29/11/08			

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۹

آدب

مدیر نگراں ۔ سیّد انور حسین آرزو

مدیر مسئول ۔ سیّد اعظم حسین

آئین ادب

عدد

(۱) "ادب" ہر انگریزی مہینے کی آخری تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) دوسرے ماہ کی دس تاریخ تک اگر پرچہ نہ پہنچے تو دفتر "ادب" کو اطلاع دینا چاہیئے۔ ورنہ عدم تعمیل کی شکایت معاف۔

(۳) "ادب" کا حجم کم از کم چار جزو ہوگا۔

(۴) عمومی قیمت پیشگی چار روپیہ سالانہ مع محصولڈاک ششماہی دو روپیہ آٹھ آنہ۔

ضوابط

نرخنامہ اشتہارات

مدت اشاعت	ایک صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
ایک سال کے لئے	صہ	سہ/	ہعہ/
چھ ماہ کے لئے	سہ/	ہعہ/	عہ
تین ماہ کے لئے	ہعہ/	عہ/	معہ/
ایک ماہ کے لئے	معہ/	للعہ/	ہعہ/

فہرست مضامین

جلد ۳ نمبر ۱

بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۱ء

مطبوعہ ماہ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء

اس "خاص نمبر" کے بعد جولائی اور اگست ۱۹۳۲ء کا پرچہ بہت جلد حاضر کیا جائیگا ہمدردان ادب کو اپنے پرچہ کی اشاعت بڑھانے میں ہماری مدد کرنا چاہیے۔ تاکہ بروقت پرچہ ارسال کرنے میں آسانی

انتساب

"ادب" کا یہ خاص نمبر فخر ملک و قوم عالی جناب سرسید سلطان احمد صاحب کے۔ٹی۔ ایل۔ایل۔ڈی۔ بار ایٹ لا۔ ایڈوکیٹ جنرل بہار اڑیسہ سابق جج ہائیکورٹ۔ سابق وائس چانسلر پٹنہ یونیورسٹی۔ ممبر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس لندن۔ کے نام نامی سے معنون کیا جاتا ہے۔

ہر چند یہ حقیر نمبر اس جناب میں پیش کئے جانے کے قابل نہیں ہے تاہم یہ جسارت صرف اس یقین کی بنا پر کی جاتی ہے کہ یہ شرف باریابی "ادب" کی بے مائگی کی تلافی کر کے اسے معاصرین میں ممتاز بنا دیگا۔

ناچیز مدیر

ادب

سر سلطان احمد بالقابہ ملک کے اُن چند منتخب افراد میں سے ہیں جو قانون دانی ہی میں نہیں بلکہ پبلک کے کاموں میں بھی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ آپکا وطن موضع پالی (ضلع گیا) ہے۔ آپکے والد بزرگوار خان بہادر مولوی سید خیرات احمد صاحب ہیں جو عرصہ تک گیا کے بہترین وکیل رہے ہیں اور اب اسّی برس سے زیادہ عمر میں راحت و آرام کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپکے بڑے بھائی جناب ہادی حسن صاحب گیا کے سینیئر بیرسٹر ہیں اور عرصہ تک پبلک پراسیکیوٹر رہ چکے ہیں۔ سر سلطان احمد بالقابہ ۲۴ ر دسمبر ۱۸۸۰ء کو گیا میں پیدا ہوئے اور آپ کی عمر اس وقت اکاون برس کی ہے۔ گھر پر تعلیم پانے کے بعد آپ کا نام گیا ضلع اسکول میں لکھا گیا جہاں سے آپنے ۱۸۹۷ء میں اول درجہ میں میٹرک پاس کیا۔ اسکے بعد آپ کی تعلیم پریسیڈنسی کالج کلکتہ اور پٹنہ کالج میں ہوئی۔ آپ ۱۹۰۲ء میں لندن تشریف لے گئے اور جنوری ۱۹۰۵ء میں بار ایٹ لا ہوئے۔ اُسی سال اگست سے آپ کلکتہ ہائیکورٹ میں کام کرنے لگے۔ شروع ہی سے آپ کی بیرسٹری اس طرح چمکی کہ چند دنوں میں آپ کی قابلیت کا سکہ ہائیکورٹ کے ججوں پر بیٹھ گیا اور آپ گورنمنٹ کی طرف سے متعدد عہدوں پر مامور کئے گئے۔ آپنے تقریباً دس برس تک وہاں کام کیا۔ تاآنکہ پٹنہ ہائیکورٹ کھلا اور آپ مارچ ۱۹۱۶ء میں وہاں اسسٹنٹ گورنمنٹ ایڈوکیٹ ہو کر آئے۔ اور جنوری ۱۹۱۷ء سے آپ گورنمنٹ ایڈوکیٹ مقرر ہوئے اور آج تک اس عہدے پر مامور ہیں۔ دوسرے گورنمنٹ لاافیسروں کی طرح آپنے اپنے کو گورنمنٹ ہی کے کام تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ آپ "پرائیوٹ پریکٹس" بھی بڑے اعلیٰ پیمانہ پر کرتے ہیں چنانچہ آپ ہائیکورٹ کی قانون دان جماعت کے پیشواؤں میں شمار کئے جاتے ہیں۔

۱۹۱۹ء میں آپ ۳۹ برس کے سن میں پٹنہ ہائیکورٹ کے جج مقرر کئے گئے۔ آپنے ایک سال تک بہت زور و شور سے انصاف و آزادی کے ساتھ ججی کی۔ اسکے بعد آپ پھر "پرائیوٹ پریکٹس" کرنے لگے۔

گورنمنٹ نے کئی مرتبہ چاہا کہ آپ مستقل جج بھی قبول فرمائیں لیکن آپ نے منظور نہیں فرمایا۔ اس انکار سے اگرچہ موصوف فائدے میں رہے لیکن پبلک کو بہت نقصان ہوا۔

۱۹۲۳ء میں آپ پٹنہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر مقرر ہوئے۔ آپ سات برس تک وائس چانسلر رہے۔ اور اگست ۱۹۳۰ء میں آپ نے اس عہدے سے سبکدوشی حاصل کی۔ آپ نے یونیورسٹی کے امور میں اس انہماک و سرگرمی سے کام لیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے یونیورسٹی کو چار چاند لگ گئے۔ انھیں قیمتی خدمات کے صلے میں سنڈیکیٹ نے آپکو "ڈاکٹر آف لاء" کی ڈگری دی۔ آپکو ۱۹۲۷ء میں گورنمنٹ نے "نائٹ ہڈ" کا خطاب عطا کیا۔

سر سلطان احمد بالقابہ جس طرح قانونی و تعلیمی دنیا میں ممدوح و نیک نام ہیں۔ اسی طرح سیاسی دنیا میں بھی ممتاز و سربلند ہیں۔ آپ لبرل خیالات کے روشن دماغ رہنما ہیں۔ سائمن کمیشن کے زمانہ میں آپ بہار کی کمیٹی کے ممبر تھے۔ آپ گزشتہ گول میز کانفرنس کے بھی ممبر تھے اور آپ نے اسمیں غیر معمولی طور پر حصہ لیا۔ چنانچہ آپ دوسری گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے پھر عنقریب لندن تشریف لے جانے والے ہیں۔

آپکا اخلاق بہت بلند ہے۔ آپکا مزاج شگفتہ ہے۔ آپکے خیالات ارفع ہیں۔ آپکی نظر نہایت وسیع ہے۔ آپکو ادبیات سے خاص دلچسپی ہے۔ اور موسیقی سے غیر معمولی لگاؤ ہے۔ آپ موسیقی کے بہت بڑے ماہر مانے جاتے ہیں۔ ادبیات سے ہمدردی کا ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ آپ نے حال ہی میں "ادب" کو ایک گراں قدر عطیہ عنایت فرمایا ہے جو اس وقت اس پرچے کے لئے ممد حیات ہو رہا ہے اور جسکے لئے ہم سراپا سپاس ہیں۔

مختصر یہ کہ سر سلطان احمد بالقابہ کی ذات بابرکات جامع صفات ہے۔ مشرقی و مغربی تہذیب کی خوبیاں اس طرح موجود ہیں کہ آپ بلاشبہ ایک مکمل انسان کہے جا سکتے ہیں۔ ہم دست بدعا ہیں کہ موصوف اپنے سفر لندن سے بخیر و خوبی واپس آئیں اور ملک و قوم کی بھلائی کے لئے جو ایثار آپ فرما رہے ہیں اسکے صلے میں آپکی عمر و اقبال میں ترقی ہو اور آپ بہت جلد صوبہ کے سب سے بڑے عہدے پر مستقل طور پر مامور نظر آئیں۔

"**ادب**" **کا خاص نمبر** حاضر ہے۔ ظاہری رنگینیوں کے دیکھنے والے کچھ بھی کہیں، لیکن معنویت کے قدردان اسے ضرور پسند کرینگے۔ ہم نے اسے بہت زیادہ دیدہ زیب بنا کر کوئی بڑا تیر نہیں مارا ہے۔ ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس نمبر میں ایسے ایسے گراں قدر و بیش بہا مضامین فراہم کئے ہیں۔ جن میں کا ایک مضمون بھی ادبی رسالہ کی عزت کا باعث ہو سکتا ہے۔ اس مجموعہ کا ہر مضمون اپنی جگہ پر بلند پایہ ہے اور اسکا مصنف ایک ممتاز ادیب ہے۔ کسی مسلم الثبوت مصنف کا معمولی سا مضمون بھی اسکے غیر فانی خدمات ادبیہ کی بدولت قدر و منزلت کا مستحق ہوتا ہے۔ چہ جائیکہ اسکا مضمون بھی معمولی نہ ہو! زیر نظر مضامین ان دو صورتوں میں سے ایک صورت سے

بہرحال خالی نہیں ہیں اور اسی لئے ہم اس بے سروسامانی میں بھی خود کو "سرمایہ دار" سمجھتے ہیں ہمیں اس وقت اس نمبر کی دیدہ زیبی اور نظر فریبی کی کمی کا افسوس نہیں ہے۔ اگر افسوس ہے تو اس بات کا، کہ باوجود کوشش کے اسکا حجم اور نہ بڑھایا جاسکا جسکی وجہ سے کئی بیش بہا مضامین اس نمبر کی زینت نہ ہوسکے۔ ہم نہایت خلوص کے ساتھ اپنے ان کرم فرما حضرات سے جن کے مضامین شائع نہ ہوسکے اپنی تنگی داماں کا عذر معقول پیش کرکے طالب عفو ہیں۔ اور اُن سب اصحاب کی خدمت میں جنھوں نے "ادب" کے خاص نمبر کی قلمی معاونت فرمائی ہے دلی شکریہ کا حقیر ہدیہ پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ حضرات ادب کو اپنا پرچہ سمجھکر اپنی ادبی دلچسپیاں اس سے آئندہ بھی وابستہ رکھینگے۔

اس خاص نمبر کو زیادہ دیدہ زیب و ضخیم کیوں نہیں بنایا گیا۔ یہ طویل داستان بیان کرنا کچھ بیکار سا ہے۔ آج کل ہر شعبۂ زندگی میں جو مالی کشمکش جاری ہے اس سے کون نہیں واقف ہے۔ بڑے بڑے سرمایہ سے چلنے والے رسالے بند ہورہے ہیں اور بڑے بڑے اولوالعزم ہمت ہار رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ادب، بہت کم سرمایہ سے جاری کیا گیا۔ دوسرے یہ کہ اکثر اخبارات و رسائل کی طرح اسکے خریدار زیادہ تر زمیندار طبقہ سے ہیں اور اس مالی کشمکش میں یہی طبقہ سب سے زیادہ پامال ہے۔ جسکا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ادب، اپنے معاونین کی دقتوں میں پورا پورا شریک ہے۔ اسکی حالت بھی محتاج امداد ہے۔ ایسے خطرے کے عالم میں جب کہ زندگی ہی قائم رکھنا بڑا کام ہے "سالگرہ" یا "سالنامہ" کا جشن منانا کون سی دور اندیشی ہے! یہ سچ ہے کہ آج کل تجارتی دنیا میں ترقی کرنے اور مقابلے کے لئے جدت و جدوجہد ضروری ہے لیکن وہیں تک۔ جہاں تک کوئی فائدہ پہونچ سکے۔ خدارا بتلائیے کہ ایک ایسی مہمل غزل کو جسمیں کوئی ایسا شعر نہ ہو جو خاص نمبر کے مخصوص صفحات تو خیر عام نمبر کے اشتہارات کے صفحے پر بھی شائع کیا جاسکے، نہایت تزک و احتشام سے سنہرے حرفوں میں لکھوا کر صفحۂ اول پر شائع کرنا کون سی ادبی خدمت ہے۔ اور اسی طرح کے لغویات سے رسالہ کو زرق برق کرکے خاص نمبر بنا دینا اردو کے لئے کس حد تک مفید ہے۔ اس ناکارہ لٹریچر کی اشاعت سے تو اسکی عدم اشاعت ہی بہتر ہے اس مضر صحت ادبی مواد کا تو فنا ہوجانا ہی مناسب ہے۔ البتہ کیا کہنا اس صورت کا کہ معنوی لطافتوں کے ساتھ ساتھ صوری خوبیاں بھی ہوں۔ پاکیزہ روحیں حسین جسموں میں جگہ پائیں یعنی "ادب" کے صفحات مضامین کو پنجابی رنگینیاں نصیب ہوں۔ دل میں ہمارے بھی یہ ولولہ ہوا، مگر دماغ نے بتایا کہ یہ جینے کی باتیں نہیں ہیں۔

کار دنیا کسے تمام نہ کرد   ہر چہ گیرید مختصر گیرید

اور یہی وجہ ہے کہ آج اس معمولی صورت میں لیکن غیر معمولی سیرت کے ساتھ "ادب" آپکی خدمت میں حاضر ہے اسے ملاحظہ فرمائیے۔ اگر آپ کو اسکا کوئی مضمون پسند آئے تو اسکے صلے میں اسکے لئے خریدار اور اشتہارات بہم پہنچانے میں ہماری ممکن مدد فرمائیے۔

میر انیسؔ کی علمی استعداد

جناب پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیبؔ ایم اے

شیخ محمد جان عروجؔ فیض آبادی ایک ذی علم شاعر اور نظم و نثر کی چند کتابوں کے مصنف تھے۔ مرثیہ بھی کہتے تھے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ دونوں کو خدائے سخنوری مانتے تھے اور دونوں کی ہمنشینی کا شرف بھی رکھتے تھے۔ ان کا بیان ہے:-

"میر صاحب قبلہ (میر انیس) کی حیثیت علمی محتاج اعلیٰ درجے کی تھی۔"[1]

خان بہادر میر علی محمد شادؔ عظیم آبادی کی قابلیت و وسعت نظر، قوت شاعری اور کثرت تصانیف کا حال کس کو معلوم نہیں۔ مرزا دبیرؔ سے بخوبی واقفیت و عقیدت رکھتے تھے۔ میر انیسؔ کی زیارت اور ہمکلامی کا فخر بھی حاصل تھا۔ لکھتے ہیں:-

"میر صاحب مرحوم عربی و فارسی زبان سے بھی بہت اچھی طرح ماہر اور شاعری کے سب فنون میں طاق تھے۔ اُن کو استادوں کے کلام اس قدر یاد تھے کہ ایک مثال کے لئے کئی کئی شعر پڑھ دیتے تھے۔"[2]

سید امجد علی اشہری نے انھیں شادؔ مرحوم کے ایک خط کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ فلسفے کی مشہور درسی کتاب صدرا کی ایک عبارت پر بحث ہو رہی تھی۔ میر انیس سے بھی استصواب کیا گیا۔ اُنھوں نے وہ عبارت زبانی پڑھ دی اور اس مشکل مقام کو اس خوبی سے حل کر دیا کہ سننے والے

---

[1] تردید موازنہ صفحہ ۱

[2] نوائے وطن صفحہ ۳۳

دنگ ہوگئے۔ یہ بھی لکھا ہے :۔

"لکھنؤ میں میر انیس کو عالمانہ درجے میں تسلیم نہیں کیا جاتا، لیکن انکی معلومات علمیہ کا سب کو اقرار ہے ...... میر صاحب کو بہ نسبت منقولات کے معقولات سے زیادہ دلچسپی تھی .... میر صاحب کی مختصر لائبریری میں ہر علم و فن کی ضروری کتابیں جمع تھیں جو سب کی سب انکی نظر سے گزر چکی تھیں۔"[1]

مولانا علی حیدر صاحب نظم طبا طبائی تحریر فرماتے ہیں :۔

"میر صاحب کے کلام سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ علوم متعارفہ سے ناواقف بھی نہ تھے"[2]

میر انیس کے حقیقی نواسے میر سید علی صاحب مانوس جو سید صاحب کے نام سے معروف ہیں۔ اور قریب دس برس کے سن سے پچیس چھبیس برس کی عمر تک میر انیس کے ساتھ رہے۔ انکا بیان ہے کہ میر انیس کے کتبخانے میں کوئی دو ہزار کتابیں ہونگی۔ دو بڑے بڑے صندوق کتابوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان کو خوب یاد ہے کہ غدر کے بعد میر انیس نے شاہنامہ فردوسی کا ایک عمدہ نسخہ مطلا، مصور، بخط ولایت دو سو روپے کا خریدا تھا۔

راقم مضمون نے بھی میر انیس کے کتبخانے کی ایک کتاب کی زیارت کی ہے یعنی نفس اللغۃ[3] جسکا ایک حصہ خود میر انیس کے ہاتھ کا نقل کیا ہوا ہے۔ یہ لغت اب خاندان انیس کے ایک ممتاز رکن سید ظفر حسین صاحب عرف بابو صاحب فائق کے پاس موجود ہے۔ جناب مانوس کا بیان ہے کہ "غدر کے بعد جس زمانے میں میر انیس کا قیام پنجابی ٹولہ میں تھا، تو میں اس کتاب کو نقل کیا کرتے تھے۔"

مندرجۂ بالا مختصر بیانات کے علاوہ میر انیس کی علمی استعداد کا حال میری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن انکی تصنیفیں اور تحریریں انکی قابلیت اور معلومات کی وسعت پر شہادت دے رہی ہیں۔ میر انیس کو فطرت نے ذوق سلیم عطا کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اظہار قابلیت کی ہوس ادبیت کی دشمن ہے۔ اس لئے وہ بڑے بڑے لغات، غیر مانوس ترکیبیں، عربیت اور فارسیت کا غلبہ، اصطلاحات علمیہ، مسائل حکمیہ۔ ان

---

[1] حیات انیس صفحہ ۱۹-۲۰

[2] مراثی انیس جلد دوم، مرتبہ حضرت نظم طباطبائی، مطبوعہ مطبع نظامی بدایوں صفحہ ۵

[3] یہ لغت ناسخ کے شاگرد و اردو کے مستند زبان داں میر علی اوسط رشک نے مرتب کیا تھا۔ اس میں اردو لفظوں کے معنی فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ اس لغت کا صرف ایک حصہ مولوی نور الحسن صاحب نیر مؤلف نور اللغات نے چند سال ہوئے شائع کیا تھا۔

چیزوں سے لوگوں پر اپنی قابلیت کا دباؤ ڈالنا اور ادبیت کا خون کرنا پسند کرتے تھے۔ ان کو جو زبان پر قدرت، نظم کی مشق، اور ادبیت میں پختگی حاصل ہوتی گئی اُتنا ہی اُن کی کتابی معلومات کا اظہار اُن کے کلام میں کم ہوتا گیا۔ چنانچہ علمیت اور عربیت جس قدر ان کے ابتدائی کلام میں ہے آخری کلام میں نہیں ہے۔

انیس کی علمی استعداد کے بارے میں میں اُنکے کلام سے جو کچھ اخذ کر سکا ہوں وہ ذیل میں نمبروار لکھتا ہوں۔

(۱) میر انیس عربی زبان بخوبی جانتے تھے۔ اس دعوے کی دلیلیں یہ ہیں:-

(ا) وہ اپنے کلام میں عربی لفظ، فقرے، محاورے اور ترکیبیں بے تکلف اور برمحل استعمال کرتے ہیں۔ اگر عربی میں پوری مہارت نہ ہوتی تو ان کے استعمال میں ضرور غلطی ہو جاتی۔ مثلاً:-

ع - جوہر میں اَنَا سَیفُ یَدُ اللہ لکھا تھا
ع - حُر پکارا بابی اَنتَ و اُمّی یا شاہ
ع - اے خداوند جہاں خذ بیدی خذ بیدی
ع - صلوا علی النبی کی بیاباں میں دھوم ہے
ع - اشک آنکھوں سے بہا کے کہا یرحمہُ اللہ
ع - کہتی تھی یہ گیتی کہ انا الطود انا الطود
ع - کیا خوب لڑے سلمک اللہ برادر
ع - العظمۃُ للہ کی صدا برق سے نکلی
ع - اے مددگار و معین الضعفا ادرکنی
ع - ہنس کر طوبیٰ لکم علی کہتے تھے
ع - عبرت کی ہے جا فاعتبروا یا اولی الابصار
ع - سمعاً و طاعۃً نہیں طاقت کہ دوں جواب
ع - عباس چلے کہہ کے توکلتُ علی اللہ
ع - چلائے وہ آمنّا کہہ کے بار بار
ع - خالق کی یاد سرّاً و علن چاہیے تمہیں

(۳) میر انیس قرآن و حدیث کا کافی علم رکھتے تھے۔ آیات و احادیث، اُن کے ترجمے، اُن کی طرف اشارے، تفسیر و حدیث کی کتابوں کے نام، راویوں کے حوالے۔ یہ سب چیزیں ان کے کلام میں موجود ہیں جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہوگا:۔

آیات قرآنی یا انکی طرف اشارے

ع۔ کس کو اکملت لکم دینکم ارشاد کیا

ع۔ شرح جعل الشمس ضیاء تھی ہویدا

ع۔ وہ خوں سے بھرے فاعتبروا یا اولی الابصار

ع۔ اے قوم اذا زلزلت الارض یہی ہے

پوری آیت یہ ہے " اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَھَا "

ع۔ آثار اذا زلزلت الارض عیاں ہوں

ع۔ غضب اللہ علیھم کے عیاں تھے آثار

ع۔ لب پر فسیکفیکھم اللہ کی آیت

ع۔ محبوب کبریا کی صدا ہے کہ لا تخف

اشارہ ہے اس آیت کی طرف " لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ اِنَّ اللہَ مَعَنَا "

ع۔ یٰسین میں کہا ہے امام مبین کسے

اشارہ ہے اس آیت کی طرف " کُلَّ شَیْءٍ اَحْصَیْنٰہُ فِیْ اِمَامٍ مُّبِیْنٍ "

ع۔ نصِ مباہلہ ہے کہو کس کی شان ہیں

آیہ مباہلہ یہ ہے " قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَکُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَکُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَکُمْ "

ع۔ ہے انفسنا انفسکم کس سے اشارہ

اس مصرع میں آیہ مباہلہ کی طرف اشارہ ہے۔

ع۔ آؤ کہ تم یہ پھونک دیں پڑھ کر وان یکاد

پوری آیت یہ ہے " وَاِنْ یَّکَادُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَکَ بِاَبْصَارِھِمْ "

ع۔ تھا خوف بخوف انکدرت چرخ بریں کو

پوری آیت یہ ہے " وَاِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ "

ع - کس کی ثنا ہے سورۂ والعادیات میں

ع - ہے کون مراد آیۂ لا اسئلکم سے

اشارہ ہے اس آیت کی طرف "قُل لَّا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی"

ہ - کس کے لئے اکملت لکم دینکم آیا
اتممت علیکم کا ملا ہے کسے پایا

پوری آیت یہ ہے "اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ"

ہ - شمسُ الضُّحیٰ اسی رخ نیکو کا وصف ہے
واللیل اذا سجیٰ اسی گیسو کا وصف ہے

ع - جو رطب و یابس اس میں ہے سب ان کو یاد ہے

اشارہ ہے اس آیت کی طرف "لَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ"

ع - او ناد اراضی عرب ہل گئے یک بار

ع - قوسین کا ہے فرق جہاں رتبۂ ادنیٰ

اس آیت کی طرف اشارہ ہے "فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی"

ہ - اقرب ہے رگ جاں سے اور اس پہ یہ بُعد
اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو

پہلے مصرعے میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے "نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ"

ہ - الفت کو، محبت کو، مودت کو بھی بھولے
سب ایک طرف اجر رسالت کو بھی بھولے

اس آیت کی طرف اشارہ ہے "قُل لَّا اَسْئَلُکُمْ عَلَیْہِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّۃَ فِی الْقُرْبٰی"

احادیث کی طرف اشارہ

ع - شمشیر شرع عارف اسرار معرفت

ع - فرزند صاحب شرف بیعت مہ عرب میں

اسی کی دونوں شانوں میں حضرت علی کے اس قول کی طرف اشارہ ہے "مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ"

اصحاب خاص گرد تھے انجم کی طرح سب
مصداق قول پاک اصحابی کالنجوم

ع کریم مجھ کو عطا کر وہ فقر دنیا میں
کہ جس کو فخر رسالت مآب سمجھے ہیں

رسولؐ کی اس حدیث کی طرف اشارہ ہے ”اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ“

ع - افضل ہے دو عالم کی عبادت سے یہ اک وار

رسولؐ کی حدیث ہے ”ضَرْبَۃُ عَلِیٍّ یَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ عِبَادَۃِ الثَّقَلَیْنِ اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَۃِ“

ع - اس پر حدیث نفسک نفسی گواہ ہے

آیات واحادیث کا ترجمہ

ظاہر ہے کہ نظم میں لفظی ترجمہ تقریباً محال اور اصل عبارت میں جزوی تغیر ناگزیر ہے۔ اس لئے ذیل کی مثالوں میں بھی ترجمے سے لفظ بہ لفظ ترجمہ مراد نہیں ہے۔

تم پاس ہوں میں چھوڑتا دو امر عظیم اب   قرآن ہے اور عترت اطہار مری سب
ناجی ہو وہ ان دونوں سے جو رکھیگا مطلب   جو ہوگا خلاف ان سے نہ بخشیگا اسے رب
ان میں سے ہر اک مصحف ایماں کا ورق ہے
تابع رہو ان کے یہ رضامندی حق ہے

واللہ اگر میری رضامندی ہے درکار   تم ان سے خصومت نہ کبھی کیجو خبردار
آزار مجھے دوگے جو دوگے انھیں آزار   دونوں یہ جدا مجھ سے نہیں ہونگے زنہار
میں ساتھ تمہارے ہوں جو ساتھ انکے رہوگے
مجھ سے اسی تقریب سے کوثر پہ ملوگے

ان دو بندوں میں پہلے بند کے ابتدائی تین مصرعے، اور دوسرے بند کے آخری تین مصرعے اس حدیث کا ترجمہ ہیں۔ ”اِنِّیْ تَارِکٌ فِیْکُمُ الثَّقَلَیْنِ کِتَابَ اللّٰہِ وَعِتْرَتِیْ اَھْلَ بَیْتِیْ مَا اِنْ تَمَسَّکْتُمْ بِھِمَا لَنْ تَضِلُّوْا بَعْدِیْ وَاِنَّھُمَا لَنْ یَّفْتَرِقَا حَتّٰی یَرِدَا عَلَیَّ الْحَوْضَ“

دوسرے بند کے تیسرے مصرعے میں رسولؐ کی اس حدیث کی طرف اشارہ ہے ”فَاطِمَۃُ بَضْعَۃٌ مِّنِّیْ مَنْ اٰذَاھَا فَقَدْ اٰذَانِیْ“

جو دوست ہے اسکا وہ مرا دوست ہے واللہ   دشمن ہے جو اسکا مرا دشمن ہے وہ گمراہ

رسولؐ کے اس قول کا ترجمہ ہے "مَنْ اَحَبَّ عَلِیًّا فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَمَنْ اَبْغَضَ عَلِیًّا فَقَدْ اَبْغَضَنِیْ"

ﷺ شہ نے ثناء عرب کو سارا یہ ماجرا　　فرمایا بازگشت ہی سب کی ہے سوئے خدا

"بازگشت ہی سب کی سوئے خدا" ترجمہ ہے "انا الیہ راجعون" کا۔ اور اشارہ ہے اس آیت کی طرف " اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ "

ع- تیغ ایسی نہ ہوگی نہ جوان ہوئے گا ایسا

"لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیْ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار" کا ترجمہ ہے۔

تفسیر و حدیث کی کتابوں کے نام

ع- پڑھتے ہیں تہنیتِ فتح کو باری باری

فتح اور باری کے لفظ قریب قریب لاکر شاعر نے ذہن کو ابن حجر عسقلانی کی کتاب فتح الباری کی طرف بھی منتقل کردیا ہے۔

ع- تفسیر حسینی ہے خطِ مصحفِ رخسار

تفسیر حسینی ملا حسین واعظ کاشفی کی تفسیر قرآن کا نام ہے۔

سہ کشاف امرِ حق ہے بیاں اس سعید کا
ہاں ترجمہ ہے مصحفِ ربِ مجید کا

کشاف علامہ زمخشری کی تفسیر قرآن کا نام ہے۔ دوسرے مصرعے سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر نے لفظ کشاف میں ایہام ملحوظ رکھا ہے۔

ع- لکھتا ہے مناقب میں یہ راوی دل آگاہ

مناقب ابن شہر آشوب کی ایک کتاب کا نام ہے۔

راویوں کے نام

ع- سید بن طاؤس سے ہے ایک روایت
ع- ناقل ہے اس حدیث کا سلمان خوش سیر

(۳) میر انیس اپنے زمانے کے علوم رسمی یعنی صرف و نحو۔ معنی و بیان۔ عروض منطق فلسفہ۔ تاریخ۔ طب۔ رمل وغیرہ سے واقف تھے۔ ان علوم کے مسائل اور اصطلاحیں اُنکے کلام میں موجود ہیں۔ صرف و نحو اور معنی و بیان کے متعلق مثالیں اوپر گذر چکی ہیں۔ ذیل میں وہ مثالیں پیش کی جاتی ہیں جن سے دوسرے علوم کی واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔

عروض | کامل تھی وہ بس بحر شجاعت میں وہ تلوار — شل الف وصل کرے جاتے تھے کفار
جو کوئی قریب آیا رجز خواں وہ پیکار — سالم تھا تب نہ فاصلہ رکن اسکے تھے چار

کیا ڈرتے کہ سکتہ تھا ہر اک اہل حسد کو
تقطیع کیا تیغ نے ہر مصرع قد کو

اس بند میں کامل، بحر، رجز، سالم، فاصلہ، رکن، سکتہ، تقطیع، مصرع، عروض کی اصطلاحیں ہیں۔ بند کے دوسرے مصرعے میں ایک عروضی مسئلے کی طرف اشارہ ہے۔

تقطیع مصرع قد اعدا میں تھی وہ فرد — اور نظم چارپارہ میں کامل ہے نبرد
ناقص کیا انھیں جنھیں ہولا کا تھا نہ درد — تھے ضربتِ ثقیل سے اسکی خفیف مرد

بحر فنا زمیں پہ تو برق آسمان پر
سیفی کا سب عروض تھا اُسکی زبان پر

اس بند میں تقطیع، مصرع، فرد، نظم چار پارہ، کامل، ناقص، ضرب ثقیل، خفیف، بحر، عروض کی اصطلاحیں ہیں۔ آخری مصرعے میں فن عروض کی کتاب عروض سیفی کا ذکر ہے۔

منطق و فلسفہ |

ع۔ اک فصل میں اس جنس کے عقدے بھی کھلینگے
ع۔ ہر فرد کو اس صاحب ہمت نے کیا زوج
ع۔ ہے شکل ممتنع قسم واجب الوجود
ع۔ ہے جوہر فرد اسکی نہ ہوگی کبھی تقسیم
ع۔ تقسیم جزو لایتجزیٰ محال ہے
ع۔ ہر جزودن کو لایتجزیٰ بنا دیا
ع۔ کرتی تھی شکل کو وہ ہیولیٰ سے منفصل
ع۔ عالم مرکبات میں تھا مفردات کا

اوپر کی مثالوں میں فصل، جنس، فرد، زوج، ممتنع، واجب الوجود، جوہر فرد، جزو لایتجزیٰ، شکل، ہیولیٰ، مرکبات، مفردات، منطق اور فلسفے کی اصطلاحیں ہیں۔

ع۔ [illegible] آئے

ع - سب زرد تھا اُداسیٔ حرارت سے تن تمام
ع - جیسے تپِ محرق میں جواں کو عرق آئے

ان مثالوں میں تبعض "زردی" "اداسیٔ حرارت" اور "تپِ محرق" طب کی اصطلاحیں ہیں - اور ہر مثال سے طبّی واقفیت ظاہر ہوتی ہے -

رمل | سر سے ہوا بلند تو پھینکا زمین پر — طفلی سے زائچے میں لکھا تھا اجل کا گھر
پہچاننا بھی شکل کا اشکال ہو گیا
ایک ایک عضو قرعۂ رمّال ہو گیا

اس بند میں زائچہ، گھر، شکل، قرعہ، رمل کی اصطلاحیں ہیں -

تاریخ اسلام | میر انیس تاریخ اسلام سے واقف تھے - اُنکے کلام میں تاریخی واقعات کا ذکر، معرکوں اور غزووں کا حال کثرت سے ملتا ہے - واقعۂ کربلا کے تمام جزئیات و تفصیلات سے بھی بخوبی واقف تھے ان کے بیان سے مرثیے بھرے پڑے ہیں - انصار حسین کے نام، اُن کے کارنامے - یزیدی لشکر کے لوگوں کے نام، اُن کے عہدے - اُن کے مظالم وغیرہ جابجا تفصیل سے لکھے ہیں -

ذیل میں چند بند مثال کے طور پر نقل کیئے جاتے ہیں جن سے اس بیان کی تائید ہوتی ہے :-

کربلا میں امام حسین کا داخلہ اور فوجوں کی آمد

تاریخ دوسری تھی کہ داخل ہوئے امام — اور تیسری کی صبح کو آئی سپاہ شام
آنے کی شمر کے ہوئی چوتھی کو دھوم دھام — تھی پانچویں کہ دشت ستم بھر گیا تمام
نرغہ ہوا چھٹی سے شہ مشرقین پر
ہفتم سے بند ہو گیا پانی حسین پر
تھا ہشتم و نہم کو تو اک شورِ العطش — تھے نہر علقمہ سے بہشتی کنارہ کش

حسینی لشکر

ایسی نہ فوج کچھ ہے نہ ایسے نشان ہیں — میں نے تو خود گنا ہے بہتّر جوان ہیں
اسوار بھی قلیل پیادے بھی تھوڑے ہیں — کل شتر سوار ہیں و بیس گھوڑے ہیں

لفظ انیس کے بعض [illegible] ہیں - اسکے متعلق پھر کبھی بحث کی جائیگی - (ادیب)

ہمشکل مصطفےٰ کو تو اٹھارواں ہے سال — تیرہ برس کا ہے ابھی شبر کا نونہال
نو دس برس کے ہونگے زینب کے دونوں لال — ہاں اک جواں ہیں حضرت عباس خوش خصال
چھوٹے ہیں اور سب کوئی ان میں جواں نہیں
تھا اک طرف سبیں بھی کسی کے جواں نہیں

سنتا ہوں میں ہیں دو پسر شاہ نامدار — بیمار ان میں ایک ہے اور ایک شیر خوار
زینبؑ کے دو ہیں تین حسنؑ کے ہیں گلعذار — دس ہیں عقیلؑ و مسلمؑ و حیدرؑ کے یادگار
زہراؑ کے جان و دل ہیں محمدؐ کے پیارے ہیں
کل سترہ تو چاند ہیں باقی ستارے ہیں

انصار حسین کے نام

بگڑے ابو ثمامہ و سعد فلک سریر — تولی زہیر قین نے شمشیر بے نظیر
جوڑا کماں میں ابن مظاہر نے جھکا کے تیر — بولے اسد کہ زجر کے قابل ہیں یہ شریر
عابس کو غیض لشکر بدخو پہ آ گیا
غصے سے بل ہلال کے ابرو پہ آ گیا

بولے اٹھا کے نیزے کو ضرغامۂ دلیر — بس اب سزا ہیں آگئی مناسب نہیں ہے دیر
بولے شبیب ادھر سے جو نکلیگا ایک شیر — بھاگیں گے سب گھوڑوں کی باگوں کو پھیر
آقا کا ہے یہ پاس کہ ہم دور دور ہیں
کثرت پہ اپنی پھولے ہیں کیا بے شعور ہیں

پہلے محمد غازی نے صفیں کیں تہ و بالا — پھر بھائی گیا ان میں ہلاتا ہوا بھالا
فرزند نے رہوار کو چمکا کے نکالا — تینوں جو مرے قتل تو رونے شہ والا
کہرام تھا مہماں کے لئے اہل حرم میں
رونے کو بتول آئی تھی میدان ستم میں

میدان میں مسلم پسر عوسجہ آیا — تلوار جو کھینچی تو ہزاروں کو بھگایا
جس دم وہ گرا شہ نے بڑا رنج اٹھایا — چھاتی سے کئی مرتبہ زخمی کو لگایا
لاشے کے گلے مل کے بہت روتے تھے شبیر
[illegible]

ضرغامہ و وہب و انس و مالکِ بیدار — حجاج و زہیر اسدی عامر و عمار
عمران و شعیب و عمرو و شوذب ابرار — قربان حسین ابن علی ہو گئے یکبار
جس سمت یہ جانباز تھے خالی وہ پڑا تھا
اور رود تلک دشتِ ستم خوں سے بھرا تھا

باقی جو رفیقِ شہ دیں رہ گئے دو چار — حسرت سے انھیں دیکھتے تھے سید ابرار
کی بڑھ کے حبیب ابن مظاہر نے یہ گفتار — یہ پیر غلام اب ہے اجازت کا طلبگار
بندے کو بھی مرنے کی رضا دیجیے آقا
فردوس کے رستے پہ لگا دیجیے آقا

یزیدی فوج کی تعداد

اس فوج سقر موج کی تعداد ہے دشوار — لکھتا ہے کوئی تیس ہزار اُس کے تھے غدار
اور اس سے فزوں تر بھی کچھ وارد اخبار — اکثر کا یہ ہے قول کہ تھے لاکھ ستمگار
لکھتے ہیں یہ بعضے کہ چھ لاکھ اہل جفا تھے
یاں بیکس و مظلوم امام دوسرا تھے

فوج یزید کے سردار

یہ سنتے تھے جو دوسرا آکر یہ پکارا — آ پہونچا یزید ابن رکاب ستم آرا
عمان شقاوت نے ہوا اک زور سا مارا — گھوڑوں سے رکا جاتا ہے دریا کا کنارا
پانی بھی کوئی نہر سے پاتا نہیں اب تو
جز تیغ و سناں کچھ نظر آتا نہیں اب تو

آ لے دہل فتح بجاتے ہوئے باہم — حجاج و سنان ابن انس خولی و قشعم
تھے چار ہزار اہل ستم اور بھی اظلم — انبوہ ہوا تھا ششم ماہ محرم
اُمڈی ہوئی بادل کی طرح فوج گراں تھی
مقتل کی زمیں گھوڑوں کی ٹاپوں سے نہاں تھی

(۴) میر انیس کو فارسی زبان و ادب پر عبور تھا۔ اس کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں

ان کے مرثیوں کو پڑھیے تو ایک ایک مصرع ان کی فارسی دانی پر شہادت دیتا چلا جاتا ہے۔ فارسی الفاظ کا بامحل صرف، دلاویز ترکیبیں، شعرائے فارسی کا انداز بیان، فارسی کا اقوال و امثال کی طرف اشارے، فارسی اشعار کے ترجمے۔ جابجا فارسی اشعار کو تضمین کرنا۔ یہ سب ان کے فارسی پر مہارت تام رکھنے کے بین ثبوت ہیں۔

میر انیس فارسی نظم و نثر لکھنے پر بھی قادر تھے۔ فاضل اجل جناب علامہ مفتی میر عباس صاحب قبلہ مغفور کی مثنوی من و سلوی کی تاریخ طبع فارسی میں کہی تھی جو ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

طبع شد این نظم از فضل الہ — در جلوس میمنت مانوس شاہ
خاصۂ درگاہ رب ذوالمنن — ظل حق واجد علی شاہ زمن
صاحب علم سید معجز بیان — قبلۂ کونین استاد زمان
فاضل باذل۔ فقیہ بالیقین — آفتاب آسمان علم و دین
چوں تامل کرد با فکر سلیس — از پئے تاریخ آں طبع انیس
داد ہاتف این صدائے دلپذیر — ہست تاریخش کلام بے نظیر

اس نظم کا تیسرا شعر بتاتا ہے کہ یہ تاریخ مصنف علام کی فرمائش سے لکھی گئی تھی۔ جناب مفتی صاحب قبلہ نے خود بھی لکھ دیا ہے کہ میر انیس نے یہ تاریخ انکی فرمائش سے عجلت میں لکھی۔ فرماتے ہیں:۔

باز تاریخ دگر کردم طلب — از جناب سید والا نسب
نور شمع مجلس صدق و صفا — ذاکر مقبول سبط مصطفےٰ
بلبل دستان زن بستان ہند — مادح میر عرب سحبان ہند
شاعر یکتا رئیس ذاکرین — تارک دنیا انیس اہل دین
ارتجالاً آں وحید روزگار — زود رقم این چند بیت آبدار

اسی مثنوی من و سلوی کو پڑھنے کے بعد میر انیس نے جناب مفتی صاحب قبلہ کو ایک خط لکھا تھا جو نقل کیا جاتا ہے:۔

قبلہ و کعبۂ خلوص کیشاں دام ظلکم العالی

زبان این کج مج بیان را چہ یارا کہ مدح این اشعار آبدار نماید۔ الحق کہ درین جزو زمان طرز ایجاد طرازی و سحر پردازی بر ذات فیض آیات ختم گردیدہ ؎

د قلم بودہ است گویا کلک معجز سلک تو — صفحۂ قرطاس را کردی نگارستان چین

ازیں بیش تکلف نگاہ داشتن سایہ ہما پایہ ابر مفارق خادمان خاص مبسوط باد۔ بحق محمد و آلہ الامجاد۔

گو کہ یہ مضمون کافی محنت اور تجسس کا نتیجہ ہے تاہم ابھی اس موضوع پر لکھنے کی بہت گنجائش ہے میں نے صرف ایک استنکال دیا ہے کہ اگر وہ لوگ جو قرآن، حدیث، ادب عربی، علوم اسلامیہ وغیرہ میں وسیع نظر رکھتے ہیں اس راستے پر چلیں گے تو معلوم ہوگا کہ انیس نے کہاں کہاں آیات و احادیث اور اقوال و امثال و اشعار عرب کا ترجمہ کیا ہے۔ کہاں کہاں اُن کی طرف اشارہ کیا ہے اور کہاں کہاں مسائل علمی سے کام لیا ہے۔ ان سب باتوں کی تحقیق کے بعد انیس کا علمی پایہ صحیح طور پر معین کیا جا سکیگا۔

بہرحال جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اور جو مثالیں پیش کی گئی ہیں اُن سے بھی صاف ظاہر ہے کہ انیس عربی بخوبی جانتے تھے اور ان کو مختلف علوم یا کم سے کم ان کی اصطلاحوں کا کافی علم تھا اور وہ ایک من علم سے کام لینے کے لئے دس من عقل بھی رکھتے تھے۔ کتابیں پڑھ پڑھ کر "چارپائے بر او کتابے چند" کا مصداق بن جانا اور چیز ہے اور اپنے مبلغ علم کو جزو ذات بنا لینا یا اُس پر حاکمانہ قدرت رکھنا اور چیز ہے۔

اس بحث کے خاتمے میں ایک بار ایک بات جو ابتدا میں کہہ چکا ہوں پھر یاد دلاتا ہوں کہ عربیت کا غلبہ اور علمیت کا اظہار جتنا انیس کے ابتدائی مرثیوں میں ہے اُتنا آخری مرثیوں میں نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو جو مشق سخن بڑھتی گئی وہ وہ یہ قدرت بھی بڑھتی گئی کہ باریک اور نازک خیالوں کو غریب لفظوں اور علمی اصطلاحوں سے بچ کر سادہ اور عام فہم زبان میں ادا کردیں۔ اس موقع پر مجھے ایک تاریخی حکایت اور ایک زبردست ادیب کی ہدایت یاد آگئی۔ بابر بادشاہ نے جسکا قلم اُسکی تلوار سے کم نہ چلتا تھا اور جسکی خود نوشتہ سوانح عمری نے اُسکو دنیا کے ممتاز ادیبوں میں جگہ دی ہے۔ ایک مرتبہ اپنے بیٹے ہمایوں کو جو اسکے بعد تخت و تاج کا مالک ہوا۔ لکھا کہ "تم خط اچھا نہیں لکھتے ہو، تمہاری تحریر میں سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ تم اس میں اپنی قابلیت کی نمائش کرنے لگتے ہو۔" بابر کی یہ نصیحت تمام انشاپردازوں اور شاعروں کے لئے شمع ہدایت ہے۔

تبرکات

جناب مفتی میر محمد عباس صاحب شوستری اعلی اللہ مقامہ

(غیر مطبوعہ)

ترسم از خون من آلودہ شود دامن تو — کشتۂ ناز تو آغاز طپیدن دارد
شد مشبک جگر و دل ہمہ خوں گشت ہنوز — نوک مژگان تو در سینہ خلیدن دارد

دیگر

نیامدی شب و کار من اشکباری بود — شوم فدائے سر [illegible] یاری بود
خطاب کرد بہ نعشم کہ قبل وعدۂ وصل — گزشتی از سر جاں ایں چہ بیقراری بود

دیگر

بود نازک تر از تو اے صبا جسمے کہ من دارم — قدم بر مرقد بید گزار آہستہ آہستہ

دیگر

زہے نامۂ تو سرخی خامۂ نو — فَهَاتِيكَ مِسْكٌ وَتِلْكَ الغَزَال
حروف و نقط نیست بر صفحۂ خط — عَلیٰ خَدِّ حَسْنَاءَ صُنْعٌ وَخَال
صریر قلم نیست ہنگام تسوید — ولکن تُنَادِی بِلَیْلٍ بِلَال

دیگر

شہید عشق ہوا میں تو کیا تعجب ہے — ترا مزار پہ آنا بڑا تعجب ہے
طپش جو قلب میں ہے وہ آہ سرد لب پر — یہ گرمی اور یہ ٹھنڈی ہوا تعجب ہے
گزر ہوا کا بھی ممکن نہیں جس گل تک — پیام وصل کا کس نے کہا تعجب ہے
طلب وہ کرتے ہیں جاتے نہیں تم اپنے — عجب ہے آپ ہے ان سے جدا تعجب ہے

نظم اور نثر

پروفیسر خواجہ اطہر حسین صاحب ایم اے

کچھ زیادہ زمانہ نہیں گزرا جب خالص علمی مباحث اور علمی مسائل کو نظم کے سانچے میں ڈھالنے کا رواج بہت عام تھا طلباء کے ہاتھوں میں منظوم جغرافیہ، منظوم تاریخ، منظوم قواعد صرف و نحو وغیرہ کی قسم کی چیزیں اکثر دیکھنے میں آتی تھیں۔ نظم کی زبان کو ان مقاصد میں استعمال کرنے کی ابتدا غالباً اُس وقت ہوئی ہوگی جب چھاپہ کی ایجاد نہیں ہوئی تھی اور کتابیں صرف قلمی نسخوں کی صورت میں دستیاب ہوسکتی تھیں۔ اس وقت ان کی قیمت گراں تھی اور اُنکا حاصل کرنا دشوار۔ درس و تدریس زیادہ تر زبانی ہوتی تھی طلباء کے پاس ضروری سی کتابیں موجود نہ ہوتی تھیں بہت سی چیزیں جن تک فی زمانا کم قیمت مطبوعہ کتابوں کے ذریعہ متعلمین کی رسائی ہر وقت بہ سہولت ہوسکتی ہے۔ اُس زمانہ میں بہت کمیاب تھیں، اسی لئے انھیں محفوظ رکھنے کی غرض سے اُنکا حفظ کرلینا ضروری ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ نظم کا حفظ کرلینا نثر کے حفظ کرنے سے بدرجہا سہل ہے۔ لہٰذا اس زمانہ کی ضروریات کے لحاظ سے یہ امر یقیناً باعث سہولت تھا کہ مختلف مفید اور کام میں آنے والی چیزوں کو نظم کا جامہ پہنا دیا جائے تاکہ اُنکے یاد رکھنے اور وقت ضرورت ان سے کام لینے میں دشواری نہ ہو۔ مگر جیسا اکثر ہوتا ہے جب یہ ضرورت باقی نہ رہی اور کتابیں آسانی سے دستیاب ہونے لگیں۔ اس وقت بھی یہ رواج جو زمانۂ قدیم سے چلا آتا تھا جاری رہا۔ بلکہ ابھی تک بالکل مفقود نہیں ہوا ہے۔ متعلمین کے فائدے پر نظر رکھتے ہوئے اس طرح کی منظوم چیزوں میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ قوت حافظہ کی تربیت غیر ضروری حد تک [illegible] ہے اور دیگر قوائے عقلی کی [illegible] سے محروم رہ جاتے ہیں۔ طلبا کو مطالب کے سمجھے [illegible] کہ کام میں [illegible]

بجائے ان میں مطالب کو طوطے کی طرح حفظ کر لینے کا ملکہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ رٹ لینے کی عادت ہو جاتی ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب کبھی ایسے طلبا کو اپنے حاصل کردہ علم سے عملی زندگی میں کام لینے کے مواقع پیش آتے ہیں تو ان میں اس سے زیادہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ موقع و محل کو دیکھے بغیر حفظ کردہ مقالات کو بلا امکان دُہرا دیں اور اسی پر اکتفا کریں۔ ممکن ہے کہ بعض متعلمین پر اس طرح کا اثر نہ پڑے مگر عام رجحان یقیناً اسی طرف ہوگا۔ اس اعتبار سے تعلیمی دنیا میں اس قسم کی منظوم چیزوں کے رواج کا کم ہونا فال نیک ہے۔

لیکن قطع نظر اس سے کہ اس طرح کی منظوم چیزیں دماغی تربیت کے لئے بڑی حد تک مضرت رساں ہیں نظم کا ان اغراض میں استعمال کرنا فی نفسہ نظم کا غلط اور بیجا استعمال ہے۔ نظم کی زبان جذبات کی ترجمان ہے نظم کی ابتدا ہی جذبات کے برانگیختہ ہونے سے ہوتی ہے۔ نظم اگر صحیح معنوں میں نظم ہے تو اسکا تعلق بطور کلی جذبات سے ہونا لازمی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ جذبات کا اظہار محض نظم ہی میں ہو۔ اسکا امکان نثر میں بھی ہے۔ اور اس نکتہ پر آگے چل کر بحث کی جائیگی۔ لیکن یہ بہر حال لازمی ہے کہ نظم کی ابتدا جذبات کے ہیجان میں آنے سے ہو۔ ورنہ نظم محض سطحی معنوں میں نظم ہے۔ اس میں وہ جوہر موجود نہیں ہو سکتا جسکی موجودگی نظم کا حقیقی طرۂ امتیاز ہے۔ ردیف، قافیہ، بحر اور وزن کی پابندی نظم کا ایک جزو ہے مگر بہ اعتبار اہمیت ثانوی چیز ہے۔ علم عروض کی باریکیوں سے ماہر ہو کر شعر سازی کے مشغلہ کا نام شاعری نہیں ہو سکتا۔ اگر محض صاف ستھرے اور منجھے ہوئے اشعار نظم کرنے میں شاعری کا کمال ہوتا تو الگزینڈر پوپ یقیناً آج انگلستان کا سب سے بڑا شاعر مانا جاتا۔ اس لئے کہ اس نے اس فن کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ اور اسی طرح اردو میں ناسخ اور امیر مینائی شعرا کی صف اول میں جگہ پانے کے مستحق ہوتے مگر ایسا نہیں ہے۔ اور اسکی وجہ یہی ہے کہ قوائے عقلی کے زور سے کام لیکر شعر سازی تو ہو سکتی ہے مگر وہ چیز پیدا نہیں ہو سکتی جس پر حقیقی معنوں میں شاعری کا اطلاق ہو سکے۔ مثلاً علم عروض کی شرائط کو پورا کرتے ہوئے

ہاتھی کو بڑا کیا بڑا ہے   ٹٹو کو کھڑا کیا کھڑا ہے
نہر پر چل رہی ہے پن چکی   دھن کی پوری ہے کام کی پکی
رات گزری نور کا تڑکا ہوا   ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا

اور اسی قسم کے بظاہر معنی مگر باطن میں کھوکھلے شعر تو ڈھالے جا سکتے ہیں اور اصطلاحی طور پر انہیں اشعار کہا بھی جا سکتا ہے۔ مگر یہ کون کہیگا کہ اس کا نام شاعری ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ جب تک

دل میں جوش اور جذبات میں طغیانی کا عالم نہ ہو۔ جب تک انسان کے قلب پر ایک "ترنم ریز" کیفیت طاری نہ ہو اس وقت تک حقیقی شاعری ناممکن ہے۔

اسی بنا پر تاریخ، جغرافیہ اور دیگر علمی موضوعات کو نظم کی صورت میں دیکھکر ہم اس بات کے کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ یہ نظم کا بے محل اور غیر مناسب استعمال ہے۔ جہاں مدعا یہ ہو کہ واقعات کی صحیح ترجمانی کی جائے علمی مطالب بلا کم و کاست پیش کئے جائیں اور موضوعات کی حقیقت کا اظہار کیا جائے۔ یا بالفاظ دیگر جہاں اغراض علمی وابستہ ہوں۔ وہاں نثر کا استعمال مناسب ہی نہیں بلکہ ناگزیر ہے علم کا تعلق جذبات سے نہیں بلکہ قوائے عقلی سے ہے علمی مباحث کی زبان نثر ہے۔ بحر، وزن اور قافیہ کی قیود میں مطالب کو اس طرح پیش کرنے کا امکان باقی نہیں رہتا کہ انکے سمجھنے میں کوئی دشواری حائل نہ ہو اور مفہوم میں کسی قسم کی غلط فہمی کا شائبہ باقی نہ رہے فلسفہ ہو یا منطق۔ تاریخ ہو یا جغرافیہ طبیعات ہو یا ہیئت۔ مطالب کا صحیح عنوان سے پیش کرنا اور سمجھنا صرف نثر ہی میں ممکن ہے نظم اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتی۔

اُن عملی دقتوں کے ماسوا جو بحر اور قافیہ وغیرہ کی پابندی سے پیدا ہوتی ہیں علمی مباحث کو منظوم طریقہ پر پیش کرنے میں ایک بڑا نقص یہ بھی ہے کہ وہ ماحول قائم نہیں رہتا جو افکار عقلی اور مباحث علمی کے لئے ناگزیر ہے۔ چونکہ نظم کا تعلق ابتداءً جذبات سے ہے لہذا خیالات پر بھی اس کا اثر پڑنا لازمی ہے جسکی وجہ سے وہ دماغی کیفیت قائم نہیں رہتی جسکی مشاغل علمی میں ضرورت ہے۔ مباحث علمی میں صحیح اور غلط کے فرق سے بحث ہوتی ہے کسی قانون قدرت کی نسبت ہماری پسندیدگی و ناپسندیدگی سے بحث نہیں کی جاتی۔ کوئی یہ نہیں پوچھتا کہ فلاں قانون فطرت خوبصورت ہے یا بدصورت باعث تفریح قلب ہے یا موجب رنج و غم۔ یہاں مقدم سوال یہ نہیں ہے کہ مفہوم کو دلکش پیرایہ میں پیش کیا گیا یا نہیں۔ یہاں مقدم سوال یہ ہے کہ مفہوم صحیح طور پر ادا ہوا یا نہیں۔ یہاں واقعات سے بحث ہوتی ہے نہ کہ جذبات سے۔ علم کا نصب العین حقیقت کا انکشاف ہے اور اسی بنا پر علم یا سائنس کی زبان نثر ہے اور ہونا بھی چاہیئے۔ علمی مباحث اور شاعرانہ تخئیل کے تفاوت کا ذکر کرتے ہوئے حضرت جوش ملیح آبادی نے کیا خوب کہا ہے۔

زخم دل پر تقاضائے فن ایک کیا ستم کرتا ہے تو؟ ۔ کوئی نوک خار سے چھوتا ہے نبض رنگ و بو؟

شاعری دانائی تحقیق و تدقیق کیا حق عام! ۔ برش مقراض کا دیتا ہے زلفوں کو پیام،

فکر کا جس کی حواسِ ظاہری پر ہو مدار ۔ شاعری کے قصرِ ہوشی میں پا سکتا ہے بار

مملکتِ علم میں جذبات کی مداخلت بے ربط و بے محل ہی نہیں بلکہ سم قاتل ہے جن چیزوں کا تعلق قوائے عقلیہ سے ہے ان میں دماغ کا عمل اُن چیزوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے جن کا تعلق جذبات سے ہے۔ اسی وجہ سے اُن لوگوں کا طرزِ عمل قابلِ اعتراض سمجھا جاتا ہے جو خالص علمی مباحث کو بھی شاعرانہ جولانیِ طبع کا آماجگاہ بنانے میں دریغ نہیں کرتے اور ان دونوں چیزوں کو ملا کر ایک ایسا معجون مرکب تیار کر لیتے ہیں جس پر نہ شاعری کا صحیح اطلاق ہو سکتا ہے نہ علمی بحث کا جب یہ معجون پڑھنے والے کے سامنے آتی ہے تو وہ متحیر رہتا ہے کہ اسکے کس حصہ کو عقل و فہم کی محک پر کسے۔ اور کس حصہ کو لکھنے والے کے جذبات کا آئینہ سمجھے۔ اِس قسم کی بدنظمی کا سدِباب صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ علمی مباحث میں شاعرانہ پروازِ خیال اور شاعرانہ طرزِ بیان سے احتراز کیا جائے اور ان میں سے ہر ایک کو اس کے موقع اور محل پر استعمال کیا جائے۔

مطالبِ علمی کی صحیح ترجمانی زبان اُسی وقت کر سکتی ہے جب اس میں الفاظ کا کافی ذخیرہ موجود ہو اور اصطلاحات کا مفہوم معین ہو چکا ہو جب تک ہر ضرورت کے لئے ایک خاص اصطلاح اور ہر لفظ کا ایک مقررہ مفہوم نہیں ہے اس وقت تک زبان علمی مقاصد کی سرانجام دہی میں قاصر رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب سقراط نے اپنے زمانے میں تحصیلِ علم کے ذرائع کی طرف توجہ کی تو اُسے سب سے پہلے اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی کہ الفاظ کے معنی اور اصطلاحوں کے مفہوم کا جائزہ لیا جائے اور انکی صحیح حدود معین کی جائیں۔ یہی ضرورت علمِ منطق کے اُس باب کا موجب ہوئی جسکا تعلق "تعریفات" سے ہے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک کسی زبان میں یہ صفات پیدا نہ ہو جائیں اسکی نثر علمی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتی۔

نثر کا فرضِ اولین مطالب کو بلا کم و کاست، پوری صحت اور وضاحت سے پیش کرنا ہے۔ مگر اس سے یہ مطلب نہیں کہ نثر میں اسلوبِ بیان یا طرزِ تحریر کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا اور اچھی اور بُری نثر میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ بلکہ اسکے برعکس حقیقت امر یہ ہے کہ نثر کا کام مطالب کی صحت برقرار رکھتے ہوئے انھیں بہترین عنوان سے بیان کرنا ہے۔ اس لحاظ سے نثر کی مشکلات دوگونہ ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف تو مفہوم کو کما حقہ ادا کرنا لازم ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسکی بھی ضرورت ہو کہ عبارت سلیس اور

طرزِ بیان جہاں تک ممکن ہو معائب سے پاک رہے۔ ان صفات کی صلاحیت زبان میں مدتوں منجھنے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ ان شرائط کا پورا ہونا بھی منجملہ اُن دیگر وجوہ کے ہے جنکی بنا پر یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ السنۂ عالم میں ایسی نثر کا ارتقا بالعموم نظم کے بعد ہوتا ہے۔ سلاست بیان اور صحت مفہوم ایسی شرطیں ہیں جو بسا اوقات ایک دوسرے سے برسرِ پیکار نظر آتی ہیں۔ انکو ایک ہی وقت میں پورا کرنا فن انشاپردازی میں ملکہ رکھنے کے علاوہ خود زبان میں الفاظ اور اصطلاحات کے ایک اچھے ذخیرہ کا متقضی ہے۔ اُردو میں اس طرح کی نثر کی مثالیں مولانا شبلی، ڈاکٹر نذیر احمد اور سر سید وغیرہ کی تصانیف میں بکثرت موجود ہیں۔

یہاں تک تو نثر محض علمی ضروریات کے پورا کرنے اور مطالب کے پیش کرنے کا ذریعہ ہے۔ مگر نثر کا دامن ان حدود سے زیادہ وسیع اور اس میں اس سے زیادہ بلندی تک پہنچنے کی صلاحیت ہے۔ جیسا بیان کیا جا چکا ہے نظم کا ماحول اور اسکے قیود نظم کو علم کی زبان بننے سے قاصر رکھتے ہیں۔ مگر نثر میں اسکا امکان ہے کہ اُسے جذبات کے اظہار کا ذریعہ بنایا جا سکے۔ اسکی راہ میں ایسی سنگین دشواریاں حائل نہیں ہیں جن کی بنا پر نثر قلب انسانی کے جذبات رنج و غم، حسرت و یاس، فرحت و انبساط کی حامل نہ ہو سکے۔ نثر میں رنگینی پیدا کی جا سکتی ہے، نثر ہنسا بھی سکتی ہے اور رُلا بھی سکتی ہے نثر فطرت کی تصویر کشی بھی کر سکتی ہے اور داستان حسن و عشق کی ترجمان بھی ہو سکتی ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں پہنچ کر نثر ادب لطیف کا جزو اور فنون لطیفہ کی ایک شاخ بن جاتی ہے۔ یہاں اسکا نصب العین مطالب علمی کو بیان کرنا نہیں ہوتا بلکہ وہ آپ ہی اپنی غرض اور آپ ہی اپنا مدعا بن جاتی ہے۔ ایسی نثر کو ہم ابتداً اس لئے نہیں پڑھتے کہ اُس سے ہماری معلومات میں اضافہ ہو۔ بلکہ ہم اُسے اُسی نیت اور اُسی ارادے سے پڑھتے ہیں جس سے ہم فنون لطیفہ کی کسی اور شاخ کی طرف ملتفت ہوتے ہیں۔ اس حالت میں نثر وہی فرائض ادا کرتی ہے جو نظم سے متعلق ہیں یعنی وہ جذبات کی زبان بن جاتی ہے اور دیگر فنون لطیفہ کی طرح اسکی علت غائی بھی جذبات فرحت و انبساط کو پیدا کرنا ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے نثر کو نظم پر ایک گونہ فوقیت حاصل ہے یعنی نظم جب کبھی نثر کے فرائض میں دخیل ہوتی ہے تو نہ اُس میں خود اپنا جوہر حقیقی ہی باقی رہتا ہے اور نہ وہ علمی ضروریات ہی کو کما حقہ پورا کر سکتی ہے۔ مگر نثر ان دونوں مقاصد کے لئے استعمال کی جا سکتی ہے اور ان میں کسی ایک میں بھی اسکا استعمال بے محل نہیں ہوتا
اس قسم کی نثر سے میرا اشارہ اُس نثر کی طرف نہیں ہے جسے مقفی اور مسجع عبارت آرائی کہتے ہیں

اور جس کا کچھ عرصہ پہلے بہت رواج تھا۔ مقفّیٰ اور مسجع عبارت آرائی فی نفسہ کوئی بری چیز نہیں مگر شرط یہ ہے کہ موضوع اور مفہوم بھی ان چیزوں کی ہمنوائی کرتے ہوں۔ اور یہ خیال پیدا نہ ہو کہ یہ عبارت آرائی جذبات کی آمد کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض صنائع و بدائع کے اظہار کے لئے مترتب کی گئی ہے۔ لہٰذا ان خصوصیات سے قطع نظر کرتے ہوئے یہاں مقصود وہ نثر ہے جو مخصوص آلات نظم کو استعمال کئے بغیر شاعرانہ طرز خیال کی حامل اور جذبات کے اظہار کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ اس میں گو بحر اور وزن وغیرہ کی پابندی نہیں ہوتی مگر پھر بھی الفاظ کی مناسبت، مطالب کی ندرت اور طرز بیان کی خوبی ایک پیارا روح پرور ترنم پیدا کر دیتے ہیں جسے علم عروض کی کسی صنف میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر اردو نثر کے قائد اعظم یعنی آزاد مرحوم کے نیرنگ خیال سے دو ایک اقتباسات محض تمثیل کے طور پر پیش کروں۔ ورنہ کون صاحبِ ذوق ہوگا جو نثر کے اس مایۂ ناز انشا پرداز کی تصانیف سے بخوبی آشنا نہ ہو۔ پہلا اقتباس اس مقام سے لیا گیا ہے جہاں آزاد فلک الکلام کے دربار کی تصویر کشی کر رہا ہے اس سلسلے میں آزاد لکھتے ہیں۔

”اوّل علم نے تخت کے سامنے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ اُٹھائے۔ اور چند فقرے ثنائے الٰہی اور دعائے بادشاہی میں اس حسن تاثیر سے ادا فرمائے کہ سب کی آنکھیں آسمان کو لگ گئیں اور سینہ ہائے گرم کے جوش سے محفل میں ایک گونج پیدا ہوئی۔ بعد اس کے ذکاوت آگے بڑھی، زمین خدمت کو بوسہ دیا۔ مگر جب سر اُٹھایا تو چند شعر پڑھ کر ایک تبسم زیر لب کیا۔ کہ گویا ایک چمن بھر زعفران لوگوں پر برسا دی۔ انعام یہ ہوا کہ دونوں عالم بالا کے نام نہادوں میں داخل ہو گئے اور خواجہ خضر نے اپنے مبارک ہاتھ سے آب حیات کا جام بھر کر دیا کہ جب تک آسمان پر چاند سورج کا چاندی سونا ہے تمہارا سکہ روئے زمین پر چلتا رہے ....“

ایک دوسرے موقع پر ”گلشن اُمید کی بہار“ کا منظر دکھایا جا رہا ہے اور فطرت کی تصویر کشی کی جا رہی ہے۔ اس مقام سے بھی صرف چند سطریں ناظرین کی خدمت میں پیش کئے دیتا ہوں۔ خالی از لطف نہ ہوگا۔

”دیکھتا ہوں کہ ایک باغ نو بہار میں ہوں جس کی وسعت کی انتہا نہیں، امید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے۔ آس پاس سے لیکر جہاں تک نظر کام کرتی ہے تمام عالم رنگین و شاداب ہے۔ ہر چمن رنگت روپ کی دھوپ سے چمکتا، خوشبو سے مہکتا، ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے۔ زمین فصل بہار کی طرح گلہائے گوناگوں سے گلپوش ہو رہی ہے اور زنگار رنگ کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں۔ یہ سماں بہار کا دیکھ کر دل پر ایک

عجب عالم طاری ہوا کہ سرتاپا محو ہوگیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو اُن چمن ہائے دلکشا کو نظر غور سے دیکھنے لگا۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف زیادہ ہو۔ پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دُور آگے رنگیلے چمکیلے پھول کھلے ہیں۔ آب لال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جھلمل جھلمل کررہے ہیں۔ اونچے اونچے درخت جھُنڈ کے جھُنڈ چھائے ہوئے ہیں جو جانور دھیمی آواز سے بولتے سُنائی دیتے تھے یہاں خوب زور شور سے چہکار رہے ہیں۔ چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں اور پھول اپنی خوشبو سے مہک پھیلاتے ہیں ...."

یہ دو اقتباسات ہی اسکا کافی ثبوت ہیں کہ کسی قادر الکلام اہل قلم کے ہاتھ میں آکر نثر کا پایہ کس بلندی تک پہنچ سکتا ہے اور وہ کیا کچھ کرسکتی ہے۔ تصویر کشی بھی ہے۔ ترنم بھی، نزاکت خیال بھی ہے اور حسن بیان بھی۔

اسکے بعد اس سے کچھ مختلف پیرایہ کی نثر کا ایک مختصر نمونہ اس بات کے اظہار میں پیش کرتا ہوں کہ شاعر کی واقعہ نگاری کی طرح اعلیٰ درجہ کی نثر کی واقعہ نگاری بھی بیان کرنے والے کے جذبات کی مظہر ہوتی ہے۔ چند الفاظ میں ایک دلفریب منظر پیش نظر ہو جاتا ہے اور متحرک تصویروں کے پردہ کی طرح اس منظر کی مختلف کیفیتیں یکے بعد دیگرے چشم باطن کے سامنے آنے لگتی ہیں۔ اس اقتباس کا ماخذ میرے دوست حسینی صاحب کا افسانہ "سکھی" ہے۔

"جب گھڑا پانی سے بھر چکا تو دونوں نے ایک ساتھ مل کر کھینچنا شروع کیا۔ دو سرو قد ایک ساتھ جھکتے۔ دو نازک ہاتھ ایک ساتھ بڑھتے۔ دو بار ور شاخیں ایک ساتھ سیدھی ہوتی تھیں۔ "ڈور" "گراری" پر سانپ کی طرح دوڑتی اور رک جاتی۔ پھر کلائیاں لچکتیں۔ پھر چوڑیاں بجتیں۔ پھر سر جھکتے۔ پھر گرفت مضبوط ہوتی اور پھر گھڑا ایک ہاتھ اوپر آجاتا۔ عجب دلکش منظر تھا۔ دُور سے دیکھنے والا ہوا میں اڑتی ہوئی ساریوں کو دیکھتا۔ لہراتی ہوئی زلفوں کو دیکھتا اور بیساختہ گنگنانے لگتا لیکن وہ اس خوشی کا اندازہ کسی طرح نہ کرسکتا تھا جو ان دونوں "سکھیوں" کے دلوں میں بھری پڑی تھی۔"

حقیقت یہ ہے کہ جب نثر اس رفعت پر پہونچ جاتی ہے اور اسکے ہر لفظ میں جذبات کو ابھارنے اور ایک محویت کا عالم پیدا کرنے کی قوت ہوجاتی ہے تو نثر اور نظم کا فرق اٹھ جاتا ہے اور دونوں ایک ہی قسم کی خدمات بجا لانے لگتی ہیں۔ اس سے میرا مقصد نہیں کہ نظم اور نثر دو جداگانہ چیزیں نہیں ہیں۔ بلاشبہ

یہ دو علیحدہ چیزیں ہیں اور انھیں ایک ہی صنف میں جمع کر دینے سے کوئی خاص فائدہ مترتب نہیں ہو سکتا۔ موزونیت کلام ایک شے واقعی ہے جسکے وجود سے انکار ممکن نہیں۔ اگر نظم کی اصطلاح کو بحر اور قافیہ وغیرہ کی قیود سے آزاد کرکے نثر کو بھی اسکے مفہوم میں شامل کر لیا جائے تو بھی اس حقیقت کا اعتراف لازمی ہوگا کہ انسان اپنے عالم باطن کا اظہار دو طریقوں پر کرتا ہے۔ ایک وہ جسمیں موزونیت کی صفت موجود ہو اور دوسرا وہ طریقہ جو موزونیت کی شرائط سے آزاد ہو۔ ایسی حالت میں نظم اور نثر کے امتیازی فرق کو برطرف کرنے کی کوششیں سطحی حدود سے آگے نہیں بڑھ سکتیں اور نہ اُن سے کوئی مفید نتیجہ برآمد ہوگا۔ بلکہ مروجہ اصطلاحات میں محض ایک غیر ضروری ابہام واقع ہو جائیگا۔ جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں اس سے میرا مدعا کسی ایسے نظریہ کی تائید نہیں ہے۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ نظم کے علاوہ نثر بھی جذبات کے اظہار کا ذریعہ ہو سکتی ہے یا بالفاظ دیگر نثر میں بھی وہ خصوصیات پیدا کی جا سکتی ہیں جو فی الحقیقت شاعری کا جوہر یا شاعری کی روح کہلانے کی مستحق ہیں۔ ایسا کیوں ہے۔ صرف اس لئے کہ شاعری محض اشعار موزوں کرنے کے ملکہ کا نام نہیں ہے۔ بلکہ اُس مخصوص طرز خیال اور اُن خصوصیات باطنی کا نام ہے جو حقیقی شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں۔

اِس مقام پر یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس امر کی بھی وضاحت کر دیں کہ جب ہم کسی شخص کی نسبت یہ کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہے تو اس سے ہمارا حقیقی مفہوم کیا ہوتا ہے۔ یہ کہنا تو محض ایک سطحی سی بات ہوگی کہ شاعر سے مراد وہ شخص ہے جو اشعار موزوں کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اس بات کے کہنے سے شاعر کی مخصوص ذہنیت یا اسکے عالم باطن پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ جس شخص کو ہم شاعر کے لقب سے یاد کرتے ہیں اسکے اور عام لوگوں کے نقطۂ نظر میں کیا نمایاں فرق ہوتا ہے۔ اس سے ہم کس قسم کے خیالات کی توقع رکھتے ہیں اور اسکی دنیائے باطن کی نسبت ہمارا نظریہ کیا ہے۔

ان سوالات کا مختصر جواب غالبًا یہ ہوگا کہ شاعر وہ ہے جسکے خیالات اسکے جذبات کے تابع ہوں یا جسکی ذہنیت میں جذبات کا عنصر غالب ہو۔ وہ دُنیا کی چیزوں کو ایک نئی روشنی میں دیکھتا ہو۔ وہ محض موجودات سے بحث نہ کرتا ہو، بلکہ اُسکی نظر ایک ایسے "آئیڈیل" پر ہو جسکے موجود ہونے کا وہ خواہشمند ہے۔ اسکی چشم باطن کے سامنے ایک ایسا عالم خیال ہو جو موجودات کی دنیا سے کہیں بہتر ہو اور جو ان تمام معائب سے پاک ہو جنہیں واقعات کی دنیا میں دیکھ کر اسکے جذبات کو صدمہ پہنچتا ہے اور اسکے قلب کو ٹھیس لگتی ہے

یہ لازم نہیں کہ ایسی دنیا کا ایک مکمل نقشہ ہر وقت اسکی چشم باطن کے سامنے موجود رہے نہیں وہ اس دنیا کو بحیثیت مجموعی شاید کبھی بھی نہیں دیکھتا۔ بلکہ جب اسکے جذبات متحرک ہوتے ہیں تو موقع موقع سے اس دنیائے خیال کے مختلف پہلو یا اجزا اسکے پیش نظر ہوتے رہتے ہیں اور وہ اپنے کلام میں ان کی تصویر کشی کرتا رہتا ہے۔ واقعات سے متاثر ہونا اسکا ثبوت ہے کہ وہ اُن سے بطور کلی مطمئن نہیں ہے۔ بلکہ اُن سے بہتر کسی چیز کا تخیل اُسکے دل میں موجود ہے۔

یہ بھی لازمی نہیں کہ وہ ہمیشہ فطرت سے غیر مطمئن ہوکر اس طرح کی خیالی تصاویر ہی پیش کرتا ہے جب اسکا دل چاہتا ہے یا اسکے جذبات متاثر ہوتے ہیں تو وہ فطرت کی تصویر کشی بھی کرتا ہے۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ اسکا مدعا ان چیزوں کی حقیقت یا ماہیت کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ ان چیزوں کو وہ اس روشنی میں پیش کرتا ہے جس میں خود انھیں اس نے دیکھا ہے۔ مثال کے طور پر اُردو کے مایۂ ناز شاعر چکبست کی "سیر دیرہ دون" دیکھیے۔ وہ دیرہ دون کی تصویر کشی کرکے اپنے تاثرات یوں بیان کرتے ہیں۔

"یہ راگ مجھ میں سمایا سرور بنکے ہو کر — ہوس تھی روح کو مل جائے اسمیں لے ہو کر
حریم خاص میں قدرت کی باریابی تھی — نگاہ شوق میں اک شان بے حجابی تھی
نشست سنگ پہ تھی سایۂ شجر کے تلے — رواں تھا چشمۂ آب خنک نظر کے تلے
شریک حال تھی وضع قدیم قدرت کی — عیاں تھی سنگ و شجر سے کشش محبت کی
شراب حسن حقیقی سے تھا ہر اک سرشار — شجر تھا کوہ تھا چشمہ تھا یا یہ مشت غبار
درخت و کوہ میں کیا ذات پاک انساں کیا — طیور کیا ہیں ہوا کیا ہے ابر و باراں کیا
یہ موج ہستی بیدار کے عناصر ہیں — سب ایک قافلۂ شوق کے مسافر ہیں
یہ دل کے ٹکڑے ہیں قصر سخن کے ان میں بیر نہیں — سب ایک گود کے پالے ہیں کوئی غیر نہیں
انھیں علاقۂ قدرت ہو اوج ہستی ہیں — سب ایک ساز کے پردے ہیں بزم ہستی میں
جدا کسی سے کسی ہستی کا اپنا راز نہیں — کچھ آبشار میں اور ہم میں امتیاز نہیں
ہے جسم خاک یہاں اُسکا جسم پانی ہے — جو اوج ہم میں ہے اُسمیں وہی روانی ہے۔"

مختصر یہ کہ واقعات ہوں یا مناظر فطرت۔ حسن و عشق کی داستانیں ہوں یا کشت و خون کے افسانے جو کچھ بھی اسکی زبان سے نکلتا ہے وہ اسکے خیالات و جذبات کا رنگ لیکر نکلتا ہے۔ وہ واقعہ نگاری نہیں کرتا

بلکہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اسکے مشاہدات نے اسکے قلب پر کس طرح سے اثرات پیدا کئے۔ اسکی زبان کسکے افکار عقلی کی ترجمان نہیں ہوتی بلکہ اسکے جذبات کا آئینہ ہوتی ہے۔ اسے کسی مدلل انبساط مگر عشاک فلسفۂ حیات کی ترویج سے بحث نہیں ہوتی" فلسفہ عقل کا بیان ہے اور شاعری جذبات کی زبان ہے فلسفہ کو جو رشتہ دماغ سے ہے شاعری کو وہی تعلق دل سے ہے۔ فلسفی کا قول اگر کسی واقعے کا بیان ہوتا ہے تو بیان واقعہ ہی اسکا اصلی مقصود ہوتا ہے لیکن شاعر جب کوئی واقعہ بیان کرتا ہے تو بیانِ واقعہ اس کا مقصود اصلی نہیں ہوتا بلکہ وہ جذبات جو اس واقعے کے ساتھ وابستہ ہیں یا وہ اثر جو اس واقعے سے دل پر پڑتا ہے[1]

اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ شاعر کے نتائج افکار کو پڑھتے ہیں وہ اُسی وقت پورے طور پر ان سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں جب اسی طرح کے جذبات خود ان کے دلوں میں بھی موج زن ہوں۔ اسکی مصوری کی صحیح تنقید اسی نقطۂ نظر سے ممکن ہے جس نقطۂ نظر سے اس نے تصویر کشی کی ہے۔ ورنہ تصویر نامکمل، ناقص یا مبالغہ آمیز نظر آئیگی۔ اسی نکتہ کو سودا نے اپنے ایک شعر میں اس طرح سے ادا کیا ہے۔

"سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ   کیا جانئے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا"

اسی حقیقت کا اظہار جوش نے ایک "نعرۂ رندانہ" میں یوں کیا ہے۔

"عشق سے مست ہیں مجھے ساغر ہوش سے غرض   ترک سیاہ چشم کو سرمہ فروش سے غرض"
"آپ کو حسِ خیر و شر، آپ کو حبِ مال و زر   آپ جنوں سے بے خبر آپ کو جوش سے غرض!"

شاعر کے عالم باطن کی حقیقت پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ایمرسن کہتا ہے۔

"حقیقی شاعر کے علامات و شواہد یہ ہیں کہ اسکی زبان اُن حقائق کی ترجمان ہو جن کو اس سے قبل کسی نے بیان نہیں کیا۔ شاعر اور صرف شاعر ہی سچا اور حاذق حکیم ہے۔ وہ حقیقت آشنا اور حقیقت کا ترجمان ہے۔ وہ ایک مخبر صادق ہے۔ اس لئے کہ جن مشاہدات کو وہ بیان کرتا ہے اُن کو اُس نے بچشم خود دیکھا ہے۔ وہ فطرت کا محرم راز ہے۔ اس نے دنیائے خیال کا مشاہدہ کیا ہے۔ اور وہ کارخانۂ ازل کے حقائق و تجلیات ابدی کی داستان سناتا ہے۔ اس لئے کہ یہاں اُن لوگوں کا ذکر نہیں جو چھوٹے اشعار موزوں کرنے کی استعداد اور بحور و قوافی میں مہارت پیدا کرلی ہے۔ بلکہ یہاں حقیقی شاعر کی ذات سے بحث ہے"

---

[1] ہماری شاعری صفحہ ۱۴۔ مصنفہ پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی

اسی مضمون میں کچھ آگے چل کر ایرسن کا قول ہے کہ

"شعر کی تخلیق بحر اور وزن کی بدولت نہیں ہوتی۔ بلکہ کوئی موزونیت آفریں موضوع اسکا موجب تخلیق ہوتا ہے۔ شاعر کے قلب میں ایک جوش اور حیات بخش خیال رونما ہوتا ہے جو نباتات وحیوانات کی طرح اپنے نظام فطری کو اپنے ہی دامن میں لیکر آتا ہے اور نشو ونما پاکر مرقع فطرت پر ایک یادگار نقش کا ذریعہ بنجاتا ہے"

یا بقول اقبال

"سینۂ شاعر تجلی زار حسن　　　　خیزد از سینائے او انوار حسن
از نگاہش خوب گردد خوب تر　　　　فطرت از افسون او محبوب تر
از دمش بلبل نوا آموخت است　　　　غازہ اش رخسار گل افروخت است
سوز او اندر دل پروانہ ہا　　　　عشق را رنگیں ازو افسانہ ہا
بحر و بر پوشیدہ در آب و گلش　　　　صد جہان تازہ مضمر در دلش
در دماغش نادمیدہ لالہ ہا　　　　ناشنیدہ نغمہ ہا ہم نالہ ہا
فکر او با ماہ و انجم ہمنشیں　　　　زشت را نا آشنا خوب آفریں

حقیقی شاعر کے خصوصیات امتیازی کی یہ داستان ارادے اور منشار سے زیادہ طویل ہوئی جاتی ہے مگر موضوع کی اہمیت اور وسعت کے اعتبار سے جو کچھ کہا گیا وہ بحر میں قطرہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتا تاہم جو اقوال یہاں نقل کئے گئے اور جن چیزوں کی طرف قارئین کی توجہ منعطف کرائی گئی ہے۔ اُن سب کا ماحصل یہ نکلتا ہے کہ شاعر کے عالم باطن میں جذبات کا پایہ عقلیات پر غالب رہتا ہے۔ اسکے حیات عام افراد عالم کے حیات سے کہیں زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ اس کا قلب اوروں کے قلب کی نسبت کہیں زیادہ نازک اور اثر پذیر ہوتا ہے۔ اسکی رگوں میں ایک غیر معمولی دوران خون اور اُسکے کلام میں ایک نئی طرح کی گرمی ہوتی ہے۔ اسکی ذہنیت منطقیوں اور فلسفیوں سے نرالی اور اُسکا نقطہ نظر سب سے جداگانہ ہوتا ہے جس دل میں ایسے جذبات موجود ہوں۔ جسکے کلام میں اس طرح کی خصوصیات کا اظہار ہو وہ شاعر کہے جانے کا مستحق ہے اور اُسکے نتائج فکری کا نام شاعری ہے۔

ان شرائط کے پورا ہونے اور ان صفات سے متصف ہونے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ایسا شخص اپنے جذبات کا اظہار کرے تو اسکی زبان صرف نظم ہی ہوگی یا نثر بھی ہو سکتی ہے؟ اس بارے میں

ہمارا عقیدہ تو یہ ہے کہ اگر کسی شخص کی دنیائے خیال میں جذبات کی شمع روشن ہے اور اسکے قلب میں وہ چیز موجود ہے جسے کوئی معرفت کہتا ہے کوئی جنون - کوئی حقیقت شناسی سمجھتا ہے اور کوئی وارفتگی بے خبری - کوئی الہام کہکر اسکی عزت افزائی کرتا ہے اور کوئی مجذوب کی بڑ کہکر اسکی تضحیک کرتا ہے غرض، اگر اسکے عالم داخلی میں یہ چیزیں موجود ہیں تو اسکے یہاں شاعری کی مقدم اور امتیازی خصوصیات موجود ہیں - اسکے بعد یہ محض ایک ثانوی بات ہے کہ وہ اپنے جذبات کو نظم کی صورت میں پیش کریگا، یا نثر میں کسی عام کلیہ کی بنا پر اسکی تعین نہیں کی جا سکتی کہ اظہار خیال کی ان دو شاہراہوں میں سے وہ کس راہ پر گامزن ہوگا - اسکے فیصلہ کا انحصار اسکے انفرادی رجحان طبع، عنوان تعلیم تربیت اور ماحول کے اثرات پر منحصر ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ فنون لطیفہ کی ان دو شاخوں میں سے جو بھی انفرادی حیثیت سے اسکے لئے زیادہ موزوں اور فطری ثابت ہوگی - اسکے عالم خیال کی خصوصیات اس میں نمایاں رہینگی - اگر وہ نثر کو اپنے جذبات کا ترجمان بنائیگا تو اسکی نثر میں بھی فطرت کی تصویر کشی، جذبات کا تجزیہ اور ترنم کی لہریں موجود ہونگی - اس لئے کہ ترنم محض نظم ہی تک محدود نہیں ہے اور محض ترنم موزونیت کلام کا مرادف نہیں ہے بلکہ جیسا کہ مذکورہ مثالوں سے واضح ہوتا ہے - یہ صفت نثر کی بھی ہو سکتی ہے -

شاید یہ کہا جائے کہ کلام میں ترنم کی صفت کا موجود ہونا کلام کو نثر کے حدود سے باہر لے جا کر نظم ہی کی ایک صنف بنا دیتا ہے - تو اسکے جواب میں پھر وہی نظم اور نثر کے امتیازی فرق کی بحث چھڑ جائیگی اور یہ سوال پیدا ہو جائیگا کہ آیا نظم کے لئے (کم از کم) بحر اور وزن کی شرطیں لازمی ہیں یا نہیں ہم اسکے متعلق اپنا نظریہ بیان کر چکے اور ہمیں اس وقت اس بحث میں پڑنے کی ضرورت بھی نہیں ہے - اس لئے کہ یہاں مدعا صرف اس قدر ہے کہ جسے بالعموم نثر کہا جاتا ہے اور جسمیں وزن اور بحر کی قید نہیں ہوتی اس میں بھی ترنم موجود ہو سکتا ہے - اب یہ بات کہ ایسی نثر کے لئے صحیح اصطلاح کیا ہونا چاہیے - ایک ایسا سوال ہے جہاں اختلاف سائے ہو سکتا ہے بعض انشا پردازوں کے نزدیک سے شاعرانہ نثر کہنا زیادہ مناسب ہے ہمیں اس اصطلاح سے کوئی مخالفت نہیں - شاعرانہ نثر بہرحال نثر ہی کی ایک صنف رہتی ہے اور اس اصطلاح سے مفہوم کی خاصی وضاحت ہونے کے علاوہ اسکا اظہار کھلے الفاظ میں ہو جاتا ہے کہ شاعرانہ انداز خیال اور شاعرانہ اسلوب بیان کے لئے نظم کی شرط لازمی یا ناگزیر نہیں ہے -

اس بحث کا مدعا نظم کی منقصت نہیں ہے - بلکہ ہمیں اسکے اعتراف میں بھی تامل نہیں کہ شاعرانہ

جذبات کے اظہار میں نظم بہ نسبت نثر کے زیادہ متاثر اور بامحل ہے۔ ہمارا مقصد تو صرف اس قدر ہے کہ نثر بھی ادب لطیف کا ایک جزو ہے۔ اس کا شمار بھی فنون لطیفہ میں ہے۔ اسے بھی جذبات کا ترجمان بنایا جا سکتا ہے اور انھیں وجوہ سے وہ اس سے زیادہ توجہ کی مستحق ہے جو بالعموم اسکی طرف کی جاتی ہے۔ اُردو ادب کے موجودہ رجحان کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نثر ایک حد تک ثانوی اور حقیر چیز سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ اسکے حدود بہت وسیع اور اس میں ترقی کی بہت گنجائش ہے۔ اگر بنظر غور دیکھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ اعلیٰ درجہ کی پُرلطف اور فرحت بخش نثر کے لکھنے والوں کی تعداد ہمارے یہاں بہت زیادہ نہیں ہے۔ اس انحطاط کی دو خاص وجہیں نظر آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ نثر نگاری اور انشا پردازی کے ماہرین فن کی خدمات اُس عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتیں جس کی وہ مستحق ہیں اور غالباً اسی وجہ سے بیشتر صاحبان قلم اس طرف توجہ کرنا خلاف شان سمجھتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ اس طرح کی نثر کا لکھنا ایسا سہل نہیں ہے جیسا بالعموم اُسے سمجھا جاتا ہے۔ نثر لکھنا تو بہت آسان ہے مگر نثر کو ادب لطیف کے پایہ تک پہنچانا بہت دشوار ہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لئے کہ بسا اوقات انھیں چیزوں میں کمال حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے جنھیں بظاہر آسان سمجھا جاتا ہے۔ ٹوٹی پھوٹی، بُری بھلی نثر ہر پڑھا لکھا شخص لکھ لیتا ہے اور اپنا مطلب ادا کر لیتا ہے۔ اس حد تک پہنچکر وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اُسے نثر لکھنا آگیا۔ اسکے بعد اسکی نگاہ میں نثر اس قابل نہیں ٹھہرتی کہ وہ آگے بڑھنے کو اپنا فرض خیال کرے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھدے قسم کی نثر سے ابتدا کرتا ہے اور اسی منزل پر اسکی استعداد کی انتہا بھی ہو جاتی ہے

نثر کی طرف سے کم التفاتی کا ثبوت اُن ناقدانہ مضامین اور تبصروں سے بھی مل سکتا ہے جو اُردو کے ادبی رسائل میں بکثرت شائع ہوتے رہتے ہیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ محض نثر پر قلم تنقید اُٹھانا ناقدین ادب کے نزدیک کسر شان کا موجب یا کم از کم روکھا پھیکا مشغلہ ہے۔ بہت کم ایسے مضامین دیکھنے میں آتے ہیں جن میں نثر سے بحیثیت ایک فن لطیف کے بحث کی جاتی ہو اور اُس کے خصوصیات و نکات کو واضح کر کے اس فن میں کمال رکھنے والوں کی حقیقی قدر و منزلت کا اظہار کیا جاتا ہو۔ ممکن ہے کہ اس کم توجہی میں کچھ دخل اس دقت نظر کو بھی ہو جس کی اس کام کے لئے ضرورت ہے۔ نظم کی تنقید کا دائرہ بہت وسیع ہے اور ناقد کو کوئی نہ کوئی گوشہ حسب خواہش مل ہی جاتا ہے۔ اشعار کی تشریح اور تاویل میں ناقد کی ذات کو بہت کچھ دخل رہتا ہے۔ مگر نثر میں اسکے مواقع کم ملتے ہیں جس طرح

بلند پایہ نثر کا لکھنا مشکل کام ہے اسی طرح اس کے محاسن کا تجزیہ بھی دقت طلب ہے۔ شاید یہ بھی ایک وجہ ہے جسکی بنا پر تصانیف نثر کی تنقید کا یہ پہلو اکثر یا تو قطعی نظر انداز کردیا جاتا ہے یا محض ایک سرسری نظر کا حق دار سمجھا جاتا ہے۔

ایسی حالت میں ادب اُردو کی سربرآوردہ ہستیوں اور ممتاز شخصیتوں سے یہ التجا بے محل نہ ہوگی کہ یہ حضرات نثر کی طرف بھی اسی قدر توجہ مبذول فرمائیں جتنی نظم کی طرف توجہ کی جاتی ہے تاکہ اُردو رسائل اور اُردو تصانیف میں ادبی نثر کا پایہ موجودہ حالت سے زیادہ بلند ہوجائے اور نثر کی مملکت میں وہ ستم آرائیاں دیکھنے میں نہ آئیں جو آج کل بلا روک ٹوک برتی جاتی ہیں۔ اگر اس طرف توجہ نہ کی گئی تو یقین ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اُن مضامین کی تعداد جو اُردو نثر کے چہرہ پر بدنما داغوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور جو بہر صورت خاصی تعداد میں شایع ہوتے رہتے ہیں خطرناک حدود تک پہنچ جائیگی۔ اور بادی النظر میں یہ محسوس ہونے لگیگا کہ اُردو نثر میں مفہوم کو کسی نہ کسی طریقہ پر ادا کرلینا کافی ہے اور اس سے بلند تر کوئی اور منزل نہیں ہے۔



SIR SULTAN AHMAD, Kt., D.L.

غزل

حضرت میرزا ثاقب لکھنوی

بہا میرا لہو، ہے سبز کشتِ آسماں پھر بھی — مٹا میں اور برہم ہے مزاجِ باغباں پھر بھی
قفس میں نغمۂ طرب کہاں، میں تو یہ کہتا تھا — کوئی بتلا کے دیکھونگا بہارِ بوستاں پھر بھی
نہیں معلوم کیا دلچسپیاں ہیں صحنِ عالم میں — اُٹھایا جا رہا ہوں میں، مگر ہوں میہماں پھر بھی
جو تھے طبل و علم والے پتہ اُنکا نہیں ملتا — ہماری بے نشانی کا تو باقی ہے نشاں پھر بھی
اُجڑ جائے نشیمن آج اس کا غم نہیں مجھ کو — چمن کی خیر ہو بن جائیگا کل آشیاں پھر بھی
کوئی ہنگامِ صبحِ وصل سمجھا دے موذن کو — شبِ وصلت کہاں آ جائیگا وقتِ اذاں پھر بھی
شناسائی دل گم ہے تو کیا صورت نمائی میں — ہزاروں بار دیکھا بھولتا ہے پاسباں پھر بھی
وہ، جو آگے گئے آنکھوں سے اوجھل ہو نہیں سکتے — بہت مُنہ دھو چکا، آگے ہے گردِ کارواں پھر بھی
خود اپنے آنسوؤں میں ڈوب جا یہ فرضِ الفت ہے، — اُبھر آئیگی اک دن کشتیِ عمرِ رواں پھر بھی
کہیں مجھ سے زیادہ میرا دشمن مبتلا نکلا — مری گردش مٹی لیکن نہ ٹھہرا آسماں پھر بھی
نہ ہونا اور ہونا ایک تھا چشمِ عداوت میں — نگاہوں میں کھٹکتا ہی مقامِ آشیاں پھر بھی
جو روتوں کو ہنساتا تھا جو سوتوں کو جگاتا تھا — کبھی گزریگا یارب اس طرف وہ کارواں پھر بھی
چمن تھا دو جزوں کا نام یعنی ایک گل اک میں — کھلا میری اسیری سے کہ آئیگی خزاں پھر بھی
نہ سمجھے ہم کہ ہم سے نامرادوں کی نمائش پر — محلِ آرزو کیونکر ہے بازارِ جہاں پھر بھی

متاعِ فہم ہے کمیاب اہلِ دہر میں ثاقب
مگر مل جائینگے محفل میں تیرے قدرداں پھر بھی

پیا کی جوگن

جناب علی عباس حسینی صاحب ایم اے

البیلی واقعی البیلی ہی تھی۔ اسکی صورت میں لربائی، اسکی آواز میں ترنم، اسکی آنکھوں میں لگاوٹ اور اسکی اداؤں میں مستی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ سڈول جسم تھا، صبیح و ملیح رنگ، اُٹھتی جوانی، پھر "بائی جی" سی ماں کی تربیت و تعلیم۔ اب بھلا کافرماجرائیوں اور عشوہ آفرینیوں میں کہاں سے کمی ہوتی؟۔ جس وقت وہ محفل رقص و سرود میں اپنی نازک کمر لچکاتی ہوئی آتی اور سازندوں کے ساتھ تال اور سُر ملاکر گاتی تھی تو سامعین کو اسکی ہر تان شراب کے حوضوں میں غوطہ دیتی اور ہر ادا سرشاری و مدہوشی کے چشموں میں ڈبوتی تھی۔ اور جب وہ سادی گلابی ساری پہنے، ستار ہاتھ میں لئے، زلف جھٹکائے اپنے طور پر بیٹھی کوئی ہندی بھاکی چیز گنگناتی تھی تو سننے والوں کو یہ محسوس ہوتا تھا کہ تار پر انگلیاں نہیں دوڑ رہی ہیں بلکہ کائنات کے رشتۂ حیات پر اور بلوری حلق و دہن سے آواز نہیں نکلتی بلکہ تخلیق کے ساز سے!۔

مگر اعجوبہ بات یہ تھی کہ اسطرح کے پیشہ ور خاندان میں پیدا ہونے کے باوجود اور اس طرح کے حُسن اور ایسی آواز کی مالکہ ہونے کے ساتھ البیلی عشاق سے گریزاں اور صنف کور سے متنفر تھی۔ اسکی ماں "بائی جی" کے پاس اسکی زندگی بھر سیکڑوں رئیسوں کے پیام آئے مگر فن موسیقی میں غرق البیلی نے ماں کی منتوں اور عشاق کی فریادوں کو ہمیشہ ٹھکرایا۔ وہ دنیا کی سب سے بڑی مغنیہ اور رقاصہ بننا چاہتی تھی۔ فن کی تکمیل کے صنفی تعلقات دشمن ہیں۔ عورت ان میں سے صرف ایک کی ہو کر رہ سکتی ہے۔ اس لئے البیلی وہ برق تھی جو خرمن عقل و خرد کو جلاتی ہے مگر خود نہیں جلتی اور وہ فولاد جو دوسروں کو کاٹتا ہے مگر خود نہیں کٹتا۔

اس رعنائی و شباب کے مجسمہ اور حسن و جذبات کے منجمد پیکر کا شہرہ دُور دُور پھیلا جس نے اس کی

کافرادائیاں مشہور ہوئیں اتنی ہی عشاق اور دیوانوں میں بھی زیادتی ہوتی تھی۔ دیدار کا اشتیاق اور قسمت آزمانے کا خیال ہر ایک کو کھینچ لاتا تھا۔ وہ مجروں میں بھی بلائی جاتی تھی مخصوص اسکے لئے بزم رقص و سرود بھی رچائی جاتی تھی اور اسکا سرنام "تماشا" بھی کیا جاتا تھا۔ مگر اسکی غلط انداز نگاہیں نہ کسی کی آہ کی پروا کرتیں اور نہ "واہ" کی۔ کسی نے اس سے ایک بار پوچھا "تم کو اپنے بسمل پروانوں کو دیکھ کر رحم نہیں آتا؟"۔ وہ نہایت بے باکی سے بولی "نہیں تو! کیوں آئے؟ پروانوں کا جلنا ہی شمع کو صاعقہ طور بناتا ہے! میں مغنیہ اور رقاصہ ہوں، میری شہرت تمہارے بسمل ہی رہنے میں ہے"۔

اس طرح کے سنگدل کی بزم میں مُمن صاحب سے "چہل سالہ" شخص کا کہاں گزر تھا؟ ریاست و امارت نے انکے خداداد مردانہ حسن کو اب تک باقی ضرور رکھا تھا۔ گر پھر بھی دنیا جانتی تھی کہ جوان بیٹا ہے، اور بیس برس سے پہلو میں لگی ہوئی بیوی۔ لیکن مُمن صاحب نے علی بہادر کی زبانی اس فتنے کا ذکر سنتے ہی بیوی اور لڑکے کے وجود کو فراموش کر دیا۔ تخئیل نے ایک صورت قائم کی، اور جذبات نے ابھر ابھر کر پیار سے دیکھنا شروع کیا۔ صنم پرستی کی ہوس نے دل میں گداز پیدا کر دیا۔ اور زیارت کے شوق اور دید کے ذوق کے وہ گرفتار ہوئے۔ بالآخر علی بہادر کو ساتھ لے کر اس محلے اور اس گلی میں پہونچے جہاں وہ آفت جان رہتی تھی۔ سامنے جھروکے میں وہ برق وش شرار رچاتی نظر آئی۔ وہیں گلی میں کھڑے ہو گئے۔ نہ تو بغل میں جو خاصا عمیق نالا تھا اُسکا خیال رہا اور نہ اسکا کہ دیکھنے والے کیا کہیں گے۔

وہ اسی طرح مدہوش و بیخود نظارۂ جمال میں مشغول تھے کہ دفعتہً بھینسوں کا ایک گروہ اُچھلتا پھاندتا اُس طرف سے نکلا۔ مُمن صاحب کو پیش و پس۔ راست و چپ کا کچھ خیال نہیں رہا اور وہ جھجک کر پیچھے ہٹے۔ پاؤں چھوٹا پڑا اور وہ منہ کے بل نالے میں جاتے رہے! علی بہادر جو انھیں کی طرح محو دید تھے گھبرا کر پلٹے ہی تھے کہ ایک بھینس سے دھکا لگا۔ وہ بھی نالے کی لگر سے اُلجھے۔ ٹھوکر کھائی اور اپنے حبیب کے پہلو میں دراز ہو گئے!

آنسیل نے ان دونوں کو حواس باختہ ہوتے مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسکو کئی دن ایسا سماں نظر آیا کرتا تھا لیکن دفعتہً دونوں پجاریوں کو اس طرح مدہوشیوں کی ہڑبونگ سے سخت و سنگلاخ [illegible] مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیل گئی۔ عورت کا دل انسانیت و ہمدردی سے اُمڈا اور اسکے

لعل سے دہن سے "ہے! ہے!" کی آواز نکل گئی۔ اسکے گلابی گالوں سے سرخی غائب ہوگئی اور غزالی آنکھوں کی چمک دہشت و خوف سے پھیکی پڑ گئی۔ اس نے جلدی سے ستار ہاتھ سے رکھ دیا اور گھبرائی ہوئی پریشان زینہ سے اُترنے لگی۔ اسکے دوپٹے کے ایک کونے کو زمین آنکھوں سے لگا رہی تھی۔ اسکے سیاہ بالوں کا ایک حصہ رخ پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ اسکا دم پھول رہا تھا اور اسکے چہرے پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے پھول کی پنکھڑیوں پر اُوس کے قطروں کی طرح چمک رہے تھے۔ وہ اسی طرح پریشان "ہے! ہے!" کہتی سڑک پر نالے کے قریب پہنچی۔

علی بہادر کے حواس گرنے کی چوٹ سے کچھ بجا ہوگئے تھے۔ لیلی کے نام کی جگہ اب "یا علی" زبان پر تھا۔ انھوں نے اپنے زخمی گھٹنے کو اس طرح حسرت سے دیکھا جیسے اسکے خون آلودہ حصے پر انھیں پیار آرہا ہو۔ انھوں نے کولے کی چوٹ ہاتھ سے دبا دبا کر مٹانے کی کوشش کی، اور کہنیوں کا درد ہاتھ ہلا ہلا کر محسوس کیا۔ وہ اپنے زخموں کی تیمارداری ہی میں مشغول تھے کہ راہ گیروں اور سڑک کے آتے جاتوں نے ہجوم کیا۔ انکی چاؤں ماؤں سن کر یہ چونکے اور انھیں اپنے دوست کا خیال آیا۔ اب جو پلٹ کر دیکھا تو منن صاحب اس طرح بیہوش پڑے ہیں کہ آنکھیں بند ہیں، سر سے خون جاری ہے۔ اور ہاتھ پاؤں بالکل بے کینڈے پڑے ہیں گویا دم ہی نہیں۔

علی بہادر کا دل دفعتہً زور سے دھڑکا اور پھر اسکی حرکت رک گئی۔ آنکھوں میں سڑک، مکانات اور مجمع تمام چیزیں لٹو کی طرح گھومنے لگیں۔ انھوں نے گھبرا کر ہاتھ پھیلا دیے اور نالے کی دیوار سے سہارا لگایا۔ ایک منٹ میں چکر رفع ہوا۔ انھوں نے جلدی سے منن صاحب کے پہلو میں بیٹھ کر ان کے قلب پر اپنا کانپتا ہوا ہاتھ رکھا۔ جی سن سے ہوگیا۔ انہیں دل کی حرکت ہی محسوس نہ ہوئی۔ بڑے درد سے مجمع کی طرف دیکھ کر بولے "ارے بھائیو۔ ذرا دیکھو، انکی کیا حالت ہے؟"

لیلی نے علی بہادر کی یہ فریاد سنی اور کانپتی ہوئی نالے میں اتر گئی۔ منن صاحب کے پاس آئی، انکی ٹانگیں کھینچ کر برابر کیں۔ دبا ہوا ہاتھ پہلو سے نکالا۔ دل پر ہاتھ رکھ کر دیر تک حرکت محسوس کیا کی۔ اسکے بعد وہیں بیٹھ کر زخمی سر گود میں لے لیا۔ پھر گھبرا کر بولی "پانی! پانی! ارے تم میں سے کوئی پانی نہ لائیگا۔ سب یونہی منہ کھولے دیکھا ہی کروگے؟"

مجمع پر یکبارگی شرم کا چھینٹا پڑا۔ جو انکو کرنا چاہیے تھا وہ عورت کر رہی تھی اور وہ بھی لیلی!

سارا مجمع دفعتہ "پانی! پانی!" کہکر چیخنے لگا۔ ایک دفعہ تین چار آدمی دوڑ پڑے۔ کوئی گلاس میں، کوئی کٹورے میں، کوئی لوٹے میں پانی لایا۔ ایک صاحب پورا بھرا گھڑا گھر سے اُٹھا لائے۔ دس پندرہ آدمی ایک ساتھ نالے میں پھاند پڑے اور البیلی کے نازک ست خائی سے یہ سب پانی منن صاحب کے منہ پر پڑنے لگا اُنکے سارے کپڑے سُرخ ہوگئے۔ البیلی کے ریشمی دوپٹہ پر گلکاریاں ہوگئیں۔ علی بہادر گھٹنوں تک بھیگ گئے مگر منن صاحب نے آنکھیں نہ کھولیں۔

مجمع میں ہر قسم اور ہر طرح کے لوگ موجود تھے۔ کوئی بولا "اب ہوش میں آنا مشکل ہے!" کسی نے کہا "اب ہوش کہاں"۔ تیسرے نے ہاں میں ہاں ملائی۔ کہا "جان ہی نہیں ہوش کیسے آئے؟" علی بہادر چُپکے ٹکٹکی باندھے، آنکھوں میں آنسو بھرے مُنن صاحب کا خون آلودہ چہرہ دیکھ رہے تھے۔ دماغ میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بھر کی مشینیں بڑے زور شور سے چل رہی تھیں مگر اُنکے شور پر بھی جو آواز غالب تھی وہ یہ تھی "ارے یہ کیا ہوا؟" "ہائے میں انہیں یہاں کیوں لایا؟" زبان سے بھی یہی آواز نکلتی تھی لیکن کچھ اس طرح بے معنی و مہمل بن کر کہ لوگوں کو صرف "غِل، غِل، غِل" کی صدا سنائی دیتی تھی۔ نہ معلوم علی بہادر نے کتنی بار یہی کہا، مگر کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ البتہ اتنا ہر شخص دیکھ رہا تھا کہ ان کا چہرہ بالکل زرد تھا، انکے پاؤں لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ بار بار ہونٹ چاٹتے تھے اور انکی زبان پر لعاب دہن کی سپید سپید چتیاں پڑگئی تھیں۔

البیلی منن صاحب کو ہوش میں لانے کی صورتیں بھی کر رہی تھی۔ مجمع کی باتیں بھی سُن رہی تھی اور علی بہادر کی حالت بھی دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل پاش پاش ہو رہا تھا۔ شاید وہ گھر میں بیٹھنے والی شریف زادیوں کی طرح ہوتی تو چیخ کر وہیں گر پڑتی لیکن مردوں سے روزمرہ کے ملنے جلنے اور دنیا کے بدترین پیشہ والیوں کے ساتھ رہنے سہنے نے اسکی "نسائیت" بہت کچھ کم کر دی تھی وہ اسکی عادی سی تھی کہ وہ اپنے جذبات و حسیات کو دبا کر عقل و فراست سے کام لے۔ وہ منن صاحب کو چھوڑ کر علی بہادر کی طرف پلٹی۔ وہ اُسی طرح دونوں کانپتے ہاتھ پھیلائے، آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے، ہونٹ چاٹ چاٹ کر "غِل، غِل، غِل" کر رہے تھے۔ وہ دفعتہ مجمع کی طرف مُڑی اور ہاتھ جھٹکا کے جھڑک کر بولی "ایک کا تو یہ حشر ہے، کیا دوسرے کی بھی جان لوگے؟"

لوگوں نے گھبرا کر ایک دوسرے کو اس طرح دیکھا جیسے قصوروار دوسرا شخص ہے اور وہ بالکل بے قصور۔ چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ البیلی کی جگہ کوئی اور یہ بہتان اُن کے لئے تراشتا

تو وہ منہ نوچ لیتے۔ مگر البیلی تو البیلی ہی تھی کون بولے۔ وہ خود پھر منن صاحب پر جھک پڑی پھر اس نے انھیں جھنجھوڑا۔ پھر دل کی حرکت سنی اور پھر دانت کھولنے کی کوشش کی۔ مگر اُن پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ بالآخر ایک ٹھنڈی سانس لیکر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اور مجمع سے تحکمانہ لہجہ میں بولی " انھیں اُٹھا کر میرے گھر لے چلو!"

منن صاحب کو لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ اُٹھا لیا۔ علی بہادر نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر لوگوں کو دیکھا۔ نہ معلوم کیا سمجھے بڑے زور سے چیخ کر بولے" ارے بھائیو انہیں کہاں لئے جاتے ہو؟"

ایک شخص نے کہا "میاں گھبرائیے نہیں، یہیں قریب ہی" البیلی نے انکی طرف اشارہ کر کے کہا "ذرہ کوئی انکو بھی سہارا دیدو!" دو آدمیوں نے آگے بڑھ کر انکا بھی شانہ پکڑ لیا۔

سب سے آگے منن صاحب خون میں نہائے، شہانا جوڑا پہنے چار آدمیوں کے ہاتھوں پر۔ ان کے پیچھے علی بہادر دو آدمیوں کے شانوں پر ہاتھ رکھے ہوے۔ انکی بغل میں البیلی۔ اپنی پریشانیوں میں ہزاروں لرزائیاں چھپائے ہوئے۔ اور اسکے پیچھے ایک جم غفیر۔ اس طرح یہ مجمع البیلی کے گھر کی طرف چلا۔ ایک صاحب جو کہیں قریب ہی کھڑے تھے مُسکرا کر بولے۔

"ہاں بھئی۔ عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے!"

البیلی کو نہ معلوم کیوں یہ فقرہ بُرا معلوم ہوا۔ وہ تڑپ کر بولی۔ "خدا ید شگونی نکالنے والوں کا منہ کالا کرے!"

کئی گھنٹے بعد منن صاحب نے آنکھیں کھولیں۔ ڈاکٹر نے پیچھے ہٹ کر اطمینان کی سانس لی۔ علی بہادر "خدا کا شکر" کہہ کر مسکرائے۔ البیلی کے ضبط کا قلعہ ٹوٹا۔ موتی سے آنسو آنکھوں سے ٹپ ٹپ گر پڑے۔ منن صاحب نے گھبرا کر پوچھا "میں کہاں ہوں؟"

ڈاکٹر صاحب مسکرا کر بولے " اپنے قاتل کے گھر میں!"

منن صاحب نے اور پریشان ہو کر پوچھا "قاتل؟ قتل۔ قتل کیا؟"

ڈاکٹر صاحب اپنی ستم ظریفی پر کچھ جھیپ کر بولے" ارے یار، اس وقت موقع نہیں، ورنہ بتا دیتا۔ لو، یہ دوا پیو۔ اور سو رہو!" منن صاحب نے دوا پی لی۔ آنکھیں بند ہوئی جاتی تھیں لیکن زبان پر اسی لفظ "قتل" کی تکرار تھی۔ پہلے کچھ استعجاب سے۔ پھر کچھ خوف و اضطراب سے۔ اور آخر میں چھنیا بیگم کے

عاشقوں کی طرح ناک سے "قتل - قتل" کہتے سو گئے۔

الیبلی نے ڈاکٹر صاحب کا انوکھا مذاق سُنا۔ پھر مُحسن صاحب کی زبان سے لفظ "قتل" کی تکرار سُنی۔ یہ لفظ اور اس صنف خاندان کے تمام الفاظ اسکے لئے نئے نہ تھے۔ اُس پر ان الفاظ کا سوائے رعونت بڑھانے کے کوئی اثر نہ ہوتا تھا لیکن آج محسن صاحب کے طرز ادا و لہجہ میں نہ معلوم کون سی بات تھی کہ اس لفظ "قتل" کی نوعیت ہی کچھ اور ہو گئی۔ اسکے ہر ہر حرف اور ہر ہر نکتے میں شکایتوں اور بیجا شکایتوں کا انبار پوشیدہ تھا۔ اُس نے گردن جُھکا لی اور کمرے سے اس طرح چلی، جیسے دُنیا کی ندامتیں اور عالم کی شرمندگیاں اسی کے لئے مخصوص کر دی گئی تھیں۔ وہ اس کمرے میں آئی جہاں موسیقی کے تمام آلات رکھے تھے۔ اس نے ستار اُٹھا لیا اور اپنے خیالات کے اظہار کے لئے اسے بجانا شروع کیا۔ دُکھے ہوئے دل نے ہاتھوں کے اشارے سے نئے نئے راگ اور نئی نئی راگنیاں پیدا کیں۔ کبھی اس طرح کی آوازیں کمرے میں گونجتیں کہ معلوم ہوتا کہ بہادروں کا رسالہ پرچے سیدھے کئے قومی نعرے بلند کرتا غنیم کی فوج پر حملے کے لئے بڑھ رہا ہو۔ کبھی اس طرح کی صدائیں فضا میں پیدا ہوتیں کہ محسوس ہوتا کہ کوئی ناکام محبت جوان عالم کی نعمتوں کو ٹھکرا کر عزت و آبرو سے ہاتھ دھوئے۔ ایک حُسن فروش کو بغل میں دبائے ہنسنے زہر خند کرتا جاتا ہے اور شیشے جھنکار جھنکار کر جام پر جام پیے جا رہا ہے۔ اور کبھی اس طرح کے نوحہ و شیون کی آواز ستار سے نکلتی جیسے پھولوں کا تابوت سیاہ کفن نوجوانوں کے کاندھے پر ہو اور ایک بیوہ کشیر کسی جوانا مرگ پر سر و سینہ پیٹتا، واویلا کرتا چلا جا رہا ہو۔

خود الیبلی پر اس دردبھرے راگ کا یہ اثر ہوا کہ سرگیں آنکھوں سے آنسو ڈھل کر گلابی گالوں تک آگئے۔ دفعتہً اسکی ابروؤں پر بل پڑے اور اس نے کسی قدر خشمگیں انداز سے ستار سے ہاتھ ہٹا لیا اور ایک اُنگلی سے ان انمول موتیوں کو سمیٹ کر فرش پر پھینک دیا۔ ایک لمحہ بعد وہ پھر ستار بجانے لگی۔ مگر اسکی جو اُنگلیاں تار پر چلیں تو ایک نئے انداز سے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سوکھے خزاں دیدہ باغ میں بہار کی ہوائیں چلنے لگیں کونپلیں پھوٹ رہی تھیں، کلیاں چٹک رہی تھیں پھولوں نے شبنم کے لئے آغوش محبت پھیلا دی تھی اور بلبلیں خوشی اور مستی سے چہک رہی تھیں!۔

اسکے دل سے غمیں رفع ہونے لگیں وہ جھوم جھوم کر ستار بجانے لگی اور آہستہ آہستہ گنگنانے لگی۔ وہ اسی طرح غرق موسیقی تھی کہ دفعتہً کمرے کے ایک کونے سے ایک چھوٹی سی چوہیا نکلی۔ تھوڑی دیر

اس نے البیلی کو بغور دیکھا۔ پھر اس نے اس طرح سر ہلایا جیسے یہ گانا اسے پسند آیا۔ پھر سر گھما کر سوچی۔ اور پھدک کے البیلی کے قریب آبیٹھی۔ پھر اپنی ننھی ننھی پچھلی ٹانگوں پہ بیٹھ کر "چیچک! چیچک! چیچک!" کر کے ساتھ دینے لگی۔

البیلی کی محویت پر اس "چیچک" کا عجیب اثر ہوا۔ وہ دفعتہً اچھل پڑی اور چوہیا کو دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑی۔ پھر جلدی سے ستار رکھ کے جوتی اٹھائی، اور پاجی کہتی اسکی طرف دوڑی۔ چوہیا پھدک کے سوراخ میں گھس گئی۔ اور جب البیلی ناکامیاب پلٹ آئی تو اس شریر نے اسے بل سے جھانک کر دیکھا۔ پھر اگلے پاؤں سے سر کھجایا۔ اور دانت نکال کر سر کو حرکت دی۔ گویا کہتی تھی "اللہ! دنیا کتنی ناقدر ہے۔ ہم تو اتنی محنت سے ساتھ دیں، اور لوگ ہم کو جوتیوں سے دھمکائیں۔ چیچک! چیچک! چیچک! اے ری نا قدری!"

البیلی کو دفعتہً خیال آیا کہ ڈاکٹر نے مسٹر صاحب کو شوربا دینے کے لئے بتایا ہے۔ وہ اٹھی اور باورچی خانے میں جا کر خود اپنے ہاتھ سے شوربا تیار کرنے لگی۔

مسٹر صاحب نے اچھے ہوتے ہی شہر میں کرایہ پر مکان لیا اور وہاں منتقل ہو گئے۔ پہلے ہی سے لگاؤ تھا۔ اب تو ممنون احسان بھی تھے۔ پورے تین دن مہمان رہے۔ تیمارداری کی گئی۔ خاطریں کی گئیں۔ نازک نازک ہاتھوں سے سرکی، پہلو کی پٹیاں بدلی گئیں۔ غرض جسم تو اچھا ہوا مگر بیماری دل اور بڑھی۔ ساتھ ہی شغف بڑھا، انہماک بڑھا، محویت بڑھی۔ روزانہ البیلی کے یہاں جانا فرائض سے ہو گیا اور جاناں پہ جبیں سائی کئے بغیر چین آنا محال تھا۔

البیلی بھی عورت تھی، محسن تھی، تیماردار تھی، میزبان تھی۔ اسکے یہاں بھی آگ سلگنے لگی۔ گو بظاہر داری میں۔ روزمرہ میں کوئی فرق نہ آیا۔ اسکے پاؤں آسانی سے ڈگنے والے نہ تھے۔ اعصابی کشش پر وہ بہت پہلے سے قابو پا چکی تھی۔ ہاں دل کی لگی البتہ لرزہ براندام کر دیتی تھی مگر پھر بھی فن سے محبت مسٹر صاحب کی محبت پر اب تک غالب تھی۔ جہاں کہیں اسے اپنے اوپر ذرا بھی شک ہوا اس نے اس طرح کا انتظام کرتی تھی کہ ہفتوں مسلسل بزم و سرود کی محفلوں سے اسے فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ اور مسٹر صاحب کی صورت تک دیکھنے کا اتفاق نہ ہوتا تھا۔ کئی مہینے یونہی گزر گئے۔ بالآخر مسٹر صاحب کی وارفتگی اتنی بڑھی

کہ وہ اپنی نجابت و شرافت کے ساتھ بیوی اور لڑکے سب کو بھول گئے۔ اُنھوں نے البیلی کے پاس ایک رقعہ بھیجا۔ مضمون یہ تھا۔

"قبلۂ عالم - خدا تمھارا حسن دوبالا کرے!۔

اب پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ میں تمھارے بغیر نہیں جی سکتا۔ اب خدا کے لئے مجھ سے نکاح کر لو اور مجھے ہمیشہ کے لئے اپنی غلامی میں قبول کرو۔

تمہارا مہجور منن "

البیلی نے خط پڑھا۔ پہلے تو اسکا چہرہ خوشی سے چمک اُٹھا۔ پھر گالوں سے سرخی دفعتہً غائب ہو گئی اور وہ بالکل زرد ہو گئی۔ اسکی درخشاں پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمکنے لگے۔ وہ اپنی ہنس کی سی گردن جھکا کر سوچنے لگی۔ پھر علی بہادر سے حسرت سے بولی "اچھا..... اُن سے کہہ دیجئے گا..... کہ آج میں اُن سے خود باتیں کرونگی"۔ دن بھر اسی طرح سُست سُست سی رہی۔ شام کو جب منن صاحب آئے تو اُنھوں نے اسکی صورت دیکھتے ہی پوچھا "کیوں خیریت تو ہے کیسا مزاج ہے؟"۔ البیلی نے انکی طرف دیکھا اور اس طرح مسکرائی جس طرح نقیہ مریض مسکراتے ہیں۔ پھر بولی "اے باد صبا این ہمہ آوردۂ تست۔ خود ہی پریشان کرتے ہیں خود ہی پوچھتے ہیں خیریت ہے!"۔ منن صاحب آزردگی سے بولے "میں اور تمھیں پریشان کروں۔ قسم قرآن کی اگر مجھے اسکا یقین ہو جائے تو میں ابھی جان دیدوں!"۔ اس نے ان کو کنکھیوں سے دیکھا۔ اور انکی حالت کا اندازہ کر کے بولی "نہیں آپ ہی کا تنہا قصور نہیں!"۔

اُنھوں نے والہانہ انداز سے کہا "تو پھر اور کون تمہیں پریشان کر رہا ہے قسم خدا کی اگر مجھے معلوم ہو جائے تو میں اس مردود کا خون چوس لوں"۔

وہ مسکرا کر بولی "جی اس قصور میں میرا دل بھی شریک ہے!"۔

اس فقرے میں جو اقرار محبت پوشیدہ تھا منن صاحب اسے بالکل نہ سمجھے۔ سادہ لوحی سے بولے "لاحول ولا۔ میں نے معلوم کیا سمجھا۔ مگر تمہارا دل کیوں پریشان ہے!"۔

اس نے انکی طرف دیکھا۔ پھر گردن جھکا کر بولی "آپ کی حالت دیکھ کر"۔

یہ تو صاف صاف اظہار تمنا کی دعوت تھی۔ منن صاحب نے فوراً قاعدہ اُٹھایا، گڑگڑا کر بولے "تو پھر رحم کرو، خدارا مجھے زندہ کرو"۔

اس نے تمتماتے ہوئے چہرے کو دیکھا۔ پھر ٹھنڈی سانس لیکر متانت سے بولی "آپ کے نقطۂ نظر سے میں یقینی یہ کر سکتی ہوں مگر...... مگر مجھے آپ سے محبت ہے ؟"

وہ جلدی سے بولے "تو پھر کاہے کی دیر ہے۔ آج ہی شام کو مولوی کو بلالاؤں۔ کل دونوں آدمی بارات چلیں گے وہیں کوٹھی میں قیام ہوگا......"

وہ بات کاٹ کر بولی "آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ آپکے لئے مجھ سے شادی کرنا نامناسب ہے۔

حسن صاحب کچھ کہا ہی چاہتے تھے اس نے ہاتھ کے اشارے سے روکا "اس لئے نامناسب ہے کہ آپ سید ہیں، رئیس ہیں، بحیثیت شریف ہیں اور میں...... میں الیلی ہوں.... جو دنیا کے بدترین پیشے میں پیدا ہوئی۔ جسکے باپ کا نام تک نہیں معلوم۔ جو اچھوتوں سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔ جسکا خاندان عالم بھر سے زیادہ کمینہ ہے! ۔ میں آپ سے شادی کرکے آپ کو کیوں ذلیل کروں ؟ آپ کو کیوں غارت کروں ؟"

حسن صاحب نے کہا "لیکن مجھے تو ان باتوں کا خیال نہیں۔ تم یہ سب لغو باتیں سوچ سوچ کر اپنی طبیعت کیوں پریشان کرو ؟"

وہ بولی "سید صاحب آپ نے شادی کا پیغام دے کر اپنی محبت کا ثبوت دیدیا۔ آخر مجھے بھی تو اپنی محبت کا ثبوت دینا چاہیے! ۔

انھوں نے کہا "تو ان باتوں میں تو محبت کی کوئی تک نہیں!"

وہ مسکرا کر بولی "ممکن ہے نہ ہو۔ مگر ذری میری بات کو سنیے..... آپکی شادی ہو چکی ہے! آپ کے خدا رکھے چودہ برس کا جوان لڑکا ہے! آپ کی ماشاء اللہ کئی ہزار ماہوار کی جائداد ہے! ۔ اب اگر میں آپ سے عقد کر لوں تو ساری دنیا مجھے خود غرض کہیگی یا نہیں ؟ سب یہی سمجھینگے کہ میں نے محض دولت کے لالچ سے ایسا کیا ——"

حسن صاحب نے بات کاٹ کر کہا "خدا کی قسم میرے خواب میں بھی یہ خیال نہیں آسکتا"

الیلی نے شوخی سے ڈانٹا "میں نے آپ سے چپ رہنے کو کہا تھا۔ ذری میری پوری بات سن لیجیے پھر جو جی چاہے کہیے گا۔ میں اس معاملہ پر ہر پہلو سے غور کر چکی ہوں۔ ہاں تو خواہ آپ نہ سمجھیں مگر دنیا آپ کو یہی سمجھائیگی۔ چار دن کے لئے جب تک کہ میں جوان ہوں آپکے دل میں یہ خیال نہ آنے کا مگر جب میں بڈھی ہو جاؤں گی تو پھر آپ بھی یہی سمجھنے لگینگے —— ابھی سمجھئے —— [illegible]

ہاں تو یہ ایک بات ہوئی۔ دوسری بات یہ ہے کہ ماشاء اللہ آپکی بیوی موجود ہیں اُنکی زندگی اس شادی سے برباد جائیگی۔ سَوت خواہ کیسی ہی ہو بُری ہوتی ہے۔ نہ کہ نٹی سوت! آپ بھی سے اُنکو بھول بیٹھے نہ کہ جب میں ہر وقت گلے کا ہار رہوں ——"

متن صاحب جلدی سے بول اُٹھے "خدا وہ دن جلد لائے!"

اس نے پھر ڈانٹا "چپ نہیں رہا جاتا" اُنھوں نے سر جھکالیا۔ اس نے گفتگو کا سلسلہ یوں جاری رکھا "یہ دانی۔ شریف، نیک بیوی گھر پر موجود ہے۔ جوان لڑکا ماشاء اللہ اپنے برابر کا۔ ہر بات کا سمجھنے والا۔ آپکی ہر حرکت بغور دیکھ رہا ہے مگر آپ ہیں کہ ہوش ہی میں نہیں آتے۔"

متن صاحب بڑے جوش سے بولے "واللہ اسی بیہوشی ہی میں لطف ہے" شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔

وہ بولی "آپ اپنی جگہ پر شاد سہی مگر آپ کی بیوی اور آپکے بیٹے کے دل سے کوئی پوچھے۔"

متن صاحب نے جل کر کہا "خدا کی قسم تم تو اس وقت بالکل ناصح مشفق" بن بیٹھیں نہیں نہ تو مجھ سے محبت ہے اور نہ تم میری محبت کی قدر کر سکتی ہو۔ ورنہ یہ باتیں تمھارے ذہن ہی میں نہ آتیں۔"

الیبلی نے مسکرا کر جواب دیا "خیر، ان طعنوں سے تو کام نہیں نکلیگا لیکن اگر آپ سمجھنا چاہیں تو میں آپکو سمجھا دوں...... دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جنھیں سوائے "ہائے، وائے" کے کوئی کام نہیں ہوتا۔ جو ساری زندگیاں محض جوش اور جذبہ کی نذر کر دیتے ہیں۔ اور جن کی عقل کمزور ہوتی ہے اور دوسرے وہ لوگ ہوتے ہیں جو نفس کی خواہشوں پر عقل کے حکموں کو ترجیح دیتے ہیں جو بلا سوچے سمجھے کوئی کام نہیں کرتے اور جو دل کا خون کر سکتے ہیں مگر عقل کی بات نہیں ٹال سکتے میں اسی طرح کی عورت ہوں، میں ایک ذلیل ترین پیشہ والے گھر میں پیدا ہوئی مگر میں نے آج تک عصمت فروشی نہیں کی۔ خدا بخشے اماں جان کو اُنھوں نے لاکھ لاکھ کوششیں کیں مگر میں آج تک اس کام سے متنفر رہی۔ مجھے سوائے لکھنے پڑھنے اور گانے بجانے کے کسی چیز کا شوق ہی نہیں۔ مجھے دنیا میں سب سے بڑی مغنیہ بننے کی خواہش ہے۔ یہی تمنا یہی آرزو ہے۔ میں اسی لئے نہ کسی کی محبوبہ بننا چاہتی ہوں اور نہ کسی کی بیوی۔ اور نہ اس طرح کے تعلقات پیدا کرکے اپنی آواز کو برباد کرنا چاہتی......"

متن صاحب نے پھر بات کاٹی اور کہا "اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ تمہیں محبت نہیں!"

الیبلی نے کہا "جی تو یہی چاہتا ہے کہ میں آپ کو بتا دوں کہ ہاں مجھے محبت نہیں ہے مگر آج [illegible]

آپکی آخری ملاقات ہے...... ہاں ہاں آخری ہی ہے۔...... اس میں کچھ کہنے کی گنجائش نہیں۔ ...... اس لئے میں آپ سے جھوٹ نہ بولونگی.... میں آپ سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں جتنی کہ میری سی عورت کسی مرد سے محبت کرسکتی ہے میں آپ کی شرافت کی، آپکی انسانیت کی، آپکی اس وقتی دیوانگی کی دل سے قدر کرتی ہوں۔ لیکن ہاں میں محبت کو کچھ اور ہی شے سمجھتی ہوں"

منن صاحب نے یہ ساری باتیں اس طرح سنیں جس طرح کوئی حکم موت سنتا ہے اور خشک ہونٹوں پر زبان پھرا کر آہستہ سے بولے۔" وہ کیا!"

وہ بولی۔" میں محبت کہتی ہوں نفس کشی کو۔ ایثار کو۔ خلوص کو۔ بے غرضی کو! جب عورت کسی سے محبت کرتی ہے تو وہ اپنے فائدوں کو۔ اپنے آرام، چین کو۔ اپنی ساری زندگی کو دوسرے پر سے قربان کرتی ہے۔ میں کمینی سہی۔ ذلیل سہی، رسوائے زمانہ سہی۔ مگر عورت ہوں۔ میں آپکو اپنے ہاتھوں برباد نہیں کرسکتی۔ نہ میں آپ سے عقد کرونگی اور نہ مجھ سے آپ کے عورت و مرد کے تعلقات ہونگے!"

منن صاحب کے ہاتھوں سے دامن صبر چھوٹ گیا۔ وہ بالکل بچوں کی طرح رونے لگے۔ البیلی بھی آنکھوں میں آنسو بھرے اٹھ کھڑی ہوئی۔ منن صاحب نے فریاد کرتے ہوئے دونوں ہاتھ اسکی جانب پھیلا دیئے اور بڑے درد سے بولے" خدا کے لئے رحم کرو! میرے لئے تمھارے بغیر زندگی محال ہے! مجھ سے منہ نہ موڑو" اس نے کمرے کے دروازے پر کھڑے کھڑے جواب دیا۔" دنیا میں کوئی شے محال نہیں۔ محبت کا ثبوت صبر و استقلال ہے۔ آپ بھی وہی کیجئے جو ایک شریف عاشق کو کرنا چاہیے" اور ان پر وداعی نظر ڈالتی ہوئی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

منن صاحب زانو پر سر رکھے وہیں بیٹھے رہے۔ تھوڑی دیر بعد علی بہادر آئے اور سمجھا بجھا کر اٹھا لے گئے۔

البیلی نے اپنے کو عشق کی کسوٹی پر کسا اور پوری اتری۔ مگر اپنے ہاتھ سے اپنے دل کا خون کوئی آسان کام نہیں۔ اور وہ بھی جب کہ معشوق منن صاحب سا آدمی ہو۔ وہ اپنی اصل کو بھی جانتی تھی اور انکی نسل کو بھی۔ وہ اس سے بھی واقف تھی کہ اب زندگی میں اسے اس طرح کا موقع نہ ملیگا۔ اس سے یہ بھی پوشیدہ نہ تھا کہ رقاصہ اور مغنیہ کی زندگی روحانی و دماغی اطمینان کی زندگی نہیں ہوتی اور اسکے دل میں اپنی نسل کی بقا اور ماں بننے کی خواہش بھی اسی طرح سے موجزن تھی جس طرح [illegible]

کے دل میں ہوتی ہے۔ مگر کیا کرتی مجبور تھی۔ اسکے نزدیک عشق کا معیار بہت بلند تھا اور محبت کی منزل حد درجہ کٹھن تھی۔ منن صاحب کی محبت کو وہ قیمتی اور مہنگا می شے سمجھتی تھی۔ چالیس کے قریب سن پھر بال بچوں والے آدمی۔ انکے لئے یہ عقد کسی طرح شایان شان نہ تھا۔ ساری دنیا میں رسوا ہو جائیں گے۔ ہر شخص ہنسے گا۔ محبوب کو فانی راحت کے لئے بدنام کرنا محبت کے معیار سے بہت گری ہوئی بات ہے۔ بس اس نے اپنی قربانی چڑھادی! پھر بھی دل پر آ بنی۔ جس وقت سے وہ اسکے یہاں سے اٹھ کر گئے وہ خاصی دیوانی ہوگئی۔ اس نے چاروں طرف سے اپنا کمرہ بند کرلیا اور اس میں ٹہلنے لگی۔ کبھی چہرے پر مسرت و خوشی کے آثار نمایاں ہوجاتے تھے اور کبھی اضطراب و غم کے۔ کبھی مسکراتی اور ہنستی تھی، تو کبھی پھوٹ پھوٹ کر رو دتی تھی۔ ساری رات نہ لیٹی اور نہ سوئی۔ بس کمرے میں ٹہلتی ہی رہی۔ صبح کے قریب تھک کر پلنگ پر پڑ رہی۔ فطرت نے مدد لالیا۔ سوگئی۔ دس بجے اٹھی۔ سب سے پہلا کام آنکھ کھلتے ہی یہ کیا کہ منن صاحب کی طلبی کے لئے آدمی بھیجا۔ کیا کرتی، قوت ارادی نے جواب دیدیا تھا۔ ضبط محال تھا۔ معیار حد سے زیادہ بلند تھا۔ دل کی آگ جلائے ڈالتی تھی۔ مغنیہ اور رقاصہ بننے کا خیال اس آگ میں ایسا جل گیا جس طرح مٹی کے تیل میں ڈوبا ہوا ردی کاغذ جلتا ہے۔ ایک رات کے تجربے نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ منن صاحب کی کنیز بنے بغیر زندہ ہی نہیں رہ سکتی ہے۔

"انکے انتظار میں بیٹھی تھی"۔ "آہٹ پہ کان، در پہ نظر تھی۔ کہ ناگہاں آدمی نے واپس آکر خبر دی، وہ شب میں مکان چلے گئے۔"

"بس خون ٹپک پڑا نگہ انتظار سے"۔ عجیب طرح دل کو ٹھیس لگی۔ اللہ ری بیمروتی! بس ایک رات کے انکار نے آزردہ کردیا۔ خفا ہو کر گھر چلے گئے۔ اسی کو وفا کہتے ہیں۔ اسی کا نام استقلال ہے؟ - خیر ایک طرح اچھا بھی ہوا۔ اس طرح کے آدمی کا زندگی بھر کیسے ساتھ ہوتا؟ جب اتنا صبر نہیں تو کیونکر نبھتی؟ - اٹھی، نہائی، کپڑے بدلے، بال میں کنگھا کیا۔ ستار اٹھایا۔ ایک نہایت ہی زندہ دل راگنی چھیڑی گنگنانے لگی۔ لیکن پانچ منٹ بھی نہ گزرے ہونگے کہ معلوم ہوا کلیجہ میں کسی نے چٹکی لی۔ آنکھوں سے آنسو سیل کی طرح بہنے لگے۔ رنگ بدل گیا۔ جہاں مستی اور زندگی تھی وہاں اب سوگ تھا اور نوحہ و ماتم!

گھنٹوں یہی کیفیت رہی یہاں تک کہ سازندے آگئے۔ خواہ مخواہ طبیعت کو سنبھالنا پڑا۔ دوسرے ہی دن ایک رئیس کے یہاں شادی میں جانا تھا۔ اس کے لئے سامان درست ہونے لگا۔ طبیعت بہل گئی۔

تین روز تک وہ اِن کی محفلوں اور چہل پہل میں منن صاحب کو اور اپنے کو بھولی رہی۔ چوتھے دن گھر آئی اور انکی یاد نے ستایا۔ پھر آدمی بھیجکر دریافت کرایا۔ معلوم ہوا مکان بند ہے۔ کوئی خبر نہیں بے حد تکلیف ہوئی۔ مگر خود کردہ را علاجے نیست! خود ہی ٹکا سا جواب دے کر نکالا تھا۔ اب کیا کر سکتی تھی۔ انکے گاؤں پر جانے یا آدمی بھیجنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ خیال تھا "وہ سمجھینگے خون رنگ لایا۔ پوری طرح قبضہ میں کرنے کے لئے پیشہ والی چالیں چلی تھی" یہ سراسر اپنے کو اور اپنی محبت کو رسوا کرنا تھا۔ اِس لئے شمع روشن کی طرح گھلی جاتی مگر خاموش تھی۔ زبان کٹ چکی تھی سوائے سکوت کے چارہ ہی کیا تھا۔

دو ہفتہ بعد علی بہادر آئے۔ مگر عجیب شان سے۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وضع قطع سے وحشت کے آثار نمایاں تھے۔ الیلی صورت دیکھتے ہی شکایتیں بھول اور گھبرا کر بولی "میر صاحب خیریت تو ہے۔ آپ اس قدر پریشان کیوں ہیں!"

علی بہادر نے بھرائی ہوئی آواز سے کہا "میں تو خیریت سے ہوں لیکن ......"

الیلی نے بڑے اضطراب سے بات کاٹ کر پوچھا "اور منن صاحب؟"

علی بہادر اس سوال پر رونے لگے۔ الیلی اس طرح زرد پڑ گئی جیسے جسم بھر میں لہو کی بوند ہی نہ تھی۔ پھر کانپتے ہاتھوں سے اپنا دل پکڑ کر بولی "خدا کے واسطے جلد بتائیے۔ خیریت تو ہے"

اُنھوں نے جیب سے رومال نکالا اور آنکھوں پر رکھ کر بولے "اُنھوں نے کل انتقال کیا"

الیلی نے ایک چیخ ماری اور بیہوش ہو کر گر پڑی۔ تمام سازندے دوڑ پڑے۔ وہ اس طرح ساکت اور بے حس پڑی تھی جیسے قلب میں نہ حرارت تھی اور نہ حرکت۔ جلدی سے ڈاکٹر بلایا گیا۔ اُس نے نبض دیکھی۔ کچھ پتہ نہ چلا۔ اُس نے جلدی سے بائیں شانے میں انجکشن دیدیا۔ پانچ سات منٹ بعد الیلی نے ہلکی سی سانس لی۔ آنکھیں کھولیں اور گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ علی بہادر پر نظر پڑی۔ اُنکا آہستہ سے نام لیا۔ جب وہ قریب آئے۔ پوچھا "کیا واقعہ ہے؟"

وہ آنسو بہا کر بولے "جس شب میں تمھارے یہاں سے گئے تو مکان سے آدمی آیا کہ گاؤں میں طاعون ہے اور لڑکا اس مہلک مرض میں مبتلا ہو گیا ہے۔ اسی وقت مکان چلے گئے۔ لڑکے کی حالت واقعی خراب تھی لیکن اس نے چند ہی دنوں میں سنبھالا لے لیا مگر تیمارداری میں اُنھوں نے

بے احتیاطی برتی، خود بیمار ہوئے اور تین ہی دن کی علالت کے بعد کل ہم لوگوں کو داغ جُدائی دے گئے۔ شروع سے آخر تک سرسامی کیفیت رہی۔ بس تمہارا ہی نام زبان پر تھا۔ البیلی، البیلی کی رٹ تھی۔ کل دن میں تھوڑی دیر کے لئے ہوش آیا تو کاغذ منگوا کر دو سو روپیہ ماہوار کی جائداد تمہارے نام ہبہ کی بیوی اور لڑکے سے ہبہ نامہ پر دستخط کرائے اور ہبہ نامہ مجھے سپرد کرکے راہیِ جنت ہو گئے!"

یہ کہتے کہتے علی بہادر نے جیب سے ہبہ نامہ نکال کر البیلی کے پلنگ پر رکھدیا۔ گو سارا مجمع یہ ہبہ نامہ دیکھکر علی بہادر کے ساتھ اور شدت سے رونے لگا۔ مگر البیلی کی آنکھ سے نہ پہلے آنسو نکلا تھا اور نہ اب نکلا۔ اس نے اسی طرح خاموشی سے ہبہ نامہ اُٹھالیا۔ البتہ کاغذ اُٹھاتے وقت ہاتھ ضرور کانپ رہے تھے اور جب مُٹھی میں بند کئے ہوئے اس نے اپنا ہاتھ دل پر رکھ لیا تو پشت کف کی ساری رگیں اُبھر آئی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب نے آگے بڑھ کر کہا: "آپ کی حالت ایسی نہیں کہ آپ بادہ ریج کریں۔ قلب بیحد کمزور ہے۔"

اس نے ڈاکٹر صاحب کو کچھ اس طرح دیکھا کہ انھوں نے بھی آبدیدہ ہو کر گردن جھکالی۔ وہ پھر آہستہ سے بولی "مجھے کوئی قوت کی دوا دیجیے لیکن تیز۔ بہت جلد اثر کرنے والی۔"

ڈاکٹر صاحب نے فی الفور دوا تیار کرکے اُسے دی۔ اُس نے دوا پی لی۔ تھوڑی دیر بعد اُٹھکر بیٹھی۔ صندوقچہ منگوایا۔ ڈاکٹر صاحب کو فیس نکال کر دی۔ جب وہ چلے گئے تو پھر اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ہاتھوں کی چوڑیاں توڑ ڈالیں، آنکھوں کا سُرمہ پونچھ ڈالا۔ سر کے بال چھٹکا دیے۔ ستار اُٹھالیا اور علی بہادر کی طرف دیکھ کر بولی "مجھے انکی قبر پر پہونچادو!"

وہ آگے بڑھے اور البیلی موافقان ستار بغل میں دبائے، کاغذ ہاتھ میں لئے انکے پیچھے ہولی۔ سازندوں میں سے ایک نے ستار ہاتھ سے لینا چاہا۔ اس نے جھڑک دیا "تم نہیں میں خود لے جاؤنگی!"

منن صاحب کا گاؤں پورے دو کوس پر تھا۔ نہ علی بہادر نے کچھ کہا اور نہ وہ خود ایک لفظ بولی۔ دونوں خاموشی راستہ طے کرتے رہے۔ جب مقبرے میں داخل ہوئے تو البیلی نے ایک جُھرجُھری سی لی۔ علی بہادر نے مُڑ کر دیکھا تو اب بھی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ ہاں چہرے کی زردی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اسی طرح وہ ٹہلتی اس تازہ قبر پر پہونچیں جس میں منن صاحب کل ہی دفن کئے گئے تھے۔

علی بہادر پھر رونے لگے مگر البیلی خاموش قبر کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اُس نے اپنے ستار کے تار ٹھیک کئے۔ تاسف بھری انگلی دوڑائی۔ تھوڑی دیر وہ جھومی۔ پھر عجیب درد سے گانے لگی "میں اپنے پیا کی جوگن ہو گئی

بروگن بنونگی ..... میں اپنے پیا کی جوگن بنونگی !" یہ گاتی جاتی اور جھومتی جاتی تھی - گاتی جاتی اور جھومتی جاتی تھی ......"

علی بہادر پہلے تو خوب روئے - پھر انھوں نے البیلی کو گھبرا گھبرا کر دیکھنا شروع کیا - اس لئے کہ وہ اسی ایک ٹکڑے کو "جوگن بنونگی ! بروگن بنونگی !" طرح طرح کے راگ سے دُہرا رہی تھی ساتھ ہی ساتھ آواز بلند ہوتی جا رہی تھی - ارتعاش زیادہ ہوتا جا رہا تھا اور چہرے کی زردی بڑھتی جا رہی تھی - یہ گھبرا ہی رہے تھے کہ اس نے تازہ قبر سے مٹی اُٹھا کر اپنے چہرے پر ملنا شروع کی - سر پر ڈالی - گریبان میں بھر لی - مگر "میں اپنے پیا کی جوگن بنونگی - بروگن بنونگی" جاری تھا - یہاں تک کہ سیدھے سادھے کسان جو کھیتوں کی آبیاری کر رہے تھے یا کیاریاں بنا رہے تھے گھبرا کر دوڑ پڑے - ہر شخص منن صاحب کی موت سے متاثر تھا ہی رونے لگا - ایک کہرام برپا ہو گیا ..... مگر البیلی کی آنکھ میں آنسو نہ تھا - صرف آواز میں درد تھا - وہ گائے جا رہی تھی - اسے نہ اب علی بہادر دکھائی دیتے تھے اور نہ مجمع سُجھائی دیتا تھا - وہ صرف "اپنے پیا" کو دیکھ رہی تھی - نہ معلوم کفن میں لپٹا ہوا یا سیکڑوں من مٹی میں دبا ہوا دیکھ رہی تھی یا زمیں کے لباس میں - عاشقوں کی وجہ میں اپنے سے باتیں کرتا ہوا دیکھ رہی تھی ....."

وہ ایک بار اُٹھی - بالکل دیوانہ وار اُٹھی - اور مور کی طرح ناچنے لگی - کبھی کمر لچکاتی کبھی کولا مٹکاتی کبھی مور نکھی بن جاتی - مگر منن صاحب کی قبر کا طواف کئے جاتی اور "میں اپنے پیا کی جوگن بنونگی" کی رٹ جاری تھی ....."

علی بہادر کے آنسو خشک ہو چکے تھے - وہ گھبرا گھبرا کر البیلی کو دیکھ رہے تھے - دیہاتیوں نے آہستہ سے کہا "میاں روکیے" - وہ آگے بڑھے - ہاتھ پکڑا - "البیلی ! البیلی !" کہہ کر پکارا - وہ جیسے خواب سے چونک پڑی - اُس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اُنھیں دیکھا - مجمع کو دیکھا - پھر تازہ قبر کو دیکھا - پھر بے تحاشہ اُنکے منہ پر کھینچ مارا - ہاتھ جھٹکا دیکر چھڑایا - اور ہنستی اُچھلتی ستار بغل میں دبائے ایک طرف کو بھاگ گئی ! .... اب بھی گاؤں والے کبھی کبھی رات میں "میں اپنے پیا کی جوگن بنونگی - بروگن بنونگی !" کی آواز سُن لیتے ہیں - شاید البیلی کو اسکا "پیا" اب تک نہیں ملا -

تضمین جزوی بر غزل میر

یعنی

مُسدّس الارکان اشعار کو ایک ایک جزو کے اضافے سے مثمن بنایا ہے

جان ہوا - غم رہا جب تک کہ دم میں دم رہا   آگہی میں - دم کے جانے کا نہایت غم رہا
میرے رونے کی حقیقت جسمیں تھی - لکھی ہوئی   حرف کیسے - ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا
سب کے مُنہ سے سنتے ہیں لیلیٰ کا خیمہ تھا سیاہ   کتنے دن تک - اُسمیں مجنوں کا مگر ماتم رہا
کودکی سے - حُسن تھا تیرا بہت عالم فریب   تا جوانی - خط کے آنے پر بھی اک عالم رہا
دل نہ پہنچا - دل نہ پہنچا گوشۂ داماں تلک   بے اثر اک قطرۂ خوں تھا مژہ پر جم رہا
زندگی بھر - اُسکے لب سے تلخ ہم سنتے رہے   مرتے مرتے - اپنے حق میں آب حیواں سم رہا
کھول آنکھیں - جامۂ احرام زاہد پر نہ جا   بے بصیرت - تھا حرم میں لیک نامحرم رہا
بے تحاشا - دیکھ میرا رونا اُس نے ہنس دیا   آنکھ جھپکی - برق چمکی ابر باراں تھم رہا
بے مروت - زلفیں کھولے تو تو ٹک آیا نظر   بڑھ کے اُلجھن - عمر بھر یہاں کام دل برہم رہا

آرزو بس - صبح بیتی شام ہونے آئی میر
وائے غفلت - تو نہ چیتا اور بہت دن کم رہا

عربی تالیفات و تاریخ روما

جناب حکیم عیش صاحب امروہوی (از رنگون)

روما کی تاریخ بھی عبرت کی ایک خاص داستان ہے کہ یہ تھوڑے سے لوگ توسیع سلطنت کے لئے برابر ساڑھے سات سو سال تک جہد بلیغ کرتے رہے حتیٰ کہ ایک عالم پر غلبہ حاصل کر لیا۔ اس عنوان کے ماتحت انکی تاریخ کا استقصا مقصود نہیں ہے بلکہ نہایت اختصار کے ساتھ صرف یہ دکھانا ہے کہ تالیفات عرب میں رومنوں کی تاریخ اور قیاصرہ کے اخبار کا حال کیا ہے۔

مورخین اقدمین عرب مثل مدائنی، زبیر بن بکار اور ابن کلبی وغیرہم نے کہیں بھی رومنوں کے متعلق کچھ نہیں لکھا، سب سے اول اس طرف طبری نے توجہ کی ہے اور محض طیباریوس (Tabarius) اور اسکے بعد کے بادشاہوں کا ہرقل تک باقتصار ذکر کر دیا ہے یعنی انکی مدت سلطنت بیان کر دی ہے۔ حوادث و اخبار کچھ نہیں لکھے۔ (لہذا ابن اثیر طبری کی اس فروگذاشت پر متعجب ہیں)

مسعودی نے "مروج الذہب" میں البتہ کچھ لکھا ہے۔ اور ابن اثیر نے سب کچھ انہی سے نقل کیا ہے۔ مگر اسمیں حروب عظیمہ، اتساع مملکت، انکسار اعداء، بونیوں[۳] و مقدونیوں کی جنگ وغیرہ کے حالات کچھ بھی نہیں بیان کئے۔ البتہ ابن خلدون نے رومس (Romulus) اور اسکے بھائی ریمس اور قیام الوجمہوریت کی تاریخ بیان کی ہے۔ فتنہ قرطاجنہ[۱] (Carthage) کے ذکر میں

۱؎ قرطاجنہ بفتح جیم و تشدید نون مفتوحہ ابن حوقل و یاقوت و ابن خلدون وغیرہ نے یہی لفظ لکھا ہے۔ ہمارے علما ہم حصر کے ساتھ الف و تشدید قرطجنہ بھی لکھتے ہیں، اور بعض فرانسیسی علما کی پیروی میں قرطاجہ بھی لکھنے لگے ہیں۔ یہ افریقہ کا ایک شہر تھا جو خلیفہ عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایام میں برباد ہوا اور اسکی خرابی پر تونس (Tunis) آباد ہوا۔ پرانے سکے جو محفوظ ہیں ان پر یہ نام اس طرح کھدا ہوا ہے: قرت حدسہ جسکے معنی ہیں نیا شہر جو القریۃ الحدیثہ کے مقارب ہے۔ ۸۵۰ سنہ قبل مسیح میں اسکی بنیاد پڑی تھی، افریقہ میں فینیقی قوم کی یہ سب سے پہلی آبادی تھی۔

۲؎ یعنی رومس اور ریمس وغیرہ کا حال نہیں لکھا۔ ۳؎ وہ فینیقی جو قرطاجنہ میں آباد تھے بونی کہلاتے ہیں۔

ایک علیحدہ فصل منعقد کی ہے۔

ایک مقام پر لکھا ہے کہ شاہ نوبہ (Nubia) سے اہل رومیہ کی لڑائی چھڑ گئی تو شاہ نوبہ بربر کی امداد کے سبب غالب ہو گیا۔ اس سے مراد غالباً وہ لڑائی ہو گی جو نومیدیا[1] (Numidia) یعنی جزائر میں واقع ہوئی تھی۔ کیونکہ نوبہ جزائر میں سے نہیں ہے اور نہ بربر نومیدیا کو بربر نوبہ سے کوئی مناسبت ہے اس لئے کہ بربر مغرب (نومیدیا وغیرہ) تو اتنے قبائل ہیں جن کا شمار کرنا بھی مشکل ہے اور ان کے بلاد کی فراخی و وسعت بھی ایسی ہی کچھ ہے اور انکا مذموم و محقر ہونا بھی معروف ہے چنانچہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

رایتُ آدمَ فی نومی فقلتُ لہٗ — ابا البریۃ ان الناس قد حکموا

حضرت آدم کو میں نے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اے خلق خدا کے باپ لوگ کہتے ہیں کہ

انَّ البرابرَ نسل منک قال انا — حوّاءُ طالقۃٌ ان کان ما زعموا

بربر آپ کی نسل سے ہیں؟ فرمایا کہ اس میری! اگر یہ بات ہو جیسا کہ انکا خیال ہے تو حوا پر طلاق پڑے۔

اور اہل نوبہ ممدوح چلے آتے ہیں حتیٰ کہ یاقوت نے ایک حدیث بھی انکے متعلق روایت کی ہے۔ مَن لم یکن اخٌ فلیتخذ اخاً من النوبۃ ۔ یعنی جسکے کوئی بھائی نہ ہو تو وہ نوبہ والوں میں سے کسی کو بھائی بنا لے۔

مختصر یہ کہ غالباً کتاب ابن خلدون میں یہاں نومیدیا کی جگہ نوبہ جو لکھا گیا ہے تو یہ تصحیف ہے، علامہ ابن خلدون کی شخصیت اس سے بری ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

عرب کے نزدیک جو بادشاہوں کی تقسیم شائع ہے وہ تین طبقات پر مشتمل ہے۔ طبقہ اولیٰ صابیوں کا ہے، یہ قسطنطین پر ختم ہوتے ہیں۔ دوسرا طبقہ ملوک متنصرہ (نصرانیوں) کا ہے۔ یہ قسطنطین سے شروع ہوتا ہے۔ طبقہ ثالثہ میں بعد ہجرت کے بادشاہ ہیں۔

اسم روم عرب کے نزدیک تینوں طبقات پر اطلاق پاتا ہے۔ مگر صحیح یہ ہے کہ اس سے طبقہ اولیٰ اور چند ملوک طبقہ ثانیہ مراد لئے جائیں۔

مسعودی اور انکے تتبع میں ابن اثیر وغیرہ نے لکھا ہے کہ تاریخ رومانی میں اول بادشاہ غایوس قیصر

---

[1] نومیدیا: شمال افریقہ میں کارتھیج اور مراکش کے درمیان وہ ملک تھا جس کی جگہ آج کل الجیریا (Algeria) واقع ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی سے یہ نام صفحۂ افریقہ سے غائب ہے۔ ۱۲

(Gaius Caesar) (۱۰۴ سے ۱۲ ق م) شمار کیا جاتا ہے اور دوسرا اولیوس۔
یہاں مسعودی سے خطا ہوئی ہے۔ یولیوس غایوس ہی کا دوسرا نام ہے۔ یہ دونوں نام ایک ہی شخص کے ہیں۔ رومانیوں کے تین تین نام بلکہ زیادہ بھی ہوا کرتے تھے۔ ہاں مسعودی کا یہ کہنا کہ اغسطس کو اول ملوک رومان سمجھنا بعید از صواب ہے۔ درست دیکھا ہے۔

اغسطس (Augustus) کے معنی جلیل (بڑے) کے ہیں مسعودی نے اسکا ترجمہ ضیا لکھا ہے۔ یہ بھی حقیقی معنی سے قریب ہیں۔ مگر ابن اثیر کے قول میں ضیا کے ضاد کا نقطہ اڑ گیا اور یائے تحتانی کی جگہ بائے موحدہ نے لے لی۔ کتابت میں تصحیف ہو گئی ہے۔

دوسرا بادشاہ طیباریوس (Tiberius Claudius Nero) (۴۲ ق م۔ ۳۷ء م) ہے۔ اسکے بعد جو بادشاہ ہوئے ہیں انکے ناموں میں علماے عرب سے تصحیفات ہو گئی ہیں مسعودی اور دوسرے مورخوں نے انکے عہد میں جو حوادث ہوئے ہیں وہ بھی گنائے۔ مثلاً

طیباریوس کے زمانے میں حضرت مسیحؑ کا ظہور۔ اصطفانوس رئیس الشمامسہ کا قتل، بطرس و بولس کا مدینہ رومیہ میں سولی پر چڑھایا جانا، طیطس کے ہاتھ پر بیت المقدس کا فتح ہونا (۷۰ تا ۷۱ بعد میلاد) اسی زمانے میں یہود کا قتل دادی۔ پھر بیت المقدس کا دوبارہ خراب کیا جانا جو ایام واقیس میں واقع ہوا۔ وھلم جرا

یہ تمام وہ اخبار ہیں جو دیانت یہود و نصاری سے متعلق ہیں انکو تو مسعودی و ابن الاثیر وغیرہم نے بیان کیا ہے۔ مگر حروب عظیمہ کی تاریخ اور امور سیاست کی خبریں چھوڑ دی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسعودی کا ماخذ کتب نصاری روم و سریان ہے۔ جن میں دینی اخبار تو درج کئے گئے ہیں۔ مگر امر حروب افتتاح بلدان کو دنیوی باتیں سمجھ کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ حالانکہ توسیع مملکت کے لحاظ سے دیکھو تو ایام قیاصرہ کے یہ کارنامے اہل جمہوریت کے عہد سے زیادہ شاندار اور قابل تذکرہ ہیں۔
حروب وہاں ہیں سے وہ حرب جو ایام قیاصرہ میں ہوئی اور جسکا علماے عرب نے تذکرہ نہیں کیا غزوہ غالوس[1] ہے

---

[1] غالوس (Gallus Caius corni) (۶۹ تا ۲۶ ق م) شاعر بھی تھا۔ سامل افریقہ پر انطونی کی افواج پر اس نے فتح حاصل کی تھی۔ اور قلو بطرا کو گرفتار کیا تھا۔ جسکے انتقال کے بعد یہ چند سال تک مصر کا حاکم رہا! ایک دشمن نے شاہ اغسطس کو اس کی طرف سے ایسا بہرہ کا دیا کہ اسے اپنے منصب سے برطرف ہو کر خودکشی کرنا پڑی۔

یہ خالوس شاہ اغسطس کا مصری عامل تھا۔ اس نے بحر احمر کو پار کرکے ساحل حجاز پر پڑاؤ کیا پھر اندرون ملک کی طرف بڑھا مگر راہ بتلانے والوں نے اس سے خیانت کی اس لئے سرگشتہ و حیران ہو کر اس قدر رنج و تعب اٹھائے کہ بیان سے باہر ہیں آخر بلاد یمن میں جا کر نکلا اور مشہور قدیم دار السلطنت مآرب کا محاصرہ کر لیا مگر کچھ فائدہ حاصل نہ ہوا آخر تنگ آکر خائب و خاسر لوٹنا پڑا۔

روماں کی مملکت کا امتداد در عہد کامرانی ۹۶ء سے ۱۸۰ء بعد میلاد تک ہے۔ اسی کا نام "برہۂ سعیدہ" ہے۔ شاہ طرایانس کا عہد اس مملکت کے سب سے زیادہ وسعت و امتداد کا زمانہ تھا حتیٰ کہ بلاد رومانیہ اور بعض بلاد ہنسا (Hungary) اور بعض جنوبی روسیا کے حصے نیز آرمینیا مابین جنوب فلسطین و حجاز بعض حصہ حجاز بلاد ارض جزیرہ یعنی مابین النہرین (دجلہ و فرات) سب ایک شخص کا عمل دخل تھا۔ یا امتداد مملکت سکندر؛ یا یوں سمجھو کہ مملکت عرب میں اوّل زمانہ خلافت بنی عباس یعنی منصور سے رشید تک جس قدر ملک تھا اس کے موازی قرار دیا جا سکتا ہے۔

اب رہی یہ بات کہ ایسی اہم و جلیل تاریخ کتب روم و سریان میں کیوں نہیں ملتی تو اس کی وجہ یہ ہے، کہ یہ تصانیف مذہبی نقطۂ خیال سے لکھی گئی ہیں۔ ان کا موضوع ملت مسیحیہ و یہودیہ کے اخبار دینیہ ہیں نہ دنیویہ۔ البتہ کتب روماں میں کل تاریخ ضبط کی گئی ہے۔

مختصر یہ کہ روماں کے تاریخی وقائع کا اگر بیان کیا ہے تو مورخین عرب میں سے ابن خلدون نے کیا ہے مگر بہت نامکمل صرف ایک دو معرکوں کا حال ہروسیوس مورخ لاطینی سے لے لیا ہے۔

برہۂ سعیدہ کے بعد یعنی ۱۸۰ء بعد میلاد سے روماں کے امور سلطنت میں انحطاط و ہبوط نظر آنے لگتا ہے۔ سرداران لشکر امور سلطنت پر مسلط دکھائی دیتے ہیں اور تصرف و تدبیر انہی کے ہاتھ میں نظر آتی ہے۔ اس وقت دولت روماں کی وہی صورت ہے جو خلفائے بنی عباس میں عہد مستنصر، مستعین، معتمد وغیرہم میں تھی کسی شاعر نے ان خلیفوں کے عدم اختیار و سلطت کا یوں خاکہ اڑایا ہے۔

خلیفۃٌ فی قفصٍ بَینَ وصیفٍ و بُغا   یقول ما قال لہٗ ، کما تقول البغا

خدمتگاروں اور کارلونڈیوں میں خلیفہ ایک پنجرہ کا جانور بنا ہوا ہے جو کچھ یہ دونوں اسے پڑھاتے ہیں وہی طوطے کی طرح بول دیتا ہے

اُس زمانے میں ملوک روماں کی بھی یہی حالت تھی۔ نام کے بادشاہ یہ تھے مگر کام دوسروں کے ہاتھ میں تھا۔ سیادت جہال میں آگئی تھی اور جس قوم کے سردار جاہل ہوں اُس میں جو ابتری ہو کم ہے شاعر

جاہلیت افوہ الاودی نے خوب کہا ہے۔

لا یُصلح الناسُ فوضیٰ لا سراۃ لہم　　ولا سراۃ اذا جہالہم سادوا

ان لوگوں میں صلاحیت نہیں آ سکتی جن میں سب کے سب برابر ہوں اور کوئی سردار نہ ہو اور نہ وہ سرداری کام کی ہو جب کہ جاہل لوگ سردار بن جائیں۔

غرضکہ دقلطیانوس اور قسطنطین کے زمانے تک یہی حال رہا قسطنطین طبقہ ثانیہ یعنی ملوک متنصرہ قبل ہجرۃ کا پہلا بادشاہ ہے۔

عرب نے طبقہ ثانیہ کی تاریخ بھی ایسی ہی لکھی ہے جیسی طبقہ اولی کی یعنی اس طبقہ کے متعلق بھی امور مدنیہ کا بیان تو کیا ہے مگر امور دینویہ کا نہیں کیا۔ بات وہی ہے کہ انہوں نے دونوں طبقوں کا حال نصاری کی ان کتابوں سے لیا ہے جن کا تذکرہ ہو چکا۔

نصاری کی دینی تصانیف دو قسم پر ہیں۔ ایک تو وہ جنہیں باجمال یا بہ تفصیل سالانہ واقعات سنہ وار ضبط کئے گئے ہیں۔ دوسری وہ جنہیں قدیسین و شہداء کے قصص ہیں اور یہ دونوں تاریخ کی کتابیں ہیں کہی جا سکتی ہیں۔

ایام قسطنطین میں مملکت کے دو حصے ہو گئے تھے۔ ایک غربیہ جسمیں رومیہ (Rome) واقع تھا دوسرا شرقیہ جسمیں قسطنطنیہ واقع تھی۔ پانچویں صدی بعد میلاد میں مملکت غربیہ پر امم بربریہ کہ شمال اورپا (Europe) و آسیا (Asia) نے ترکتازی کی ان میں وندال (Vandals) قوط (Goth) اور فرنک (افرنج) (French) شامل تھے بعض نے رومیہ پر غلبہ پالیا اور اہل شہر کو قتل بھی کیا اور قیدی بھی بنایا۔ وندال جزیرہ اندلس پر قابض ہو گئے اور انہی سے اس خطے کا نام اندلس پڑ گیا۔ افرنج اس خطے پر متصرف ہو گئے جسے فرنسا France کہتے ہیں۔

مملکت غربیہ کا انقراض ۴۷۶ء میں ہوا۔ اسکا آخری بادشاہ رومولس اغسطلس ہے (Romulus Augustulus) اغسطلس تصغیر اغسطس ہے۔ اسکے نام میں اول بادشاہ بانی رومیہ یعنی رومولس کا نام بھی ہے اور جمہوریت کے اول بادشاہ یعنی اغسطس کا نام بھی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ سلطنت وہاں کی ابتدا رومولس سے ہوئی اور اغسطس سے اس نے وسعت حاصل کی اور رومولس اغسطلس پر اس کا انقراض ہو گیا۔

یہ امر واضح ہو چکا ہے کہ اخبار مسعودی وغیرہ ان کتب تاریخ سے ماخوذ نہیں ہیں جن میں تمام حوادث کے احوال کا تتبع کیا گیا ہو بلکہ نصاری کی کتب دینیہ سے ماخوذ ہیں جنمیں سے بعض محض قصص شہداء و قدیسین پر محتوی ہیں اسی قبیل سے اصحاب کہف کا قصہ مشہور ہے۔ ساڑھے تین سو سال بعد ظہور اسلام سے ایک صدی پہلے اور پانچویں

عہ جو اصل میں وندالوسیا تھا۔ ۱۲ منہ

صدی عیسوی کے آخر میں سریان نے اس کو قید کتابت میں لیا۔ وہ روایت سریان نے کی ہے اسکی منصوص عبارت کا ترجمہ یہ ہے۔

داقیسؔ نے قتل نصاریٰ کا سخت تتبع کیا تھا (کتب تاریخ سے بھی یہ تحقیق صحیح ہے) اسکا زمانہ سلطنت ۲۴۹ء سے ۲۵۱ء تک ہے بعض حروب کے ضمن میں شہر افسس میں اسکا گزر ہوا تو اُس نے وہاں کے لوگوں کو بتوں کے آگے سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ شہر میں سے سات اشخاص نے صاف انکار کردیا۔ ان سے اُس نے ملاطفت برتی اور پرچاتا رہا۔ آخر یہ کہکر جنگ سے واپس آنے تک آپ حضرات کو مہلت دیتا ہوں۔ منزل مقصود کو روانہ ہوگیا۔ انہیں اس ظالم سے خوف ہوا اور ایک پہاڑ کے غار میں (جو شہر کے پاس تھا) جا چھپے۔ جب دقیس واپس آیا تو انہیں پوچھا لوگوں نے کہا کہ وہ تو بت پرستی پر راضی نہیں ہوئے اور غار میں جا گھسے ہیں۔ یہ سُن کر اُس نے غار کے دروازے کو چن دینے کا حکم دیا تاکہ اسی میں وہ گھر کر مرجائیں۔ جو مومنین مسیح وہاں موجود تھے اُنھوں نے ایک پیتل کی لوح پر ان کا حال لکھ کر غار کے دروازے کے اندر لگا دیا۔

داقیس مرگیا اور ملوک طبقۂ اولے ابھی گزرتے گئے حتیٰ کہ قسطنطین بادشاہ ہوا اور عیسائی ہوگیا۔ اسکے بعد بھی بادشاہ ہوتے رہے حتیٰ کہ تاویسوس اکبر بادشاہ ہوا جسکا عہد ۳۷۹ء سے ۳۹۵ء بعد مسیح تک ہے۔

جب تاویسوس اصغر کا زمانہ آیا جسکا عہد ۴۰۸ء سے ۴۵۰ء بعد مسیح تک رہا تو انہیں ایام میں کسی کے دل میں یہ بات آئی کہ وہ بھیڑ بکریوں کے لئے غار کے منہ پر ایک حظیرہ بنائے ایسا کرنے میں غار کے منہ پر جو پتھر چنے ہوئے تھے وہ ڈھے پڑے۔ دھوپ جو اندر گئی تو اصحاب کہف جو اب تک بحکم الٰہی وہاں سوئے تھے جاگ اُٹھے۔ مگر اپنے رنگ روغن (اور اشیا میں) کوئی چیز انہیں بدلی ہوئی دکھائی نہ دی۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ کوئی ایک رات بھر سوئے ہونگے۔ ان میں ایک کا نام یملیخا تھا

ا؎ Gaius Messius Quintus Trajanus Decius

یہ صاحب نفقات بھی تھے۔ اس لئے غار سے نکل کر شہر کی طرف کھانا خریدنے چلے واقیس کے خوف سے ان کا بھیس بدلا ہوا تھا۔ دل میں ڈرتے تھے کہ پکڑے نہ جائیں۔ دروازہ شہر پر پہنچکر آنکھ اٹھی تو اس پر دین نصاریٰ کی علامت صلیب نظر آئی۔ بہت متعجب ہوے۔ ادھر سنا کہ لوگ مسیح کی قسمیں کھاتے ہیں۔ پھر شہر کر دیکھا تو اسکی بھی کایا پلٹی ہوئی تھی تعجب پر تعجب ہوتا رہا۔ جلد کھانا لیکر سیا تھیول کی طرف چلنے کی ٹھہرائی (ایک دوکان پر) روٹی لی دام دیے۔ تو یہ دقیس کے نام کے سکے تھے، جسے مرے ہوئے اب سو برس ہو چکے تھے۔ نانبائی نے تامل کے بعد یہ جانا کہ اس شخص کو کہیں پرانا خزانہ مل گیا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ جناب دیکھیے مجھ سے نہ چھپائیے، یہ جو خزانہ آپ کو ملا ہے اس میں سے کچھ یاروں کا بھی حصہ ہے۔ ذرا مجھے بھی بتائیے کہ وہ کہاں ہے ورنہ میرے ساتھ حاکم شہر کے پاس چلیے۔ یہ بیچارے ڈر گئے اور کہنے لگے کہ بھائی خزانہ وزانہ کیسا۔ یہ سکے تو مجھے کل اپنے والد کے گھر ملے تھے۔ آخر اس بات پر دونوں میں شور وشغب ہونے لگا اور گرد وپیش کے لوگ جمع ہو گئے یملیخا کو حاکم واسقف شہر کے پاس لے گئے۔ یہاں پہنچکر انھوں نے اپنا سب قصہ صحیح صحیح بیان کر دیا، جسے سن کر تمام لوگ غار کی طرف لپکے جہاں باقی اصحاب کہف کو بھی دیکھا۔ پھر تو انکے تعجب وحیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اصحاب کہف اسکے بعد پھر سو گئے اور اسی زمین میں ان کا وصال ہو گیا لوگوں نے اس غار پر ایک گرجا بنا دیا"

(محاضرات العلامۃ السنیور جویدی صفحہ ۱۶۵)

اسی قبیل سے ایک اور قصہ بھی ہے جو پہلی صدی بعد میلاد کی کتب یہود میں موجود ہے۔ اس کو باجمال ذکر کر دینے میں مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔

"ارمیا نبی کے ایک حبشی شاگرد تھے جو انکی خدمت کیا کرتے تھے انکا نام ابیلک تھا جب بیت المقدس پر بخت نصر کے تسلط کا خوف ہوا تو ارمیا نبی نے انھیں بھوکوں اور ناداروں کے لئے انجیر چننے کے لئے بھیجا چنانچہ انھوں نے ایک جھاڑ صیر کر لیا اور لا کر

واپس ہوئے اس دن دھوپ بہت تیز تھی ایک گھنے درخت کے سایہ میں ذرا دیر کو
ٹھہرے تو بحکم الٰہی انہیں نیند آگئی اور ایسے سوئے کہ ساٹھ سال تک سوتے رہے - اس
اثنا میں بخت نصر کا بیت المقدس پر تسلط ہو گیا خون خرابے کے بعد بنی اسرائیل کی ایک
خلق کثیر کو یہ بردہ بنا کر بابل کو لے گیا - ارمیا بھی انکے پیچھے پیچھے گئے - ساٹھ سال
گزرنے پر بحکم خدا ابیملک کی آنکھ کھلی، انجیر جیسے تھے ویسے ہی تھے - ابیملک کہنے
لگے کہ آنکھ جھپک کر کھل گئی تو در دسر اور گرانی سی ہو رہی ہے - ارمیا کا خوف
نہ ہوتا تو جی بھر کے سوتا اور انجیروں کی ٹوکری اُٹھا کر چل پڑے جب شہر میں پہنچے
تو وہاں تبدیلی نظر آئی - آنکھیں مل مل کر دیکھتے رہے اور حیران ہوتے رہے - اتنے
میں ایک سن رسیدہ گبڑے بڈھے کو دیکھا تو اُس سے دریافت کیا کہ اس شہر کا
کیا نام ہے - اس نے کہا کہ اورشلیم "قدس" - ابیملک نے پوچھا کہ ارمیا نبی کا کچھ
حال معلوم ہے کہاں ہیں - اب تو بڈھے نے ابیملک کو تاڑنا شروع کیا اور کہنے لگا
کہ آج ارمیا کا حال پوچھنا حماقت ہے جنہیں یہود کے ساتھ یہاں سے گئے ہوئے
ساٹھ سال ہو گئے وہ تو بابل میں ہیں - ابیملک بولے کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے آج ہی صبح کو
تو اُنھوں نے مجھے انجیر لینے کے لئے بھیجا ہے اور آپ دیکھ رہے ہیں کہ انجیروں کی تازگی
اور تری میں کمی تک نہیں آئی - اب بڈھا پہچان گیا کہ ہو نہ ہو یہ اللہ کی نشانیوں میں سے
ایک نشانی ہے - انکا نام باروک تھا اور تلامیذ ارمیا میں سے تھے - ابیملک کا یہ حال
لکھ کر انھیں بھیجا اور اس قصۂ عجیبہ و مُدہشہ سے انہیں آگاہ کیا -

اِس قسم کے قصوں سے یہ غرض ہے کہ قیامت کی حقانیت مبرہن ہو جائے اور بعث و نشر
اموات پر خدا کی قدرت ثابت ہو - اس اعتقاد پر یہود و نصاریٰ مع اہل اسلام کے متفق ہیں -
غرضکہ کتب یہود و نصاریٰ میں اس قسم کے وقائع تو ہیں مگر امور سیاسیہ کی تاریخ نہیں ہے

(محاضرات سیئور)

ختم جوانی

حضرت آرزو لکھنوی

آ گئی پیری جوانی ختم ہے　　صبح ہوتی ہے کہانی ختم ہے

حسرتوں کا دل سے قبضہ اُٹھ گیا　　غاصبوں کی حکمرانی ختم ہے

ہوگیا ذوقِ نظارہ خود فنا　　یا بہارِ بوستانی ختم ہے

وقت بینش کیف خود بینی کہاں　　پیاس ہے موجود، پانی ختم ہے

بجھ گیا دل ہوگئی گونگی زباں　　اگلی پچھلی ہر کہانی ختم ہے

حسن نے غارتگری کر دی تمام　　دل کا ذوقِ کامرانی ختم ہے

ماجرائے غم چراغِ صبح کا　　ختم اور اپنی زبانی ختم ہے

خستگی کی حد میں ہے آسودگی　　بے تسلی نوحہ خوانی ختم ہے

صورتِ یخ بستہ ہے جوشِ گداز　　بہتے دریا کی روانی ختم ہے

ذکرِ غم میں لذتِ غم پھر کہاں　　اپنے ساتھ اپنی کہانی ختم ہے

آرزو تھا اک اندھیرے کا چراغ
اُسکی بھی اب ضوفشانی ختم ہے

سُرخی؟

رند کے قلم سے

دنیا کیا ہے گویا ایک بڑے پیمانہ کا چڑیا گھر، جہاں رنگ برنگ کے جانور طرح طرح کی بولیاں بولتے اور اپنے اپنے طرز پر رنگ رلیاں مناتے نظر آتے ہیں۔ کوئی مناظر فطرت کا دلدادہ شفق کی سرخی کا شیدائی ہے کسی آنکھ میں چشم مخمور کی ہوش ربا سرخی نے گھر کر لیا ہے۔ کسی کی طبع نازک گلاب کی سُرخ پنکھڑیوں پر لوٹ پوٹ ہے کسی عاشق مزاج کا دم عقیق لب کی سرخی پر نکلتا ہے، کہیں عارض جاناں کی چکنی چکنی سُرخی پر دل پھسلا جاتا ہے۔ کسی مے آشام کو بادۂ گلفام کی سرخی نے مدہوش بنا رکھا ہے۔ کہیں برگ حنا کی سُرخی کسی رنگیلے متوالے کا دل پسیے ڈالتی ہے، کہیں چشم نیم باز کے لال ڈوروں نے اچھے خاصے انسانوں کو لٹو بنا رکھا ہے۔ الغرض جدھر دیکھئے اُدھر سرخی کا دور دورہ اور سُرخ جھنڈے کی حکومت ہے تو ہم بھی اسی سرخی زدہ گروہ میں شامل۔ مگر ہمیں اپنی محرومی قسمت پر روتے روتے اپنی بدمذاقی پر ہنسی آجاتی ہے کہ ہمارا دامن رندی (جس سے ہماری بڑی اونچی اونچی توقعات وابستہ تھیں) اُلجھا بھی کہاں کہ مضمون کی سرخی میں! وہ خوش نصیب قارئین ادب جنہیں ابھی تک لیلائے مضمون نگاری کی پیچ در پیچ زلفوں کا سودا نہیں ہوا وہ نہیں سمجھ سکتے کہ اس سیاہ پوش لال پری کے شیدائیوں کو کیسی کیسی سخت جانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور کیسی کیسی سنگلاخ زمینوں میں "جوئے شیر" لانے کے لئے "فرہادی تیشے" چلانا پڑتے ہیں۔ ہم اپنے ان خوش قسمت احباب کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ بھول کر بھی اس سرخی کے خبط میں نہ پڑیں۔ ورنہ سمجھ لیں کہ اس سرخی سے آنکھ لگانا شب ہائے تیرہ و تار میں "طوفان میل" کے انجن کو پوری رفتار سے ہنکانے اور ریلوے سگنل کی سرخی سے برابر آنکھ لڑائے رکھنے سے کوسوں دُور اور کہیں زیادہ دیدہ ریزی اور دیدہ دلیری کا کام ہے۔ — والٹر اسکاٹ

اسی کے فراق میں مرگیا۔ اور ملٹن نے اپنی آنکھیں پھوڑ لیں۔ جو محض دیوانے اور مجذوب ہوکر رہ گئے انکی تعداد کا تصور مضمون نگاری کی موت ہے۔

بہر حال۔ ہم تو آپ بیتی سنانے آئے ہیں۔ پند نامہ سعدی محض ایک ناخواندہ مہمان کی طرح وارد ہو گیا۔ ہاں تو۔ ہم یہ کہہ رہے تھے کہ اپنی خوش قسمتی اور قارئین کی بدقسمتی کے طفیل ہم آج کل ذرا مضمون نگار ہو پڑے ہیں اور مرض ترقی پر ہے۔ چنانچہ جب یہ مسرت افزا خبر پائی کہ خلاق عالم کے فضل و کرم سے کارکنان ادب بھی اپنے یہاں "خاص نمبر" نکالنے کی اخباری سنت کو جاری کرنے والے ہیں تو ہم نے بلا تامل اس کار ثواب میں شریک ہونے اور ادبی چھپر کو اٹھانے میں احباب کا ہاتھ بٹانے کا تہیہ کر ڈالا۔ اس فیصلہ کا لازمی نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا۔ یعنی ہمیں فوراً یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ اس مضمون کی سرخی کیا ہوگی بظاہر یہ مسئلہ ذرا ٹیڑھا تھا۔ اس واسطے کہ ابھی تک ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ اس مضمون میں ہم، کہنا کیا چاہتے ہیں۔ مگر خدا مروجہ کثرت تعلیم کا بھلا کرے جس کی بدولت دماغ کے "ڈیلی ٹیلیگراف" میں اس خبر کے شائع ہوتے ہی سیکڑوں ہلکی اور تیز، حزنیہ، طربیہ، مذاحیہ اور طنزیہ ہر رنگ کی کثیر التعداد سرخیوں نے درخواستوں کا ایک بھاری بھرکم پلندہ ہماری قوت انتخاب کے سر دے ٹپکا۔ جولانی طبع کے اس سیلاب اور قحط الے مضمون نگاری کے اس دیو کا حال دیکھ کر ہم پہلے تو بہت خوش ہوئے اور یہ سمجھتے ہوئے کہ بس ایڈیٹری ملنے میں محض پرچہ چھپنے کی دیر ہے وفور شوق میں کچھ دور ہر سرخی کے ساتھ میدان تصور میں تیز گامی کرتے نظر آئے اور جہاں کہیں زمین ذرا ناہموار ہونے لگی وہاں سے شاندار پسپائی کرتے دکھائی دیئے۔ مگر افسوس کہ بہت دیر نہ گزرنے پائی تھی کہ فرس تخیل کے ہانپنے کی صدا کانوں میں آئی اور ہمیں بتدریج اسکا احساس ہونے لگا کہ ایڈیٹری بہت دور اور ہماری شکست بہت قریب ہے۔

اس رواروی میں ٹائم پیس پر جو نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ گو عمر عزیز کے پورے دو گھنٹے اس ادھیڑ بن کی نذر ہو چکے ہیں۔ لیکن ہم کرسی پر ہیں۔ نظر کھڑکی کے باہر ہے۔ قلم ہاتھ میں ہے اور اچھوتے قرطاس کا پنڈا ابھی تک کورے کا کورا ہی ہے۔ البتہ بحر اسود میں پے در پے غوطہ زنی کے باعث نوک قلم نے سیاہی کی ایک خاصی مقدار جذب کر لی ہے۔ ہم نے مانا کہ ہماری ریاضی کی تعلیم جبریہ اصول پر ہوئی تھی اور اس ادب سوز مضمون میں ہماری استعداد کا پایہ بفضلہ ہمیشہ اسلامی حدود کے اندر ہی رہا تھا مگر اب ہم ایسے گئے گزرے بھی نہیں ہیں کہ بہت جلد اتنا حساب نہ لگا لیتے کہ اگر مضمون اسی رفتار سے لکھا گیا تو عمر

فلاح بھی اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ اس اثنا میں ہمالیہ کا سلسلہ خلیج بنگال کی سرزمین ہو جائے مگر ہماری رسائی اس طور تک نہ ہوگی جہاں سے فردوسی، انوری، اور سعدی کھڑے کھڑے "پیغمبری سخن" لے آئے تھے۔ اس نتیجہ پر پہنچکر ہم ذرا چونکے اور بلا تکان دس پانچ نئی سرخیوں کا رنگ دیکھا بھالا۔ مگر پھر بھی مضمون ہنوز روز اول ہی رہا۔ اب تو ہم نے ہتھیار ڈال دیے یعنی قلم رکھدیا اور سر کے بال دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کھانسا کھنکارا کہ شاید اب بھی دماغ کا ٹٹو کسی خاص روش پر لگ جائے۔ مگر بھلا وہ اپنی بے راہ روی سے کہاں باز آنے والا تھا۔ اس نے اتنی سی ڈانٹ ایک پھریری میں ٹال دی اور برابر منہ زوریاں کرتا ہی رہا۔ تب عاجز آکر ہم نے دنیا کے ممتاز اور مستند شہسواران ادب سے مدد طلب کرنا شروع کی اور یہ دیکھنے لگے کہ آیا انھوں نے سرخی کی ہفتخوان کو کیونکر طے کیا ہے اور اس راہ میں پسر زال کی طرح کیسے کیسے سیاہ و سفید دیو پچھاڑے ہیں۔

سب سے پہلے تو مشرقی ہونے کی حیثیت سے اپنے یہاں کے چابکدستوں پر نظر کی۔ حافظ، عرفی، نظیری، میر، سودا اور مرزا غالب، جسے دیکھا وہ سرخی کی بدعتوں سے عاجز آکر غزل گوئی پر مائل نظر آیا۔ ان سب نے ایک سرخی کے تحت میں ایک سے زیادہ شعر لکھنے کی زحمت گوارا نہ کی۔ ادھر دوسرا شعر شروع کیا اور ساتھ ہی مضمون بھی بدل دیا۔ شاید اسی حقیقت کو نظر رکھتے ہوئے غالب کی فطری حق پسندی نے انھیں یوں صاف صاف کہنے پر مجبور کر دیا۔ ؎

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ　　پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

مشرق کا یہ حال دیکھ کر ہم نے اشہب دماغ کو ایسی زبردست ایڑ لگائی کہ ایک جست ہی میں سات سمندر پار کر مغرب میں جا دھمکے۔ اس ولایت میں پہنچکر سب سے پہلے جس صاحب تصنیف کی طرف ہم نے نظر کی وہ شکسپیئر کی ذات تھی۔ ہم نے سلسلہ وار اس کے کچھ اوپر تیس ڈراموں کی سرخیوں کا جائزہ لینا شروع کیا تھا ہی کہ ہمیں یاد آگیا کہ لیجئے جس مصیبت میں ہم آج گرفتار ہیں اس سے دنیا کا یہ مایہ ناز شاعر بھی نہیں بچ سکا۔ یعنی ایک موقع پر ایک مکمل ڈرامہ کی تصنیف اور اس میں متعدد جیتی جاگتی ہستیوں کی تخلیق میں کامیاب ہونے کے بعد اُسے مناسب سرخی کی تلاش لاحق ہوئی۔ مگر اس کا بھی وہی حال ہوا جو آج ہمارا ہے۔ یہاں تک کہ بالآخر اس نے بھی اس ذہنی پرخار کو تنگ آمد بجنگ آمد سمجھکر کیا اور قلم دے پھینکا اور جھلا کر اس ڈرامہ کا نام "جو آپ کا جی چاہے" رکھدیا۔ شکسپیئر کا یہ فیصلہ قارئین کی نسبت غیر معمولی

حسن ظن اور سرخی کے بارے میں مصنف کے انتہائی استغنا یا غصہ کو ظاہر کرتا ہے۔ ورنہ بالعموم مصنف لوگ ایک نکتہ بھی قارئین کی پسند پر چھوڑ دینا گوارا نہیں کرتے۔ اس واقعہ کا وقت پر یاد آجانا ہمارے لئے محض باعث تقویت قلب ہی نہیں ہوا بلکہ ہمیں اس خیال نے بہت مسرت پہنچائی کہ کم از کم ایک اعتبار سے تو ہم شکسپیر کے ہم پایہ نکلے۔

یہ یاد نہیں رہا کہ اسکے بعد ہم کس صاحب کمال کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ مگر تھا وہ کوئی بڑا آدمی ضرور۔ اس لئے کہ اس نے ہمیں بتایا کہ سرخی کا مسئلہ بہت اہم مسئلہ ہے۔ مناسب یہی ہے کہ پوری دماغی قوت اسکے انتخاب میں صرف کردی جائے۔ (آیندہ خدا مالک ہے) بہ وجوہ مصالح سرخی کے چند لفظوں میں پورے مضمون کی جھلک نظر آنا ازبس ضروری ہے بعض موقعوں پر یہ احتیاط بہت کارآمد ثابت ہوئی ہے۔ مثلاً اگر حسن اتفاق سے نفس مضمون کا مطالعہ مفہوم کو واضح کرنے میں قاصر رہے تو سرخی اس پر بہت کچھ روشنی ڈال سکتی ہے۔ قارئین کو بسہولت یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اصل مضمون کے لکھنے سے ہمارا مقصد کیا تھا۔ اس کے علاوہ ان احباب کی طبع نازک کا لحاظ رکھنا بھی مناسب ہے جو اچھی بری سرخیاں دیکھ کر مضمون پڑھنے کے عادی ہیں۔ یا جو محض ورق الٹنے اور سرخیاں پڑھنے کو کافی دماغی ورزش سمجھتے ہیں۔ اگر آپ کی سرخیاں عالمانہ و فاضلانہ ہونگی تو بہت جلد ان طبقات میں آپ خاصی شہرت کے مالک ہوجائینگے ...... مختصر یہ کہ ان حضرت نے بدلائل مختلفہ سرخی کی اہمیت ہمارے پیش نظر کی اور بہ تفصیل تذکرہ بھی کیا کہ برنارڈ شا اور اسی انوکھی ذہنیت کے دیگر مصنفوں سے وہ اس بارے میں بہت ہی بیزار ہیں ان لوگوں کی سرخیاں بالکل بدرنگ، قطعاً بے ربط اور سراسر بے معنی ہوتی ہیں اور نفس مضمون سے ان کو کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ ان حضرت کی رائے میں شا وغیرہ "اکدم گولی ماردینے کے قابل ہیں"

ان حضرت کی یہ پرجوش اور فاضلانہ تقریر ہمارے لئے حد درجہ مایوس کن ثابت ہوئی اور ہم نے طے کر لیا کہ انشاء اللہ جب ہمارا مضمون تیار ہو جائیگا تو اسے ہم ان بزرگ کے روبرو ہرگز پیش نہ کرینگے۔ اس کے بعد کے مضمون بھی انھیں نہ دکھائینگے۔ اس واسطے کہ یہ گولی ودلی کا معاملہ ہمیں قطعاً ناپسند ہے۔ ہمارے لئے میں بیر بہوٹی جیسی لال لال نرم نرم مخملی سرخی بھی جان سے زیادہ پیاری نہیں ہوسکتی۔

اس مایوسی کے عالم میں ہم چسٹرٹن کی طرف بڑھے اور بڑے شوق سے بڑھے۔ اس لیے کہ ایک تو ہم مدتوں سے اسکی مضمون نگاری کی دلدادہ ہیں۔ اس کے علاوہ چسٹرٹن کی سرخیوں میں خصوص

قسم کی ندرت، شوخی اور اچھوتاپن ہمیشہ نمایاں رہتے ہیں جن کی وجہ سے اسکی سُرخیاں سراسر سُرخیوں میں سُرخیاں ہی دکھائی دیتی ہیں۔ ہمارے سوال کے جواب میں چسٹرٹن نے بتایا کہ اسکے نزدیک سُرخی کی حیثیت محض اس کھونٹی کی ہے جس پر خیالات کی ٹوپی لٹکائی جاسکے۔ اصل چیز ٹوپی ہے نہ کہ کھونٹی مضمون نگار کو خیالات کا جٹڑا ٹانگنے سے مطلب نہ کہ روٹیوں کی طرح کھونٹیاں گننے سے۔ جو سہارا بھی مل جائے غنیمت سمجھو۔ تردد بے محل اور مبتدیوں کا شیوہ ہے۔ کچھ لکھنا شروع کردو۔ پھر جدھر جدھر خیالات کا سلسلہ گھسیٹ لے جائے بلا تکلف اسی سیدھ میں چلتے رہو۔ اگر وہ سُست خرامی پر آمادہ ہو تو تم بھی دھم چال چلو۔ اگر وہ بھاگے تو تم بھی بھاگو۔ اگر وہ اُچھلے کودے، جست لگائے تو تم بھی اُچھلو کودو، جست لگاؤ۔ اگر وہ بلند پروازی پر مائل ہو تو تم بھی آسمان میں ڈوب جاؤ۔ اور جب اور جہاں تھک جاؤ وہیں آشیانہ سمجھکر قیام کرو، آرام کرو۔ اور کھاپی کر سورہو۔ صبح سویرے نظر ثانی کرتے وقت جو چیز سب سے زیادہ غیر متعلق نظر آئے اسی کا ٹیکہ عروسِ مضمون کی پیشانی پر بٹھادو سرخی ہو جائیگی۔

ہمیں تو پہلے ہی سے یقین تھا کہ چسٹرٹن ضرور کوئی کام کی بات بتائیگا۔ اُس کے ان چند جملوں سے ہماری دماغی پریشانی کے بادل آن کی آن میں چھٹتے نظر آنے لگے اور مضمون کا مطلع صاف ہوتا نظر آیا اگرچہ اس سنہرے اصول کے مطابق بھی ہماری دشواریاں بالکل رفع نہیں ہوسکتی تھیں۔ تاہم یہ تسلی تو ہوئی کہ شب درمیان است۔ پہلے مضمون تو لکھ لیں پھر سرخی کی بلا سے بھی نپٹ لیں گے اور جب متعلق یا غیر متعلق کی قید نہیں رہی تو کیا تعجب ہے کہ وہ جو سامنے والی دوا کی شیشی پر سُرخ حرفوں والا لیبل لگا ہے جلدی میں اُسی کو چسپاں کردیں۔ اکثر طب کی بڑی بڑی کتابوں میں یہ سُرخی دیکھی ہے یقیناً کوئی مفید چیز ہوگی۔

اب سرخی کی طرف سے مطمئن ہوکر ہم پھر سنبھل کر بیٹھے۔ میز پر کی سب چیزیں ازسرِ نو ٹھکانے سے رکھیں مسودہ کا کاغذ جو ابھی تک کورا ہی تھا مناسب زاویہ پر قائم کیا۔ کرسی ذرا اور میز کے قریب کھسکائی اور قلم ہاتھ میں لے کر لکھنا شروع کرنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک کسی زبردست قوت نے ہمارے ہاتھ کو اس طرح روکا، جس طرح چلتا پھرتا سپاہی "ہالٹ" کا حکم سنتے ہی دفعتہً ٹھہرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہم سخت سٹپٹائے کہ یا الٰہی اب کون سی بلائے ناگہانی پیش آئی کہ اتنے میں کسی نے چپکے سے کان میں کہا "حضرت! عنوان تک تو قائم نہیں کیا۔ لکھئے گا کیا خاک!!" آپ سمجھے کہ یہ ہمت شکن آواز کس کی تھی۔ یہ وہی پرانا فرشتہ تھا جو تعلیم کی ہر منزل میں ہماری شوقِ مضمون نویسی کا نگران کار رہا تھا ہم انسا

تھے (بلکہ ہیں) اور گھبراہٹ میں بھول بیٹھے۔ مگر فرشتہ بھلا کیسے بھول سکتا تھا کہ جس زریں اصول پر ہماری مضمون نگاری کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا اس میں سرخی سب سے مقدم چیز تھی۔ ہمارے استادوں نے (خدا ہی اُن کی مغفرت کرے) مضمون لکھنے کا جو طریقہ ہمیں پڑھایا تھا، وہ یہ تھا کہ سب سے پہلے سرخی کو جلی حرفوں میں کاپی کے صفحہ پر لکھو۔ پھر کرکٹ، فٹ بال، ہاکی، امرود، مونگ پھلی، چپت بازی وغیرہم کے ناپاک خیالات کو دل سے دور کرکے انتہائی یکسوئی کے عالم میں اس سُرخی کی طرف دیکھو۔ خوب نظر جما کر دیکھو یہاں تک کہ باقاعدہ گھورنے لگ جاؤ۔ اگر اب بھی کوئی نقطہ نہ چلے تو ایک کہنی کے سہارے سر کا بوجھ ٹکا کر دوسرے ہاتھ کی ... دستے قلم کا سرا (دُم کی طرف سے) چبانا شروع کردو۔ اور ساتھ ہی ساتھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سُرخی کو دیکھتے بھی رہو۔ اس طرح سے کہ دیکھنے والا یہ سمجھے کہ تم نے سرخی کو اب کھایا اور اب کھایا۔ اس پر بھی مضمون آگے بڑھنے کا نام نہ لے تو اسٹول پر جم کر بیٹھو۔ ایک ہاتھ سے "ڈیسک" کے تختہ کو مضبوط پکڑو۔ اور سرخی کی طرف ٹکٹکی باندھے گہری سانسیں لیتے ہوئے انتہائی قوت سے دماغ پر زور ڈالو اور "الٰہی غنچۂ اُمید بکشا" کا ورد کرو۔ کیسا ہی سخت مضمون کیوں نہ ہو فوراً سٹ سے نکل پڑیگا۔

اِس قاعدہ کی مثال اس طرح پر ہے کہ مثلاً ماسٹر صاحب حکم لگا دیں کہ آج کا مضمون "گدھا" ہے۔ تم فوراً کاپی کے کورے صفحہ پر ایک خوبصورت نستعلیق "گدھا" لکھو۔ اسکے بعد سوچو کہ یہ کس قسم کی چیز ہے اور کس چیز سے اس کا قریبی تعلق ہے۔ تھوڑی دیر غور کرنے اور دو ایک بار پاؤں پٹکنے یا لاتیں جھاڑنے پر تمہاری سمجھ میں آجائیگا کہ "گدھا ایک قسم کا جانور ہے اور اُسکی مادہ کو گدھی کہتے ہیں"۔ مضمون میں ابتدا ہی مشکل ہوتی ہے۔ جہاں یہ دو جملے مکمل ہوئے باقی مضمون بہ آسانی لد چلیگا۔ پھر دوسرے دن اگر کہا جائے ... پر مضمون لکھو۔ تو اُسی طریقہ سے آدمی کی سرخی قائم کرو اور اُسکے نیچے سوچ سمجھ کر لکھو کہ "آدمی ایک قسم کا جانور ہے اور اُسکی مادہ کو عورت کہتے ہیں"۔ جہاں تم اس نکتہ تک پہونچے پھر آسمان ہی آسمان ہے۔

اب ذرا قارئین "ادب" ہی انصاف کریں کہ کہاں تو مضمون آفرینی کا یہ زوردار طریقہ جس میں مضمون سرخی سے پیدا ہوتا ہے اور کہاں چسٹرٹن صاحب کا وہ اصول جہاں سُرخی سرے سے غائب ہے۔ بھلا جس کی تعلیم اس زبردست اصول پر ہوئی ہو اس کا فرس تخیل اگر چسٹرٹن کے اصول پر ... پھر دماغ سودا کا گھوڑا نہ بنے تو اور کیا ہو چنانچہ ہم نے "ہالٹ" بول دیا۔ اور اب بھی ... کی حالت میں ہیں۔ البتہ ہم اب بھی یہی فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ سرخی مضمون سے پیدا ہوتی ہے

یا مضمون سرخی لاسے۔ جب ہم مرغی اور انڈے کی اولیت کے قضیہ مہملہ کی طرح یہ مسئلہ بھی حل کر لیں گے تو انشاء اللہ مضمون حاضر خدمت کرینگے۔ فی الحال تو قلم کے ٹوٹنے نے مکمل مقاطعہ عمل کر دیا ہے اور ہم میز کے سامنے کرسی پر جمے بیٹھے ہیں اور اُسکی دُم چبا رہے ہیں۔ البتہ اگر آپ کی زندگی کا تار حیات ہمارے مضمون کی دُم میں اٹکا ہو تو آپ بھی ہمارے ساتھ ہمزباں ہو کر دعا کیجئے کہ اللہ ہمیں جلد اس مخمصے سے چھٹکارا دے اور کوئی نئی نویلی اچھوتی پھڑکتی سرخی ہمارے پلّے پڑ جائے۔

جناب نواب احسان علی بہادر صاحب احسان آف باندہ زاندو

ہے عوض قاتل کے شکوہ گردش تقدیر کا / سخت جانی سے مری منہ پھر گیا شمشیر کا

دل سلامت جذب دل سے کام لینگے ہجر میں / رکھ لیا ہے آئنہ ہم نے تری تصویر کا

دمبدم شوق شہادت کا یہی ہے اقتضا / دیکھ لیں ہم بھی ذرا دم خم تری شمشیر کا

میری صورت دیکھکر منہ سے نکلجاتی ہے اُف / آہ سے بڑھکر ہے شعلہ ضبط کی تاثیر کا

آپ اور وعدہ خلافی آئے باور کس طرح / سچ ہے کوئی اور بھی ہوگا سبب تاخیر کا

چین رخصت ہو گیا احسان قیامت آگئی
قہر تھا دل سے نکل جانا کسی کے تیر کا

غیر مطبوعہ

کلامِ کامل

غیر مطبوعہ

(جناب علی میاں صاحب کامل مغفور)

تو رہ گئی نہ بزم میں پروانہ رہ گیا
اے شمع سوزِ عشق کا افسانہ رہ گیا

شیشہ رہا نہ بزم میں پیمانہ رہ گیا
دورِ شرابِ ناب کا افسانہ رہ گیا

میکش رہے جہاں میں نہ میخانہ رہ گیا
پیرِ مغاں کے فیض کا افسانہ رہ گیا

شاہی نہ وہ تجملِ شاہانہ رہ گیا
دنیا میں بادشاہوں کا افسانہ رہ گیا

ہر لب پہ ذکرِ ہمتِ مردانہ رہ گیا
منصور کا زمانے میں افسانہ رہ گیا

باقی رہی نہ شمع نہ پروانہ رہ گیا
دونوں کے اختلاط کا افسانہ رہ گیا

طبل و علم نہ افسرِ شاہانہ رہ گیا
کسریٰ کے عدل و داد کا افسانہ رہ گیا

گل کر گئی جو آ کے ہوا شمعِ بزم کو
اک آہ دل سے کھینچ کے پروانہ رہ گیا

پیری نے محو کر دئیے سینہ میں داغِ عشق
بستی تباہ ہو گئی ویرانہ رہ گیا

اُنکے فروغِ حسن سے پلکیں جھپک گئیں
آنکھوں کو شوقِ جلوۂ جانانہ رہ گیا

اللہ رے حفظِ رازِ محبت کا دل کو پاس
آ آ کے لب پہ نعرۂ مستانہ رہ گیا

وہ میرے احتضار میں بالیں پہ آ گئے
لبریز ہو کے عمر کا پیمانہ رہ گیا

سر رکھ کے زیرِ تیغ یہ دولت ملی ہمیں
عالم میں ذکرِ ہمتِ مردانہ رہ گیا

خاروں کو قرب سے ہوئی حاصل یگانگی
سبزہ گلوں سے دور تھا بیگانہ رہ گیا

اغیار مول لے گئے آ کر متاعِ حسن
میں ہاتھ میں لئے ہوئے بیعانہ رہ گیا

بازارِ ہوش میں نہ ملی مجھ کو یہ متاع
جو پائے جنسِ ہمتِ مردانہ رہ گیا

زندہ نہ رہتے دیکھ کے موسیٰ جمالِ دوست
بجلی گرا کے جلوۂ جانانہ رہ گیا

جلدی کی تیغ اٹھانے میں قاتل نے حلق سے
میرے گلے پہ ذبح کا شکرانہ رہ گیا

آخر ہوا بہار کا موسم بھی اے جنوں
دامن کا چاک جیب سے بیگانہ رہ گیا

ساقی روانہ ہو گیا میخوار اٹھ گئے
شیشہ کے ساتھ صبح کو پیمانہ رہ گیا

کامل [illegible] بہار کا موسم وہ گوشِ دل
فریادِ عندلیب کا افسانہ رہ گیا

شگرف نامہ

جناب چودھری محمد محب اللہ صاحب ڈپٹی کلکٹر بستی

شاعران ذوی الاحترام اپنے اشعار کی یادگار دیوان کی صورت میں چھوڑتے ہیں۔ مگر حضرت شاہ عالم بادشاہ دہلی نے جن کا شاعر ہونا اب تک معلوم نہیں ہوا ایک ایسا دیوان یادگار چھوڑا ہے جسکا زور شور اب تک قائم ہے اور جسکا سارے عالم میں ڈنکا بج رہا ہے۔ وہ دیوان لارڈ کلائیو ہے جس نے اپنی قوت بازو یا پالسی سے آج تمام ہندوستان پر قبضہ کر رکھا ہے۔

اتفاق زمانہ دیکھئے کہ میرے ایک مہربان منشی سید واجد علی صاحب رئیس سنڈیلہ نے میرا تاریخی شوق معلوم کر کے ایک قلمی کتاب عنایت فرمائی۔ اُسکو دیکھکر میں بے چین ہو گیا۔ اور فوراً خیال ...یا کہ ان معلومات کا خزانہ جو اب تک پوشیدہ تھا اُسکو کھول کر میدان میں رکھ دینا چاہئے تاکہ ...شائقین اسکے فائدے سے محروم نہ رہیں۔ میری دلچسپی اور بھی بڑھ گئی۔ جب میں نے دیکھا کہ یہ ...اس وقت کے واقعات ہیں جس وقت کہ لارڈ کلائیو کے دیوان مقرر ہونے سے میرے مورث ...اعلیٰ شیخ عظمت اللہ خاں صاحب بگڑ کے الہ آباد سے بادشاہ کا ساتھ چھوڑ کے چلے آئے اور ...ضلع اناؤ میں خانہ نشین ہو گئے۔ اسکا حال میں نے مثنوی بحر مواج کے دیباچہ میں فارسی میں ...مفصل لکھا ہے۔

بہرحال تاریخ کے مصنف منشی اعتصام الدین صاحب بنگالی بادشاہ کے ایک درباری ...تھے۔ آپنے اُسکا نام شگرف نامہ رکھا ہے۔ آپنے تحریر فرمایا ہے کہ جب حضرت ظل اللہ نے لارڈ ...کلائیو کو دیوانی عطا فرمائی اور وہ کلکتہ واپس ہونے لگے تو بادشاہ نے آب دیدہ ہو کر فرمایا کہ "اب ...تم تو جاتے ہو مجھ کو ان مکراموں کے درمیان میں تنہا کس پر چھوڑے جاتے ہو؟ - لارڈ کلائیو نے ...جواب دیا کہ "میری فوج جو تم میں موجود ہے وہ ضرورت کے وقت آپ کی خدمت کریگی اس سے

زیادہ فوج کا میں بغیر انگلستان سے حکم منگائے ہوئے انتظام نہیں کرسکتا ہوں۔" اس کے بعد بادشاہ کے درباریوں نے شاہ انگلستان کی خدمت میں شاہ ہندوستان کی طرف سے ایک لاکھ کا تحفہ اور ایک خط روانہ کرنے کا انتظام کیا اور منشی صاحب موصوف بطور ایلچی کے کپتان سوئنٹن کے ساتھ جانے کو تیار ہوئے۔ یہ سب واقعات مع دو برس کے سفر کے حالات کے نہایت دلچسپ لکھے ہوئے ہیں۔

ناظرین "ادب" کی دلچسپی کے لئے اس کتاب کا دوسرا باب جس میں کمپنی اور برٹش گورنمنٹ کے اُس زمانہ کے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے حاضر ہے۔ میں نے پوری کتاب کا ترجمہ کر ڈالا ہے اگر اہل علم نے اسکی ضرورت سمجھی تو وہ بھی کبھی چھپ جائیگی۔

منشی اعتصام الدین صاحب یوں رقمطراز ہیں:۔

"نواب شجاع الدولہ نے جنگ میں شکست کھانے کے بعد لارڈ کلایو سے معاہدہ کر کے حضرت شاہ عالم بادشاہ سے اودھ واپس جانے کی اجازت حاصل کی۔ لارڈ کلایو نے صوبۂ بنگال بہار و اڑیسہ کی سند دیوانی کمپنی کے نام اور سند نظامت نجم الدین سر نواب جعفر علی خاں کے نام بادشاہ سے حاصل کر کے رخصت چاہی، اُس وقت بادشاہ ظل اللہ نے بدیدہ ہو کر لارڈ کلایو سے فرمایا کہ تم نے اپنی کمپنی کی خدمت صرف برائے نام ظاہرہ طور پر انجام دی ہے اور بادولت واقبال کی مرضی کے مطابق بالکل خدمت نہیں کی کیونکہ ہمارے ساتھ دہلی میں فوج نہیں بھیجتے ہو اور نہ انتظام ممالک محروسہ کا کرتے ہو۔ اس وقت بادولت کو چاروں طرف دشمنوں اور نمک حراموں میں گھرا ہوا چھوڑ کر بھاگے جاتے ہو۔ لارڈ کلایو مع کارنک وغیرہ سرداروں کے بہت متاثر اور منفعل ہوئے اور عرض کیا کہ فوج کے انتظام میں بغیر اپنے بادشاہ کے حکم حاصل کئے ہوئے میں کچھ نہیں کرسکتا، میرا کام صرف عرض کر دینا اور ولایت سے حکم منگانا ہے۔ البتہ میں لشکر کا انتظام کر دونگا، جواب آنے تک میری صلاح یہ ہے کہ خود بدولت الہ آباد میں تشریف رکھیں۔ اس عرصہ میں جنرل اسمتھ جو انگریزی فوج کے سپہ سالار مقرر ہوئے ہیں مع ایک پلٹن سپاہی کے حضوری میں حاضر رہ کر خدمت بجا لائینگے اور بوقت ضرورت وہ لشکر جو نیو میں چھاؤنی ڈالے ہے حاضر ہو جائے گا۔ خود بدولت خاطر جمع رکھ کر فدوی کو غلامی وتابعداری میں یکساں متصور فرمائیں۔

اس کے بعد منیر الدولہ[1] اور راجہ شتاب رائے[2] کی رائے سے حضور اقدس شاہ جہاں و ولایت کے نام ایک خط لکھنے اور ایک لاکھ روپیہ کے تحفے بھیجنے کو راضی ہوئے۔ منیر الدولہ اور راجہ شتاب رائے لارڈ کلایو کے ساتھ کلکتہ آئے۔ لارڈ کلایو، جنرل کارنک اور کپتان سوئنٹن جارج سرت مع مترجم کے بمشورہ منیر الدولہ اور راجہ شتاب رائے باغ دیدبہ میں جاکر بے اطلاع دوسرے کونسلیوں کو خط لکھا اور اس پر بادشاہ کی مہر کرکے سوئنٹن کے آدمیوں کے سپرد کیا۔ اسکو کپتان مذکور بادشاہ ولایت کی خدمت میں پیش کرائے اور جب تک جواب ملے وہیں مقیم رہے۔ چونکہ بادشاہ کی طرف سے کپتان کے ساتھ کسی کا جانا ضروری تھا اس لئے اس کام کے واسطے راقم تجویز کیا گیا۔ احقر کو بھی بوجہ جولانی سیر و سیاحت کی خواہش اور آب و دانہ کی کشش نے جانے پر مجبور کیا۔ میں کپتان کے ساتھ جہاز پر سوار ہو گیا۔ جب ایک مہینہ تک سفر کر لیا تو ایک روز کپتان نے مراسلہ شاہی کے تذکرہ میں کہا کہ لارڈ کلایو نے مجھ سے بادشاہ کا خط لے کر کہا تھا ابھی بادشاہ کے تحائف نہیں آئے ہیں لہٰذا صرف خط کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں ہے میں آئندہ سال اسکو لاکر تم کو دیدونگا اس وقت بادشاہ ولایت کے روبرو پیش کر دینا اور مطلب حاصل کرنا۔ یہ خبر سن کر میرے ہوش اڑ گئے اور میں نے مصمم ارادہ کیا کہ اس معاملہ میں اپنی کا کوئی بہانہ سوچنا چاہیئے اور یقین کیا کہ اس خطرناک سفر کی تکلیف اور مسافت کا نتیجہ بیکار اور فضول ہوگا۔ اگر میں پیشتر سے یہ جانتا تو سفر کے لئے تیار ہی نہ ہوتا۔ اب جبکہ وقت گزر گیا اور تیر کمان سے نکل گیا۔ ناچار رضا و تسلیم کے سامنے سر خم کیا اور اپنی بدقسمتی خیال کرکے جہاز کی سواری کی تکلیف اور مسافرت برداشت کرکے چھ مہینے کے بعد ولایت میں داخل ہوا اور انہیں وجوہ سے جب تک ولایت میں رہا وہاں کی سیر و تماشہ اور عجائبات وغیرہ سے کوئی دلچسپی اور خوشی حاصل نہ ہوئی۔ چونکہ کپتان نے سخت تاکید

---

[1] منیر الدولہ۔

[2] راجہ شتاب رائے ساکن دہلی کایستھ تھے۔ اپنے ایام جوانی میں وہ محمد شاہ کے امیر الامرا خان دوراں کے بیٹے شمس الدولہ کے منشی مگر ملازم آقا سلیمان کے نوکر رہے۔ شمس الدولہ کے انتقال کے بعد وہ پٹنہ میں شاہی دیوان مقرر ہوئے۔ انھوں نے متعدد انقلابات میں انگریزوں کا ساتھ دیا حتی کہ انگریزوں نے ان کو شاہان و والیان ہند کے معاملات میں اپنا مخبر خاص بنا لیا۔ وہ بڑے مدبر سیاست داں اور ماہر مالیات تھے۔ [illegible] مطابق [illegible] میں انتقال کیا۔

کردی تھی کہ یہ راز ظاہر نہ کیا جائے۔ اِس لئے میری عجب حالت تھی، نہ تو طاقت گفتار اور نہ قوت صبر ایک کوہ غم کا بار تھا جو اوپر لدا ہوا تھا۔ رات دن اسی گھلانے والے غم میں مبتلا رہتا تھا۔ ان سب رنج اور مصیبتوں کو بہلانے کے لئے رات دن کتب تاریخ وغیرہ پڑھتا رہتا تھا، تاہم ہر وقت رنج اور فکر میں پریشان رہا۔ نہ اچھی طرح زبان انگریزی پڑھ سکا نہ کسی کام میں جی لگا اور نہ کچھ سیکھ سکا۔ یہ پریشانی اور مصیبت کی داستان کس سے کہوں سوا اسکے کوئی چارہ نہیں کہ مُنہ پر مہر سکوت لگا کر اپنی ناحقی کا خود مقر ہو جاؤں۔ القصہ ڈیڑھ سال اسی انتظار میں گزرا۔ جب لارڈ کلایو ولایت پہنچے تو شاہی تحفوں کو اپنی طرف سے خدمت میں پیش کر کے سرخروئی حاصل کی اور حضرت شاہ عالم کے خط اور پیغام کا بالکل ذکر نہ کیا۔ کپتان نے بھی اس معاملہ میں مُنہ نہ کھولا۔ کپتان کو بوجہ ہم قوم ہونے کے لارڈ کلایو کی دوستی پر بڑا غرہ تھا، تاہم بیچارگی اُنکی دغا سے عاجز ہو کر مجھ سے کہا کہ جو کچھ آپنے مجھ سے کہا تھا وہی ہوا اور لارڈ کلایو نے بدعہدی اور دغا کی۔ چونکہ کپتان کو شاہی امراء اور فوج میں رسوخ نہ تھا اور وہ لارڈ کلایو افسر اعلیٰ کا لحاظ کرتے تھے اِس لئے اس بارہ میں اُنکی کوئی تدبیر نہ چلی۔ اس خط کے راز کو پوشیدہ رکھنے کا سبب دریافت کرنے سے یہ معلوم ہوا کہ اُس وقت کمپنی اور امرائے شاہی میں بنگال کی واپسی پر جھگڑا ہو رہا تھا۔ امرائے شاہی کی رائے تھی کہ کمپنی مہاجن اور تجارت پیشہ ہے اُنکو اپنی مہاجنی اور سوداگری کا کام کرنا چاہیئے اُنکو مالگذاری سے کیا مطلب ملک بنگالہ جو انگریزی فوج کے بھروسے حاصل ہوا ہے اُسکی آمدنی بادشاہ کو لینا چاہیئے۔ برخلاف اسکے عملہ کمپنی کے جواب یہ تھے کہ سراج الدولہ کی لڑائی میں قاسم علی خاں کا بنگال کی کوٹھیوں کی لوٹ مار میں کروروں روپیہ اور بعقلی کا نقصان ہوا اور فوج کے مصارف میں روپیہ کی ایک کثیر تعداد خرچ ہوئی ہے نیز اہلکاران کمپنی نے ملک بنگال بڑی محنت اور پریشانی سے حاصل کیا ہے۔ اِس لئے یہ سب نفع و نقصان تجارت میں شمار ہونا چاہیئے۔ یہ فیصلہ اُس عہد و پیمان پر مبنی ہے جو کمپنی اور معتمدیان شاہی کے درمیان قدیم زمانہ سے چلا آتا ہے۔ اُس وقت اُس قول و قرار کے خلاف عمل کرنا عدل و انصاف سے بہت بعید معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ کسی طرح زیبا نہیں ہے۔ غرضکہ اسی طرح کے سوال و جواب اور مخالفت اور موافقت کی بحث فریقین میں ہو رہی تھی اور امراء شاہی کو اپنی تائید میں کوئی دستاویز معتبر نہیں ملتی تھی۔ چونکہ لارڈ کلایو کمپنی کے خیر خواہ تھے اس لئے اُنھوں نے شاہ عالم کے مراسلہ جو امراکی رائے کی زبردست تائید کرتا تھا مناسب سمجھا کہ

خدمت میں پیش کرنا مناسب نہیں خیال کیا جب میں بنگال واپس ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ جھگڑا تین سال سے کمپنی اور امرائے شاہی کے درمیان چل رہا ہے۔ طرفین اپنے اپنے سوال و جواب میں حجت قوی اور دلائل معتبر پیش کرتے تھے۔ آخرکار بادشاہ ولایت کی یہ رائے ہوئی کہ جو کچھ شاہ ہند کی مرضی ہو وہ ہم کو قبول ہے۔ بادشاہ جمجاہ نے بلند ہمتی اور عالی حوصلگی سے جواب دیا کہ شاہ عالم بادشاہ ہندوستان نے ملک بنگال وغیرہ بطور خیرات انگریزی کمپنی کو عطا فرمایا ہے اور اپنے لئے کچھ تحفہ بھی مقرر کر دیا ہے اگر میں شاہ انگلستان اس ملک کو اپنے تصرف میں رکھوں تو میں بادشاہ ہند کے خیرات خوروں اور باج گزاروں میں شمار کیا جاؤنگا۔ اور یہ ایک بڑی بدنامی کی بات ہے۔ اگر تمام ملک ہندوستان ہمارے قبضہ اور تصرف میں آجائے تو کچھ مضائقہ نہیں لیکن کمپنی اور امراء شاہی نے قبضہ کرکے یہ طے کیا کہ کمپنی کئی کروڑ روپیہ بطور نذرانہ اور اُس سے کچھ زائد سالانہ خراج شاہ ہند کو ادا کیا کرے بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ صرف چند سال کے واسطے طے ہوا۔ اُسکے بعد یہ شرط تھی کہ کمپنی ملک بنگال کو ذریات شاہی کو واپس کردیگی۔ کپتان نے مجھ سے ولایت میں پڑھنے کے لئے بہت اصرار کیا لیکن میں نے بالکل قبول نہ کیا، یہاں تک کہ وہ ناخوش ہوگئے جسکا ذکر انشاء اللہ آئندہ کرونگا۔ آخرکار مسٹر مجندی کو جو پیشتر کونسل کلکتہ کے سکتر رہے تھے مجھ کو سپرد کرکے رخصت کیا اور تین ماہ کا تک ۱۱۸۳ھ مطابق ۱۷۶۹ء بنگلہ اپنے وطن بنگال پہنچا۔

کلام رُسوا

جناب پروفیسر ڈاکٹر میرزا محمد ہادی صاحب رُسوا

کیوں حد سے بڑھ گئے ہیں کیا آسمان پر ہیں — نازاں بہت جو اپنے اونچے مکان پر ہیں
بگڑے ہو وصل میں کیوں دل سے بنا کے باتیں — ایسے بہت سے فقرے میری زبان پر ہیں
اظہار شوق بیجا، اظہار عشق باطل — یہ اعتراض اُنکے میرے بیان پر ہیں
صحرا پہ جا کے قبضہ میں نے کیا جنوں میں — بربادیوں کے دعوے میرے مکان پر ہیں
خوب اسکو جانچ لینا تم جس سے مل کے چلنا — کچھ تیر کی خطائیں ثابت کمان پر ہیں
کس کا گزر ہوا ہے گمراہ میکشوں میں — کچھ بہکی بہکی باتیں مے کی دُکان پر ہیں
خاموش ہو کے مرزا اُنکا کلام سُنیے — جن کی عنایتیں اب اُردو زبان پر ہیں

حُسن شاہد ہے مری رنگینی تحریر کا — اک ادائے شوخ ہے جو رنگ ہر تصویر کا
الحذر یہ کام دنیا میں تمہیں سے ہو سکا — چاہنے والے پر اپنے کھینچنا شمشیر کا
یاد کر لینا کہ اکثر بستیاں ویراں ہوئیں — اس خرابے میں خیال آئے اگر تعمیر کا
وضع کے پابند ہم دیوانگی جدت پسند — پھر گلا یا جائے لوہا قیس کی زنجیر کا

شوق اظہار حریفِ غمِ پنہاں نکلا — گرمئ ضبط سے نالہ شرر افشاں نکلا
خوش ہیں کیوں دھوم سے میت کے اُٹھانے والے — مرنے والے کا بھی آخر کوئی ارماں نکلا
جیتے ہیں وصل کی امید پہ مرنے والے — زندگی کا یہ وسیلہ بہت آساں نکلا
اس دلِ تنگ کی وسعت مجھے معلوم نہ تھی — میری تقدیر سے گوشے میں بیاباں نکلا

(غیر مطبوعہ)

"داستان سکنتلا ناٹک"

اُردو نثر کی ایک قدیم یادگار

(جناب سید حسن برنی صاحب بی اے۔ ایل ایل بی (علیگ) ایڈوکیٹ بلند شہر)

(۱)

کالی داس کی سکنتلا ادبیات ہند کا ایک چمکتا ہوا سورج ہے۔ وہ کون سی سربرآوردہ زبان ہے جس میں اُسکا ترجمہ نہیں ہوا؟ اور وہ کون سا دلدادۂ ادب ہے جس نے اُسے ایک بار پڑھ کر بار بار نہیں پڑھا۔

لیکن اُسکے مصنف کے متعلق ہم کیا جانتے ہیں؟ بہت کم واقعات، اور کچھ ایسی روایات، جنکی تنقید و تصدیق خالی از وقت نہیں۔ یہاں تک کہ ابھی تک یقین کے ساتھ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس زمانہ میں تھا، اور کب اس دنیا سے سدھارا۔ پہلی صدی سے چھٹی صدی عیسوی تک مختلف زمانے اُس کی زندگی کے تجویز کئے جاتے ہیں، اور حسب معمول اس سے ہر ایک کے لئے کچھ نہ کچھ قرائن پیش ہو جاتے ہیں۔

یہ اختلاف آرا غالباً کبھی ختم نہ ہوگا لیکن کالی داس ایک مصنف کی حیثیت سے زمان و مکان کے قیود سے آزاد ہو چکا ہے۔ وہ ہر عہد، ہر ملک، اور ہر قوم سے تعلق رکھتا ہے اور اُسکا چھوڑا ہوا ادبی ترکہ دنیا کے عام ورثہ اور مشترک سرمایہ میں شامل ہے۔ بالخصوص سکنتلا جسکی ہر دلعزیزی غیر فانی اور دائمی ہے۔

اُس میں پرانے ہندوستان کی زندگی اور روح جلوہ افگن ہے، بلکہ اُسکا عطر کھینچ کر پیش کیا گیا ہے۔ اُس میں ہندوستان کا ماضی عجب شان و شوکت کے ساتھ نظر آتا ہے۔ اس

سبب سے نہیں کہ ماضی ہمیشہ شاندار دکھائی دیا کرتا ہے اور شاعر اپنے جادو سے اُسے اور بھی زیادہ دلفریب بنا دیتا ہے بلکہ فی الواقع ہندوستان کا ماضی شاندار تھا۔ اور شاعر نے محض خیالی تصویر نہیں اُتاری ہے۔ اسکا جادو نگار قلم فطرت و حقیقت سے بیخبر نہ تھا اور سکنتلا میں اس نے فطرت و حقیقت کے بہت سے مناظر پیش کئے ہیں۔

کتاب کھولتے ہی ہندوستان کے دشت و بیاباں اور ایک زاہد گوشہ نشین کے پُر سکون روحانی ماحول نظر آتے ہیں۔ اُسی چمن میں حور سرشت سکنتلا گلگشت کرتی اور پھول کے پودوں کو پانی دیتی نظر آتی ہے۔ وہ ابھی تک دنیا کے نیک و بد سے بے خبر ہے۔ یکایک اُس بہشت میں سلطان عشق ناوک افگنی کرتا ہوا داخل ہوتا ہے۔ راجہ دشینت جو شکار کے لئے پھر رہا تھا، سکنتلا کے تیر نظر سے خود گھائل ہو کر رہ جاتا ہے اور سکنتلا کو بھی گھائل کر کے چھوڑ جاتا ہے۔ اب سکنتلا کی دنیا بدل جاتی ہے، وصل و ہجر کے شیریں و تلخ تجربوں کے بعد وہ اپنے عزیز ماحول سے جدا ہوتی اور دنیا کی مکدر فضا میں پہنچتی ہے، جہاں اُسے اہل دُنیا کی خرابیوں کو دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ بالآخر وہ اپنے صبر، پاکبازی اور سچائی سے فتح پاتی ہے، اور اپنے عاشق اور محبوب کو بھی، جو اُسے بھول چکا تھا، پالیتی ہے۔

سکنتلا کی کھوئی ہوئی انگوٹھی کا قصہ بھی کہا گیا ہے۔ تمام مصیبتیں ایک طلسمی انگوٹھی کے کھو جانے سے پیش آئیں۔ جو راجہ وسوامتر نے سکنتلا کو اپنی یادگار کے طور پر دی تھی، اور ایک رشی کی بددعا سے گم ہو گئی تھی۔

فنون لطیفہ کے مشرقی اُستادوں نے اپنے فنون کو ہمیشہ اخلاق روحانیت اور مذہب کا تابع رکھا ہے۔ وہ "فن برائے فن" کے نظریہ پر بہت کم اعتقاد رکھتے ہیں یہی حال کالیداس کا ہے۔ اور اُس نے سکنتلا میں بہت سے سبق دیئے ہیں۔ مثلاً بزرگوں کی تعظیم۔ سکنتلا اپنے دنیاوی عشق میں ایسی محو ہو کر رہ گئی ہے کہ ایک خدا رسیدہ بزرگ کی تعظیم کرنا بھول گئی۔ جسکی بددعا سے ساری مصیبتیں اُٹھانا پڑیں۔

لیکن کالیداس محض اخلاق و روحانیت اور مذہب کا معلّم نہیں تھا، بلکہ سب سے پہلے اور اُس سے بڑھ کر ایک بہترین شاعر اور ڈراما نگار تھا۔ وہ قدرت کے مناظر اور انسانی حُسن کی دلفریبی سے پورے طور پر متاثر ہے۔ اور انسانی جذبات کے مد و جزر اور بوقلمونی، نیز انسانی سیرتوں کی

پستی و بلندی اور روشنی و تاریکی سے پورے طور پر آگاہ ہے، اسی وجہ سے سکنتلا مظاہر قدرت و جذبات انسانی کا ایک نہایت دلکش مرقع ہے۔

بعض نقادان فن معترض ہیں کہ قصہ میں انسانوں کے ساتھ دیوتا بھی کام کرتے نظر آتے ہیں جسکی وجہ سے قصہ کے واقعات قدرتی طور پر رونما نہیں ہوتے، نہ اشخاص قصہ اپنے افعال قدرتی طور پر انجام دیتے ہیں، اور نہ اُنکے اعمال اور سیرتوں کا انکشاف مکمل طریق پر ہوتا ہے لیکن وہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ اُس کا لکھنے والا اور اُسکے مخاطب ان سب چیزوں پر اعتقاد رکھتے تھے، اور اُنکی نظر میں اشخاص دنیاوی اور افراد سماوی کا اشتراک عمل ایک حقیقی امر تھا۔

۲

مشرق و مغرب میں سکنتلا کی ستایش و تنقید میں اتنا لکھا گیا، کہ اُسے بار بار دُہرانا بے سود ہے۔۔ اس مضمون کا مقصد بھی یہ نہیں ہے۔

ہمارے پیش نظر اس وقت ایک دوسری چیز ہے۔ اور وہ کالیداس کی لکھی ہوئی سکنتلا نہیں ہے، بلکہ اُردو ادب کی ایک قدیم ترین یادگار ہے، جو "داستان سکنتلا ناٹک" کے نام سے لکھی گئی تھی۔

اس کا لکھنے والا میر کاظم علی جوان تھا، جسکا اصلی وطن تو دہلی تھا، لیکن بعد میں لکھنؤ میں سکونت پذیر ہو گیا تھا۔ وہیں سے وہ کلکتہ کے مدرسۂ "فورٹ ولیم" کے لئے منتخب ہو کر آیا۔ اور ہندوستانی زبان کے مربی و محسن ڈاکٹر جان گلکرسٹ صدر معلم کی فرمائش سے اُس نے اس کتاب کی ابتدا سنہ ۱۸۰۱ء میں کی اور سنہ ۱۸۰۳ء میں نظرثانی کے بعد مکمل کیا۔

اُسی زمانہ میں فورٹ ولیم کے دوسرے ہندوستانی اُستادوں نے بھی چند کتابیں لکھیں، جو ہمارے ادبیات نثر کے نقوش اولین ہونے کی وجہ سے آثار مقدسہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سید حیدر بخش حیدری نے طوطا کہانی، آرائش محفل، دہ مجلس و تاریخ نادری۔ میر بہادر علی حسینی نے نثر بے نظیر، و اخلاق جلالی۔ شیخ حفیظ الدین احمد نے خرد افروز۔ اور میر شیر علی افسوس نے آرائش محفل و باغ اُردو۔ نہال چند نے قصۂ گل بکاولی موسوم بہ مذہب عشق۔ اور اکرام علی نے اخوان الصفا۔ اور میر امن نے باغ و بہار و گنج خوبی لکھیں۔

میر کاظم علی جوان نے سکنتلا کے علاوہ سنگھاسن بتیسی سنہ ۱۸۰۵ء میں لکھی تھی۔ اور تاریخ فرشتہ سے خاندان بہمنی کی تاریخ سنہ ۱۸۰۶ء میں اور ایک بارہ ماسہ جس کا نام دستور ہند ہے سنہ ۱۸۱۲ء میں تصنیف کیا۔

اُس نے اپنی مختصر سرگزشت، اور سکنتلا کا سبب تالیف اپنی کتاب کے دیباچہ میں اس طرح لکھا ہے۔

"اب یہ ہیچ مداں ہر صغیر و کبیر کی دریافت کے لئے اس روزگار کے سررشتے سے کہ سرکار میں کمپنی بہادر دام اقبالہٗ کے مقرر ہوا بیان کرتا ہے۔

کرنل اسکاٹ صاحب، جو لکھنؤ کے بڑے صاحب ہیں، اُنھوں نے حسب الطلب گورنر جنرل بہادر دام ملکہٗ کے سنہ ۱۸۰۰ء میں کتنے شاعروں کو سرکار عالی کے ملازموں میں سرفراز فرماکر اشرف البلاد کلکتہ کو روانہ کیا۔ اُنھوں میں احقر بھی یہاں وارد ہوا۔ اور موافق حکم حضور خدمت میں مدرس مدرسہ ہندی کے جو صاحب والا مناقب جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام ظلہٗ ہیں شرف اندوز ہوا۔

دوسرے ہی دن اُنھوں نے نہایت مہربانی و الطاف سے ارشاد فرمایا کہ سکونتلا ناٹک کا ترجمہ اپنی زبان کے موافق کرو اور للوجی لال کب کو حکم کیا کر بلاناغہ لکھایا کرے۔

اگرچہ کبھی سوا نظم کے نثر کی مشق نہ تھی لیکن خدا کے فضل سے بخوبی انصرام ہوا۔ کہ جس نے سُنا پسند کیا۔ اور اچھا کہا۔ بہت سا پڑھنے لکھنے میں آیا۔ اور کچھ چھپ کر اتفاقات سے رہ گیا۔

ان دنوں میں کہ سنہ ۱۸۰۲ء ہیں، اور احقر قرآن شریف کے ہندی ترجمے کا محاورہ درست کرتا ہے، صاحب ممدوح نے فرمایا "ہم چاہتے ہیں کہ اس کتاب کو سرنو چھپوادیں۔ نظرثانی لازم ہے۔ اور اس کب کو فرمایا کہ تم بھی اُس کتاب سے مقابلہ کرو کہ اگر کہیں مطلب کی کمی بیشی ہوئی ہو تو لے۔ چنانچہ ہم اُن کا فرمانا بجا لائے۔ پھر موافق حکم صاحب کے بندے نے تھوڑا سا دیباچہ اور بھی لکھا۔ والآنہٗ لکلا یہی ہے۔

خدا کا نام لے پہلے زباں پر
لگا پھر دل کو اپنی داستاں پر

یہ قصہ فرخ سیر بادشاہ کی سلطنت میں سنسکرت سے برج بھاکھا میں ترجمہ ہوا تھا۔ اب شاہ عالم بادشاہ کے عہد میں اور عہد دولت میں نواب عظیم الشان مشیر خاص شاہ کیوان بارگاہ انگلستان

اشرف الاشراف مارکوئیس ولزلی گورنر جنرل بہادر دام دولتہ کی حکومت میں ۱۸۰۱ء میں مطابق سنہ ۱۲۱۵ھ کے جناب جان گلکرسٹ صاحب بہادر دام ظلہٗ کے حسب الحکم کاظم علی جوان نے اُسے زبان ریختہ میں بیان کیا۔

اس داستان کے لکھنے والے نے یوں لکھا ہے کہ فرخ سیر بادشاہ کے فدویوں میں سے مولی خاں فدائی خاں کے بیٹے نے جب ایک لڑائی ماری، تب حضور پرنور سے اُس کا خطاب عظیم خاں ہوا، اسی ایام میں اُسے نوازکبیشور کو حکم کیا کہ سکونتلا ناٹک جو سنسکرت میں ہے برج کی بولی کہہ۔ اس کبیشور نے یہ کہانی کبت دُہرے میں کہی کہ جس کا ترجمہ یہ ہے۔ اور جو انگریزی میں ہے سو سنسکرت سے ہوا ہے۔ اگر اس میں اور اُس میں کچھ فرق ہو تو ممکن ہے۔

اب صاحبانِ دانش و بینش کی خدمت میں التماس یہ ہے کہ چشم و گوش انصاف کھولیں اور ٹک منصفی سے بولیں کہ کبت اور دُہرے کا ترجمہ جیسا چاہئیے ویسا زبان ریختہ میں کب ہو سکتا ہے اور اُس کے اور اس کے مضمون کی بندش کا فرق کھلا ہوا ہے۔ بیان کی احتیاج کیا۔

طرز اُسکی ہے جدی اسکا نرالا فرق ہے — اُسکا عالم اور ہے اور اسکا عالم اور ہے

قطع نظر اس سے کہ کبت ہو یا دوہرا، نظم کا ترجمہ نثر میں طبیعت کو منتشر کرتا ہے کیا کیا۔"

سکنتلا کا اصل قصہ ڈراما ہے جو سنسکرت میں لکھا گیا تھا۔ جوان کی لکھی ہوئی سکنتلا ہندی سے ترجمہ کر کے ایک مسلسل قصہ کے طرز میں جو فارسی دا اُردو میں مروج تھا لکھی گئی ہے۔

اُردو نثر کی کتابیں نو وارد انگریزوں کے نصاب کے لئے لکھوائی گئی تھیں۔ اسی وجہ سے سکنتلا کا جو اڈیشن ۱۸۰۲ء میں شائع ہوا وہ رومن حروف میں چھاپا گیا تھا۔ اور غالباً اُس کی اشاعت عام طور پر نہ ہو سکی۔

۱۸۴۳ء میں ایک علم دوست پارسی کریم بہمن ڈوسا بھائی منشی نے اُسے اُردو حروف میں لکھ کر مرزا حسن کاشانی کے مطبع میں چھپوایا لیکن غالباً یہ اڈیشن بھی محدود تھا اور عام اشاعت سے محروم رہا۔ اور ہمارے زمانے میں تقریباً نایاب ہے۔ چنانچہ سیر المصنفین کے قابل مؤلف کو اسکی کوئی جلد دستیاب نہ ہو سکی۔

خوش قسمتی سے اُسکا ایک نسخہ ہمارے کتبخانہ میں موجود ہے جسے ہم عنقریب شائع کرنے کا قصد رکھتے ہیں۔

۳

جوان کی لکھی ہوئی سکنتلا کا کالی داس کی سکنتلا سے مقابلہ کرنا عبث ہے۔ یہ کام کوہ کندن کاہ برآوردن سے کم نہ ہوگا۔ اُسکی اصلی اہمیت باغ و بہار وغیرہ کی طرح یہ ہے کہ وہ نثر کی قدیم ترین یادگاروں میں شامل ہے، اور خالص ادبی لحاظ سے بڑا اونچا پایہ رکھتی ہے، ورنہ اصل ناٹک کے مقابلہ میں وہ محض ایک بعید پر تو ہے۔ البتہ قصہ سمجھنے اور اُسکے مضامین پر اطلاع پانے کے لئے ایک تمہید کا کام خوب دے سکتی ہے۔

جوان کا انداز تحریر سلیس و رنگین و دلکش ہے۔ وہ شاعر بھی تھا۔ اور اُس نے کہیں کہیں شعر بھی لکھے ہیں۔ اُس نے اعتراف کیا ہے کہ اُسے نثر لکھنے کی پہلے سے مشق نہ تھی۔ مگر آخر اہل زبان تھا۔ اُسکی نثر مستند محاوروں اور روزمرہ سے مالامال ہے۔ داستان سرائی میں عرصے سے مقفیٰ عبارتوں کا رواج تھا۔ باوجود سادہ زبان لکھنے کے یہ تکلف جوان نے بھی اکثر اختیار کیا ہے۔ یہ رسم اب متروک ہے۔ اور موجودہ مذاق سلیم اسکا بمشکل متحمل ہو سکتا ہے لیکن جوان کی نثر پر اس تکلف کا مضر اثر بہت کم پڑا ہے بلکہ کبھی کبھی لطف پیدا ہو گیا ہے۔

کیسا افسوس ہے کہ ہمارے بزرگوں نے نثر کی طرف اتنی کم توجہ کی؟ کیا زبان تھی جو وہ لوگ بولتے تھے! گویا سرد و شیریں چشمے ہیں جو اپنے سوتوں پھوٹ کر بہ رہے ہیں، اور ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک و صاف ہیں۔ زبان میں یہ لوگ ہمارے ادب کے ہومر، چاسر اور فردوسی ہیں۔ آنے والی نسلیں اُن کو پڑھ کر سر دھنینگی اور تعجب کرینگی۔

ایک مختصر مضمون میں ہمیشہ محدود گنجائش ہوتی ہے، اور صرف نمونہ کے طور پر چند انتخابات پیش کئے جا سکتے ہیں، لیکن جوان کی سکنتلا ایسی دلچسپ ہے کہ ہم نے قصداً اُس سے کافی انتخابات لیئے بلکہ مختصر طور پر تمام قصہ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

مینکا پری کا، جس سے سکنتلا پیدا ہوئی تھی سراپا اور اُسکا وسوامتر زاہد کو اپنے اوپر فریفتہ کرنا اس طرح بیان کیا ہے:۔

"وہ ایک ایسا ستارہ تھی کہ تمام عالم کو جس نے روشن کر دیا۔ تن پر سولہ سنگھار بارہ ابھرن جو اُس نے سر سے پاؤں تلک کئے۔ دن کو تو سورج اُسکا جلوہ دیکھ رشک کی آگ سے جلا۔ اور

رات کو چاند غیرت سے داغ ہو کر ستاروں کے انگاروں پر لوٹا۔ ویسی موہنی صورت اور وہ بناؤ جو دیکھا جوگ بھوگ میں آ گیا۔ تپسیا کا پیڑ جڑ سے اکھڑا۔ کیا وہ خرمن صبر کی جلانے والی بجلی تھی کہ جس پہ اسکی نگاہ گرم پڑی بیتاب ہو کر دل اس کا سینے میں بھسمنت ہو گیا۔ اگر فرہاد دیکھتا جان شیریں دیتا۔ لیلیٰ مجنوں ہو جاتی ؎

نہ بلبل ہی ہوئی تھی اس پہ شیدا گلوں کے بے کلی تھی دل میں پیدا

بہشت سے نکل کر جو اسے دیکھتی حور، تو یقین ہے کہ جان دینے میں نہ کرتی قصور........

حاصل کلام وہ اس صورت سے اس منی کے منہ کو اور من بس کرنے کو اٹھکھیلیوں کی چال خرام ناز کے انداز سے چلی۔ اچپلاہٹ اور چنچل پنے سے ٹھوکر دامن کی گریبان شکیبائی کو چاک کرتی تھی۔ آنچل دوپٹے کا سر پر سے کاندھے پر اور کاندھے سے پھسل کر زمین پر آ رہتا تھا۔ اس سرو گل اندام کے اس ناز و انداز پر نسیم و صبا صدقے قربان جاتی تھی۔ مدھ بھری نے آنکھیں دیکھکر نرگس پیالہ شراب شوق کا لیکر کھڑی کھڑی رہ جاتی تھی۔ کمر کی لچک سے تار تار سنبل کا پیچ و تاب کھاتا تھا۔

بین بجاتی ہوئی ہولی گاتی ہوئی دھیان تانوں پر دھرے پھول دامن و گریبان میں بھرے ہوئے آ کر وہاں جلوہ گر ہوئی جہاں وہ جوگ سادھے تپسیا کر رہا تھا۔

یکا یک پازیب کی جھنکار بین کے تاروں کی آواز گانے کی لے سے ملی ہوئی اس کو میسر آ ہوا۔ اس نے جو ہیں آنکھیں کھولیں ایسی شکل نظر آئی کہ ایک ہی نظارے سے اسکا سب دھیان گیان جاتا رہا۔ برسوں میں جپ کی جتنی پونجی جمع کی تھی اس کے ناز و غمزے کی فوج نے سب کی سب ایک ہی دم میں لوٹ لی۔

پھر تو غش کھاتا ہوا اٹھکر پروانہ وار اس شمع رو کے گرد پھرنے لگا۔ اور بیتابی سے دمبدم قدموں پہ گرنے، بلائیں سر سے پاؤں تک لینے اور صدقے ہو ہو جان اپنی دینے ؎

دل اس کا محو جلوۂ جانانہ ہو گیا کرتے ہی ایک نگہ کے وہ دیوانہ ہو گیا''

سکنتلا:۔

''وہ شعلہ بھبھوکا کہ جو ... کا نام سکنتلا تھا اسے ایک حلہ ... سے ... کا

پھونک دیتی تھی۔ شہرہ اسکی گرم بازاری کا دھوم اسکے حُسن عالم سوز کی ایسی تھی کہ آفتاب عالمتاب کو ایک ذرہ اسکے آگے تجلی نہ تھی.......

شروع جوانی وہ اُسکا وہ جوبن نیا عالم اپنا دکھاتا تھا بن بن

جتنے اُس وشت کے چرند و پرند تھے وے اُسکے دام محبت کے پابند تھے..... کبھی ہرن کے بچوں کو دانہ کبھی درختوں کو پانی دیا کرتی..... جب جوانی کی اُمنگ نے عالم کچھ اور دکھایا۔ شوخیاں نئے نئے طور کی اُس نازنین میں سمانے لگیں۔ دلداری اور دلربائی کے انداز بھولپن سے شروع کئے۔ ترچھی نگاہوں تیکھی نظروں سے اشاروں ہی اشاروں میں اُن کے دلوں کو بے چین کرتی تھی۔ بگڑ بگڑ کر ہزاروں طرح چن چُن کے ان کو نام دھرتی تھی۔

کبھی ہنس بول کر نہال کیا کبھی ٹھوکر سے پائمال کیا

نہ تھا دلربائی کا ایک طور کچھ ہر اک آن میں آن تھی اور کچھ

وہ قامت قیامت کا نمونہ، بلکہ آمد میں اُس سے بھی دونا۔ پست بر تمام وہ ترکیب بدن کی جیسا پھولوں کا گڈوا۔ آفت غضب وہ چھاتیوں کا اُبھار۔ چمن حسن کی اُس سے تر و تازہ بہار۔ عالم کچھ کا کچھ نظر آتا تھا۔ جسے دیکھ کر عالم کا جی جاتا تھا۔ کمر کی بھی لچک سے رگ جان تلک پیچ و تاب تھا۔ اور ہر روز جوبن اُس کا اِس چمک سے بڑھتا تھا کہ چودھویں رات کے چاند کو بھی مکھڑا دیکھ کے چکا چوندی آتی تھی اُس جنگل میں اُسکے حُسن کی یہ جھلک تھی کہ ہر پردوں میں چھپائے نہ چھپے۔...... اگرچہ حُسن خداداد لباس و زیور کے بند سے آزاد ہے کہ اس سے اُسکی خوبی ہے نہ اس سے اُسکی محبوبی ظاہر خوش نما ہے اور باطن میں تو دل لبھانے والی ہر آن ادا ہے کہتے ہیں کہ اُسکے بدن کی پوشش ہرن کی کھال تھی، اور پوتھ کا بھی گلے میں ہار تھا۔ تب بھی گویا ہزاروں ہزار بناؤ تھا۔ لیکن جیوں جیوں وہ جوانی پر آتی تھی تیوں تیوں خوبصورتی اور سماں دکھاتی تھی جس کسی کی آنکھ اُس کے چاند سے مکھڑے پر پڑتی بے اختیار وہ یوں کہتا تھا۔؎

مصور گر تری تصویر کو چاہے کہ اب کھینچے لگا دے چاند سارا ایک چہرے کے بنانے کو"

راجہ دشمنت جنگل میں شکار کرتا ہوا اسکنتلا کے مسکن پہنچتا ہے۔

"دوپہر کی دھوپ سر پر تھی اور وہ مہاسے گرم بدن کو لگی، تب بیتاب دشوار ہوا وہ

ہرن کہ چھلاوے کی طرح نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا اُس جنگل میں کہ سکنتلا کی بودوباش تھی نمودار ہوا۔ راجہ نے جھنجھلا اور طیش کھا کر تیر کو کمان کے چلّے سے جوڑ کر چاہا کہ اُسے نشانہ کرے ہنوز تیر قبضے سے کمان کے سرکنے نہ پایا تھا کہ آواز آئی تم راجہ ہو ہم جتنے جنگل کے جوگی تپشو اور جتنے رہنے والے ہیں کیا چرند کیا پرند تمہارے سائے میں بستے ہیں۔ سبھوں کے تم رکھوالے ہو۔ ہا مہاراج ہمارے تپ بن کا ہرن ہے شکار مت کرو۔

جب جوگیوں منیوں، تپشیوں کی راجہ نے یہ بات سُنی، ہاتھ رکھ گھوڑے کی باگ لی۔ ان سب رکھیوں نے آشیرباد دیا، راجہ نے اُن کو ڈنڈوت کر کے پوچھا کن کا یہاں مکان کون ہے ہم جا کر درشن کریں اور اُن کے قدم لیں"

راجہ سکنتلا کو اپنی سہیلیوں کے ساتھ گلگشت کرتے اور چمن کی آبیاری کرتے دیکھتا ہے:۔

"دہنی آنکھ جوں پھڑکی دل میں شاد ہوا کہ یہ شگون اچھا ہے۔ پانوں جب آگے دھرا اُس کا یہ پھل پایا کہ چھوٹی چھوٹی عمروں کی تین نازنیں نظر آئیاں، لیکن اُنھوں میں

جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

.... ایک اُن میں ایسی نازنین ہے کہ جس کے گل سے چہرے پر زلفیں جو سنبل سی پیچ و تاب سے جنبش میں ہیں، تو کمر لچکی جاتی ہے۔ اُس سے چمن رعنائی میں عجب بہار ہے، اور ہر ایک اُن دونوں میں سے نسیم و صبا سی اُس پر نثار ہے۔

ہوش جاتا رہا نگاہ کے ساتھ صبر رخصت ہوا اک آہ کے ساتھ

وہ اُس کا ایسا محو دیدار رہا کہ بیخود ہو کر خاک پر گرا، اور اپنے تن بدن کی کچھ خبر نہ رہی کتنی ایک دیر کے بعد جس تس طرح جوں آپ کو سنبھالا تو دیکھا کہ وہ نازنین اپنے ہاتھوں سے گھڑے پانی کے بھر بھر پودوں میں دے رہی ہے۔

وہ دونوں اُس کے ساتھ کی سکھیاں بھی اسی طرح پیڑوں کو سینچتی ہیں۔ جان کر یہ بھی ایک طور کی بندگی خدمت اور پرورش درختوں کی کرتی ہیں۔ اُن گل اندا موں کے موبے سر سے کہ سراسر غیرت سنبل ہیں قطرے شبنم کے سے ٹپک رہے ہیں اور تمام پسینے پسینے ہو رہیاں ہیں۔ گویا حسن کے دریا میں غوطے مار کر نکلی ہیں۔

وے صورتیں موتیں سی بار بار سر کاندھے، کمر پر گھڑے لے لے آتیاں ہیں۔ سانسیں چڑھ جاتیاں ہیں اور منہ اترا اترا جاتا ہے۔ چہروں پر ٹکے ایک رنگ جاتا ہے اور ایک رنگ آتا ہے کبھی نزاکت سے پاؤں رپٹ جاتا ہے کبھی بوجھ سے بیدکی مانند ساراً بدن تھرتھراتا ہے۔

نہ تھا اُس کو وہ رنج راحت سے کم　　　ہر اک آن کرتی تھی چہلیں بہم

درختوں کی چھاؤں میں کھڑی ہو ہو کر اپنے اپنے جوبن پر ایک ایک مغرور تھی لیکن اُن سبھوں میں سکنتلا اپنے حسن و ادا میں بہت دُور تھی۔ چمکاوٹ اُسکے چہرے کی عجب جلوہ دکھاتی تھی اور زلفیں بکھری ہوئیں منہ پر اُس کے اس رنگ نظر آتیاں تھیں جیسے نمود دھوئیں کی شعلے پر ہوتی ہے۔ یا جیسی کچھ کچھ گھٹا سورج پر آجاتی ہے۔ نگاہ بجلی تھی کہ نظروں کو ندجاتی تھی۔ اس تپ بن میں اس رنگ روپ سے سماں بندھا تھا۔

خجل دیکھ کر اُسکو ہوتا تھا ماہ　　　ٹھہرتی نہ تھی مہر کی بھی نگاہ"

۴

سکنتلا اور اُس کی سکھیاں آپس میں چھیڑ چھاڑ کر رہی ہیں:۔

"اتنے میں سکنتلا سے دونوں سکھیاں پوچھنے لگیاں تو جو ان درختوں کو سینچتی رہتی ہے کیا مُنی کو یہ تجھ سے بھی بہت پیارے ہیں۔ تو تو ان کو جان سے بھی چاہتی زیادہ ہے۔ سو تجھ کو اُنھوں نے کیوں اُن کی خدمت کو مقرر کیا ہے۔ خدا نے تجھے یہ شکل و شمائل دی ہے کہ کوئی حسن و ادا میں تیرے مقابل نہیں۔ یہ نزاکت اور کامنی پن تیرا کہ لوگ چشم و دل اپنے تیری راہ میں فرش کرتے ہیں۔ پاؤں تیرے اپنے سر پر دھرتے ہیں۔ تیرا بدن اس محنت و مشقت کے لائق نہیں"

سکھیوں نے جب ایسی باتیں کہیں سکنتلا نے جواب دیا میں آپ دل و جان سے پرورش کرتی ہوں۔ آخر ایک دن اسکا پھل پاؤں گی جو کوئی چھاؤں میں اُنھوں کی آن کر بیٹھیگا مجھے یاد کریگا۔ کچھ مُنی کے کہنے سے خدمت اُن کی نہیں کرتی ہوں۔ بلکہ میں آپ دھیان ان پر دھرتی ہوں مجھ کو خود اُلفت ہے۔

یہ کہا اور ہرن کے چمڑے کی وہ انگیا جو چھاتیوں پر کسی ہوئی تھی اور پھول سے اُسکے بدن میں گڑ گئی تھی جب ہاتھ سے کھولنے لگی نہ کھلی، تب انسویا سے وہ بولی اری مُددا

میری انگیا باندھی ہے ٹاٹک تو اُسے ڈھیلا کر دے۔

جوں اُس نے بندوں کو ڈھیلا کر دیا، پریم کھلسیا کر اور جھنجھلا کر بولی گھڑی گھڑی کی کھول موند کیا کریں۔ جوانی کے زور سے بدن تیرا بڑھتا ہے اور اُبھار چھاتیوں کا ہوتا جاتا ہے۔ ہمارا گلہ تو کرتی رہتی ہے۔ اپنی طرف نہیں دیکھتی کہ تیرا بدن کچھ کا کچھ ہوا جاتا ہے"۔

ایک بھنورا منڈلاتا ہوا سکنتلا کے چہرہ پر آبیٹھتا ہے اور قصہ کا وہ منظر ہمارے سامنے آتا ہے جہاں ہندوستان کے جادو قلم شاعر نے حسن و عشق کی داستان میں گویا تمام کائنات کے جمیل ترین مناظر کو شریک کر دیا ہے۔ اور ان سب میں سکنتلا کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

" یہ بات سُن کر وہ نہایت شرمائی۔ پھر اُسی اپنے کام میں لگی۔

تب ایک بھنورا پھولوں پر سے اُڑ کر مُنہ پر منڈلانے لگا اور خوشبو پا کر اُسکے نازک نازک ہونٹوں پہ جو گلاب کی پتّی سے تھے پھرتا تھا۔ وہ سسکیاں لے لے جھڑکتی تھی۔ اُڑ جاتا پھر آبیٹھتا تھا۔ تب جھنجھلا کر اور گھونگھٹ کر کے سکھیوں کی طرف دوڑی، اور وہ بھنورا بھی گونجتا ساتھ ساتھ لگا رہا.......

راجہ یہ تماشا دیکھ رہا اور من ہی من میں بھنورے سے یہ کہا تیرے سے کہاں طالع میرے کہ اسکے گرد پھروں .... تو اُڑ کر پاس جاتا ہے، گویا خوشی کی باتیں کہہ اُس سے لگن لگاتا ہے۔ وہ تجھے ناز و ادا سے جھڑک جھڑک دیتی ہے، اور خفا ہو ہو مُنہ پر گھونگھٹ لیتی ہے تس پر تو نہیں منڈلاتا پھرتا ہے، اور اُسکے ہونٹوں سے رس لیتا ہے ہم دُور سے چھپ چھپ کر یہ رنگ دیکھ رہتے ہیں، آگے جاتے ہوئے خاطر نازک سے اُس کی ڈر آتا ہے۔ دھن تجھے ہم کس کام کاج کے ہیں .... وہ معشوقیت سے اُس بھنورے کو ہزار عشوہ و کرشمہ ور کر رہی تھی۔ پر وہ اُسکی باس پہ پاس سے نہیں سرکتا تھا۔

پھر کہنے لگی مجھے اس جنگل میں اس بھنورے نے ستایا۔ پھر چلّائی کہ سکھیو تم میرے پاس آؤ۔ اس بدبخت سے میری تئیں چھڑاؤ۔ یہ ہونٹوں پہ میرے منڈلا رہا ہے۔ ٹالے سے نہیں ٹلتا۔ اس سے میرا بس نہیں چلتا۔

سُنتے ہی سکھیاں دوڑی آئیاں، اور یہ رنگ دیکھ ہنس ہنس کر کہنے لگیاں کہ ہمیں تو نے

ناحق بلایا - اس بَیری سے ہم کیونکر بچائیں - راجہ دشمنت سے فریاد کرو وہ اس تپ بن کا رکھوالا ہے -
راجہ کا نام سُنتے ہی پکار اُٹھی، اور وہ اُن درختوں سے نکل پاس آکر کہنے لگا - کہو،
تمھیں کس نے ستایا - راجہ کو دیکھتے ہی سب (یہ) بن مول بِک گئیاں، اور شرم کے مارے
گھونگھٹ کر کے جھک گئیں - کچھ ڈریں گھبرائیں، بیقراری سے ایک جاگہ کھڑی نہ رہ سکیاں -
حیرت سے آگے بھی پاؤں نہ پڑ سکا - بھیچک سی ہو گئیں، کچھ بول نہ سکیں -

تب اُن میں سے انسویا نے دل کڑا کر راجہ کو جواب دیا کہ ...... یہ بھولی نادان
ہے، نادانی اور بھولے پن سے بھنورے کو دیکھ پکار اُٹھی - ہم اُسکے راج میں نڈر ہیں - کون ہمیں
ستا سکے اور کون آنکھ دکھا سکے -

یہ سُن کر راجہ نے کچھ اپنے تئیں بتا اور مسکرا کر سکنتلا کی طرف دیکھ کر پوچھا کہ تمہارے نونہال
درخت سر سبز اور ہرن کے بچے اچھے ہیں - اتنی بات کے سنتے ہی اُسکے رونگٹے کھڑے ہو گئے
اور سارا بدن شرم کے مارے کانپنے لگا - منہ سے کچھ بات نہ نکلی حیا کے مارے نیچی نظریں کر لیں -

تب انسویا نے اُسی قرینے سے تھوڑا سا دریافت کر کے بخاطر داری اُسکی طرف سے یہ کہا -
کیوں خیر ہو اب خیر ہماری جو تم سے نیک بخت رکھوالے ہوں - تم جو پاؤں پاؤں یہاں دوڑے
آئے ہو، پسینہ تمہارے مُنہ پر آگیا ہے - درختوں کی چھاؤں تلے دم لو - ہم تمہارے ہاتھ پاؤں
دھوویں - ہم نے قسمت سے تمہارے قدم دیکھے - آج کے دن تم ہمارے مہمان ہو -

سکنتلا سے کہا تو کیوں نادان بنی ہے - ٹھنڈا پانی لا اپنے مہمان کو پلا -

(راجہ نے مسکرا کر) ہمیں کچھ درکار نہیں ...... تم بھی پانی سینچتی سینچتی تھک گئی ہو -
سب مل کر ان درختوں کی چھاؤں میں بیٹھو اور ٹھنڈی ہوا لو - تب ہنس کر انسویا سکنتلا کی
طرف دیکھ کر بولی - ہمارے یہاں رلونٹے مہمان آئے ہیں - ان کا ڈر کچھ مت کر انکی باتوں پر کان دھر -
سکھیوں کی سن کر یہ باتیں حسن داد اکی کر گھاتیں راجہ اور سکنتلا چھاؤں میں درختوں کے
نیچے بیٹھے - ایک کی طبیعت ایک کی طرف آئی ہوئی، اور مہر و محبت دل میں سمائی ہوئی قسمت سے
اُن دونوں کی ملاقات ہوئی - دونوں کے دل کی گرہ کھلنے کی کیا اچھی بات ہوئی "

ابھی سلسلۂ کلام جاری تھا کہ راجہ کی فوج پہنچ گئی، اور سکنتلا اور اُسکی سکھیاں گھبرا کر

اپنے گھر کو جاتی ہیں اور سکنتلا نہایت پریشاں حال وہاں سے رخصت ہوتی ہے۔

"انسویا وحشت کھا کر راجہ سے بول اُٹھی تم بیٹھو یا جاؤ ہمارا کلیجہ تھرتھراتا ہے۔ ہم اپنے مکان میں جاتیاں ہیں۔ تم مہربانی کرکے ہمارے مکان میں آئیے۔ تمہاری خدمت ہمیں لازم تھی۔ سو ہم خدمت کئے بن رخصت ہوتے ہیں۔ یہ بات کہتے بھی ہمیں شرم آتی ہے ہم سے رکاوٹ دل میں مت کیجیو پھر ایک بار ہمیں درسن دیجیو۔

سکنتلا کو تھام اور ہاتھ میں ہاتھ لیکر وہاں سے گھر چلیاں۔ جدائی سے دونوں کے دل میں بے کلیاں ہوگئیاں۔ وے اُدھر چلیں اور راجہ فوج کی طرف چلا۔ جوں جوں وہ آگے جاتا تھا۔ دل اُس کا پیچھے رہا جاتا تھا۔......

ہر ہر قدم پر اُس کا تو یہ حال تھا اور سکنتلا کا عجب احوال تھا۔ اپنے کف پا سے جو برگ گل سے نازک تر تھے کانٹے نکالنے کے بہانے جابجا ٹھہرتی تھی اور کبھی آنچل اُسکا بیقراری سے جو خاک پر گرتا تھا کھڑے ہو ہو اور سنبھال سنبھال آپ کو اُٹھاتی تھی اور کبھی بال سر کے جو آشفتہ سری سے مُنہ پر بکھر جاتے تھے سنبل کا سا دستہ بنا کر اسی حیلے سے باندھ کر جوڑا آگے یا توں بڑھاتی تھی کبھی نظریں بچا کر سکھیوں کے پیچھے پھر کر راجہ کو دیکھ لیتی تھی۔ ؎

اسی طرح ہر ہر قدم راہ تھی   کبھی نالہ تھے اور کبھی آہ تھی

یوں ہی لگن لگائے ہوئے وہ اپنے ستھان میں گئی قالب میں گویا جان نہ تھی۔ ؎

نہ تھا دن کو آرام نے شب کو خواب   شب و روز تھا اُسکے جی کو عذاب

(۵)

قصہ طویل ہے اور بے انتہا دلچسپ۔ انداز بیان اور زبان دونوں ایسی ہیں کہ بغیر ختم کئے کتاب ہاتھ سے رکھنا ناممکن ہے۔

سکنتلا کی حالت فراق میں ملاحظہ ہو:۔

"وہ شرم کے مارے سکھیوں سے بھی کچھ نہ کہہ سکتی تھی۔ دل کا درد دل ہی دل میں گھٹتی تھی۔ تیر کاری یا تیز کٹاری کلیجے پر لگے تو سو رہا سکتے ہیں۔ پر نئی جدائی کا دکھ سہا نہیں جاتا۔ کون کہے سے بات یہ مانے جس پہ بیتے وہی جانے۔ جہاں وہ اکیلی جا کر بیٹھی۔ ساون کی

سکنتلا کنول کے پتے پر چٹھی لکھتی ہے :-

"ہم کیا علاج کریں، مہر تمہارے دل میں ذرہ نہیں - دل ہمارا نظروں ہی نظروں میں چُرا لے گئے پھر دکھائی نہ دیے - سراپا تمہارا برگ گل سے بھی نازک تر یہ ساتھ بنایا ایسے بیدرد اور سنگدل کیوں ہو"

راجہ سکنتلا کے پاس پہنچ جاتا ہے اور سہیلیاں اُسے اکیلا چھوڑ کر چلی جاتی ہیں سکنتلا گھبرا کر اُٹھتی ہے - راجہ پکڑ کر بٹھا لیتا ہے -

"راجہ نے مسکرا کر اُسکی (؟) کر کہا اس دوپہر کی گرمی میں سورج ایسا تپتا ہے جو پرند پر نہیں ما سکتے اور چرند بھی رکھوں کی چھاؤں میں سے باہر نہیں نکلتے، تم اُٹھ کر یہاں سے کہاں چلی ہو میرے پاس سونپ گئی ہیں جو تمہاری پیاری سکھیاں ہیں - جو وے کام کاج کرتی تھیں، مجھے فرماؤ کہو تو صندل گھس لاؤں، تمہاری پیشانی پر لگاؤں - کہو تو پنکھا ہلاؤں -

یہ کہکر راجہ نے ڈھٹھائی کی اور ہاتھ پکڑ کر سکنتلا کو بٹھایا چھاتی اُسکی دھک دھک کرنے لگی"

سکنتلا اور راجہ آپس میں پیمانِ وفا کرتے ہیں -

"اپنے ہاتھ میں اُسکا ہاتھ لیکر کہا، آج سے ہم تمہارے ہو چکے، اور تم ہماری ہو چکیں"

اُس وقت کی فضا :-

"وہ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں اور درختوں کی گہری گہری چھائیں کہ جہاں یہ جگہ سا اُس چاند سے مکھڑے پر والہ تھا، اور وہ کوئل سی کوک رہی تھی ......"

—— ۶ ——

سکنتلا اپنے پیارے شوہر کے یہاں سدھارتی ہے اور اُسے دلھن بنا کر اُس کی سکھیاں اور گھر والے رخصت کرتے ہیں -

"گوتمی نے شگون نیک ٹھیرا، چمکیلے کپڑے اور گہنا پہنایا، سکھیوں نے مانگ میں سیندور بھر، کاجل آنکھوں میں دے بہادر پان کھلائے"

وہ اپنے گھر والوں بلکہ اپنے گرد و پیش کی تمام چیزوں سے جدا ہوتے وقت نہایت بے چین ہوتی ہے -

"آنسو آنکھوں سے پونچھتی، اور ہچکیاں لیتی ہوئی وہ سسرال کو چلی ......"

درختوں پر کوئلوں نے کوک مچائی وے جو لگی تھیں گویا درخت آہ و زاری کرتے تھے -

یہ شورش اور اپنے درختوں کو دیکھ دیکھ کر وہ آنسو بھر لاتی تھی، اور سکھیوں سے کہتی چلی جاتی تھی "اگرچہ راجہ کی الفت میرے دل میں سمائی ہے پر اس بن کی ہوا میرے جی سے جاتی نہیں۔ اپنے ہاتھوں کے درخت لگائے ہوئے دیکھ کر چھاتی بھری آتی ہے۔ میں تو چلی پر تمہیں انہیں سونپے جاتی ہوں۔

..... جدائی سے اُس کے بن نے خاک اُڑائی، موروں نے ناچنا بھولے، ہرنوں نے سبزے کا پھرنا چرنا چھوڑا، چکاروں نے اُدھر سے مُنہ موڑا، پرندوں کے ہوش اُڑے، بھنورے گونجنا بھولے ......"

سکنتلا راجہ کے یہاں پہنچتی ہے۔ انگوٹھی گم ہو چکی ہے، راجہ اُسے نہیں پہچانتا اور اُس سے شادی کرنا تسلیم نہیں کرتا بلکہ اُسے الزام دیتا ہے۔

"تریا چرتر ہم کانوں سے سنتے تھے سو آنکھوں دیکھے، میں نے تجھے کب دی تھی انگوٹھی۔ ایسی بات کیوں کہتی ہے جھوٹی؟"

گومتی خفا ہو کر راجہ سے کہتی ہے :-

"مہاراج تم ٹھٹھول ہو، ہم بن باسی ہیں۔ باتیں بنانا کیا جانیں، کپٹ کہاں سیکھی ہم نے، دغا ہوتی ہے راجوں کے من میں"

راجہ بولا :-

"عقل سبھاؤ سے ہوتی ہے۔ کوئل چترائی کر کے انڈے کوّے کے جھوجھ میں دے آتی ہے جب وہ سیتا ہے اور بچے نکل کر بڑے ہوتے ہیں تب اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرتی ہے"

یہ حالت دیکھ کر سکنتلا حیران و سرگرداں رہ جاتی ہے۔ دیوتا مدد کرتے ہیں۔ اُسکی ماں اسے آسمانی دنیا میں لے کر غائب ہو جاتی ہے۔ ادھر کھوئی ہوئی انگوٹھی حُسنِ اتفاق سے ایک مچھلی کے پیٹ سے مل جاتی ہے۔ اور اُسکے ملتے ہی راجہ کی حالت بدل جاتی ہے۔ اب سکنتلا کی یاد میں وہ مدت تک رات دن تڑپتا رہتا ہے۔ آخر کار ایک دن ایک کوہستان میں پہنچتا ہے۔ جہاں اُسے اپنا بیٹا جو اس دوران میں سکنتلا سے پیدا ہو کر کچھ بڑا ہو لیا تھا مل جاتا ہے :-

"پھول رنگ برنگ کے تمام اُس پہاڑ پر کھلے ہوئے دیکھے، پانی چشموں سے جاری۔ درخت سب میوہ دار، ہر ایک ٹہنی پر جانور [illegible]

کہ ایک لڑکا خوبصورت، چھوٹی سی عمر کا، شجاعت کے تمام آثار اُسکی پیشانی سے روشن ہیں شیر کے بچے سے کھیل رہا ہے...... کلا جبڑا اُسکا چیر چیر کر دانت گنتا ہے۔"

راجہ کو رفتہ رفتہ معلوم ہو گیا کہ یہ اُسی کا لڑکا ہے۔ اور اُسکی ماں وہیں پر موجود ہے۔ راجہ اُسکے پاس جاتا ہے اور بچھڑے ہوئے عاشق و معشوق مدتوں کے فراق کے بعد ایک دوسرے سے ملتے ہیں:۔

سکنتلا کی حالت یہ ہے ۔

" دردِ فراق اُسکے دل میں کارگر ہے اور احوال اُس کا نوع دیگر ہے۔ منہ اُترا ہوا، بال سر کے چکٹے ہوئے، کپڑے بدن کے میلے۔

اُسے اس حال میں دیکھ کر راجہ زار و قطار رونے لگا، اور وہ شرم سے سر نہوڑائے ہوئے پاس آکر کھڑی ہوئی۔ اُس وقت راجہ کو اور بات کچھ بن نہ آئی پاؤں پر گر پڑا۔"

اخیر منظر:۔

" اس طور اُن مشتاقوں کی آپس میں ملاقات ہوئی۔ طالع سوتے ہوئے دونوں کے جاگے۔ دُکھ درد اُن کے دلوں سے یک لخت بھاگے۔ دونوں خوش و خرم ہوئے سکنتلا رانی ہوئی اور راجہ اپنے راج میں حکمرانی کرنے لگا۔ رعیت اُنکی خوشی سے شاد ہوئی وہ نگری پھر از سر نو آباد ہوئی۔ سب مطالب و مقاصد اُنکے دلوں کے بر آئے اپنے اپنے حسن جوانی کے خوب مزے اُٹھائے۔"

خاتمہ

" اب یہ کہانی یہاں تمام ہوئی۔ اے جوان! لفظ و معنی سے بخوبی سر انجام ہوئی، از بسکہ زبان ریختہ میں لکھی سال ہجری کے موافق ریختہ تاریخ ہوئی۔

سکنتلا کا جو احوال اس میں ہے مذکور
سکنتلا ہے اسی نام سے کیا مشہور

ڈانٹی کی تصنیف ڈیوائن کامیڈی
کے
حصۂ دوزخ کے باب اوّل کا ترجمہ

جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثر ڈپٹی کلکٹر

(۱)

طے مری عمر کا جب نصف ہوا تھا حصا   دشت تاریک میں گم آپ کو میں نے پایا
جادۂ راستی و حق سے جو برگشتہ ہوا   اُسکا اظہار ہے مشکل جو مجھے پیش آیا
وحشت انگیز تھا ایسا وہ بھیانک جنگل
کہ تصور سے بھی آتا ہے حواسوں میں خلل

(۲)

کم نہیں چاشنیٔ مرگ سے کچھ یاد اُسکی   نہیں آسان، بیاں ہو سکے روداد اُسکی
غم و اندوہ پہ قائم ہوئی بُنیاد اُسکی   چھوڑ دے فکر بس اب اے دل ناشاد اُسکی
ذکر اُسکا ہو جو اُس دشت میں دیکھا میں نے
اور انجام میں جو لطف اُٹھایا میں نے

(۳)

پردے غفلت کے پڑے تھے جو مری آنکھوں پر   دھیان آتا نہیں کیونکر ہوا جنگل میں گزر
ہوش منزل ہی کا تھا اور نہ جادہ کی خبر   کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جاتا ہوں کدھر
گرم رفتار تھا اک عالم بیہوشی میں
طے ہوا دشت بلاخیز فراموشی میں

دامن کوہ میں تھا سر جو اُٹھا کر دیکھا (۴) نور خورشید سے نکھرا ہوا اُس کو پایا
مشعلِ راہ ہدایت تھی مجھے اُسکی ضیا چونک اُٹھا اور اُسی سمت کا رُخ میں نے کیا
رونما صبح ہوئی شام محن کی آخر
ظلمتِ شب سے ہوا نور سحر کا ظاہر

اُس شناور کی طرح سانس ہو جسکی پھولی (۵) اور اک بار نظر آئے جھلک ساحل کی
پھر خوشی میں ہو مبدل الم مایوسی ڈالے مڑ مڑ کے نظر موجوں پہ وہ سہمی ہوئی
میں جو گزرے تھے آفات پہ کرتا تھا غور
غور میں بھی تھے مری روح کے آزار کے طور

دم میں دم آیا تو دم بھر وہیں آرام کیا (۶) اُجڑی سنسان پہاڑی پہ پھر چڑھنے لگا
ہر قدم پھونک کے مضبوط جگہ رکھتا تھا یوہیں چٹان کی اک ڈھال سے نزدیک ہوا
ناگہاں آئی ذقن بھرتی ہوئی مادہ پلنگ
عرصۂ زیست دوبارہ ہوا مجھ زار پہ تنگ

چست چالاک غضب کی تھی قیامت کی حسیں (۷) پتلیاں زرد، سیہ جلد، گُل اُس میں سیمیں
رُخ جدھر کا میں کروں وہ بھی پہنچتی تھی وہیں اپنی ہر سانس تھی مجھ کو نفس بازپسیں
متواتر یہ کیا قصد پھروں اُلٹے پاؤں
خوف وادی کا پکڑتا تھا مگر میرے پاؤں

وقت وہ تھا کہ سحر کو ہو عطا تازہ حیات (۸) ہر شناہ بنے خورشید تجلی آیات
جسکی تخلیق ہے عشق اور محبت ہے ذات حرکت بھی ہو اُسی سے اور اُسی سے ہو ثبات
جب کہ دل رازِ حقیقت کے بیاں کرتا ہے
چشم ظاہر سے نہاں جو ہے عیاں کرتا ہے

خوش وہ ہنگام کہ ہر سانس ہے وجدان کا جام (۹) دیدۂ و دل کے لئے امن و نبت کا پیام
اک فقط میں ہی تھا محروم نشاط و آرام مبتلائے غم ہستی و اسیر اوہام
خوف اس طرح کے نرغے میں جیسے گھیرے ہوں

صورت اک شیر ببر نے بھی مجھے دکھلائی (۱۰) اے لو! اک تازہ بلا اور بلا پر آئی
جست کی میری طرف لے کے بس اک انگڑائی　　حالتِ گرسنگی میں جو مری بو پائی

یہ گماں تھا کہ وہ آیا وہ دبوچا مجھ کو
کبھی دانتوں سے کبھی پنجوں سے نوچا مجھ کو

مادہ اک گرگ کی ہمراہ تھی پیچھے پیچھے (۱۱) ایسا خونخوار تھا لرزاں تھی ہوا بھی اُس سے
لیکن آنکھیں تھیں دہکتے ہوئے دو انگارے　　سوکھی لقات تھی اور بھوک سے کلّے کاڑھے

اُسکا مجموعہ تھی جو جس پہ مصیبت گزری
یادگار اُن کے غم و ہم کی مجسم وہ تھی

دانت بجنے لگے اور آیا پسینا ٹھنڈا (۱۲) ڈر اُسے دیکھتے ہی دل میں سمایا ایسا
تا سرِ کوہ پہونچنے کا سہارا نہ رہا　　اپنی حالت پہ کبیدہ ہوا میں بے سروپا

میری جانب وہ درندے بڑھے چپکے چپکے
بال تھے اُنکے کھڑے رونگٹے میرے تھے کھڑے

مرحلے جھیل کے دورانِ سفر بہتیرے (۱۳) ایسے رہرو کی طرح جو سرِ منزل پہونچے
آس کو یاس میں بدبخت بدلتے دیکھے　　شل ہو ایسا کہ قدم آگے دھرے پیچھے پڑے

قصد میں نے کیا ناچار پھر اُس وادی کا
جسکی گہرائیوں میں مہر کا شعلہ گل تھا

کہ یکایک نظر آئی مجھے صورت اُسکی (۱۴) غار کی آڑ میں یہ سوچ رہا تھا میں ابھی
اپنی جانب جو پھری چشمِ عنایت دیکھی　　جس کو کہئیے ادب آموزِ غمِ خاموشی

”رحم کر رحم کہ ناچار ہوں،، میں چیخ اُٹھا
”میری امداد کر انسان ہو تو یا سایا“

میرے ماں باپ تھے لمبارڈ وطن منٹووا (۱۵) ”کب کا انسان تھا مجھ میں ہوا“ وہ بولا
دورِ اگسٹس کا تھا مسکن تھا مرا جب روما　　جولیس تخت نشیں تھا کہ ہوا میں پیدا

دیوتا میرے زمانے کے دغاباز تھے سب
دوست دشمن کے تھے اور دوست کے غماز تھے سب

ابن انکیس کی تعریف میں اشعار کہے (۱۶) نیک و عادل تھا ٹروجن پہ کئے تھے حملے
سورماؤں کے میدان میں اکثر مارے سر ہوئے معرکے ان ہاتھوں سے کیسے کیسے

غلبہ دشمن کا تھا بانکا الئیس جلتا تھا
پھر بھی نرغہ سے وہ تلوہ نکل آیا تھا

آرزو کیوں ہے تجھے پھر تو پہونچ جائے وہاں (۱۷) ہے مصیبت کے شیاطین کا ھنگامہ جہاں
"کوہ فرحت" کی طرف کیوں نہیں موقع تاکے واں مرکز عیش ہے ہر شخص وہاں ہے شاداں

جلوہ گر ہوتا ہے وہ نور محبت دل سے
محو ہو جاتے ہیں سب نقش کدورت دل سے

وضع تعظیم سے تب میں نے جھکا کے سر کو (۱۸) عرض کی تو کہیں ورجل تو نہیں مردِ نکو
نغمہائے طرب انگیز کا مخزن تھا جو جسکا ہم پلہ یہ ممکن ہی نہیں کوئی ہو

مُہر دانائی و یکتائی کی ہر بات پہ ہے
شعر و موسیقی کو خود ناز تری ذات پہ ہے

تو ہی شاہد ہے مجھے تجھ سے ہے الفت کیسی (۱۹) تجھ سے مانوس ہوئی میری طبیعت کیسی
شاعری سے تری حاصل ہوئی لذت کیسی ایسی نعمت ہو میسر جسے، دولت کیسی

مرحبا اے مرے اُستاد مرے راہنما
تجھ سے ہی مجھ کو انوکھا یہ ملا طرز ادا

قصد پھرنے کا درندوں کے سبب میں نے کیا (۲۰) فرق ہے میرے حواسوں میں نہیں ہوش بجا
تیری امداد کا محتاج ہوں مردِ دانا نبض پھڑکی ہوئی رگ رگ میں تشنج ہے بھرا

دیکھ کر تجھ کو ہوئی لاکھ تسلی دل کی
پھر بھی انسان ہوں حالت نہیں اچھی دل کی

میری آنکھوں میں جو اُمڈا ہوا دریا دیکھا (۲۱) یہ کہا لطف سے اُس نے کہ "یہ دل سے رستا"
"آگے بڑھنے کا مصمم جو ارادہ ہے ترا" "راہ دینے کا نہیں تجھ کو درندہ جانتا"

[illegible] ہے آسیب وہ اور یہ موذی چالاک

خشم فطرت ہو اگر، خبث ہے طینت اسکی (۲۲) اشتہا کم نہیں ہوتی کسی صورت اسکی
مثل دوزخ کبھی بھرتی نہیں نیت اسکی حلق تک پر ہے شکم، پھر وہی حالت اسکی
کتنے ہی اور بہائم بھی مرید اسکے ہیں
نہ پلشت ایسے ہیں لیکن نہ پلید ایسے ہیں

ہاتھ سے ولنٹرو کے اسکی مقدر ہے قضا (۲۳) ملک گیری کی ہوس اسکا نہ ہوگا منشا
بلکہ تعلیم مساوات و محبت دیگا فلٹرو بھر میں نہ ہوگا کوئی اس کا ہمتا
بیکس اٹلی کو مصیبت سے چھڑائیگا وہی
بیڑیاں کاٹ کے آزاد بنائے گا وہی

اس پہ سوجان سے دوشیزہ کمیلا تھی نثار (۲۴) یوری الیس نے بنایا اسے رشک گلزار
دم سے پھر نیسس و ٹرنس کے رہی اسکی بہار بادۂ حب وطن سے یہ جری تھے سرشار
زندگی تیر ہوئی چھاؤں میں تلواروں کی
واہ کیا بات ہے ان اگلے وفاداروں کی

شہر و قریہ سے بھگائے گا وہ اس موذی کو (۲۵) ٹھوکروں ہی میں اڑائیگا وہ اس موذی کو
خاک میں خوب لٹائے گا وہ اس موذی کو پھر پلوٹس میں سلائے گا وہ اس موذی کو
شجر حرص وہیں پہلے پھلا پھولا تھا
مقصد زیست بھی انسان وہیں بھولا تھا

بہتری تیری ہے اسمیں ترا رہبر میں ہوں (۲۶) جو مقامات ہیں دلچسپ تجھے دکھلاؤں
آ مرے ساتھ تجھے ایسی جگہ پہونچاؤں کہ جہاں گردش افلاک ہے اک دور سکوں
ہے وہ نادیدہ جو آنکھیں تری دیکھینگی سماں
ناشنیدہ ہے ترے کان سنینگے جو وہاں

سینہ کوبی ہے کہیں اور کہیں ماتم ہے (۲۷) کوئی پرساں ہے کسی کا نہ کوئی محرم ہے
اس جگہ روحوں کی تکلیف کا یہ عالم ہے مرگ نو کی ہے تمنا کہ وہ ہستی سم ہے
ایسے بھی کچھ ہیں کہ پروا نہیں جلنے کی [illegible]

مجھ سے بہتر مگر اک روح کی حاجت ہوگی
رہنمونی میں اُسی کی تجھے راحت ہوگی

(۲۸) جو مجسم کرم و خلق و مروت ہوگی
وہ ترے واسطے اک آیۂ رحمت ہوگی

سونپ دونگا اُسے اور تجھ سے میں رخصت ہونگا
ورنہ تیرے لئے سرمایۂ زحمت ہونگا

(۲۹)

کیونکہ اُس قادر مطلق کی حکومت ہے وہاں
خشمگیں ہوگا مرے ساتھ تجھے دیکھا جہاں

جسکے احکام سے نا زیست رہا نا فرماں
باریابی نہ تجھے ہوگی یہ میرا ہے گماں

اِس جگہ سائے میں اے مرد مسافر دم لے
وہ مبارک ہیں جو مقبول ہیں اُسکے بندے

میں نے اُس سے کہا اے شاعر شیریں گفتار
ساتھ اپنے مجھے لے چل کہ نہیں خوب آثار

(۳۰) مجھکو تنہا نہ یہاں چھوڑ کہ ہوں غم کا شکار
شور و شر سے نہ دوبارہ کہیں ہو جاؤں دوچار

باب پیٹر سے میت میں گزر جاؤں گا
پست سے پست جو ہیں اُنکو بھی دیکھ آؤں گا

وہ چلا، ساتھ ہی سایہ کی طرح میں بھی چلا
شکر صد شکر مصیبت سے ہُوا چھٹکارا

(۳۱) وہ جو مانع نہ ہوا خوف زدہ دل ٹھہرا
ہادی و رہبر کامل مجھے ورجل سا ملا

بعد ایذا کے میسر مجھے راحت جو ہوئی
کیا بیاں کیجئے اُس وقت مسرت جو ہوئی

نوٹ - جولائی ۱۹۳۱ء سے ادب کی نئی جلد شروع ہوتی ہے۔ جولائی اور اگست کا پرچہ خریداران ادب کی خدمت میں عنقریب حاضر کیا جائیگا اِس نمبر سے اپنی گزشتہ جلد مکمل فرمالیں۔ - مدیر

علم الانساب کی ضرورت

جناب منشی امیر احمد صاحب علوی بی اے ۔ پی سی ایس مصنف یادگار نیس شاہان مالوہ

طرہ امیر وغیرہ وغیرہ

علم الانساب جس سے مراد اپنے آبا و اجداد کے نام و نسب کی محافظت و یادداشت ہو ایک فطری علم ہے جسکی ضرورت ابتدائے آفرینش عالم سے اس وقت تک ہر قوم اور ہر ملک میں محسوس ہوئی ہے اور جسکو اگرچہ طوفان مخالفت کے تند و پرشور جھونکوں سے اکثر مقابلہ کا اتفاق ہوا ہے خصوصاً گزشتہ چند صدیوں میں تو براعظم یورپ کے ایک معتد بہ حصہ سے اس پرانے برگزیدہ علم کا اثر قلوب سے بہت زائل ہوگیا ہے لیکن جس وقت تک یورپ کے عالی دماغ مدبر تمام دنیا کے لئے ایک ایسی جمہوری اور متحدہ سلطنت بنانے میں کامیاب ہوجائیں جو حاکم و محکوم، عالم و جاہل، فاسق و پرہیزگار سب کا رتبہ یکساں کر دے اور جس وقت تک اولاد جائز و ناجائز کا امتیازی فرق صفحۂ عالم سے بالکل نیست و نابود نہ ہو جائے اُس وقت تک یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ شرافت ذاتی کی فلسفیانہ اور عام پسند قدر و منزلت نے عالی نسبی کی وقعت معدوم کر دی اور یہ مجبوراً تسلیم کرنا ہوگا کہ شرافت نسب کا دنیا کے قانون سیاست مدن اور نیز ہر شخص کے دل پر ایک خاص اثر ہے جسکو نہ مغربی روشنی کی برقی قوت نیست و نابود کر سکتی ہے اور نہ ترقی تہذیب کا پرانا اثر جادو بے اصل کر سکتا ہے ۔ مشرقی دنیا تو بقول نئی روشنی والوں کی تہذیب و شائستگی کے مدارج طے کرنے میں بہت سست ہے لیکن یورپ میں بھی جسکی ہر ادا پر ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان [illegible] دیتے ہیں از منہ مظلمہ سے اس وقت تک ہمکو کوئی ایسا زمانہ نظر نہیں آتا جس میں نسب کا لحاظ نہ کیا گیا ہو۔

[illegible]

نہ تھا؟ کیا روم میں صرف وہی لوگ ملک کے بارگراں کے متحمل نہیں قرار دیئے جاتے تھے جو شرفا کے معزز طبقہ میں شامل ہوں؟ کیا فرانس میں پچھلی عظیم الشان بغاوت کا اصلی سبب یہ نہیں تھا کہ آزادی پسند رعایا قدیم شرفا اور رؤسا کے پنجہ ظلم و ستم سے رہائی چاہتی تھی؟ کیا آلمانیہ (جرمنی) فرانس، آسٹریا، روس اور اطالیہ میں اب تک عالی نسب رؤسا کے خاندان نہیں باقی ہیں؟ جو عوام الناس کو اپنے مقابلہ میں ذلیل اور کمینہ خیال کرتے ہوں؟ کیا انگلستان کا وہ پرقوت و شوکت رکن عظیم جو مجلس وضعان قوانین کے ایک اعلیٰ طبقہ میں گشت کرتا ہے اور جسکے بعض افراد اس پر ناز کرتے ہیں کہ انکے اجداد شہنشاہ ولیم فاتح انگلستان کے ہمراہ آئے تھے۔ نیست و نابود ہو گیا۔

اگر یہ نہیں ہے تو بیشک تمام یورپ میں نسب کا لحاظ کیا گیا اور کیا جاتا ہے گو وہ ملکی خصوصیات طرز ماند و بود اور رسم و رسوم کے عظیم تغیرات کی وجہ سے اس خیال سے بہت مختلف ہے جو نسب کے متعلق اس وقت ہمارے ملک میں جاری و ساری ہے۔

اگر قومی اور ملکی حیثیت سے قطع نظر کر کے مذاہب عالم کی طرف توجہ کی جائے تو وہ تین جلیل القدر مذاہب جنکی مجموعی تعداد دنیا کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ ہے اور جنکے تسلی بخش فیض سے دنیا کی شائستہ اور تہذیب یافتہ قوموں کا ایک بہت بڑا گروہ سیراب ہے یعنی مذہب یہود، مذہب نصاریٰ اور مذہب بودھ۔ ان میں سے ہر ایک کو نسب کی سخت زنجیروں میں جکڑا ہوا پاؤ گے خصوصاً مذہب یہود چونکہ وہ بنی اسرائیل کا خاص مذہب ہے اور بجز اولاد یعقوب علیہ و علی نبینا الصلوٰۃ والسلام کے اور کوئی شخص خواہ وہ کیسا ہی بزرگ مرتبت کیوں نہ ہو اس مذہب کی برکتوں سے فیضیاب نہیں ہو سکتا۔ بدیہی طور پر علم الانساب کی سخت ضرورت رکھتا ہے۔ اور اس علم میں ان کی سب سے زیادہ مستند تاریخ توریت مقدس کا ابتدائی جزو کتاب پیدائش ہے جو انساب کے تذکروں اور مختلف خاندانوں کے کیفیات وراثت سے مملو ہے اور جسمیں حتی الامکان عہد عتیق کے جمع کرنے والوں کا سلسلۂ نسب حضرت ابوالبشر علیہ السلام سے ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مذہب عیسوی نے چونکہ بیت المقدس اور اسکے مجاور یہودیوں کے کنار عاطفت میں پرورش پائی اور بقول مرقس کے اس مذہب کا مقدس بانی سوائے بنی اسرائیل کے کھوئے ہوئے گلوں کے اور کسی کی ہدایت کے لئے بھیجا ہی نہیں گیا تھا۔ اس لئے عہد جدید کے تالیف کرنے والوں نے

علم الانساب کو کتاب اللہ کا ایک ضروری حصہ سمجھا۔ یہاں تک کہ متی نے اپنی انجیل کا آغاز حضرت مسیحؑ کے نسب نامہ سے کیا جس میں آپ کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک پہنچایا ہے اور لوقا نے اپنی انجیل میں متی سے بھی ایک قدم بڑھا کر آپ کا نسب حضرت آدمؑ تک پہنچا دیا۔

اگرچہ حضرت مسیح کے اجداد کے متعلق لوقا اور متی میں کسی قدر اختلاف ہے لیکن دو رسولوں کا علی التواتر اپنی اناجیل میں آپ کا مفصل نسب نامہ درج کرنا اور بقیہ دو انجیلوں میں بھی۔ آپ کی شرافت اور عالی نسبی کا جا بجا ذکر ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ احکام عیسوی کے ترتیب دینے والے نسب کی صحت اور شرافت کو بزرگی و عظمت کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔

بودھ مذہب کی ابتدائی کیفیت اور اُسکے آداب و رسوم کے متعلق دنیا کو ایسی واقفیت جو بالیقین اور بلا تامل تسلیم کی جا سکے بہت کم ہے لیکن اس زمانہ میں تبت کے لاما، سیام، لنکا اور دیگر جزائر کے پیشوایان مذہب بودھ اور سلطنت چین کے حالات جس قدر دریافت ہو سکے ہیں اس بات کے شاہد ہیں کہ اُن کے یہاں بھی نسب کا لحاظ کیا جاتا ہے اور مذہب بودھ کی ایک مقدس کتاب (لوتاسعت دلوہر کے متعلق بعض روشن دماغ فلسفیوں کا خیال ہے کہ وہ مذہب بودھ کے احکام کا ایک قابل اعتماد ذخیرہ ہے) کے مطالعہ سے یہ استنباط ہوتا ہے کہ نہایت قدیم زمانہ سے گوتم بودھ کے نصائح پر عمل کرنے والے بعض خاندانوں کو مذہباً متبرک سمجھتے اور باہمی ازدواج و مناکحت میں عالی نسبی اور کفاءت کا لحاظ رکھتے تھے۔

علاوہ بریں مذاہب مذکورہ بالا کی آبادی کا ایک حصہ بت پرستوں سے بھی آباد ہے جن میں اہل ہنود سب سے زیادہ مہذب ہیں مگر ان کے یہاں بسبب ذاتوں کے تقسیم ہو جانے پیشہ وروں اور اہل حرفہ کی جداگانہ برادریاں قائم ہونے اور برہمنوں کی فوق العادات عظمت و شوکت بڑھ جانے کے نسب کی جانچ پڑتال کی اس قدر ضرورت ہے کہ اسکی مثال تاریخ عالم میں دشوار ہے۔

۲

البتہ اگر کوئی مذہب دنیا میں ایسا جاری ہوا ہے یا ایسی کوئی قوم دنیا میں سر سبز ہوئی ہے جو اس معاملہ خاص میں اہل ہنود اُنکے مذہب سے سبقت لے جا سکے تو وہ زمانہ جاہلیت میں مذہب تھا اُس نبی معصوم کی اولاد کا جسکو جلیل القدر باپ نے اپنے خداوند قدیر کی اطاعت و فرمانبرداری بجا لانے کے لئے ایک دشت بے آب و گیاہ میں "ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع" کہکر چھوڑ دیا تھا اور جو ایک مختصر [illegible]

جزیرہ نما میں تمام دنیا سے قطع تعلق کئے ہوئے آباد تھی۔ اگرچہ عالم کی نظر میں اُسکی وقعت اور دنیا کی تاریخ پہ اُس کا تمدنی اثر کچھ ہو مگر بجائے خود وہ اپنی شرافت و عالی نسبی شجاعت و بلند حوصلگی پر ایسی نازاں تھی کہ جتنی حقارت اُسکی دیگر اقوام نے نہ کی ہوگی اُس سے زیادہ ذلت کی نظر سے یہ اُن لوگوں کو دیکھتی تھی جن کو عرب مستعربہ کہلانے کا فخر نہیں حاصل تھا۔ موجودہ اہل ہنود کی طرح اُن کے یہاں بھی ہر پیشہ اور ہر کام کے لئے جداگانہ قبائل تھے جن میں نسلاً بعد نسلٍ موروثی سنتوں پر عمل ہوا کرتا تھا اور جس قبیلہ کے سپرد خانۂ کعبہ کی محافظت تھی اُسکی وقعت اُنکی نظر میں اس سے بدرجہا زیادہ تھی جو ہندوؤں کے مقدس شیوں نے برہمنوں کے لئے قرار دی ہے۔ انساب کی محافظت و یادداشت اور ازدواج و مناکحت میں شرافت کا لحاظ جو یہ کرتے تھے اور اس خاص فن میں جس قدر اہتمام انکو تھا اُس کا مثل تو شاید ممکن ہو لیکن افضلیت یقیناً دشوار ہے جبکہ اُنکے چچازاد بھائی بنی اسرائیل مصر و شام کے سبزہ زاروں کے فرحت افزا لطف اُٹھا رہے تھے کبھی یدبیضا کے معجز نما اثر سے مبہوت ہوے اور کبھی لب جاں بخش مسیحی کے فیض سے روح تازہ پائی۔ کبھی صوت داؤدی کے دلکش اثر سے بیہوش ہوے۔ اور کبھی شوکت سلیمانی کے پرجوش کوس لمن الملکی سے بیدار ہوے تھے۔ جب کہ رب العالمین کا اُنکے حال پر وہ فضل تھا کہ کبھی آسمان سے من و سلویٰ اُترتا تھا، اور کبھی پتھروں سے چشمے جاری ہوتے تھے جب کہ اُنکے ایک ہاتھ میں عصائے سلطنت تھا اور دوسرے میں پروانہ نبوت۔ غرض وہ عنایت تھی کہ یا بنی اسرائیل اذکروا نعمتی التی انعمت علیکم سے خطاب کئے جاتے تھے تو یہ ذریت اسمٰعیل ملک عرب کے سنسان و ویران ریگستان میں جَو کے سَتّو اور سوکھی کھجوریں کھا کھا کر بسر کر رہے تھے نہ اپنے حدود سے باہر نکل کر کیسی قوم سے ملے نہ کوئی ترقی یافتہ قوم اُنکی شریک ہوئی۔ ہزارہا سال اسی حالت میں گذر کرتے کرتے اُنکے پاس نہ مذہب ہا نہ دین، نہ کتاب نہ صحیفہ، صرف خانۂ کعبہ کی عظمت اُنکے دل میں تھی اور شرافت کا خیال دماغ میں۔ ہر قبیلہ ایک جداگانہ مذہب کا پابند ہوگیا۔ کوئی لات و عزا کی پرستش کرتا تھا، کوئی ہبل کو معبود سمجھتا تھا فسق و فجور شراب خواری اور کثرت ازدواج کی کوئی انتہا نہ تھی۔ بے تامل فحش اشعار و قصائد شارع عام پر پڑھتے اور لوگوں کو سُناتے تھے۔ مدتوں جہالت میں بسر کرنے کا یہ نتیجہ تھا کہ بات بات پر تلوار چلتی تھی اور زمانہ جنگیاں ہوا کرتی تھیں جنکا سلسلہ برسوں تک منقطع نہ ہوتا تھا۔ غرض دُنیا کی کوئی بُرائی نہ تھی جو ان سے سرزد نہ ہوتی ہو۔

کہتے ہیں کہ تمام بنی اسمٰعیل میں صرف ایک خاندان تھا جو مذکورہ بالا ملاہی اور منہیات سے کسی قدر

معزز رہا اور وہ بھی اس وجہ سے کہ خانہ کعبہ کی تولیت اُسکے سپرد تھی اور دوسروں پر اپنی عظمت و وقعت کے اظہار کے لئے اُن معاصی سے بے بہرہ رہنا ضروری سمجھتا تھا جن کے دیگر ہم وطن مرتکب ہوتے تھے۔ واقعی مصلحت خداوندی انسان کی عقل سے باہر ہے۔ یہی ایک قبیلہ یا خاندان جو ایام جہالت کی بُرائیوں سے محفوظ و مصئون رہا تھا ایک ایسے جلیل القدر بزرگ کا مولد و منشا قرار پایا جس نے اپنے خاندان، اپنے قبیلہ، اپنے گروہ، اپنے ملک بلکہ تمام دنیا کی تاریخ میں ایک عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا اور زبور داؤد کی وہ قدیم پیشین گوئی پوری کر دکھائی کہ جس پتھر کو معماروں نے بیکار سمجھ کر الگ کر دیا تھا اب وہی اصل الاصول بن گیا۔

اللہ اللہ اسی معصوم لڑکے کی اولاد جس نے وادی غیر ذی زرع میں اغیار کے طفیل سے پرورش پائی تھی اور جسکو بھائی بندوں نے ولد الجاریہ کا طعنہ دے کر وراثت سے محروم کیا تھا ایک معجز نما روحانی قوت سے متاثر ہو کر ایسی معزز ہوئی کہ آج جبل الطارق سے تا سرحد چین اور افریقہ کے انتہائی کنارہ سے تا بحر شمال جو ایک زبردست قوم ایک مذہب کی پیرو، ایک نبی کا کلمہ پڑھنے والی اور ایک خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرنے والی آباد ہے اور جسکی تعداد بروایتے اٹھائیس کروڑ اور بروایتے تیس کروڑ ہے۔ اُسکا ہر متنفس اُسی معصوم لڑکے کے ایک عزیز فرزند کی غلامی کو اپنا فخر سمجھتا ہے اور شرافت علوی نسب کی سب سے زیادہ محکم سند یہی خیال کرتا ہے کہ اُسی محروم الارث لڑکے کا خون رگوں میں دوڑتا ہو۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

جناب شارع اسلام علیہ التحیۃ والسلام نے اپنے فیض تعلیم سے ملک عرب اور وہاں کے باشندوں کی اخلاقی، تمدنی، اور ملکی حالت میں جو مفید اصلاحیں کیں ان میں سے ایک مہتم بالشان مسئلہ امتیازات نسبی کا بھی ہے آپ نے اپنے پر اثر روحانی وعظ سے جس طرح تعداد ازدواج کو محدود کیا، شراب کو قطعاً حرام قرار دیا، لڑکیوں کا بے گناہ قتل دفعتہ روک دیا۔ اور قصاص کے لئے حدود مقرر کئے۔ اُسی طرح عرب کی قدیم خاندانی شرافتوں کی عظمت کسی قدر کم کر دی لیکن بعض معاملات میں نسب کا لحاظ قائم رکھا مثلاً بنی ہاشم پر بسبب اُنکے فضل و قدس کے ذکوۃ حرام قرار دی۔ نماز میں قریشی کا امام ہونا افضل بتایا۔ ائمہ مسلمین کا قریشی نسب ہونا لازمی کر دیا اور نکاح میں تو شرافت نسبی کو ایسا ضروری سمجھا کہ اگر کوئی عورت غیر کفو میں نکاح کرے تو ولی کو اُس نکاح کے فسخ کا اختیار رہا۔ پھر کفارت کی تشریح میں قریش کو ایک

دوسرے کا کفو قرار دیا اور بقیہ اعراب کو بعضہم بعض کا ہمسر بتایا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ معاملۂ نکاح میں عرب کے رہنے والے عجمیوں کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتے تھے۔ ایک فقیہ نے تو یہ صاف طور سے کہدیا کہ "العجمی لایکون کفواً العربیۃ ولو کان العجمی عالماً او سلطاناً" یعنی عجمی اگرچہ وہ عالم یا بادشاہ ہو عربیہ کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ غرضکہ عالم کی کل مہذب قوموں اور تمام شایستہ مذہبوں میں کسی نہ کسی پیرایہ سے نسب کا لحاظ ضرور کیا گیا ہے اور علم الانساب سے واقفیت گویا ایک فطرتی ضرورت ہے جس سے کسی مہذب گروہ کو چارہ نہیں۔

علم الانساب میں جس قدر اہتمام کہ بنی اسمٰعیل کو تھا اور اس خاص فن میں جو درجۂ فضیلت انھوں نے حاصل کیا تھا وہ عالم میں بے فرد ہے مگر زمانۂ حال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اُنکے عزیز فرزند اب بھی اس آبائی علم سے غافل نہیں ہیں اور یادگار سلف کا ذوق شوق اُن کے دلوں میں بدستور قائم ہے۔ اگرچہ تہذیب اسلام کے اثر سے اُنکی نظر میں اب اس علم کی وہ وقعت نہیں ہے جو زمانہ جاہلیت میں تھی، لیکن ہنوز جس ملک جس صوبہ میں جس شہر یا قریہ میں چند عربی النسل خاندان آباد ہونگے اُن کو ہمیشہ شرافت و عالی نسبی پر نازاں پاؤگے اور اگر میراث پدر کے ساتھ علم پدر بھی اُن کے حصہ میں آیا ہے تو اس خاص بحث پر تصنیفات و تالیفات کا بھی ایک معقول سرمایہ اُن کے پاس موجود ہوگا، خواہ کیسی ہی ذلت، افلاس و محتاجی کی حالت میں ہوں اور بمقابلہ اپنے دیگر ہمسائیوں کے چاہے کیسے ہی زیادہ ناشایستہ حرکات کے مرتکب ہوتے ہوں لیکن اپنا سلسلۂ نسب ہمیشہ کسی عالی مرتبت خداشناس صحابی رسول یا اُولوالعزم خلیفۂ نبی سے ملائیں گے اور ہر عجمی کو گو وہ ایک جلیل القدر رئیس رفیع الشان عالم یا معرفت آگاہ درویش کیوں نہ ہو ہمیشہ اپنے مقابلہ میں چند خاص امور کے لئے کم رتبہ ہی خیال کرینگے۔

ظاہر میں اس فخر و ناز پر تعجب ہونگے لیکن نکتہ رس جانتے ہیں کہ شرافت کا خیال خود ایک تسلی ہے جو فطرت نے بنی نوع انسان کے دلوں میں اس لئے ودیعت رکھی ہے کہ ہجوم حسرت و آلام میں پچھلی ناکامیوں کا ایک حد تک معاوضہ اُس وقت کردے جب ذہن میں یہ تازگی بخش خیال پیدا ہو کہ "پدرم سلطان بود" ؎

دولت نہیں انسان کی کچھ قدر بڑھاتی		دنیائے دنی کام کسی کے نہیں آتی
گو فقر ہو عالی نسبی پر نہیں جاتی		بینا جو ہیں وہ دیکھتے ہیں جوہر ذاتی
محتاجی سے کم رتبۂ عالی نہیں ہوتا
عزت وہ خزانہ ہے کہ خالی نہیں ہوتا

اس عام قاعدہ سے وہ بنی اسمٰعیل بھی مستثنیٰ نہیں ہیں جو ہندوستان میں آباد ہیں اور جن کی نسل اس وقت مسلمانان ہند کی آبادی کا ایک بڑا حصہ ہے یہ بھی انھیں دل خوش کن خیالات سے مست ہیں۔ جو اُنکے بھائی بندوں کو عراق عجم، شام، مصر و عرب وغیرہ میں تسکین و تسلی دیتے رہتے ہیں اور اُن کے کانوں میں بھی وہی ثم الاقربون ثم الاقربون[1] کا گراں بہا مژدہ گونجا کرتا ہے جسکے دلپسند اظہار کے لئے دوسری صدی ہجری میں خلفاء عباسیہ میں سے ایک بلند ہمت[2] سلطان نے روضۂ رسول کریم کے سامنے السلام علیک یا ابن عم کہا اور ایک جلیل القدر بزرگ[3] نے اُسی وقت السلام علیک یا جدی کہہ کر اُسکا تفاخر خاک میں ملا دیا۔

اُنھوں نے ہندوستان پہنچکر اپنے آباو اجداد کے صحیفہ کا ایک لفظ بھی فراموش نہ کیا بلکہ چند حاشیے اور بڑھا دیے مثلاً عرب میں نسب کا اعتبار باپ کی طرف سے ہے اور ماں خواہ کیسے ہی قبیلہ کی ہو لیکن اگر باپ شریف ہو تو اولاد جائز کی صحت نسب میں کچھ فتور نہیں آتا۔ اُنھوں نے اپنے مقدس عربی خون کو مخلوط النسل عجمیوں سے بچانے کے لئے یہ شرط اور بڑھا دی کہ اگر ماں عجمی النسل ہو۔ یا اُس کے اجداد میں ذکور و اناث سے کوئی شخص مجہول الاحوال ہو یا اندیشہ ہو کہ اس میں کسی عجمیہ کی آمیزش ہے تو اولاد کا مرتبہ گھٹ جائے گا اور وہ نجیب الطرفین نہ شمار کی جائیگی۔ ظاہر ہے کہ یہ شرط ہندوستان کے لئے جو مختلف اقوام سے آباد ہے بہت سخت تھی اور خصوصاً ان بزرگوں کے لئے جو مجاہدین کی شان سے اہل و عیال کو چھوڑکر یہاں آئے اور یہیں بس پڑے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصداق الشرافۃ فی القریٰ صرف چند قصبات ایسے رہ گئے جو اس محک امتحان پر پورے اُتر سکیں اور ارض مقدس حجاز کے متبرک باشندوں سے تفاخر نسب میں ہمسری کا خیال دل میں لاسکیں۔

ان معدودے چند قصبات میں جو مختلف خاندان آباد ہیں وہ حسب و نسب میں اپنے دیگر ابنائے وطن سے ممتاز ہیں اور نہایت فخر سے دعویٰ کرتے ہیں کہ جس گراں بہا امانت کی حفاظت نے اُنکے دیگر بنی اعمام کو عربستان کے حدود سے چار قدم آگے بڑھ کر دشوار ہوگئی تھی حتیٰ کہ خلفائے عباسیہ میں سے صرف ایک

---

[1] قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم " اول من اشفع من امتی اہل بیتی ثم بنو ہاشم ثم الاقرب ثم الاقرب۔ جواہر الایقان فی حفظ الایمان صفحہ ۱۱

[2] خلیفہ ہارون الرشید عباسی۔

[3] حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام۔

فرمانروا[1] کے متعلق یہ دعوی کیا جا سکتا ہے کہ وہ نجیب الطرفین تھا۔ یہ اپنے وطن سے نہ نکلے ہوں ورا ایک اجنبی ملک اور غیر مانوس سرزمین پر اپنے پاک عربی خون کو ویسا ہی صاف بچائے ہیں جیسا کہ وہ نعز بن کنانہ[2] کی رگوں میں تھا۔

کوتہ اندیش اس افتخار نسبی پر طعنہ زن ہوتے اور اپنے زعم میں ان اوہام باطلہ کے دور کرنے کے لئے لیس للعربی علی العجمی فضل الا بالتقوی سے سند لاتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ فطرت کی نازک آواز جو دل میں گدگدی پیدا کرتی ہے اُسکا بے حس و مدہوش کرنے والا اثر نہ کسی حاکم جابر کے جور و جفا سے تھم سکتا ہے اور نہ کسی ناصح مشفق کی پند و نصیحت سے نہ کوئی برقی یا کیمیائی طاقت اُن کے دل سے یہ فلسفیانہ نکتہ کہ

گرچہ خوردیم نسبتے است بزرگ ذرۂ آفتاب تابانیم

فراموش کرانے میں کامیاب ہو سکتی ہے اور نہ کوئی دُور اندیش اُنکی اس منطقیانہ دلیل کا جواب دے سکتا ہے کہ

ذرے سے گل کا خذ گل تر ہو نہیں جاتا قلعی سے کچھ آئینہ قمر ہو نہیں جاتا

ہر قطرۂ ناچیز گہر ہو نہیں جاتا مس پر جو ملمع ہو تو زر ہو نہیں جاتا

جس پاس عصا ہو اُسے موسیٰ نہیں کہتے

ہر ہاتھ کو عاقل ید بیضا نہیں کہتے

---

[1] خلیفہ امین الرشید عباسی

[2] ایک مورخ کا خیال ہے کہ اجداد رسول مقبول صلعم میں نعز بن کنانہ ہی وہ تھے جنکی اولاد نے قریش کا معزز نام حاصل کیا۔

ستی سہاگن

خالص اُردو　　ایک دُکھ بھری کہانی

حضرت آرزو لکھنوی

کالی کالی متوالی گھٹائیں جھومتی ہوئی آتی ہیں، کھُل کھُل کے برستی ہیں اور برس برس کے کھُل جاتی ہیں۔ یہ ایسا سماں نہیں جو دبی ہوئی اُمنگوں کو نہ اُکسائے۔ کوئل پھُریری لیکر کوک نہ اُٹھے اور پپیہا بے آپ ہو ہو کر پی کہاں پی کہاں کی رٹ نہ لگائے۔ یہ تو دبی ہوئی آگ کے سلگنے کی کہانی تھی۔ اب سلگتی ہوئی آگ کے بھڑک اُٹھنے کو اُس دُکھیاری کنواری لاجونتی سے پوچھیئے جسے میکے سے سُسرال آئے ہوئے اتنے دن ہو چکے کہ وہ مُنہ بند کلی سے کھلتا ہوا پھول بن گئی اور اب تک اُس کا کورا پنڈا جیسے کا تیسا اچھوتے کا اچھوتا ہی ہے اور آگے چل کے بھی مرجھائے ہوئے کنول کے کھلنے کی کوئی آس نہیں وہ ہری بھری کیاریوں میں پھپکتے ہوئے پودوں کی جھومتی ہوئی ڈالیوں کو دیکھ کر انگڑائیاں لینا بھول چکی ہے۔ کبھی ایسے بھی دن تھے کہ وہ اسی پھلواری کو دیکھ کر پھولے نہ سماتی تھی اور اب وہ کبھی چلی جاتی ہے اُسکے جلتے ہوئے کلیجے سے رہ رہ کر ایسے ہُوکے اُٹھتے ہیں جو سانس کے ساتھ باہر نکلکر اُس کے پھول سے گالوں کو جھُلسائے دیتے ہیں۔ وہ آرسی میں اپنے مٹے ہوئے روپ کو دیکھ کر مُنہ سے ٹھنڈی سانس بھرتی ہے اور آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ گھٹائیں آتی ہیں برس برس کے نکل جاتی ہیں۔ اُسکی آنکھوں سے آنسوؤں کی ایسی جھڑی لگی ہے جو آٹھ پہر میں ایک پل کو نہیں تھمتی۔ بادل گرجتے گرجتے تھک کے چپ ہو جاتے ہیں۔ اُسکی دھڑکتی ہوئی چھاتی اپنے ساتھ دوسروں کا کلیجا بھی برابر ہلائے جاتی ہے۔ کوندا لپک لپک کے رُک جاتا ہے۔ اُسکے کلیجے کی ہوکیں اُٹھ اُٹھ کر ٹھوکوں پر ٹھوکے دیے چلی جاتی ہیں۔ اُسکے دن بھیانک ہیں راتیں ڈراؤنی۔ جن کا اکا ایک پل پہاڑ ہو رہا ہے۔ چار چار پہر اکیلے ہی گزار کر

دن کو رات اور رات کو دن کرنا۔ اُس کی سیج ایسی سونی ہے جسکے سہانے ہونے کی کوئی آس نہیں۔ یہ کس لئے۔ کیا اُس کا میاں پردیس میں ہے۔ نہیں نہیں۔ وہ تو اسی گھر میں ہر گھڑی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور یوں کہ کوئی آن اوجھل نہیں ہوتا۔ پھر کیا وہ اسے چاہتا نہیں۔ نہیں یہ بھی نہیں۔ یہ تو پہلے دن سے آج تک اسکی آنکھوں کی پتلی بنی ہوئی ہے جدھر یہ جاتی ہے اُدھر اسکی آنکھ بھی مُڑ جاتی ہے۔ تو پھر کیا ہے۔ ہائے اسے اک نو ہی کنیا کیا بتائے۔ آنسو بھری آنکھوں سے ٹکر ٹکر دیکھ رہی ہے کہ اُسکا آسرا ٹوٹ رہا ہے۔ چاند ڈوبنے کو ہے تارا جھلملا رہا ہے۔ اُسکے روگی میاں کی اُکھڑی اُکھڑی سانسیں رہے سہے چھوٹے سہارے کو بھی ملیامیٹ کر رہی ہیں۔ اس بیاہ کا پھل آنکھوں کے سامنے ہے دوسرے بیاہ کو دیس کی ریت ہندو دھرم کی لاج پہلے سے روک رہی ہے۔ اُس پر اُٹھتے ہوئے جوبن کی اُمنگیں چڑھتی ندی بن کر دھرم اور لاج دونوں کو ڈبونے کے لئے بڑھتی ہی چلی آتی ہیں۔ وہ کہاں جائے کیا کرے۔ اسکے لئے جینا ہے تو بے دھرم ہو کے اور مرنا ہے تو بے آس ہو کے۔ پھر دونوں میں اچھا کسے سمجھے۔ اسی کو جو اس نے کر دکھایا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور اپنے اکیلے گھر میں گئی۔ سولہ سنگار کئے، ریت کا جوڑا پہنا اور آرسی میں مُنہ دیکھ کر ٹھنڈی سانس بھری، پھر اک کونے میں گئی مٹی کے تیل میں شرابور ہو کے نکلی، مرتے اور سسکتے ہوئے میاں سے آنکھ ملا کر مسکرائی اور دیا سلائی کھینچ کر دکھا دیا کہ میں ستی بھی ہوں اور سہاگن بھی !!

رباعیات

(غیر مطبوعہ)

جناب شیخ مہدی حسین صاحب ناصری اعلی اللہ مقامہ

دنیا میں رہے تو بس یہ توقیر ملی
پیری آئی لحد کی جاگیر ملی
وہ زورِ شباب اور یہ ضعفِ پیری
اللہ! وہ خواب اور یہ تعبیر ملی

رشتے جو شباب سے ہمارے ٹوٹے
ٹانکے دلِ مجروح کے سارے ٹوٹے
گرنے لگے دانت تو قیامت آئی
ہاں صبح قریب ہے کہ تارے ٹوٹے

تھی ہوش ربا مئے جوانی کیسی
اور وقتِ خمار ہے گرانی کیسی
کیا ذکر شباب کا کروں پیری میں
جب رات نہیں تو پھر کہانی کیسی

دُنیا طلبی کیوں سحر و شام کرو
اے ناصری اب دین کا کچھ کام کرو
دیکھو کتنا شباب برباد کیا
رات آگئی ہے بہت بس آرام کرو

شاعری کیا ہے؟

(جناب نواب جعفر علی خاں صاحب آثر بی اے ۔ ڈپٹی کلکٹر)

شاعری جذبات راستی و حسن اقتدار کی انفعالی کیفیت کا اظہار ہے۔ پیکر جذبات کی روح رواں تخیل و تمثیل ہیں۔ الفاظ میں توازن و تناسب اُس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب خیال میں یکرنگی کے ساتھ تنوع بھی ہو۔ تخیل کی جولانگاہ کل کائنات اور شاعری کا مقصود روح میں انبساط کی لہر دوڑانا اور اُس کا ارتفاع ہے۔ شاعری فطرت اور رسم و رواج کے درمیان رشتۂ اتحاد قائم کرتی ہے۔ یہ بھی شاعری کا فیض ہے کہ مادی و روحانی عالم کے مشاہدات سے ہم یکساں لذت اندوز ہوتے ہیں۔

شاعری ایک انفعالی کیفیت ہے۔ کیونکہ جب تک ہم کسی جذبہ کو شدت کے ساتھ محسوس نہ کرینگے دوسروں کو متاثر نہیں کر سکتے۔

شاعری جذبۂ راستی ہے کیونکہ جب تک ہمارے محسوسات حقیقت سے ہمکنار نہ ہونگے ان میں نقص و تصنع پایا جائیگا۔

شاعری احساس حُسن ہے کیونکہ اس کا مقصد انسان کے جذبات کو بلندی کی طرف لیجانا اور ان میں انبساط کے ذریعہ سے تہذیب پیدا کرنا ہے۔ اور حسن کچھ نہیں اگر انبساط کا مجموعہ بن مجسمہ نہیں۔

شاعری ملکۂ اقتدار ہے کیونکہ اقتدار میں خیال غلبہ مضمر ہے خواہ شاعر اپنے جذبات سے آپ مغلوب ہو خواہ سامعین کو حسب منشا مغلوب کرے۔

تخئیل محسوسات شاعری کا تمثیل ہونا ہے تاکہ راستی کے نقوش دل پر مرتسم ہو کر

موجبِ انبساط[1] ہوں۔

تشبیہ و استعارہ شاعری کے خال و خط و زیب و زینت ہیں۔

شاعری کے ارشادات میں ترتیب یعنی وزن ہوتا ہے کیونکہ دنیائے حسن میں حسنِ صوت بھی شامل ہے۔ مانا کہ وزن ایک قید ہے مگر انبساط کی تکمیل اسی وقت ہوتی ہے جب دشواریوں کو شکست دی جائے بلکہ خود اُن دشواریوں کو کسبِ کمال کا وسیلہ بنایا جائے۔

ترتیب و توازن سے یکرنگی میں تنوع پیدا ہوتا ہے کیونکہ خود انسان میں اضداد مجتمع ہو گئے ہیں۔

جذبۂ شاعری کا جزوِ اعظم تخلیق ہے جو تخئیل کا عمل ہے۔ وہی سب سے بڑا شاعر ہے جسکے کلام میں خیال، جذبہ، قدرتِ اظہار، تخئیل، عمل، کردار، اور تسلسل اعلیٰ درجہ کے ہوں۔

جہاں واقعات اور سائنس کی تحقیق ختم ہوتی ہے شاعری کا دور شروع ہوتا ہے جو ان سے بالاتر حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے یعنی وہ ربط نمایاں ہوتا ہے جو دنیائے ظاہری اور دنیائے جذبات میں ہے۔ اسی انکشاف میں حقیقی مسرت کا راز نہاں ہے۔

اگر کسی باغبان سے پوچھیے وہ کون سا پھول ہے؟ وہ کہیگا گلاب، کسی ماہرِ نباتات سے پوچھیے۔ وہ پھول کا شجرہ بیان کریگا۔ مگر ایک شاعر کی نظر میں گل ایک عاشق مزاج دیوانہ ہے۔ میر

مگر دیوانہ تھا گل بھی کسو کا ۔۔۔ کہ پیراہن میں سو جاگہ رفو تھا

کبھی اس سست پیمان میں معشوق کی خو بو پائی جاتی ہے۔ میر

سحر پائے گل بیخودی ہم کو آئی ۔۔۔ کہ اس سست پیماں میں بُو تھی کسو کی

کبھی گل کی حقیقت یوں بیان کی جاتی ہے۔ میر

کہا میں نے کتنا ہو گل کا ثبات ۔۔۔ کلی نے یہ سُن کر تبسم کیا

یہیں سے یکرنگی میں تنوع کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ ایک خاص حالت میں گل دیوانہ ہے۔ کہیں معشوق سے مشابہ ہے اور کہیں ایک فانی و بے ثبات مخلوق ہے۔ اگر صرف میر کے وہ شعر جمع کئے جائیں جن میں تخئیل نے گل پر عمل کیا ہے تو انکی معقول تعداد ہو گی۔

---

[1] لفظ انبساط ہر جگہ اپنے لغوی معنی میں یا بسط یعنی پھیلنے کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ خوشی و غم سے براہ راست ربط نہیں۔

[illegible]

مضمون اختصار طلب ہے لہٰذا تخئیل کی بحث ختم کی جاتی ہے۔ تشبیہ و استعارہ سے بھی قطع نظر کرتا ہوں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاعری کے لئے بحور و اوزان کی قید ضروری نہیں اور شاعرانہ خیالات نثر میں بھی ادا ہو سکتے ہیں۔ اُن کا قول ہے کہ ایسے قیود عائد کرنے سے شاعری کا دائرہ محدود اور اصل منشا فوت ہو جاتا ہے لیکن اُن کا خیال درست نہیں معلوم ہوتا۔ شاعری میں موسیقیت پیدا ہو ہی نہیں سکتی جب تک وزن قائم نہ کیا جائے۔ اور حسن و عظمت کی تکمیل بغیر وزن محال ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ شاعر اپنے خیالات نثر میں ادا نہیں کر سکتا بلکہ حقیقی شاعر ہمیشہ نظم کو اظہار خیال کا وسیلہ قرار دیگا۔ اگر نظم میں اپنے خیالات ظاہر نہیں کر سکتا تو شاعر کے خطاب کا مستحق نہیں۔ وزن سچے شاعر کی راہ میں کاوٹ نہیں پیدا کرتا کیونکہ وزن کا محرک بھی وہی جوش و ولولہ ہے جو شاعری کے جذبات کو اُبھارتا ہے۔ درحقیقت وزن ان جذبات کی تکمیل اور اثر گیری میں معین ہوتا ہے۔ سچا شاعر وزن کی قید سے مرعوب نہیں ہوتا بلکہ خود اُس پر حکومت کرتا یا اپنا دست راست بناتا ہے۔ کون شاعر ایسا گزرا ہے جس نے اپنے خیالات نثر میں ظاہر کئے ہوں۔ یا نثر میں کون ایسی تصنیف ہے جس پر نظم کا اطلاق ہو یا نظم کی ہم پلہ ہو۔ شاذ کتابیں نثر کی ایسی ہیں جن کے متعلق لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ ان میں شاعری ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ اگر اُن میں حسن خوبی کی تکمیل کا امکان ہوتا تو نثر پر کیوں قناعت کی جاتی۔ ان لوگوں میں تلاش حسن کا جذبہ نامکمل تھا ورنہ نغمہ موزوں بنکر اُبل پڑتا۔

ماننا پڑیگا کہ ہر شاعر کے لئے ناظم ہونا ضروری ہے۔ گو ہر ناظم شاعر نہیں کہلا سکتا ہر عمدہ شاعر عمدہ ناظم ہوتا ہے۔ مگر بہترین شاعر وہ ہے جسکی نظم میں زور، شیرینی اور سچائی ہے، کلام حشو و زوائد سے پاک اور تنوع میں یک رنگی ہے۔ یک رنگی سے یہ مراد ہے کہ تخئیل میں یکساں علو ہو اور تنوع سے یہ مطلب ہے کہ اثرات میں بوقلمونی ہو۔ زور کا مدار ترتیب و نشست الفاظ اور اُنکی ہم آہنگی و تناسب پر ہے۔ لفظوں میں گھلاوٹ ہو اور اُسی حصہ پر قدرتی طور سے آواز کا اُتار چڑھاؤ پیدا ہو جو مفہوم کے اعتبار سے شاعر کا منشا ہے۔ سلاست و روانی ہو، نہ کہ ثقل و کرختگی۔

میرؔ کے یہاں ان خوبیوں کے حیرت انگیز نمونے ملتے ہیں۔ ؎

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی ؛ اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

لفظ سنگ ایسی جگہ واقع ہوا ہے کہ پتھر سے سر پھوڑ لینے کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ ایضاً ؎

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا　　دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

شعر میں خاص الفاظ اُلٹی، سب، کچھ اور دیکھا ہیں۔ پڑھنے میں انسان قدرتی طور سے انہیں پر زور دیتا ہے۔ دوسرے مصرع میں لفظ دیکھا کے بعد باقی الفاظ ہموار پڑھے جاتے ہیں جس سے شفا سے مایوسی کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی قبیل کا یہ شعر ہے۔ ؎

آنکھوں میں ہی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں　　مرتا ہوں میں تو۔ ہائے رے صرفہ نگاہ کا

لفظ تو کے بعد توقف لازمی ہے۔ اُس کے بعد کا پورا جملہ معترضہ اور بظاہر پہلے ٹکڑوں سے الگ ہے۔ اس نے شعر میں کس قدر لطائف پیدا کئے۔ گویا قائل شکوہ کرنے والا تھا۔ مگر پاس محبت نے زبان پکڑ لی۔ ہائے کے بعد کسی لفظ پر زور نہیں پڑتا جس سے مترشح ہوتا ہے کہ اس مرنے والے کے دل میں معشوق کی طرف سے کوئی تلخی باقی نہیں رہی بلکہ محبت اپنے حال پر قائم ہے۔

ایضاً ؎ کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی　　دھوم ہے پھر بہار آنے کی

پہلے مصرع میں عجب گھبراہٹ اور وحشت ہے جس سے اختلال حواس کے شروع ہونے کا اظہار ہے۔ دوسرے مصرع میں لفظ دھوم ایسی جگہ واقع ہوا ہے کہ اس نے تہلکہ برپا کر دیا۔ گویا اس دیوانے کی رگوں میں خون جوش کھا رہا ہے اور کان بج رہے ہیں۔ اور آخرکار بے قابو ہو کر انتہائے انتشار میں چیخ اُٹھتا ہے۔ ع کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی۔

ضعف نظم کی دلیل یہ ہے کہ شعر سپاٹ ہو اور کسی قسم کا جوش نہ پایا جائے۔ یہ کیفیت عموماً کمزور تخئیل اور نمائشی یا مصنوعی سرگرمی کی غماز ہوتی ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ دل سے نکلی ہوئی بات نہیں ہے اور نظم کرتے وقت شاعر پر جذبۂ انفعال طاری نہیں ہوا۔ بعض لوگ محض پر شکوہ الفاظ کے مجموعہ کو شاعری سمجھتے ہیں چاہے شعر شرمندۂ معنی نہ ہو یا اُس میں پست و ناقابل توجہ خیال نظم ہو۔ بعض ایسے ہیں جو درد و سوز و گداز کا مفہوم صرف اس قدر سمجھتے ہیں کہ جانکنی کے آثار نظم کر دیے جائیں۔ بعض نے شاعری کو زبان و محاورہ و روزمرہ میں محدود کر دیا ہے۔ خیالات عامیانہ ہیں تو ہوں۔ یہ سب حریم شاعری سے کوسوں دور ہیں۔ شعر کی بنیاد تخئیل ہے اور تخئیل میں جب تک بلندی ندرت و تازگی نہ ہو، ظاہری خوبیاں مثلاً سلاست، روانی، شیرینی، لطف زبان و محاورہ و محاکات

سب بے سود ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اگر معنویت کے ساتھ ظاہری خوبیوں اور آرائش کا لحاظ نہ کیا گیا تو تخئیل کی لطافت کا بالکل نہیں تو بڑی حد تک خون ہو جائیگا۔

بعض حضرات ایسے ہیں جو شاعری کے لئے نظم کی شرط گوارا کرتے ہیں مگر قافیہ کی قید سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ حالانکہ قافیہ سے شعر کی دوسری لطافتوں کو چار چاند لگ جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کم سے کم انگریزی شاعری میں بھی باستثنائے رزمیہ و تمثیلی (ڈرامٹک) شاعری قافیہ رائج ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ خود تخئیل کو قافیہ اچھے راستہ پر لگاتا ہے۔ البتہ ہم نے بہت سخت قیود عائد کر دئیے ہیں جن میں سے اکثر بے معنی ہیں۔ میں اُن لوگوں کا ہم آہنگ ہوں جو قافیہ کی بنیاد آواز پر رکھنا چاہتے ہیں۔ نہ صرف عزم و رزم یا قاضی و راضی و قس علی ہذا قافیہ سمجھے جائیں بلکہ عزم کا قافیہ نظم اور معانی کا بازی بھی جائز ہو۔ غزل میں زیادہ پابندی کی ضرورت ہے کیونکہ اسکا ہر شعر بجائے خود مکمل ہے اور تحقیق زبان کے مواقع پیش کرتی ہے۔ اسمیں زیادہ آزادی برتنے کا نتیجہ زبان سے بیگانگی اور ایک طرح کا اعتراف عجز ہوگا۔ اسمیں بھی شاید ایطا کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ کتنے ہی ایسے بے تکلف مطلع ہیں جنمیں اس دشمن شعریت کی بدولت شان آورد پیدا ہو جاتی ہے۔

آخر میں ملٹن کا قول جو بہت مشہور ہے نقل کیا جاتا ہے:۔

"شاعری میں سادگی، اصلیت یا فطرت کی مطابقت اور جوش ہونا چاہیئے"

ان الفاظ کے معانی میں نقادوں نے اختلاف کیا ہے۔ لی ہنٹ کے نزدیک "سادگی" سے یہ مراد ہے کہ مطلب آسانی سے ذہن نشین ہو جائے اور تاویل و توجیہ کی ضرورت نہ ہو۔

اصلیت یا فطرت کی مطابقت کا یہ منشا ہے کہ بعید از قیاس نہو تاہم متنوع ہو۔

جوش سے یہ مطلب ہے کہ شاعر جو کچھ کہے اُس سے نہ صرف اُسکی اثر پذیری کا اندازہ ہو بلکہ دوسرے بھی سُن کر متاثر ہوں۔

لی ہنٹ نے اپنے قول کی تائید میں رچرڈسن کو پیش کیا ہے جسکا مقولہ ہے کہ "شاعر کو سب سے زیادہ محبت اور سچائی کے اکتساب کی ضرورت ہے۔ اور جس سے زہر کی طرح پرہیز کرنا چاہیے۔ عارضی نمود کی ہوس اور کذب ہیں۔ شاعر کے لئے صرف اتنا کافی نہیں ہے کہ جو کچھ کہے اُس پر کتنے وقت یقین رکھتا ہو بلکہ یہ یقین عادت سرشت کی حد تک پہنچ جائے گویا ساتھ لیکر پیدا ہوا ہو اور سب سے زیادہ قابل قدر بیرات جانتا ہو۔

کولرج کا قول ہے کہ "میں اپنی تصنیفات سے نفع یا شہرت کا متمنی نہیں ہوں بلکہ خود میری

شاعری عظیم ترین صلہ ہے۔ اس سے میرے آلام میں کمی ہوئی۔ خوشیوں میں اضافہ ہوا تنہائی سے اُنس پیدا ہوا اور اس بات کی عادت ہو گئی کہ جو کچھ دیکھتا ہوں اور جو کچھ میرے گرد و پیش ہے اُس میں نیکی و راستی دریافت کروں"۔

بعض لوگ شعر میں خیال کی اصلیت یا مطابق فطرت ہونے کا یہ مفہوم لیتے ہیں کہ جس چیز سے وہ خیال وابستہ ہے اسکا وجود حقیقت میں ہو یا عقل یا اعتقاد کی رو سے ممکن ہو یا مان لیا گیا ہو میرے نزدیک یہ درست نہیں۔ اصلیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ شاعر جو ماحول قائم کرے انہیں واقعات کے رونما ہونے کا امکان اُسی کے بیان کے موافق ہو ورنہ ملٹن کی تصنیف "پیرا ڈائز لاسٹ"، ہومر کی "ایلیڈ"، ڈینٹی کی "ڈوائن کامڈی" (خصوصاً وہ حصہ جسکو انفرنو کہتے ہیں) اور اسی قسم کی دیگر تصانیف جن میں مافوق الفطرت واقعات کی تخلیق اور جادوگری ہے دائرۂ شاعری سے خارج ہو جائینگی۔ حالانکہ انکی خوبی و عظمت ناقابل تردید ہے۔ گو اُن میں سے بیشتر امور کا جو ان شاعروں نے بیان کئے، حقیقت میں وجود نہ تھا۔ نہ عقل انکی رہبری کرتی ہے، نہ اعتقاد کی رو سے ممکن یا مسلم تھے۔ البتہ جن اشخاص یا واقعات کی موجد انکی تخئیل ہوئی اور جو کردار اُن سے منسوب کیا گیا اُس کی روشنی میں اُن کا وہی عمل ہونا چاہئیے تھا، اور وہی نتائج مترتب ہونا ضروری تھے جو مذکور ہوے۔

چاسر نے پیتل کا اُڑنے والا خیالی گھوڑا بنایا، ہابس نے کہدیا کہ ناممکن ہے۔ شاعر کی تخئیل کے آگے سب کچھ ممکن ہے۔ سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جب ایسے گھوڑے کا وجود فرض کر لیا گیا، تو اُسکی فطرت کا لحاظ کرتے ہوے اُس سے کیسے حرکات و سکنات سرزد ہونگے۔ اسی کے فیصلے میں شاعر و غیر شاعر کے جوہر کھلتے ہیں۔ شاعر اس مفروضہ مخلوق کو فطرت کا تابع ثابت کر دکھائیگا، غیر شاعر مضحک بنا دیگا۔

ڈینٹی نے جہنم میں نمرود کی جو تصویر پیش کی کس قدر مہیب و پر دل کو شکنجہ میں جکڑنے والی ہے اس میں عقیدہ یا طلسم یا جادو کو مطلق دخل نہیں بلکہ محض تخئیل ہے مگر کس قدر موثر۔

شاعری کی عظمت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ موجودات ذہنی کو جن کا خارجی وجود نہیں ہے اس طرح پیش کرے کہ اُن میں بھی وہی اصول راستی و حقیقت برسرکار نظر آئیں جو ان اشیاء میں عمل پیرا ہیں جن کا ہم کو علم و یقین ہے تاکہ ان اصول کی مطابقت سے ان پر حقیقت کا گمان ہو جائے۔

نقش بر آب

جناب حنیف ہاشمی صاحب (دہلی)

بادل گرجا، بجلی کڑک کڑک کر چمک رہی تھی۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ گویا اس نے درختوں کو اُکھاڑ دینے کا عزم کر لیا تھا اور اُکھاڑ دینا ہی چاہتا تھا۔ ایک موٹی سی بوند بادلوں سے قرطاس پر پڑی۔ بوڑھے پروفیسر نے سر اُٹھایا۔ اس نے بادلوں کو دیکھا۔ بارِ ایک بادلوں کو جو مختصر سے عرصے میں آسمان کی وسعتوں پر چھا گئے تھے۔ اس نے ان پر تھکی ہوئی نگاہ ڈالی جو بہت دُور سے اور بہت گہرائیوں سے آتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سر کی ایک خفیف سی حرکت کے ساتھ اس نے درختوں کو دیکھا۔ ہوٹل کے باغیچہ کی روش کے کنارے کے درخت جھوم رہے تھے ہوا سے دست و گریبان تھے۔ ان کی شاخیں سناٹے سے لہلہاتی تھیں بدست میخواروں کی طرح مخمور اور نشہ میں چور اور اُنکے زرد اور پژمردہ پتے بلندی سے فضا میں ایک آہوانہ رقص کرتے آتے اور سبزہ اور سرخ بجری کی روش پر گرتے۔

ہوا کا ایک اور جھونکا آیا اور اسکے ساتھ بارش کا ایک چھینٹا۔ پروفیسر نے حسرت آمیز نگاہوں سے قرطاس تصویر کو دیکھا۔ بوندوں نے گر کر مختلف رنگوں کو مخلوط کر دیا تھا اور وہ تصویر ایک نوخیز لڑکی کا بڑی بڑی آنکھوں والا حسرتناک چہرہ خراب ہو گیا۔ پروفیسر نے تصویر پر نگاہ جمائی سیاہی اُسکے اوپر برس رہا تھا۔ وہ بھیگ رہا تھا۔ وہ بھیگ چکا تھا۔ اس نے ایک آرزو اور خاک شدہ تمنائے ہوئے تصویر کو دیکھا اور ایک سرد اور حرماں انگیز آہ کے ساتھ قلم ہاتھ سے روک دیا۔ وہ اپنے سفید سر کو اپنے چوڑے چوڑے ہاتھوں میں لئے کہنیاں گھٹنوں پر رکھے بیٹھا رہا۔ وہ دیر تک بیٹھا رہا۔ اسے معلوم نہ تھا وہ کب تک بیٹھا رہیگا۔ اور حسرت

اندوہ کے ساتھ اس پیکر حسرت اور اس راز سربستہ کے موہوم خط و خال کو دیکھتا رہیگا جو اس کی تخیلہ کی تخلیق تھا۔

ہمیشہ یہی ہوا تھا۔ وہ تصویر بنانا چاہتا تھا، حسین چہرے کی ایک نوخیز لڑکی کی تصویر جسکے سر کے بال پریشاں تھے جسکی آنکھوں میں غیر ارضی سوز و گداز تھا۔ وہ رحم انگیز المناکیاں اُسکی نگاہیں، بُوڑھا پروفیسر فراموش نہ کرسکتا تھا، اُن میں اُسے حرماں نصیبی کی اذیتیں نظر آتی تھیں۔ اسکی نگاہیں حزن مجسم تھیں اسکے آرزو انگیز ہونٹ لب خشک تھے، خشک اور زرد۔ اسکا چہرہ حسین تو تھا لاثانی طور پر حسین لیکن اس پر حسرت و یاس کی ملمع تھی۔ اسکی نگاہوں میں جوانی کی اُمنگیں تھیں، لیکن درماندہ۔ وہ ایک شگفتہ پھول تھی لیکن گرم ہوا نے اسے کمہلا دیا تھا۔ یہ چہرہ تھا جسکی تصویر پروفیسر بنانا چاہتا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا اسے یاد نہ تھا اس نے یہ المناک چہرہ کہاں دیکھا ہے۔ یہ نشتر شکستہ اسکے دل میں کہاں سے پیوست ہوا ہے لیکن یہ اسکے خوابوں کی مملکت میں آباد رہا تھا اور پروفیسر اپنی خیال کی دنیا نذر قرطاس کرنا چاہتا تھا کتنی بار۔ اس نے اس امر کی کوشش کی تھی کتنی بار۔ اس نے چاہا تھا کہ اس حسرت نصیب حسینہ کی پریشانی کو خطوط رنگیں کا جامہ پہنا دے لیکن وہ ناکام رہا تھا تصویر مکمل نہ ہوئی۔ وہ کہتا "بس اب چند خطوط باقی ہیں اور میرا خیال مجسّم ہوجائیگا"

لیکن اس وقت کوئی اتفاقی واقعہ ہوتا۔ اور تصویر پھر محو ہوجاتی۔ آرٹسٹ کا کام تخلیق ہے وہ خالق ہوتا ہے ان جذبات کا جو اسکے دل کی گہرائیوں میں پیدا ہوتے ہیں اور اُسکے لئے عظیم نعمت سماوی یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرسکے پتھر کے کسی تراشیدہ ٹکڑے میں، بُرش کے ایک حیات آفریں لمس اور الفاظ کی سحرکار ترکیب سے۔

اور پروفیسر کی روح بھی ایک آرٹسٹ کی روح تھی، وہ بھی اس اظہار کے لئے بیتاب تھی۔ وہ اس تابناک خیال کو نذر قرطاس کرنا چاہتی تھی غم و الم کی اس اذیت اور اس لامحدود حسرت کو جو اسکے دل میں جاگزیں تھی جو اب اسکے دل میں بسی تھی ——— لیکن وہ ناکام رہتا تھا۔ وہ ایک حسرت ناک چہرہ، سراپا درماندگی اور حزن مجسم دیکھتا تھا، ہر جگہ دیکھتا تھا، ہوٹل کے بڑے کمرہ میں جہاں ہر قومیت کے مہمان شرکت طعام کے لئے جمع ہوتے وہ اس چہرہ کو دیکھتا۔ یہ سراپا الم چہرہ۔ آہ۔ پژمردہ جوان چہرہ! حسرت نصیبوں کا پیکر اسے حسین و جمیل عورتوں کے درمیان نظر آتا۔ وہ اسے

ٹکٹکی باندھ کر رحم انگیز نگاہوں کے ساتھ دیکھتا۔ یہ چہرہ اسے ہوٹل کے باغیچہ کی روش پر ٹہلتا نظر آتا تھا۔ شام کے جھٹپٹے میں حنائی روش کے کنارے خراماں ہوتا۔ یوکلپٹس کے کسی بلند قامت درخت کے سایہ میں شام کی گہری میں غائب ہو جاتا تاریکی میں اسکے پریشان بال فضائے بعید میں لہراتے اور وہ آہستہ آہستہ تحلیل ہو جاتا۔

پروفیسر نہ جانتا تھا وہ کب سے وہاں بیٹھا ہے۔ وہ بھیگ چکا تھا۔ اسکے سر کے سفید بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ اسکے روبرو حسرت ناک آنکھیں تھیں اور گہری دھند، بارش رک گئی ہو رہی تھی۔ درخت سائیں سائیں کرتے تھے، اور حنائی روش کی سرخ بجری بہتی جا رہی تھی۔ درخت دھندلے نظر آتے تھے۔ اور سڑک کا راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہر چار طرف ایک دھواں چھا رہا تھا۔

پروفیسر قرطاس بارش میں چھوڑ کر آہستہ سے اٹھا اور تھکے ہوئے قدموں کے ساتھ، سر جھکائے ہوئے ہوٹل کے بلاک کی طرف چلا۔ وہ جا رہا تھا سرنگوں اور حسرت و یاس کا پیکر بنا۔ بیچارگی اور ناکامی کا مجسمہ۔ ہر ایک قدم ایک خاص وقفہ کے بعد اٹھتا۔ نہایت مشکل کے ساتھ بہ ہزار دشواری اور پھر بجری کی سرخ سڑک پر پڑتا۔ گراں باری کے ساتھ اور اس مختصر وقفہ میں اس پر المناکیوں کی بیشمار ابدیتیں بیت جاتیں۔ جن کو وہ صرف جانتا تھا لیکن وہ اس غم ــــــ اس عظیم الشان غم کے اظہار سے قاصر تھا جو خدا جانے کہاں سے اسکے دل میں اٹھا تھا اور کیوں اس نے ایک حزین و مایوس نوخیز لڑکی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ ایک نوخیز لڑکی کے سراپا کو غم سے کیا مناسبت ہو سکتی۔ سنگ تراشوں نے بھی غم کے مجسمے بنائے تھے پیکر نگاروں نے غم کا تصور زندہ قرطاس کیا تھا لیکن وہ ایک نوخیز اور حسین کا سنگین مجسمہ یا پیکر لطافت نہیں تھا۔ وہ شباب کا حامل نہیں تھا۔ اسکا چہرہ حسین نہیں تھا حسین ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ غم کا چہرہ بھیانک ہے۔ دہشت ناک طور پر بھیانک اور کریہہ۔ پروفیسر حیران تھا کہ اس غم کا تصور اس قدر حسین کیوں ہے اور کیا یہی حسن اسکے اظہار میں مانع نہیں لیکن اگر اسکی روح میں حسن ہے، اگر اس کی زندگی کے رباب کے تاروں میں غم کا ارتعاش ہے تو وہ ایک ترانۂ مسرت نہ سہی، درد و کرب کی ایک چیخ تو پیدا کر سکتا ہے۔

وہ حنائی روش پر سے ہوتا ہوا پھولوں کی کیاریوں کو روندتا ہوا چلا گیا۔ نرگس اور ولایتی بنفشہ کے پھولوں کو، کئی پھول پامال ہو گئے اور اسے احساس بھی نہ ہوا۔ وہ انھیں پامال کرتا ہوا جا رہا تھا۔ وہ بلاک کی سنگین زمینوں سے غلام گردش میں اور پیچدار آہنی سیڑھیوں سے دوسری منزل پر گیا۔ اسکے کپڑوں سے

پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں اور ہوٹل کے رنگین فرش پر ان کا نشان پڑ رہا تھا۔ وہ آہنی زینوں سے چڑھ کر دروازے کے سامنے گزرتا ہوا چلا جا رہا تھا، خاموش اور سرنگوں اور اسی طرح پیکر یاس بنا ہوا۔ خیالات میں مستغرق چلا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ گویا وہ موت کی منزل کے لئے جا رہا ہے اور سرعت قدم سکون قلب کو برباد کرنا نہیں چاہتا۔ آخر کار وہ ایک دروازے کے سامنے ٹھہر گیا۔ اس نے مڑ کر باہر کی جانب دیکھا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی اور ہوا کا سناٹا۔ خدا کی پناہ، وہ درختوں میں سائیں سائیں کر رہی تھی۔ بجلی کڑکتی تھی۔ ایسی تیزی اور ایسی تندی اور خیرہ کن چمک کے ساتھ۔ اور ہوٹل کے باغیچے کے درخت بیچارگی سے جھوم رہے تھے۔ ہری ہری گھاس پانی میں چھپ گئی تھی اور سڑک کی بجری بہی جا رہی تھی۔

پروفیسر نے غیر شعوری طور پر دروازہ پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور ایک حسین لڑکی کا شاداب چہرہ دکھائی دیا۔ اس نے پروفیسر کو رحم آمیز متبسم نگاہوں سے دیکھا اور اندر آنے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ پروفیسر نے کہا۔

"میری بچی ——— ناہنجار بارش نے تصویر خراب کر دی !"

(وہ خواب میں گفتگو کرتا معلوم ہوتا تھا۔)

"آہ ! ——— صرف خطوط باقی ہو نگے !"

ہاں ——— میری بچی، ورنہ تم دیکھتیں یہ مجھ حسرت نصیب کی شاہکار ہوتی، لاثانی اور ابدی"

پھر اس نے کہا گویا کسی غیر مرئی مخلوق سے گفتگو کر رہا ہے۔

یہ حزن مجسم نوخیز لڑکی کون ہے۔ میں نہیں جانتا، مجھے یاد نہیں، میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔ لیکن اس کی نگاہیں، وہ نگاہیں جو میں تصویر میں دیکھتا ہوں اور اس وقت بھی جب وہ قرطاس پر بٹی ہوئی ہیں مجھ سے کوئی راز بیان کرنا چاہتی ہیں۔ شاید زندگی کا راز جس میں اپنی ہمہ دانی اور تبحر علمی کے باوجود محروم رہا۔ یا کوئی داستان ہے غمی کی۔ کیونکہ وہ میرے پاس بچپن کی بھولی ہوئی پکار کی مانند آتی ہیں اور مجھے فوراً احساس ہوتا ہے میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔ صرف دیکھا ہی نہیں اسکے خیالات کی گہرائیوں میں بھی اتر گیا اور کھویا رہا ہوں لیکن کب؟ یہ مجھے یاد نہیں"۔

یہاں لڑکی نے اس کے خیالات کے سلسلہ کو منقطع کیا۔

"ہر حسین و جمیل شے کے متعلق ہمیں گمان ہوتا ہے کہ ہم اسے پیشتر کہیں دیکھ چکے ہیں کسی گزشتہ زندگی میں"۔

وہ خاموش ہوگئی۔ اس نے پروفیسر کا گیلا کوٹ اُتارتے ہوئے کہا۔

"محسوس ہوتا ہے ہم نے اُسے کسی گزشتہ زندگی میں دیکھا ہے کیا یہ حرماں نصیب نوخیز لڑکی کسی گزشتہ زندگی کا سایہ نہیں؟"

لیکن پروفیسر اپنے خیالات میں کھویا رہا۔ اسے احساس ہی نہ تھا لڑکی نے کیا کہا ہے۔

"مجھے یاد نہیں میں نے اسے کب دیکھا ہے لیکن میں اس راز سے آشنا ہوں جو وہ مجھ سے کہنا چاہتی ہے۔ وہ راز کیا ہے۔ کیا ہے وہ حدیث الم اور روداد آرزو جو [illegible] الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا نہیں۔ میں قدرت نہیں رکھتا میں الفاظ تلاش کرتا ہوں اور ناکام رہتا ہوں لیکن وہ راز وہاں ہے۔ اسکی نگاہوں میں موجود ہے۔ وہ افسردگی و یاس کے لباس میں ملبوس ہے۔ اسکی کشادہ پیشانی کی ویرانی اور زندگی بخش ہونٹوں کی پژمردگی میں۔ لٹتے ہوئے حسین چہرہ اور پریشاں بالوں کی برہمی میں اور میں اسی پژمردگی اور ویرانی کا شاکی ہوں۔ اسی سے مجھے شکوہ ہے۔ مجھے گلہ ہے تو اسی بے سروسامانی کا کہ یہی میری قوت تخیلہ کو بے بس کردیتی ہیں۔ میری قوت تخلیق ناکارہ ہو جاتی ہے۔ مجھ پر تمام تر وہی جذبات طاری ہو جاتے ہیں اور میں اپنے گرد قوس قزح کے رنگوں کی ایک دُھند محسوس کرتا ہوں جو بیکار کردیتی ہے میرے حواس کو، میرے قلب و جگر کو، خرد و ہوش کو۔

ایک نادر کار آرٹسٹ ایک خالق نغمہ موسیقار مغنی۔ ایک سحر کار شاعر اور ایک نوآموز میں غالباً یہی امتیاز ہے۔ آرٹسٹ ایک ایسے عریاں پیکر حسن کو نذر قرطاس کرتا ہے جو دیکھنے والے کے جذبات میں ایک ہنگامہ برپا کردے، طوفان اور آندھیاں لے آئے، لیکن آرٹسٹ کا دل سکون کا گہوارہ ہی رہے۔ مغنی اپنے رقت انگیز اور جگر گداز نغموں سے، بے پناہ الہام، سے زندگی اور موت کے حدود کو ایک کردیتا ہے اور تمام کائنات اس لحہ ایک نغمہ" بن کر رہ جاتی ہے لیکن مغنی خود ——— وہ اپنے تئیں فراموش نہیں کرتا اور شاعر باد صبا کے مانند گلستاں میں پھرتا، گلوں کو رنگ و بو بخشتا ہے۔ جذبات کا طوفان اُٹھاتا ہے یاس و حرماں کی تصویر کھینچتا ہے کہ پڑھنے والا زندگی سے بیزار ہو جاتا ہے لیکن وہ زندہ رہتا ہے، دنیا کو ترک کرنے کا کبھی اسے خیال نہیں آتا لیکن میں ہوں کہ جذبات کے وفور سے مجبور ہوں تخلیق سے قاصر ہوں میں جیسے زندگی سے کوئی شے وابستہ نہیں کرسکتی۔ کوئی رشتہ نہیں کہ مجھے دنیا سے منسلک کرے۔"

نوجوان لڑکی نے گھنٹی بجائی - ایک یورپین لڑکی آئی اور چاء کا آرڈر لیکر چلی گئی - لڑکی ایک کرسی پر بیٹھ گئی اس نے ایک ضخیم کتاب اٹھائی اور اُس کے اوراق الٹنے پلٹنے لگی -

"کیا ہے میری بچی ؟"

"یہ کتاب ابا نے بھیجی ہے - پروفیسر آپ اپنی تصنیف مکمل کیوں نہیں کرتے" لڑکی نے سادگی سے کہا -

لڑکی حسین تھی - سفید ساری میں ملبوس، بوڑھیوں کا سا لباس اور بال ہندوستانی وضع پر آراستہ مشرق اور مغرب کے مخلوط تمدن کا ایک پیکر - انداز میں مغربی بے تکلفی - نگاہوں میں مشرقی حیا، الفاظ میں مغربی سادگی - انداز گفتگو میں ایشیائی متانت و تفکر، سادگی اور معصومیت -

یورپین لڑکی چاء لیکر آئی -

"حمرا ــــــ مجھے سردی محسوس ہوتی ہے میری بچی"

"غریب پروفیسر" لڑکی نے کتاب رکھدی اور ٹرے کی طرف ہاتھ بڑھایا -

پروفیسر نے چاء کی پیالی تھامتے ہوے کہا

"حمرا ــــــ تمہیں آیندہ ماہ جہاز پر سوار ہوجانا چاہیئے"

آیندہ مہینے ــــــ ہاں پاسپورٹ آچکا ہے -"

"جرمنی ؟"

"ہانڈل برگ"

"تم تنہا ہوگی حمرا ؟"

"ابا نے کہا ہے پروفیسر تمہارے ساتھ ہونگے"

"ہاں کیا رکھا ہے میرا ہندوستان میں !"

"پروفیسر تمہارا کوئی نہیں ؟"

"نہیں !"

"کوئی دوست ؟"

"نہیں"

"بیوی ؟"

"نہیں ——— میری بچی !"

"پروفیسر، تم نے کبھی محبت نہیں کی" حمرا کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

"مجھے یاد نہیں ——— میری بچی"

"تو ——— پروفیسر تم میرے پاس رہوگے ہمیشہ ؟"

"حمرا ——— میں چند روز کا مہمان ہوں"

"نہیں، تم وعدہ کرو !"

"کیا"

"تم میرے پاس رہوگے"

"تم بھول جاؤگی مجھے میری بچی !"

"غلط"

"حمرا وقت آئیگا کہ تم بے پروا ہو جاؤگی مجھ سے"

"نہیں، میں کبھی بے پروا نہیں ہونگی"

"ایک شخص آکر تمہارے خیالات کا مالک ہو جائیگا اور تم مجھے فراموش کردو گی حمرا"

حمرا شرما گئی۔

"یہ تم کس کی تصویر بنانا چاہتے ہو ؟"

"ماضی کی تصویر میری ننھی بلبل"

"ماضی کی تصویر ——— شباب رفتہ کا تصور ؟"

"نہیں۔ ویران و برباد گشتہ زندگی۔ وہ افسانہ جسکا مجھے کوئی ٹکڑا یاد نہیں"

"یہ کوئی عورت تھی ؟"

"میرا خیال ہے میں نے اسے کہیں دیکھا ہے"

"کہاں دیکھا ہے"

"یہ مجھے یاد نہیں"

"ابا کہتے ہیں تم دس سال سے یہ تصویر بنانا چاہتے ہو"

"ہاں ــــــ لیکن نہیں بنا سکا"

"کیا یہ تمہارے واہمہ کی تخلیق ہیں"

"نہیں ۔ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے ضرور"

پروفیسر چائے ختم کر چکا تھا۔ گھنٹی بجی، یوریشین لڑکی اندر داخل ہوئی، ہوا کا جھونکا اندر آیا۔ تھکا ماندہ، اور پروفیسر کو آسمان دکھائی دیا۔ بارش ختم ہو چکی تھی۔ وہ اٹھ کر برآمدہ میں آگیا اور ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ جنوب کی جانب بادل پھٹ چکے تھے اور سیاہی مائل نیلگوں آسمان کی سطح لارنس گارڈن کے گھنے اشجار پر نظر آرہی تھی۔ سورج غروب ہو گیا تھا اور درختوں پر تاریکی بڑھتی چلی آرہی تھی۔ یوکلپٹس کے درخت کے پاس جہاں پروفیسر کا قرطاس تصویر پڑا تھا کوئی کھڑا تھا۔ وہ ایک عورت کا سراپا تھا۔ ارغوانی سمور کا ایک کوٹ پہنے، سر پر نیلگوں ساری کا آنچل۔ حنا کے پودہ کا سا قد لیکن چہرہ تصویر کی جانب۔ تصویر کے موہوم خدوخال میں کھویا ہوا۔

اس نے ہوٹل کی طرف نگاہ کی، جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہے۔ اور پروفیسر نے اسکے چہرہ کو دیکھ لیا ایک موہوم سی جھلک ۔

"یہ وہی ہے!" اس کے منہ سے نکلا۔ اور وہ دیوانہ وار سبزہ زار کی جانب جھپٹا بتیابانہ پختہ سنگین زینوں کو جلدی سے عبور کرتا، پھولوں کی کیاریوں کو روندتا، بجری کی سڑک پر بے تحاشا بھاگتا سیدھا یوکلپٹس کے درخت کی طرف۔ اسکی سانس پھول گئی تھی۔

ہوا کا جھونکا آیا۔ درختوں کی شاخوں سے سائیں سائیں کی آواز پیدا ہوئی۔ عورت نے مڑ کر دیکھا۔

"ہاں، یہ وہی ہے، وہی آنکھیں، وہی حسرت و مایوسی، وہی حسن بے پناہ اور نگاہوں میں وہی حمق، یہ وہی ہے، وہی نابہنجار۔ جس نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ جس نے نذر قرطاس ہونے سے بغاوت کی مسلسل بغاوت اور میرے سکون کو تباہ کر دیا ــــــ لیکن یہ کون ہے۔ حسین جہنمی مخلوق۔ وہ مجھ سے کیا راز کہنا چاہتی ہے۔ کیا غم ہے جسکا وہ مجھے امانت دار بنانا چاہتی ہے۔ کیا وہ مجھ سے بیان کریگی۔ اب جبکہ میں نے اُسے دیکھ لیا ہے جبکہ میں جان گیا ہوں ۔ وہ ایک واہمہ یا فریب نہیں۔ ایک حقیقت ہے۔ ایک مجسم حقیقت ! ! ایک انسانی مخلوق۔ اسی یاس و حرماں کی

حامل - اسی حسرت پرستی کی پیکر -

عورت نے پروفیسر کو ڈری سہمی ہوئی نگاہوں سے دیکھا - وہ قرطاس پران آنکھوں کو دیکھ رہی تھی جو بارش سے محفوظ تھیں - اور ان میں اپنی روح کو عکس نما پاتی تھی - لیکن اب وہ حیران تھی یہ معمر شخص کون ہے - وہ اسکی طرف دانت پیستا چلا آرہا ہے - ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچے ہوئے ہے - اس کے سر کے سیاہ اور سفید بال پریشان ہیں - داڑھی کے بال بھی برہم ہیں - آنکھوں میں ایک دہشت ہے، خونخواری، شیطان کا سا ایک عزم -

پروفیسر قریب آتا جا رہا تھا اور وہ سہمی جا رہی تھی، ڈر رہی تھی، کانپ رہی تھی، وہ کسی اور جانب دیکھ سکتی تھی - وہ پروفیسر کی آتش ریز نگاہوں کو دیکھ رہی تھی اور کانپ رہی تھی اور پروفیسر اب آہستہ آہستہ بڑھا چلا آرہا تھا - وہ اس کے قریب آگیا - اس قدر قریب کہ وہ اس کے تیز تیز تنفس کی آواز سن سکتی تھی - اسے اپنے چہرہ پر محسوس کرتی تھی، وہ بے بس تھی اور پروفیسر کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں - اس نے کچھ کہنا چاہا، اسکا حلق خشک تھا، وہ کانپ رہی تھی اور پروفیسر قریب آتا رہا - اب وہ اسکے دل کی حرکات سن سکتی تھی، وہ مسحور ہوگئی تھی - پروفیسر کے چنگل، اسکی لمبی لمبی انگلیوں والے وحشیانہ ہاتھ اسکے شانوں پر تھے وہ انھیں پکڑ کر جھنجھوڑ رہے تھے، انھیں زور زور سے ہلا رہے تھے، اور وہ خاموش تھی - آواز اسکے منہ میں منجمد ہوگئی تھی اور پروفیسر بھی ایک لفظ نہ کہہ سکتا تھا - وہ تمام جذبات جو گزشتہ دس سال سے اسکے دل میں مسکن گزیں رہے تھے - وہ تمام حسیات جن کو اس نے محسوس کیا تھا - وہ تمام پریشاں خیالات جو اسکی تنہائیوں کے رفیق رہے تھے اس وقت ہجوم کر آئے تھے - وہ ان سب کو دیکھتا تھا - چاروں طرف - اور اب حسین منحوس عورت کا چہرہ ان میں چھپ گیا تھا - یہ حسرت آلود حسین چہرہ، جہنمی سایہ، نفرت انگیز پیکر -

پروفیسر نے اسے جھنجوڑا اور بہ ہزار دقت کہا " تم کون ہو! " اور اسے دھکا دیکر گرا دیا - وہ بھاگ گئی - اس نے پھر نہ دیکھا، وہ بھاگ گئی -

ہوٹل کے دروازہ میں اسے ایک نوجوان ملا جس نے اسکا بازو تھام لیا اور وہ دونوں چلے گئے پروفیسر نے انہیں مال کے طریق پر جاتے دیکھا - دور تک - وہ ہوٹل کے دروازے میں آکھڑا ہوا اور وہ دریناک کے پاس جاکر نظر سے اوجھل ہوگیا - وہ ارغوانی سوئٹر کے کوٹ والی عورت - وہ حسین اور حیرت زدہ چہرہ اور اسکا جوان رفیق ——— خدا جانے وہ کون تھا - اور وہ کہاں چلے گئے -

ہوٹل کی رقص گاہ سے مخمور سروں کی آواز آرہی تھی۔ ارغنوں کی مدہوشانہ تانوں پر رقص ہو رہا تھا۔ پروفیسر سر جھکائے، یوکلپٹس کے درخت کے نیچے کھڑا تھا، وہ سوچ رہا تھا "آخر وہ واہمہ نہیں۔ وہ میرے خیال کا فریب نہیں حقیقت ہے۔ ایک عورت جسے اگرچہ روح عظیم نے ایک پیکر الفت ایک ہیکل الوہیت تخلیق کیا تھا لیکن کسی افتاد نے الفت کے آخری قطرے تک کو خشک کر دیا۔ ہیکل ویران ہو گئی۔ اور اب وہ اس "آبادی" اور "معمورگی" کی ماتم گسار ہے۔ وہ مجھے اس ویرانی اور بربادگشتگی کی داستان سنانا چاہتی ہے۔ اِس لئے کہ وہ کسی آواز کو نہیں سنا سکتی۔ کوئی نہیں ہے کہ اسکے اشک ہائے حسرت کو پونچھے اور اسکے درد کو شرمندہ التفات کرے۔ میں اس افسانہ حسرت کو سنونگا۔ میں اس غم کو جو وہ میرے سپرد کرنا چاہتی ہے اپنے پاس امانت رکھونگا اور اسے قبر میں بھی ساتھ لے جاؤنگا۔ یہ حرماں نصیب چہرہ۔ یہ ارغوانی سمور والی حسینہ کون ہے؟ ۔ میں نے اسے دیکھا ہے؟ میں اس سے کیوں محبت کرتا ہوں؟ محبت؟ ہاں نفرت نہیں، مجھے محبت ہے۔ میں نے کبھی محبت نہیں کی۔ مجھے یاد نہیں میں نے کبھی محبت کی ہو۔ میں نے ہمیشہ حسینوں کی آہوانہ نظروں کو فریب مال بتایا ہے۔ انکا حسن سحرکار میرے لئے ہمیشہ ایک فریب اور مایا رہا ہے۔ ان کے التفات کو میں نے ہمیشہ بناوٹ اور تکلف سے تعبیر کیا ہے۔ جمال کی لطافتیں اور رعنائی کی شادابیاں ہمیشہ میرے لئے رشتہ ہائے دام رہی ہیں مجھے حسینوں سے ہرجائی ہونے کا تلخ ترین گلہ رہا ہے۔ ان کی خاموشی کو فریب متانت اور حسن التفات کو طلسم گناہ کہا ہے۔ لیکن یہ کیا؟ ایک ارغوانی سمور والی حسینہ آئی اور مجھے اپنی محبت نہیں، نہیں، پرشوق عشق اور والہانہ الفت کا پرستار کر گئی۔ آخر وہ کون ہے؟ وہ کہاں گئی؟ میں کس کے پاؤں کی آہٹ سنتا ہوں؟ درخت کیوں سائیں سائیں کرتے ہیں؟ مجھے کوئی کیوں پکارتا ہے۔ یہ کون ہے۔ یہ ارغوانی سمور والی حسینہ ہے جو اپنے پریشان بالوں کو، اپنے جذبات پرور سینہ کو دبائے آرہی ہے۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔ مجھ سے، محض مجھ سے —— نہیں۔ یہ تمرا ہے۔ تمرا غریب لڑکی۔ ابدیت کی ایک آواز ابدیت اور عالم معصومیت۔ اس کو کیا معلوم ہے وہ پیکر جسے وہ میرے واہمہ کی تخلیق خیال کرتی ہے ایک زندہ مخلوق ہے۔ ہماری طرح گوشت اور پوست کی جذبات و حسیات کی۔ خوف اور غم وہ بھی محسوس کرتی ہے اور اسکی زندگی ویران ہے۔ برباد۔ حدت و الم کا گہوارہ۔ میں معلوم کرونگا وہ کیا راز ہے جو وہ مجھے سونپنا چاہتی ہے"

پروفیسر یوکلپٹس کے بلند اور مستقیم درخت کے نیچے کھڑا بڑبڑا رہا تھا۔ وہ ایک تاریک سایہ معلوم ہوتا تھا۔ اور ہوٹل کے دریچوں سے روشنی آ رہی تھی۔ بڑے کمرے میں رقص ہو رہا تھا لیکن پروفیسر بے خبر تھا۔

ایک نرم ہاتھ نے اس کا بازو چھوا۔

"حمرا"۔ "پروفیسر یہاں کیا کر رہے ہو؟ میں اپنا دن کا کام ختم کر چکی ہوں"۔

"حمرا ـــــــــ میری تصویر مکمل ہو چکی ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ وہ مکمل ہو چکی ہے۔ میں تمہیں کل دکھاؤنگا۔ میری تصویر مکمل ہو گئی ہے۔ اور میں کہ سکونگا میں نے اس عورت کو کہیں دیکھا ہے وہ میرے خیالات کی تخلیق نہیں ہے۔ محض میرے خیالات کی تخلیق نہیں ہو حمرا۔ میری بچی"۔

ایسے مواقع پر حمرا ہمیشہ کہتی تھی۔

"ہاں۔ کل تصویر مکمل ہو جائیگی۔ اور میں اسے "اگزیبیشن" میں کھینچ دونگی"۔

پروفیسر گوشہ ہائے چشم سے اسے پیار کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ اس کے لئے یہ چند الفاظ عنایات فراواں اور پرسش و التفات کی ایک دنیا لئے ہوئے تھے لیکن اس نے آج ان الفاظ کا جواب نہیں دیا۔ اس کے دل میں ایسا ہی خیال پیدا ہوا۔ اس نے سہمی ہوئی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھا کانپتے اور لرزتے ہوئے۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ اس نے حمرا کا بازو تھام لیا۔ اور اسے کھینچتا ہوا لے چلا۔

"آ! ۔ میری بچی ۔ میری معصوم حمرا! چلی آ! آسیب زدہ ہے یہ درخت، یہ خواب آسیب زدہ ہے۔ دنیا تمام آسیب ہے۔ آ جا میری بچی ۔ آ جا ۔ باغیچہ کے اس ویران گوشہ سے آ جا۔ میں دور سے آسیبی آوازیں سنتا ہوں ۔ بھیانک اور ہولناک ۔ یہ آوازیں دنیا کے اس پار سے مجھے آ رہی ہیں میری بچی ۔ آ جا ۔ بھاگ نہ ٹھہر"۔

حمرا اسے رقص گاہ کی گیلری میں لے آئی ۔ ارغنوں کی تانوں پر ایک تیز اندلسی رقص ہو رہا تھا۔ حسین و جذبات انگیز مجسمے سینہ سے سینہ پیوست کئے گوری گوری باہیں مردانہ گردنوں میں حائل، اور مردانہ بازو آغوش میں شباب ملتہب لئے تیزی سے گھوم رہے تھے حسین چہرے روبرو آتے تھے اور پھر گزر جاتے تھے۔ حمرا ان میں کوئی دلچسپی نہ لیتی تھی۔ وہ ایک مشرقی زادی تھی،

ہیروئین کی طرح ہر وقت خیالات میں مستغرق رہتی تھی۔ اور کثرت مطالعہ اور فلسفہ میں استغراق نے اسے ضرورت سے زیادہ متفکر بنا دیا تھا۔ لیکن پروفیسر آج خلاف معمول ان چیزوں کو غور سے دیکھتا تھا اور محسوس کرتا تھا وہ بھی سر پر فرش پر ایک بدمست میخوار کی مانند جھوم رہا ہے۔ رقص کر رہا ہے اور گائے جاتا ہے۔

آخرکار جب رقص کا ایک دور ختم ہوا۔ تمرا اسے اس کی خوابگاہ میں چھوڑ آئی۔ تمرا کو اسکی یہ کیفیت دیکھ کر ایک تشویش تھی۔ وہ طبی امداد طلب کرنا چاہتی تھی۔ لیکن پروفیسر مصر تھا کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ اسے سردی لگ گئی ہے اور صبح تک وہ اچھا ہو جائیگا۔

وہ پھر آئی۔ وہ ارغوانی سمندر کے گوشہ والی حسینہ۔ جسکے سر پر نیلگوں ریشم کی ساڑی کا آنچل تھا۔ وہ یاس و حرماں کا مجسمہ حسرت و ناکامی کا پیکر۔ وہ پھر آئی۔ پروفیسر نے اسے پھر دیکھا۔ وہ اسی یوکلپٹس کے درخت کے نیچے بیٹھا تصویر بنانے میں منہمک تھا۔ اسی حسرت نصیب حسینہ کی تصویر۔ وہ محروم آرزو التفات عورت۔ وہ یاس و حرماں نصیب تھی۔ پروفیسر اسکے متعلق نہ جانتا تھا لیکن اسکی آنکھیں تو کہتی تھیں وہ حسرت نصیب ہے۔ اسکا دل دکھا ہوا ہے کسی نے اسے ستایا ہے۔ گردش زمانہ نے یا انقلاب چرخ نے۔ پروفیسر یہ جانتا تھا لیکن اتنا یاد تھا اس نے اسے بارہا دیکھا ہے۔ وہ پھر آئی۔ پروفیسر موقلم سے قرطاس پر اس حسرت زدہ آنکھوں کی پلکیں بنا رہا تھا کہ وہ آئی۔ وہ ان آنکھوں کی گہرائی میں کھویا ہوا تھا۔ ڈوبا ہوا تھا۔ ان کے عشق میں اس وقت اس کے دل میں جذبات کا طوفان تھا۔ اسے توقع تھی آج شام تک تصویر مکمل ہو جائیگی۔ وہ اس معصوم ہستی اپنی شاگرد تمرا کو دکھائیگا اور کہیگا "لو، دیکھو یہ مکمل ہوگئی ہے۔ اب اسے تم "اکیڈیمی" میں بھیج دو۔ میری زندگی مکمل ہو چکی ہے۔ آج میں نے روداد حیات کی تکمیل کرلی ہے اور اسکے بعد اب میں آرام سے مر سکونگا۔ سکون و اطمینان کی موت"

اور پروفیسر واقعی مرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ تصویر کی تکمیل سے پیشتر مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے حسرت زدہ آنکھوں کی سیاہ اور گھنی پلکیں بناتے ہوئے محسوس کیا۔ سرد تیز ہوا آرہی ہے۔ ایک ہلکا سا جھونکا جس نے لٹ کپکپا دیا ہے۔ ہوا درختوں کی شاخوں میں سرسرائی اور اس نے نگاہ اٹھا کر آسمان کی جانب دیکھا۔ اسے خوف تھا کہیں کوئی کالا ابر نہ ہو اور بکالا رکہ ان قضا و قدر پھر اسکے ارادوں کو پامال نہ

کر دیں۔ اُس نے اطمینان کی ایک سانس لی۔ وہ پھر نگاہ کو گھنی پلکوں کی تکمیل میں مصروف کرنا چاہتا تھا کہ اسکی نظر یاسمین کی گھنی روش سے ہوتی ہوئی ہوٹل سے باہر پڑی۔

وہ جا رہی تھی۔ وہی حسرت آلود اور حرماں آگیں آنکھوں والی حسین عورت، وہ کشادہ چہرے اور سیاہ پلکوں والی حسینہ۔ وہ جا رہی تھی اس ارغوانی سمور کے کوٹ میں وہ سطح آب پر چلتی معلوم ہوتی تھی۔ ایک شاہی راج ہنس کی مانند اور لارنس گارڈن کے گھنے گہرے سبز رنگ کے اشجار کی فضائے بعید نے اُسے اور بھی حسین بنا دیا تھا۔ وہ اُسی مایوسی اور حرماں نصیبی کے سایہ میں ملبوس تھی۔ اسکی نگاہوں اور انداز سے وہی بیچارگی برستی تھی۔ وہ بے بسی اور درماندگی کا پیکر تھی۔ وہ جا رہی تھی۔ سُبک رفتاری کے ساتھ اور اُسکے ساتھ وہی نوجوان تھا وہی نوجوان۔ جسے اس نے کل شام کو دیکھا تھا۔ وہ جو انگریزی لباس میں ملبوس تھا اور اسکے ساتھ جا رہا تھا۔

عورت نے ڈرتے ہوئے، جھجکتے ہوئے اور کنیاتے ہوئے یوکلپٹس کے اس درخت کی طرف دیکھا۔ پروفیسر وہی تھا۔ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ اسکا سینہ تنفس کے زیر و بم سے گرتا اور اُبھرتا تھا سانس کی رفتار تیز تھی اور سراپا سکوت بنا اس حرماں نصیب حسینہ کو دیکھ رہا تھا۔

عورت جا چکی تھی وہ ارغوانی سمور کے کوٹ والی عورت ایک موج نسیم کی طرح جا چکی تھی۔ پروفیسر کی نگاہیں لارنس گارڈن کی روش پر تھیں وہ اس طرح دیکھ رہا تھا ٹکٹکی جمائے اور یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کسی بھولے ہوئے افسانہ کو، ماضی کے کسی لمحہ کو، اپنے افسانۂ حیات کے کسی قیامت بداماں ٹکڑے کو لیکن اسے یاد نہ آتا تھا۔

اس محویت میں کس قدر وقت گزر گیا۔ گم شدگی کی یہ کیفیت کتنے طویل لمحے طاری رہی۔ پروفیسر نہ جانتا تھا۔ اسے کبھی معلوم نہ ہوا لیکن جب اس نے پھر تصویر کو دیکھا تو رنگ آلود موقلم حسینہ کے حسرت آگیں چہرے پر ایک سیاہ نشان بنا چکا تھا۔ قسمت نے اس بار بھی دھوکا دیا تھا۔ اور "حمرا" وہ نوخیز معصوم لڑکی "حمرا" یونانی علم الاصنام کی علم کی دیوی کی طرح اسے شفقت آمیز جملوں اور محبت آگیں الفاظ سے تسلی دیتی اس درخت کے نیچے سے اُٹھا کر لے گئی۔ لیکن اسے ارغوانی سمور کے کوٹ والی حسینہ کا کوئی علم نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ پروفیسر کسی ذہنی عارضہ میں مبتلا ہے۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا وہ ضرور طبی امداد طلب کرے گی لیکن پروفیسر دلائل سے اسکے خیالات کی تردید کرتا تھا۔

وہ مباحثین حضرات سے زیادہ ذی ہوش تھا مگر اس سے درس فلسفہ لیتی تھی اور کوئی وجہ نہ تھی کہ پروفیسر کی ہوشمندی پر یقین نہ کرتی

تیسرے روز پروفیسر سر جھکائے پھر تصویر کی تکمیل میں مصروف تھا۔ تصویر تقریباً مکمل ہو چکی تھی کشادہ پیشانی، قوسی ابرو، اور بھرے بھرے گال، تراشیدہ گول ٹھوڑی۔ اور وہی حسرت آگیں آنکھیں وہ جن میں ایک غیر ارضی سوز و گداز تھا۔ ایک فریاد مستقل یا نالۂ پیہم۔ ایک رقت انگیز آرزو۔ اور ایک خوں شدہ تمنا۔ آہ ———— وہ مرقد آرزو آنکھیں کھلی ہوئی اور حسرت زدہ حرماں نصیبی کا مزار۔ آج وہ پھر سیاہ اور گھنی پلکوں میں مصروف تھا۔ موقلم غیر شعوری طور پر حرکت کر رہا تھا۔ پروفیسر کی آنکھوں میں فتحمندی کی چمک تھی۔ اور اس نے ارادہ کر لیا تھا وہ سر نہ اٹھائیگا۔ اس وقت تک سر نہیں اٹھائیگا جب تک وہ اس ناشاد و نامراد حسینہ کے حسرت آگین چہرہ کو نذر قرطاس نہ کر دے۔ اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا اور وہ اسکا پابند تھا۔ تصویر ابھی ایک یا دو یا شاید تین لمس کی محتاج تھی اور وقت کا وہ نقطہ جب ایک غیر مرئی ہاتھ پروفیسر کی تخلیق کو خراب کر دیتا تھا قریب پہنچ چکا تھا۔

پروفیسر کو اپنی پشت پر ایک سایہ نظر آیا۔ ایک سایہ۔ ایک مرد کا سراپا۔ نوجوان مرد کا۔ اور پھر ایک عورت کا سراپا۔ وہی حنا کے پودے کا سا قد اور ارغوانی سمور کے کوٹ کی جھلک اور ایک مانوس کی معطر روح۔ اس نے پہچان لیا۔ یہ وہی روح تھی وہی عطر۔ چند روز پیشتر کی برشگالی، شام کی حرماں نصیب مینہ کی خوشبو اور وہی خوبصورتی۔ اس نے غیر شعوری طور پر سر اٹھایا۔ وہی عورت کھڑی تھی خاموش اور اپنی تصویر کو اپنی کھلی ہوئی حسرت آلود آنکھوں، اپنے پریشان بالوں اپنے سیاہ آہوانہ ابرووں اور اپنی ایک جانب کی سیاہ گھنی پلکوں کو دیکھ رہی تھی۔ تصویر میں بھی باریک ہونٹوں پر وہی استہزا آمیز مسکراہٹ تھی۔ وہی مسکراہٹ جو اس کے دل کے عظیم تنفر و حقارت کا پتہ دیتی تھی۔ اس میں انسانی سوسائٹی اور انسانی رسوم و قیود اور کارکنان قضا و قدر کے خلاف ایک عمیق جذبہ تحقیر و تمسخر کا ایک پوشیدہ طوفان۔ اور اس عورت کے ساتھ وہی نوجوان تھا۔ شباب مجسم، سراپا مسرت و شگفتگی، اس کے ہونٹوں پر ایک زندگی بخش مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں ایک فیاضانہ خندہ۔ اس نے شفقت آمیز الفاظ میں پروفیسر کو مخاطب کیا۔ عورت خاموش رہی۔ پروفیسر نے محسوس کیا۔ نوجوان نے گفتگو کر کے اسے ایک حیات نو بخش دی ہے۔ اس کی زندگی کی تاریکیوں کو پاش پاش کر دیا ہے۔ وقت کا دریا پلٹ گیا ہے۔ اور وہ پھر شباب کی وادیوں میں گل بداماں پھر رہا ہے۔ اسکے ساتھ کوئی رفیق بھی ہے۔

لیکن اسکے چہرے کے نقش و نگار بہت دھندلے ہیں - وہ اب انہیں پہچاننے سے قاصر ہے - وہ انکی یاد تازہ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن نہیں کرسکتا - اس نے بتایا کس طرح اس نے ایک نوخیز لڑکی سے عشق کیا - وہ شباب کے طوفانی ایام سے گذر چکا تھا - یہ وہ ایام تھے جب وہ جامعہ میں فلسفۂ اسلامیہ کی کرسی پر متمکن تھا - کس طرح اس نے پرشور جذبات کے ساتھ ایک نوخیز حسینہ کو چاہا - کس طرح دونوں نے پیمان وفا باندھا، دونوں کی شادی ہوئی اور کس طرح ایک صبح اسے بیدار ہوکر معلوم ہوا کہ وہ جاچکی ہے وہ نوخیز حسینہ جو اس کی امیدوں کا مرکز تھی وہ سراپا جمال ——— وہ کسی ایکٹر کے ساتھ جاچکی تھی اور یہ جواب تھا اسکی محبت کا ——— اس قدر فریب کار واقع ہوئی ہے عورت !

اس نے یہ بھی بتایا کس طرح وہ ایک عرصہ تک دیوانوں کی سی زندگی بسر کرتا رہا - وہ کس مجنونانہ تلاش میں کھویا رہا اور آخر ناامیدی نے ہی بے حاصل کی لذت کو خاک میں ملاکر اسے پھر وہی سکون بخش دیا جسکا وہ محبت کے ایام سے پہلے مالک تھا -

وہ آرٹسٹ ہے - وہ پھر استاد فلسفہ ہے - اور خدا نے اسے الفت کی تباہی کا مقابلہ کرنے کی قوت عطا کردی ہے - طوفان اتر چکا ہے اور پھر "باریکی نگاہ" کا اہل ہے - وہ نہیں جانتا، وہ یہ تصویر کیوں بناتا، لیکن وہ گزشتہ دس سال سے اسے مکمل کرنے کی کوشش میں ہے اور یہ کوشش ابھی تک مشکور نہیں ہوئی -

نوجوان نے تمام واقعہ کو غور سے سُنا - سراپا جوش اور ہمہ تن التفات و توجہ بن کر سُنا اور جیب میں ہاتھ ڈالا - ہاتھ کچھ عرصہ تک جیب میں رہا - وہ عورت تصویر پر نگاہ جمائے دیکھتی رہی - وہ پروفیسر کو مخاطب کرنے سے خائف تھی - اسکے لب متحرک تھے لیکن الفاظ زبان تک آکر رہ جاتے - وہ جانتی تھی یہ اسکی تصویر ہے - اسکے شباب کی بہار کے اولین ایام کی - جب وہ ایک پرکیف مسکراہٹ تھی - یا ایک خندۂ مسرت - اور یہ تصویر ایک پکار ہے ایام گزشتہ کی -

نوجوان نے جیب سے "ویسٹ تھیٹر" کے دو ٹکٹ نکالے - اور پروفیسر کی طرف بڑھا کر اُسنے کہا "آج ہم شکسپیر کا "اتھالو" دکھاتے ہیں - آپ اور آپ کے فاضل رفیق کی موجودگی ہمارے لیے باعث افتخار ہوگی"

یہ جملہ نوجوان نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ پروفیسر نے فوراً ٹکٹ لے لئے اور وعدہ کرلیا کہ رات کو

وہ ضرور "اتھالو" کا لطف اُٹھائیگا اور اپنی حسین رفیق "حمرا" کو بھی ہمراہ لائیگا۔ نوجوان نے ہاتھ ملایا اور حسین عورت نے پروفیسر کے چہرہ کو پرمعنی نگاہ سے دیکھا اور دونوں باغیچہ کی جھاڑیوں اور پودوں کو روندتے پھاندتے نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

آج بھی تصویر خراب ہوچکی تھی۔

حمرا پروفیسر کا بازو تھامے ہوئے تھی وہ تھیٹر کے روشن دروازے کی طرف بڑھے۔ وہ ہندوستانی تیاتر کی وسعت کی ممکنات پر غور کر رہے تھے۔ اور دونوں ہجوم کو چیرتے ہوئے اندر داخل ہوئے

وہ روشنی۔ تیز روشنی۔ موسیقی اور ہجوم کے شور کے درمیان بیٹھے تھے۔ آرکسٹرا کے ترانوں سے ایوان گونج رہا تھا۔ اور "اتھالو" کی تمثیل، فن تمثیل کے تمام تر کمال کے ساتھ دکھائی جا رہی تھی۔ پروفیسر کی نگاہیں اطالیہ کے مناظر میں محو تھی۔ وہ نیلگوں سمندر، وہ سیمیں چشمہ ہائے آب، اور سنگترے کے سرسبز درختوں کا سایہ جو پانی پر ایک زرکار جال بچھا دیتا تھا جس میں سے دھوپ چھن چھن کر بحیرۂ قلزم کے پانی کو چومتی تھی۔

نصف سے زیادہ تمثیل دکھائی جا چکی تھی۔ اتھالو حبشی سپہ سالار کا جرم دکھایا جا رہا تھا۔ "ڈسڈامونا" ریشمی پردوں میں لپٹی پڑی تھی اور اتھالو اپنے افریقی خنجر کی دو ضربیں لگا چکا تھا۔ اور قریب تھا کہ تیسری ضرب اسکی زندگی کا خاتمہ کردے۔

اس وقت موسیقی کے ہلکے ہلکے تفکر انگیز ترانوں کو چیرتی ہوئی ایک چیخ سنائی دی۔

"سلما!"

"اتھالو" جھجک کر ایک جانب ہٹ گیا۔ پروفیسر بالکل سیدھا کھڑا تھا۔ اسکی آنکھیں، اسکی داڑھی کے پریشان بال، اسکا ماتھا بجلی کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اسکا سینہ گرتا اور اُبھرتا تھا۔ جذبات کے زیر و بم اور تنفس کی سرعت سے وہ مضطرب ہوگیا۔ وہ اختلاج، مہلک اختلاج محسوس کرتا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا وہ مر رہا ہے۔ مرا جاتا ہے۔ وہ مٹھیاں کھولتا اور بھینچتا تھا۔ حسرت آلود نگاہوں والی پریشان بال حسینہ اسکے سامنے تھی۔ وہ حسینہ جس کی نگاہوں میں عمر کا ایک سمندر موج زن تھا۔ ایک سربستہ راز کی

صورت ایک سر تباہ کی طرح، وہ حسینہ ارغوانی سمور کوٹ والی، مایوسی و ناکامرانی کا پیکر ڈسڈا مونا کے لباس میں اسٹیج پر متحیر کھڑی تھی۔ پروفیسر نے اسے کہیں دیکھا تھا۔ اور وہ بتا سکتا تھا اس نے اسے کہاں دیکھا ہے۔

وہ ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا۔ ایک نشست سے دوسری نشست پر کودتا، لوگوں کے شور اور بجلی کی خیرہ کن چمک کے درمیان کودتا اسٹیج پر پہنچ گیا۔

اس نے اپنی باہیں پھیلا دیں۔ اس کی آواز لرزتی ہوئی پھر بلند ہوئی۔

" سلما ! میری پیاری سلما ! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ! "

اس نے ارغوانی سمور کے کوٹ والی حسرت نصیب حسینہ کو کھینچ کر اپنے سینہ سے لگا لیا۔ وہ اپنے دھڑکتے ہوئے مضطرب دل سے لگائے ہوئے کھڑا تھا۔ اور پردا موسیقی کی تانوں، لوگوں کے شور، بجلی کی خیرہ کن روشنی کے درمیان آہستہ آہستہ گر رہا تھا!۔

"ویلنس تھیٹر" کا "اتھالو" کبھی مکمل نہ ہوا۔ کیونکہ "ڈسڈا مونا" کا پارٹ کرنے والی نادرہ کار ایکٹرس نے اپنی تیاتر کی زندگی کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دیا تھا۔

ہمیں دلی رنج ہے کہ جناب حنیف ہاشمی صاحب مرحوم نے انتقال کیا۔ آپ ابھی جوان تھے اور ادب اردو میں آپ سے بہت کچھ امیدیں تھیں۔ افسوس ہے کہ مرگ ناگہانی نے مہلت نہ دی۔ مرحوم کا آخری افسانہ ہے۔ مدیر

عہد پیری

(جناب سید احمد اللہ صاحب قادری، نائب اڈیٹر "تاریخ" حیدرآباد)

عہد پیری کیا کہوں میں تیری کہنہ داستاں
زندگی کی آخری تصویر ہے تیرا فشاں

تو وہ دریا ہے کہ جس میں اک فراوانی نہیں
تو وہ بجلی ہے کہ جس میں نورافشانی نہیں

تو وہ کشتی ہے کہ ساحل آ گیا جس کا قریب
جلد ہو جاتا ہے تیرا راہرو منزل نصیب

ہر بلندی میں تری پستی ہی کے اسرار ہیں
ہر نظر میں تیری بربادی ہی کے آثار ہیں

تو ہماری زندگی کا انتہائی راز ہے
ہر قدم تیرا شکستہ ساز کی آواز ہے

داستانِ اُردو

آریا برن[1]

جناب نواب نصیر حسین صاحب خیالؔ

زبان و ادب کی خدمت سے آریا فارغ ہوئے تو اب اس زمین پر اپنی قدرت دکھانے کی فکر کی۔ اس کے لئے چار مضبوط ہاتھ نکالے۔ مذہب و قانون پر کل کاموں کی درستگی منحصر تھی۔ اس کے لئے ایک الگ فرقہ بنا۔ اور اُسے برہما (خالق) کے منہ سے پیدا ہونے کا شاعرانہ مگر موزوں دعویٰ کرکے اُنھیں براہمن (برہمن) خطاب دیا۔ اور یوں دلوں میں اُن کی بڑائی بٹھا کر اور مذہب و قانون کو اُن کی مٹھی میں دے کر اُنھیں اچھوتا اور عام ہاتھوں سے دُور کر دیا! ۔ اب قانون کے چلانے اور اُس کے پھیلانے کی مہم درپیش تھی۔ وہ برہما کے بازوؤں سے[2] سُرمو ئی اور رجپوت و چھتری (چتری) نکلے۔ اُن کے قبضہ میں تلوار آئی اور سر پر چتر چھپے! مگر سلطنت کا کام خالی دھرم اور ترو ار[3] کے دم سے نہیں چلتا۔ اس لئے ایسے ہاتھوں کی تلاش ہوئی جو اس آتما کی آگ کو بھی بجھا سکیں۔ ویش پیش ہوئے! اور اسی مناسبت سے وہ ہاتھ برہما کے پیٹ سے نکال کر زمین میں جوت دیئے گئے! راجہ بغیر پرجا اور آقا بغیر نوکر مفلس ہے۔ یہ افلاس مٹایا گیا۔ مال غنیمت[4] پاس تھا، اس وقت کام آیا

---

[1] برن۔ ذاتوں کی تقسیم کا قانون۔ [2] تخیئل نے رجپوتوں، چھتریوں کو برہما کے بازوؤں سے پیدا کر دیا۔ دنیا کی اور قدیم قوموں (مثل مصریوں، چینیوں اور یونانیوں) کی مائی تھولجی (Mythology) میں بھی ایسے خیالات عام ہیں۔

[3] تلوار اور ترو ار، دونوں ہندی لفظ ہیں اور درست۔ [4] لڑائی میں جو ہاتھ لگتا ہے اُسے مال غنیمت کہتے ہیں۔ غیر آریا بھی اسی طرح آریوں کے ہاتھ لگے۔ وہ مال غنیمت سے کم نہ تھے۔ اس لئے غلام د شودر بنے!

انھیں برہما کے پیر (سب میں حقیر عضو) سے نکالا۔ نیا نام دیا۔ اور شودر کہہ کر چاکر بنالیا۔ شک نہیں کہ یہ قانون آریوں کے دوسرے دور یعنی ویدی زمانہ میں نہیں بلکہ سنسکرتی یا برہمنی عروج میں پاس ہوئے اور اُن سے بڑے کام بھی نکلے۔ برہمن (مذہبی و علمی جماعت) دنیا سے الگ نہ ہو جاتے تو علم و گیان رونق نہ پاتے۔ اور اسی طرح رجپوت، تلوار کے سوا، اور بوجھ بھی اٹھاتے تو خود جھک جاتے! اور ویش، خاص دھندھوں میں نہ لگتے تو پیٹ نہ ملتے۔ اور غریب شودر چاکر نہ بنتے تو کام نہ چلتے!

یہ سب درست لیکن سماج کا اصل کام چھوٹوں کو بڑا کر دینا، دبے ہوؤں کو اٹھانا اور انھیں اونچا کر کے اپنے برابر بٹھانا ہے! ۔ مگر یہ آریا برن شکشا اس کی ضد تھا۔ اور غیر آریوں کو جس وقت اس کا حس ہوا اُسی وقت سے اُن کے تیور بدلے اور خود کو بنانے اور اپنی طاقت بڑھانے لگے! چاکر شودر یہ آقا سے ہمیشہ بڑھے اور غالب رہتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ ایک شکتی بند ہے تو ابھر کر سمندر ہو جاتی اور جھکائے نہیں جھکتی! اور یہاں بھی آخر ایسا ہی ہوا!!

جناب رہبر

دل کے ہاتھوں عشق کی دنیا بہت بدنام ہے
ضبط کی ناکامیاں دل کا راز طشت از بام ہے

ذرہ ذرہ حسنِ رنگیں کا فنا انجام ہے
چار دن کی چاندنی یہ جلوۂ ناکام ہے

مجھ کو ناصح عشق کی رسوائیوں کی کیا خبر
تو کہے یا تنگ میں تو جانتا بدنام ہے

دیکھیے کب تک رہا رہتے ہیں مرغانِ چمن
پھر دکھائی نظر آیا جہاں پر دام ہے

مجھ کو ساقی نے پلائی دورِ آخر میں شراب
ایک ہی تنکا کو دیا یہ سب سے پہلا جام ہے

دیکھنے والوں کی قوت پر ہے سارا انحصار
کیا کہیں دنیا میں جب یہ جلوہ گاہِ عام ہے

مرنے والا چپ ہے لیکن کہہ رہے ہیں اتفاقات
زندگی سے نسبتاً کچھ قبر میں آرام ہے

دیکھنا کیا ہے جب نظر آجائے منزل کا سواد
صبح سے میں چل رہا ہوں رہبر اور اب شام ہے

خالص اُردو

(حضرت آرزو لکھنوی)

تھاہ نہ اِس سے پائے گا دھارے کا جو بہاؤ ہے
دھوکا ہے آس ناؤ کی۔ اب تو بھنور ہی ناؤ ہے

رات سے دن ہو دن سے رات، تارے بھی لپٹے ساتھ ساتھ
کس کے لئے یہ بھاگا بھاگ، کاہے کی ہاؤ ہاؤ ہے

کھیل نہیں یہ دھوپ چھاؤں۔ آنکھ سے دیکھ جی میں سوچ
ڈیرا وہاں لگے گا کل۔ آج یہاں پڑاؤ ہے

بکسے جو پھول مٹ ہی جائے۔ بکسے کلی تو جی لُبھائے
اِس کا یہی بگاڑ ہے۔ اُس کا یہی بناؤ ہے

ہم بھی دیکھ لیں گے پھر۔ کہہ چکے ہو تو کیا ہوا
نکلو نہ باہر اوٹ کے۔ آج بڑا جماؤ ہے

جھپکی پلک جس آنکھ کی۔ ٹپ سے گری لہو کی بوند
دیکھو تو دو الگ الگ۔ سمجھو تو ایک گھاؤ ہے

جسکی ہے سب یہ اوس دھوپ۔ چھاؤں اُسی کی ڈھونڈھ لے
اوس کا بھی نہیں ہے ڈر۔ دھوپ سے بھی بچاؤ ہے

اپنی[1] یہ اُردو آرزو ہند و عجم کے بیچ میں
آپ ہے اک اَنّی چھُری۔ تیغ نہ ہے نہ داؤ ہے

---

[1] مقطع غیر مقید اُردو میں ہے اور مفہوم اسکا خالص اُردو، اپنی مقید اُردو کے حدود بتا رہا ہے۔ آرزو

کیا میں ڈرپوک ہوں؟

(جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب حیدرآباد دکن)

سچ ہے یہ کہ جب انسان کسی مسئلہ کو حل نہیں کر سکتا تو عجب کشمکش میں پڑ جاتا ہے۔ ہر شخص کو کبھی نہ کبھی یہ مصیبت ضرور پیش آتی ہے۔ میں بھی انسان ہوں مجھ سے بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہو سکتا کہ میں ڈرپوک ہوں یا نہیں ہوں۔ کہتے ہیں کہ جب کبھی ایسی صورت پیش آئے تو دوسروں سے مشورہ کر لو۔ میں بھی اس لئے اب سب صاحبوں سے یہی سوال کرتا ہوں۔ اور سوال کرنے سے پہلے وہ واقعات بیان کر دیتا ہوں جن کی وجہ سے کبھی میرا دل یہ کہتا ہے کہ تو ڈرپوک ہے اور یقیناً ڈرپوک ہے۔ اور کبھی کہتا ہے کہ نہیں ہرگز نہیں۔ ترک بھی کبھی کہیں ڈرپوک ہوئے ہیں۔

پہلے میں اپنی ہمت و جرأت میں اپنے برابر والوں سے کہیں بڑھا چڑھا تھا۔ گرمی میں رات کو قابلیز پر دوستوں کے ساتھ گیا ہوں بیٹھے بیٹھے وہاں جی گھبرایا اور میں بھاگا۔ سب لوگ روکتے بھی ہیں کہ "میاں کیوں ایسے بے وقت جا رہے ہو۔ رات کے بارہ بجے ہیں۔ مرگھٹ میں سے ہو کر راستہ جاتا ہے۔ خدا معلوم کیا موقعہ ہے۔ کہیں اور کچھ ہو گیا، تو لینے کے دینے پڑ جائینگے۔ بھلا یہ کوئی بھلے آدمیوں کے جانے کا وقت ہے۔" مگر میں۔ میں کیا ماننے والا تھا۔ آتا۔ مردے پڑے جلتے ہوتے۔ اُنکی چتا کا چکر کاٹ کر آتا۔ ہڈیوں کو چٹخنے دیکھتا۔ بو کو لمبے لمبے سانس لیکر سونگھتا۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا۔ کچھ گنگناتا۔ کچھ خود بخود دوسروں کے دلوں کی کمزوری پر ہنستا۔ کبھی بیچارے مرنے والوں کو مقابلے پر بلاتا لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی بھلے آدمی نے آکر آمنا سامنا کیا ہو۔ اور آتا بھی تو میرا کیا بگاڑ لیتا۔ قسم خدا کی وہ تھپڑ مارتا کہ مُنہ پھر جاتا۔ اب آپ ہی بتائیے کہ

کیا میں ڈرپوک تھا؟

نے مجھے کئی دفعہ ڈر بھی لگا ہے لیکن وہ ایسا موقعہ تھا کہ ہر ایک کو ڈر لگنا چاہیے تھا۔ میں اگر ڈرا تو کون سی نئی بات کی۔

ایک روز میں پڑا سو رہا تھا کہ یکایک کھٹکے سے ایک دم آنکھ کھل گئی۔ میرے برابر ہی بھائی صاحب کا پلنگ تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ کوئی شخص سات آٹھ گز اونچا انکے پلنگ پر کھڑا ہے میں نے جھٹ آنکھ بند کر لی۔ اور طبیعت سنبھال ایک دفعہ ہی قلانچ مار پلنگ کی پائنتی جا کھڑا ہوا۔ اب دیکھتا ہوں کہ وہ ست گزے آدمی تو کہیں غائب ہو گئے۔ ہاں بھائی صاحب پلنگ پر لیٹے ہیں۔ میرے اس طرح اچکنے سے وہ بھی گھبرا گئے۔ کہنے لگے "ہیں یہ کیا" میں نے پوچھا "آپ کب آئے" انھوں نے کہا "تماشے سے ابھی آکر لیٹا ہوں" انکا یہ کہنا تھا کہ مسئلہ حل ہو گیا۔ وہ واپس آکر پلنگ پر کھڑے ہوئے تھے۔ جھٹکنے کے لئے پلنگ پر کھڑے ہو کر لحاف کھولا تھا پلنگ کی بلندی ان کے قد کی اونچائی۔ اور انکے ہاتھوں کے اونچے ہونے نے انکو ست گزا آدمی بنا دیا تھا۔ ان کے سامنے لحاف لٹکا ہوا تھا۔ اس لئے انکی شکل تو چھپ گئی اور میرے وہم نے ان سب چیزوں کو ملا کر ایک ایسی صورت پیدا کر دی جو کسی طرح انسان نہیں کہی جا سکتی تھی۔

اب آپ ہی بتائیے کہ

کیا میں ڈرپوک تھا؟

ایک دفعہ یہ ہوا کہ میں تھک تھکا کر آیا تھا نیند بہت آ رہی تھی۔ ویسے ہی الٹا سیدھا پڑ کر سو رہا۔ اندھیری رات تھی۔ چراغ گل ہو گیا تھا۔ پھر بھی تاروں کی وجہ سے دالان میں کچھ اجالا سا تھا۔ رات کو کوئی دو بجے ہونگے کہ دفعتہً بلا وجہ میری آنکھ کھلی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ پلنگ کی پائنتی ایک لمبے سے آدمی سفید براق کپڑے پہنے کھڑے ہیں۔ میں نے جھٹ آنکھیں بند کر لیں۔ آہستہ آہستہ پاؤں سکیڑے اور اس زور سے دونوں لاتیں ان صاحب کو ماریں کہ واقعی اگر کوئی بھوت بھی ہوتا تو الٹ جاتا۔ مگر حضرت ان لاتوں کی وہ زبردست آواز ہوئی کہ سارا گھر اٹھ بیٹھا۔ اور میرے پاؤں تو ایسے ہو گئے جیسے کسی نے ہتھوڑا مار دیا ہو۔ ہوا یہ کہ جن صاحب کو میں بھوت سمجھا تھا وہ دالان کا کھمبا تھا۔ نئی نئی سفیدی ہوئی تھی۔ اس لئے تو مجھے یہی معلوم ہوا کہ یہ انسان تو نہیں ہو سکتا ضرور جن یا بھوت ہے۔ مگر میری ہمت کو دیکھئے کہ یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی میں نے [illegible]

میں ذرا کمی نہیں کی۔ اب آپ ہی فرمایئے کہ

کیا میں ڈرپوک تھا؟

خیر یہ تو گھر کی باتیں ہیں۔ یار دوستوں میں بھی میری ہمت کی دھاک تھی۔ ایک دن تو اللہ بھلا آدمیوں نے مار ہی ڈالا ہوتا۔ رات کے آٹھ بجے ہونگے۔ ہم سات آٹھ آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور یہی بھوت پریتوں کے قصے ہو رہے تھے۔ ایک صاحب جو ہم سب میں ڈرپوک سمجھے جاتے تھے کہنے لگے کہ "اجی یوں باتیں بنانے سے کیا ہوتا ہے۔ ہم تو جب جانیں کہ کوئی صاحب رات کو ..... کے مقبرہ کے تہ خانہ میں جاکر ...... بادشاہ کی قبر پر پھول چڑھا آئیں"۔ میرے یار نے بات بڑی سخت کہی تھی۔ اول تو مقبرہ ہی تین میل تھا۔ دوسرے وہاں کا تہ خانہ خدا کی پناہ۔ دن کو جاتے ڈر لگتا ہے لیکن ایک ڈرپوک کا چیلنج تھا۔ اگر قبول نہیں کرتے ہیں تو ڈرپوک بنتے ہیں۔ اور اگر قبول کرتے ہیں تو خدا جانے کیا افتاد پڑے۔ غرض سب لوگ کچھ جھینپے سے ہو گئے۔ بھلا ہم تمیں مار خاں کیا دبنے والے تھے۔ ہم نے کہا "ہم جاتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ لالٹین لیکر جائیں گے۔ اس لئے نہیں کہ تہ خانے میں جانے سے ڈر لگتا ہے، بلکہ اس لئے کہ کہیں کوئی سانپ بچھو نہ ہو۔ دوسرے تہ خانہ میں قبریں اتنی ہیں کہ ...... بادشاہ کے سرہانے تک دن ہی کو پہنچنا مشکل ہے۔ بہر حال یہ شرط منظور ہوئی۔ اور پانچ روپے کی مٹھائی پر تصفیہ ہوا۔ غرض پھول آئے اور ہم لالٹین لینے گھر گئے۔ اس زمانہ میں مجھے لکڑی کا بہت شوق تھا۔ گھر میں آکر لکڑی لی، لالٹین اٹھائی۔ گھر والے پوچھتے ہی رہے کہ "کیوں خیر تو ہے، یہ آخر لالٹین کہاں لیکر چلے"۔ مگر میں نے کسی کا جواب نہیں دیا اور میں گھر سے نکل، شہر میں سے گزر سیدھا مقبرہ کی سڑک پر پڑ لیا۔ مقبرہ پہنچ کر چبوترہ پر ذرا دم لیا۔ لالٹین جلائی۔ تہ خانہ میں گھسا اور بڑی مشکل سے قبروں کو ناگھتا پھلانگتا ...... بادشاہ کی قبر تک پہنچا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ قبر کو سات آٹھ اونچی اونچی بلائیں گھیرے کھڑی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی انھوں نے آہستہ آہستہ قبر کے گرد ناچنا شروع کیا۔ میں لالٹین رکھ، پھٹ سے کر لگا کھڑا ہو گیا۔ جب تھوڑی دیر ہو گئی۔ اور وہ ناچ کسی طرح ختم نہیں ہوا تو میں نے کہا "اے بزرگوں یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ تم کون ہو۔ مگر میری ایک عرض سن لو۔ میں قبر پر پھول چڑھانے آیا ہوں۔ ذرا ہٹ جاؤ تو میں اپنا کام کرکے چلا جاؤں۔ اسکے بعد تمہیں اختیار ہے۔ ساری رات ناچا کرنا"۔ میرا یہ کہنا تھا کہ انکی گردش میں ذرا تیزی آگئی۔

جب میں نے دیکھا کہ یہ قبر کا کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتے تو مجھے بھی جذبہ آگیا اور میں نے کہا "دیکھئے حضرات میں یہاں سے پھول چڑھائے بغیر کبھی نہیں جاؤں گا۔ اگر یوں نہیں مانتے تو پھر مجھے دوسری طرح بھی منوانا آتا ہے" بھلا وہ میری کب ماننے والے تھے اُن کا ناچ کسی طرح نہ ختم ہوتا تھا نہ ہوا میں نے آیت الکرسی پڑھ کر اپنے پر دم کی اور پھر بسم اللہ کہہ کر لکڑی اُٹھائی پہلے ہی صاحب کے جو ہاتھ رسید کرتا ہوں تو چیخوں سے سارا تہ خانہ گونج گیا۔ اور سب کے سب کمبل پھینک غل مچانے لگے کہ "مرزا ہم ہیں۔ خدا کے لئے اور ہاتھ نہ مارنا" لاحول ولا قوت الا باللہ۔ یہ سب کے سب تو وہی مہربان ہیں جن سے شرط باندھ کر میں پھول چڑھانے آیا تھا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بدمعاش پہلے سے ایکا کر کے آئے تھے کمبل ساتھ لائے تھے۔ اور کمبلوں کو لکڑی کے سہارے اونچا کر کے شیطان بنے تھے۔ ان کی اس حرکت پر مجھے بہت غصہ آیا۔ اور خوب جی بھر کر سب کو ٹھونک ڈالا۔ بھلا آپ ہی غور کیجیے کہ اگر میرا دل ذرا بھی کمزور ہوتا تو مر جانے میں کیا کسر رہی تھی۔ ایک ہی دھچکے میں دم نکل جاتا اب آپ ہی بتائیے کہ

کیا میں ڈرپوک تھا؟

آپ یہ کہیں گے کہ میں مبالغہ سے کام لے رہا ہوں میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ بالکل سچا واقعہ ہے۔ ہمت تو میں نے ضرور کی لیکن ذرا عقل سے کام لے کر۔ اس سے پہلے بھی ہمارے شہر میں ایک اسی قسم کا واقعہ گزرا تھا۔ یہاں تو نہیں، ہاں ایک دوسرے مقبرے کے تہ خانہ میں ایک صاحب شرط باندھ کر کیل گاڑنے گئے تھے گھبراہٹ میں انگرکھے کا دامن بھی کیل کے ساتھ دیوار میں ٹھونک دیا۔ اب جو پلٹتے ہیں تو ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے دامن پکڑ لیا۔ پھر کیا تھا۔ بیچارے ایک چیخ مار کر وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔ میں یہ قصہ سن چکا تھا۔ اس لئے جانتا تھا کہ اکثر ہماری غلطی ہی ہماری کم ہمتی اور وہم کا باعث ہو جاتی ہے۔ جب میں نے ان بلاؤں کو قبر کے گرد ناچتے دیکھا تو میرے دماغ نے کام کرنا شروع کیا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے۔ اگر شیطان ہیں تو بھلا انکو بادشاہ سلامت سے کیا دلچسپی ہے جو رات کے وقت کسی زاہد یا عابد کو بہکا کر یہاں ناچ میں وقت گنواتے ہیں۔ اگر یہ کوئی بلائیں ہیں تو کیا مرگھٹ میں انکے لئے جگہ نہ تھی جو تین میل آ کر اس مقبرہ کو اپنا مسکن بنایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ میری لالٹین کی روشنی سے ان کا سایہ سامنے کی دیوار پر پڑ رہا ہے،

پیسے یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ آدمی ہیں - یہ تو میں ہرگز نہیں سمجھا کہ یہ میرے مہمان دوست ہیں - ہاں یہ خیال ہوا کہ کوئی چور دو ہیں - مال باندھنے کو یہاں جمع ہوئے تھے میری آہٹ پا ہوشیار ہو گئے اور میرے ڈرانے کے لئے یہ روپ بھرا - بہرحال یہ تو میں نہیں کہتا کہ میں بہادر تھا لیکن یہ آپ بھی نہیں کہہ سکتے کہ مجھ میں ہمت نہ تھی - آپ سچ فرمائیے گا کہ واقعی

کیا میں ڈرپوک تھا ؟

یوں تو ہمیشہ ہی ایسے واقعات پیش آتے رہے جن میں "مردی و نامردی قدمے فا" کا حال کھل جاتا ہے لیکن جب میں کالج میں پڑھتا تھا اُس وقت ایک ایسا واقعہ ہوا کہ میں بھی ذرا گھبرا گیا تھا - ہوا یہ کہ ہم کرکٹ کا میچ کھیلنے ریاست ...... گئے تھے میں کیپٹن تھا اس لئے میری ذمہ داریاں سب سے زیادہ تھیں جس ریاست میں ہم گئے تھے وہاں کی ٹیم بڑی مشہور تھی سب کے سب کھلاڑی ریاست کے نوکر تھے اور کرکٹ ہی کی بدولت بڑی بڑی تنخواہیں پاتے تھے - کھیلنے والے بھی اچھے تھے مگر بے ایمانی کرنے میں چوکتے بھی نہیں تھے - اور کسی طرح بس چلتا تو چائے کے وقت کسی نہ کسی چیز میں بھنگ ملا کر دے دیتے تھے - اخیر دسمبر ـــــ ء میں شام کو ہم وہاں پہنچے - بڑے زوروں سے خیر مقدم ہوا - ایک عالی شان محل میں لے جا کر اُتار دیا گیا - کھانا کھا کر ذرا لوٹ ماری - اتنے میں ریاست کے لوگ باتیں چیتیں کرنے آ گئے - اور آتے ہی بھوتوں کے قصے چھیڑ دیئے - اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ یہ محل بہت بدنام ہے - اکثر آتشدان میں سے خون بہنے لگتا ہے - کراہنے کی آوازیں آتی ہیں - شاید کسی زمانے میں یہاں کوئی بیگناہ مارا گیا ہے - وہی سامنے کی دیوار پر سفید کپڑے پہن کر ٹہلا کرتا ہے - وہ تو یہ کہہ کر رخصت ہوئے اور کالج کے لونڈوں کے حواس باختہ ہو گئے - ساری رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹ دی - صبح ہوتے کچھ تھوڑی دیر کو سو رہے - دس بجے سے میچ شروع ہوا - خدا کی قدرت کو دیکھئے کہ اتنی بڑی ٹیم کو ہم نے ۴۳ رنوں میں ڈھیر کر دیا - اس کے بعد ہمارے کھیلنے کی باری آئی - ہم لوگ جاگے ہوئے تھے لیکن پھر بھی ۱۲۰ رنیں بنا ہی گئے - رات کو کھانا کھانے کے بعد پھر وہی لوگ آئے اور وہی قصے بڑھا اور چڑھا کر بیاں کئے - خیر گیارہ بجے کے قریب وہ لوگ تو رخصت ہوئے اور ہم نے سونے کی ٹھانی - ایک صاحب کمرہ سے باہر پیشاب کو نکلے ہی تھے کہ چیخ مار کر بھاگے - ہم سب گھبرا کر اُٹھ بیٹھے -

معلوم ہوا کہ دیوار پر کوئی بزرگ سفید اپٹرے پہنے ٹہل رہے تھے۔ میں نے بھی جھانک کر دیکھا۔ مجھے بھی کچھ پرچھائیں سی نظر آئی اور غائب ہوگئی۔ اب کیا تھا سب کے سب سہم سے گئے اٹھ کر بیٹھے ہی تھے کہ آتشدان میں سے کراہنے کی آواز آئی۔ بس یہ ایم ہوتا تھا کہ آتشدان کی لکڑیوں میں کوئی بیٹھا "اوہنہ اوہنہ" کر رہا ہے۔ بہت غور کیا کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر واقعی کوئی اوہنہ اوہنہ کرتا تو آواز گونجتی۔ اور اس آواز میں ذرا گونج نہ تھی۔ بہرحال اسکا یہ اثر ہوا کہ ہم سب کے سب ایک جگہ کونے میں دبک کر مونہ بیٹھے۔ ابھی کراہنے کا سلسلہ ختم نہیں ہوا تھا کہ آتشدان میں سے خون کی پتلی سی دھار بہنا شروع ہوئی۔ اور یہ خون کمرے کے فرش پر آکر پھیلنے لگا۔ اس نے رہے سہے اور بھی سب کے حواس کھو دیے بعضوں نے تو بھاگنے کی ٹھانی۔ بعضوں کے سروں میں چکر آ گیا۔ غرضکہ یہ صلاح ٹھہری کہ مکان سے نکل بھاگنا چاہیے۔ مگر میں نے منع کیا اور کہا "یارو اگر یہاں سے بھاگے تو تمام شہر میں تکو بن جاؤ گے سب کہینگے کہ "بیچیے یہ دلی شہر کے بہادر آئے تھے جو خون دیکھ کر بھاگ نکلے۔ تم بھی بدنام ہوگے تمہارا کالج بھی بدنام ہوگا۔ تمہارا شہر بھی بدنام ہوگا۔ اور یہ کیا ہے۔ کیا تم کو کل فیلڈ میں منہ دکھانے کی جگہ رہیگی۔ اس میں کچھ نہ کچھ "فن" ضرور ہے۔ ورنہ ہمارے میزبانوں کو روز بھوتوں کے قصے آ آکر بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اچھا تم ٹھہرو۔ میں کچھ پتہ چلاتا ہوں" یہ کہہ میں آتشدان کے پاس آیا۔ خون برابر بہہ رہا تھا۔ مگر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس خون میں نوسادر کی بو تھی۔ یہ تو ہم نے پڑھا تھا کہ جہاں شیطان ہوتا ہے وہاں گندھک کی بو آتی ہے لیکن یہ نوسادر کا معاملہ بالکل نیا تھا۔ میں نے دماغ پر ذرا زور ڈالا تو بیچیے مسئلہ حل ہوگیا۔ آتشدان کے اندر کچا سرخ رنگ بھرا ہوا تھا۔ شاید کوئی اوپر سے آہستہ آہستہ پانی ڈال رہا ہے جو خون کی شکل بن کر فرش پر پھیل رہا ہے۔ نوسادر کی بو کا خیال آتے ہی دوسری طرف دماغ لڑا یعنی یہ کہ پانی نہیں ڈالا جا رہا بلکہ کئی آدمی یکے بعد دیگرے پیشاب کر رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ تھوڑی دیر تک دھار چلتی ہے اور پھر رک جاتی ہے۔ میں نے آہستہ سے آکر کرکٹ کی گیند لی۔ اور آتشدان کے پاس آ بیٹھا۔ تھوڑی دیر نہ گذری تھی کہ پھر وہی خون کی دھار چلی۔ میں نے آتشدان کے اندر ہاتھ ڈال بڑے زور سے گیند اچھالی۔ اور اسکے ساتھ ہی ایک چیخ کی آواز آئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ گیند

بیچارے کے کسی نازک حصۂ جسم پر لگی اور ایسی لگی کہ الٹ دیا۔ دوسرے دن صبح کو کیپٹن صاحب غائب تھے۔ اس سے پتہ چلا کہ انھوں ہی نے یہ چوٹ کھائی تھی۔ خیر یہ تو سب کچھ ہوا مگر اب تک یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ پانی کے بجائے یہ پیشاب کا کیوں سلسلہ شروع کیا گیا تھا۔ پانی سے بھی وہی کام نکل سکتا تھا معمہ میں نے کھول دیا۔ اب اسکو آپ حل کر لیجئے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتائیے کہ

کیا میں ڈرپوک تھا؟

خیر "یہ باتیں ہیں جب کی کہ آتش جوان تھا" اب کیا پوچھتے ہو۔ کالج چھوٹا۔ نوکری کے پھندوں میں پھنسے۔ شادی ہوئی۔ بال بچے ہوئے۔ جان کی حفاظت فرض عین ہوئی۔ ہر عقدہ لاینحل کو سلجھانے کے لئے ایک شریک کار ملا لیکن اب خود مجھے خیال پیدا ہونے لگا کہ

کیا میں ڈرپوک ہوں؟

ہم (یعنی میں اور وہ) سو رہے ہیں۔ کہ ایک دفعہ ہی کسی نے شانہ ہلایا۔ گھبرا کر آنکھ کھل گئی۔ بیگم صاحبہ نے کہا "ارے دیکھنا۔ یہ سیڑھیوں پر کھٹ کھٹ کی آواز کیسی آرہی ہے"۔ ہم نے کچھ کھلی کچھ بند آنکھوں سے کہا "او جی کتا ہوگا"۔ انھوں نے جواب دیا "واہ۔ کتا تو سرہانے بیٹھا ہے"۔ میں نے کہا "بلی ہوگی"۔ انھوں نے پھر تردید کی کہ "جس گھر میں کتا ہو اس میں بلی کیسے آسکتی ہے"۔ میں نے پھر وجہ بتائی کہ "چوہا ہوگا"۔ انھوں نے اس وجہ کو بھی کاٹ کر کہا "اے لو، تم نے مجھے کوئی دیوانہ مقرر کیا ہے۔ کہیں دنیا کے پردے پر چوہے بھی سیڑھیوں پر چڑھتے ہیں اور چڑھیں بھی تو کیا ان کے پاؤں کی ایسی آواز ہوتی ہے"۔ غرض اس بحث میں آنکھ لگ گئی اور یہ نہ معلوم ہوا کہ آخر وہ کھٹ کھٹ کس چیز کی تھی۔ دوسرے تیسرے روز پھر وہی آواز آئی۔ جبتک وہ جہیں تھیں انکا تو پہلے ہی فیصلہ ہو چکا تھا خیال آیا کہ چلو دیکھ ہی کیوں نہ لیں۔ مگر بھلا کوئی اُٹھنے دیتا تھا۔ زبانی بحث ہوتی ہی اور بالاتفاق آرا اقرار پایا کہ ہو نہ ہو کوئی "اسرار" ضرور ہے۔ کیا اتنی سی بات پر آپ کہیں گے کہ

میں ڈرپوک ہوں؟

غالب کی ایک غزل

(جناب سید محمد احمد صاحب بیخود موہانی ایم اے)

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے

جوش قدح - کثرت جام شراب -

حل - معشوق کو اپنے گھر مہمان بلائے ہوئے اور اپنی محفل عیش کو کثرت جام ہائے شراب آتشیں سے چراغاں کئے ہوئے ایک مدت گزر گیا -

وجوہ بلاغت - ظاہر میں تو یہ ایک سادہ شعر ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ کئی مخالف و متضاد حالتوں کی تصویر ہے اور گوناگوں انقلابات کیفیات و حالات کا مرقع - غزل کی غزل مضمون مسلسل میں تمام ہوگئی ہے - اسکا پہلا ٹکڑا یہ ہے (مدت ہوئی ہے) مدت ہوئی نہیں کہتا صرف مدت ہوئی ایسے موقع پر بولتے ہیں جب صرف واقعہ بیان کر دینا مقصود ہو مگر (مدت ہوئی ہے) کا ٹکڑا کچھ اور کہتا ہے - اس شعر کے تمام الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کی حالت ہے جس نے کبھی اپنے دلربا کو بلایا تھا - اسکے بعد خیالات میں انقلاب ہوا صنم پرستی سے توبہ کر لی گئی - اس حالت میں بھی ایک مدت گزر گئی اور ضبط سے کام کیا گیا - پھر دل لذت آشنائے شوق نے کروٹ بدلی اور اجتناب و زہد کی زندگی بے کیف نظر آنے لگی اب ان رات وہی گزری ہوئی کیفیتیں نظروں میں پھرا کرتی ہیں آخر بے اختیار ہوجاتا ہے اور جذبات شوق کا دریا امڈنے لگتا ہے - سارے گزشتہ واقعات ہوش ربا بائسکوپ کی تصویروں اور منظروں کی طرح پے در پے نظروں کے سامنے آتے اور غائب ہوجاتے ہیں - ان تمام کیفیتوں پر صرف "مدت ہوئی ہے" اور "مہماں کئے ہوئے" کے ٹکڑے شاہد ہیں - دوسرا مصرع بتاتا ہے کہ جہاں یہ خیال آیا کہ مدت گزری وہیں اس رات کا

منظر بھی آنکھوں میں پھر گیا اور شراب آتشیں کے جام جن سے محفل میں چراغاں کی سی بہار پیدا ہو گئی تھی نظروں میں پھرنے لگے (تجوید)

اگر اس مطلع کو اسکے بعد کے اشعار کے سلسلے سے جدا کر کے اس کے مطالب پر نظر کی جا. تو دوسری کیفیت پیدا ہوتی ہے یعنی وصل محبوب کا لطف اُٹھائے ہوئے تو ایک مدت گزر گئی لیکن عاشق بعد وصل کے ایک عرصہ تک لذت وصل کے مزے لیتا رہا اور اُس کیفیت کے تصور میں ڈوبا رہا۔ جیسا جیسا زمانہ گزرتا گیا لذت تصور کم ہوتی گئی اور جب یہ کمی اس حد تک پہونچی کہ عاشق برداشت نہ کرسکا تو بے اختیار مُنہ سے نکل گیا کہ اب تو وصل محبوب کا لطف اُٹھائے ہوئے مدت گزر گئی (مدت ہوئی) کے بعد لفظ (ہے) عاشق کے دل کی بےچینی کا پتہ دے رہی ہے۔ (تجوید)

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
مدت ہوئی ہے دعوتِ مژگاں کئے ہوئے

لخت لخت ۔ پارہ پارہ، دعوت مژگاں سے مراد دعوت مژگان یار اور دعوت مژگان عاشق۔

حل ۔ اب پھر اپنے جگر پارہ پارہ کو جمع کر رہا ہوں اِس لئے کہ مژگان یار کی دعوت کئے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا یعنی اگرچہ محبت مژگان یار ایسی چیز ہے کہ اس سے دل کے ٹکڑے اُڑ جاتے ہیں۔ سمیں انتہا کی تکلیف ہوتی ہے مگر لطف زندگی اسی تکلیف میں ہے ۔ میں پھر ویسی ہی دعوت کرنا چاہتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ پھر وہ پلکیں دل کی وہی حالت کردیں جو پہلے ہو چکی ہے ۔

سادے لفظوں میں اس شعر کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جب سے عاشقی چھوٹی دل کبھی ٹھکانے نہ ہوا۔

حاشیہ :۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ مژگان یار کے متعلق شعرا کی ایسی سخن آفرینیاں محض شاعرانہ ہی نہیں ہیں ۔ بلکہ واقعہ ہیں ۔ جسکے احساسات قوی ہوں اُس سے پوچھیے وہ بتادیگا کہ معشوق کی پلکوں کے کھلنے اور بند ہونے میں عاشق کے دل پر ویسا ہی اثر پڑتا ہے جیسا تار پر مضراب کے پڑنے سے یہ شعر بھی قریب قریب اسی معنی کا ہے ۔ س

آمادہ گشتہ ام دگر امشب نظارہ را
پیوند کردہ ام جگرِ پارہ پارہ را

اگر مژگان سے اپنی مژگاں مراد لیں تو یہ مطلب نکلیگا کہ ترک عشق اور ضبط شوق کو ایک زمانہ گزر گیا ۔ اب دل بے اختیار ہوا جاتا ہے ۔ میں اپنے جگر کو جو ہزار طرح کے خیالوں کی طرف متوجہ ہونے اور پریشان رہنے کی وجہ سے جگر لخت لخت کے حکم میں تھا اب پھر ساری دنیا کے خیالات

سے یکسو کر کے اس طرف متوجہ ہوا ہوں کہ خاموش رہتے رہتے جو دل گرفتہ ہو گیا ہے اُسکا علاج کر دوں جو اسکے سوا کچھ نہیں ہے کہ یاد معشوق میں خوں فشانی کی جائے۔

طبا طبائی:۔ دعوت مژگاں نامقبول مضمون ہے اس سے زینت مژگاں بہتر ہے یعنی لخت ہائے جگر سے پھر مژگاں کو اپنی شاخ گل بنانا مقصود ہے۔

بیخود:۔ جناب طبا طبائی نے اپنے ارشاد پر کوئی دلیل نہیں قائم کی اس لئے اس پر توجہ نہ کی جاتی تو بھی مضائقہ نہ تھا مگر عوام کے مغالطے میں پڑ جانے کے خوف سے کچھ لکھنا ضروری ٹھہرا جب مژگاں کے ساتھ خون آشام کی صفت اساتذہ کے کلام میں عام ہے تو ایسی بات کہنا اساتذہ معتبر پر بے وجہ حرف رکھنا ہے۔ پھر یاد مژگان یار میں جگر اور دل کا لہو کر بہ جانا شاعری کی مشہورات میں سے ہے۔ پھر اس پر چیں بہ جبیں ہونا یعنی چہ، اب ہی جناب طبا طبائی کی اصلاح کہ "دعوت مژگاں" کی جگہ "زینت مژگاں" ہونا چاہئیے تھا۔ اس مقام پر ایک بہت ہی نازک نکتہ ہے جیسے شعر ہو یا نثر سب سے برابر کا تعلق ہے۔ "زینت مژگاں" بھی کہنا مناسب ہوتا۔ اگر مرزا نے یہ شعر محل تفاخر میں کہا ہوتا جیسے ایک مقام پر فرماتے ہیں۔ ؎

میرے دل میں نہیں وہ قطرۂ خوں جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز

لیکن یہاں بیداد شوق کا اظہار مقصود ہے اس لئے زینت مژگاں بے محل ہے۔ ؎

پھر وضع احتیاط سے رکنے لگا ہے دم برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے

حل۔ گریبان کو پھاڑے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ اب پھر ضبط شوق کا خیال اور خوف رسوائی کا پاس کرنے سے دل بھاگنے لگا ہے اب ان قیدوں سے طبیعت اُلجھتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ پھر وہی جوش وحشت ہو اور وہی آزادی شوق۔

وجوہ بلاغت:۔ اس شعر میں "پھر" کا لفظ نہایت کثیر المعنی ہے۔ اس ایک لفظ سے چار زمانوں کا تصور ہوتا ہے۔ (۱) ابتدائے عشق و شوق کا زمانہ۔ (۲) بے احتیاطیوں کا زمانہ۔ (۳) پھر احتیاط کا زمانہ۔ (۴) پھر شوق ترک احتیاط کا زمانہ۔ ؎

پھر گرم نالہائے شرربار ہے نفس مدت ہوئی ہے سیر چراغاں کئے ہوئے

اس شعر کا مطلب کہنے میں دوسرے مصرع کا مطلب پہلے اور پہلے کا آخر میں کہنا چاہئیے۔

حل سیر چراغاں یعنی نالہ ہائے شرر ریز کی سیر کو ایک مدت گزر گئی ہے اب پھر جی چاہتا ہے ابھی یہ کہہ رہا تھا کہ نالہائے شرر بار کرنے لگا۔

وجوہ بلاغت:۔ یہ شعر نہیں شاعری کی کرامت اور تصور و خیال کی قدرت نمائی کا معجزہ ہے یعنی ایک عاشق جو مدت سے ضبط شوق کئے ہوئے تھا اب ضبط سے تنگ آگیا ہے اور کہتا ہے کہ وضع احتیاط سے دم رکنے لگا اب گریباں چاک کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اسکے بعد کہتا ہے کہ سیر چراغاں یعنی نالوں کی شرر باری کا نظارہ دیکھے ہوئے ایک زمانہ گزر گیا ہے۔ یہ کہہ ہی رہا تھا کہ دل سے گرم گرم نالوں کا ایک سلسلہ بندھ گیا۔

ممکن ہے کہ یہاں پر یہ اعتراض کیا جائے کہ آخر یہ معنی کہاں سے آگئے۔ میں بکمال ادب عرض کرونگا۔ اگر یہ معنی نہ ہوتے تو مصنف نے پہلے مصرع میں یہ نہ کہا ہوتا ع

پھر گرم نالہائے شرر بار ہے نفس

بلکہ یوں کہا ہوتا ع

پھر گرم نالہائے شرر بار ہو نفس

"ہو" اور "ہے" کا فرق ظاہر ہے۔ (بیخود)

پھر پرسش جراحتِ دل کو چلا ہے عشق   سامانِ صد ہزار نمکداں کئے ہوئے

جراحت زخم۔ زخموں پر نمک چھڑکنے سے تکلیف بڑھ جاتی ہے۔

حل۔ پھر عشق زخم دل کی مزاج پرسی کے لئے لاکھوں نمکدان لئے ہوئے چلا ہے۔

وجوہ بلاغت:۔ مرزا صاحب یہ نہیں فرماتے کہ عشق پھر دل کی پرسش کو چلا ہے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ جراحت دل کی پرسش کو چلا ہے یعنی ضبط شوق یا ترک شاہد پرستی کی وجہ سے دل کا زخم صرف دب گیا تھا اب عشق لاکھوں نمکدان لے کے چلا ہے کہ دبے ہوئے زخم کو تازہ کردے۔ اس تمام مطلب پر صرف لفظ جراحت دلالت کرتا ہے۔

۲۔ "ہے چلا ہے" سے معلوم ہوتا ہے کہ پھر دل میں پرانی لذتوں کی یاد نے ہل چل ڈال رکھی ہے۔

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل   سازِ چمن طرازیٔ داماں کئے ہوئے

خامہ سے یہاں مراد موقلم ہے اور مژگاں کو موقلم کہنا بہت بدیع واقع ہوا ہے۔

حل :- پھر میں اپنی پلکوں کے قلم کو دل کے خون میں اس نظر سے ڈبو رہا ہوں کہ دامن کو خون کے آنسوؤں سے کھلا ہوا باغ بنا دوں یعنی اب پھر جی چاہتا ہے کہ لہو کے آنسو روؤں اور دامن کو رنگا رنگ رنگیں سے افشانی ہو جائے۔

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب		نظارہ و خیال کا ساماں کئے ہوئے

حل - یعنی جو زمانہ ضبط شوق میں گزرا اُسمیں دل و دیدہ میں رقابت نہ تھی اور چونکہ دونوں کو پھر معشوق کی چاہ پیدا ہوئی ہے اس لئے آنکھ اس گھات میں ہے کہ نظارۂ جمال کے مزے اُڑاؤں اور دل اس تاک میں ہے کہ خیال یار کی لذت اُٹھاؤں۔ آنکھیں محروم رہیں تو میری بلا سے' یعنی ایک سے ایک کی خواہش زیادہ ہے۔

دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے		پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے

پندار - غرور

حل - پھر دل ملامت کی گلی کے گرد پھرنے جاتا ہے اور کیونکر ؟ غرور اور خودداری کا بتخانہ ڈھا کے یعنی جہنم میں جائے احتیاط و خودداری - اب ہم پھر عاشق رسوا بنیں گے۔ کوئی ملامت کرے تو کیا کرے۔

وجوہ بلاغت - اس شعر میں الفاظ نہیں رکھے ہیں ہیرے جڑ دیئے ہیں۔ (۱) پھر سے تو وہی وسیع مطلب اس شعر میں بھی پیدا ہو گیا ہے جو اس غزل کے اکثر اشعار میں ہے۔ (۲) دوسرا قابل لحاظ لفظ اس شعر میں (طواف) ہے۔ طواف کعبہ کے گرد پھرنے کے معنوں پر عام ہے۔ فطرت انسانی کے ماہر جانتے ہیں کہ جب انسان کے دل پر کوئی قوی جذبہ طاری ہوتا ہے تو ویسی ہی امنگیں اُٹھتی ہیں اور وہی امور خواہ اخلاق فاضلہ کے موافق ہوں یا مخالف۔ انسان کو محبوب ہو جاتے ہیں اور دوسری کیفیتیں خاص کر جو اس حالت کے خلاف ہوں ذلیل معلوم ہونے لگتی ہیں اور ان میں اس کے لئے کوئی دلکشی باقی نہیں رہتی اب چونکہ عاشق کے دل میں دیرینہ صحبتوں کی یاد نے قیامت برپا کر رکھی ہے۔ گزشتہ مٹے ہوئے حالات و جذبات کے پیکر میں جان پڑ رہی ہے اس لئے اب اسکو ہر گزشتہ حالت قابل عظمت معلوم ہو رہی ہے اس لئے وہ کوئے ملامت کو ایسا مقدس پا رہا ہے کہ اسکے گرد پھرنے کو طواف ایسے مقدس لفظ سے تعبیر کرتا ہے

اور خود داری اور احتیاط کو پندار کے قابل نفرت نام سے یاد کرتا ہے اب نفس عشرت پرست احتیاط کو پندار کہتا ہے۔ احتیاط کو صرف پندار کہہ دینے سے جی کی بھڑاس نہ نکلی تو اسکو تجانہ بھی کہہ دیا۔ اس لئے کہ جب کوئے ملامت قابل طواف ٹھہرا تو ظاہر ہے کہ اسکی ضد یعنی کوئے احتیاط ایک بتکدہ ہے اور بتکدہ توحید پرستوں کی نظروں میں ڈھا دینے کے قابل ہے۔ (بیخود)

بیخود:۔ اگر یہ شعر اس غزل میں نہ ہوتا جو نظم مسلسل کے حکم میں ہے اور جسکے ایک شعر کو دوسرے شعر سے ایسی پیوستگی حاصل ہے کہ انکے علیحدہ کر لینے پر مذاق سلیم کی تیوریوں پر بل پڑ جانیکا خوف ہے تو بیشک اسکا مطلب کچھ اور بھی بیان کیا جا سکتا تھا مگر صورت موجودہ میں ایسا کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی سارے جسم کو بحالہ رہنے دے اور دل نکال لے۔ ؎

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب — عرض متاع عقل و دل و جاں کئے ہوئے

عرض کردن۔ فارسی محاورہ کا ترجمہ ہے جسکے معنی ظاہر کرنا اور پیش کرنا ہیں۔

حل۔ یعنی اب پھر جی چاہتا ہے کہ اگر کوئی خریدار ملے تو دل، عقل اور جان کو بیچ ڈالوں یعنی اب دل بے اختیار چاہتا ہے کہ کوئی معشوق ملے تو اس پر دل عقل، جان سب نثار کر دیں۔ اب یہ چیزیں قابل قدر نظر نہیں آتیں۔ (بیخود)

دوڑے ہے پھر ہر ایک گل و لالہ پر خیال — صد گلستاں نگاہ کا ساماں کئے ہوئے

مرزا نے عجب شعر کہا ہے اور انتہائے شوق میں جو کیفیت قلب انسانی کی ہوتی ہے اسکی تصویر لفظوں میں کھینچ دی ہے۔

گل و لالہ سے یہی گل و لالہ کے پھول مراد ہیں اور حسینوں سے بھی استعارہ ہو سکتا ہے۔

حل۔ کہتا ہے کہ اب جذبات شوق نے دل میں وہ آہنگ اور وہ مزا پیدا کر دیا ہے کہ ہر لالہ و گل (یا ہر حسین) کی طرف خیال دوڑتا ہے یعنی جی چاہتا ہے کہ اٹھا کے دل میں رکھ لوں یعنی اب ایک ایک پھول کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور ہر پھول پر نظر کرنے سے دل کو وہ لذت حاصل ہوتی ہے جو سو باغوں کی بہار دیکھنے سے حاصل ہوتی ہے یعنی اب جذبات کا یہ عالم ہے کہ ہر حسین یا ہر پھول ایک کلیجے سے لگا لینے کے قابل نظر آتا ہے۔ بیخود موہانی۔ ؎

بر آواز م ز بتخانہ صدائے برہمن خیزد — قبول بندگیم را خدائے برہمن خیزد

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا　　جاں نذرِ دلفریبیٔ عنواں کئے ہوئے

عنواں - سُرخی - سرنامہ - دلدار - وہ معشوق جو عاشق نواز ہو -

حل :- اب پھر جی چاہتا ہے کہ میرے پاس میرے اُس معشوق کا خط آتا جو عاشق نواز ہے اور میں اُسے اُسی حالت میں کھولتا کہ میری جان اس خیال پر صدقے ہو رہی ہوتی کہ اُس نے عنوان نامہ یعنی القاب ایسا لکھا ہوگا جسکی دلفریبی پر جان نثار کر دینے کو جی چاہے -

چونکہ معشوق کو دلدار سمجھتا ہے یعنی جو عاشق کا دل توڑنا بڑے سے بڑا گناہ سمجھتا ہے اس لئے لفافہ کھولنے سے پہلے ہی دل کو یقین ہے کہ عنوان خط نہایت دلفریب ہوگا - اگر عنوان سے لفافہ پر کی عبارت اور پتہ مراد لیں تو یہ مقصود ہوگا کہ لفافہ پر پتہ ایسا لکھا ہے جو نہایت دلفریب ہے - اور اسی لذت کی حالت میں اسے امید واثق ہے کہ جس خط کا سرنامہ ایسا دلکش ہے - اسکی عبارت اسکے مطالب کیسے دلربا ہونگے - ہ

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس　　زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

حل - اب پھر جی چاہتا ہے کہ معشوق لبِ بام آتا اور اس انداز سے کہ اپنے چہرے پر اپنی کالی کالی زلفیں بکھرائے ہوتا - یہ تصویر ایسی دلکش ہے اور اسکی خوبی ایسی واضح ہے کہ شرح کی محتاج نہیں - (بیخود)

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو　　سُرمہ سے تیز دشنۂ مژگاں کئے ہوئے

حل - پھر آرزو کا تقاضا ہے کہ کوئی یعنی معشوق سامنے کھڑا ہوا اور کیونکر - یوں کہ مژگاں کی چھری پر سرمہ کی باڑھ رکھے ہوئے یعنی اُسکی آنکھیں سرمہ آلود ہوں - (بیخود)

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ　　چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

فروغ - دمک - شراب پینے سے چہرے کا رنگ تمتما اُٹھتا ہے - سرخی دوڑ جاتی ہے -

حل - لو نگاہ پھر ایک ناز کی نئی نئی بہار کو گھور رہی ہے جسکے چہرے کا رنگ شراب کے نشہ میں گلستاں کی بہار دکھا رہا ہے -

جناب طباطبائی مصنف مرحوم نے مے اور تاک کی مناسبت سے کہدیا ہے ورنہ معانی میں چہاں یہ لفظ نہیں ہے (ڈھونڈے ہے) کہنا چاہیئے -

بیخود :- جناب طباطبائی نے غور نہیں فرمایا مصنف مرحوم نے اگر "تاکے" اور "تاک" کی مناسبت سے ایسا کہہ دیا ہوتا تو عام شعرا اور اس یگانۂ عصر میں کوئی امر مابہ الامتیاز باقی نہ رہتا - یہ ارشاد کہ یہ لفظ معانی سے چسپاں نہیں ہے ایسا ہے جس سے ذوق سلیم کانوں پر ہاتھ رکھتا ہے - یہاں "تاکے ہے" "منتخب کرے ہے" کے معنی پر کہا گیا ہے - اور یہ لفظ رکھ کر مصنف نے جذبات سخن فہم میں ایک ہل چل ڈال دی ہے یعنی اب تک تو یہ کہتا تھا کہ یہ جی چاہتا ہے یہ جی چاہتا ہے - یہ کہتے کہتے یکسوئی خیال نے وہ رنگ جمایا کہ الٰہی توبہ - ایک تصویر تھی کہ سامنے آ کھڑی ہوئی اور وہ عالم تصور میں معشوق کو اس انداز سے دیکھ رہا ہے کہ اُسکے چہرے پر شراب پینے کے اثر سے سرخی دوڑی ہوئی ہے اور وہ سراپا ناز اور سراپا بہار بنا ہوا ہے جب یہ صورت نظر آئی تو دل میں اور شوق پیدا ہوا - ؎

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں ۔۔۔ سر زیرِ بارِ منتِ درباں کئے ہوئے

منت - احسان -

حل - جی چاہتا ہے کہ پہلے جس طرح درباں کے احسان مند بن کر دربار پر پڑے رہتے تھے اُسی طرح پھر پڑے رہیں - یعنی اب سے پہلے جب تک ترک شوق کا زمانہ تھا کسی کے دروازے پر بیواؤں کی طرح پڑ رہنا اور درباں کے سے ذلیل آدمی کا احسانمند ہونا خلاف شان نظر آتا تھا - اب جب کہ دل بے قابو ہو رہا ہے تو انھیں باتوں کی تمنا ہے - ؎

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن ۔۔۔ بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے

حل - اب سے پہلے ایک زمانہ تھا کہ ساری دنیا کو ہیچ کر کے بلکہ بھول کر آٹھ پہر (چونسٹھ گھڑی) معشوق کا تصور باندھے بیٹھے رہا کرتے تھے - اب ویسے ہی فرصت کے رات دن کی پھر آرزو ہے یعنی ہائے وہ زمانہ بھی کیا مزے کا زمانہ تھا - (بیخود)

غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے ۔۔۔ بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے

تہیہ کرنا - ٹھان لینا -

حل - اے غالب ہم کو نہ چھیڑ نہیں تو غضب ہی ہو جائیگا - ہم جوش گریہ سے طوفان اُٹھانے کی ٹھانے بیٹھے ہیں یعنی ہمارا دل اُمنڈ رہا ہے تو نے چھیڑا اور ہم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے -

جناب طبا طبائی:۔ مصنف نے یہاں طوفان کے معنی طوفان برپا کرنے کے لئے ہیں۔ اسکی سند ملنا مشکل ہے۔"

بیخود:۔ مصنف نے طوفان کے معنی طوفان برپا کرنے کے تو نہیں لئے ہیں بلکہ تہیہ طوفان کے معنی طوفان اُٹھانے کے ارادے کے لئے ہیں۔ اسکی مثالیں عام ہیں مثلاً ہم تہیہ کربلا یا تہیہ زنداں کئے بیٹھے ہیں یعنی ہم کربلا یا جیل جانے کا پکا ارادہ کئے بیٹھے ہیں۔ یوں ہی اگر ایک ایک عام لفظ پر سند مانگی جائیگی تو سوا خاموشی کے اسکا جواب اور کیا ہو سکتا ہے۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ مقطع کچھ الگ سا ہے مگر حقیقت اسکے خلاف ہے۔ مذکورۂ بالا خیالات کے اظہار کے بعد رقت قلب اور گداز طبیعت اس حد کو پہونچی کہ زبان سے نکل گیا ؎

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوش اشک سے — بیٹھے ہیں ہم تہیہ طوفاں کئے ہوے

یا یوں کہیے ۔ کہ تصور کی بنائی ہوئی دنیا کیف تک رہتی، خیال آہی گیا کہ یہ سب تصور و خیال و شوق کی صورت نگاری تھی گویا آنکھ کھلی تو کچھ نہ تھا۔ اب رونا بے محل ہے۔ بیخود

جناب چودھری محمد وزیر حسن صاحب نشترؔ سندیلوی تلمیذ حضرت آرزوؔ لکھنوی

ہر برگ گل زباں ہے اور ماجرائے بلبل — گلشن میں گونجتی ہے اب تک نوائے بلبل
بلبل ہے اور گلستاں۔ غربت ہے اور میں ہوں — میرا خدا نہیں کیا تو لے خدائے بلبل
ہنستے ہیں کچھ بہت گل یہ جی لرز رہا ہے — سنسان ہو نہ جائے بستاں سرائے بلبل
یہ حسن و عشق دونوں کی آخری حدیں ہیں — بلبل بجائے گل ہے گل ہے بجائے بلبل
کہتی ہے سرخی گل خونریزیوں کا قصہ — مٹ مٹ کے اور ابھرے نقش وفائے بلبل
الفت بُری بلا ہے، کل کیا تھا آج کیا ہے — عبرت کا ماجرا ہے ہر نقش پائے بلبل
صیاد کی نگاہیں پڑتی ہیں آشیاں پر — برگشتہ ہو رہا ہے بخت رسائے بلبل
چٹکی کلی کہ ٹوٹا اک آرزو بھرا دل — سنکی ہوا کہ آئی آواز ہائے بلبل

دل شق ہوئے پھبی ہے ہمصورت گل تر
یہ اور کس سے ہوتا نشترؔ سوائے بلبل

بھگوت گیتا پر ایک نظر

(جناب مشیر احمد صاحب علوی بی اے علیگ)

ہر ملک کا ایک مخصوص مذاق رہا ہے جس میں اُس نے غیر معمولی کمال حاصل کیا ہے اور جس کے لحاظ سے اُسے دوسری اقوام عالم پر نمایاں تفوق و امتیاز حاصل ہوا ہے فلسفہ کی اشاعت ہر ملک میں ہوئی لیکن یونان کی سی شہرت کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ قانون ہر قوم نے وضع کیا لیکن رومہ کی آب ہوا اُسے خاص طور سے راس آئی۔ حسن و عشق کو ہر ملک نے اپنی بساط کے موافق سراہا لیکن نجد کی سرزمین سے زیادہ کس نے حصہ لیا۔ ہندوستان کا مخصوص دائرہ عمل تصوف و روحانیت رہا ہے۔ یہاں اس فن لطیف کو جس حد تک پہنچا یا گیا اُسکی نظیر شاید دُنیا کے کسی حصہ میں نہ ملے۔ گوتم بدھ کی تعلیمات تو تمام تر تصوف تھیں۔ خود ہندو مت میں طریقت کا عنصر شریعت پر غالب ہے۔ یہاں کے پیشوایان طریقت کا درجہ غالباً دنیا کے رہبران شریعت سے کم نہیں۔

ہندی ادبیات میں میرے نقطۂ خیال سے اگر کوئی کتاب رامائن کے بعد ایسی ہے جسکا نام سُنتے ہی ایک ہندوستانی کی رگ و پے میں مسرت و احترام کی روحانی لہریں دوڑ جاتی ہیں تو وہ یقیناً ویاس کی شاہکار گیتا ہے۔ ادبی شان صوفیانہ خیال اور تاریخی نکات سے وہ آپ اپنی نظیر ہے اُسکا طرز بیان اس قدر سادہ، دلاویز سلیس اور پاکیزہ ہے کہ ادبیات شرقیہ سے معمولی دلچسپی رکھنے والا بھی مصنف کی سحر البیانی سے مستفید ہو سکتا ہے۔ اور اسکی رنج میں خود ناظر کی ذات محو ہو جایا کرتی ہے۔ موزوں الفاظ کے انتخاب اور مناسب اسالیب بیان اختیار کرنے میں ویاس ہمیشہ برمحل اور عام فہم ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ تخیل کی فراوانی اور دلفریب تشبیہات کے انتخاب میں وہ اپنا ثانی نہیں رکھتا ویاس کے مقابلہ میں امرالقیس متنبی، فردوسی، محتشم کاشانی کو پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ویاس کا

بلیغ طرز بیان اور ارفع موضوع اس درجہ فرح بخش ہے کہ جب ہم ویاس کی تصانیف پڑھتے ہیں نت نئے محاسن ہم کو نظر آیا کرتے ہیں۔ گیتا میں ویاس نے انیس کی طرح سیرتوں کے خدوخال کچھ اس درجہ لطیف اور نادر طریقے سے پیش کئے ہیں کہ ہر شخص کو خواہ وہ کسی نسل یا مذہب سے کیوں نہ تعلق رکھتا ہو مجبور ہو کر ویاس کے حضور میں سر نیاز خم کرکے اس کی راہبانہ عظمت اور شاعرانہ قادر الکلامی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

والمیک اور ویاس کے کلام پر رام چندر اور کرشن کے اسمائے گرامی نے آب حیات چھڑک دیا جس کی بدولت اب تک ان کے کلام میں وہی تازگی اور نزاکت ہے۔

سنسکرت کی شاعری سمجھنے کے لئے حسب ذیل امور ذہن نشین کرنا ضروری ہیں۔

(۱) سنسکرت کے قدیم شعرا زیادہ تر راہب اور تارک الدنیا تھے۔ دیکھیے رام چندر کا محل۔ جہانبانی ایک شاعر والمیک کے حضور میں جھکتا ہے اور دعا کا طالب ہے لیکن شاعر خود دربار میں نہیں جاتا۔

(۲) سنسکرت کی شاعری میں لطف سخن اصول مذہب تاریخ اور علم ادب کو اس طریقے پر ملایا گیا ہے جیسے برہما جی کے سر میں چار موتی آشکار ہیں۔ اصول مذہب کی وضاحت کے لئے تمثیل کی ضرورت نہیں پڑتی۔ تاریخ کو وقائع اور تفصیل کے خارزار سے نکال کر اصول مذہب سے استوار کیا گیا ہے علم ادب اور لطف سخن کو تو حاجت بیان ہی نہیں۔

(۳) قدیم زمانہ میں آریہ قوم کی قناعت پسندی اور رجحان روحانی نے ان کی ضروریات کو ہندوستان کی قدرتی پیداوار تک محدود رکھا تھا۔ اس سے تجارت و تمدن کی ضروریات اور حضرت انسان کی دستکاریوں سے مناظر قدرت محفوظ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سنسکرت کی شاعری میں استعارات و تشبیہات رموز معرفت اور کرشمہ ہائے قدرت سے مالا مال ہیں بعینہ یہی حال عربی شاعری کا بھی ہے۔ وہاں بھی ابو نواس ابو العتاہیہ ابو العلا معری ابو تمام اور متنبی کے کلام نادر استعاروں اور لطیف تشبیہوں سے مملو ہیں۔ والمیک کی رامائن ادائے فرض و صداقت عمل کا بے مثل مرقع ہے۔ اسے تاریخ کہیے، تمثیل کہیے، تصویر کہیے۔ اس امر سے انکار نہیں ہو سکتا کہ والمیک کے لوح دل پر رام چندر کے طرز عمل کا ایسا گہرا نقش قائم تھا کہ اگر وہ بجائے رامائن کے کوئی دوسری کتاب لکھتے تو بھی وہ کتاب انہیں اثرات کے تحت میں لکھی جاتی۔

ویاس کی تصنیف مہابھارت کہنے کو تو ایک خانہ جنگی کی منظوم تاریخ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک خزانہ ہے جس میں ادب تاریخ اور تصوف کے بیش بہا جواہر موجود ہیں۔ مہابھارت کی تصنیف کا مقصد گو

بنفسہ دنیاوی تھا لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ گیتا کے فلسفہ نے اس کتاب کو جزائے اخروی کا باعث بھی بنا دیا ہے۔

میرے خیال میں ویاس کی تصنیف کا مطالعہ جس قدر مسرت انگیز ہے اس سے زیادہ لطف افزا۔ ہندوستان کی ادبیات میں جو متعدد اخلاقی شہ پارے ہم کو آج بیسویں صدی کی بجلی کی تیز روشنی میں نظر آتے ہیں ان میں گیتا میرے نقطہ خیال سے سب سے زیادہ درخشاں ہے۔ اسکی ضیا باری میرا عقیدہ ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک میں برابر ہوتی رہیگی اور انسان کو اس منزل مقصود تک لیجائیگی جسکی جانب مکمل طریقے سے انسانیت دیوانہ وار بڑھ رہی ہے۔

گیتا کا پیام امن شانتی محبت اور پریم ہے گیتا کا مصنف اپنی لاثانی بانسری سے پریم محبت شانتی اور امن کے محبت نواز نغمات چھیڑتا ہے اور دنیا کو مسرور و مسحور کر دیتا ہے۔ گیتا کی تعلیم یہ ہے کہ انسان کو عیش رنج، بلکہ ہر حالت میں اپنے فرائض مفوضہ کو بہترین و احسن طریقے پر انجام دینا چاہیے۔ ہندوستان میں والمیک و ویاس کو خوش قسمتی سے وہی درجہ حاصل ہے جو ایام سعادت کے (عرب) میں حسان بن ثابت کو یا ایام جہالت میں امرالقیس کو ان لوگوں نے شاعرانہ سحر کاریوں کا مفہوم خوب سمجھا، اور صحیح سمجھا اور جذبات سے عوام کے فائدہ اٹھایا۔ والمیک نے رام چندر کا زبردست کیرکٹر پیش کیا اور دنیائے عقیدت نے اسکے حضور میں گردنیں خم کر دیں۔ ویاس نے کرشن کے کلمات کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ بہرحال یہ شاعری کی تنقید ہے اور اسکو اس موقعے پر پیش کرنا کچھ زیادہ مفید نہیں ہے اس لئے ہم کو کرشن کی تعلیمات کا ایک تبصرہ کرنا چاہیے۔ میں یہی کہہ رہا تھا کہ کرشن کا پیام پریم ہے اور یہ بلند آواز سے کہتا ہے کہ انسان کو عیش میں خدا کو نہ بھولنا چاہیے اور مفوضہ امور کو احسن طریقے سے انجام دینا چاہیے۔ انجام سے بے پروا رہنا چاہیے۔ اُسے محض نیکوکاری کا خیال کرنا چاہیے۔ کیونکہ عبادت فرض کی ادائیگی کے خیال سے کرنا مسرت بخش ہے۔ زندگی کو نیکی کی خاطر گزارنا چاہیے۔ نیکی کو نیکی کی خاطر کرنا اور فرض کو فرض کی خاطر کرنا گیتا کا مخصوص پیام ہے۔ جب ہم دنیاوی مصائب و آلام میں مبتلا ہوں۔ جب رنج پریشانیاں ناکامیاں اور مایوسیاں ہمارے قلب و دماغ پر مسلط ہو جائیں۔ تو اُس وقت بھی ہم کو مساعی جلیلہ سے ہمت نہیں ہارنا چاہیئے۔ بلکہ گیتا کی تعلیم یہ ہے کہ اُس حالت مایوسی میں بھی ہم کو حتی الامکان مساعی جمیلہ سے احتراز نہ کرنا چاہیے۔ اور مردانہ وار اُن مصائب کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ مسٹر ناگر گھراتی کا یہ خیال بالکل

صحیح ہے کہ گیتا ایک آئینہ ہے جسمیں ہر شخص اپنا عکس اپنے خیال میں دیکھتا ہے۔ اور اس آئینہ میں ذہن انسانی کے ہر پہلو کا عکس نظر آتا ہے۔ یہی وہ پہلا کلام ہے جو ایک ہندوستانی پیغامبر روحانیت کی زبان سے نکلا اور اسکا تعلق تاریخ عالم و تاریخ ہندوستان دونوں سے برابر ہے۔ میرا خیال ہے کہ انسان کو جب تک اپنی نسل کی تاریخ سے دلچسپی باقی رہیگی اور محققین و روحانیین اپنے کتبخانوں کی صحیح الماریوں اور عجائب خانوں کی بیش قیمت میزوں میں ازمنہ پارینہ کے آثار و صنادید جمع کرتے رہینگے۔ اس وقت تک (اس دعوی میں کوئی شبہ نہیں ہے) اُن خاص کتابوں کی فہرست میں جو انسانی نسلیں ہمیشہ سے اپنی زاویۂ نگاہ سے منتخب کرتی چلی آئی ہیں۔ یقیناً گیتا کا بھی نام باقی رہیگا۔ ازمنہ قدیمہ کے اس لازوال خزانہ کو ہندوؤں نے اپنے ورثہ میں پایا جسکو ہندوستان کی مقدس سرزمین اور پوتر دریاؤں کی ابیاری کئے ہوئے وادی فردوس میں کائنات کی تعلیمات کا اولین درس خدائے عشق کرشن نے دنیا کو دیا جو آج تک مختلف رنگ آمیزیوں کے ساتھ بھی رائج ہے۔

کچھ عرصہ سے علمائے متبحر اور روشن خیال برادران وطن نے یورپ کی دیکھا دیکھی اپنے اپنے خیال کے مطابق گیتا کی تفاسیر لکھنے کی کوششیں کیں لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ مشہور محبوب وطن مسٹر تلک آنجہانی کی شاہکار تفسیر "دی گیتا رہس یم" سب سے بہتر ہے۔ مسٹر تلک نے اس تفسیر میں گیتا کی اہمیت نہایت درجہ تفصیل سے بیان کی ہے۔ گنجان چھپائی کے تقریباً ایک ہزار صفحات کی ضخیم جلد میں لائق مصنف نے کانٹ مِل اسپنسر اور گرین کے اقوال سے نہایت درجہ قابلیت سے موازنہ کیا ہے۔ یہ کتاب بھگتی یوگ۔ گیان یوگ۔ اور کرم یوگ پر لاتعداد معلومات کا ایک بے شبہہ خزانہ ہے۔ مسٹر تلک کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ اگر موضوع کتاب کو کسی ایسے عالیشان شہر سے تشبیہ دی جائے جس میں کئی دروازے ہوں۔ تو اُسکا صدر دروازہ یقیناً کرم یوگ ہوگا۔ بے غرضانہ افعال کا فلسفہ یہ اُس فردوسی نغمہ یعنی گیتا کا منترہ ہے۔ مسٹر تلک نے فلسفہ کے اس پہلو کو بھی نمایاں کرنے میں بہت سعی کی ہے۔ اور بہت بڑی حد تک اس مقصد عظیم میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ مگر افسوسناک واقعہ ہے کہ ہندوؤں کی ایک کثیر جماعت ان جملہ تفاسیر کو مغویانہ اشتراکی اور ناستک یعنی سرمایۂ الحاد تصور کرتی ہے۔

انفرادی مسرت کے متعلق گیتا جو نصب العین پیش کرتی ہے اُسکا مفہوم یہ ہے کہ ذہن انسانی کی تربیت اس طرح کی جائے کہ وہ رنج و راحت سے متاثر نہ ہو۔ مشکلات میں اُسکے پائے ثبات کو

لغزش نہ ہو۔ اور خوشی میں بہک نہ جائے بلکہ عیش و مصیبت دونوں حالتوں میں ذہن انسانی کا توازن برابر رہنا چاہیئے یہی تعلیمات ہمارے صوفیائے کرام کی نویں صدی ہجری سے ماقبل تھیں اور جو آج بھی مختلف رنگ آمیزیوں کے ساتھ متعدد اشکال عجیبہ میں نام نہاد خانقاہوں میں پائی جاتی ہیں ؎

زاہد تجھے لذت ہی نہیں عشق بتاں کی
اس راہ میں تو کفر ہے ایماں سے بھی اچھا
(ریاض)

سنیاس یوگ یعنی ترک دنیا کے زاہدانہ مطمح نظر اور اس نصب العین میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ انسانوں اور قوموں کی تاریخ میں اس مسئلہ کو ایک خاص امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ شو فن ہار کو تو گیتا سے جو فوائد حاصل ہوئے ہیں وہ ہر آئینہ مسلم ہیں۔ اور آج بھی ہندوستان کے متصوفین کے متعدد خانوادوں میں گیتا کی تعلیم دریات میں شامل ہے۔

اکثر افراد کا یہ خیال ہے کہ ہندو مت ایک مذہب ہے لیکن میں مسٹر "جنپرادرکر" کا ہمخیال ہوں کہ ہندو مت کوئی مذہب نہیں۔ بلکہ یہ ایک تمدن ہے "ایک تہذیب ہے" اسکا ایک خاص تہذیبی پیغام ہے اور تخیل و ترقی دونوں حیثیات سے عجیب و غریب ہے جنکی معلومات کی بنا پر قدیم اخلاق کا نظام قائم کیا جا سکتا ہے۔

اگر ہندو مت کی طویل اور گوناگوں تاریخ میں کبھی کبھی افراد مطامع نظر پر عمل پیرا ہونے میں ناکام رہے ہوں اور خود غرضی یا جہالت کی بنا پر انھوں نے اپنی نیت کے اساسی اصول کو مدنظر نہ رکھا ہو تو کسی شخص کو میری ناقص رائے میں مصنفین تہذیب کی انگشت نمائی نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ہر مذہب کی تاریخ میں ہمیشہ ایک عجیب و غریب باب نظر آتا رہا ہے اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مظہر ناگزیر بھی ہے۔ بانیان مذاہب اپنے متبعین کے سامنے اپنی حیات میں کچھ نصب العین پیش کرتے ہیں اور چند مخصوص اصول کردار کی تعلیم دیتے ہیں اور اپنی حیات کو نامکمل یا مکمل کر کے دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ لیکن انکے حواریین نفسانیت حرص و ہوس میں خدا معلوم کیوں مبتلا ہو کر واضع مذہب کی دلکش تعلیمات کو فراموش کر دیا کرتے ہیں اور راست بازی کی شاہراہ کو چھوڑ کر جو ان زبردست داعیوں نے انکے لئے تجویز کی تھی ہٹ جایا کرتے ہیں۔ اسکا فطری انجام یہ ہوا کرتا ہے کہ منافقت و ریاکاری کا دور شروع ہو جاتا ہے اور مذہب کے

ارکان بہت جلد فراموش ہوجاتے ہیں اور فروعات کی پابندی کی وجہ سے اوہام باطلہ اور لایعنی عقائد کا دور شروع ہوجاتا ہے۔

ہندویت کا تہذیبی پیغام اُسکے نفع بخش اصول کردار اُسکے پُرشکوہ مطامح نظر اور روح کو بلند کرنے والے جذبات اُسکی معاشرتی تنظیم اُسکا ورن اشرم دھرم ہم کو یہ بتلاتے ہیں کہ انگلستان کے مشہور فلسفی بنتھم کا یہ مقولہ گیتا کے لئے کس حدتک بالکل صحیح اُترتا ہے۔ بنتھم کا یہ خیال ہے کہ ہر سیاسی معاشرتی غرضکہ ہر دنیاوی نظام کا اخلاق معیار اُسکے نزدیک یہی ہے کہ اُس سے غالب ترین تعداد افراد کو اکثر ترین منفعت حاصل ہوسکے۔ چنانچہ یہ اعلیٰ تخیل ہم کو بتلاتا ہے کہ گیتا نے انسانی تہذیب اور بیش ترین مفاد بہ اکثر افراد کی تاریخ میں جیسے وہ مرتب کرچکی ہے اور آج بھی مرتب کررہی ہے اہم حصہ لیا ہے۔

بنی نوع انسان کے محسنین کی فہرست میں متعدد صوفیائے کرام و اولیائے کرام کے اسمائے گرامی سنہرے حروف میں آج بھی منقوش ہیں۔ بے شبہ مسلمان اور ہندوں کا یہ مقدس گروہ بے لوث زہد و عبادت کا عادی تھا۔ اُنھوں نے اپنی زندگی کو اپنے پالنے والے اور خاک سے پیدا کئے ہوئے ناچیز لیکن اشرف المخلوقات کی خدمت کے لئے وقف کردیا تھا۔ اس امر کے ثبوت کی شہادتیں موجود ہیں کہ ایسی مفید خلائق بزرگ و برتر ہستیاں ازمنہ ماقبل تاریخ کے ہندوستان میں بھی پیدا ہوچکی ہیں وہ لوگ نہ تو ان ذہنی خودساختہ مراسم کے پابند تھے جو روزانہ نئی انجمن و مذاہب صنع کرنے کے کوشاں رہتے ہیں اور نہ وہ فقہا کی جماعت میں ہوتے تھے جو مذہب کی لطیف حرارت کو فلسفہ کی تیز برودت میں سرد کرنا چاہتے ہیں جو اُن بدنام سادھوئں کی قسم سے بھی نہ ہوتے تھے جو مذاہب عالم کے پردے میں معاشرتی مفت خوروں کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ برخلاف اسکے وہ تو خالق اکبر کے پرستار اور اُسکی مخلوق کے سچے خادم ہوا کرتے تھے اُنکو مذہب و نسلی تفاوت سے کچھ علاقہ نہ ہوتا تھا۔ اُنکا شوق عبادت اتنا ہی پرزور ہوتا تھا جس قدر اُنکی یہ آرزو ہوتی تھی کہ سماج میں گرے ہوئے مقروضہ ذلیل برادران وطن کو اُبھارنے کی مبارک سعی کی جائے۔ یہ خدمت مخلصانہ ہوتی تھی وہ دوسری جانب خالق اکبر کی رحمت کاملہ پر اعتقاد رکھتے تھے اور نہایت درجہ عجز و نیاز سے اپنے پیدا کرنے والے ارحم الراحمین سے رحم کے امیدوار ہوتے تھے۔ اس زبردست روحانی قوت کی امداد سے جو ان میں تصوف کی آگ سے پیدا

ہوچکی تھی وہ بنی نوع انسان کی خدمات کے لئے ہمہ تن تیار رہتے تھے اور اگر عبد و معبود میں کوئی معاشرتی مراسم اور فرقہ وارانہ پابندیاں حائل ہوتی تھیں تو وہ اُن سب کو توڑ ڈالتے تھے۔ اُن کی زندگیوں کا صرف ایک تسکین دہ جوش مسرت تھا جو پر جوش عبادت کی وجہ سے پیدا ہوجایا کرتا تھا اُسکا واحد سہارا وہ خوشی ہوتی تھی جو انسانوں کو اپنے ہمخیال افراد کی خدمت و صحبت سے حاصل ہوتی تھی۔ وہ بھگت کہلاتے تھے اور اُنکا مذہب بھاگوت دھرم کہلاتا تھا۔ میتھو آرنلڈ کے خیال کے مطابق اُنکا یہ عقیدہ للّٰہیت کسی قدر تاثیر آمیز اخلاق کا ساتھا۔ اُنکا عقیدہ گو میرے نقطۂ خیال میں افلاطون کے الفاظ میں محض یہی تھا کہ "خدا ہی واحد حقیقت ہے"۔ لیکن بھگتوں کی ایک جماعت "سب کچھ خدا ہی ہے" کی قائل تھی! کچھ عرصے کے بعد ان بھگتوں میں ایک فرقہ اس عقیدہ کا پیدا ہوا کہ "خدا ہی سب کچھ ہے"۔ اور بعض افراد نے یہ مزید اضافہ کیا کہ "خالق اکبر کو ماورائے خیر و شر سمجھنے لگے۔

ان شیوں نے خدا کو اپنی ذات سے خارج نہیں بلکہ اپنے قلوب کے سب سے زیادہ اندرونی گوشہ میں پایا۔ اُنھوں نے کبھی یہ خیال نہیں کیا کہ تیرتھ، ریاضت، زہد اور دیگر جسمانی تکالیف مذہب میں لوازمات ہیں۔ اُنکے نقطۂ خیال سے صفائی قلب، تزکیہ نفس، بے لوث خدا کی محبت بھی خدارسی کے لئے ضروری لوازمات ہیں چنانچہ ایک مشہور رشی رام دلبھ نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے کہ "میرا پنڈھر پور یعنی تیرتھ نہیں ہے۔ ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ خدا یہاں ہے جب کہ تمام عالم اس سے معمور ہے"۔ اسی طرح گیتا کے مصنف حقیقی کرشن نے کہا ہے کہ "میں نہ بہشت میں رہتا ہوں اور نہ یوگیوں کے دلوں میں، لیکن میں وہاں رہتا ہوں جہاں میرے بھگت جلال کے نغمات بلند کرتے ہیں"۔

انکی للّٰہیت کا ایک قابل ذکر پہلو یہ بھی ہے کہ حصول خدا کے لئے وہ کسی وسیلے کے قائل نہ تھے۔ چنانچہ سری کرشن بیان کرتے ہیں کہ "میں نہ ویدوں کے مطالعے سے ملتا ہوں اور نہ ریاضت، خیرات یا قربانیوں سے۔ تم صرف ایک فرضانہ عبودیت کے ذریعے سے مجھکو پا سکتے ہو"۔

یہ ہے بھگتی یوگ کا لُب لُباب جسکو بھگوت گیتا نے نہایت درجہ شرح و بسط سے بیان کیا ہے۔ شاید کوئی یہ اعتراض کرے کہ اکثر سادھو اپنے مرشدوں سے امداد کے جویاں رہتے ہیں لیکن اُن کو معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ حیثیت ایک استاد کی ہوتی ہے جو اُن کو نور معرفت کے حصول کے ذرائع بتلا دیتا ہے۔ اور جہاں اُنکو ایک مرتبہ طلسم روحانی کا سُراغ مل گیا تو وہ آزاد ہوجاتے تھے اور خدا کا تخیل قائم کرکے ذات مطہر باری کی

مشاہدہ کرتے تھے۔ ایک مشہور یوگی تکارام نے خوب کہا ہے کہ "اے احکم الحاکمین مجھے ایک بچہ کی سادہ لوحی عنایت کر اور صرف ایک عرض قبول کر لے کہ میں تجھکو نہ بھولوں"۔

اسی سلسلہ میں صفائی قلب کے متعلق بھی ہندو یوگیوں کا تخیل بہت ارفع تھا۔ ایک قصہ کسی خانقاہ کا میں نے سنا ہے کہ کسی سادھو کے ایک چیلہ کی بابت مشہور ہے کہ وہ تزکیہ نفس کے لئے جاترا کو جانا چاہتا تھا وہ اپنے گرو کے پاس اجازت حاصل کرنے کے لئے گیا اور عرض کیا بھگوان میں بنارس جانا چاہتا ہوں تاکہ گنگا اشنان سے اپنے گناہوں کو دور کردوں۔ براہ کرم میرے ساتھ چلیے۔ گرو نے کہا نہیں۔ تم میری طرف سے یہ کدو لیجاؤ اور گنگا میں دھوکر واپس لے آنا۔ چیلہ گنگا میں نہا دھوکر واپس آیا اور کدو گرو کی خدمت میں پیش کیا کہ مہاراج لیجیے میں اسکو غوطہ دے کر بہت احتیاط سے واپس لایا ہوں۔ گرو نے کہا اسکو توڑکر دیکھو کہ اسکی تلخی دور ہوئی یا نہیں۔ چیلے نے جواب دیا نہیں۔ تلخی اسمیں موجود ہے۔ گرو نے کہا بیشک گنگا جل جب اسکی تلخی کو دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا تو اس سے انسانی معاصی کس طرح دھل سکتے ہیں اور قلوب کس طرح پاک ہوسکتے ہیں"۔ اصل میں قلب دماغ کو پاک رکھو گناہ دھل جائیں گے۔ بیرونی غسل اندرونی صفائی کے لئے غیر موثر ہے۔ یاد رکھو بغیر صفائی قلب کے کچھ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اسی مفہوم کو خیام نے خوب ادا کیا ہے۔ ع

شیخ بہ زن فاحشہ گفتا مستی ؟ کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی
زن گفت چنانکہ می نمایم ہستم تو نیز چناں کہ می نمائی ہستی

کیا آج کسی مذہب کا مسئلہ تزکیہ نفس اس سے زیادہ رفیع ہے۔

"ڈاکٹر بسنٹ نے بالکل سچ کہا ہے کہ" بھگوت گیتا کتاب نہیں بلکہ پوری نسل اور کل زندگی کا صحیفہ مقدسہ ہے۔ ہر زمانہ کے لئے ایک نیا پیغام اور ہر تمدن کے لئے ایک نیا حکم اس میں موجود ہے کسی زمانہ میں اگر اس نے ہندوستان کو تعلیم دی تھی کہ" دھیان کرو" اس پر ہندوستان نے اس قدر غلو کے ساتھ دھیان کیا کہ اسکا دھیان مبدل بہ غنودگی ہوگیا۔ اب وہ ہندوستان کو للکارتی ہے کہ" عمل کر" یہ آواز سارے ملک میں گونج رہی ہے اور ہر جگہ ذوق عمل کو بیدار کر رہی ہے لیکن عمل مفید اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب وہ دانشمندانہ بھی ہو۔ عمل فیض رساں اسی وقت ہوگا جب وہ مفاد عام کو اپنا مطمح نظر بنائے اور رضائے الٰہی کو ہم آہنگی کے ساتھ پورا کرے۔

مسٹر آرنلڈ کا خیال یہ ہے کہ "یہ کتاب سادہ لیکن ارفع زبان میں اس نظام فلسفہ کو آشکار کرتی ہے جو آج تک رائج الوقت برہمنی عقیدہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اسی وجہ سے کہ اس میں کپل تجلی اور ویدوں کے مسائل کا امتزاج کیا گیا ہے۔ اسکے بیانات اس قدر بلند آرزوئیں ایسی ارفع اور تقوی اتنا نازک اور پاکیزہ ہے کہ شلیگل اس نظم کے مطالعہ کے بعد کیف مسرت سے چلا اُٹھتا ہے اور اُسکے نامعلوم مصنف کی ستائش کرنے لگتا ہے۔

مسٹر لاسین نے اس شاندار اعتراف کو دُھرایا ہے اور خود بھی یہ صداقت نامہ دیا ہے کہ گیتا میں جو اخلاق بتائے گئے ہیں وہ اس قدر پُراثر ہیں۔ اور اسکی اور عہد نامہ جدید کی تعلیمات میں اس قدر گہرا اور بسا اوقات لفظی تطابق پایا جاتا ہے کہ آج فریقین کے مبلغین کے درمیان یہ مسئلہ مابہ النزاع بن گیا ہے کہ آیا اسکے مصنف نے مسیحی ماخذوں سے گیتا کو اخذ کیا ہے یا جامعان انجیل اور حوارین نے خود یہ انجیل اس سے اخذ کی ہے۔

گیتا کی تعلیمات پر مکمل تبصرہ انشاء اللہ بہت جلد کتابی شکل میں پیش کیا جائیگا۔ یہ ایک ہلکا سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔ اصل مضمون میں نے "مسلم اکاڈمی" کے ایک جلسہ میں پڑھا تھا۔ وہ مضمون بہت طویل تھا اس لئے اُسکے مقدمہ کا خلاصہ پیش کر دیا گیا ہے تاکہ ناظرین و ناظرات! "ادب" بھی اُس مضمون کو کسی حد تک پڑھ سکیں۔ یہ ضرورت یوں پیش آئی تاکہ ہمارے برادران وطن کو یہ معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں کو اُنکے مذہبی دریات کے پڑھنے سے عار نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرچشمۂ علم ہی ایک ایسا لازوال و مبارک خزانہ ہے جو تعصب کی مسموم فضاؤں سے دُور ہے اور اُسکے لاثانی گھاٹ ہر شخص کے لئے کھُلے ہوئے ہیں۔ میں نے ارادہ کیا ہے کہ آیندہ "ادب" میں ہر ماہ ایک ڈرامہ ہندو ادبیات سے اخذ کرکے نذر کیا کرونگا چنانچہ میرا خیال ہے کہ میں آیندہ ماہ میں شکنتلا کا ڈرامہ مع مقدمہ پیش کرنے کی جرأت کرونگا۔ اور اُسکے بعد سیتا اور ساوتری۔ فریقین کو مذہبی دریات پڑھنا چاہیے۔ اور اُسی وقت جب دوسرے کی مذہبی معلومات سے ہماری آنکھیں نور حاصل کرینگی۔ ایسے اُن کے مناقشات مذہبی یک لخت دور ہو جائینگے!۔

نوٹ:۔ اس مضمون کی تیاری میں بہت سی کتابوں اور رسالوں سے امداد لی گئی ہے۔ فہرست میں نے اس لئے نہیں دی کہ مضمون بہت طویل ہو جاتا۔ مبشر احمد

فریبِ ہستی

(جناب سراج لکھنوی۔ مدیر "مبصر")

ایک دھوکا ہے، یہ آئینۂ فطرت کیا ہے
بے خبر دیکھ تو۔ دنیا کی حقیقت کیا ہے

کبھی اس مسئلے پہ غور کیا ہے تونے
فکر سے عقل سے کچھ کام لیا ہے تونے

حدیں ہر شے کی معین نہ کوئی بیش نہ کم
ایک ہی رنگ پہ قائم ہے نظامِ عالم

کرۂ ارض کی گردش، سحر و شام ہے کیوں؟
کس کی ہے اسکو تلاش اور یہ ناکام ہو کیوں؟

اختلاف اسمیں ہے، کچھ تجھ کو خبر ہی کہ نہیں؟
نیلگوں چرخ بریں حدِ نظر ہے کہ نہیں؟

دن کی محفل ہے جُدا۔ رات کی محفل ہے جُدا
ایک منزل سے غرض دوسری منزل ہے جُدا

کیا یہی سلسلۂ راز رہیگا تا حشر؟
یہی عالم یہی انداز رہیگا تا حشر؟

یہ کوئی شعبدہ ہے، کوئی نظر بندی ہے
کبھی اس بات کی تحقیق بھی تونے کی ہے؟

دن ہے یا مہر جہانتاب کی شانِ تنویر
حُسن بیدار کی روشن متکلم تصویر

نسخۂ فطرتِ رنگیں کا ہے رنگین ورق
رنگ رخسار ہے یا خون تمنا ہے شفق

رات ہے فطرتِ خوابیدہ کی بزمِ خاموش
پردہ در ہے یہ سیہ کاروں کی یا پردہ پوش

چاند خوش خوش اسی انداز سے ہے تاروں میں
شاد تھے جیسے خلیل آگ کے انگاروں میں

یہ ہے خشکی یہ تری۔ یہ ہے نشیب اور یہ فراز
منکشف ہو کے بھی ہر چیز ہے آئینۂ راز

گہرِ بیش بہا سینۂ قلزم میں نہاں
سیکڑوں نغمے ہیں موجوں کے ترنم میں نہاں

دشت میں گھاٹیوں میں گونج رہی ہے آواز
نہیں معلوم یہ ہے چھیڑا ہوا کس کا ساز

بھید کھلتا نہیں فطرت کے گنہگاروں پہ
روح پھرتی ہے بھٹکتی ہوئی کہساروں پہ

گلشنِ دہر میں کس شان سے آتی ہے بہار
صاف اللہ کی قدرت نظر آتی ہے بہار

راز سربستۂ فطرت ہے کہ منہ بند کلی
جادۂ عشق و وفا ہے کہ روش گلشن کی

رشتۂ موج ہوا سلسلۂ جنبانِ بہار
بے خبر دیکھ تو۔ ہے خندۂ گل جانِ بہار

کیوں خزاں آتی ہے فتنوں کو جگانے کے لئے
آگ بلبل کے نشیمن میں لگانے کے لئے

نالے کیوں کرتی ہے کیوں ہوتا ہے بلبل کو قلق
جب خزاں آکے الٹ دیتی ہے گلشن کا ورق

کیوں بگڑ جاتا ہے رنگین چمن کا نقشہ
زرد پڑ جاتا ہے گلزار کا پتہ پتہ

کردیا گریہ پہ مائل اسے کس کے غم نے
کس سے یوں پائی ہے تعلیم فنا شبنم نے

فکر عاجز تری اور عقل ہے تیری محدود
عبد ہے اور سمجھتا نہیں رمز معبود

تیری ہستی بھی ہے اک ربط عناصر کا طلسم
نہ رہے روح تو پھر خاک کا اک ڈھیر ہے جسم

نہیں۔ تو واقفِ پیچیدگیِ راہ نہیں
بے خبر اپنی حقیقت سے بھی آگاہ نہیں!

اب ذرا دیر کو میدانِ عمل میں آجا
دیکھنا ہے مجھے۔ کیا کرنا تھا۔ کیا تو نے کیا

قصر تعمیر کئے اور خدائی بھی کی
پڑ گیا وقت تو پھر تو نے گدائی بھی کی

کئی فرقے۔ کئی مسلک ہیں۔ کئی مذہب ہیں
فرق یہ کیوں ہے جب اللہ کے بندے سب ہیں

عام بخشش یہ نہیں۔ بات بہت صاف ہے یہ
کیسا قانون ہے۔ کس طرح کا انصاف ہے یہ

خوش ہے جو آج۔ وہ کل دہر میں ناشاد ہے کیوں
زیست انسان کی مجموعۂ اضداد ہے کیوں

بات کیوں ٹالتا ہے منتظرِ روزِ حساب
ان سوالوں کا ترے پاس بھی ہے کوئی جواب

وا ہوے اور یہ عقدے نہ کبھی وا ہونگے
ہر تیقن سے گماں سیکڑوں پیدا ہونگے

تو نے تحقیق جو کل کی تھی وہ ہے باطل آج
پیچھے چھٹ جائیگی جو سامنے منزل ہے آج

سچ تو ہے کون بتا سکتا ہے کل کیا ہوگا
حل کسی سے بھی نہ فطرت کا معما ہوگا

نہ بلندی ہے سراج اور نہ کوئی پستی
لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب ہے فریبِ ہستی

الحاق اودھ اور مسٹر بیورج

سید اعظم حسین

انگریزی مورخین میں سے میکالے اور مل کی طرح مسٹر بیورج اور اُنکی بیگم صاحبہ اپنی انصاف پسندی اور دیانت داری کے لئے ہندوستانیوں میں ہمیشہ یاد کئے جائینگے۔ مسٹر بیورج اُن علم دوست انگریزوں میں سے تھے جنھوں نے کمپنی کا زمانہ اپنی آنکھوں دیکھا۔ وہ باوجود انگریز ہونے کے اُن تمام معاملات پر جو ہندوستانی سلطنتوں اور برٹش کمپنی یا انگریزی حکومت کے درمیان مابہ النزاع تھے غیر جانبدارانہ رائے کا اظہار ہمیشہ ضروری سمجھتے تھے۔ افسوس ہے کہ اُردو داں پبلک اس عالی مرتبہ مصنف کے کارناموں سے اب تک ناواقف ہے۔ ہم اس وقت اس منصف مزاج اور حق پرست مورخ کی کتاب "تاریخ ہند۔ جلد ہفتم" کے ایک مختصر سے حصے کا ملخص پیش کرتے ہیں جس سے "الحاق اودھ" کے بارے میں اسکی رائے ظاہر ہوگی۔ مسٹر بیورج الحاق اودھ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار کرنے سے پہلے سلطنت اودھ کے قائم ہونے اور کمپنی اور اس سلطنت مرحومہ کے درمیانی تعلقات کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"سنہ ۱۷۶۰ء کے قریب جبکہ مغل سلطنت کا زوال ہو رہا تھا شجاع الدولہ نے جو اسکے وزیر تھے اور جنکے پاس صوبۂ اودھ بھی تھا اودھ پر قبضہ کرلیا........ کچھ دنوں بعد وہ میر قاسم سے مل گئے...... لیکن انکو کمپنی کی فوجوں نے شکست فاش دی اور انھیں وہ صلح بخوشی منظور کرنا پڑی جسکے ذریعہ سے الہ آباد اور کڑا کے اضلاع انکے ہاتھ سے نکل گئے۔ سنہ ۱۷۶۸ء میں کمپنی کو یہ خیال ہوا کہ وہ کھوئے ہوئے حصوں کو پھر سے حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ اس لئے اُنھیں دوسرا صلح نامہ لکھنے پر مجبور کیا جسکی بنا پر انھیں ۳۵ ہزار سے زیادہ فوج رکھنے کا حق نہیں رہا۔ سنہ ۱۷۷۳ء میں ان سے وہ سمجھوتا ہوا جسکا دھبہ آج تک وارن ہیسٹنگ کے نام پر ہے اور ان برطانوی فوجوں کی مدد سے روہیلا فتح ہوا جو بے شرمی سے اس کارروائی کے لئے کرایہ پر منگائی گئی تھیں۔ سنہ ۱۷۷۵ء میں انکے انتقال کے بعد آصف الدولہ بادشاہ ہوئے کمپنی نے انکی کمزوری سے

فائدہ اٹھا کر کئی اضلاع حاصل کر لئے - اور انکے عوض میں یہ وعدہ کیا کہ نواب کے خرچہ دینے پر وہ ایک امدادی فوج رکھینگی اور ہر موقع پر صوبہ اودھ کی محافظت کریگی - بعد میں جو سمجھوتے ہوئے انکے ذریعہ سے اس امدادی فوج کا خرچہ پانچ لاکھ پاونڈ سے پانچ لاکھ پچپن ہزار - اور پھر سات لاکھ پاونڈ کیا گیا - اور بالآخر ۱۸۰۱ء میں سعادت علی نواب وقت کو اس امر پر راضی بلکہ مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی سلطنت کا نصف حصہ ہمیشہ کے لئے اس خرچہ کے بدلے دیدیں اور کمپنی ان حصوں کے عوض جنکی آمدنی ۱۵ لاکھ پاونڈ سالانہ سے زیادہ تھی انکی ذمہ دار بنی کہ وہ سلطنت اودھ کو تمام اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے بچائے -

جب سلطان غازی الدین مرحوم کے عہد میں سلطنت کا انتظام کچھ خراب ہوا تو اس وقت کمپنی کو اسکا موقع نہ مل سکا کہ وہ انکی توجہ اس طرف مبذول کرا سکتی - اسکی وجہ یہ تھی کہ کمپنی نے نواب غازی الدین سے ۲۰ لاکھ پاونڈ قرض لیا تھا اور وہ اپنے قرضدار سے اکڑ نہیں سکتی تھی" بلکہ کمپنی نے نواب غازی الدین کو بادشاہ کا خطاب عنایت کیا - نواب نے اپنی فوج ساٹھ ہزار تک بڑھالی لیکن کمپنی کو سوائے سکوت کے کوئی چارہ نہیں رہا -

نواب غازی الدین کے بعد ۱۸۲۷ء میں انکے بیٹے نصیر الدین نواب ہوئے - جب انکے زمانے میں انتظام سلطنت کسی طرح نہیں سدھرا تو لارڈ ولیم بنٹنگ نے انھیں ایک شکایت نامے کے ذریعے سے پرزور الفاظ میں اس طرف توجہ لائی اور آخر کار جب ۱۸۳۷ء میں نواب نصیر الدین لاولد مر گئے اور انکی جگہ پر نواب محمد علی ہوئے تو ایک صلحنامہ تیار کیا گیا جسکی رو سے یہ طے کیا گیا کہ پہلے سے زیادہ تعداد میں برطانوی فوج اودھ میں رکھی جائیگی اور انتظام سلطنت اگر درست نہ ہو سکا تو کمپنی کو یہ حق ہوگا کہ وہ اودھ کے ان حصوں میں جہاں بد انتظامی ہوگی اپنے افسران مقرر کر دیگی جو اس وقت تک انتظام کرتے رہینگے جب تک کمپنی ضروری سمجھے گی"۔

جنگ افغانستان اور ان لڑائیوں کی وجہ سے جو لارڈ ایلنبرا کے زمانے میں پیش آئیں کمپنی کو اتنی مہلت نہ مل سکی کہ وہ شرائط صلحنامہ پر عمل درآمد کرنے کی طرف متوجہ ہو سکے تا اینکہ ۱۸۴۲ء میں محمد علی شاہ کی جگہ پر انکے بیٹے ثریا جاہ تخت نشین ہوئے اور انکی جگہ فروری ۱۸۴۷ء میں ان کے بیٹے واجد علی شاہ مرحوم بیٹھے - انکی حکومت کے پہلے ہی سال لارڈ ہارڈنج لکھنؤ آئے اور انھوں نے ایک یادداشت تیار کی - اس میں صاف صاف یہ ظاہر کیا گیا کہ اگر شاہ اودھ نے دو سال کے اندر اپنی سلطنت کا انتظام درست نہیں کیا تو کمپنی اس پر مجبور ہوگی کہ وہ ۱۸۳۷ء کے صلحنامہ پر کاربند ہو - دو سال بعد جب انتظام سلطنت کسی طرح نہ سنبھلا تو لارڈ ڈلہوزی نے مسٹر ڈبلو ایچ سلیمن ریذیڈنٹ کو

حکم دیا کہ وہ سلطنت میں دورہ کریں اور تمام حالات کا خود معائنہ کرکے رپورٹ پیش کریں سلیمن صاحب نے نواب کے خلاف رپورٹ دی اور لکھا کہ اودھ کی تمام رعایا کی دلی خواہش ہے کہ یہ سلطنت برطانوی حکومت میں شامل کر لیجائے۔ لارڈ ڈلہوزی نے اس رپورٹ کے بعد ڈائرکٹروں کی اجازت سے ایک اعلان شائع کیا اور اودھ کو کمپنی کی حکومت میں شامل کرلیا۔ بیورج صاحب فرماتے ہیں "ہمیں اس اعلان میں اور اُن ہدایات میں جو کرنل آوٹرم ریذیڈنٹ کے نام جاری کئے گئے تھے کوئی اور بات سوائے اسکے نہیں دکھائی دیتی کہ ایک قومی معاہدے صریحی انحراف کر پردہ ڈالنے کی ناکامیاب کوشش کی گئی ہے۔ مندرجۂ بالا بیانات کی رو سے دونوں حکومتوں کے تعلقات اور ذمہ داریاں سنہ ۱۸۰۱ء اور سنہ ۱۸۳۷ء کے صلحناموں پر مبنی تھیں .... ان دونوں صلحناموں میں کسی ایسی بات کا نکالنا جس سے کہ الحاق کی اجازت مل سکے ناممکن ہے۔ ایک کے ذریعے سے حکومت اودھ پر یہ لازم کردیا گیا تھا کہ وہ اپنے انتظامات میں اصلاح کرے۔ دوسرے نے اس سزا کی تعریف اور حدبندی کردی تھی جو اسے انتظام نہ کرنے پر دی جاسکتی تھی" اِس لئے اودھ کا الحاق کسی صورت سے جائز نہیں قرار دیا جاسکتا۔ "پچاس برس تک اسکے بادشاہ برطانیہ کے صرف وفادار دوست ہی نہیں رہے تھے بلکہ بارہا گاڑھے وقتوں میں کام آئے تھے اور اُنھوں نے بڑے بڑے قرض دے کر کمپنی کے خالی خزانوں کو پُر کیا تھا ایسے دوست کو چھوڑ دینا احسان فراموشی کہلاتا ہے لیکن اسکی کمزوری سے فائدہ اُٹھا کر اسکی سلطنت کو چھین لینا ایک ایسا فعل ہے جسکی صفائی میں ...... کوئی عذر پیش نہیں کیا جاسکتا۔ حکومت اودھ بیشک قابل بیزاری تھی لیکن اسکے باشندوں نے جن کی حمایت میں ہم نے اپنے ادعا کی بنا پر دخل اندازی کی ہمارے پاس کوئی عرضی نہیں ارسال کی تھی اور ہمیں اپنا نجات دہندہ سمجھنے کے بجائے بالاتفاق لٹیرا اور بے ایمان ڈاکو سمجھا۔ اُنکی فلاح و بہبود کے متعلق ہمارے دعوؤں کو اُنھوں نے ہنوٹ کے نام سے یاد کیا اور اپنی آزادی سلب ہوجانے کی وجہ سے یہی سمجھا کہ حصول سلطنت کی ہوس ہم میں اس درجہ زیادہ ہوگئی ہے کہ ہم اپنی کافی سے زیادہ بڑی سلطنت میں اور اضافہ کے لئے ہر طرح کی بے ایمانی کرنے کو تیار ہیں۔"

دلچسپ انعامی مقابلہ

از جانب شمس نونہروی برائے "ادب"

اشعار مندرجۂ ذیل میں جو الفاظ حذف کر دیے گئے ہیں صرف انھیں الفاظ کو ذیل کی کوپن میں درج کر کے جو صاحب ۳۰ ستمبر ۱۹۳۱ء تک اڈیٹر "ادب" کے پاس بھیجیں گے ان کی خدمت میں ایک عمدہ فاؤنٹن پن بطور انعام پیش کیا جائیگا ۔ اگر کئی اصحاب صحیح الفاظ تحریر فرمائینگے تو رقم انعام میں ممکن اضافہ کر کے اسے برابر تقسیم کر دیا جائیگا۔

کوپن کے بغیر کوئی جواب بغرض مقابلہ قبول نہیں کیا جائیگا۔ کوپن اگر بھیجی جائے تو ۴ر علاوہ فیس داخلہ کے آنا چاہیے ہر ایک کوپن کے ساتھ ۴ر بطور فیس آنا چاہیے۔

مکمل اشعار آئندہ اشاعت میں شائع کیے جائیں گے۔

اشعار

(۱) منحصر ... کشتی کی ... پہ نہیں
پار ساحل ...... تھا کر ... ڈوبا

(۲) ایک دل ...... کیجے ...... رسم ...... ترک
...... کہتا ہے ...... اور دیکھا چاہیے

(۳) لگاؤ تیر ...... پورا ہو
فرشتہ ... کا ہے ...... بہانے کا

(۴) پاس ... ہو مجھے ... دیندار ... ہے
روز ... کو میں ...... کلیسا ہو کر

(۵) خدا ... دوست ... دشمن ...... ہوتا ہے
رقیب ... سے ... انتقام لیتے ہیں

محذوف الفاظ اشعار

نمبر ۱ ....

نمبر ۲ ....

نمبر ۳ ....

نمبر ۴ ....

نمبر ۵ ....

ادب

جلد (۴) | فہرست مضامین بابت ماہ جولائی، اگست ۱۹۳۱ء | نمبر ۱، ۲

گاندھی جی جس کام کو اب کر رہے ہیں

اسی کو میں نصف صدی سے کامیابی کے ساتھ انجام دے رہی ہوں،

مہاتما گاندھی کا خاص اصول ہے کہ ہر انسان کے ساتھ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی ہو یا بودھ، برہمن ہو یا چمار ایک سا برتاؤ کیا جائے، حالانکہ غیر کی چیزوں سے پرہیز کر کے اپنے ملک کی اشیا کی قدر کی جائے، آپ دیکھیے اور غور سے دیکھیے کہ میرا بھی ٹھیک یہی اصول ہے مجھ میں ہند کی پاک صاف زمین میں پیدا ہونے والی چیزوں کے سوا اور کچھ نہیں یعنی ہندو مسلمان، عیسائی، بودھ، برہمن سے چمار تک یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں میں جوانوں، بڈھوں، مردوں، عورتوں ہر ایک کیلیے یکساں ہوں میں ہر ایک کی تکلیف کو دور کرتی ہوں، کمزوروں کو مضبوط بنانا میرا خاص کام ہے، جو میری خدمت قبول کرتا ہے اسکا قبض، بدہضمی، خون اور قوت مردمی کی خرابی دکھی اور جریان، احتلام، سرعت، رقت، وغیرہ کو دور کر کے اعلیٰ درجہ کی طاقت و توانائی عطا کرتی ہوں دماغ اور قوت حافظہ کو اعلیٰ درجہ کی تقویت دیتی ہوں، اپنے غلط افعال کا خمیازہ بھگتنے والوں کو اعلیٰ درجہ کی مردمی عطا کرتی ہوں میرا نام آتنک نگرہ ٹولیاں ہے قیمت فی ڈبیہ ۳۲ گولیاں صرف ایک روپیہ، پانچ ڈبیاں للعہ ایک کارڈ تحریر کر کے:

ویدشاستری منی شنکر گووند جی جام نگر کاٹھیاواڑ سے منگوا کے تجربہ کریں۔

نہایت عمدہ مضامین سے مزین صحت و تندرستی کی راہبر ۲۰۹ صفحات کی کتاب کام شاستر بالکل مفت منگوا کر مطالعہ کریں

سمن بغرض انفصال مقدمہ

مقدمہ نمبر ۴۰۳ سنہ ۱۹۳۱ء

بعدالت جناب جج خفیفہ صاحب بہادر اکبرپور ضلع فیض آباد

رام نریس وغیرہ ساکنان موضع خواجہ پور شمولہ ڈولاون پرگنہ مڈیر تحصیل باندہ ضلع فیض آباد مدعی

بنام

بنام رام ملھلاون ولد نبدراسوکل ساکن موضع خواجہ پور شمولہ ڈولاون پرگنہ مڈیر تحصیل باندہ ضلع فیض آباد، مدعا علیہ ہرگاہ مدعیان نے تمہارے نام ایک نالش بابتہ مبلغ للعہ کے دائر کی ہے، لہذا تمکو حکم ہوتا ہے کہ تم بتاریخ ۵ ماہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء بوقت ۱۰ بجے دن اصالتاً یا معرفت وکیل کے جو مقدمہ کے حال سے قرار واقعی واقف کیا گیا ہو اور جو کل امور اہم متعلقہ مقدمہ کا جواب دے سکے یا جسکے ساتھ کوئی اور شخص ہو جو جواب ایسے سوالات کا دے سکے حاضر ہو اور جوابدہی دعویٰ مدعی مذکور کی کرو اور ہرگاہ وہی تاریخ جو تمہارے حضار کے لیے مقرر ہے واسطے انفصال قطعی مقدمہ کی تجویز ہوئی ہے پس تم کو لازم ہے کہ اپنے جواب دعویٰ کی تائید میں جن گواہوں کی شہادت پر یا جن دستاویزات پر تم استدلال کرنا چاہتے ہو اسی روز ان کو پیش کرو۔

مطلع رہو کہ اگر بروز مذکور تم حاضر نہ ہوگے تو مقدمہ بغیر حاضری تمہارے مسموع اور فیصلہ ہوگا۔ آج بتاریخ ۲۶ ماہ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء میرے دستخط اور مہر عدالت سے جاری کیا گیا۔

دستخط حاکم بخط انگریزی

مہر عدالت

وقت حاضری بدفتر منصفی اکبرپور ۱۰ بجے سے ۴ بجے تک

بزمِ ادب

ہندوستان میں اردو زبان کے بولنے اور لکھنے والوں کی تعداد معقول ہے۔ ان میں ایسے دولتمندوں کی کمی نہیں ہے جو مالی امداد کرکے اردو کی بہبودی میں حصہ لے سکیں، ہزاروں ایسے خوشحال افراد موجود ہیں جنکی ادنیٰ توجہ اردو کو بہت کچھ فروغ دے سکتی ہے، لیکن سخت افسوس اور شرم کا مقام ہے کہ ان ناموران قوم کو اپنی زبان کا کچھ بھی خیال نہیں ہے۔ انکی دولت کا بڑا حصہ عیش و نشاط، لہو و لعب، اور دیگر مسرفانہ افعال میں صرف ہوتا ہے، مگر اردو کے نام پر انکی جیب سے کچھ نہیں نکلتا۔ انکی اس ناقدردانی اور بے حسی ہی کا نتیجہ ہے کہ اردو پیچھے ہٹتی جاتی ہے اور دوسری زبانیں آگے بڑھتی جاتی ہیں۔ آج کل جسقدر بھی اردو کا چرچا ہے وہ تمام تر خود اس زبان کی شیرینی، دلکشی اور ہمہ گیری کا نتیجہ ہے لیکن بغیر خارجی امداد کے صرف اسکی خوبیاں اسکی ہر دلعزیزی کو کب تک برقرار رکھ سکتی ہیں۔ اگر صاحبان مقدرت کا یہی جمود رہا تو وہ دن قریب تر ہے جب اسکے غزلگو شاعروں کی آخری تصنیف اسکا مرثیہ ہوگا۔ اس روز بد کے تصور سے روح کھنچنے لگتی ہے اور دل پکار اٹھتا ہے "خدا وہ دن نہ دکھائے"، لیکن صرف دعاؤں سے تو کام نہیں چلتا ضرورت ہے کہ وہ اردو داں اصحاب جنھیں خدا نے مواقع دیئے ہیں اب بھی چونکیں اور اپنی ناقدردانی کی تلافی کریں۔

اردو کی ترقی کے لیے چند انجمنیں طول و عرض ملک میں قائم ہوئیں لیکن ادبی رسائل کی طرح ان میں سے اکثر ختم ہوگئیں اور جو ہیں وہ بھی کالعدم ہیں۔ یہ بھی اسی بے حسی اور جمود کا نتیجہ ہے۔ اول تو ذمہ دار کام کرنیوالے بہت کم ہیں اور اگر کوئی جماعت ایسے لوگوں کی تیار بھی ہوئی تو خداوندان نعمت کے تغافل نے اسکی ہمت توڑ دی۔ پھر بھی میں یہ کہونگا کہ ہر شخص کو اپنی جگہ پر یہ سوچکر بیٹھ نہ رہنا چاہیے کہ اسکی انفرادی کوششوں سے کیا ہوگا۔ ہر فرد کو اپنی استعداد کے مطابق اظہار ہمدردی کا عملی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ کچھ دنوں بعد انفرادی کوششیں جو ایک دیکھا دیکھی دوسرے کی طرف سے بھی عمل میں آئینگی ایک اجتماعی کوشش کے سلسلہ کی کڑیاں ثابت ہونگی۔ زبان کیونکر ترقی کرتی ہے، اسکی امداد کے کیا طریقے ہوا کرتے ہیں، اور اردو دانوں کے خواب غفلت کے برعکس ہندی دوست طبقہ میں کسقدر بیداری ہے۔ ان امور کے ذہن نشین ہونے میں مدد پہنچانے کے خیال سے لیڈر اخبار کے ایک مراسلہ کا ضروری اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔

آنریری سکرٹری صاحب "ہندی ساہتا سمیلن" الہ آباد سے لکھتے ہیں۔ "آل انڈیا ہندی ساہتا سمیلن کے

سالانہ اجلاس میں جو جھانسی میں ہوگا۔ اس سال بارہ سو روپیہ کا انعام اُس موجودہ مصنف کو دیا جائیگا جس نے ہندی میں سائنس پر بہترین کتاب لکھی ہو ...... ہمیلن کے آخری سالانہ جلسہ میں مسٹر سیتارام سکسریا آف کلکتہ نے سمیلن کو پچیس سو روپے کی ایک رقم پانچ انعامات کے لیے عطا کی۔ ہندی کی موجودہ بہترین لکھنے والی عورت کو ہر سال پانچ سو کا ایک انعام اِس رقم میں سے دیا جائیگا۔ آیندہ سالانہ اجلاس میں پانچ سو کا پہلا انعام دیا جائیگا۔ کتابیں کسی موضوع پر ہوں...... متوفی ہندی مصنفین کے خاندانوں کی مدد کرنے کے لیے سمیلن نے "ہندی رائٹرس فیملی فنڈ" کھولا ہے، ہر ہندی لکھنے والا ایک روپیہ فیس داخلہ بھیجکے اور صرف تین روپے جمع کرکے اِس فنڈ کا ممبر ہو سکتا ہے۔ کسی ممبر کے انتقال کے بعد دوسرے ممبران کو فی کس ایک روپیہ چندہ دینا ہوگا، اور متوفی کا نامزد کردہ عزیز اتنے ہی روپے پائیگا جتنے ممبر ہونگے ....

...... مسٹر گوکل چند آف کلکتہ نے "سمیلن" کو دس ہزار کی ایک رقم ہندی میں کتابیں شائع کرنے کے لیے دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اِس "سیریز" میں عام مباحث پر کتابیں شائع ہونگی۔ جو لوگ اپنی کتابیں اِس سیریز میں شائع کرانا چاہتے ہیں "سمیلن" کو [illegible] لکھیں .... پنڈت دیوگی ہری نے "سمیلن" کو دس ہزار کی رقم ایسے مضامین کی اشاعت کے لیے عنایت کی ہے جن میں بہادری اور اولوالعزمی کے تذکرے ہوں اور جن سے نوجوانوں کو فائدہ پہونچ سکے۔

ہندی میں ایسی ایسی اولوالعزمیوں سے کام لیا جا رہا ہے اور اردو کے صاحبان ہمت پڑے سوتے ہیں۔ اردو کی سی صلاحیت ترقی رکھنے والی زبان کس مپرسی کے عالم میں پڑی ہوئی ہے۔ ارباب ادب اب بھی اُٹھو اور میر و غالب، آزاد و حالی کے کارناموں کو اپنی کوششوں سے چار چاند لگاؤ۔

"ادب" کے خاص نمبر کو ہماری توقع سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ابھی اسکی اشاعت کو زیادہ زمانہ نہیں گزرا لیکن دفتر میں بہت کم کاپیاں رہ گئی ہیں۔ آرڈر برابر آرہے ہیں اور اُمید ہے کہ وہ بھی بہت جلد ختم ہو جائینگی اِس نمبر کے مضامین کی خاص طور سے تعریفیں ہو رہی ہیں متعدد بزرگان ادب اور صاحبان تمیز کے ستائش نامے احباب موصول ہو چکے ہیں، اخبارات و رسائل میں بہت ہمت افزا تنقیدیں شائع ہو رہی ہیں اور مضامین نقل کیے جا رہے ہیں۔ اگر موقع ملا تو اِس نمبر کے متعلق چند مخصوص اصحاب کی رائیں درج "ادب" کی جائینگی۔

"ادب" کی اِس کامیابی کی تو ہمیں خوشی ہے لیکن ساتھ ہی اِس کا افسوس بھی ہے کہ خاص نمبر کی وجہ سے اشاعت میں پابندی وقت نہ ہو سکی۔ "ادب" برابر مہینے کی آخری تاریخ کو بروقت شائع ہوا کیا مگر اس طرف

"خاص نمبر" کی غیر معمولی دشواریوں کے ہاتھوں ہمیں تاخیر کا الزام بھی برداشت کرنا پڑا ہم اسکی تلافی کی تدبیر کر رہے ہیں جولائی اگست کا یہ مجموعی نمبر ستمبر میں شائع ہو رہا ہے اسکے بعد ستمبر اور اکتوبر کا مجموعی نمبر اکتوبر ہی میں شائع ہوگا اور اس طرح اکتوبر کا پرچہ پابندی وقت شائع ہوگا اسکے بعد "ادب" برابر پابندی وقت سے شائع ہوتا رہے گا۔ آئے دن کی شکایتوں سے یہ بدرجہا بہتر ہے کہ دو نمبر ایک ساتھ نکال کے آیندہ کیلیے تاخیر کا سد باب کر دیا جائے۔ اُمید ہے کہ ناظرین ہماری گوناگوں دقتوں کو مد نظر رکھکر ہمارے اس طریقۂ کار پر عمل کرنے کے لیے ہمیں مجبور سمجھیں گے۔

ادب جب سے عالم وجود میں آیا ہے، چند مخصوص افراد اسکی بقا کی کوششوں میں نہایت سرگرمی سے لگے ہوے ہیں یہی مبارک ہستیاں اس پرچے کے استقرار و بقا کی ضامن ہیں وہ ادب کی تمام کامیابیوں کیلیے مستحق مبارکباد ہیں اگرچہ اُنھیں ہمارے شکریے کی ضرورت نہیں ہے اسلیے کہ وہ کسی کی خاطر و مروت سے یہ کام نہیں کرتے بلکہ خود اپنے احساس خدمت ادب سے مجبور ہو کر یہ درد سر مول لیے ہوے ہیں پھر بھی جذبۂ تشکر ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم اپنے دلی شکریے کا حقیر ہدیہ ان ادب نوازوں کی خدمت میں پیش کریں۔

اس ادبی کشتی کے پانچ ناخدا (۱) جناب سید علی عباس صاحب حسینی ایم اے (۲) جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم اے (۳) جناب سید انور حسین صاحب آرزو (۴) جناب مولانا سید اختر علی صاحب تلہری (۵) جناب خواجہ اطہر حسین صاحب ایم اے، ہمارے تمام جذبات تشکر و امتنان سے بالاتر ہیں اسلیے کہ انھیں اصحاب کی توجہ نے ادب کو عالم وجود میں پہنچایا اور یہی اب بھی اُسکی بقا کے ضامن ہیں۔ ان کی حیثیت کوزہ گر کی بھی ہے اور خود گل کوزہ کی بھی۔ ان کا شکر گزار ہونا تو خود "ادب" کو اپنا شکریہ ادا کرنا ہے۔

البتہ ہم جناب مولوی سید حامد حسین صاحب عشروی، جناب شیخ تفضل حسین صاحب میرٹھی، جناب سید محمد صالح صاحب شمس نونہروی، جناب مرزا محمد قدیر صاحب عظیم آبادی، جناب سید جعفر حسین صاحب وکیل، اسپشل مجسٹریٹ لکھیم پور اور جناب سید مصطفےٰ حسین صاحب پیشکار کے حد درجہ شکر گزار ہیں کہ انھوں نے ادب کی توسیع اشاعت میں ہماری پوری مدد کی۔ اگر چند اور ایسے ہی مربی ادب کو مل جائیں تو اُسکی ساری مالی مشکلیں برطرف ہو جائیں۔

ان حضرات کے علاوہ ہم اُن صاحبان قلم کے بھی بیحد ممنون ہیں جو ادب کی قلمی اعانت مستقلاً فرماتے رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں جناب نواب مرزا جعفر علیخاں صاحب اثر بی اے، جناب مولوی سید اطہر حسین صاحب جعفری، جناب سید حسن صاحب برنی ایم اے، جناب شبیر احمد صاحب علوی بی اے، جناب مرزا ثاقب لکھنوی، اور محترمہ سیدہ ساجدہ بیگم کے اسمائے گرامی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

امیر مینائی

(جناب محمد اظہار الحسن صاحب بی اے - ایل ایل بی (علیگ) وکیل غازی آباد)

سوانحی حالات | بلبل ہندوستاں کے ہمصفیر مولوی محمد اکرم کے خلف اکبر منشی امیر احمد بعہد شاہ نصیر الدین حیدر والی اودھ ۱۶ شعبان المعظم ۱۲۴۴ھ ہجری نبوی کو دوشنبہ کے دن لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا سلسلۂ نسب چند واسطوں سے حضرت شاہ مینا صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے جن کا مزار لکھنؤ میں آج بھی زیارتگاہ خاص و عام ہے ملتا ہے۔ اسی نسب کی بنا پر آپ امیر مینائی مشہور ہیں۔ اردو شعرا باستثنائے پنڈت برج نراین چکبست کوئی نہ کوئی تخلص اپنے لئے ضرور تجویز کرتے آئے ہیں جو بیشتر حالات میں اصلی نام کے علاوہ ہوتا ہے۔ مفتی صاحب نے اپنے نام ہی کو تخلص کے طور پر استعمال فرمایا۔ نام کی اس موزونیت پر آپ نازاں تھے فرماتے ہیں

نام کا نام تخلص کا تخلص ہے امیر
یہ بڑا حسن خداداد مرے نام میں ہے

شعرا تلامیذ الرحمٰن ہوتے ہیں۔ شاعری وہبی فن ہے کسبی نہیں۔ اس لئے شاعر کو استاد کی ضرورت نہ ہونی چاہیئے۔ شاید یہ خصوصیت صرف اردو شاعری کے ساتھ وابستہ ہے کہ ہر شاعر کے لئے ایک استاد ضروری تھا ورنہ بے فکرے "بے استادا" کی پھبتی کستے۔ مرزا غالب نے بھی اس آوازے سے بچنے کی خاطر ایک فرضی شخص کو اپنا استاد بنایا تھا۔ رسم زمانہ کے مطابق امیر نے نصیر الدولہ مدبر الملک سید مظفر علی خاں بہادر جنگ اسیر کے سامنے زانوے ادب تہ کیا۔ اسیر کی جو حیثیت شعرائے اردو میں ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں حقیقت یہ ہے کہ مرزا صائب کا یہ شعر ؎

از ادب صائب خموشم ورنہ در ہر وادیے
رتبۂ شاگردی من نیست استاد مرا

جس طرح شاہ حاتم اور سودا، حسرت اور جرأت پر صادق آتا ہے اسی طرح آسیر اور امیر پر بھی منطبق ہوتا ہے بہر حال اس واسطے سے امیر کا سلسلہ شیخ غلام ہمدانی مصحفی تک پہنچتا ہے جنکو شعرا لکھنؤ کا ابوالآبا سمجھنا چاہیئے۔

امیر کا زمانہ لکھنؤ میں عروج شاعری کا زمانہ تھا۔ رند، صبا، خلیل، سحر، انیس اور دبیر کے دم سے لکھنؤ رشک چمن بنا ہوا تھا۔ ہر شخص نشہ شاعری سے سرشار تھا۔ گھر گھر شعر و سخن کے چرچے تھے غرضکہ لکھنؤ کی فضا پر شاعری چھائی ہوئی تھی۔ ان سب باتوں کا اثر امیر کی ہونہار طبیعت پہ نہایت عمدہ پڑا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ کی مشق نے طبیعت کے جوہر آشکارا کر دیئے۔ رفتہ رفتہ ان کا شہرہ سلطان عالم واجد علی شاہ اختر کی سمع ہمایوں تک پہنچا۔ ۱۸۵۲ء میں اختر کے دربار میں امیر کی طلبی ہوئی اور ان کا کلام سُنا گیا۔ حسب الحکم سلطانی دو کتابیں "ارشاد السلطان" اور "ہدایت السلطان" تصنیف کیں۔ جن کے صلے میں انعام بیش بہا اور خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوئے۔ سلطان عالم کی مدح میں متعدد قصائد بھی لکھے۔ اس زمانہ سے انکا عروج شروع ہوا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ میں انقلاب ہو گیا۔ وہ مجلسیں باقی رہیں اور نہ وہ قدردان۔ اودھ کا الحاق ہو گیا اور امیر کو گوشہ نشینی اختیار کرنی پڑی۔ ذیل کے شعر میں سلطان موصوف کی نظربندی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

ہے لکھنؤ کی جان تو کلکتے میں امیر ‏ ‏ خاک آئے میری آنکھوں میں اب لکھنؤ پسند

۱۲۷۵ھ ہجری میں امیر کی قسمت نے پھر یاوری کی۔ خلد آشیاں نواب یوسف علی خاں ناظم نے جو خود ایک ماہر فن شاعر اور شاعروں کے قدردان تھے امیر کو دارالسرور رامپور میں طلب فرمالیا۔ ان کے بعد نواب کلب علی خاں بہادر سریر آرائے ریاست ہوئے۔ یہ اپنے وقت کے ہارون الرشید تھے۔ رامپور کو ہندوستان کا بغداد بنا دیا۔ ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر اہل کمال جمع کئے گئے۔ علما و فضلا کی سرپرستی شاہانہ عز و شان کے ساتھ ہوتی تھی۔ شعرا پر خاص توجہ مبذول تھی۔ دربار رامپور باکمال شعرا کا مرجع بن گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب اسیر، منیر، داغ، تسلیم، جلال، ذکی، بحر، حیا، قلق اور رسا کا جمگھٹا تھا۔ امیر نے یہاں خوب خوب داد سخن دی یہیں انکو نواب کی اُستادی کا شرف حاصل ہوا۔ تنخواہ معقول تھی۔ نہایت آرام سے بسر ہوتی تھی۔ نواب کا قاعدہ تھا کہ جملہ اہل کمال بزرگوں کو کوئی نہ کوئی خدمت ضرور تفویض کر دیتے تھے تاکہ ایک پنتھ دو کاج، وہ لوگ بھی آرام سے رہیں اور خزانہ پر بھی بار نہ پڑے چنانچہ امیر بھی محکمۂ دیوانی سے وابستہ تھے۔

۴۳ سال رامپور میں نہایت عزت و آرام سے بسر کر کے آخر عمر میں حسب فرمائش حضور نظام طلب ہوتے ہوئے عازم حیدرآباد ہوئے اور ۱۰ رجمادی الاول کو وہاں پہنچ کر اپنے دوست فصیح الملک کے یہاں فروکش ہوئے۔ ابھی پیشگاہ خسروی میں باریابی کی نوبت نہ آئی تھی کہ غریب الدیار امیر کو پیام اجل آپہنچا کم وبیش ایک ماہ کی علالت کے بعد جس میں مرزا داغ اور پنڈت رتن ناتھ سرشار نے نہایت انہماک کے ساتھ تیمار داری کے فرائض انجام دیے اور کبھی کبھی یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر نے بھی عیادت کی غرض سے قدم رنجہ فرمایا۔ ۱۹ رجمادی الآخر ۱۳۱۸ ہجری مطابق ۱۳ اکتوبر ۱۹۰۰ء کو ۷۲ سال ۱۰ ماہ کی عمر میں اس محسن اردو نے سفر آخرت اختیار فرمایا اور اپنے چار بیٹوں منشی محمد احمد محمود قمر، منشی ممتاز احمد آرزو، منشی مسعود احمد ضمیر، اور منشی لطیف احمد اختر کو یادگار چھوڑا۔ مرزا داغ نے بھی تاریخ کہی۔[۲]

وائے ویلا چل بسا دنیا سے وہ | جو مراہم فن تھا میرا ہمصفیر
مصطفٰی آباد سے آیا دکن (رامپور) | یہ سفر تھا اس مسافر کا اخیر
کیا کہوں کیا کیا ہوئیں بیماریاں | کیا لکھوں تفصیل امراض کثیر
مبتلائے حدت صفرا و تپ | مورد آزار اسہال و زحیر
گو بظاہر تھا امیر احمد لقب | درحقیقت باطناً پایا فقیر
شاہ مینا سے ہے نسلی سلسلہ | شاعری میں خاص تلمیذ اسیر
ہے دعا بھی داغ کی تاریخ بھی | قصر عالی پائے جنت میں امیر

---

[۱] "۱۹۰۰ء میں جب نظام حیدرآباد کلکتے سے واپس آرہے تھے تو راستہ میں بنارس میں بھی ٹھہرے۔ امیر نے ایک قصیدہ ان کی تعریف میں لکھ کر بمقام بنارس ان کی حضور میں پیش کیا تھا۔ حضور نظام کو وہ بہت پسند آیا۔ اور امیر سے حیدرآباد آنے کی فرمائش کی"۔ تاریخ ادب اردو صفحہ ۴۱۹

[۲] ادیب جمیل سید سجاد حیدر یلدرم بی اے نے جو مرثیہ امیر کی وفات پر لکھا تھا اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

لوگ کہتے ہیں کون شاعر ہے! | آج ہم کس کا نام بتلائیں؟
ہم کو تحقیق لفظ ہے منظور | کس طرف اس کے واسطے جائیں
دل یہ کہتا ہے مرگئی اردو | کس طریقہ سے دل کو سمجھائیں
ہم نہیں مانتے ہمارا امیر | حیدرآباد والے دے جائیں

تلامذہ | امیر کے شاگردوں کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے جن میں سے جلیل، ریاض، مضطر صفدر، اور حفیظ بہت مشہور ہیں۔[1]

علم و اخلاق | امیر کی استعداد علمی نہایت معقول تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایک عالم متبحر تھے عربی کی درسی کتابیں مستی سعد اللہ صاحب اور ان کے ہمعصر علمائے فرنگی محل سے پڑھی تھیں۔ طب، نجوم اور جفر وغیرہ میں کامل دستگاہ حاصل تھی۔ اخلاقی لحاظ سے امیر کی ذات نہایت قابل قدر تھی۔ باوجود اس فضل و کمال کے نہایت منکسر المزاج واقع ہوئے تھے۔ بخلاف دیگر شعرا کے دوسروں کے کمال کے اعتراف میں کبھی بخل سے کام نہ لیتے۔ مرزا داغ کو ان کا حریف سمجھا جاتا ہے اور اکثر لوگوں نے ان کو مرزا سے بھڑانے کی کوشش کی، مگر خود امیر نے کبھی داغ سے مسابقت نہ کرنی چاہی — مرزا داغ نے ایک بڑی ہی دھوم دھام کی غزل لکھی ہے جس کا مطلع ہے۔ ؎

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں — کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

امیر نے بھی اس زمین میں ایک چھوڑ دو غزلیں لکھیں مگر ان کی انصاف پسندی کی داد دینا چاہیے کہ مقطع میں حریف کے کمال کا اعتراف اس طرح کرتے ہیں۔ ؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا مصرع ہے — بھویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں

امیر نہایت پاکباز، متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔ ان کو تہذیب اور متانت کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ علم و عمل کی یکجائی تصویر امیر کے پیکر میں نظر آتی ہے۔ انھوں نے کبھی کسی کی ہجو سے زبان کو آلودہ نہیں کیا۔ متواضع اس قدر تھے کہ ہمیشہ اپنے حریفوں سے بھی جھک کر ملتے اور کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہ دیتے۔ درویش صفت اور صوفی مشرب تھے۔ بقول داغ۔ ؎

گو بظاہر تھا امیر احمد لقب — درحقیقت باطناً پایا فقیر

اس لحاظ سے ان کو خواجہ میر درد کا ثانی کہا جا سکتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میر درد نے اپنے کلام کو بسر

[1] صاحب تاریخ ادب اردو نے محسن کاکوروی کو بھی امیر کے شاگردوں میں شمار کیا ہے لیکن خود جناب محسن کے فرزند ارجمند مولوی نورالحسن نیر نے کلیات نعت مولوی محمد محسن" میں جو مختصر حالات موصوف کے قلمبند کئے ہیں ان میں لکھا ہے کہ "محسن کو مولوی ہادی علی اشک سے تلمذ تھا حضرت اشک کی وفات کے بعد کسی سے اصلاح نہیں لی۔" "گل رعنا" سے بھی جناب نیر کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ امیر اور محسن کے تعلقات نہایت مخلصانہ تھے۔ غالباً اسی وجہ سے صاحب تاریخ ادب اردو کو محک[illegible] ہوئی۔ (اظہار)

تصوف میں ڈبودیا، اور امیر لکھنؤ کے عاشقانہ رنگ سے نہ نکل سکے۔ پھر بھی ان کے کلام میں تصوف کے اکثر اشعار ملتے ہیں اور ایسے اشعار کا پایہ ان کے کلام میں یقیناً بلند ہے۔ آپ خاندان چشتیہ صابریہ میں حضرت امیر شاہ صاحب سے بیعت رکھتے تھے، اور آخر وقت میں خرقۂ خلافت سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔ حُبِّ رسول سے آپ سرشار تھے نعتیہ کلام ایک علیحدہ دیوان کی صورت میں "محامد خاتم النبیین" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ عاشقانہ دواوین میں بھی کہیں کہیں اس رنگ کی جھلک نظر آتی ہے۔ غرض امیر کی ذات ستودہ صفات بہمہ جہت مرجع کمالات تھی۔

تصانیف | امیر کی تصانیف کی تعداد بہت کافی ہے۔ غدر کے پُر آشوب زمانہ میں انکی اکثر تصانیف جن میں ایک اُردو دیوان "غیرت بہارستان" بھی شامل تھا تلف ہوگئیں، اور ستم بالائے ستم یہ کہ سنہ ۱۸۹۵ء میں مکان میں آگ لگ جانے کے باعث ان کی اکثر تصانیف نظم و نثر اور قیمتی کتابیں نذر آتش ہوگئیں۔ ذیل میں ان کی تصانیف کی فہرست پیش کی جاتی ہے[۱]۔

(۱) ارشاد السلطان۔

(۲) ہدایت السلطان

(۳) غیرت بہارستان۔ اس میں وہ غزلیں تھیں جو قبل غدر مشاعروں میں پڑھی تھیں نیز چند قصائد مدح واجد علی شاہ میں تھے یہ کلام غدر میں تلف ہوگیا۔

(۴) نور تجلی } یہ دونوں مثنویاں بھی غدر سے پہلے لکھنؤ میں لکھی تھیں۔
(۵) ابر کرم }

(۶) ذکر شاہ انبیاء۔ بصورت مسدس مولود شریف ہے۔

(۷) صبح ازل۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بیان میں۔

(۸) شام ابد۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بیان میں۔

(۹) لیلۃ القدر۔ معراج کے حال میں۔

(۱۰) مجموعۂ واسوخت۔ چھ واسوختوں کا مجموعہ جن کے تاریخی نام حسب ذیل ہیں اور سنہ

---

[۱] یہ فہرست زمانۂ حال کی بہترین اور قابل قدر تصنیف "تاریخ ادب اُردو" مصنفۂ مسٹر رام بابو سکسینہ مترجمۂ مرزا محمد عسکری سے ماخوذ ہے۔ (اظہار)

تصنیف ۱۲۸۴ہجری ہے۔ یعنی "بانگ اضطرار"، "واسوخت اُردو"، "شکایات رنجش"، "صفیر آتشباز"، "حسد اغیار"، "غبار طبع"۔ اِس مسدس کو ایک عمدہ دیباچے کے ساتھ "مینائے سخن" کے نام سے "دائرہ ادبیہ" لکھنؤ نے چھاپا ہے۔

(۱۱) محامد خاتم النبیین۔ مولفہ سنہ ۱۲۸۹ہجری نعتیہ دیوان ہے۔

(۱۲) انتخاب یادگار۔ رامپور کے شعرا اُردو کا تذکرہ ہے جو نواب کلب علی خاں بہادر کے حکم سے سنہ ۱۲۹۰ہجری میں لکھا تھا۔ جیساکہ تاریخی نام سے ظاہر ہوتا ہے۔

(۱۳) خیابانِ آفرینش۔ نثر میں مولود شریف ہے۔

(۱۴) مراۃ الغیب۔ اُردو غزلوں کا پہلا دیوان ہے[1]۔

(۱۵) صنمخانۂ عشق۔ مطبوعہ سنہ ۱۳۱۳ہجری۔

(۱۶) جوہر انتخاب
(۱۷) گوہر انتخاب مولفہ سنہ ۱۳۱۰ھ } یہ دونوں میر تقی میر و خواجہ میر درد کے رنگ میں کچھ غزلیں لکھی گئی ہیں[2]۔

(۱۸) تیسرا دیوان جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے اس میں چند قصائد اور رباعیات شامل ہیں۔

(۱۹) سرمۂ بصیرت۔ جو ایسے عربی و فارسی الفاظ کی ایک فرہنگ ہے جو اُردو میں غلط استعمال ہوتے ہیں اس میں انکا صحیح طریقہ استعمال مع اسناد کے بتایا ہے۔

(۲۰) بہار ہند۔ ایک مختصر لغت، اُردو محاورات و الفاظ کا، جس کو امیر اللغات کا نقش اول کہنا چاہیے۔

(۲۱) امیر اللغات۔ جسکو منشی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ سمجھنا چاہیے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ ناتمام رہ گیا۔ صرف دو جلدیں الف ممدودہ و الف مقصورہ کی اب تک طیار ہوئی ہیں۔ اس کتاب سے قابل مصنف کے تبحر اور جامعیت اور نیز ان کی بےحد کد و کاوش اور محنت و جانکاہی کا

---

[1] "غیرت بہارستان" سے قطع نظر۔ اس دیوان میں رباعیات، قطعات، تاریخیں، نظمیں، ترکیب بند، غرض جملہ صناعات سخن کے نمونے موجود ہیں۔ نام تاریخی ہے۔ (اظہار)

[2] یہ غزلیں نہیں بلکہ متفرق ابیات کے مجموعے ہیں جو "صنمخانۂ عشق" کے ساتھ ضمیموں کے طور پر شائع کیے گئے ہیں۔ ممکن ہے کہیں ایک سے زیادہ اشعار ایک سلسلہ میں نظر آتے ہیں۔ مگر غزل کا اطلاق ان پر نہیں ہوسکتا۔ (اظہار)

پتہ چلتا ہے۔ اسکی دو جلدیں چھپ گئی ہیں تیسری بھی تیار تھی مگر شائع نہ ہوسکی۔ ابتداً آٹھ جلدوں میں اسکے نکالنے کا ارادہ تھا۔ نواب کلب علی خاں بہادر کے عہد میں شروع ہوئی تھی اور اسکے بڑے سرپرست ہز آنر سر الفرڈ لائل لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ تھے۔ جنرل عظیم الدین خاں نائب پریڈنٹ کونسل آف ریجنسی رامپور نے بھی اسکی سرپرستی کی تھی منشی صاحب نے اکثر اپنے خطوط میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔

(۲۲) خطوط اور متفرق چیزیں نظم و نثر میں۔ منشی صاحب کے شاگرد اور دوست بہت کثرت سے تھے۔ لہذا اُن کا مجموعۂ خطوط بہت دلچسپ ہے۔ اسکو ان کے شاگرد رشید مولوی احسن اللہ خاں ثاقب نے ایک نہایت مفید اور دلچسپ دیباچہ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ رسالۂ اسرار نظم، اور "زاد الامیر" اور مناجات وغیرہ ان کی متفرق تصانیف میں سمجھنا چاہیئے۔

ان کے علاوہ بقول مولوی محمد یحییٰ تنہا صاحب سیر المصنفین ان کی بعض تصنیفات کو شائع ہونے کا موقع نہیں ملا۔ اگرچہ وہ ان کے صاحبزادوں کے پاس بطور ترکہ موجود ہیں۔

نثر نگاری پر تبصرہ ادبی لحاظ سے امیر مینائی کی دو حیثیتیں ہیں۔ ناثر و شاعر۔ اگرچہ آپ کو شہرت بحیثیت شاعر کے حاصل ہوئی مگر ہماری رائے میں شاعری سے زیادہ آپ کی نثر نگاری وقیع ہے یہی وہ شعبہ ہے جس میں امیر نے حقیقتاً زبان و ادب کی گراں بہا خدمات انجام دیں۔ آپ کی جملہ تصانیف نثریہ میں خصوصیت کے ساتھ "انتخاب یادگار" اور "امیر اللغات" قابل ذکر ہیں۔ امیر اللغات میں آپ نے جو داد تحقیق دی ہے وہ ہر طرح قابل تحسین ہے۔ افسوس ہے کہ یہ گرانبہا تصنیف مکمل نہ ہوسکی۔ ورنہ ایک نادر چیز ہوتی اور زبان کی ایک بڑی ضرورت رفع ہو جاتی۔ اُردو کی کم مائگی کا یہ عالم ہے کہ اس میں کسی "انسائیکلوپیڈیا" کا تو کیا ذکر کوئی مکمل لغت تک نہیں پائی جاتی۔ "امیر اللغات" فرہنگ آصفیہ اور نور اللغات ایک حد تک اس کمی کو پورا کرتی ہیں لیکن افسوس ہے کہ امیر کی سعی ناتمام رہی۔ فرہنگ آصفیہ اگرچہ نہایت قابل قدر چیز ہے لیکن بہ ہمہ وجوہ مکمل نہ ہوسکی اور اب اسکا دستیاب ہونا بھی حسن اتفاق پر منحصر ہو گیا ہے۔ خدا نور اللغات کے مصنف کو حیات دراز ارزانی فرمائے کہ اُن کی ذات سے اُردو کی بڑی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ امیر اللغات کے ذریعہ سے

لے مجموعہ "مکاتیب امیر مینائی" کے نام سے اشاعت پذیر ہوا ہے اگرچہ روش وہی قدیم ہے مگر بقول تنہا "تنہا ئے جاوید "اکثر مقامات پر لطف زبان کے ساتھ طرز ادائے بیان نہایت دلکش اور بیساختہ ہے"

منشی صاحب نے زبان کی ٹھوس خدمت انجام دی ہے۔ اس کی ترتیب و تدوین میں جو کد و کاوش امیر مینائی کو کرنا پڑی ہوگی اسکا اندازہ کچھ وہی لوگ اچھی طرح کر سکتے ہیں جن کو کبھی اس قسم کے کام سے سابقہ پڑا ہو۔ "انتخاب یادگار" واقعی ایک یادگار تذکرہ چارسو دس شعرا متوسلین دربار رامپور کے حال میں ہے جو ۴۷۵ صفحات میں سمایا ہے اور جیسا کہ تاریخی نام سے ظاہر ہے ۱۲۹۰ھ ہجری میں لکھا گیا ہے۔

مؤلف سیر المصنفین نے آمیر کو نثر نگاروں کے دوسرے دَور میں شامل فرمایا ہے۔ اگرچہ بلحاظ عہد ان کو تیسرے دَور کے اہل قلم بزرگوں کے پہلو بہ پہلو جگہ ملنا چاہیے تھی۔ تنہا صاحب اسکی معذرت ان الفاظ میں فرماتے ہیں

"آپ کا ذکر تیسرے دَور کے مصنفین کے ساتھ ساتھ ہونا چاہیئے تھا لیکن آپ کی کتاب انتخاب یادگار...... بلحاظ زبان مرزا رجب علی بیگ سرور کی فسانہ عجائب سے ملتی جلتی ہے اس سے ہم نے یہ مناسب خیال کیا کہ آپ کے حالات زندگی اس طبقہ کے مصنفین کے ساتھ بیان کئے جائیں۔ علاوہ ازیں تیسرے دَور کے مصنفین اس اعلیٰ پایہ کے ہیں کہ ایک یادو کتاب کے مؤلف کو ان صدر نشینان بزم اردو کے ہم پلہ جگہ نہ دی گئی اور نہ دی جاسکتی تھی ...... نیز آپ کی دو کتابیں "ارشاد السلطان" اور "ہدایت السلطان" "فسانہ عجائب" کے کچھ ہی بعد کی تصنیف ہیں۔ اور آپ بلا تکلف دوسرے دَور کے مصنفین کے ساتھ پہلو بہ پہلو جگہ پا سکتے ہیں"

انتخاب یادگار، ارشاد السلطان، اور ہدایت السلطان کی نسبت جو کچھ بھی کہا جائے لیکن یہ عذر یقیناً قابل قبول نہیں ہے کہ "تیسرے دَور کے مصنفین اس اعلیٰ پایہ کے ہیں کہ ایک یادو کتاب کے مؤلف کو ان صدر نشینانِ بزم اُردو کے ہم پلہ جگہ نہ دی گئی اور نہ دی جاسکتی تھی" ایک یادو کتاب کی تعریف کچھ اچھی معلوم نہیں ہوتی۔ آمیر کی ایک ہی تصنیف "امیر اللغات" ادبی خدمت کے لحاظ سے اس قدر اہم ہے کہ وہ ہر دَور کے مصنفین کے بلاخوف لوم ولائم پیش کئے جاسکتے ہیں۔

پُرانے لوگ عام طور پر بالطبع قدامت پسند ہوتے تھے۔ جدت کے نام سے وہ کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے اور کوئی نئی بات کرنا وہ گناہ سے کم نہ سمجھتے تھے امیر مینائی کو کوئی استثنا نہ تھی۔ قدامت پسندی ان کی طبیعت کا خمیر تھی۔ ان کی نثر اور نظم دونوں میں وہی پُرانی روش پائی جاتی ہے۔ بقول جناب تنہا انتخاب یادگار میں آمیر نے فسانۂ عجائب کی تقلید میں مقفیٰ و مسجع عبارت لکھی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"سمند قلم پر شہسوار سخن کی تاکید ہے کہ میدان حمد الٰہی میں قدم اٹھا اور تیغ زبان پر قوت ناطقہ کی تہدید ہے کہ اس معرکہ میں جوہر دکھا۔ مگر یہ منزل ایسی کڑی ہے کہ دونوں کو مشکل پڑی ہے۔ نہ اسکا پاؤں نہ اسکا ہاتھ اٹھ سکتا ہے۔ اس عجز کو دیکھ کر عقل حیران ہے اور دل کو سکتہ ہے کہ تحریر و تقریر کا تو یہ حال ہے کہ نہ قلم کو لکھنے کی تاب اور نہ زبان کو گویائی کی مجال، پھر کیونکر وادیٔ ناپیدا کنار حمد تمام ہو جسکی ذات کی بدایت، صفات کی نہایت نہ ہو کس طرح اسکے سپاس کا سرانجام ہو۔ الحق وہی باطن ہے وہی ظاہر ہے وہی اول ہے وہی آخر ہے۔ گفتگوے بے سروپا اسکی ثنا کی گنجائش کہاں پائے۔ قطرے میں دریا، ذرے میں صحرا، کیونکر سمائے۔ عجب بارگاہ کبریائی ہے، کہ وہاں رسائی کا طریقہ نارسائی ہے۔ انسان ہمت ہار دے اور اس بادی کو جیت لے۔ وادی معرفت الٰہی طے ہونے کی یہ ہی سبیل ہے العجز عن الدرک ادراک اسی پر دلیل ہے۔"

ہر عہد کا معیار علیحدہ ہوتا ہے جس زمانہ میں امیر بقید حیات تھے اُس وقت یہی طرز پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ سیدھی سادھی عبارت لکھنا اپنی کسر شان سمجھتے تھے۔ مقفیٰ اور مسجع عبارت اظہار کمال کا ذریعہ خیال کی جاتی تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ اگرچہ مرزا غالب خطوط میں سلاست اور بے تکلفی کو کام فرماتے ہیں۔ مگر تقریظوں کی تحریریں اپنے دامن کو پرانی روش سے نہیں بچا سکتے۔ رائے عامہ بڑی چیز ہے۔ مرزا کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ ان کے خطوط کبھی شائع ہونگے اور شائقین ادب انہیں حرز جاں بنائینگے۔ برعکس اسکے تقریظیں وہ پبلک کے لئے لکھتے تھے۔ یہ ہی وجہ تھی کہ خود سر سید کو جنھوں نے لٹریچر میں انقلاب پیدا کر دیا۔ اپنی گرانبہا تصنیف "آثار الصنادید" کے پہلے ایڈیشن میں وہی مقفیٰ اور مسجع عبارت استعمال کرنا پڑی۔ ہر زبان کا یہ ہی قاعدہ ہے۔ فارسی میں کبھی سہ نثر ظہوری کی قسم کی کتابیں مقبول ہوتی تھیں۔ ایک زمانہ تھا کہ انگریزی میں لارڈ میکالے کے طرز کو پسند کیا جاتا تھا، لیکن آج کل سلیس انگریزی مرغوب خاطر ہے۔ یہ طرز قدیم اگرچہ لکھنے میں مشکل ہے مگر پڑھنے میں دلچسپ ضرور ہے۔ اسکے یہ معنی نہیں کہ ہم اس طرز تحریر کو پسند کرتے ہیں۔ ہمارا ذاتی خیال تو یہ ہے کہ اردو کی ہیئت و فطرت کو مد نظر رکھ کر جہاں تک ہو سکے زبان کو سلیس، شگفتہ اور آسان بنانا چاہیئے۔ تاکہ ہر شخص کا دل اسکی طرف راغب ہو۔

بہرحال امیر کا عام طرز تحریر مقفیٰ و مسجع عبارت لکھنا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اُن کا وہ جواب پیش کرتے ہیں جو انھوں نے محسن کاکوروی کے مشہور قصیدہ نعتیہ سے

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل　　برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

تشبیب پر اعتراضات کی تردید میں لکھا تھا۔ فرماتے ہیں۔

"بادی النظر میں شبہ ہوتا ہے کہ قصیدہ نعت میں متھرا گوکل و کنھیا کا ذکر بے محل ہے لہذا دفع دخل کیا جاتا ہے کہ نعت میں تشبیب کے معنی ہیں، ذکر ایام شباب کرنا اور اصطلاح شعرا میں مضامین عشقیہ کا بیان کرنا۔ اساتذہ نے تخصیص مضامین عاشقانہ کی قید بھی نہیں رکھی۔ کوئی شکایت زمانہ کی کرتا ہے کوئی متفرق مضامین کی غزل لکھتا ہے کوئی غزل میں کسی طرح کا خاص تلازم ملحوظ رکھتا ہے۔ الغرض متبعان کلام اساتذہ و حقیقت شناسان تشبیب قصیدہ پر پوشیدہ نہیں ہے کہ مضامین تشبیب کے محصور نہیں ہیں اور نہ کچھ اس مناسبت کی قید ہے کہ حمد و نعت و منقبت میں قصیدہ ہو تو تشبیب میں بھی اسی کی رعایت ہے۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی نے منقبت میں قصیدہ لکھا ہے جس کا مطلع ہے؎

صبح کہ در ہوائے پرستاری وثن　　جنبد کلید بتکدہ در دست برہمن

اور اس قصیدہ کی تشبیب میں بھی ایسے ہی مضامین لکھے ہیں۔ عمدہ تر سند اس کے جواز کی یہ ہے کہ حضرت سرور کائنات خواجہ ہر دو عالم صلعم کے حضور میں قصیدہ بانت سعاد جس کی تشبیب بھی مشروع نہیں ہے پڑھا گیا اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان مبارک سے اس کی تحسین فرمائی۔"

شاعری اور نثر نگاری جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہوگا۔ امیر کے خدمات نثر نظم سے کچھ کم نہیں۔ اس لئے ہمیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ "تاریخ ادب اردو" میں امیر کا ذکر نثاروں کے زمرہ میں نہیں کیا گیا کچھ عجیب بات ہے کہ امیر کی شہرت کا انحصار تمام تر ان کی شاعری پر ہے۔ بہ حیثیت نثر نگار بہت کم لوگ ان سے واقف ہونگے۔ حالانکہ ان کے اشعار کو اگر کوئی وقعت دی جا سکتی ہے تو محض اس بنا پر کہ وہ امیر کے نام سے منسوب ہیں۔ ورنہ کوئی خاص بات ان کی شاعری میں نہیں پائی جاتی۔ بلکہ ایک تذکرہ نگار تو یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ امیر غیر فطری شاعر تھے[1]۔ اس فن کا خاتمہ ان سے پیشتر آنے والوں پر

---

[1] "ہمارے ایک نکتہ داں دوست کا قول ہے کہ "اردو شاعری کے ہر دور میں ایک غیر فطری شاعر" ایک فطری شاعر کا مد مقابل رہا ہے۔ جس کی ابتدا سودا و میر سے ہوئی۔ اور یہ تسلسل انشا و مصحفی۔ ناسخ و آتش۔ اور ذوق و غالب تک دوسرے کے حریف تسلیم ہو گئے۔ یہاں تک کہ امیر و داغ پر اس کا خاتمہ ہو گیا لیکن ہمارے نزدیک انشا، ناسخ، ذوق اور امیر کی طرح سودا کو بالکل غیر فطری شاعر تسلیم نہیں کیا جا سکتا" (شعر الہند جلد اول صفحہ ۳۲۸)

ہوگیا تھا۔ غزل کے محدود مضامین میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ انہیں کوئی ترقی دی جا سکتی۔ امیرؔ اور جلالؔ ناسخؔ اور آتشؔ کے بعد اس صنف پر طبع آزمائی کرنا بیکار سی بات ہے۔ چنانچہ امیرؔ بھی کوئی بات پیدا نہ کر سکے۔ اُنھوں نے پُرانے اساتذہ کی فرسودہ روشوں پر گام فرسائی کرنے اور متعدد مرتبہ بندھے ہوئے مضمونوں کو بنوع دیگر باندھنے کی کوشش کرنے پر اکتفا کیا۔ انھیں خود اس کا اعتراف ہے۔ ؎

امیرؔ ہے مجھے شیرینیٔ زباں سے غرض   کسے ہے فکر مضامین تازہ کی فرصت

اس میں کوئی شک نہیں کہ امیرؔ نے اپنے بعد اشعار کا کافی ذخیرہ چھوڑا اور اپنا بے انتہا وقت اس شغل میں صرف کیا۔ لیکن ہماری رائے میں انکی شاعری سے زبان و ادب، ملک و قوم کو کوئی قابل قدر فائدہ نہیں پہنچا۔ اگر یہ تمام ذخیرہ تلف ہو جائے تو زبان کو کیا نقصان پہنچیگا؟ ہم کہینگے "کچھ نہیں"۔ اس کے برعکس اگر خدانخواستہ انکی امیر اللغات معدوم ہو جائے تو اُردو کا دامن ایک گرانبہا لعل سے خالی ہو جائے گا۔

افلاطون نے اپنی مشہور آفاق تصنیف "جمہوریت" میں جو نظام شہریت کا قائم کیا ہے اسمیں ہر قسم اور ہر پیشہ کے لوگوں کو مناسب جگہ دی ہے لیکن شعرا کے لئے اُسکے یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس طبقہ کا وجود ملک و قوم کے لئے غیر ضروری سمجھتا تھا۔ یہ مثال تو دور کی تھی۔ اب گھر کی مثال لیجئے۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ ایک ہندی محب قوم مولانا حالیؔ نے جو خود ایک خوش فکر سخنور تھے اپنے لاجواب مسدس میں اس فرقہ کے متعلق قریب قریب اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ فرماتے ہیں۔ ؎

جو سقے نہ ہوں جی سے جائیں گزر سب   ہو میلا جہاں گم ہوں دھوبی اگر سب
بنے دم پہ گر شہر چھوڑیں نفر سب   جو تھڑ جائیں مہتر تو گندے ہوں گھر سب
پہ کر جائیں ہجرت جو شاعر ہمارے
کہیں مل کے خس کم جہاں پاک سارے

میں ان خیالات سے قطعی طور پر تو متفق نہیں ہوں لیکن اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ اُردو شعرا بڑی حد تک اس الزام کے صحیح طور پر مستحق ہیں۔ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں شاعری سے بھی بہت مفید کام لئے جا سکتے ہیں اور بعض بعض صورتوں میں شاعر کا وجود نہ صرف کار آمد بلکہ ضروری ہوتا ہے۔ عربوں نے اس فن شریف کا کس قدر برمحل استعمال کیا اور کیا کیا فائدے اُٹھائے۔ دُنیا جانتی ہے انگریزی شعرا میں

لارڈ بائرن کو گناہ مجسم تصور کیا جاتا ہے۔ جس کی حیات میں سوسائٹی اس سے قطعی متنفر رہی لیکن یہی بائرن ہے جو "چائلڈ ہیرالڈ" لکھ کر تمام عیسائی یورپ میں اس سرے سے اُس سرے تک آگ لگا دیتا ہے اور ترکوں کے مقابل سب کو آمادہ پیکار بنا دیتا ہے۔ بنکم چندر چٹرجی ایک ناول میں اپنی مشہور آفاق نظم "بندے ماترم" لکھتے ہیں۔ یہی "بندے ماترم" آج ہندوستانیوں کا قومی ترانہ بن جاتی ہے کانگریس کے پلیٹ فارم بندے ماترم کے فلک شگاف نعروں سے گونج اُٹھتے ہیں اور یہ چھوٹی سی نظم پڑھنے والوں اور سُننے والوں کے دل خدمت وطن کے جذبہ سے سرشار کر دیتی ہے۔ اسی کو شاعری کہتے ہیں۔ خود اُردو میں دیکھ لیجئے۔ اقبال کی نظموں نے انجمن حمایت اسلام کے لئے جو کچھ کیا وہ بڑے بڑے زبردست مقرروں کی تقریروں سے نہ ہو سکا۔ مسلمانوں کی قومی بیداری میں خواجہ حالی کے مسدس کا کتنا حصہ ہے؟ آج کل افادیت کا دور دورہ ہے۔ ہر چیز کو دیکھ کر سوال کیا جاتا ہے۔ "اِس سے کیا فائدہ؟" جب اِس نظر سے امیر کی شاعری کو جانچا جاتا ہے تو مایوسی ہوتی ہے۔ ان کے اشعار اس مطلب کے نہیں۔ ہاں بقول مولانا حالی مغفور۔

طوائف کو از بر ہیں دیوان ان کے ۔۔۔ گو توں پہ بیجا ہیں احسان ان کے

کلام پر تبصرہ | خالص ادبی زاویۂ نگاہ سے بھی امیر کے اشعار کو دیکھا جائے تو وہ گذشتہ اساتذہ کے مقابلہ میں کوئی اعلیٰ معیار سخن پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ امیر بالطبع قدامت پسند واقع ہوئے تھے لہٰذا وہ کبھی تقلید کے دائرہ سے باہر نہ نکل سکے۔ اپنے حریف داغ کی طرح وہ صاحبِ طرز اُستاد نہیں۔ ان کی تمام شاعری پُرانے اساتذہ کی روش پر محدود ہے۔ اُردو شعرا کی صفِ اولین میں غالباً ان کو جگہ نہ مل سکے۔ ہاں انکو دوسرے درجہ کا شاعر ضرور کہا جا سکتا ہے۔ "اوریجنیلٹی" اور ندرت ان کے کلام میں مفقود ہے۔ شعر کی ظاہری زیب و زینت سے مسحور ہو کر وہ اس کے حُسن باطنی سے بیگانہ ہو گئے۔ ان کی شاعری فردوس گوش ہے جس میں لذت درد کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ انکے اشعار کسی پیغام کے حامل نہیں۔ بلند خیالی اور جذبات کی ترجمانی کے نمونے اگرچہ موجود ہیں لیکن زیادہ نہیں۔ ان کے استاد اسیر کے متعلق لکھنؤ کے ایک مبصر نے اثنائے گفتگو میں مجھ سے فرمایا۔ "ان کے تمام کلام میں سات شعر بھی ایسے نہیں مل سکتے جو بامزہ ہوں"۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ رائے بہت کچھ مبالغہ پر مبنی ہے لیکن اس سے حقیقت کا اندازہ ضرور ہو سکتا ہے۔ امیر کا یہ حال تو نہیں، پھر بھی اُستاد کا اثر کافی ہے۔ تاثیر جو

شاعری کا مقصدِ وحید ہے' ان کے یہاں معدوم ہے۔ مصحفی نے سچ لکھا ہے" والحق کہ درویشی و شاعری دوش بدوش راہ می رود" آمیر تمام عمر درباری شاعر رہے اس لئے ان کے کلام میں درباری شاعری کے تمام نقائص موجود ہیں۔ درباری شاعر اپنے لئے شعر نہیں کہتا۔ وہ اپنے اشعار سے اپنے آقا کو خوش کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں تصنع اور آورد سے مفر نہیں۔ حقیقی شاعری اپنے لئے ہوتی ہے۔ شعر اصلی معنی میں وہی ہوتا ہے جو بے اختیار قلم سے ٹپک پڑے۔ شاعر جب اپنے جذبات و احساسات سے مغلوب ہو کر شعر کہیگا تو وہ شعر ہوگا کسی دوسرے کے لئے شعر نہیں کہے جا سکتے۔ اسکے علاوہ مؤثر اور دلپذیر اشعار وہی کہہ سکتا ہے جسکے دل نے کبھی چوٹ کھائی ہو۔ آمیر خوش قسمتی سے ہمیشہ فارغ البال رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں عام طور پر سوز و گداز کی کمی ہے۔ اگرچہ پر لطف اشعار بھی پائے جاتے ہیں لیکن وہ ایسے نہیں کہ پڑھنے والے کو محو و بیخود بنادیں۔ ان کے اشعار ہنگامی تحسین کے غلغلے بلند کرا سکتے ہیں اور بس۔ حالانکہ ؎

شعر دلکش ہو اگر صفحۂ کاغذ پہ عزیز ہے یہ معیار کمالِ سخن آرائی کا

تاہم اتنا ضرور عرض کرونگا کہ آمیر اس امر میں معذور ہیں۔ ماحول اور فضا کے اثرات قبول نہ کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ ان کا رنگِ سخن سوسائٹی کا رہین منت ہے۔ بہر حال ان کا کلام محاسن سے خالی نہیں جس کا ذکر آگے آئے گا۔

قادر الکلامی اور مشکل پسندی جناب امیر مینائی کے ضخیم دیوان اس امر کے شاہد ہیں کہ ان میں ملکۂ شاعری ودیعت کیا گیا تھا۔ کم از کم وہ قادر الکلام ضرور تھے۔ وہ نہایت پرگو تھے۔ انکی غزلیں درد کی طرح مختصر نہیں بلکہ میر کی طرح طویل ہوتی ہیں۔ سودا اور جرأت کے انداز سے وہ دو غزلہ اور سہ غزلہ لکھتے ہیں اور جب اس سے بھی طبیعت کو سیری نہیں ہوتی تو چہار غزلہ اور پنج غزلہ کی بھی نوبت آجاتی ہے۔ شاہ نصیر اور ذوق کی طرح انھوں نے سنگلاخ زمینوں اور دشوار گزار طرحوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں اکثر قافیہ بندی پر مضمون کو قربان کر دینا پڑتا ہے۔ ذیل میں انکے چند مطلعے لکھے جاتے ہیں جن سے انکی دشوار پسندی کا اندازہ ہو سکیگا۔ ؎

جب کبھی اس کو نئی شان سے ہم دیکھتے ہیں دل ہی واقف ہے جس ارمان سے ہم دیکھتے ہیں

ازل میں کس نے دکھائی نگاہ کی گردش کہ ساری خلق کو ہے اک نگاہ کی گردش

میں رو کے آہ کرونگا جہاں رہے نہ رہے — زمیں رہے نہ رہے آسماں رہے نہ رہے
شمشیر بے سناں ہی کسے دوں کسے نہ دوں — اک جانِ ناتواں ہی کسے دوں کسے نہ دوں
سب جلو میں آپکے آتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے — اک مجھی پر آپ جھنجھلاتے ہیں اُٹھتے بیٹھتے
سوز جگر سے شمع شبستاں بغل میں ہے — داغوں کی روشنی سے چراغاں بغل میں ہے
کیونکر رہے نہ زار تن و توش نقش پا — جز خاک کچھ نہیں ہے خورو نوش نقش پا
کہتا ہوں نہیں سو ہو دیکھو ہی بڑی دھوپ — اس وقت کہاں جاؤگے پڑتی ہے کڑی دھوپ
جو تجھ سے رُخ ملائیں چاند سورج — ابھی تو مُنہ کی کھائیں چاند سورج
چمکا کریں چمکیں جو چمن میں پرِ طاؤس — یاں داغ سے ہر عضو ہے تن میں پرِ طاؤس
عارض ترا اے گلبدن اک اس طرف اک اُس طرف — گویا کھلے ہیں دو چمن اک اس طرف اک اُس طرف
منکسرہ ہیں ہمارا گھر بنے اور ٹوٹ جائے — اُٹھتے ہی دیوار بیٹھے در بنے اور ٹوٹ جائے

ترجمانی جذباتِ حقیقی سے بے نیازی اور رکاکت

مصنف کی تصنیف جہاں اسکی سوسائٹی کا آئینہ ہوا کرتی ہے وہاں وہ خود اُسکی ذات بھی عکاس ہوتی ہے۔ ایک انگریزی مقولہ ہے کہ "مصنف کو اسکی تصنیف میں دیکھا جا اس خیال کو ذیل کے فارسی شعر میں جو خاندان مغلیہ کی مشہور شہزادی زیب النسا بیگم مخفی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے نظم کیا گیا

درسخن پنہاں شدم مانند بو در برگ گل — ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

اس لحاظ سے اگر مصنف کا عکس تصنیف میں نظر نہ آئے تو اسے تصنیف یا خود مصنف کی کمزوری سمجھنی چاہئے۔ اُردو شعرا میں بات بالکل نایاب ہے۔ یہاں اپنے جذبات کی ترجمانی نہیں کی جاتی بلکہ دوسروں کے فرضی احساسات اور خیالات کو نظم کر دینے اکتفا کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اثر اور سوز و گداز جو لوازم شاعری ہیں اور شعرا کے کلام میں باستثناء چند بہت کم پائے جا ہیں۔ دل پر اثر وہی بات کریگی جو دل سے نکلیگی۔ خود امیر کے کلام کو لیجئے انکے سوانحی حالات جو ہم تک پہونچے ہیں یہ نہیں بتاتے کہ ان کا کلام ایسا ہو سکتا ہے۔ امیر نہایت متشرع، پابند صوم و صلوۃ، صوفی مشرب اور پاکباز بزرگ لیکن کیا ان اوصاف کا کوئی شائبہ ان کے عاشقانہ کلام میں پایا جاتا ہے؟ کیا قیاس کیا جاتا ہے کہ ایسا پابند مذہب شخص شراب خواری کی تعریف میں اشعار لکھیگا؟ امرد پرستی کو اپنی تصانیف میں جگہ دیگا؟ رقاصہ سے علانیہ عشق اظہار کریگا؟ رکیک جذبات کو لکھ کر خوش ہوگا؟ لیکن

وائے بر شاعرانِ نادیدہ

گنڈا نظرِ گذر کا پنھائیگی آپ کو — قد ناپتی ہے زلف رسا سر سے پاؤں تک

اس سلسلہ میں کہیں کہیں ایسی رسموں کا بھی ذکر کر گئے ہیں جن کا تصور بھی مذاقِ سلیم پر بار ہے ۔

ملتا نہیں مزاج جو سوسن کا اے صبا — رسّی[1] ہے شاید آج عروسِ بہار کی

انگیا چوٹی | لکھنؤ کے عام رنگ کی مطابقت میں عورتوں کی انگیا چوٹی کا ذکر بھی مزے لے لیکر کیا ہے معشوق کے خد و خال اور ظاہری سامان آرائش کی تحسین و توصیف میں بھی دادِ سخنوری دی[2] ہے ۔ یہ رنگ اس وقت مقبول انام تھا ۔ امیر مینائی کے یہاں اس قسم کے اشعار بیشتر تعداد میں پائے جاتے ہیں ۔ جن سے زیورات کی ایک مکمل فہرست طیار ہو سکتی ہے ۔ آج کل یہ چیزیں معیار سخن سے گری ہوئی سمجھی جاتی ہیں ۔

مشتاق وصل کون ترا نازنیں نہیں — کرتی چھینی کہ پیٹی ہوئی آستیں نہیں

دبائے تو لاکھا ہی شاید دبائے — بہت شوخ ہے رنگ ان کی مسی کا

یہاں دل ہو صد چاک پڑتی ہیں چوٹیں — وہاں اُن کو سرمہ مسی سوجھتی ہے

نگہِ شوق سے کہتی ہے یہ عصمت اُس کی — کہ اچھوتا مرا ینڈا ہے نہ چھو تو مجھ کو

نور کا تن ہے نور کے کپڑے، اس پہ کیا زیور کی حاجت ہے — چھلے، کنگن ز کے، جوشن، ماشاءاللہ ماشاءاللہ

لعل کے جب نہ امید شگوفہ پر توافگن ہوگئی — کان کی بجلی چراغِ زیر دامن ہوگئی

یہ موئے مژہ بھی ہیں جادو کے پتلے — کہ جب دل میں آئے ہیں بھائے ہوئے ہیں

اندازِ کلام کا زنانہ پن | اسی رنگ کا طفیل سمجھئے کہ انداز کلام میں ایک حد تک زنانہ پن پیدا ہوگیا ہے ۔

جنازہ غیر کا نکلا ہے تو نکلنے دو — ہمیں کو بیٹھو جو چلمن سے جھانک کر دیکھو

چُبھ گئی گو بجھ جو بالی کی بگڑ کر بولے — ہاتھ ٹوٹیں ترے مشاطہ مرے کان گئے

آرسی سامنے آئی تو کہا جھنجھلا کر — دیدے پھوٹیں ترے کیوں گھورتی ہے تو مجھ کو

---

[1] مسّی کی رسم طوائفوں کے ساتھ مخصوص ہے نتھ اترنے کا بدل سمجھئے ۔ عروس کا اطلاق طوائف پر نہیں ہو سکتا ہے اس لئے میرے نزدیک مسّی کا استعمال بے محل ہے ۔ اظہار

[2] اسی رعایت سے جناب آسی مینائی کے ... ایک شاعر نے لکھا ہے ۔

سرِ بازار خوبرویاں ہے — اب وہ تعریف خد و خال کہاں

زبان پر فخر دہلی اور لکھنؤ کی رقابت بہت پرانی ہے ہمیشہ سے دہلی والے لکھنؤ والوں سے اور لکھنؤ والے دہلی والوں سے نوک جھونک کی لیتے رہے ہیں - ہر شخص اپنی زبان کے مقابلہ میں دوسروں کی زبان کو غیر مستند سمجھتا ہے - واقعہ یہ ہو کہ دہلی اور لکھنؤ اُردو کے دو بڑے مرکز ہیں اور دونوں کی زبان مستند ہے - دونوں نے اُردو کی پرورش میں حصہ لیا ہے اور دونوں احترام کے مستحق ہیں - زبان کی ترقی میں شہروں کا سوال بے محل ہے - بہرحال اس بات سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی کہ دہلی اور لکھنؤ میں چوٹیں چلتی رہیں - اُردو نے جب سے بزم شرفا میں بار پایا ہے شعرا اپنی زبان دانی پر فخر کرتے آئے ہیں دہلی کے کسی قدیم اُستاد غالبًا میر کا شعر ہے - ؎

گفتگو ریختہ میں ہم سے نہ کر   یہ ہماری زبان ہے پیارے

مرزا غالب نوا سنج ہیں ؎

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی   گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سُنا کہ یوں

اصغر علی نسیم دہلوی کا دعویٰ ہے - ؎

نسیمِ دہلوی ہم موجدِ بابِ فصاحت ہیں   کوئی اُردو کو کیا جانے کہ جیسا ہم سمجھتے ہیں

مرزا داغ کی تعلّی ملاحظہ ہو - ؎

اُردو ہے جسکا نام ہمیں جانتے ہیں داغ   سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

غالبًا ان سب کا جواب آمیر مینائی نے لکھنؤ کی طرف سے دیا ہے اور اچھا دیا ہے - فرماتے ہیں - ؎

دعویٰ زباں کا لکھنؤ والوں کے سامنے   اظہار بوئے مشک غزالاں کے سامنے

مقامات کی تعریف اُردو شاعری میں عام طور پر مقامات کا بیان نہیں ملتا - کہیں کہیں بعض شعرا نے لکھنؤ اور دہلی کی تعریف میں اشعار ضرور لکھے ہیں - دہلی کے عزاداروں میں مولنا حالی اور مرزا داغ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں لکھنؤ میں شیخ ناسخ نے ع لکھنؤ مجھ پر فدا ہے میں فدائے لکھنؤ، کہہ کر حب وطن کا حق ادا کیا ہے - اسی طرح بعض غزلوں میں شیخ مغفور نے لکھنؤ کا تذکرہ کیا ہے - آمیر مینائی نے لکھنؤ کی تعریف میں ایک شعر خوب کہا ہے - ؎

کہاں ہونگی آمیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں   رہیگا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ رسول

قیصر باغ اور رامپور کی تعریف میں پوری غزلیں موجود ہیں لیکن یہ تعریف لکھنؤ کے رنگ میں کچھ اس قدر ڈوبی ہوئی ہے کہ واقعیت سے دُور ہوگئی ہے اور مزہ نہیں دیتی - ؎

ہما اُڑ جاتا ہے قباحت سے بھی کہیں شان رامپور   زلف پری ہے سایۂ ایوان رامپور
نے حقیقت کا

محوِ خرام ناز نسیم و صبا نہیں — گلگشت کر رہے ہیں حسینانِ رام پور
آشفتگی یہاں کی ہے طرہ بہار پر — زلفِ بتاں ہے خوابِ پریشانِ رام پور

ـشانی نے پہلے مصرع کو بھی بیکار کر دیا ورنہ شعر اچھا ہو سکتا تھا۔

چکتے ہیں بے سبب نہیں دن رات آسماں — کرتا ہے مہر و ماہ کو قربان رام پور

فی الحقیقت یہ بھی کم گلزارِ جنت سے نہیں — حوریں پھرتی ہیں سرِ بازار قیصر باغ میں
ہر روش پر چل رہی ہے ایسی صحت کی ہوا — چشمِ نرگس تک نہیں بیمار قیصر باغ میں

ـدہ کی شان پیدا ہو گئی ہے۔

پاؤں کا یاں ذکر کیا صاف ہے ایسی زمیں — دل پھسلتے ہیں دمِ رفتار قیصر باغ میں
اتنے پتے بھی نہ ہونگے گلشنِ فردوس میں — جس قدر پھولوں کے ہیں انبار قیصر باغ میں

ـ سب اشعار کے بعد امیر کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے جو دلی کی تعریف میں ہے۔ ظالم نے کس قیامت کا شعر کہا ہے نشتر ہے نشتر!!

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے — جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

ـاظرِ قدرت اُردو شعراء نے بالعموم اس جانب کم توجہ کی ہے۔ ابتداءً میر حسن، اور متاخرین کے دورِ اول میں ـس و دبیر نے البتہ اس روش کو اختیار کیا اور خوب خوب لطف پیدا کئے۔ دورِ ثانی میں پیارے صاحب رشید کے بہاریہ مرثیے ـ نہایت دلچسپ ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک فراموش ہونے والا نام نظیر اکبر آبادی کا ہے۔ جن کو اُردو کا شیکسپیر بجا طور پر ـ جا سکتا ہے۔ امیر کے یہاں غزلوں میں تو یہ رنگ بہت کم ہے۔ البتہ قصائد وغیرہ میں اسکے نمونے ملتے ہیں۔ ایک ـیع بند میں بہار کی کیفیت کو نظم کیا ہے۔ یہاں اسکے چند بند نقل کر دینا لطف سے خالی نہ ہوگا۔

لو تماشائے گل و سنبل و سوسن کو چلو — دیکھنے شاہدِ مقصود کے جوبن کو چلو
سیر کا وقت ہے گردان کے دامن کو چلو — بیٹھنا گھر میں مناسب نہیں گلشن کو چلو
تند پر شور و سیہ مست ز کہسار آمد
میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

کرتے ہیں مرغِ چمن شور گھٹا چھائی ہے — ہر روش ناچتے ہیں مور گھٹا چھائی ہے
لطفِ برسات کا ہے زور گھٹا چھائی ہے — صحنِ گلزار میں گھنگھور گھٹا چھائی ہے

تند و پر شور و سیہ مست ز کہسار آمد
میکشاں مژدہ کہ ابر آمد و بسیار آمد

"زور" کو قدیم معنوں میں استعمال کیا ہے لیکن نسبت الفاظ کچھ اس قدر عمدہ ہے کہ گراں نہیں معلوم ہوتا۔ ؎

زینتیں حور کی وہ کان کی خداداد ہوئیں — اڑ چلیں بوتلیں ایسی کہ پریزاد ہوئیں
خاطریں قید غم دہر سے آزاد ہوئیں — بھٹیاں بادہ فروشوں کی پھر آباد ہوئیں

تند و پر شور و سیہ مست ز کہسار آمد
میکشاں مژدہ کہ ابر و بسیار آمد

اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر بات جو امیرؔ مینائی کے ساتھ مخصوص ہے اور دیگر اساتذہ کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ امیر اکثر مناظر قدرت کی تشبیہ دے کر کیفیات طلب بیان کر جاتے ہیں۔ نیچر کی بصورتی کو داستان حسن و عشق کے ساتھ نفاست سے وابستہ کرتے ہیں۔ ؎

ہلال و بدر دونوں میں امیرؔ اسکی تجلی ہے — یہ خاکہ ہے جوانی کا نقشہ ہے لڑکپن کا
امیرؔ آیا نظر جب چودھویں کا چاند ہم سمجھے — کسی نقاش نے کھینچا ہے نقشہ اسکے جوبن کا
یہ تر و تازہ چمن ہے کہ تمھارے عارض — دھواں دھار گھٹا ہے کہ تمھارے گیسو
جو بجلی ابر میں چمکی کبھی قیس حزیں سمجھا — سیہ خیمہ سے باہر لیلی محمل نشیں نکلی
ہوئی تھی راہ جو رنگین تری رنگیں خرامی سے — وہی قوس قزح بن کر سر چرخ بریں نکلی
گھٹائیں برق جو چمکی تو یاد آئی امیرؔ — ادا کسی کی وہ پردہ اٹھا کے آنے کی
آسماں پر جو ستارے نکل آئے تو امیرؔ — یاد آئے مجھے داغ اپنے ابھرنے والے

محاکات شاعر اور مصور کا کام ایک ہے۔ مصور موقلم سے ایک منظر کھینچ کر آنکھوں کے سامنے پیش کرتا ہے اور شاعر الفاظ کے ذریعہ قوت تخیلہ کے سامنے ایک منظر لا کھڑا کرتا ہے۔ اس لئے ایسے اشعار کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے جن سے کوئی تصویر کھینچی گئی ہو یا جنکی تصویر کھینچی جا سکتی ہو۔ اصطلاح میں اسکو محاکات کہتے ہیں۔ افسوس ہے کہ امیرؔ کے یہاں محاکات کے اعتبار سے قابل التفات اشعار کی تعداد زیادہ نہیں لیکن جو ہیں غنیمت ہیں۔ ؎

قدم کو لغزش، زباں کو لکنت، ہے رعشہ ہاتھوں کو سر کو جنبش — کہاں گئی ہائے نوجوانی آن آفتوں میں ہیں پھنسے
یار کے اٹھتے ہی برہم ہو گیا سامان عیش — مے کہیں مینا کہیں ساقی کہیں ساغر کہیں

محفل برخاست ہے پتنگے — رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر — تارے کہیں نام کو رہے ہیں
ان کی بھی نمود ہے کوئی دم — یہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں
دنیا کا یہ رنگ اور ہم کو — کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں
نوجوانی میں بھی باقی ہے انھیں اتنا حجاب — کوئی بیٹھا ہو تو شرماتے ہیں اٹھتے بیٹھتے
جبیں قمر ہے ہلال ابرو، تو چہرۂ غصہ ہلال بھی ہے — ہو ان سے ظاہر ہے شان خالق جمال بھی ہے جلال بھی ہے

جوش بیان | آپ کا کلام سرتاپا تغزل سے مملو ہے۔ ان کے یہاں درد اور دبی ہوئی درد ہے۔ انہیں یہی وجہ ہے کہ جوش بیان کے نمونے ان کے کلام میں کم پائے جاتے ہیں۔ جوش کیسا مضمون کا نام ہے جب دل میں کیفیت نہ ہو جوش کیا ہوتا معلوم۔ پھر بھی ان کے بعض اشعار ہیں جو جوش بیان، علو خیال اور سلاست زبان سے دست و گریبان ہیں۔ ذیل کی غزل سرتاسر ان صفات سے متصف اور آمد اور قدرت شعری کی مظہر ہے۔ ؎

تیر کھانے کی ہوس ہے تو جگر پیدا کر — سرفروشی کی تمنا ہے تو سر پیدا کر
کون کہتا ہے کہ کوئی نیشوہ مشتاق نہیں — ہے جو عاشق دل معشوق میں گھر پیدا کر
تنگ جا ہے اگر اس باغ میں آزادی کا — نکہت گل کی طرح شوق سفر پیدا کر
قطرۂ اشک بنے گوہر گوش جاناں — آبرو اتنی تو اے دیدۂ تر پیدا کر
کون سی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں — شوق دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر
میرے ہی دل پہ گرے کاش یہ بجلی بن کر — اے فلک آہ میں اتنا ہی اثر پیدا کر
آخرت میں عمل نیک ہی کام آئیں گے — پیش ہے تجھکو سفر زاد سفر پیدا کر
اپنی گردن پہ نہ سمجھے اسے تیغ خنجر — جب میں جانوں کہ شب غم کی سحر پیدا کر
صدمے الفت کے اٹھانے ہیں الہٰی مشکل — دل اگر ایک دیا لاکھ جگر پیدا کر
عشق بازی کا اگر حوصلہ رکھتا ہے امیر — دل جو لوہے کا تو پتھر کا جگر پیدا کر

محذوفات | بیان واقعہ میں بعض اجزا کو اس طرح حذف کر دینا کہ وہ خود بخود پڑھنے والوں کے پیش نظر ہو جائیں۔ زور بیان اور لطف کلام کو بڑھا دیتا ہے۔ تفصیل طبعاً ناگوار ہوتی ہے۔ اجمال بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے قادر الکلام شعرا خود اس قدر نہیں کہتے جتنا پڑھنے والے کے سوچنے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں لیکن یہ بات ہر شاعر کے بس کی نہیں

منی فی بطن الشاعر" دالا مضمون ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ شاعر خود نہ کہے لیکن شعر میں ایسے الفاظ موجود ہو پڑھنے والے کا ذہن محذوف حصہ کی طرف منتقل کر دیں۔ دیکھئے امیر کے حسب ذیل شعر اس خوبی کی بنا پر نہایت دلکش ہو گئے

انسان کو اگر کوئی تکلیف ہوتی ہے تو محض اس وجہ سے کہ اسکے اپنے مقاصد میں ناکامیاں نصیب ہوتی ہیں امید ی نہیں ہوتیں۔ بے نیاز تمنا دل ہر قسم کے آلام سے مامون و مصئون رہتا ہے۔ بقول فانی :-

کھیل تھا سب امید کا یہ نہ رہی تو کچھ نہ تھا آرزوؤں کی کیا بساط شوق کا کاروبار کیا

م مصائب کی جڑ امید ہے اور ترک تمنا ان کا واحد علاج۔ انسان بے نیاز ہو جائے۔ نہ آنے کی خوشی کرے اور نہ جینے کا غم۔ م تکالیف سے پیچھا چھوٹ جائے۔ اسی خیال کو امیر نے نظم کیا ہے۔ لیکن "تمنا باعث تکلیف ہے" اس جزو کو محذوف رکی دلکشی کو دو بالا کر دیا ہے :-

پہلے میں ترک تمنا کی تمنا کرتا وہ جو امید بر آوری پہ آمیر آ جاتے

حیات مستعار کی تکلیفیں نا قابل برداشت تھیں۔ حیات دوام کے آلام کا کیا ٹھکانا۔ ذیل کے شعر میں امیر نے یہ کچھ ن انداز سخن سے یہ ساری باتیں پیش نظر ہو جاتی ہیں :-

قیامت کا اگر ڈر ہے تو یہ ہے کہ ہے ہم کو پھر جینا پڑیگا

جینا پڑیگا" گویا جینا چاہتے نہیں مجبوری ہے کہ جی رہے ہیں۔ قیامت بقاء دوام کا پیام لیکر آئیگی وہ مخص کاٹے کٹے نہ جس سے دو دن بھی زندگی کے

بے ثباتی کے صدمے کس طرح اٹھا سکیگا ؟ حسن بیان اسی کا نام ہے۔

شاعر میکدہ کی طرف جاتا ہے۔ وہاں محتسب کو زخمی اور قاضی کو برہنہ سر دیکھتا ہے۔ اسے خیال گزرتا ہے کہ دونو جب التعظیم ہستیوں کی گت بادہ خواروں نے بنائی ہوگی۔ شاید تشبیہ میں چور ہونے کے باعث انھیں آداب اخلاق یاد نہیں رہا

قاضی برہنہ سر تو ہے زخمی ہے محتسب شاید کہ پی گئے ہیں بہت بادہ خوار آج

بہت" اور "آج" سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ واقعہ غیر معمولی ہے۔ ورنہ قاضی اور محتسب تو یوں بھی دوا تلقین کرنے سننے کے عادی تھے۔ لیکن بات اتنی کبھی نہ بڑھتی تھی جو نشہ معمول سے زیادہ چڑھ گیا اور بادہ خوار قاضی و محتسب سے دگریبان ہو گئے۔

عاشق راتوں کو مصروف فغاں رہا کرتا ہے۔ محلہ والے تنگ آ گئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ کسی طرح اسکا پردہ ڈھکا رہے عاشق تکالیف ہجر سے مجبور ہو کر دعائے مرگ مانگتا ہے اور سننے والے بے اختیار ہیں کہتے ہیں :- ع

کہیں مر بھی چکئے جھگڑا چھوٹے

ہ لیجیے کہ عاشق کی خستہ حالی محلّے والوں سے نہیں دیکھی جاتی۔ اسکی حالت مایوس کن ہو چکی ہے اور ع موت ہی سے اب علاج دردِ
تو ہو۔ کا مضمون ہے۔ تقاضائے رحمدلی ہے کہ وہ دعائے مرگ پر آمیں کہتے ہیں کہ عاشق مرکے تکالیف سے چھٹکارا پائیگا۔ ؎

دعائے مرگ جو فرقت میں مانگی
محلّے والے چلّائے کہ آمیں

وعدۂ وصل کرتا ہے لیکن عاشق کے ؎

عزم اتنے ہوئے ہیں شیخ کہ اب
دل ارادے سے کانپ جاتا ہے (جوش)

قدر بدگمان ہے کہ یہ سمجھ چکا ہے کہ میرے نصیب میں مسرت ہی نہیں اس لئے یہ امید نہیں کہ وعدہ پورا ہو۔ اکثر بن بن کر
ٹا گئے ہیں۔ ؎

تیرے وعدے پہ شاد ہوں کیونکر
اپنی قسمت کو جانتا ہوں میں

رقت کی صبح نہیں ہوتی۔ درازیِ شب ہجراں عاشق کی جان لیکر جاتی ہے۔ ؎

آج امید صبح ہونے کی
حضرت دل یہ شام فرقت ہے

فرقت کے آلام و مصائب کا کیا ٹھکانا۔ زندگی کی امید کیسے ہوتی ہے۔ عم نصیب عاشق یہ تمام رنج و محن برداشت کرتا ہے
زباں نہیں لاتا۔ ع ہم اگر عرض کرینگے تو شکایت ہوگی۔

فرقت میں زندگی یہ عنایت خدا کی ہے
آگے جو کچھ کہوں تو شکایت خدا کی ہے

و کچھ کہوں تو شکایت خدا کی ہے" کہہ کر سب کچھ کہہ دیا۔ غالب نے کہا تھا۔ ؎

زندگی اپنی اسی ڈھب سے جو گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کرینگے کہ خدا رکھتے تھے

بیہات و استعارات | شاعری کے اجزائے اعظم ہیں۔ ان کے برمحل اور برجستہ استعمال سے شعر کی لطافت اور
زیری کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔ اور کلام میں زور اور وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ شاعر کا کام اپنے جذبات اور مشاہدات
کرتا ہے۔ ہر شخص دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ لیکن ان کیفیات کو قلمبند کرنا ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ بعض کیفیتیں ایسی ہوتی ہیں
سادی عبارت ان کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ان کے بیان کے لئے نئے اسالیب ان کے ذہن نشین کرنے کے لئے نازک مثالوں
رت ہوتی ہے۔ ایسے وقت میں تشبیہات اور استعارات ہی شاعر کے کام آتے ہیں۔ بقول مرزا جعفر علی خاں صاحب اثر لکھنوی کے

"جب کسی نہایت نازک چیز یا حالت کا بیان کرنا ہوتا ہے تو الفاظ و عبارت کام نہیں دیتی اور یہ نظر آتا ہے کہ الفاظ نے چھوا تو ان کو صدمہ پہنچ جائیگا جس طرح حباب چھونے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر شاعر کو تشبیہ سے کام لینا پڑتا ہے۔"

زمانہ، نومبر سنہ ۱۹۳۶ء صفحہ ۳۸۰

تشبیہ و استعارہ ایسی چیزیں ہیں کہ ہر شخص ان سے کام لیتا ہے۔ اس لئے ایک کامیاب شاعر کے لئے ضروری ہے کہ وہ نئی نئی تشبیہ اچھوتے استعارے تلاش کرکے اپنے کلام میں داخل کرے جن سے لطفِ سخن دوبالا ہو۔ امیر نے تشبیہات اور استعارات کو نفاست سے برتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے۔

عاشق کے دل کو شبنم اور عکسِ روئے دلربا کو جمالِ آفتاب سے تشبیہ دی ہے جس سے ضمناً عاشق کا فنا فی المحبوب ہونا بھی

دلِ عاشق میں کیونکر عکسِ روئے دلربا ٹھہرے
جمالِ آفتاب آئینۂ شبنم میں کیا ٹھہرے

جبینِ محبوب کو آسمانِ حسن اور افشاں کے تاروں کو تاروں سے تشبیہ دے کر کس قدر حسین کیفیت پیدا کی ہے۔

جھڑ گئی افشاں جبیں پر کچھ تارے رہ گئے
آسمانِ حسن پر گنتی کے تارے رہ گئے

"گنتی کے تارے" اس ٹکڑے نے شعر کو کتنا دلچسپ بنا دیا ہے۔

شباب کی کیفیت کا کتنا صحیح فوٹو ہے۔

نہ پوچھ عیشِ جوانی کو ہم سے پیری میں
ملی تھی خواب میں وہ سلطنت شباب نہ تھا

کثرت میں وحدت کے مسئلہ کو کس خوبی سے ذہن نشین کیا ہے

حق کہ دو جہاں میں ہو ذات اللہ ایک
دو آنکھیں جس طرح کہ ہوں ان میں نگاہ ایک

زیست کی بے اعتباری کیسی بیساختہ تشبیہ ہے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ تشبیہ سے کام لیا گیا ہو۔ باتوں باتوں میں کس قیامت

زیست کا اعتبار کیا ہے امیر
آدمی بلبلا ہے پانی کا

پیشِ یار جاتے وقت دل میں کیا کیا مسودے ہوتے ہیں لیکن وہاں جاکر رعبِ حسن سے زباں نہیں کھلتی حسرت موہانی۔

بے زبانی ترجمانِ شوق بے حد ہو تو ہو
ورنہ پیشِ یار کام آتی ہیں تقریریں کہیں

صورتِ سوال ہو کر خموشی سے تقریر کا کام لیا جا سکتا ہے۔ دیکھئے کتنی برجستہ تشبیہ ہے۔

مثلِ مکتوب نہ کہنے میں ہے کیا کیا کہنا
نہ مری طرح خموشی نہ کسی کا کہنا

جمالِ محبوبِ حقیقی کے مشاہدے کے لئے آنکھ کی ضرورت نہیں۔

کس کام کی ہے آنکھ تری جلوہ گاہ میں
کیا احتیاجِ شمع تماشائے ماہ میں

نقاب فانوس ہے اور روئے محبوب شمع۔

نقاب ڈال کے ائے ہیں وہ تو کیا پردا
چھپے نہ پردۂ فانوس میں ضیائے شمع

محبوب کو سب نے حور بتایا ہے لیکن دربان کو رضوان سے تشبیہ دینا جدت ہے۔

کیوں وہ شرمائیں اپنے دربان سے
حوریں چھپتی نہیں ہیں رضوان سے

نگاہ ناز سے یا برق خرمن ۔ ؎

چار آنکھیں ہوتے ہی جاتے رہے صبر و قرار سمجھا نگاہ ناز تھی جو برق خرمن ہو گئی

(ل) سامنے ہے لیکن قدم نہیں اٹھتا۔ اس مسافر بیکس کی حسرت پر رونا چاہیئے جو منزل کے سامنے تھک کر بیٹھ جائے
لے قریب آ کر کشتی ٹوٹ جائے۔ موت اور زندگی چند قدم کا فاصلہ رہ جائے کیسی حسرت کا وقت ہوتا ہے ۔ ؎

وا ماندہ دور سے یوں منزل کو دیکھتے ہیں کشتی شکستہ جیسے ساحل کو دیکھتے ہیں

ہ کی لطافت اور نزاکت اور بھی بڑھ جاتی ہے اگر متحرک ہو۔ امیرؔ کو اس قسم کی تشبیہوں کے استعمال میں مطولی حاصل ہے
لے۔ اضطراب دل کی کیفیت کو کس عجیب دلفریب انداز سے دکھایا ہے۔ کتنی حسین تشبیہ ہے اور کس قدر مکمل۔

نبض کی چال سکھائی طپش دل نے مجھے عمر چلتے ہوئے گزری کہیں آیا نہ گیا

باریور اتر نا کس قدر قیامت خیز منظر ہوگا۔ ہرے بھرے درختوں کا پامال خزاں ہونا قلب حساس کے لئے کچھ کم ستم انگیز نہیں

شاخوں سے برگ گل نہیں جھڑتے ہیں باغ میں زیور اتر رہا ہے عروس بہار کا

بوب کی کیف آور تصویر ۔

ان ہونٹوں پہ کھیلنا مِسّی کا کھلنا دکھلا گیا کلی کا

ثالیں ملاحظہ ہوں ۔

جو یوئے گل چمن میں ڈھونڈتے ہیں مسافر کو وطن میں ڈھونڈتے ہیں

نکات سے شاخوں میں جنبش ہوا سے پھولوں میں بہار جھول رہی ہے خوشی کے جھولوں میں

پیاری تشبیہ ہے ۔ ؎

تھا آنا کہ ہو نہ ظاہر عیاں تھا جانا کہ سب یہ ں ماہر وہ دل میں آئے رنگ ہو کر گئے چہرے کا رنگ ہو کر

ریاض دہر میں پوچھو نہ میری بربادی برنگ بو ادھر آیا ادھر روانہ تھا

مری کشتی برنگ موج اس بحر حوادث میں کنارے تک اگر پہونچے تو ٹکر کھائے ساحل کی

ال لیکن یہ جدید تشبیہیں کہیں کہیں باندازِ ناسخ پھبتیاں بن گئی ہیں ۔ ؎

نکالتے ہیں وہ مانگ ور دل یہ کہتا ہے نکل رہی ہے سڑک یہ بلا کے آنے کی

سب کی نظروں میں ہیں گر دل میں ہیں ہمارے خلوت کی کوٹھری بھی بازار ہو گئی ہے

یہ کی باریکی اور سحر طرازی اسوقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب وہ ان صورتوں میں واقع ہوتی ہے جن میں حرکت پائی جاتی ہے۔
شعر الہند جلد اول بحوالہ اسرار البلاغۃ صفحہ ۱۴۵ از امام عبدالقاہر جرجانی

نہیں خال یہاں جو ہیں نمایاں اسکے ابرو پر
نشیمن زاغ نے آکر بنایا شاخ آہو پر

مخمور آنکھیں یہ نہیں ساقی مے کشو
بلور کی پیالیوں میں ہے شراب سرخ

حسن ترکیب | شعر کی ظاہری خوبیوں میں سے ایک ترکیبوں کی برجستگی اور ندرت ہے جس قدر رواں اور برجستہ ترکیبیں صرف کی جائینگی اسی قدر شعر کا لطف زیادہ ہو گا ترکیبوں کی مثال انگوٹھی میں نگینہ کی سی ہے۔ امیر نے اپنے اشعار میں بعض اچھی ترکیبیں استعمال کی ہیں:۔

آنسوؤں آپ چھپنے میں بجھا دو نگا میں آگ
آتش افروز انکو بھڑکائیں تو بھڑکانے بھی دو

بیابان مرگ میں اہل وطن کا شک گزرتا ہے
لپیٹی ہے ہماری خاک میرا ایک ایک ہی

جس دن سے اس غریب کو آیا ہے تو پسند
ہے کس غضب میں جان دل آرزو پسند

رشتہ بر پا مجھے صیاد نے آزاد کیا
تا گئی جو نرگس کا نئے نئے گلستاں میں ہوں

اغلاط تراکیب | لیکن کہیں کہیں یہ ترکیبیں اصول قواعد کے لحاظ سے غلط بھی ہوتی ہیں۔ فارسی اور ہندی الفاظ میں ترکیب نہیں کیا جا سکتا۔ مگر امیر کے یہاں ایسی مثالیں موجود ہیں:۔

بخیے کا دیا حکم تو بولے دہن زخم
سلواتے ہو کیوں قاتل سے ان لبوں ہم

وصلت کی رات اور موذن گجر فروش
ہوتے ہیں کیسے کیسے ملاؤں کے سامنے

گجر ہندی لفظ ہے۔ اس لئے گجر فروش کی ترکیب کو جائز نہیں کیا جا سکتا۔

متروکات | یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ امیر نے بھی "زور" کو بمعنی "خوب" یا "بہت" استعمال کیا:۔

ناتوانی نے زور کام کیا
چڑھ گئے یار کی نگاہوں پر

عبرت | معلوم ہوتا ہے کہ امیر نے فلسفۂ ہستی کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس نے ان کے دل پر دنیا و مافیہا کے ہیچ ہونے کا نقش بٹھا دیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ دنیا چند روزہ ہے۔ یہاں کے تفکرات اور عیش و آرام سب فانی ہیں۔ تدبیر کنند بندہ تقدیر کند خندہ کے عبرت انگیز مناظر انکی چشم حقیقت بین نے اکثر دیکھے تھے۔ کارزار حیات کے پرغور مشاہدہ نے انکو پیکر عبرت بنا دیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ باوجود تہذیب کی کارفرمائیوں اور سائنس کی ہنگامہ آرائیوں کے مجبور محض ہے۔ بڑے بڑے انسانی اہتمام قدرت کی لاتعداد قوتوں سے متصادم ہو کر چشم زدن میں قصۂ ماضی بن جاتے ہیں۔ ٹائی ٹینک جہاز کی غرقابی اور آر ہنڈرڈ ون طیارہ کی تباہی انسانی تدبیروں کے لاحاصل اور نظام کائنات کا کسی مافوق الفطرت ہستی کے اشارہ چشم و ابرو کا تابع ہونے کی شاہد ہیں۔ امیر کی ذہنیت نے ان واقعوں میں دنیا کو بے وقعت اور بے نتیجہ بنا دیا تھا۔ چنانچہ اسکی جھلک انکے کلام میں جا بجا نظر آتی ہے:۔

چنے نہیںوں ہی تنکے غریب بلبل نے | مگر نصیب نہ دور فراز آشیانہ ہوا
وہ گلعذار کہ تلتے تھے زر در پھولوں میں | انھیں کی خاک شریک آج ہے بگولوں میں
زندگی میں ہے موت کا کھٹکا | قصر کیا مقبرہ بنائیں ہم
مری کشتی بہ رنگ موج اس بحر حوادث میں | کنارے تک اگر پہونچے تو ٹکر کھائے ساحل کی
نفس کی آمد و شد ہر نفس یہ کہتی ہے | کوئی دم اور تجھے اختیار باقی ہے
قفس کی تیلیاں ہیں جتنی شاخیں ہیں درختوں کی | کہاں باندھے الٰہی اس چمن میں آشیاں کوئی
ہے حادثوں سے بعد فنا بھی کہاں نجات | ممکن نہیں کہ زیر زمیں آسماں نہ ہو
یہ جو ہے یہ صحبت یہ عالم کہاں | خدا جانے کل تم کہاں ہم کہاں

مرزا غالب کی طرح فلسفہ یاس کے علم بردار ہیں۔ ان کے نزدیک دنیا طرب خانہ نہیں دار المحن ہے جس میں تلاش آرام بے سود۔ غالب کہتا ہے ع

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں | موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

اسی خیال کو امیر نے ایک رباعی میں نظم کیا ہے۔ ؎

خواہان طرب سے جیسے اور اک نہیں | آرام تہ گنبد افلاک نہیں
پیمانہ گردوں میں کہاں بادہ عیش | جز دُرد تہ جام یہاں خاک نہیں

…نی زبان مستزاد ہے۔ مصرعہ آخر میں۔ "خاک" نے عجیب مزہ دیا ہے۔

تصوف اُردو شاعری کی نشو و نما فارسی کے نقش قدم پر ہوئی ہے۔ اس وجہ سے فارسی شاعری کی تمام خصوصیات اس میں پائی جاتی ہیں۔ فارسی کے مشہور اساتذہ حافظ اور سعدی وغیرہ کی طرح صدر نشینان بزم اُردو ولی دکنی، شاہ آبرو، مرزا مظہر جان جاناں … خواجہ میر درد صاحبان خرقہ و سجادہ تھے۔ ظاہر ہے۔ جو شاعری ان صاحب باطن بزرگوں کی گود میں پرورش پائے اس پر تصوف کا اثر ہوگا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ شروع ہی سے اُردو شاعری میں تصوف جزو اعظم بن گیا تھا خصوصاً شعرائے دہلی میں کیا ہندو کیا … لیکن اس رنگ کی چاشنی بہت نمایاں ہے۔ البتہ بقول مرزا جعفر علی خاں اثر "لکھنؤ میں علاوہ آتش کے اس رنگ کی طرف … کم توجہ کی گئی"۔ امیر خود صوفی اور صاحب نسبت بزرگ تھے۔ ناممکن تھا کہ ان کا کلام تصوف کی آمیزش سے خالی رہتا۔ اگرچہ … وہ رنگ زمانہ کے مقلد ہیں اور معشوق مجازی کے حسن ظاہری اور زیب و زینت کے مدح گستر ہیں۔ لیکن دل میں درد معشوق … حقیقی کا رکھتے ہیں۔ معشوق مجازی کی الفت کو کیفیات عشق حقیقی کا پردہ سمجھتے ہیں اور فرماتے ہیں۔ ؎

عشق بت سے بھی تھا خدا مطلب | ورنہ واللہ کچھ نہ تھا مطلب

ظاہر میں ہم فریفتہ حسن بتاں کے ہیں
پر کیا کہیں نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں

کے نزدیک ع بت پردہ ہیں، پردہ میں چھپا اور ہی کچھ ہے؛ اور یہ پردہ گفتگو میں کام بنانے کے لئے وضع کرلیا گیا ہے۔ بقول

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

ب کچھ سہی لیکن بید ظاہر بینوں کا کیا علاج جنکے دماغوں کی رسائی اس امر تک نہیں ہوسکتی اور جو کنگھی چوٹی کے ذکر میں کیفیا
حقیقی کا لطف نہیں اٹھا سکتے۔ بہرحال حاصل کلام یہ ہے کہ امیر نے اپنے مشرب کے مطابق تصوف کی چاشنی سے اپنے کلام کو بامزہ
وحدت الوجود ہے۔ ؎

راز توحید کا جو ظاہر ہو
ایک منظور اور ناظر ہو

دست ؎

یہ مہر و مہ و لالہ و گل نہ سمجھو
دکھاتے ہیں جلوے وہ شکلیں بدل کر

اسی کا ہے رنگ یاسمن میں اسی کی بو باس نسترن میں
جو کھڑکے پتا بھی اس چمن میں خیال آئے وا آشنا کر

عرفاں کی سجدہ گاہ ظاہر بینوں کی وسعت نگاہ سے ماورا ہے۔

قبلۂ دل کعبۂ جاں اور ہے
سجدہ گاہ اہل عرفاں اور ہے

لہی ہر رنگ میں نمایاں ہے۔ ؎

اے چشم شوق وہ تو ہر رنگ میں ہے ظاہر
اب بھی جو تو نہ دیکھے تو ہے قصور تیرا

وادی خرمن میں تھی برق تجلی بے حجاب
حیرت موسیٰ تھی پردہ جلوہ گاہ طور کا

کون سی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں
شوق دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر

ان حقیقی پابندی آداب ظاہری سے آزاد ہیں۔ ؎

ہر سنگ سجدہ گاہ ہے شوق سجود میں
ساجد کو دیر کی نہ حرم کی ہے احتیاج

لہی سالکان راہ طریقت کی نظروں کے آگے بے حجاب ہے۔

پردہ انھیں سے ہے جنھیں تاب نظر نہیں
آتے ہیں خود وہ دیکھنے والوں کے سامنے

ان صادق کو ماسوائے اللہ سے کیا مطلب۔ ان کا مقصود وحید ذات کبریائی ہے۔ دیر ہو یا حرم، انہیں جہاں اس کا جلوہ
ئے وہ متوالے ہیں۔ ؎

مکان سے ہے نہ کچھ ہمکو لامکاں سے غرض
جہاں حضور ملیں ہمکو ہے وہاں سے غرض

تمہارے جلوے کے مشتاق ہیں جہاں ہو نصیب　　　زمیں سے کام نہ کچھ ہمکو آسماں سے غرض
تمہاری ذات سے مطلب ہے دین و دنیا میں　　　نہ کچھ یہاں سے غرض ہو نہ کچھ وہاں سے غرض
تو ہو تو بتکدہ مجھے کعبے سے کم نہیں　　　کعبہ صنم کدہ ہے جو کعبے میں تو نہ ہو

فنا ــہ

ہو وصل، پردہ دوئی کی کہیں اس میں بو نہ ہو　　　تو ہو تو میں نہ ہوں میں اگر ہوں تو تو نہ ہو

محبوب حقیقی دنیا و ما فیہا سے بے نیاز کر دیتا ہے ــہ

تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے　　　سَو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے

، گناہگار ہیں انکی بخشش کی تقریب سوائے اسکی شان غفاری کے کیا ہو سکتی ہے ــہ

زاہد کو کافی ہوا اتنی بات بخشش کو مرے　　　اُسکو شوق مغفرت ہے میں گنہگار دین میں

مرزا غالبؔ گناہ بحر کرم کو جوش میں لانے کے لئے کافی ہے ــہ

گھبرا رہے ہو حشر میں کیوں اس قدر اسیرؔ　　　اتنی ہی سی تو بات ہے کہ دو خطا ہوئی

خیال کو امید مانگنے والا ہو تو اس کی درگاہ میں کسی چیز کی کمی نہیں ــہ

ترے کرم میں کمی کچھ نہیں کریم ہے تو　　　مرا قصور ہے، جھوٹا امید وار ہوں میں

میں یہ کہ کبھی وہ بے پردہ ہے ــہ

لاکھ پردوں میں تو ہے بے پردہ　　　سو نشانوں پہ بے نشان ہے تو
حیا تو یہ ہے کہ ستر ہزار پردوں میں　　　مگر ہے شوق لیے عالم آشنائی کا
پردہ میں جب ہو تم تو یہ عالم ہے حسن کا　　　پردے کے باہر آؤ تو کیا جانے کیا کرو

دوں کا آسرا اسکا کرم ہے ــہ

کرم کہ تیرے کرم کا امیدوار ہوں میں　　　گنہگار ہوں یارب گناہگار ہوں میں

نعت گوئی

اردو شاعری میں یہ صنعت ہمیشہ کم پایہ لوگوں کے ہاتھ میں رہی - با کمال شعرا میں بہت کم ایسے بزرگ تھے جنہوں نے خصوصیت کے ساتھ اس طرف توجہ کی - اس میں شک نہیں کہ دیوان کی تمہید یا مثنوی وغیرہ کے آغاز میں بالعموم حمد و نعت لکھتے تھے - کبھی کبھی بعض عقیدتمند نعتیہ قصائد بھی کہہ لیتے تھے - لیکن اس کو صنف سخن قرار دے کر کسی نے طبع آزمائی نہیں کی - مرثیہ گوئی کا وجود پہلے سے تھا لیکن میر انیس اور مرزا دبیر نے اس فن کو اوج کمال پر پہونچایا - اسی طرح نعت گوئی

سانہ توجہ کرنے کا سہرا امیر مینائی اور محسن کاکوروی کے سر ہے۔ امیر کا نعتیہ دیوان علیحدہ شائع ہوا اور محسن کے لائق فر
کے نعتیہ کلام کو ایک کلیات کی شکل میں ترتیب دے کر طبع کرا دیا۔ یہ عجیب حسن اتفاق تھا کہ بہترین مرثیہ گو شعرا انیس و دبیر کی
ترین نعت گو شعرا امیر و محسن بھی معاصر تھے۔ اگرچہ آپس میں چوٹیں نہ چلتی تھیں۔ امیر کے نعتیہ کلام کے متعلق ہم مناسب
صاحب "گل رعنا" اور صاحب "تاریخ ادب اردو" کی رائیں انھیں کے الفاظ میں درج کردیں۔

صاحب "تاریخ ادب اردو" کا خیال ہے۔

"انکے نعتیا شعار گوکہ قدیمی مقررہ طرز میں ہیں مگر اکثر اعلیٰ تخلیل فصاحت بلاغت اور جوش اعتقاد کے بہترین نمونے ہیں"[۱]

مولوی عبدالحی صاحب "گل رعنا" میں فرماتے ہیں۔

"تیسرا دیوان "محامد خاتم النبیین" نعت میں ہے جو اس لحاظ سے اچھا ہے کہ نعت کا وہ مذموم طریقہ جس میں شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ دیگر انبیائے کرام کی جناب میں گستاخی کا پہلو نکلتا ہے اسکو چھوڑ کر نئی راہ نکالی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ باوجود صحت زبان و پختگی کلام کے تاثیر یا سوز و گداز کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ انداز بیان کا جو سانچہ ناسخ و آتش کے زمانہ میں تیار ہوا تھا اس میں ڈھلکر شعر با مزہ ہو بھی نہیں سکتا اس سانچہ کو توڑ کر دوسرا سانچہ تیار کرلو تو دوسری بات ہے"[۲]

لوی عبدالحی صاحب کی تنقید کے جزو اول سے قطع نظر کرلی جائے تو مذکورۂ بالا دونوں اقتباسات امیر کی نعت گوئی پر نہایت
ں تبصرے ہیں۔ ذیل میں ہم امیر کی ایک نعتیہ رباعی درج کرتے ہیں جس سے معلوم ہوگا کہ مولوی صاحب جس انداز بیان کو
" قرار دیتے ہیں۔ امیر اس سے کلیتہً اپنا پہلو نہ بچا سکے۔ فن کے اعتبار سے میں سمجھتا ہوں کہ امیر کی عاشقانہ شاعری پر جو تنقی
نعتیہ شاعری پر بھی منطبق ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اس موضوع پر اتنا ہی لکھنا کافی ہے۔ ؎

احمدؐ کو شرف خدائے سرمد سے ملا — اعزاز سب انبیا کو احمدؐ سے ملا
جاں بخشی عیسیٰؑ ید بیضائے کلیمؑ — جو کچھ جس کو ملا محمدؐ سے ملا

اتذۂ قدیم کا اثر صاحب طرز اساتذہ ہر زبان کے شعرا میں معدودے چند ہوتے ہیں۔ بیشتر تعداد مقلدین کی ہوتی
لکھا جا چکا ہے کہ امیر اپنے لئے کوئی مخصوص رنگ پیدا نہ کر سکے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ اساتذۂ قدیم کی تقلید کو غنیمت سمجھا نئ
نکالنے سے قاصر رہے۔ پرانے استادوں میں امیر کو مصحفی و میر کی تقلید کا دعویٰ ہے۔

---

[۱] تاریخ ادب اردو صفحہ ۴۲۳
[۲] گل رعنا صفحہ ۴۰۴ و ۴۰۵

قدرداں چاہیے دیوان ہمارا ہے امیر — منتخب مصحفی و میر کے دیوانوں کا

کے تتبع کا بھی دم بھرتے ہیں۔ ے

قدرداں مصحفی و حضرت سودا تھے امیر — لیکے تربت پہ اُنھیں کی یہ غزل جاؤنگا

کہتا ہے شعر سُن کے کوئی واہ کوئی آہ — یکھ میرزا کے مجھ میں ہیں کچھ میر کے خواص

نے اپنے لئے کسی خاص رنگ کو مخصوص نہیں کیا تھا بلکہ اُنھوں نے ہر رنگ میں کہا ہے۔ ایک بات البتہ ان کے کلام میں ہے۔ زبان کی صفائی میں اُنھوں نے خوب کوشش کی ہے۔ ان کے کلام کا بیشتر حصہ صاف اور لطف زبان سے مملو ہے۔ ہی زبان کو امیر نے بھی خصوصیت سے ملحوظ رکھا ہے۔ ے

کسے ہے فکر مضامین تازہ کی فرصت — امیر ہے مجھے شیرینیٔ زباں سے غرض

لاست اور روانی میں ان کا کلام خاص درجہ رکھتا ہے۔ جمہور شعراء دہلی و لکھنؤ کے خلاف امیر نے اپنے یہاں گراں و ثقیل لہ نہیں دی ہے بلکہ سبک اور مناسب موقع الفاظ استعمال کئے ہیں۔ زبان کی چاشنی اور روزمرہ کے لطف نے انکے کلام ری کو دوبالا کر دیا ہے۔ عمدہ شعر کی تعریف یہ ہے کہ جب پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں لیکن کی کوشش کی جائے تو مشکل معلوم ہو۔ روزمرہ کی زبان میں سیدھے سادے بامزہ اشعار کہہ لینا آسان نہیں۔ بقول مولانا ن شعر میں اور خاص کر اردو زبان میں کوئی بات اس سے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ عمدہ مضمون معمولی بول چال اور ، پورا پورا ادا ہو جائے۔" امیر کے اشعار میں روزمرہ کی خوبی ملاحظہ فرمائیے۔ ے

اتنی گھر جانے کی جلدی کیا ہے — بیٹھیے جائیے گا جائیے گا

ہاتھ رکھ کر مرے سینے پہ جگر تھام لیا — تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا

ہن ہے۔

چارہ گر کو لائے ہیں احباب اس کے لئے — لو مراز خم جگر بھی قابل مرہم ہوا

پچھتاتے ہیں خون مرا کر کے کیوں عضو — اب اس پہ خاک ڈالیے جو کچھ ہوا ہوا

وہ، اور وعدۂ وصل کا، قاصد، نہیں نہیں — سچ سچ بتا، یہ لفظ اُنھیں کی زباں کے ہیں

آج اُمید صبح ہونے کی — حضرتِ دل یہ شام فرقت ہے

حرم سے دیر کو آئے امیر مر مر کے — خدا کے گھر سے پھرے ہم خدا خدا کر کے

کیا کروں وصفِ بتانِ خود پسند — ان سے بڑھ کر بس خدا کی ذات ہے

تھی تو کچھ دل میں کھٹک درد کی پہلے سے مگر — آپ کا پاس سے جانا کہ قیامت آئی

"صنمخانۂ عشق" کے آخر میں جو دو ضمیمے "گوہر انتخاب" اور "جوہر انتخاب" کے نام سے شامل کئے گئے ہیں۔ انکے م
ن کیا جاتا ہے کہ وہ میر اور درد کے رنگ میں کہے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ امیر کی سعی ایک حد تک مشکور ہوئی۔ یہ
ر الکلامی کی دلیل ہے کہ بالکل نئے رنگ میں وہ کامیاب شعر نکال سکے۔ پھر بھی لکھنؤ کا رنگ جو ان کی طبیعت کا خمیر ہو گیا
ل وہ چھٹ سکا۔ "گوہر انتخاب" اور "جوہر انتخاب" دونوں میں اس قسم کے اشعار پائے جاتے ہیں۔ ۵

ٹوٹ کر کس کان سے موتی کا دانہ گر پڑا — ڈھونڈھنے آنکھوں سے جو سارا زمانہ گر پڑا

کیا کیا ہوا ہے دل تہ و بالا میں کیا کہوں — کوٹھے پہ چڑھ کے آپ جو نیچے اتر گئے

اوڑھے جو تھے دلائی چلنا نہ تھا ابھر کر — جوبن چھپایا تم نے لیکن چھپا نہ جانا

کھینچتا ہوں میں تصور میں اگر ہاتھ ان کا — کھینچ کے کہتے ہیں کہ ہے مرا پہنچا ٹوٹا

ممکن نہیں کہ بوسہ ملے مجھ کو یا جواب — مشکل کی بات ہے دہن اسکا ہے لاجواب

اشک دامن سے یار نے پونچھے — کچھ تو آنسو بجھے ہمارے آج

اس سے تنہائی میں تو بیٹھا ہوں — ڈر ہے چھاگل کہیں پکار نہ دے

سہرے کی سلامی نے کیا آکے جو مجرا — اس آنکھ کی شوخی نے صدا دی کہ ادب سے

ٹالنے کو مجھے جب پاؤں سے لپٹا تو کہا — جا کسی روز ترے سر کی قسم آئیں گے

مولوی عبدالسلام ندوی "میر صنعت تضاد کے بہت شائق ہیں۔ شاید انھیں کی تقلید میں امیر نے بھی اس صنعت کو ...

جو کچھ سوجھتی ہے نئی سوجھتی ہے — میں روتا ہوں اسکو ہنسی سوجھتی ہے

زباں دی بہر وصل اور خود ہی بولے — میں سچ کہتا ہوں یہ جھوٹی بڑی ہے

عدو بھی ڈالے قسمت بزم ماتم میں ہیں ساتھ انکے — ہمارے پھولوں میں کمبخت اسکا تا بھی شامل ہے

کچھ کام نہیں ہے انھیں فریاد رسی سے — رونے کا سبب کرتے ہیں دریافت ہنسی سے

جن اشعار میر کے رنگ میں نہایت کامیاب کہے ہیں جنکا سوز و گداز دل پر تیر و نشتر کا کام کرتا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

بہت غم نہ کھا عشق کا اے امیر — تجھے کوئی آزار ہو جائے گا

عمر برق و شرار ہے دنیا — کتنی بے اعتبار ہے دنیا

بدتر اس کو سمجھ خزاں سے امیر — دیکھنے کو بہار ہے دنیا

وہ ہنس ہنس کے نشتر چبھویا کیا — میں رو رو کے دامن بھگویا کیا

عجب قدرتِ حق کے لے بت ہیں کھیل — کہ مٹی کے پتلے کو گویا کیا

قریب ہے یار روزِ محشر چھپیگا کشتوں کا خون کیونکر — جو چپ رہیگی زبان خنجر لہو پکاریگا آستیں کا

الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو — ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

وہ سنتا نہیں حال دل سے آمیر — کہانی سی کب تک کہا کیجیے

یا بجلیاں بھری ہوئی ہیں ؎

دل ہی نہ رہا امید کیسی — جڑ کٹ گئی نخل آرزو کی

بری ہو نہ قسمت الٰہی کسی کی — کہ جو سوجھتی ہے بری سوجھتی ہے

ں درازی بالعموم شعرا کا تختۂ مشق رہی ہے مگر دیکھیے اسلوب بیان نے شعر کو کہاں پہونچا دیا ہے۔ ؎

شام شبِ ہجر و عمر آخر — امید آمیر کیا سحر کی

اک عمر ہوئی ترک کئے عشق کا پیشہ — پر کچھ تک چہرے کی زردی نہیں جاتی

شور محشر امیر کو نہ جگا — کر چکے سعی جتنی قدرت تھی

ہمیں سر ٹپکتے ہی گزری آمیر — یونہیں عمر ساری بسر ہوگئی

نے "سا" اور "سی" کو اپنا لیا ہے جس قدر برجستہ اور نفیس استعمال ان الفاظ کا آمیر کے یہاں پائیے گا کسی اعر کے یہاں نہ ملیگا۔ آمیر نے بھی ایک غزل اسی انداز میں کہی ہے۔ اگرچہ "کچھ" سے مدد لی گئی ہے۔ مگر دیکھیے آمیر نے کتنے بلند شعر کہے ہیں۔ ؎

دل جو سینے میں زار سا ہے کچھ — غم سے بے اختیار سا ہے کچھ

رخت ہستی بدن پہ ٹھیک نہیں — جامۂ مستعار سا ہے کچھ

چشم نرگس کہاں وہ چشم کہاں — نشہ کیسا خمار سا ہے کچھ

کا شعر ہے! تخئیل اور محاکات کا امتزاج غضب ڈھا رہا ہے چشم محبوب کا کتنا پرلطف اور کیف آور بیان ہے مگر یہ بھی سن لیجیے۔

"آمیر ان نیم باز آنکھوں میں — ساری مستی شراب کی سی ہے"

نخل امید میں نہ پھول نہ پھل — شجر بے بہار سا ہے کچھ

ساقیا ہجر میں یہ ابر نہیں — آسماں پر غبار سا ہے کچھ

پہلے اس سے تھا ہوشیار آمیر — اب تو بے اختیار سا ہے کچھ

ر اور ذوق یوں تو امیر کے کلام میں میر، سودا، مصحفی اور جرأت سبھی کے انداز پائے جاتے ہیں مگر ہماری رائے میں
ایک شاعر سے امیر کو تشبیہ دی جاسکتی ہے تو وہ شیخ محمد ابراہیم ذوق ہیں۔ یوں کہیئے کہ امیر لکھنؤ کے ذوق ہیں۔ ذوق کی
زی خصوصیات امیر کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ ذوق کی شاعری کی ابتدا جن حالات و واقعات کے اندر دہلی میں ہوئی تقر
ت امیر کی شاعری کے آغاز کے وقت لکھنؤ میں موجود تھے۔ وہاں شاہ نصیر کا رنگ مقبول تھا، یہاں ناسخ اور اُنکے تلامذہ کو رنگ
ہے تھے۔ ذوق نے سنگلاخ زمینوں کی جو شوارگزار وادیاں طے کیں تو امیر نے بھی پیچھے رہنا مناسب نہ سمجھا۔ اس سے قبل امیر
للعے لکھے جاچکے ہیں جو مشکل زمینوں میں کہے گئے ہیں۔ ان سے دونوں کے معیار شاعری کا اندازہ ہوسکیگا۔

کلام ذوق کی خصوصیات مختصراً یہ ہیں۔ (۱) سنگلاخ زمینوں میں طبع آزمائی۔ (۲) قصیدہ گوئی۔ (۳) محاورات و ضر
فر استعمال۔ (۴) لوگوں کے اعتقادات اور توہمات، رسم و رواج کا ذکر۔ (۵) رعایت لفظی کا شوق۔ (۶) شاعرانہ
اخلاقی مضامین اور (۸) فی الجملہ زبان کی صفائی۔

تقریباً یہی تمام خصوصیات امیر کے کلام میں بھی کم و بیش پائی جاتی ہیں۔ قصیدہ گوئی میں اُردو کے پانچ شاعر سر برآوردہ
تعداد میں امیر بھی شامل ہیں۔ سودا، حسرت، ذوق اور منیر کے ساتھ ساتھ اس صنف کلام میں امیر کا نام بھی نظر انداز
ہا سکتا۔ انکی شاعرانہ قوتوں کا اظہار اسی میدان میں ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ تمام شعراء لکھنؤ میں ایک ممتاز درجہ رکھتے تھے
امیر کی مشکل پسندی اور انکے کلام میں لوکل کلر (مقامی رنگ) کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ دیگر خصوصیات کا مختصر ذکر
یں کیا جاتا ہے۔

ورات اور ضرب الامثال ظفر کی فرمائشوں نے ذوق کے دل میں زبان کی صفائی اور محاوروں کے برجستہ
ن پیدا کردیا تھا۔ چنانچہ انکے کلام میں محاورات کا ایک گراں بہا ذخیرہ ہم کو ملتا ہے۔ امیر نے مصحفی کے انداز میں زبان
ی اور روانی کا خیال رکھا اور غالباً ذوق کی تقلید میں انھیں محاورات باندھنے کا شوق ہوا۔ چنانچہ انکے کلام میں ضرب
ہاورات کا استعمال بہت پایا جاتا ہے۔ نثاروں میں یہی کیفیت شمس العلما مولوی نذیر احمد کی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ
یں کوئی نہ کوئی محاورہ صرف کیا گیا ہو اچھا ہوگا۔ ہاں محاورات کا برجستہ اور برمحل استعمال ضرور شعر میں چار چاند لگادیتا
ن کی کمی محاوروں سے نہیں پوری کی جاسکتی۔ ~

تیرے ابرو کی یاد میں لے بت ہم نے کعبہ کو بھی سلام کیا
ہر مصیبت میں رہی میری شریک یا خدا عمر شب ہجراں دراز
وہ گلعذار کہ تلتے تھے روز پھولوں میں اُنھیں کی خاک شریک آج ہے گولوں میں

آمیر دیر و حرم سے الگ ہو جاتے ہیں وہ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جُدا بناتے ہیں

چال سے پامال مجھ کو کر چلے ہائے کیا چلتا ہوا منتر چلے

نگہ ناز کام کرتی ہے دم میں ترکی تمام کرتی ہے

شمع کو کس کی تجلی یہ نظر آتی ہے تھوڑی تھوڑی جو یہ محفل میں ہوئی جاتی ہے

دل چُرایا ہے مرا پر وہ خجل کتنا ہے فق ہوا جاتا ہے مُنہ چور کا دل کتنا ہے

ہیں محاوروں کے استعمال میں عامیانہ رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ ع

جوہری ہو کہ نہ ہو کوئی سخن کا پسِ مرگ تھوک کر میں تو لہو لعل اُگل جاؤں گا

ن موقعوں پر محاورات میں تصرف بھی کیا ہے جو جائز نہیں۔ ع

عشق اب ہم کو خاک باقی ہے اک نقطہ چھانک تاک باقی ہے

تاک جھانک" ہونا چاہیئے۔ ع

اس نے جنت سے جہنم میں مجھے پھینک دیا زہر کی گانٹھ ہوا دانۂ گندم مجھ کو

بس کی گانٹھ" ہے۔

آبرو خاک ہوئے پر بھی نہ کی عاشق کی چار آنسو بھی نہ تم نے سرِ مدفن ڈالے

بہانا" صحیح ہے۔

وادیٔ وحشت میں جب رکھا قدم آکے میرے پاؤں پر چھالے پڑے

پر" زائد ہے۔ محاورہ "پاؤں پڑنا" ہے۔ خود آمیر نے یہ محاورہ اس صورت میں استعمال کیا ہے۔ ع

پاؤں پڑا پاؤں رکھ دیا سر پر"

س سلسلہ میں بعض مواقع پر روزمرہ کے استعمال میں بھی آمیر کے قلم کو لغزش ہو گئی ہے۔

ہزاروں خار پیاسے وادیٔ غربت میں ملتے ہیں پلاؤں کس کو کس کو بوند بھر پانی ہے چھالے میں

کے لحاظ سے "کس کس کو" ہونا چاہیئے۔ بصورت موجودہ پہلا "کو" زائد ہے۔

تڑپنے کا مزہ جی بھر کے لے لوں ذرا تھم تھم کے درد اُٹھے جگر سے

یت غلط استعمال ہوئی ہے۔ "سے" کی جگہ "میں" ہونا چاہیئے۔

ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں جن میں محاوروں کو غلط معنی میں استعمال کیا ہے۔

ایسا ہوا ہے اب تو زمانے کا خوں سفید — آیا جو لعل ہاتھ میں ڈرعدان ہوا

خون سفید ہونا ، محبت نہ سمجھنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

میں کہاں عشق اُسکی مژگاں کا کہاں — دیکھ کانٹوں میں نہ لے تقدیر کھینچ

سبزۂ خط اُسکا دکھلا کر نہ دیوانہ بنا — بیگنہ ہوں مجھکو کانٹوں میں لے تقدیر کھینچ

کانٹوں میں کھینچنا ، یا زیادہ صحیح گھسیٹنا ، شرمندہ کرنے کے معنوں میں مستعمل ہے ۔

ضرب الامثال :-

جائے میخانہ بنی ہے مسجد — کبھی گھورے کے بھی دن پھرتے ہیں

یہ شہر وحشت مجنوں کا مشت استخواں مجنوں — مثل سچ ہے کہ رستم نے سوا ہو ڈھاک رستم کی

ن کے یہاں عربی اور فارسی ضرب الامثال کا استعمال اور برجستہ استعمال پایا جاتا ہے - آمیر نے فارسی اور عربی ضرب الامثال کی طرف توجہ نہیں کی -

مثالیہ شاعری | شیخ ناسخ نے مرزا صاحب کی تقلید میں حقائق و معارف کو مثالوں کے ذریعے سے اپنے اشعار میں اختیار کیا تھا - اور اس رنگ کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی - چنانچہ ذوق بھی اس سے متاثر ہوئے اور مثالیہ شاعری کی - آمیر کے یہاں اس رنگ کو ناسخ کا طفیل سمجھو یا ذوق کا -

ٹھہریں کبھی کجوں میں نہ دم بھر بھی راست رو — آیا کماں میں تیر تو سن سے نکل گیا

عیب اصلی عارضی زینت سے چھپتا ہے کہیں — غازہ ملنے سے نہ زنگی خوب رو ہو جائیگا

زاہد کو فیض صحبت رنداں سے کیا امیر — عالم کبھی نہ رہ کے ہو کیڑا کتاب میں

کسی کا ساتھ کب دیتا ہے کوئی بیقراری میں — تڑپتا رہ گیا شعلہ شرر نے قطع منزل کی

فلاطوں خم میں بیٹھا ہے شراب مرگ پینے کو — نہیں حکمت سے خالی بات کوئی مرد عاقل کی

اخلاقی مضامین | شاعر کا فرض نہایت گراں بار ہے وہ صرف داستان حسن و عشق کی نوا سنجی ہی کے لئے پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کی حیثیت معلم قوم کی ہے - وہ نوجوان کے اخلاق کا محافظ ہے - وہ ان کا سیاسی ، معاشرتی اور اخلاقی رہنما ہے - اکثر سیدھے سادھے اشعار سامعین کے دلوں پر وہ اثر کرتے ہیں جو بڑے بڑے فصیح البیان مقرروں کی تقریروں سے نہیں ہوتا - شاعر کا فرض ہے کہ وہ اپنے اشعار سے سُننے والوں کے دل گرمائے اور ان میں جوش عمل کا ولولہ پیدا کرے اور شاہراہ ہستی میں صحیح طرف انکی رہبری کرے - اُردو شعراء نے عام طور پر اس فرض کی جانب سے سہل انکاری برتی ہے - اُنھوں نے فرضی معشوق

ن میں برسوں سرگردانیاں کیں لیکن اپنی قوم کی حقیقی رہنمائی کی طرف انکو کبھی توجہ نہیں ہوئی۔ اگرچہ اس کلیہ کی بعض ثنیات بھی موجود ہیں۔ آمیر کی شاعری زیادہ تر عاشقانہ یا نعتیہ ہے لیکن اسکے باوجود اخلاقی مضامین بھی آپ نے ں اور کہیں کہیں ایسے اشعار میں بھی ناسخ اور ذوق کی طرح مثال دے کر مضمون کو ذہن نشین کرنے کی کوشش نکی شاعری کا مفید پہلو ہے۔ ؎

دیکھ جو کچھ سامنے آجائے منہ سے کچھ نہ بول — آنکھ آئینہ کی پیدا کر دہن تصویر کا

ن ہے، خودی سے آدمی بڑا نہیں بنتا۔

جو سمجھے کہ میں ہوں زمانہ سے چھوٹا — وہی فی الحقیقت بڑا آدمی ہے

غنیا ہونا بے حیائی ہے۔ ؎

توفیق اتنی دے مجھے افلاس میں خدا — حاجت نہ لے کے جاؤں کبھی اغنیا کے پاس

ن مقولہ ہے "انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے"۔ معلم شیراز شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرما گئے ہیں۔ ع
صالح ترا صالح کند"۔ آمیر نے اسی خیال کو نظم کیا ہے۔ ؎

سگ اصحاب کہف انسان کے زمرے میں شامل ہے — برا بھی ہو تو اچھا ہے اگر اچھوں میں شامل ہے

کا والی ہے۔ ؎

ے مغرور تجھکو نخوت نہیں غریبوں کی تیری پروا — خدا ہے ہر مور ناتواں کا جو تو سلیماں ہے تو ہوا کر

رگی اکو دے نہ تکلیفِ حکومت اے ہوس — چار دن کی زندگی میں بادشاہی کیا کروں

سانوں کے تنزل کا افسانہ بہت دردناک ہے اسکی تہ میں جو اسباب پنہاں ہیں ان میں ماضی پرستی بھی ہے۔ جنکا ماضی اندار تھا۔ ان کے حال کی کیا کیفیت ہے اور مستقبل کیسا ہوگا۔ اس کے تصور سے بھی چشم حقیقت بیں اشکبار ہو جاتی قوم ہے کہ خواب غفلت سے بیدار نہیں ہوتی اور اس پر فخر کئے جاتی ہے کہ ہمارے اسلاف نے دنیا میں وہ کون سے کارنامے جو نہ کئے۔ "پدرم سلطان بود" کا زمانہ رفو چکر ہو گیا۔ آج دنیا میں عمل کی ضرورت ہے۔ قصے کہانی پر گھمنڈ سے کام نہیں دنیا میں باعزت زندگی بسر کرنی ہے تو با الفاظ حالی "ترک نسب" کرنا ہوگا۔

حال پر اجداد و آبا کے تفاخر کیا آمیر — ہیں وہ ناداں جنکو ہے قصہ کہانی پر گھمنڈ

ے لئے اُولوالعزمی کی ضرورت ظاہر ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قوت ارادی کے زور سے دنیا میں بڑے بڑے کام کئے

جا سکتے ہیں - نپولین کہا کرتا تھا کہ لفظ ناممکن کو لغت سے نکال دینا چاہیے - الپس کی فلک بوس چوٹیوں کو فوج
رانا اس کی عالی ہمتی کا کرشمہ تھا - سلطان محمد فاتح کا خشکی پر جہاز رانی کرنا اسکی بلند حوصلگی کی دلیل ہے - انسان اپنے
رادہ کرلے تو کیا نہ کر گزریگا - کون سا بڑے سے بڑا کام ایسا ہے جو انسان کی طاقت سے باہر ہو - کون سا مقصد ایسا
ممکن الحصول ہو - شرط یہ ہے کہ انسان کا عزم بلند اور حوصلہ عالی ہونا چاہیے - آپ کسی بلندی کو بلندی نہ سمجھیے اور آپ کی رسائی
ہوجائیگی - اسی خیال کو امیر نے شاعرانہ پیرایۂ بیان کے ساتھ نظم کیا ہے - جوش بیان شکوہ الفاظ کے ساتھ دست وگریباں

نہ شاخ گل ہی اونچی ہے نہ دیوار چمن بلبل — تری قسمت کی کوتاہی تری ہمت کی پستی ہے
بڑھا لے آہ رسا اب کنگرے پر عرش کے پہونچی — بلندی کو بلندی جاننا ہمت کی پستی ہے

"بلندی کو بلندی جاننا ہمت کی پستی ہے" کس قیامت کا مصرعہ ہے - یہ شعر ہر زبان کے شاعر کے لئے سرمایۂ فخر ہوسکتا ہے۔

رعایت لفظی لکھنؤ کی شاعری کا نہایت ناگوار پہلو رعایت لفظی ہے - شیخ ناسخ اور اُنکے تلامذہ خصوصاً امیر علی
نے اسکو اتنا رواج دیا کہ شاعری الفاظ کا گورکھ دھندا بن کر رہ گئی - تلازمہ کی دھن میں حقیقت اور معنوی لطافت سے شعر
نہیں رہتا - جذبات کی ترجمانی جو فی الحقیقت موضوع شاعری ہے طلسم الفاظ کے پردے میں نہیں کی جاسکتی - دہلی میں ا
قبول عام کبھی نصیب ہوا لیکن ذوق جو ناسخ کی شاعری سے حد درجہ متاثر تھے اپنے دامن کو اس آلودگی سے نہ بچا سکے
کلام میں تلازمہ کی بعض ناگوار مثالیں ملتی ہیں - اگرچہ اتنی کثرت کے ساتھ نہیں جتنی کہ ناسخ، رشک، امانت وغیرہ کے
امیر نے اس کو اپنے ہی گھر سے سیکھا اور کہیں کہیں اس بھدّے طریقے سے استعمال کیا ہے کہ طبیعت منغص ہوجاتی ہے

چاندی ہوئی اس کی جب دیا حکم — سونے میں منڈھے ستار تعویذ
کہہ دو کہ نہ باتوں میں مری شاخ نکالے — کھدوا نگا پتے کی میں تو پتائے گا ناصح
سن کر میں نصیحت نہیں لاتا جو حرارہ — اتنا ہے مجھے دھیان کہ جل جائیگا ناصح
زلفوں کے کوڑے باندھ کے شکلیں لگالیے — مختار ہیں حضور مرے بال بال کے

لیکن ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں اگر یہی تلازمہ کہیں برجستگی کے ساتھ استعمال ہوجائے تو حسن شعر بن جاتا ہے بعض موا
اس صنعت کو کچھ ایسی نفاست سے برتا ہے کہ شعر میں چار چاند لگ گئے ہیں -

آہ کرنے پہ کیوں بگڑتے ہو — تم تو صاحب ہوا سے لڑتے ہو
تو کھینچے گا شکل اسکی مانی — تو نے کہیں اور میں نے مانی

الفاظ کے اُلٹ پھیر سے معنی پیدا کرنا بھی رعایت لفظی ہی کی ایک صورت ہے - امیر نے اس انداز میں بعض اچھے شعر نکالے

کیا غمِ عشق جان سے کم ہے — غم رہے، جان کا کسے غم ہے
انتہائے نشہ میں آتا ہے ہوش — ہوشیاری انتہائے نشہ ہے
نہ سمجھے تھے خدا کو جب تلک سمجھے تھے ہم سمجھے — جو سمجھے اب تو یہ سمجھے نہ سمجھے تھے نہ سمجھیں گے

۔ایک نہایت عمدہ غزل اس صنعت میں لکھی ہے جس میں ایک فعل کو جو دو معنوں میں مستعمل ہے وجہ شبہ قرار دے کر نئے نئے
را کئے ہیں ایک شعر اس وقت یاد ہے۔

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت — میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ِ التزام کے ساتھ اسی زمین میں ایک غزل لکھی ہے اور حق یہ ہے کہ خوب لکھی ہے۔

کون مانع ہو کہ در پر ترے آ بھی نہ سکوں — کیا قدم نقش قدم ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں
اُن کے غصے کے مٹانے کی ہیں سو تدبیریں — لاگ کی آگ نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں
چٹکیاں لینے سے وہ دل میں کریں تو انکار — داغ کچھ درد نہیں ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں
نقش ہستی میں ابھی محو کئے دیتا ہوں — خط تقدیر نہیں ہے کہ مٹا بھی نہ سکوں
ایک نالے میں جہاں کو تہ و بالا کر دوں — کچھ ترا دل یہ نہیں ہے کہ ہلا بھی نہ سکوں

ت الفاظ ایک بات البتہ ایسی ہے جو امیرؔ ذوقؔ سے علیحدہ پائی جاتی ہے۔ ذوقؔ نے بعض نہایت ثقیل الفاظ کے استعمال کو جائز رکھا ہے۔ اگرچہ قادر الکلامی کے زور سے ان کے ثقل کو بڑی حد تک دور کر دیا ہے پھر نا پڑے گا کہ ثقیل الفاظ قصیدہ کے لئے موزوں ہوں تو ہوں۔ غزل اُن کی متحمل ہرگز نہیں ہو سکتی۔ امیرؔ نے اس قسم ے اپنے اشعار کو گرانبار نہیں کیا ہے۔ ان کے دونوں دیوانوں میں مشکل سے چند الفاظ ایسے ملیں گے جن کے معنی دیکھنے ت کی ضرورت ہو۔ وہ عام طور پر نہایت سبک اور سلیس روزمرہ کی زبان میں کام آنے والے الفاظ استعمال کرتے ہیں فائی کا ان کو خاص خیال رہتا ہے۔ اس امر میں ان کو یہاں تک شغف ہے کہ کہیں کہیں وہ ایسے الفاظ بھی لکھ گئے م کی زبان پر ہیں۔ اور غالباً اشعار میں موزوں نہ معلوم ہوں۔ مثلاً

ہم جو روئے پر اُتارے ہو گئے — ہٹ کے سب دریا کنارے ہو گئے
ایسی دو دھڑکیں کہیں ہو سکتی ہیں الفت میں امیرؔ — دل بھی پہلو میں رہے یار بھی پہلو میں رہے
دخترِ رز کا بھی جوبن نہ اُبھارے جس کو — ایسی مرگِل کسی زاہد کی طبیعت ہو گی
ڈھکا نہ بار بار مرے پاس لا کے ہاتھ — جتنے ڈال جام اپنے کھینچ نہ ساقی بڑھا کے ہاتھ

گھر کیا جب سے کھچاوٹ نے ملاقاتوں میں		بیٹھکا تیری رکاوٹ کا ہوا باتوں میں

غ کا اثر | غزل کے لغوی معنی عورت سے تخاطب کے ہیں - اس لحاظ سے اسکا موضوع عشق مجازی ہے لیکن چونکہ
ہیں سے اکثر بزرگ اہل باطن تھے اس لئے اول اول غزل کے مضامین میں زیادہ حصہ تصوف اور معرفت کا رہا - میرزا مظہر جان
خواجہ میر درد نے اس رنگ کو خوب جلادی - ان کے بعد میر، سوز اور ہوس وغیرہ نے عشق مجازی کے پاکیزہ جذبات کو
شروع کر دی لیکن پہلو بچا کر کہتے تھے - اس میں شک نہیں کہ اکثر رکیک اشعار ان کے دواوین کو داغ لگا رہے ہیں - تا
ملا ہے جس میں عشق مجازی کے جذبات عالیہ کو قلم بند کیا گیا ہے - جرات اور انشا کے یہاں جا کر اس رنگ کی قطعی مٹی پلید ہو گئی
ی کی جگہ بوالہوسی نے لے لی اور بقول غالب ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی		اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

یت بیباکی سے عریاں نویسی کو کام میں لایا گیا - معاملہ بندی کی جانے لگی - ہجر و وصل کی کیفیتیں علانیہ قلمبند ہوئیں - عاشق
رہائے پنہاں طشت از بام کئے گئے - غرض خوب کھل کھیلے - اس زمانہ سے ان جذبات کو قبول عام نصیب ہوا - بالخصوص
کچھ عرصہ قبل تک جرأت کا سکہ دلوں پر بیٹھا ہوا تھا - داغ نے اگرچہ یہی انداز اختیار کیا لیکن اسکو قدرے مختلف رنگ دیدیا ج
یہی اور شوخی میں اضافہ ہو گیا - داغ کے یہاں لطف زبان کے ساتھ شوخی، چلبلا پن، طعن، تشنیع اور تیکھا پن پایا جاتا ہے
ر غضب کے ہوتے ہیں - اگر سچ پوچھو تو یہی انکی کامیابی کا راز ہے - انکے اشعار دلوں میں چٹکیاں لیتے ہیں سننے والے سر دھن
چہ انکے کلام کو اخلاقی لحاظ سے قابل اعتراض بتایا جاتا ہے لیکن پڑھتے سب ہیں - انکی حیات میں تو جتنی قدر و منزلت انکی ہو
سرے اردو شاعر کی نہ ہوئی تھی اور نہ آئندہ ہونے کی امید ہے - داغ کا سا قبول خاطر و لطف سخن" بہت کم شعراء کے حصہ
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا کہ خود امیر نے آخر کار انکا رنگ اختیار کرنے کی کوشش کی - "صنمخانۂ عشق" ان کی اس سعی کا
سکو امیر کی قادر الکلامی کی دلیل سمجھنی چاہیے کہ وہ اس نئے رنگ میں بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں - امیر نے بھی اپنے
فی بانکپن پیدا کرنا چاہا ہے اور بعض اچھے اچھے شعر نکالے ہیں - اس صنف میں وہ شعر خصوصیت سے دلچسپ ہیں جس میں شیخ و حرم
تعریض کی گئی ہے - ملاحظہ فرمائیے ؎

دیر کی تحقیر کراتی نہ اے شیخ حرم		آج کعبہ بن گیا کل تک یہی بتخانہ تھا
خواہش وصل تو کیونکر کہوں لیکن ناصح		دیکھ لینے کا تو حضرت کو بھی ارماں ہوگا
سن کے درد دل عشاق یہ کہتا ہے وہ بت		بندے اللہ کے ہو مجھ سے ہے فریاد عبث
ہم سے دیوانوں کے آگے یہ قیامت کا بیان		کہیں آ جائے تجھی پر نہ قیامت واعظ

کہتے ہیں بزم میں تو تمہارا یہ رنگ ہے — تنہا جو ہم کو پاؤ تو کیا جانے کیا کرو
غیروں سے آنکھیں چار کرتے ہو — جاؤ بھی کس کو پیار کرتے ہو
نہ ٹھنے تک ہی اے شیخ حرم سارا تقدس ہے — برہمن نے تو سجدے کرکے مٹی کا صنم لے لو
ابھی جو بیٹھ کے مسجد میں نہ کر اے واعظ — ایسی شے ہے کہ قیامت پہ اٹھا رکھی ہے
خدا اکو اپنی اپنی داستانیں سب سنائینگے — قیامت جسکو کہتے ہیں وہ بزم قصہ خوانی ہے
کیا مزہ دیتا ہے اُس شوخ کا کہنا شب وصل — اب تو چھیڑو نہ ستاؤ ہمیں نیند آتی ہے
شب وصلت وہ ابکا چلبلاپن دیکھکر بولے — غریب آفت کا مارا غمزدہ بیکس یہی دل ہے
مانی ہیں میں نے سیکڑوں باتیں تمام عمر — آج آپ ایک بات مری مان جائیے
آخر ہوئے نہ حضرت دل آپ ان کے لیل — ہاں اور دوڑ دوڑ کے مہمان جائیے
...ی چوٹی ہوئی سوکھے ہوے ہونٹھ — یہ صورت اور آپ آتے ہیں گھر سے !

اغ سے چراغ آمیر کے دیوان میں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں ہے جن میں اُنھوں نے دیگر شعرا کے کہے ہوے مضامین کو باسلو
ظم کرنے کی کوشش کی ہے۔ صاحب شعر الہند نے ایک پوری فہرست ایسے اشعار کی دی ہے جن میں آمیر کے چراغ سے چراغ جلایا
ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ان کی یہ سعی ایک حد تک غیر مشکور رہی۔ دوسرے شعرا کے مضامین کو باندھنا کوئی عیب نہیں۔ بلکہ اس سے
ازہ ہوتا ہے کہ جب دو صاحب کمال ایک ہی بات کہتے ہیں تو کیا پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں۔ کیونکر کہتے ہیں اور کتنے کامیاب
تے ہیں۔ ہاں یہ ماننا پڑیگا کہ بعینہ ایک مضمون کو لکھنا اس وقت زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے جب اصل کو فروغ دے دیا جائے۔ مثلاً سودا نے
نے اس مشہور مقطع

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا — ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

نظیری کے اس شعر کو ترقی دی ہے۔

بوے یار من ازیں سست وفا می آید — گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے اس شعر کو

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم — باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

امیر نے زیادہ دلکش انداز سے کہا ہے۔

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ — ان سے بھی تو پوچھیے تم اتنے پیارے کیوں ہوے

ذیل میں ہم اس قسم کے اشعار درج کرتے ہیں جن میں امیر نے دوسروں کے چراغ سے چراغ جلایا ہے۔ افسوس ہے اس تقابل سے امیر کی وقعت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ بلکہ کہنا پڑتا ہے کہ اس قسم کے اشعار حسن بیان سے عاری ہیں۔ ایک فارسی شعر ہے۔ ؎

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی — مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

امیر — نہیں ہے کوئی جہاں میں باقی چلے گی اب تیغ ناز کس پر — مگر ترے قتل گہ میں لائیں مسیح مُردے جلا جلا کر

یہاں مسیح کا کام خود قاتل کے سپرد کر دینا زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے فارسی کا شعر بہتر ہے۔ علاوہ ازیں "ترے قتل گہ" میں قم کا

میر — عہد جوانی رو رو کاٹا پیری میں لیں آنکھیں موند — یعنی رات بہت جاگے تھے صبح ہوئی آرام کیا

امیر — پیری میں آئی موت جوانی گزر گئی — جاگا تمام شب میں، دمِ صبح سو گیا

امیر نے میر کے نشتر کا چربہ اتارا ہے "مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی"۔ وہ سادگی، سوز اور اثر جو خدائے سخن کے اشعار میں ہے امیر پیدا نہ کر سکے۔ جوانی گزر گئی، کو "عہد جوانی رو رو کاٹا" سے کیا نسبت؟ "پیری میں لیں آنکھیں موند" باوجود اپنی قد "پیری آئی موت" سے بدرجہا بہتر ہے۔

جرأت — کل واقفِ راز اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات — جرأت کے یہاں رات جو مہمان گئے ہم
کیا جانیے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر — جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

امیر — کہتے ہیں شب کی خوشامد بھی عجب جادو تھی — جو نہ تھی ماننے کی بات وہ ہم مان گئے

مضمون وہی ہے جو جرأت کے قطعہ میں ہے۔ لیکن کس بھدّے طریقے سے ادا کیا گیا ہے۔

ناسخ — جینا فراق کا نہیں ہرگز حساب میں — مدت ہوئی ہے مر چکے ہیں ہم حساب سے

غالب — کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں — شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

امیر — عمر کو سارا زمانہ گزراں کہتا ہے — دن جدائی کا مگر عمر میں محسوب نہیں

تینوں شعروں کا مضمون ایک ہی ہے لیکن ناسخ و امیر کے یہاں ایک بیان واقعہ ہے اور بس۔ غالب کے انداز بیان نے شعر کی کئی گنا بڑھا دیا ہے۔ ؎

انشا، — لگ کے برف میں ساقی صراحی مے لا — جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا

امیر — ساقی کمال پیاس ہے جلتا ہے یاں جگر — لا جلد برف میں مئے احمر لگی ہوئی

جوش بیان اور بلاغت کے لحاظ سے انشا کا شعر بہت بڑھا ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک رند بادہ خوار اشتیاق و اضطراب کے ساتھ فرمائش کر رہا ہے۔ امیر کا پہلا مصرعہ ٹھنڈی گرمی کی تصویر ہے۔

غالب — میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا ۔ بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

میر — سیکھ کر مجھ نالہ کش سے طرز افغاں عندلیب ۔ صحن گلشن میں ہوئی کیسی خوش الحاں عندلیب

...توں سے قطع نظر امیر کے یہاں ایک عندلیب زائد ہے۔

ب — نوید امن ہے بیداد دوست جاں کے لئے ۔ رہی نہ طرز ستم کوئی آسماں کے لئے

میر — جفا کے شوق میں حد سے گذر نہ او ظالم ۔ کوئی تو طرز ستم چھوڑ آسماں کے لئے

...معشوق کو مخاطب کر کے شعر کو زیادہ بلیغ بنا دیا ہے۔ امیر کے یہاں او ظالم کس قدر کریہہ ہے۔ اور پھر تو طرز بھی قابل لحاظ ہے

ب — زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا ۔ کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

میر — کھلی زباں پہ مری کس کی داستاں کے لئے ۔ اچھل کے دل نے جو بوسے مری زباں کے لئے

...کے احترام سے قطع نظر کر لی جائے تو اس کو منہ چڑھانا کہتے ہیں۔

ب — شورش باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں ۔ دل محیط گریہ ہے لب آشنائے خندہ ہے

...اغ میر — کچھ رنج ہے دنیا میں تو کچھ ہم کو خوشی ہے ۔ آنکھوں میں جو آنسو ہیں تو ہونٹوں پہ ہنسی ہے

...ظم کرے کا شعر فارسی تراکیب سے گرانبار ہونے کے باوجود زیادہ لطیف ہے۔ ہونٹوں پہ ہنسی ہونے کی حالت میں آنکھوں میں جو آنسو ہو سکتے ہیں ہے۔ ہنسی کے ہو سکتے ہیں غم کے نہیں۔ اب یہ ممکن ہے کہ آدمی کا دل رو رہا ہو اور وہ بظاہر اپنے آپ کو متبسم ظاہر کرے۔ جسکو زہر خندہ کہتے ہیں

...ازہ ہوتا غ — وصف کیا مجھ سے کیا کروں زاہد ۔ ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں

...تے ہیں۔ میر — تو نے کمبخت کبھی پی ہی نہیں کیا تجھے قدر ۔ محتسب دیکھ مری آنکھ سے پیمانے کو

...نے اس مزے کے شعر میں جو کیفیت اور بے ساختگی ہے وہ امیر کے یہاں کہاں؟ "ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں" کی بلاغت قابل رشک ہے ...ے پورے شعر کا مضمون داغ کے اس مصرع میں موجود ہے۔ جتنا غور کیجیے گا معنی وسیع ہوتے چلے جائیں گے۔ اس سے زیادہ ...نظیری کی کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ یہ مصرع ضرب المثل ہو گیا ہے۔

غ — لاکھ دینے کا ایک دینا ہے ۔ دل بے آرزو دیا تو نے

...نغ سعدی میر — دل بے آرزو بھی ہے تو ہے لطف ۔ یوں تو سب کچھ دیا خدا نے مجھے

...ب ذوق سمجھ سکتے ہیں کہ داغ کا حسن بیان شعر کو چار چاند لگا رہا ہے۔

...میر نے زیادہ ہنر شن بہتر گوئی کے لئے ہم امیر کا ایک شعر پیش کرتے ہیں جو غالباً انھوں نے مومن کے مشہور شعر

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا ۔ جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

...منے رکھ کر کہا ہے۔ ۵

کسی سے کوئی کچھ کرتا ہو باتیں — سُنا کرتے ہیں تیری گفتگو ہم

دورِ حاضرہ کے بعض شعرا نے بھی امیر کے بعض اشعار کو ترقی دینے کی کوشش کی ہے۔ امیر کا مطلع ہے۔ ؎

گو کہ دیکھے خواب اچھے سب نے تعبیریں کہیں — وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں

مولانا حسرت موہانی نے پہلے مصرع کو بدل کر مطلع کو مطلعِ آفتاب بنا دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

وصل کی بنتی ہیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں — آرزوؤں سے پھرا کرتی ہیں تقدیریں کہیں

امیر — بہار آئی ہے لے دستِ جنوں یا عید آئی ہے — گریباں سے گلے ملنے چلا ہے چاک دامن کا

فانی بدایونی — بہار آئی کہ یارب عید آئی اہلِ زنداں کو — گریباں نے گلے لپٹا لیا بڑھ کے داماں کو

ن ایک ہی ہے۔ مگر گریباں سے گلے ملنے دامن کے آنے اور گریبان کے دامن کو گلے لپٹانے میں جو نازک فرق ہے وہ اربابِ نظر شیدہ نہیں۔ فرقت میں ہمیشہ گریبان چاک ہو کر دامن تک پہنچیگا نہ کہ دامن چاک ہو کر گریبان تک آئے گا۔

تمہ | امیر کے متعلق اتنا کچھ لکھا گیا۔ لیکن پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ مضمون تشنہ ہے اور ابھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ حضرات میرے خیالات سے متفق نہ ہوں۔ ہر شخص کا ذوقِ سخن علیحدہ ہوتا ہے۔ یہ قطعی ممکن ہے کہ جس شعر کو سُن کر ایک شخص زبان سے بیساختہ آہ یا واہ نکل جائے اُسی شعر کو سُن کر آپکی تیوریوں پر بل آجائیں۔ بہرحال مجھے اطمینان ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا نتداری سے لکھا ہے۔ میرے ذوقِ شعر فہمی کو کچھ بھی کیوں نہ کہا جائے لیکن یقیناً میری نیت پر حملہ نہیں کیا جا سکتا۔

میر کے بہتّر نشتر مشہور ہیں۔ اب امیر کے بہتّر تیر بھی ملاحظہ فرمائیے:-

مراۃ الغیب

۱ دیدار کا تو وعدہ وفا ہوگا حشر کو — ارشاد ہو علاج دلِ ناصبور کا

۲ کہیں ضبطِ فغاں سے عشق کے آثار چھپتے ہیں — لبِ خاموش سے پیدا ہے صدمہ دردِ نہاں کا

۳ ریاضِ دہر میں پوچھو نہ میری بربادی — برنگِ بو ادھر آیا اُدھر روانہ ہوا

۴ قدم حضور کے آئے مرے نصیب کھلے — جوابِ قصرِ سلیماں غریب خانہ ہوا

۵ چُنے مہینوں ہی تنکے غریب بلبل نے — مگر نصیب نہ دو روز آشیانہ ہوا

۶ قریب ہے یار روزِ محشر چھپیگا کشتوں کا خون کیونکر — جو چُپ رہیگی زبانِ خنجر لہو پکاریگا آستیں کا

۷ وہ تو سُنتا ہی نہیں میں دادخواہی کیا کروں — کس کے آگے جا کے سر پھوڑوں الٰہی کیا کروں

۸ وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں نہیں — سچ سچ بتا یہ لفظ اُنھیں کی زباں کے ہیں

۹ کہاں ہوں گی آمیر ایسی ادائیں حور و غلماں میں — رہیگا خلد میں بھی یاد ہم کو لکھنؤ برسوں
۱۰ کباب سیخ ہیں ہم کروٹیں ہر سو بدلتے ہیں — جو جل اُٹھتا ہے یہ پہلو تو وہ پہلو بدلتے ہیں
۱۱ آنکھوں سے فائدہ جو نہ دیدار ہو نصیب — حاصل جبیں سے کیا جو ترا آستاں نہ ہو
۱۲ چمکی یہ روئے یار سے قسمت نقاب کی — جالی سے چھن رہی ہے کرن آفتاب کی
۱۳ تھی تو کچھ دل میں کھٹک درد کی پہلے سے مگر — آپ کا پاس سے جانا کہ قیامت آئی
۱۴ خونِ ناحق کہیں چھپتا ہے چھپائے سے آمیر — کیوں مری لاش پہ بیٹھے ہیں وہ دامن ڈالے
۱۵ الٰہی شبِ غم میں اتنا تو ہو — کوئی جھوٹ کہہ دے سحر ہو گئی
۱۶ دل ہی نہ رہا اُمید کیسی — جڑ کٹ گئی نخلِ آرزو کی
۱۷ فنا کیسی بقا کیسی جب اُسکے آشنا ٹھہرے — کبھی اس گھر میں آنکلے کبھی اس گھر میں جا ٹھہرے

صنمخانۂ عشق

۱۸ یہ آفتاب ہے گرم اُسکی کبریائی کا — کہ ذرہ ذرہ ہے آئینہ خود نمائی کا
۱۹ حیا تو یہ ہے کہ ستر ہزار پردوں میں — مگر ہے شوق اُسے عالم آشنائی کا
۲۰ دیر کی تعمیر کرا شیخ نہ اے شیخ حرم — آج کعبہ بن گیا کل تک یہی بتخانہ تھا
۲۱ قفس میں ہوں مگر سارا چمن آنکھوں کے آگے ہے — رہائی کے برابر اب تصور ہے رہائی کا
۲۲ غم نہیں جی تن سے نکلا دل گیا — مل گئے تم مجھ کو سب کچھ مل گیا
۲۳ وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب — مرے دونوں پہلوؤں میں دل بیقرار ہوتا
۲۴ جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی — وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا
۲۵ میں زباں سے تم کو سچا کہو لاکھ بار کہہ دوں — اسے کیا کروں کہ دل کو نہیں اعتبار ہوتا
۲۶ بیخودی کا ہو بُرا محو دم رکھا وصل سے — آپ جب آئے تو دل سے مدعا جاتا رہا
۲۷ نبض کی چال سکھائی طپش دل نے مجھے — عمر چلتے ہوئے گزری کہیں آیا نہ گیا
۲۸ فرقت میں کیوں نہ تھا کسی کروٹ مجھے قرار — کیا دونوں پہلوؤں میں دلِ ناصبور تھا
۲۹ رنگ چاہے اگر اس باغ میں آزادی کا — نکہتِ گل کی طرح شوق سفر پیدا کر

نکیلا شعر دل میں چبھ گیا ہے اس سے بڑھ کر کوئی کیا ہیگا تیر داغ ۔ قطعہ تاریخ طبع صنمخانۂ عشق

۳۰ کون سی جا ہے جہاں جلوۂ معشوق نہیں | شوق دیدار اگر ہے تو نظر پیدا کر
۳۱ تجلی جو کوہ طور پہ چمکی تھی ایک دن | عاشق کے سینہ میں ہے اسی کا شرار دل
۳۲ کسی سے کوئی کرتا ہو باتیں | سنا کرتے ہیں تیری گفتگو ہم
۳۳ انکے غصہ کے مٹانے کی ہیں سو تدبیریں | لاگ کی آگ نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں
۳۴ چٹکیاں لینے سے وہ دل میں کریں تو انکار | داغ کچھ درد نہیں ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں
۳۵ زاہد کو کافی ہے اتنی بات بخشش کے لئے | اسکو شوق مغفرت ہے میں گنہگاروں میں ہوں
۳۶ کس طرح فریاد کرتے ہیں بتا دو قاعدہ | اے اسیران قفس میں نو گرفتاروں میں ہوں
۳۷ وہ دشمنی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں | میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں
۳۸ ملا کر خاک میں بھی اے شرم آئی نہیں جاتی | نگہ نیچی کئے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں
۳۹ الفت میں برابر ہے وفا ہو کہ جفا ہو | ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو
۴۰ پردے میں تم ہو اس پہ یہ عالم ہے حسن کا | پردے کے باہر آؤ تو کیا جانے کیا کرو
۴۱ تو ہو تو بتکدہ مجھے کعبہ سے کم نہیں | کعبہ صنم کدہ ہے جو کعبے میں تو نہ ہو
۴۲ کیوں وصل کی چرخ کو خبر کی | آمد ہے جو شام سے سحر کی
۴۳ دونوں عالم ہوسے تہ و بالا | تم تھے پردے میں کیا قیامت کے
۴۴ تم کو آتا ہے پیار پر غصہ | مجھ کو غصہ پہ پیار آتا ہے
۴۵ ہے جوانی خود جوانی کا سنگار | سادگی گہنا ہے اس سن کے لئے
۴۶ باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی | بھیجنا ہے ایک کم سن کے لیے
۴۷ وائے قسمت وہ بھی کہتے ہیں برا | ہم برے سب سے ہوے جن کے لئے
۴۸ وصل ہو جائے یہیں حشر میں کیا رکھا ہے | آج کی بات کو کیوں کل پہ اٹھا رکھا ہے
۴۹ خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر | سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے
۵۰ نہ شاخ گل ہی اونچی ہے نہ دیوار چمن بلبل | تری قسمت کی کوتاہی تری ہمت کی پستی ہے
۵۱ بڑھے آہ رسا ابتم گرے پر عرش تک پہنچی | بلندی کو بلندی جانتا ہمت کی پستی ہے
۵۲ حقیقت آج تک بت کی نہیں معلوم زاہد کو | خدا کی شان اس پر دعویٰ ایزد پرستی ہے

۵۳ جھڑ گئی افشاں جبیں پر کچھ ستارے رہ گئے — آسمانِ حسن پر گنتی کے تارے رہ گئے
۵۴ تجھ سے مانگوں میں تجھی کو کہ سبھی کچھ مل جائے — سو سوالوں سے یہی ایک سوال اچھا ہے
۵۵ بری ہو نہ قسمت الٰہی کسی کی — کہ جو سوجھتی ہے بری سوجھتی ہے

گوہر انتخاب

۵۶ انصاف جور یار، خدا سے طلب کیا — تم نے بھی اے امیر بڑا ہی غضب کیا
۵۷ کہتے تھے دل کسی سے لگاؤ نہ اے امیر — دیکھو تو چار روز میں کیا حال ہو گیا
۵۸ قیامت کا اگر ڈر ہے تو یہ ہے — کہ مرنے پہ ہم کو پھر جینا پڑیگا
۵۹ بہت غم نہ کھا عشق کا اے امیر — تجھے کوئی آزار ہو جائے گا
۶۰ وہ آئے کھینچ کے تلوار سب کو شاد کیا — امیر آج بہت ہم نے تم کو یاد کیا
۶۱ شمع پر گزری ہے جو شب تا سحر — مختصر سی ہے ہماری سرگزشت
۶۲ سبب پوچھو نہ کچھ رونے کا ہم سے — یہی جانو کہ رونے کا سبب ہے
۶۳ وہ سنتا نہیں حال دل اے امیر — کہانی سی کب تک کہا کیجئے
۶۴ ہو گیا کیا تجھے الفت میں امیر — ابھی روتا تھا ابھی ہنستا ہے
۶۵ تو کھینچے گا شکل اسکی مانی — تو نے کہی اور میں نے مانی!
۶۶ ہے آج جو سرگزشت اپنی — کل اسکی کہانیاں بنینگی
۶۷ کوئی امیر ترا درد دل سنے کیونکر — تو ایک بات کہے اور دو گھڑی روئے

جوہر انتخاب

۶۸ ہاتھ رکھ کر مرے سینہ پہ جگر تھام لیا — تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا
۶۹ تیرے وعدے پہ شاد ہوں کیونکر — اپنی قسمت کو جانتا ہوں میں
۷۰ آہ کرنے پہ کیوں بگڑتے ہو — تم تو صاحب ہوا سے لڑتے ہو
۷۱ فرقت میں زندگی یہ عنایت خدا کی ہے — آگے جو کچھ کہوں تو شکایت خدا کی ہے
۷۱ وعدۂ وصل نے کیا بیخود — دیکھئے کیا وصال میں گزرے

کیا غزل گوئی امرد پرستی کی محرک ہے؟

(جناب محمد حسین صاحب ادیب - ایم اے - بی ای ٹی، حیدرآباد دکن)

سلسلہ کے لئے رسالہ ماہ جون ملاحظہ ہو

تصویر حسن کی تکمیل کے شرائط عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں منجملہ اور فروق کے ایک امتیازی فرق یہ ہے کہ مصور جس شے کی تصویر کھینچتا ہے اسکے تمام خط و خال کو نمایاں کرتا ہے ورنہ تصویر ناقص ہوگی۔ لیکن شاعر کو تفصیلات و جزئیات سے سروکار نہیں ہوتا۔ وہ اشیا کے صرف اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے اور غیر اہم و غیر ضروری امور کو ترک کر دیتا ہے۔ وہ صرف ان باتوں کو بیان کرتا ہے جن سے ہمارے جذبات متاثر ہوں۔ جزئی متروکات کو ہمارا تخیل پورا کر لیتا ہے۔ کسی شے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک خوشگوار اور دوسرا ناخوشگوار۔ اہمیت کے لحاظ سے انکا درجہ مساوی ہوتا ہے۔ اس لئے ناخوشگوار پہلو پر روشنی ڈالنا بھی شاعر کا فریضہ ہے۔ اگر کوئی شاعر کسی شے کے صرف مرغوب پہلو کو تاریکی میں چھوڑ دے تو تصویر ناقص ہوگی۔ غرض کہ شاعری میں جو شے قابل ترک ہے وہ غیر اہم و غیر ضروری اجزا ہیں نہ کہ نامرغوب و نامطبوع پہلو۔

یہاں ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ قدرت کی ہر شے بحیثیت مجموعی حسین ہوتی ہے۔ خوشگوار و ناخوشگوار دونوں پہلوؤں کے اجتماع سے حسن دل افروز پیدا ہوتا ہے۔ فرض کرو کہ ایک مصور شاخ گل کی تصویر کھینچنا چاہتا ہے اگر وہ ٹہنی پر صرف پھول اور کلیاں کھینچ دے اور پتیوں اور خاروں کو ترک کر دے تو تصویر نہ صرف حقیقت و اصلیت سے دور ہوگی بلکہ حسن و اثر سے بھی خالی ہوگی۔ گل اور خار لازم و ملزوم ہیں۔ کانٹوں کے چھوڑ دینے سے گل کی رعنائی بھی جاتی رہتی ہے۔ باکمال شاعر مصنوعی قطع و برید سے پرہیز کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ جلوہ گاہ قدرت میں خوشنما اور بدنما چیزیں سب ہی بساط پر ہیں اور یہ بساط اپنی مجموعی شان میں حسین ہے حقیقت پرستی و صداقت پسندی کا بھی یہی تقاضا ہے

پھول کے ساتھ کانٹے بھی اور پھل کے ساتھ صرف گودے ہی نہیں بلکہ بیج اور چھلکے بھی نمایاں کئے جائیں کہ شے کا اصلی اور سچا نقشہ ہی صحیح اثر پیدا کرتا ہے۔ بدنما اور خوشنما کوئی شے نہیں۔ دونوں کا مرکب اصلی حسن ہے۔ جان کیٹس کا مشہور مقولہ کہ "حسن صداقت ہے اور صداقت حسن" اس امر کی تصدیق کرتا ہے۔

انسانی حسن کے دو پہلو ہیں ایک سکون بخش دوسرا ہیجان آفریں۔ قدرتی اشیا و مناظر کا حسن صرف سکون پرور فرحت بخش ہوتا ہے۔ چنانچہ شفق، قوس قزح، ماہتاب، ابر بہاری، آبشار وغیرہ کے حسن اور خوش نمائی سے ہمارے دل پر صرف سرور و انبساط کی پرسکون کیفیت طاری ہوتی ہے لیکن انسانی پری پیکروں اور ماہ رخوں کا حسن و جمال اگر ایک طرف آنکھوں کو نور اور دل کو سرور بخشتا ہے تو دوسری طرف جذبات میں شورش و ہیجان بھی پیدا کرتا ہے۔ ایسی صورت میں ہمارے کسی صادق البیان شاعر نے حسن کے دونوں پہلوؤں کو پیش کر کے اسکے فتنہ انگیز عناصر سے بچنے کی ہدایت کی کیا برا کیا؟ اگر جامی علیہ الرحمۃ نے ایک پورا قصیدہ حسن و خط کی تعریف میں لکھدیا تو کون سی بات مقتضائے شاعری کے خلاف ہوئی؟ انکی نگاہ پاک بیں نے حسن سبزہ آغاز میں جو کرشمے اور جلوے دیکھے وہ انھیں کی زبان سے سننے کے لائق ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ؎

جلوۂ حسن تو در افزونی است — آئینہ چونی و بے چونی است
قبلۂ ہر دیدہ درین آئینہ است — منظر اہل نظر این آئینہ است

حسن کا مرقع یقیناً نامکمل و ناقص رہیگا اگر اسکے صرف فرحت بخش اور دل افروز پہلو پر روشنی ڈالی جائے اور اسکے شورش انگیز ہیجان خیز عناصر سے چشم پوشی کر لی جائے۔ مسٹر ایبر کرامبی کا قول ہے کہ شاعری میں "مکمل ذہنی تجربہ" کا اظہار ہونا چاہیئے۔ شاعر کا ذہن خوشگوار و ناخوشگوار دونوں قسم کی چیزوں کا تجربہ و مشاہدہ کرتا ہے۔ اگر نامطبوع عناصر کو شاعری سے خارج کر دیا جائے اور صرف دلچسپ و مرغوب باتوں کو بیان کیا جائے تو یہ حقیقی شاعری نہ ہوگی بلکہ اسکی حیثیت محض ہنسنے ہنسانے یا دل بہلانے والے مذاقیہ قصہ یا لطیفہ کی سی ہوگی۔ "مکمل ذہنی تجربہ" کی ترجمانی کے لئے شاعر کو چاہیئے کہ وہ کسی عنصر کو خارج نہ کرے خواہ وہ خوشگوار ہو یا ناخوشگوار۔ کیونکہ ناخوشگوار و نامطبوع عناصر و اجزا بھی شاعری میں خاص معنی و اہمیت رکھتے ہیں۔ انکے بغیر ذہنی تجربہ میں داخلی ہم آہنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ یہی ہم آہنگی شاعری کی جان ہے۔

اطالیہ کے مشہور آفاق شاعر ڈانٹے کی زندہ جاوید کتاب "ڈیوائن کامیڈی" (ربانی طربیہ) میں بعض مقامات نہایت ناخوشگوار و نفرت انگیز پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ مقامات علیحدہ انفرادی و آزادانہ حیثیت سے پیش کئے جاتے تو علمی ادبی دنیا ہرگز انھیں قبول نہ کرتی بلکہ نفرت کا اظہار کرتی لیکن ڈانٹے نے ان مقامات کو اپنے "مکمل ذہنی تجربہ" کا جزو

جزو خیال کیا۔ ان ناخوشگوار اجزا کی موجودگی ہی نے اسکے ڈرامہ میں ربط، تناسب، ہم آہنگی اور وحدت قائم کرکے ایسے مجموعی حسن کو ہزار گونہ بڑھا دیا اور "ڈیوائن کامیڈی" کو ایک محیر العقول و زندہ جاوید ادبی کارنامہ بنا دیا۔

اسی طرح رابرٹ برنز نے اپنی نظم "خوش مزاج گداگر" میں بھکاریوں کی جو بداخلاقیاں بیان کی ہیں اور انکی شرم دھاچوکڑیوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس پر بعض نقاد ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور ان پست و ناپسندیدہ امور کو مذاق سلیم کے فقدان کا نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن برنز فی الحقیقت بہت بڑا ماہر فن اور صادق البیان شاعر تھا۔ ا جن بداخلاقیوں کا ذکر کیا ہے وہ حقیقت واقعہ ہیں۔ اگر شاعر ان سے اغماض کر لیتا اور فقیروں کو صرف اپنی جھولی تھمن دکھا دیتا تو نہ صرف اسکی راست بیانی و صدق گوئی پر حرف آتا بلکہ وہ گداگروں کی صحیح تصویر پیش کرنے سے قاصر رہتا۔ جو منصب شاعری کا بہت بڑا نقص متصور ہوتا۔ خوشگوار و ناخوشگوار واقعات کی آمیزش ہی نے اس نظم کو اعلیٰ آرٹ (حسن کاری) کے زینہ پر پہنچایا ہے۔

اسی اصول پر مولانا جامی کے اشعار پر غور کرنا چاہیئے۔ اگر وہ حسن نوخطا کی صرف دلفریبیوں اور رعنائیوں روشنی ڈالتے صنعت کردگار کی تعریف کرکے خاموش ہو جاتے اور اس حسن کی شرر باریوں و ہیجان آفرینیوں یک لخت قطع نظر کر لیتے تو انکا پیش کردہ مرقع نامکمل اور ادھورا رہتا انکی صادق البیانی پر حرف آتا۔ وہ ایک فریضہ شاعری کی ادائی سے قاصر رہتے اور انکی تصویر حسن کی حیثیت محض ایک دل خوش کن خیالی و سیمیائی افسا سی ہوتی جسے صحت واقعہ سے کوئی لگاؤ نہ ہوتا۔ لیکن اس شاعر بے بدل نے ایک اعلیٰ ماہر فن کی حیثیت سے حسن کے پہلوؤں پر نظر ڈالی اور اسکے شورانگیز و ہیجان خیز عناصر کا بھی ذکر کرکے ہمیں اس کی خطرناکیوں سے آگاہ کر دیا۔ دولت حسن پر ڈاکہ مارنے والی طاغوتی قوتوں سے بچنے کی ترکیب بتاتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔

چہرہ نہاں دار کہ آلودگاں　　جز رہ بیہودہ نہ پیمودگاں
چوں بہ جمال تو نظر وا کنند　　آرزوے خویش تمنا کنند

واقعات کتنے صحیح اور سچے ہیں۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ حسن نوخط میں بھی جذب و کشش کی قوت بدرجہ موجود ہے۔ پاک بینوں کے لئے یہ حسن "آئینہ چونی و بیچونی" اور مظہر صنعت کردگار ہے لیکن دنیا میں صرف پاک اور نیک نہاد ہی نہیں بستے بلکہ یہاں بہت سے بدگہر و بدطینت بھی آباد ہیں۔ جن کے ناپاک دلوں میں حسینوں کو دیکھ کر خواہش نفسانی پیدا ہوتی ہے اور وہ اس بیش بہا حسن کو اپنے شہوانی ہاتھوں سے لوٹ کرنا چاہتے ہیں۔ ان بدسرشتوں حسن کی نگہداشت ضروری ہے۔

رنچھلا واضح رہے کہ ادب و شاعری کی راہ کو لغت کے پاؤں سے طے کرنا نری حماقت ہے۔ ہر جگہ الفاظ کے لغوی معنی
اصلی اد نہیں لئے جاتے ورنہ قرآن شریف میں بھی "ید اللہ" اور "وجہ اللہ" کے فقرے پڑھ کر خدا کو ہاتھ
شہو ر منہ رکھنے والا مخلوق ماننا پڑیگا۔ شاعری میں تو خاص طور پر الفاظ کے مرادی معنی لئے جاتے ہیں۔ ورنہ شاعر کو
سنبھال کر کہنا پڑتا ہے کہ "شعر مرا بہ مدرسہ کہ برد"۔ مولانا جامی کے مذکورہ بالا شعر میں "چہرہ نہاں دار" کا یہ
فرحہ ملب نہیں ہے کہ عورتوں کی طرح لڑکوں کو بھی پردہ نشینی پر مجبور کیا جائے۔ بلکہ شاعر تو صرف یہ کہنا چاہتا ہے کہ
ل بر لوگ او دہ دامن اور رہ بیہودہ پرگامزن ہیں اور جو حسن و جمال دیکھ کر حرص و آز کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اُن سے صاحب
رت ان کو الگ رہنا چاہیئے۔ کیا ہر شخص کا فرض نہیں ہے کہ وہ اپنی اولاد کو بُری صحبت سے بچالے؟ مولانا جامی نے
رہما بر رحہ بالا اشعار میں صرف بد باطنوں کی دراز دستیوں سے حفاظت حسن کا ذکر کیا ہے۔ ان میں کوئی بات خلاف
کیا مجھ نہیں ہے۔ صانع مطلق نے جن چیزوں کو حسن و جمال عطا کیا ہے شاعر اُنکی تصویر کھینچتا ہے۔ قدرت نے نوخطوں
ے خار سبزہ آغازوں کو بھی دولت حُسن ودیعت کی ہے اس لئے شاعر کبھی کبھی اس حسن دل افروز کا مرقع بھی پیش
ے دیتا ہے۔ شعرائے متقدمین نے حسن مردانہ کی گاہ بگاہ جو تصویر کھینچی ہے اسکی یہی حقیقت ہے حسن خواہ عورت
۳ ہو یا مرد میں۔ قدرتی اشیا میں ہو یا مناظر و مرایا میں۔ وہ فی نفسہ ہر حال میں پاک صاف ہے۔ اگر کوئی عیب ہے تو
۴ ن میں نہیں بلکہ دیکھنے والے کی آنکھ اور دل میں ہے۔ چند بد باطنوں کی خاطر نہ قدرت حُسن کی تخلیق روک سکتی
۵ ہے اور نہ شاعر حسن کی مرقع کشی ترک کر سکتا ہے۔ جب حقیقت واقعہ یہ ہے تو کون ایسا کم فہم ہوگا جو محض حسن مردانہ کی
۶ ہے و فطری تصویر کشی کی بنا پر سعدی و جامی یا ولی و میر جیسی تقدس مآب ہستیوں پر علانیہ شاہد بازی و امرد پرستی کا
۷ الزام عائد کرنے کی جسارت کریگا؟

لیکن جذبۂ بطل پرستی کو ذرا قابو میں رکھ کر "شعر العجم" کے فاضل مؤلف کی حیرت انگیز ذہنیت ملاحظہ ہو۔ آپ
۶۸ مولانا جامی علیہ الرحمۃ کے مذکورہ بالا اشعار پر حاشیہ آرائی کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "مولانا جامی ایک طرف تو جلوہ
۶۹ مہ کو نور الٰہی کا آئینہ قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنا چہرہ چھپائے رکھ ورنہ خطرات پیش آئینگے
۷۰ ہیں کیا عورتوں سے گزر کر مردوں میں بھی پردہ رائج کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بیہودہ شاہد پرستی نے
۷ لک کو برباد کر دیا۔ جب اکابر صوفیہ اس قسم کی حسن پرستی کی تعلیم دیں اور فرمائیں کہ عشق مجازی عشق حقیقی کا زینہ ہے
۷۱ پکے ملک کا بلائے عام میں مبتلا ہونا یقینی تھا اور ہوا"۔

اس قول میں صداقت کا شمہ بھی نہیں پایا جاتا۔ شق اول کی بحث تو اوپر گزر چکی۔ شق ثانی بھی محض تخیل کی

واردہے۔ نہ صرف ایران و ہندوستان میں بلکہ عالم کے کسی پردہ میں کوئی ایسا زمانہ بجز اس روایتی دیتم تاریخی زمانہ
جس کا ذکر "کتاب [illegible]" میں ہوا ہے [illegible] واقعتاً [illegible] کبھی نہ ہو۔ آپ
مشرقی یا مغربی مؤرخ کی لکھی ہوئی کوئی معتبر تاریخ ایران یا تاریخ ہندوستان [illegible] اسکا بغور مطالعہ کیجئے۔ آپ کو
کوئی زمانہ ایسا نہ ملیگا جب [illegible] کا امرد پرستی کی بابت [illegible] کا بیان ہے۔
دوسری نہیں ہیں اور رکھتی ہیں [illegible] حاصل کرتی ہیں [illegible] دنیا کا دستور
ہے ہمیشہ ایسا ہی ہوتا [illegible] مورخین نے [illegible] دیا ہے
بیان کئے ہیں لیکن کسی [illegible]
اکابر صوفیہ نے [illegible] بے بنیاد ہے [illegible] صوفیہ
سے بڑھ کر نیک سیرت ہوگی۔ [illegible] عشق حقیقی کا زینہ قرار [illegible] ہو تو عشق مجازی
کے معنی امرد پرستی یا شاہد بازی [illegible] جس عشق مجازی کی تعلیم [illegible] روحانی
مادیت پائی جاتی ہے۔ یہ عشق تو [illegible] نہیں چاہتا [illegible] خواہشات
مجولی کا عنصر [illegible] اگر عشق کے کوئی علوی و سماوی معنی نہ بھی لئے جائیں
دنیا میں بالعموم جو واقعات پیش آتے رہتے ہیں انھیں کے حدود کے اندر اسکو جگہ دے کر ہم اسکے مفہوم پر غور کریں تو
معلوم ہوگا کہ جنسی محبت کے علاوہ ہر قسم کی انتہائی محبت پر اس کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ آقا کو غلام کے ساتھ غلام کو آقا
کے ساتھ۔ باپ کو فرزند کے ساتھ فرزند کو باپ کے ساتھ۔ بھائی کو بھائی کے ساتھ۔ مرید کو مرشد کے ساتھ۔ گوالے کو
بھینس کے ساتھ۔ [illegible] کے ساتھ۔ عورت کو اپنے بچے کے ساتھ۔ ایک سعدی یا وزیری کو اپنے
[illegible] کے ساتھ۔ انسان کو دوست کے ساتھ۔ [illegible] کے ساتھ۔ یا لو جانور کے ساتھ۔ زر و سیم کے ساتھ نہایت درجے کی
محبت ہو سکتی ہے۔ عرف عام میں اسی کو عشق کہتے ہیں۔ اور اسی قسم کی انتہائی محبت کو عشق حقیقی کا اول زینہ قرار
دیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ صوبہ بہار میں حضرت مخدوم احمد یحییٰ منیری اور چولھائی گوالہ کا ایک دلچسپ قصہ زبان زد خلائق
چلا آرہا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ مخدوم صاحب ایک بار بہیا کے جنگل میں چلہ کش تھے۔ چولھائی گوالہ جو اسی جنگل
میں مویشی چرایا کرتا تھا حضرت کی چند کرامتیں دیکھ کر انکا معتقد بن گیا اور مشرف باسلام ہو کر انکے حلقہ ارادت میں داخل
جب وہ حضرت سے رشد و ہدایت کا طالب ہوا تو انھوں نے اس سے دریافت کیا کہ تم کو دنیا میں کون سی شے سب سے
عزیز ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میری گائے مجھے بہت پیاری ہے حضرت نے فرمایا کہ بس حجرے میں بیٹھ کر دن رات

اسی کا تصور کیا کرو - کچھ مدت تک گائے کا تصور کرتے کرتے اس پر ایسی محویت اور استغراقی کیفیت طاری ہوئی
گائے کا تصور کرنے لگا - چنانچہ جب مخدوم صاحب نے اسکو حجرے سے باہر بلایا جسکا دروازہ نہایت تنگ تھا تو
جواب دیا کہ [illegible] باہر آؤں - [illegible] گویا " فنا فی البقر " ہوکر اس نے راہ سلوک کی پہلی
منزل طے کر لی - اسکے بعد مرشد [illegible] " فنا فی الشیخ " ہوا - اور پھر بمرور زمانہ اس نے " فنا فی اللہ
اور " فنا فی اللہ " کے مدارج [illegible] زیارت گاہ خلائق بنا ہوا ہے - قصہ
غلط [illegible] عوام کے نزدیک عشق مجازی صرف عورت اور مرد کی باہمی جنسی محبت
ہے [illegible] اور یہی محبت عشق حقیقی کا اول زینہ قرار
[illegible] عشق حقیقی کی اول منزل نہیں بتائی ہے - صوفیاء
[illegible] اور اظہار عشق و محبت علیحدہ
جس طرح [illegible] حسین منظر شاعر کے دل پر وجد و سرور کی کیفیت
اور [illegible] صوفی اور پاک بیں شاعر کے دل میں حسن نو خط کے نظارہ
[illegible] ایک جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے جس [illegible] سفلیہ لذت حرص کا کوئی عنصر نہیں ہوتا - ہمارے
گاہ بگاہ حسن مردانہ کی صرف تصویر کشی [illegible] لیکن آج تک انھوں نے کسی خوبصورت لڑکے کے ساتھ عشق
کر کے زنا نہیں کی ہے اور نہ ہجر و وصل [illegible] یا مصافحہ و معانقہ کے عشقیہ مضمون باندھتے ہیں جیسا
اپنی معشوقہ کے متعلق کیا کرتے ہیں -

صاحب " شعر العجم " ایک جگہ سعدی علیہ الرحمہ کا ایک مصرعہ " من بتو مشغول و تو با عمرو زید " نقل کر کے
کہتے ہیں " بڑے بڑے مقدس درویش اور ارباب حال مکتبوں میں بچوں کو گھورنے کے لئے جاتے تھے " حالانکہ واقعہ یہ
میں آج کل کی طرح ڈاک بنگلے ہر جگہ نہ تھے بڑے بڑے شہروں میں البتہ بیت القرار یا دار الاضیاف بنے ہوئے تھے
صرف استطاعت قیام کر سکتے تھے - بڑے شہروں کے مسافر خانے نو واردوں کی کثرت کی وجہ سے تکلیف دہ
مقامات پر تو غیر مستطیع مسافروں کے لئے مسجد کے سوا اور کوئی جائے قیام ہی نہ تھی - اس زمانہ میں بڑی بڑی
یا دار العلوم کے لئے کہیں کہیں عمارتیں بنی ہوئی تھیں لیکن ابتدائی تعلیم کے لئے علیحدہ کوئی مکان نہ تھے بلکہ
ساتھ ایک ایک مکتب وابستہ تھا - مسجد کے دو کمرے مسافروں کے لئے مخصوص تھے - آج بھی غریب مسافر
ہی میں اترتے ہیں - بہرحال بیچارے درویش یا مسافر بچوں کے گھورنے کے لئے نہیں بلکہ شب باشی کے

م کرتے تھے اور مسجدوں ہی میں بچے تعلیم بھی پاتے تھے - اس طرح غیر آبادی والے مسافر اور بچے یک جا ہو جاتے تھے
نہی میں مکتب کے ملا قصاب کم نہ تھے - ہر فروگذاشت پر سخت سے سخت سزائیں دیتے تھے - بچے ملا جی کے خوف سے
سہمے سہمے رہتے تھے - انکو کسی استاد سے گفتگو کرنے کی مہلت نہ تھی - ان تمام امور کو پیش نظر رکھ کر سعدی علیہ الرحمہ
مذکورہ بالا مصرع پر غور کیجئے - کیا یہ مصرع کوئی روشن پہلو نہیں رکھتا ؟ کیا اسکا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ شیخ سعدی
ی طالب علم سے اس نئے مقام کے متعلق جہاں وہ فروکش تھے کوئی بات دریافت کرتے ہوں یا اور کچھ پوچھنا چاہتے
ں لیکن لڑکا استاد کے سونٹے کے خوف سے اپنی جگہ سے ہلنے میں متامل ہو - شیخ کو یہ بات ناگوار اور خلاف تہذیب
م ہوئی ہو اور انھوں نے یہ کہکر تنبیہ کی ہو کہ "میں تو تمہارے استاد کی طرح پڑھانے میں مشغول ہوں اور چند باتیں دریافت
نا چاہتا ہوں، لیکن تم ہو کہ ضرب زید عمرا کی جھڑی لگائے ہوئے ہو - یہ کہاں کی تہذیب ہے ؟" اگر یہ معنی تسلیم ہو سکتے
ں تو پھر اس مصرع کے تار ایک معنی لیکر اتنے بڑے صاحب حال و قال پر نظر بازی و امرد پرستی کا الزام لگانا کہاں کی انسانیت ہے؟
"شعرالہند" میں بھی صوفیوں اور شاعروں پر نہایت بیباکی کے ساتھ امرد پرستی کے الزام عائد کئے گئے ہیں حقیقت الامر
ہے کہ اس کتاب میں کہیں اجتہاد و تحقیق سے کام نہیں لیا گیا ہے - جدت، ندرت اور ذہنی اپج کا تو یہاں نام و نشان
ی نہیں ملتا - ہر جگہ صاحب "شعرالعجم" کے خیالات کی کورانہ پیروی کی گئی ہے "شعرالعجم" میں ایرانی شاعری اور
انی ہیئت اجتماعیہ کے جتنے معائب بیان کئے گئے ہیں وہ سب کے سب "شعرالہند" میں نقل ہو کر اردو شاعری اور اردو
سے منسوب کر دیے گئے ہیں - بلکہ بعض شعرا تو غیر فطری افعال شنیعہ کے مرتکب بھی بنا دیے گئے ہیں لیکن صاحب شعرالہند
ل معافی ہیں - کیونکہ انکی حیثیت ایک آزاد محقق کی نہیں بلکہ محض ایک ناقل کی ہے -

ود و ایاز کی عاشقی و معشوقی کا افسانہ

صاحب "شعرالعجم" نے قرون وسطیٰ کے دامن کو امرد پرستی و شاہد بازی کے دھبوں سے ملوث ثابت کرنے کے ضمن
یں جابجا محمود و ایاز کی عاشقی و معشوقی کے افسانہ کو بھی خوب چمکا چمکا کر بیان کیا ہے - حالانکہ اس بے بنیاد قصہ کو
اقعات سے اتنا ہی بعد ہے جتنا نور کو ظلمت سے - سیاہی کو سفیدی سے - سمک کو سماک سے - اور ماہ کو ماہی سے - خود
عرالعجم" کے فاضل مؤلف اورنگ زیب پر ایک نظر ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "فلسفۂ تاریخ کا یہ ایک راز ہے کہ جو
عات جس قدر زیادہ شہرت پکڑتے جاتے ہیں اسی قدر انکی صحت زیادہ مشتبہ ہوتی ہے" - کیا دیوار قہقہہ، چاہ بابل،
وان، مار ضحاک، جام جم سے بڑھکر کسی واقعہ نے شہرت عام کی سند حاصل کی ہے ؟ لیکن کیا ان میں سے ایک بھی
سے کچھ علاقہ رکھتا ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ اکثر واقعات کسی خاص وقتی سبب سے شہرت کے منظر پر آ جاتے ہیں پھر عام

تقلید کے اثر سے جو خاصۂ انسانی ہے شہرت عام کی بنا پر لوگ اس پر یقین کرتے چلے جاتے ہیں اور کسی کو تنقید و تحقیق کا خیال نہیں آتا۔ یہاں تک کہ وہ مسلمات عامہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔ فی الحقیقت یہاں جس راز کا ذکر کیا گیا ہے وہ کا تاریخ سے نہیں [illegible] ادبیات [illegible] چند چیزیں جو اوپر گنائی گئی ہیں انھیں کوئی محقق تاریخی کی فہرست میں شامل نہیں کرتا [illegible] بطور ادبی تلمیحات کے لیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایاز کی عاشقی و معشوقی کے قصے نے اگرچہ شہرت عام حاصل کر لی ہے لیکن تحقیق و تفتیش کی عدالت نے فیصلہ کر دیا ہے کہ "عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ"۔ [illegible] ایاز کے حسن و معشوقیت پر فردوسی اور فرخی کے مدحیہ لکھنے کا واقعہ بھی بالکل بے بنیاد [illegible] جام جم اور آئینۂ سکندر وغیرہ کی تلمیحوں سے [illegible] کی زینت [illegible] ہوتی ہے [illegible] کے منافی پیدا ہوتی ہے اور اس ماننے سے معاصرین کی بھی توہین ہوتی ہے۔

ابوالفضل بیہقی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ایاز کے حسن و معشوقی [illegible] ایسا جابر بادشاہ تھا کہ اپنے غلاموں کی عزت [illegible] تھا اور دوسروں کے تصور سے کا روادار تھا۔ شعرا ایک جگہ فرخی کو ایاز کا عاشق اور سلطان محمود [illegible] قرار دیا گیا ہے [illegible] فردوسی نے محمود کی [illegible] ایاز کے [illegible] تعریف [illegible] دونوں بیانات کسی بے پروا کے تخیل کی پیداوار ہیں جو [illegible] شعرالعجم میں نقل کر دیے گئے ہیں۔ حافظ محمود خاں صاحب شیرانی نے نہایت معتبر تاریخی شہادتوں کی بنا پر ثابت کیا ہے کہ جب فردوسی پہلے پہل سلطان محمود کے دربار میں آیا اس وقت ایاز پیدا بھی نہیں ہوا تھا۔ اگر ہوا بھی ہوگا تو [illegible] ہوگا۔ ایسی حالت میں ایک طفل شیر خوار پر سلطان کا اور ایاز کے حسن و معشوقی [illegible] فردوسی کا قصیدہ لکھنا کس قدر [illegible] مہمل بات ہے۔ علاوہ بریں فرخی غزنی آنے کے وقت ایاز کی عمر [illegible] اتنے کم سن [illegible] کا عاشق ہونا اور سلطان کے رقیبوں میں داخل ہونا اور بھی [illegible] حافظ محمود خاں شیرانی نے اس واقعہ کو [illegible] طرز سے بیان کیا ہے وہ نہایت دلچسپ [illegible] کے لائق ہے۔ چنانچہ وہ رقمطراز ہیں کہ "یہ پہلے دکھایا جا چکا ہے کہ ۴۰۵ھ [illegible] ایاز کا شعور [illegible] ۴۱۲ھ [illegible] فرخی کی آمد پر اسکی عمر چھ دس کی ہونی چاہیے۔ [illegible] چہار دہ سالہ [illegible] شعرالعجم فرخی کے آغوش میں بت سی وشش سالہ دیکھتے ہیں۔ خواہ کوئی [illegible] نظر انداز کر لیں [illegible] بت سی وشش سالہ معشوق کے پہلو نشین ہونے

بہت کچھ عذر و تامل اور اعتراض و انکار رہوگا ۔ اس عمر میں ایاز کے حسن و معشوقی کی اداؤں میں سے صرف ایک چیز
اہمیت رکھتی ہوگی اور وہ اسکی پاکیزگی خاص ہوگی جس نے اسکے آفتابی چہرہ کو ہر طرف سے محصور کر لیا ہوگا "۔

الغرض ایاز کے حسن و معشوقی کے سارے قصے محض خود ساختہ ہیں صحیح واقعہ صرف اس قدر ہے کہ سلطان محمود کے تمام غلاموں میں ایاز سب سے زیادہ وفادار، دلاور اور جان نثار تھا سلطان اسکی قدردانہ و جانبازانہ خدمات کی دل سے قدر کرتا تھا اور اس پر خاص نظر عنایت رکھتا تھا ۔ چنانچہ ایاز کی وفاداری، بہادری اور جان نثاری سے خوش ہوکر محمود نے اسے ایک دستہ فوج کا کماندار بھی بنا دیا تھا غرض کہ سلطان ایاز کے حسن سے زیادہ حسن سیرت کا شیفتہ و قدر دان تھا ۔ ایاز کی روز افزوں ترقی اور اس پر شاہی انعام و اکرام کی بارش دیکھ کر بعض امرا کے سینہ میں رشک و حسد کی آگ بھڑک اٹھی ۔ انھوں نے ایاز کو بدنام کرنے کے لئے اس پر سلطان کے عاشق ہونے کا قصہ گڑھا اس لغو قصہ کا لوگوں کے کانوں تک پہنچنا تھا کہ یار لوگوں کا خاص مقصد آگیا ۔ ایک کے کان میں جو پھونک گیا تو بوڑھے، جاہل، عالم، زاہد، شیعہ، امیر، غریب، نیک، بد سب یہی راگ گانے لگے " رفتہ رفتہ تحریر و تقریر میں تلمیحات ادب، افسانہ، شاعری کوئی چیز اس سے خالی نہیں رہی آگے چل کر یہ افسانہ زینت کلام کا موجب بن گیا ۔

بہت لوگوں سے یہ قصہ بھی زبانی دلائل پہنچایا جاتا ہے کہ جب محمود کو معلوم ہوا کہ ایاز کی وفادارانہ و جاں نثارانہ خدمات کے صلے میں اس نے اسکو جو سرفرازی بخشی ہے اسے بعض حسد و نوازش بیجا سے تعبیر کرتے ہیں تو اس نے ایک روز امرا لوگوں کو بلا بھیجا جنھیں دعویٰ تھا کہ وہ ایاز سے کہیں زیادہ وفا شعار اور خدمت گزار ہیں ۔ بادشاہ نے سب کو ایک ایک قیمتی زمردیں جام دے کر کہا کہ اسے توڑ ڈالو بعضوں کو تامل ہوا اور انھوں نے پیالہ نہیں توڑا بعضوں نے حکم پاتے ہی زمین پر پٹک دیا ۔ تب سلطان نے غصہ ہوکر پوچھا کہ کیا تمھیں ذرا بھی عقل نہیں ہے ایسے بیش قیمت زمردیں جام کے توڑنے میں کچھ تو تامل ہونا چاہیئے تھا ۔ سب نے یہی جواب دیا کہ سرکار کے حکم کی تعمیل کے آگے پیالہ کی کیا حقیقت تھی ۔ ہم تو صرف حکم بجا لانے والے ہیں ۔ آخر میں ایاز طلب کیا گیا ۔ وہاں تو صرف حکم کی دیر تھی ۔ بادشاہ کا اشارہ پاتے ہی اس نے پیالہ زمین پر دے مارا اور اسے چکنا چور کر دیا ۔ سلطان نے حسب سابق خفا ہوکر نہایت درشت لہجہ میں پیالہ توڑنے کا سبب پوچھا ۔ "ایاز نے مؤدبانہ حیثیت سے ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کے عرض کیا " جہاں پناہ غلام سے خطا ہوئی جسکی بیحد ندامت ہے مگر حضور خطا بخش ہیں ۔ جاں بخشی فرمائی جائے " ۔ ایاز میں یہی وہ امتیازی وصف تھا جس نے اسے سلطان کی نظروں میں اور الطاف شاہانہ کا مورد بنا رکھا تھا ۔ ممکن ہے کہ یہ قصہ جھوٹ ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سلطان محمود ایاز کے عارضی و بے ثبات حسن و جمال سے کہیں زیادہ اسکی مستقل خوبیوں یعنی اسکی بے نظیر وفاداری، جواں مردی، فداکاری

رہیں جاں نثاری کا قدر دان تھا۔ اگر ایاز میں مردانہ، شجاعانہ اور جاں بازانہ اوصاف موجود نہ ہوتے۔ بلکہ وہ صرف معشوقانہ اداؤں اور رعنائیوں کا حامل ہوتا تو محمود باوجود اپنی انتہائی الفت و محبت کے اسے اعلیٰ فوجی خدمات اور آخر میں منصب شاہی سپہ سالاری سے سرفراز نہ کرتا۔ افسوس ہے کہ تحقیق ناآشنا اور بے پروا تذکرہ نویسوں نے محض عجوبہ پسند عوام کی دلچسپی کے لئے ایاز کو جاں نثار غلاموں کے زمرہ سے نکال کر محمود کا منظورِ نظر بنا دیا۔

غرض آج جب کہ امرد پرستی قابل نفرت و ملعون خیال کی جاتی ہے اور ہیئت اجتماعیہ ان بیہودہ خیالات کی تفصیل سننا بھی گوارا نہیں کرتی اس امر کی سخت ضرورت ہے کہ ادب شاعری سے محمود و ایاز کی فرضی عاشقی و معشوقی کے قصے یکسر خارج کر دیے جائیں۔ کیونکہ صحیفۂ حسن و عشق کی زینت کے لئے لیلیٰ و مجنوں، شیریں و فرہاد، وامق و عذرا، یوسف و زلیخا کے نام کافی ہیں۔ البتہ اگر ادب شاعری میں محمود و ایاز کا ذکر آقا و غلام کی نسبت سے آئے تو کوئی ہرج نہیں مثلاً شاعری کے آسمان کے آفتاب عالمتاب یعنی ڈاکٹر سر اقبال صاحب سلامتی نوع انسان کی باہمی اخوت و مساوات کو محمود و ایاز کے حوالے سے اس طرح ظاہر کرتے ہیں ۔ ؎

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز ۔۔۔ قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قوم حجاز

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز ۔۔۔ نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

بندہ و صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

دوسری جگہ وہ رموز مملکت بیان کرنے کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ حکومت ایک قسم کی جادوگری ہے جس طرح ساحر ایک منتر سے کسی مجمع کو مسحور کر لیتا ہے۔ اسی طرح حاکم کی ذرا سی ساحرانہ نوازش محکوم کو اطاعت کیشی و جاں نثاری پر آمادہ کرتی ہے اور اسکے کندھے پر غلامی کا جوا بار نہیں معلوم ہوتا۔ اس خیال کو وہ شاعرانہ رنگ میں محمود و ایاز کی تلمیح کے ساتھ یوں ادا کرتے ہیں ۔ ؎

جادو ہے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز ۔۔۔ دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

لیکن ایسے اشعار سے پرہیز کرنا چاہیے جہاں محمود و ایاز کا ذکر بجائے آقا و غلام کے عاشق و معشوق کی حیثیت سے اس طرح ہو کہ سامع کا ذہن غیر فطری محبت کی جانب منتقل ہوتا ہو۔ یا جہاں سلطان محمود زیبا شاہانہ وقار کھو کر ایاز کی ناز برداری میں مشغول دکھایا گیا ہو۔ مثلاً ایک شعر ہے کہ ؎

محمود غزنوی کہ ہزاراں غلام داشت ۔۔۔ عشقش چناں گرفت غلامِ غلام شد

یہاں دکھایا گیا ہے کہ سلطان محمود ایاز کی زلف گرہ گیر میں ایسا اسیر ہوا کہ اسکو اپنے شاہانہ شرف و عزت اور رعب کی مطلق پروا نہ رہی اور وہ ایک غلام کے در پر جبین نیاز گھسنے لگا۔ محمود جیسے جابر بادشاہ سے اس قسم کی مجنونانہ حرکت کب نہیں ہو سکتی تھی۔ اگرچہ محمود و ایاز کی عاشقی و معشوقی کی تلمیح محض زینت کلام کے لئے بھی استعمال کرنے میں ادنیٰ شاعروں کے قلم سے بہت سی لغزشیں سرزد ہونے لگتی ہیں اور وہ غیر فطری و خلاف قیاس باتیں بیان کرنے لگتے ہیں لیکن اعلیٰ درجہ کا آرٹسٹ (فن کار) حسن و عشق کا ذکر بھی ایسے استادانہ انداز سے کرتا ہے کہ سامع کا ذہن بجائے علویت کی جانب مائل ہوتا ہے اور نہ صرف لطف و دلچسپی بلکہ جوش و تپش بھی حاصل کرتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر سر اقبال کے حسب ذیل اشعار ملاحظہ ہوں۔ ؎

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں
نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلف

سن اے طلبگار درد پہلو میں ناز ہوں تو نیاز ہو جا
میں غزنوی سومنات دل کا ہوں تو سراپا ایا

یہ اشعار کس قدر پُر جوش اور کیف آور ہیں۔ کون ایسا بدمذاق ہوگا جسکے دل میں یہ اشعار پڑھ کر بجائے علو خیالی اور جوش حرص و آز کا جذبہ پیدا ہوگا۔ پہلے شعر میں محض حسن و عشق کی معاملہ بندی نہیں کی گئی ہے اور نہ یہاں غزنوی و ایاز کسی مخصوص تاریخی شخصیت کی انفرادیت کی جانب۔ زمانہ حال کا استعمال صاف بتا رہا ہے۔ غزنوی اور ایاز وہ شخصیتیں ہیں جو آج سے ایک ہزار سال قبل اس تیرہ خاکدان کی زیارت کو آئیں اور ناز و نیاز کے جلوے دکھا کر سپرد خاک بلکہ یہ زندہ جاوید ہستیاں ہیں جو آج بھی موجود ہیں اور ہمیشہ باقی رہینگی۔ اس شعر میں غزنوی و ایاز سے سعی و مقصود و مطلوب مراد ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہمارے افعال و اعمال میں۔ ہماری سعی و تلاش میں۔ ہمارے طلب و جستجو میں پہلے جوش و خروش تپش و حرارت و صداقت خلوص باقی نہ رہا۔ اسی طرح ہمارے عزائم و مقاصد اور مطلب و منشا کوئی لطف و خوبی اور دلچسپی و مرغوبیت نہیں پائی جاتی۔ جب شوق جستجو و طلب صادق ہی مفقود ہو تو پھر کوشش عمل میں لذت جراحت کہاں؟ دوسرا شعر نہایت غامض معنی رکھتا ہے۔ شاعر نے جس درد و تپش کی طلبگاری راز و نیاز کی کشاکش کا ذکر کیا ہے۔ اسکا تعلق ایسے عرش پایہ عشق و محبت سے ہے جہاں قبضہ و گیرائی کی خواہش نہیں مار سکتی۔ اگر خواہش سفلیہ آمادہ پرواز بھی ہو تو اول ہی منزل میں اسکے پر جل جائینگے۔ اس شعر میں غزنوی عاشق ایاز معشوق نہیں ہے بلکہ معاملہ ہی دگرگوں ہے۔ غزنوی شاہد حقیقی ہے اور ایاز اسکا نازبردار طالب۔ شاعر لطیف پیرایہ میں تسلیم و رضا کی تعلیم دیتا ہے۔ کعبۂ جاں یا "سومنات دل" کیسا ہی ویران و منہدم کیوں نہ کر دیا جائے یعنی کتنی ہی دل شکنیوں اور ناکامیوں کا سامنا کیوں نہ ہو لیکن طلبگاران درد پہلو و طالبان عشق الٰہی کا شیوہ

رنگین ہیں آیات و احادیث، دنیا و مافیہا سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں۔ ان جیسی شکلیں باتھ آتے ہی جاتی ہیں اور تسلیم و رضا پیامِ مہیں اصول اعمال ہیں۔ والہانہ فرضی عشق و معشوقی کے تذکرے بھی روحانی علامت کا ... شعریات نقل نہ ہونے دیا۔ اقبال جیسے باکمال شاعر اور اعلیٰ قدرت رکھنے والے ... انکار نہیں ہو سکتی۔ اس لئے عزم و احتیاط کا تقاضا یہی ہے کہ محض زینتِ کلام ... ادبیات میں محمود و ایاز، عاشق و معشوق کی حیثیت سے منظرِ عام پر نہ لائے جائیں۔ اگر غیر فطری عشق و محبت کے ایک چھوٹے افسانہ کو تقویت نہ پہنچے اگر شعر و شاعری کے چمنستان میں انکو مثالی آئیڈیل، آقا و غلام کی حیثیت سے داخل ہونے اور گلگشت کرنے کا موقعہ دیا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔

حقیقت الامر یہ ہے کہ قدیم تذکرہ نویس خود کو مورخ کے مرتبہ سے فروتر سمجھتے تھے اس لئے انکو مورخانہ ذمہ داریوں کا کوئی احساس نہ تھا۔ وہ واقعات کی چھان بین کی دردسری اٹھانا نہیں چاہتے تھے بلکہ جو کچھ سنتے تھے اسے سپرد قرطاس کر دیتے تھے۔ صحیح بے لطف واقعات پر وہ دلچسپ لطائف و ظرائف کو ترجیح دیتے تھے۔ کوئی واقعہ کتنا ہی غلط اور بعید از قیاس کیوں نہ ہو لیکن اگر اسکی غرابت ان کے شوقِ عجوبہ پسندی کے لئے ... وہ ضرور حوالہ قلم کر دیتے تھے۔ انھیں غیر ذمہ داریوں اور بے پروائیوں کا نتیجہ ہے کہ قدیم تذکروں ... سے بھرے پڑے ہیں۔ شعر العجم کے فاضل مصنف نے بھی جو اصول تاریخ نویسی سے واقف تھے روایت کو درایت پر ترجیح دی اور تحقیق کا حق پوری طرح ادا نہیں کیا۔ ابو ہلال عسکری جیسے غیر ثقہ اور بے پروا مصنف نے کتاب الاوائل میں جو کچھ لکھ دیا بس درج کر دیا ہے۔ صاحب شعر العجم نے حرف بحرف صحیح تسلیم کر لیا ... سلطان محمود کو امرد پرستی و ہوا بازی کی لعنت میں گرفتار کر دیا۔ حالانکہ یہاں بڑی تحقیق و احتیاط سے کام لینے کی ضرورت تھی اور کم سے کم ان جیسے با کمال پر نظر بازی و امرد پرستی کا الزام عائد کرنے میں پس و پیش ہونا چاہیے تھا جن کی نسبت کہا جاتا ہے کہ

"دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں"

معترضین کی عام غلط فہمیاں

سطح آشنا معترضوں کا بیان ہے کہ ممالک متمدنہ کی شاعری میں بالعموم مرد عاشق اور عورت معشوقہ ہوتی ہے صنفِ قوی کی جانب سے صنفِ نازک کے لئے عشق و محبت کا اظہار کیا جاتا ہے جو بالکل صحیح اور فطری طریقہ ہے۔ مشرقی شاعری میں مرد بالکل بے حس اور بے پروا نظر آتا ہے لیکن عورت اپنے پیار اور پیار کے لئے سخت بیتابی اور بیقراری کا اظہار کرتی ہے۔ اگرچہ ایک عفت کی دیوی کا بے حجابانہ منظرِ عام پر آکر ایک اجنبی شخص کے فراق میں آہ و نالہ کرنا ... محبت کا احترام نہیں کرتا۔ ایشیائی

حیا پروری کے منافی ہے لیکن یورپ وہ مذاق اسے گوارا کر لیتا ہے اور اسکو بھی فطری طریقہ قرار دیتا ہے۔ غرض کہ مذاق کو سب کچھ پتہ ہے۔ اگر کوئی شئے نا پسند ہے تو اُردو و فارسی شاعری میں معشوق کے لئے صیغہ تذکیر کا استعمال۔ اگر محض ایک لسانی بحث ہے لیکن معترضین کی کم سوادی اس لسانی خصوصیت کے تمام پہلوؤں پر غور کئے بغیر یہ نتیجہ اخذ کر لیتی کہ اُردو و فارسی کی غزلوں میں مرد اپنے ہی ہمجنس کا عاشق ہوتا ہے جو فطرت کے خلاف اور تہذیب کے منافی ہے۔ چنانچہ ایک معترض صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ "اُردو شعرا نے فارسی شاعری کی تقلید میں مرد کو مرد کا عاشق قرار دیا ہے۔ اس سے اُردو کے عاشقانہ اشعار سے نہ صرف خیالات میں پستی اور عبارت میں ابتذال پیدا ہوتا ہے۔ بلکہ ایسی شاعری شاہد بازی و امرد پرستی کی محرک بھی ہوتی ہے" دنیا میں جتنی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں انکی اصلی وجہ تحقیق و تدقیق کی عدم صلاحیت اور بحث کے تمام پہلوؤں سے ناواقفیت ہوتی ہے۔ اگر معترضین کے خیالات کا علمی اصول پر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حسب ذیل امور کی بنا پر اُنھوں نے اُردو و فارسی شاعری کے معشوق کو غلطی سے مرد سمجھ لیا ہے۔

(۱) فارسی و اُردو شاعری اور خصوصاً غزلیات میں معشوق کے لئے مذکر افعال و صفات استعمال کئے جاتے ہیں اگرچہ فارسی زبان میں افعال کی تذکیر و تانیث کا کوئی امتیاز نہیں ہے تاہم دوسرے شواہد معشوق کے مذکر ہونے پر دلالت کرتے ہیں

(۲) معشوق کے ناز و انداز کی تشبیہیں بالعموم آلات حرب سے دی جاتی ہیں۔ معترضوں نے سمجھ لیا کہ معشوق حقیقتاً انہیں آلات و اوزار سے مسلح بھی ہوتا ہوگا اس لئے ضرور وہ کوئی مرد سپاہی یا سپاہی زادہ ہوگا۔

(۳) معشوق کے اعلیٰ اوصاف میں تیر اندازی، نیزہ بازی، شمشیر زنی، خنجر آزمائی، شہسواری وغیرہ داخل ہیں جو مذاق کے لحاظ سے شانِ محبوبی و دلربائی کے منافی ہیں۔ جو معشوق ان اوصاف کا حامل ہوگا وہ ضرور کوئی بیباک و سفاک نبرد آزما ہوگا۔

(۴) بعض اشعار میں تو صریحاً حسن نوخط کی تفصیل درج ہے۔ کہیں کہیں زرگر پسر، مغبچہ، طفل برہمن کے حسن و جمال کی تعریف کی گئی ہے معترضین کے خیال میں معشوق کے مذکر ہونے کا یہ سب سے زبردست دقیقہ ہے۔

یہ غلط فہمیاں تنقید نگاری کے اہم فرائض کی نگہداشت سے غفلت کا نتیجہ ہیں۔ تنقید نگار کا فرض ہے کہ کسی قوم یا کسی عہد کی ادبیات پر رائے زنی کرنے سے پیشتر اسکے ہر پہلو کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کرے۔ ادبیات کے کامل تفہیم کے لئے بیسیوں امور پر غور کرنے کی ضرورت ہے بعض لوگ کسی عہد کے لٹریچر پر حاوی ہونے کے لئے صرف اسکے مضمون موضوع، طرز اظہار و اسلوب بیان۔ رنگ و صنع اور مقصد و منشا کا مطالعہ کافی سمجھتے ہیں۔ اور اگر کسی نے انکے علاوہ اس عہد کے مختلف ادبی دبستانوں کی تشکیل۔ معیارات تنقید کی نوعیت و ماہیت۔ مذاق و پسند کے اختلافات اور عام میلانات

رنجھو بحانات کے پہلو پر بھی بحث کی تو یہ بہت بڑا تحقیقی کارنامہ خیال کیا جاتا ہے لیکن مسٹر ہڈسن اس بظاہر وسیع مطالعہ پر
ملوا می تنگ نظری کا الزام عائد کرتے ہیں کیونکہ یہ تمام سرگرمیاں ادبیات کے صرف داخلی پہلو سے تعلق رکھتی ہیں۔ انکے نزدیک
شہ یت نظری کا اقتضا ہے کہ ان تمام خارجی قوتوں پر بھی محققانہ نگاہ ڈالی جائے جو ہیئت اجتماعیہ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہر
مانہ کا لٹریچر اس عہد کی سماجی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس لئے لٹریچر پر پوری طرح حاوی ہونے کے لئے حیات معاشرہ
فرد ، تمام شعبوں سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔ حیات اجتماعیہ کا پورا علم ہمیں اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا
ل یب تک ہم اس عہد کی سیاسی تحریکات۔ اقتصادی و معاشی معاملات۔ ذہنی و اخلاقی ترقی۔ سماجی رسم و رواج۔
رو یسرے علوم و فنون کے مدارج ارتقا۔ لوگوں کے خیالات و جذبات۔ ایمان و ایقان۔ مذہبی معتقدات و توہمات۔
رہا بلند آہنگیوں اور اولوالعزمیوں۔ غرضکہ عام تہذیب و تمدن کی تمام خصوصیات کا بنظر غائر مطالعہ نہ کریں لیکن خارجی قوتوں
کیا فہرست یہیں ختم نہیں ہو جاتی کیونکہ ملک کے طبعی حالات۔ جغرافیائی خصوصیات۔ مرز بوم کے اثرات اور آب و ہوا کو بھی قومی سیرت
کی تشکیل میں بہت بڑا دخل ہے۔ یہ طبعی ماحول بھی ہمارے بالاستیعاب مطالعہ کا مستحق ہے۔ ان تمام زحمتوں اور دردسریوں
سے پہلو تہی کرنے والا سہل انگار شخص کبھی بڑا ادبی نقاد نہیں بن سکتا۔ اس لئے وہ اپنی سطحی معلومات کی بنا پر جو رائے قائم کریگا
٣ یقیناً حقیقت و واقعیت سے دور ہوا کریگی۔ اردو شاعری پر خلاف فطرت مضامین کا الزام عائد کرنے والے اسی غلطی کے مرتکب ہیں
٤ مشہور فرانسیسی نقاد مسٹر ٹین نے بنظر سہولت ان تمام قوتوں کو جنکے تحت حیات معاشرہ ترکیب پاتی ہے صرف تین
٥ عناصر میں تحویل کر کے "نسل، ماحول اور زمانہ" کا آسان ضابطہ (فامولا) پیش کیا ہے۔ اس ضابطہ کے مطابق ہر عہد کا
٦ لٹریچر صرف تین زبردست عناصر یعنی نسل ماحول اور زمانہ کی پیداوار ہوتا ہے۔ "نسل" سے مراد وہ مخصوص ذہنیت خصلت
ذہنیت اور افتاد طبیعت ہے جو کسی قوم کو اسکے آبا و اجداد سے ورثتاً منتقل ہوتی ہے۔ "ماحول" میں طبعی اور معاشرتی دونوں
قسم کے حالات گرد و پیش شامل ہیں۔ "طبعی ماحول" سے مراد ملک کی آب و ہوا۔ نباتاتی و معدنی پیداوار۔ سواد ملک و مرز بوم
٨ کے اثرات اور دوسری جغرافیائی خصوصیات ہیں۔ "معاشرتی ماحول" میں سیاسی ادارات۔ اصلاحی تحریکات۔ سماجی رسم
٩ و رواج۔ مذہبی خیالات و جذبات اور بود و باش کے طریقے شامل ہیں۔ "زمانہ" سے مراد اس مخصوص عہد کی امتیازی
خصوصیات۔ وضع قطع۔ رنگ و مذاق اور تہذیب و تمدن کے جس زینہ پر وہ قوم فائز ہے اسکی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔ کہا جاتا ہے
مسٹر ٹین کا ضابطہ نقائص سے پاک نہیں ہے کیونکہ یہاں شخصیت و انفرادیت کا ایک زبردست عنصر نظر انداز کر دیا گیا ہے
١ اسکی وجہ سے اکابر رجال کے کارناموں کی حیثیت بھی اس عہد کے لٹریچر کے معمولی نمونوں کی سی ہو جاتی ہے۔ حالانکہ اہل کمال
لکیر کے فقیر نہیں ہوتے بلکہ جدت طبع قدیم راہ کو چھوڑ کر اپنے لئے نئی راہ ڈھونڈھ نکالتی ہے۔ اعاظم رجال کی شخصیت

اگر ایک طرف اپنے زمانہ کے اثرات سے متاثر ہوتی ہے تو دوسری طرف وہ رنگ زمانہ پر اپنے نمایاں نقوش قدم بھی چھوڑ جاتی ہے۔ معمولی دل و دماغ کا مصنف صرف اپنے زمانہ کا اثر قبول کرتا ہے لیکن صاحب کمال اپنا اثر بھی زمانہ پر ڈالتا ہے۔ غرضکہ زبردست شخصیت اور زمانہ دونوں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

مشرقی حیا پروری و رسم پردہ کا اثر

لیکن جو مسئلہ اس وقت ہمارے زیر غور ہے اسکی کسی اہل کمال نے مخالفت نہیں کی یعنی معشوق کے لئے صیغۂ تذکیر کے استعمال کے خلاف کسی بڑے سے بڑے شاعر نے بھی صدائے احتجاج بلند نہ کی بلکہ ہر زمانہ کے اہل کمال نے اس قدیم روش کو برقرار رکھا۔ لہذا مسٹر ٹین کے ضابطہ کے تحت اس مسئلہ کی نہایت کامیابی کے ساتھ تحقیق کی جاسکتی ہے۔ فارسی اور اُردو شاعری نے جس ماحول و فضا میں نشو ونما پائی ہے اسکی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہوگا۔ یہاں ان تمام خارجی و داخلی قوتوں کی تحلیل و تجزیہ یا توضیح و تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ جنکے زیر اثر حیات معاشرہ تشکیل پذیر ہوئی تھی۔ ہم صرف ان محرکات و موثرات پر روشنی ڈالنا مناسب خیال کرتے ہیں جنکو مندرجہ بالا غلط فہمیوں کے ازالہ سے تعلق ہے۔ سب سے پہلا سوال جو کسی محقق کی توجہ اپنی جانب کھینچتا ہے یہ ہے کہ فارسی و اُردو غزلوں میں معشوق کے لئے مذکر افعال کے استعمال کا ایک نرالا طریقہ کیوں اختیار کیا گیا؟ اگر یہ طریقۂ استعمال و طرز بیان دنیا سے نرالا ہے تو قومی و معاشرتی زندگی میں کوئی ایسا امتیازی وصف ضرور ہوگا جو دوسری قوموں کی خصوصیات سے متغائر و مختلف ہو۔ اگر تعصب کی عینک اُتار دی جائے تو ایک ہی نظر میں معلوم ہوجائیگا کہ اس زمانہ کی قومی سیرت کی سب سے اہم صفت اعلیٰ درجہ کی حیا پروری اور معاشرتی زندگی کی امتیازی خصوصیت رسم پردہ تھی۔ یہ دو باتیں ایسی تھیں کہ انکی وجہ سے شریعت عورتوں کو منظر عام پر نہیں لاسکتے تھے۔

واضح رہے کہ ہر زمانہ کا معیار اخلاق۔ مذاق و پسند۔ اوضاع و اطوار اور امزجہ و طبائع مختلف ہوتے ہیں جسے انگریزی میں ایک لفظ "ٹائم اسپرٹ" یعنی رنگ زمانہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہزار سال قبل کے واقعات کو موجودہ دور کی عینک سے دیکھنا اور اُنھیں آج کل کے مذاق و اخلاق کے معیار پر پرکھنا تنقید نگاری کا سب سے بڑا عیب ہے لیکن "تاریخ ادبیات اُردو" کے مؤلف اپنے ذاتی مذاق کی بنا پر فرماتے ہیں کہ "ہمارے خیال میں تہذیب و متانت کے اعتبار سے بھاشا کو اُردو پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ بھاشا کا شاعر اپنے کلام میں عشق اس طرح ظاہر کرتا ہے۔ جیسے ایک عورت اپنے شوہر یا ایسے مرد کے فراق میں گریہ کرتی ہے جو اسکے جذبات کا احترام نہیں کرتا۔ برخلاف اسکے اُردو شعرا اپنا عشق کا اظہار اپنے ہی ہمجنس سے کرتے ہیں۔" بھاشا کی شاعری میں اظہار عشق کا جو طریقہ اختیار کیا گیا ہے وہ نقص

یقت واقعہ کے خلاف ہے۔کسی شایستہ قوم کی عورت اپنے عشقیہ جذبات کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتی۔صنف نازک کو
رت نے مردوں سے کہیں زیادہ شرم وحیا کا مادہ عطا کیا ہے۔جذبۂ حیا اور خوف رسوائی صنف نازک کو ہمیشہ اپنے
شقیہ احساسات کو چھپانے پر مجبور کرتا ہے۔بہرحال آج کل کی تہذیب و مذاق کا مقتضا کچھ ہو لیکن جس زمانہ اور
ں سوسائٹی میں فارسی اور اردو شاعری نے نشوونما پائی اس وقت عورت کی جانب سے کھلم کھلا اظہار عشق نہ صرف
رت نسوانی کے منافی متصور ہوتا بلکہ اس زمانہ کا معیار اخلاق اسے انتہا درجہ کی بے حیائی۔ بے عزتی۔ بے عصمتی اور
ئی خیال کرتا۔ ہمارے اسلاف کی حیا پرستی اور رسم پردہ تو اس امر کی بھی اجازت نہیں دیتی تھی کہ کوئی مرد کسی شریف
رت کا نام لے کر اسکے ساتھ عشق ومحبت کا اظہار کرے۔اس لئے قدما نے معشوق کے چہرے پر رازداری کا نقاب
ا۔اور اسے صیغۂ تذکیر کے ساتھ یاد کرنے لگے۔یہاں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ عربوں کے یہاں بھی پردہ رائج تھا لیکن
ی شاعری میں صنف نازک کے ساتھ کیوں علی الاعلان عشق ومحبت ظاہر کی جاتی ہے ؟ ۔جواب یہ ہے کہ رسم پردہ
ترویج کے بہت پہلے ایام جاہلیت ہی میں عربی شاعری معراج کمال کو پہنچ گئی تھی۔ابتدا ہی سے ان کی شاعری
مرد عورت کے ساتھ عشق ومحبت کا اظہار کرتا آرہا تھا۔جب کسی قوم کی زبان و انشا اور ادب و شاعری مستقل ہیئت
یت اختیار کر لیتی ہے تو پھر اس میں اساسی تبدیلیاں ممکن نہیں۔کوئی خوددار زبان ایسی تبدیلی جو اسکی ہیئت مستقل
منافی ہو گوارا نہیں کر سکتی بلکہ وہ اسے خودکشی کے مرادف خیال کرتی ہے اس لئے عربی شاعری میں رسم پردہ کی ترویج
جذبۂ حیا پروری کی ترقی کے بعد بھی عورت کے ساتھ اظہار عشق کا طریقہ برقرار رہا لیکن اسکا جو خوفناک نتیجہ ہونیوالا
وہ بھی برابر ظاہر ہوتا رہا۔مغربی شعرا اپنی معشوقہ کا نام لے کر نہایت آزادی وبیباکی کے ساتھ وصل واختلاط
فراق ، بوس وکنار ، معانقہ ومصافحہ اور قبضہ وگیرائی کے مضامین باندھتے ہیں اور ہر قسم کے عشقیہ معاملات وواقعات
ن کرتے ہیں۔انکا معاشرہ ان باتوں کو برا نہیں سمجھتا لیکن مشرقی معیار اخلاق انھیں گوارا نہیں کر سکتا۔عربوں
اگرچہ معشوقہ کا اصلی یا فرضی نام لے کر اظہار عشق کا طریقہ رائج چلا آرہا تھا تاہم انکی قومی غیرت وحمیت اس امر کی اجازت
دیتی تھی کہ کوئی شاعر یا عاشق انکے خاندان کی کسی عورت سے کھلم کھلا اظہار عشق کرے اور وہ خاموش بیٹھے سنا کریں
لئے بسا اوقات معشوقہ کا نام ظاہر ہو جانے سے نہ صرف معمولی جھگڑا فساد برپا ہوتا تھا بلکہ کشت وخون کی نوبت بھی
تی تھی۔اور بعض وقت تو ایسی سخت جنگ ہوتی تھی کہ خون کی ندیاں بہہ جاتی تھیں۔بالآخر عرب شعرا ان ہولناک
ج وعواقب سے بچنے کے لئے کسی مشہور معشوقہ سلف کا نام لیکر عشقیہ مضمون باندھنے لگے یا اپنی معشوقہ کو صیغۂ تذکیر کے ساتھ
رنے لگے۔یہ تمام خوفناک نتائج شعرائے ایران کے پیش نظر تھے۔علاوہ بریں قومی سیرت میں حیا پروری کی صفت پرچہ اتم

تھی۔ سماجی زندگی میں شریعت عورتیں پردہ کی سخت پابند تھیں۔ ان تمام امور نے شاعری پر اپنا اجتماعی اثر ڈالا جس طرح ئی میں شرافت نسوانی نقاب پوشی کی متقاضی تھی اسی طرح شاعری میں بھی محبوب کے چہرے پر رازداری کا نقاب ڈالا گیا۔ شوق کے ساتھ مذکر افعال وصفات استعمال کئے جانے لگے۔

علاوہ بریں تاریخ شاہد ہے کہ ایران میں شاعری کی ابتدا قصیدہ گوئی سے ہوئی وہاں بڑے بڑے جلیل القدر شعرا دربار سے وابستہ تھے اور اپنے آقائے مجازی کی مدح و ثنا میں پرزور قصیدے لکھا کرتے تھے۔ اسکے بعد سعدی علیہ الرحمہ کے زمانہ میں صوفیانہ ل گوئی کی ابتدا ہوئی جسے خواجہ حافظ شیرازی نے معراج کمال کو پہنچا دیا عشقیہ مضامین غزل گوئی کی جان ہیں اور عشق تصوف کا یہ خمیر میں داخل ہے۔ صوفیانہ شاعری کا معشوق شاہد حقیقی ہے جو اگرچہ جنسیت سے منزہ اور بالا ہے لیکن دنیا کی ہر شائستہ صیغہ تذکیر ہی سے یاد کرتی ہے۔ ایرانی شعرا نے جن اسباب کی بنا پر معشوق کو مذکر ظاہر کرنا روا سمجھا تھا انھیں صوفیانہ شاعری اور تقویت پہنچی۔ اور اسلوب بیان وطرز اظہار نے ایک مستقل ہیئت وصورت اختیار کر لی۔ جب غزل گوئی نے عشق حقیقی ق مجازی کی ترجمانی کی طرف قدم بڑھایا تو فطری طور پر اسے وہی طریقہ بیان وطرز اظہار اختیار کرنا پڑا جو صوفیانہ شاعری کے رہ ہو چکا تھا۔ غزل گوئی کی تمام خصوصیتیں اردو شاعری کو فارسی شاعری سے ورثہ میں ملیں۔ یہاں یہ امر ذہن نشین رہنا چاہئے ل چال کی زبان اور ادبی زبان میں زمین آسمان کا فرق پایا جاتا ہے۔ اردو ابتداً صرف بول چال کی زبان تھی۔ یہ زبان ل مولانا آزاد برج بھاشا سے نکلی ہو یا بقول مسٹر سکسینہ اس پراکرتی بھاشا سے جو دہلی کے اطراف میں بولی جاتی تھی لیکن اردو عری اپنے وجود کے لئے کسی پراکرتی بھاشا کی نہیں بلکہ خاص فارسی شاعری کی رہین منت ہے۔ یہ ایک علیحدہ بحث ہے کہ اردو ری کے بجائے فارسی شاعری کے نقش قدم پر کیوں چلی۔ چونکہ یہ مسئلہ ایک الگ طویل مضمون کا طالب ہے جسکا یہ موقعہ نہ ہے لہٰذا ہم یہاں صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ اردو شاعری فارسی شاعری کی نقالی نہیں ہے جیسا کہ بعض وں کا خیال ہے بلکہ وہ اسی کی ایک شاخ یا اولاد یا وجود ظلی ہے۔ دیسی زبانیں خود مسلمان حکمرانوں کے دامن حمایت پروردہ ہیں۔ ان میں اس وقت کسی اعلیٰ نصب العین کے پیش کرنے کی صلاحیت نہ تھی۔ البتہ سنسکرت زبان کا دامن علمی جواہر پاروں سے مالامال تھا لیکن مدت سے یہ زبان مردہ و متروک ہو چکی تھی۔ مفتوحہ کم مایہ پراکرتوں کے آگے دامن کشادہ نکے خرمن ریزے حاصل کرنا اردو شاعری کی شان خودداری کے سخت منافی تھا مقتضائے زمانہ یہی تھا کہ اردو شاعری ی شاعری کے نقش قدم پر چلے۔ ابتداً جو باکمال شعرا فارسی اشعار لکھتے تھے وہی کبھی کبھی ریختہ کے بھی چند شعر کہہ لیتے ں ایک ہی دماغ سے نکلتے تھے گویا دونوں کا منبع و سرچشمہ ایک ہی تھا۔ انکا جسم وجان، روح ومادہ، خیالات وجذبات ومؤثرات ایک ہی تھے صرف انکے لباس لسانی جداگانہ تھے۔ اس لئے اردو شاعری نے دوسری خصوصیا

ے ساتھ معشوق کے لئے مذکر افعال وصفات کے استعمال کا طریقہ بھی فارسی شاعری سے بطور جائز میراث کے حا
ا وہ اسکے وہ اسباب ابھی تک باقی تھے جنکی بنا پر فارسی شعرا نے معشوق کے چہرے پر رازداری کا نقاب ڈالا تھا یعنی
بازاری کا مادہ بدرجۂ اتم موجود تھا۔ پردہ کی رسم پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گئی تھی۔ تصوف کی گرم بازاری بھی قائم تھی
ردو کے قدیم شعرا مثلاً ولی، شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون، شاہ حاتم، مرزا مظہر، خواجہ میر درد، میر تقی میر
ال وحدا رسیدہ صوفی تھے یا ذوق تصوف سے لذت آشنا تھے۔ یہ ایک مسلمہ کلیہ ہے کہ یکساں اسباب یکساں نتا
تے ہیں۔ الغرض اردو شعرا نے فارسی شاعری کے صرف تتبع میں نہیں بلکہ گرد وپیش کے حالات واسباب سے متاثر ومجبو
ک کے معشوق کے لئے مذکر افعال وصفات استعمال کئے۔

ایک قابل ذکر امر یہ بھی ہے کہ غزل کے وہی اشعار اعلیٰ درجے کے سمجھے جاتے ہیں جنکا اطلاق حقیقت اور مجاز
سکے۔ اگر کسی شعر سے صاف ظاہر ہو جائے کہ اسکا تعلق صرف صنف نازک سے ہے تو اسکا اطلاق شاہد حقیقی پر نہ ہو سک
س طرح غزل کے ایک امتیازی وصف یعنی اسکی وسعت وہمہ گیری پر حرف آئیگا۔ ماہرین فن واساتذہ سخن کا خیال ہے ک
جنسیت کا تعین شعر کی خوبی کو بڑی حد تک زائل کر دیتا ہے۔ علاوہ بریں غزل کی ایک اور اہم خصوصیت جو اسے تمام د
ن سے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ اس میں عامۃ الورود واقعات ومعاملات کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ مثنوی یا انگریزی ط
کسی خاص محبوب کے ساتھ کسی خاص شخص کے عشق ومحبت کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں شلاً "فریاد داغ" میں شا
ہ بازاری کے ساتھ اپنی محبت وشیفتگی کی داستان سنائی ہے لیکن غزل کی شان اس سے بالاتر ہے۔ یہاں جو وار
معاملات بیان کئے جاتے ہیں وہ کسی فرد واحد سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ عام طور پر تمام عاشق ومعشوق کے ساتھ پیش آتے ہیں
ت کو اپنے حال دل کے مطابق پاتا ہے۔ بعض شعرا مثلاً میر اور غالب کی شاعری کا موضوع خود انھیں کی ذات ہے۔ وہ
ن اپنے ہی واردات قلبی و ذہنی اور جذبات دلی کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن فرد واحد کی حیثیت سے نہیں بلکہ بنی نوع ان
ندہ ہونے کی حیثیت سے۔ انکے پیرایہ بیان پر عمومیت کا رنگ چڑھا ہوتا ہے۔ اور یہی انکے اشعار کی گرمی تاثیر ونش
ائے دوام کا باعث ہے جس طرح ہندی بھاشا کی یہ عجیب وغریب خصوصیت ہے کہ یہاں مرد بھی اپنے عاشقانہ جذبات کو
ان سے ادا کرتا ہے۔ اسی طرح ہر زبان کی لسانی خصوصیتیں جداگانہ ہوتی ہیں۔ چنانچہ اردو زبان کی ایک خصوصیت
یب کوئی عام حکم نافذ کیا جاتا ہے جو مرد، عورت، بچے، جوان، بوڑھے سب کے لئے ہو تو وہ صیغہ تذکیر ہی میں ادا کیا جاتا
صول کے تحت خواہ مرد کسی عورت کے ساتھ اظہار عشق کرے۔ خواہ عورت اپنے شوہر یا عاشق کے فراق میں گریہ وزا
یکن اردو کی لسانی خصوصیت اور اشعار غزل کی عامۃ الورودی اس امر کی مقتضی ہے کہ عاشق ومعشوق دونوں کے

وصفات استعمال کئے جائیں۔ اسی بنا پر اردو کی جو مشہور خواتین شاعرہ گزری ہیں وہ بھی اپنے لئے صیغۂ مذکر ہی استعمال کرتی اگرچہ غزل کے اشعار کی خوبی یہی ہے کہ ان میں معشوق کی جنسیت کا تعین نہ کیا جائے اور مضامین ایسے عام باندھے جائیں کہ اطلاق شاہد حقیقی و شاہد مجازی دونوں پر ہو سکے لیکن شعرا ہمیشہ اس بلند سطح پر قائم نہ رہ سکے۔ دور انحطاط میں اکثر شعرا محض مجازی کی ترجمانی پر چل پڑے۔ ایسے اشعار کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ اگرچہ معشوق کے لئے رسماً مذکر افعال وصفات استعمال ہوتے تھے لیکن ان میں ایسے شواہد بہ کثرت پائے جاتے ہیں جو معشوق کے جنس اناث سے ہونے کا صاف پتہ دیتے ہیں۔ چنانچہ مومن ہر جگہ اپنے محبوب کے لئے پردہ نشین کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ذوق کا معشوق روزن دیوار سے جھانکا کرتا تھا لیکن بدقسمتی سے زنبوروں نے اسی روزن میں اپنا گھر بنا لیا۔ کسی کا معشوق چلمن سے لگا بیٹھا ہے۔ نہ صاف چھپتا ہے اور نہ ... ہے۔ لکھنؤ کا تو سارا دفتر شاعری اسی لئے بدنام ہے کہ اگرچہ وہاں کے شاعروں نے بھی عام و دیرینہ اصول کی پیروی میں معشوق داری کا نقاب ڈالا لیکن یہ نقاب اس قدر باریک اور جالی دار ہے کہ اندر کی تمام زیبائشی چیزیں یہاں تک کہ مِسّی، ... چوٹی، محرم، کرتی، پازیب، جھومر، بالا، کردھنی وغیرہ بھی صاف نظر آ کر ظاہر کر دیتی ہیں کہ پس پردہ جو سیمیں تن کھڑا ہے صنف نازک کی نازنین ہے۔ ان تمام امور کی تشریح کے بعد بھی اگر کوئی شخص کہے کہ اردو شاعری میں مرد اپنے ہی ہم جنس کے ساتھ ... عشق و محبت رکھتا ہے تو یہ معترض کی محض کور چشمی متصور ہو گی۔

(باقی آئندہ)

جناب سید تنویر حسین صاحب تنویر

کیا تابع تقدیر ہے تدبیر ہماری — لکھنے میں بگڑ جاتی ہے تحریر ہماری
کیا ساتھ زمانے کے بدل جاتی ہے صورت — ملتی نہیں تصویر سے تصویر ہماری
دنیائے محبت ہے عجب آئینہ خانہ — ہر چیز نظر آتی ہے تصویر ہماری
پیغام اجل بن گیا پلٹا ہوا پیغام — یوں پھیر دی اُس نے ہمیں تحریر ہماری
تھی بار نہ جب آپ کو تمہید محبت — پھر بیچ سے کیوں کاٹ دی تقریر ہماری
طے کرتے چلے جاتے ہیں ہم منزل ہستی — کم ہوتی چلی جاتی ہے زنجیر ہماری

تنویر بگڑ جاتا ہے بن بن کے ہر اک کام
[illegible]

قاضی جی

از جناب حکیم سید محمد کاظم صاحب دہانی

ہمارے محترم حکیم صاحب کو جہاں قدرت فیاض نے ذوق سلیم اور ظریفانہ طبیعت عطا فرمائی، وہاں اُنکے مزاج میں حد درجہ انکسار و ایثار بھی ودیعت فرما دیا۔ چنانچہ یہ قابلِ قدر مضمون جو پُرانے اودھ پنچ کے رنگ میں لکھا گیا تھا اور جسے حکیم صاحب نے دوستوں کے اصرار سے "انجمن اُردو لکھنؤ" کے ایک جلسہ میں سنا کر مسلم الثبوت ادیبوں اور شاعروں کی داد تحسین حاصل کی تھی۔ آج تک پردۂ خفی میں پڑا رہا۔ ہماری خوش قسمتی سے اس مضمون کا پورا مسودہ "ادب" کے خاص نمبر کے سلسلہ میں ہمیں حاصل ہو گیا ہے ہم بعض مجبوریوں سے اسے خاص نمبر میں شایع نہ کر سکے۔ اُن ناظرین کی دلچسپی کے لئے جن کی نظر سے "حاجی بغلول" گزر چکا ہے اس مضمون کا ایک حصہ اس نمبر میں شایع کیا جا رہا ہے۔ (مدیر)

ناظرین کی مُڈ بھیڑ اس وقت جن قاضی صاحب کی غیر معمولی ہستی سے ہو رہی ہے اُن کی ولادت نہ تو بی پڑوسن کی ایک نے جچہ خانہ کی گلے بازی کی ممنون ہے نہ ڈھو لیئے بجلینوں، ڈوم میراثیوں کے ڈھول دمامے نوبت نقاروں کی منت کش۔ نہ مکارم نگر کی عبرت تذکیر تانیثوں کی بے تال بے سُرالاپوں کی رہین کرم انتہا یہ کہ بھوجی یعنی بی مہترانی بھی اپنی ڈھولکی پر ایک سوہل سے شرمندہ احسان نہ بنا سکیں۔ آپ کی اس چُپ چپاتی آمد کی بھلا اہل قصبہ کو کیا خبر ہوتی۔ جب کہ آپ کی خلقت محلہ والیوں کی نظروں تک میں ایک چھپا کے بچہ سے زیادہ نہ ٹھہری۔ مگر یہ قصہ ہے جب کا کہ قاضی جوان نہ تھا۔ ہاں جب پلے، بڑھے، نام خدا جوان جہان ہوئے تو کسی دعا کی مقبولیت، کسی عامل کی کرامت، کسی ولی کی برکت، کسی گنڈے تعویذ کے اثر سے نہیں۔ بلکہ اپنی ہی کرامات کی زور آزوری۔ اپنے ہی اعجاز کی دھینگا دھینگی سے۔ جو نہ جانے کس

ووٹ میں پا گئے تھے۔ سراپائے تقدس کو پیکر پوشی سے جامۂ انسانیت کی طرف یوں پلٹا کھلایا۔ متوسط گنگلی راس گنجک پیشانی۔ چھوٹی ٹھگنی سی بینی۔ راسو دہان، کلیجہ رخسار، سانڈ ڈوٹے بیل کی طرح بازو گردن شانے پُر گوشت، کوتاہ گردن جیسے گلا میٹھا لوٹا۔ چیاں ریز آنکھیں۔ مُنی سی پڑغل نما توند۔ ڈمبل نما ہاتھ پاؤں۔ کچے گز بھر پورا قد تناسب اعضا اس اختصار میں بھی قائم۔ باستثنائے ریش فش۔ وہ البتہ اپنی حدوں سے باہر۔ یہ مور چھل قاضی جی کے جسم کی تنصیف کرتا ہوا مختصر توند کی مروجہ جنبانی میں ادنیٰ اشارہ پر ہر دم مصروف۔

ظاہر ہے جس قدر کوئی خلقت غیر معمولی ہوتی ہے۔ اُتنا ہی اپنی جانب توجہ عالم کو بھی جذب کرتی ہے۔ اب اسے مخلوق کی نظر توجہ سمجھئے یا پھر قاضی صاحب کی خلقت عجیب ہی کو کیوں نہ سراہیئے۔ کہ اس مختصر سی ہستی کے لئے ملکوں ملکوں شہروں شہروں قصبوں قصبوں گاؤں گاؤں علمیت و عرفیت کے لئے نہ جانے کیسی کیسی دماغ سوزیاں کرنا پڑیں۔ تب جاکے مطابق معنی عرفیتیں موافق مفہوم نام ایجاد ہو سکے۔ جو ایک اچھا خاصہ اضافہ علم اللغات میں سمجھئے۔ اب کوئی استعارہ، کوئی تشبیہ اردو ہو یا فارسی، عربی ہو یا ترکی، بھاشا ہو یا ہندی۔ سنسکرت ہو یا انگریزی، دیہی ہو یا شہری۔ جو ہو۔ مگر ہو مختصر۔ وہ گویا آپ ہی کے لئے وضع ہوئی۔ اور آپ ہی اُسکے صحیح مصداق ہیں۔

مثلاً۔ ٹھانک، ٹنکوڑا، گچکینی، کٹنا، ڈِرٹا، ٹھگنیا، ٹینی، پودنہ، ٹاقی، ٹنٹنا، بیٹھو، مینج چو، ٹینگن، بَونا، چھوٹک، چھٹنکن، گینھیا، تِپّتا، ٹور، ٹِمّا، چُنچن، مُنمن، بانٹھا، ناٹا، بینٹ، پچوا، ننکو، نانک، ٹوئیں، ٹوئیاں، اُردار، گرّی، فتنۂ زمین کا اَبجرہ۔ مختصر علیٰ ہذا القیاس آپ کو اضافہ کا اختیار ہے جب کبھی آپکا ذہن سا ایسا ہی مختصر لغت بتلاش ایجاد کر سکے۔ اور اگر ان ناموں کے ساتھ قاضی کا موروثی خطاب بھی اول میں چسپ ہو سکے تو نورٌ علیٰ نور سمجھئے۔ گو بعض بدمذاق کانوں کو قاضی جی کی اپنی علمیت کے ساتھ بے جوڑ چسپیدگی فی الحال گراں بھی گزرے۔ تو بھی ناظرین کو کوئی خوف نہ کرنا چاہیئے۔ اور بالکل مطمئن رہنا چاہیئے۔ کہ مرور ایام میں ان ناموں کی رٹ اور متواتر سامعہ خراشی کانوں کو مذاق سلیم کے راہ پر لگا لیگی۔ غرضیکہ یہ تو وہ القاب و خطاب ہیں جو بظاہر ہیئت کذائی کی نمائش پر داد و ثنا کے خلوص کا نتیجہ ہیں۔ سیرت کے متعلق صرف شیخ سعدی بیچارے البتہ "ہر کہ بقامت کہتر بہ قیمت بہتر" کے مقولہ سے بلیغ اشارہ کر گئے ہیں۔ "ہائے اللہ میاں کے یہاں سے کوئی خطاب نہ ملا" نہ سہی۔ اُسی کی قدرت کا مختصر کرشمہ ہیں۔ اُسکی عطا پاشیوں سے کسے مجال انکار۔ خدائی دین نے کسے تاب انحراف کوئی مولود کوئی مخلوق

اُس کی بخششوں سے مستثنیٰ نہیں۔ جہاں کوئی چلاتنا [illegible] نوع للبقا میں افادہ و استفادہ کا خیال کرلیا گیا۔
جب نزول مولود کی علت غائی یہی ٹھہری تو کوئی نہ کوئی خ[illegible]ص عطا اُس مولود کے لئے ضروری سمجھئے تاکہ
آیندہ زندگی میں اسی کو اپنا رہبر بناکر بام ترقی کے زینہ پر قد[illegible]ستا ہوا کھٹا کھٹ چڑھتا چلا جائے چنانچہ حضرتنا
قاضی صاحب بھی یوم ورود کائنات۔ بایں ہیولا[illegible] ایک لذت شناس حسن و عشق دل بلا سوچے
سمجھے، لیکر کھٹ سے دنیا میں آہی تو گئے تھے۔ سنئے [illegible] کہ مجنوں بھی ایسا ہی دل مار لائے تھے۔
جس کی بدولت دنیائے عاشقی میں اب تک فرد ہے مجنوں کو آنجہانی ہو[illegible] کئی قرن گزرے۔ بر سول

صد سال بہ محبت لیلیٰ گزشتہ است بیدا د بر قبیلۂ مجنوں نہ کردہ [illegible]

کارونا رہا لیکن پھر بھی خدائی تلاش میں کوئی ایسا جوہر قابل نہ مل سکا کہ جسکو ایسا ہی دل [illegible]
عاشقی میں ترمیم و تنسیخ کرائی جاتی۔ تاہنوز وہی بیچارے مجنوں کی پرانی دھرانی کرم خوردہ ابجد محبت
اسی غریب قیس کے بغدادی قاعدہ عشق پر اہل دل کا مدار ہے۔ گو بعد مجنوں اُن کے خلفا آتے رہے
اور کاروبار عاشقی چلاتے رہے اُنکی گزشتہ یادگاروں میں نل دمن، شیریں فرہاد، وامق عذرا، ہیر رانجھا،
اور قبل بعثت قاضی صاحب، شاکر و سلارو نے بھی خوب خوب ہنگامہ ہائے عشق و عاشقی گرم کیے۔
اگر قاضی صاحب مبعوث تعشق نہ ہوتے تو انھیں کے چلن پر نہ جانے کب تک دنیائے عاشقی کا مدار رہتا۔ مگر
دریا کا ربند ساقی نہیں۔ تلاش ظرف تھی۔ بادہ کی کیا کمی۔ جب طینت عشق تخمیر حضرتنا قاضی صاحب کا
پتلا ڈھالا گیا تو دل درد آشنائے مجنوں و کوہکن سے جو خاک بچ رہی تھی اسی کو دل بناکر سینہ ہمہ آئینہ
قاضی صاحب میں رکھ کر بلا پس و پیش یہ مختصر سا پلندۂ عاشقی بذریعہ ایکسپریس شکم نو ماہ کی قلیل مدت میں
بسبیل استعجال عالم بالا سے زمین پر پہنچا دیا گیا۔ اللہ میاں کو اتمام و اکمال دین عاشقی منظور تھا کہ قاضی
صاحب خاتم العاشقین کرکے اُتارے گئے۔ اب سب پرانے ادیان عاشقی منسوخ ہوکر قاضی جی کا دین عشق
جاری ہوگا۔ قاضی صاحب نے زمانہ رضاعت و سن صبا میں مجنوں وار جو ہاتھ پاؤں مارے ہوں۔ دنیا اس سے
بے خبر ہے۔ البتہ اختتام شیر خوارگی و ابتدائے غلہ خوری میں قاضی صاحب نے آغوش مادر سے قدم باہر
رکھا ہی تھا۔ کہ اُسی درد آشنا دل کے کوتکوں۔ کہیں دور تو جانا ہی نہ تھا۔ اپنا ہی محلہ وادی حسن تھا،
بیدھڑک کھیل کے دھم سے جا ہی تو پڑے۔ اور لگے پونی عشق کو کدانے۔ اب مجنوں و خلفائے مجنوں شیریں
فرہاد، نل دمن، وامق عذرا، ہیر رانجھا، شاکر سلارو وغیرہ وغیرہ نے جو جو کارہائے نمایاں کئے تھے سب

گردبرد ہیں۔ دنیائے عاشقی کو مجبوراً سر ی ٹیک ہو کر سجدۂ تعظیمی ادا کرنا پڑا۔ جملہ علمبرداران محبت کو اپنے اپنے آئین کے نشر میں جن صعوبتوں زحمتوں کا سابقہ ہوا اُس کے شاہد تاریخ شاعری کے اوراق ہیں۔ قاضی صاحب بھی جادۂ عشق کے سالک ٹھہرے۔ ان کا استثنا کیونکر ہوتا۔ انھوں نے بھی جب عاشقی جھنڈا اونچا کیا اور تلقین و نشر دین عاشقی شروع ہوئی۔ یاران طریقت نے تاڑا، حریفان ناہنجار نے تاکا۔ ان کے حملہ ہائے آہنی تو تھے ہی، محلہ والوں کی روک تھام دھر پکڑ سے بھی مدتوں کشمکش رہے۔ مگر مشیت الٰہی قسمت میں ناکامی لکھی تھی۔ رقیبوں کے ہاتھوں ہنگامہ دار و گیر محشر رستخیز میں اتنا تو ضرور ہوا کہ قاضی جان بسلامت بُرد، باقی ہزیمت فاحشہ نے مایوسی کے پڑاؤ کو اصل خیر سے مع صحت و سلامتی اعضائے اندرونی و بیرونی واپس کیا۔ ہمدمی و ہمنشینی معشوق سے بہ جبر چھٹکارا پا کر گوشۂ عزلت و خلوت چندے قاضی صاحب کا آرامگاہ بنا۔ مگر پختہ مغزان جنوں ہیں۔ عالم تخیل میں بھی تجسس معشوق، پونی عشق کی وہی دھما چوکڑیاں ہیں۔ وہی اچھل کود۔ ابھی پرانے اُلجھاؤ کیا معنی گٹ بندھن عشق سے پورے طور پر چھوٹے بھی نہ تھے کہ نئے معشوق کی تلاش میں سرگرم تگاپو ہو گئے۔ جس طرح خدا کی رحمت نفس کی سرکشی یورپی سلطنتوں کی ہوس ملک گیری۔ ہندوستان کا افلاس۔ عاشق کی نیازمندیاں معشوق کی بے نیازیاں۔ کسی حد و پایاں کی پابند نہیں۔ اُسی طرح قاضی صاحب کی معشوق کی ڈھونڈھیا بھی لامتناہی ہے۔ تلاش یار کا پونی کوئی چال ہو چلے جاتا ہے۔ مگر ہمت کے ٹٹو کا تھکنا کیا معنی، پسینہ تک نہیں دیتا۔ قاضی صاحب اسی عالم میں سال بہ سال کاٹتے کیا چلے جاتے ہیں گویا ساٹھے پاٹھے ہوتے جاتے ہیں مگر خاطر وحشت تخمیر کسی پل کسی گھڑی تجسس معشوق سے غافل نہیں۔ حریفوں کی آنکھ بچا کر خلوت سے نکلے جلوت میں آ لے۔ تو پھر اسی تلاش یار کے منہ زور مضبوط ٹٹوے پر سوار بگٹٹ اُڑائے چلے جاتے ہیں۔ نئے معشوق کی تلاش میں پرانے معشوق کا غم بھی برطرف۔ اس لئے کہ قاضی صاحب ٹھہرے سمجھدار۔ جانتے ہیں کہ کبھی کبھی بڑے بڑے رشی منی پیر اولیاء اللہ وں کی ہدایت بہتوں کے لئے موصل الی المطلوب ہو سکی۔ تو قاضی صاحب کی تلقین و ہدایت عشق اگر اس معاملہ میں بے سود رہی تو کیا مضائقہ۔ قاضی صاحب اس معاملۂ خاص میں اُنھیں کی تاسی فرما رہے ہیں۔ گو یہ تاسی و صبر بہ جبر ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ تلقین عاشقی اختیاری تھی۔ جاری ہے۔ اس کی استواری، استحکام، استقلال، مضبوطی میں ذرا سا بھی بل نہیں۔ اس مقولہ کو مدنظر رکھتے ہوئے "تم نہیں اور سہی، اور نہیں اور سہی"۔ کوئی تو پھنسے گا۔ حضرت تنا کی غرض و غایت عاشقی کرتا

کہیں ہو۔کسی سے ہو۔کوئی ہو کسی کے لئے ہو۔

دنیا نے جب قاضی صاحب کی تلاش دتجسس معشوق میں یہ کاواک وسعت یہ بیڈ دل پھیلاؤ یہ بے طرح کی تگاپو دیکھی بمقتضائے بشریت کسی کو کچھ شبہ کسی کو کچھ خیال۔کوئی مظنہ بد میں مبتلا کوئی بدگمانی کا اسیر۔مگر ہمارے قاضی صاحب بایں سن وسال باقرار صحیح وصالح خود اپنی عصمت کا دعوی فرماتے ہیں اچھوتے کنوارے کا سارٹیفکیٹ زبانی نہیں عملاً بھی دینے کو تیار ہیں۔فرماتے ہیں کہ اگر کبھی موقع پاؤں گا۔ تو ایک مسجد بناؤنگا جس میں اینٹ بھی خود ہی رکھونگا۔اور جملہ حریفان عاشقی اُس میں نمازیں ادا کرینگے مسجد میں اینٹ رکھنے کے لئے صرف اتنا کافی ہے کہ عامل وظیفہ زوجیت ہو۔مگر بصیغۂ جائز۔قاضی جی کے یہاں جائز و ناجائز کا ذکر ہی کیا۔انواسے تک نہیں گئے اچھوتے کنوارے کا دُم چھلہ لگا ہوا ہے۔یونہی عمر گذر گئی۔تا آنکہ سن شریف قریب پچپن سالگی پہنچا آخر تیر مدعا نشانۂ مراد پر بیٹھ ہی گیا۔خدا خدا کر کے سعی عشق مشکور ہوئی بسعی برادراں قاضی جی کو طاق سے جفت ہونے کی ایک سال بعد آس پیدا ہوئی۔اور زمرۂ مریدان میں ایک کافر کی دست بیع ہونے کی اُمیدیں بندھیں۔

خالص اُردو

(حضرت آرزو)

یہ کس ڈھب سے آنکھ اُسکی جی پر پڑی ہے
نکلتی نہیں پھانس ایسی گڑی ہے

برابر کی ہے چھیڑ ملنا نہ ملنا
کٹھن ہے ہمارے لیے جو گھڑی ہے

ملی آنکھ ماتھے سے ٹپکا پسینا
یہ چاہت کے ساون کی پہلی جھڑی ہے

ہلائے کوئی ہونٹ کیا اس کے آگے
چھُری تانے چتون تو سر پر کھڑی ہے

نئے روپ بھرتا ہے چاہت کا مالا
رکھا ہے تو گجھا۔ اُٹھا لو لڑی ہے

جہاں اپنے ہی بس کا ہو تنکا تنکا
کہیں راج سے بڑھ کے وہ جھوپڑی ہے

یہ کس کس کو اسکی لگاوٹ نے مارا
جدھر دیکھئے ایک ہٹس پڑی ہے

سلجھ لی نہ جب تک تری جیب کی گتھی
کلیجہ میں سانس آتے جاتے اڑی ہے

اچانک تڑپ کیوں بڑھی اب میں سمجھا
الٹ کر ری ہائے مجھ پر پڑی ہے

بتادے گی بھید آرزو نیند آکر
کہ جو رات چھوٹی تھی اب کیوں بڑی ہے

زندگی یا موت

(جناب مولانا سید اختر علی صاحب تلہری)

(۱)

"نئی تعلیم نے لڑکیوں کے اخلاق بگاڑ دیئے۔ انھیں بدلحاظ بنا دیا، غضب خدا کا اپنی شادی بیاہ میں دخل دینا چاہتی ہیں، حیا و شرم کا نقاب چہرہ سے بالکل ہٹا دیا ہے۔ کیا میں نے سعیدہ کو اسی لیے تعلیم دلوائی تھی کہ وہ نہایت بیباکی سے مجھے یہ صاف صاف لکھ دے۔ "ابا جان - ہندوستانی دستور کی بنا پر میرا فرض تھا کہ اپنی شادی کے بارہ میں ہونٹ سیئے رہوں۔ آپ اور والدہ جس کے ساتھ دو بول پڑھوا دیں اُس کے ساتھ زندگی بسر کر دوں لیکن عقل اور شرع دونوں مجھے اس معاملہ میں دخل دینے کا حق دے رہے ہیں اس لیے میں نہایت ادب سے یہ عرض کرنا چاہتی ہوں کہ مجھے موجودہ نسبت پسند نہیں ہے۔ اسکا انجام بخیر نہ ہوگا۔ سعیدہ"، اخاہ، کل کی چھوکری اور مجھے معاملہ کی اونچ نیچ سمجھانے بڑی شرع والی بنتی ہے۔ دو حرف اُردو اور انگریزی کے کیا پڑھ لیئے کہ اب ہر بات میں دخل دینے لگی۔ ساجد کوئی غیر نہیں ہے۔ اپنا ہے۔ ایک خاندان ہے۔ ایک بڑی ہے۔ پڑھا لکھا ہے۔ ایک گاؤں کا زمیندار ہے۔ نہیں سعیدہ کی ضد پوری نہیں کی جا سکتی۔ اس کی شادی ساجد ہی سے ہوگی"۔ عابد سعیدہ کا رقعہ پڑھ کر نہایت ہی برافروختہ ہو رہے تھے کہ اتنے میں اُن کی بیوی ناظرہ کسی کام سے کمرہ میں آ گئیں۔ عابد اُن کی صورت دیکھتے ہی بولے "صاحب ذرا اپنی صاحبزادی کا نیا کارنامہ ملاحظہ فرمایئے آپ نے میری جیب میں ایک رقعہ ڈالا ہے جسمیں ارشاد ہوتا ہے کہ مجھے موجودہ نسبت پسند نہیں ہے"۔ یہ کہکر پورا رقعہ پڑھ کے سنا دیا۔ ناظرہ اُسے سنتے ہی سناٹے میں آ گئی۔ اور پھر تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد بولی "یہ چودھویں صدی ہے جو نہ ہو وہ تھوڑا ہے

میں ہمیشہ منع کرتی رہی لیکن تم نہ مانے۔ اور لڑکی کو اسکول میں پڑھوا دیا۔ میں تو کہتی تھی کہ لڑکیوں کیلئے سوا پڑھنا لکھنا زہر ہے۔ میں کہا کرتی تھی کہ گھر پر کسی ملانی سے قرآن پڑھوا دو اور دو تین اُردو میں دینیات کی کتابیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ گھر گرستنوں کیلیے اتنا پڑھنا کافی ہے۔ میں نے نہیں پڑھا تو گھر کا کون سا کام بند ہو گیا؟"

عابد چیں بجبیں ہو کر بولے "یہ موقع وعظ و نصیحت کی کتاب کھولنے کا نہیں ہے یہ بتلاؤ کہ اس کا علاج کیا کیا جائے؟" ناظرہ جھٹک کر بولیں "علاج ولاج کیا۔ سعیدہ بجتی ہی بجنے دو۔ ایسی چھوکریوں کی باتیں سُنیں تو سننے ہی کے ہو جائیں۔ نسبت پکی پوڑھی ہو چکی۔ سعیدہ ساجد ہی سے بیاہی جائے گی"

(۲)

سعیدہ کو باپ کی جیب میں رقعہ ڈالے ہوئے تین دن ہو گئے۔ اگرچہ اس سے اس مسئلہ بیاہ کے متعلق کوئی باز پرس نہیں کی گئی ہے لیکن سارے گھر کی نگاہیں بدلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ ماں آنکھوں ہی آنکھوں میں کھائے جا رہی ہے، باپ کی نگاہیں ہر وقت قہر کی بجلیاں گراتی معلوم دیتی ہیں۔ بڑا بھائی ماجد اُسے جب دیکھتا ہے تو خون بھری نظروں سے۔ گھر کے اس بدلے ہوئے ماحول میں اُسے اپنی تباہیوں اور بربادیوں کا نقشہ صاف دکھائی دے رہا تھا وہ اپنے کمرے میں تنہا پڑی ہوئی اپنی قسمت کو روتی اور اپنے انجام پر غور کیا کرتی "یا اللہ میں بھی کتنی بدنصیب ہوں۔ ماں باپ کی مہربانیاں برہمیوں کی شکل اختیار کر رہی ہیں۔ میرا آخر قصور کیا ہے؟ یہی نا کہ میں نے اپنی شادی کے متعلق ابا جان کو صاف صاف لکھدیا۔ یہ کوئی میں نے شرع کے خلاف بات نہیں کی عقل کا قانون نہیں توڑا۔ بس اتنی ہی بات تو کہ ہندوستانی رسم و رواج کی خلاف ورزی کی مگر یہ تو کوئی گناہ نہیں۔ نباہ تو مجھے کرنا ہو گا اصلی سابقہ تو مجھ سے پڑیگا۔ ایسی صورت میں یہ کون سا انصاف ہے کہ اگر میں اپنا خیال کسی طریقہ سے ظاہر کر دوں تو ماں باپ کی شفقتیں مجھ سے منہ پھیر لیں؟ میری قسمت کا فیصلہ ہو اور میری ہی آواز پر بندشیں؟ ساجد میرا چچا زاد بھائی ہے لیکن غیر تربیت یافتہ ہے اس کا مزاج میرے مزاج سے

بالکل الگ ہے۔ بات بات میں تو اس کی زبان پر گالی آتی ہے" وہ میرا شوہر ہرگز نہیں بن سکتا۔ مجھے پڑھنے لکھنے کا شوق ہے میں صرف ایسے شخص سے شادی کر سکتی ہوں جو اس شوق کی اور ہمت افزائی کر سکے۔ آخر ظہیر کا بھی تو پیام آیا تھا۔ میں اس نسبت سے بالکل خوش تھی۔ ابا جان نے اُسے کیوں مسترد کر دیا۔ اس میں کوئی قباحت نہ تھی مگر اماں جان اور ابا جان تو مجھے ساجد ہی کے حوالے کر دینے پر آمادہ ہیں۔ انکی رائے کیونکر بدلوں؟ تو کیا پھر میں اُن کی بات مان لوں۔ اپنی قربانی گوارا کرلوں؟ مگر نہیں میں ساجد سے ہرگز نکاح نہیں کرسکتی لیکن والدین اگر یوں ہی ضد پر اڑے رہے تو میرے لیئے چارۂ کار ہی کیا ہوگا؟ ہندوستان کی مجبور و بیکس لڑکی کر ہی کیا سکتی ہے۔ خودکشی مگر یہ تو حرام موت ہے۔"

(۳)

سعیدہ کا دماغ انھیں افکار میں ہر وقت غلطاں پیچاں رہتا ہے بھوک قریب قریب ختم ہوچکی ہے۔ چہرہ کا گلابی رنگ زردی میں تبدیل ہوگیا ہے۔ آنکھوں کے اردگرد حلقے پڑگئے ہیں۔ اخیر بچپنے اور شروع جوانی کے درمیانی زمانہ کی شوخیاں رخصت ہوگئی ہیں۔ نگاہوں سے ہر وقت مایوسی ٹپکا کرتی ہے مگر اُس کے والدین کو اس تغیر کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ وہ نہایت اطمینان سے اپنے اُس مقدس حق کے جلد سے جلد برت لینے کی تیاریوں میں ہیں جو انھیں ہندوستانی معاشرت نے سعیدہ کے متعلق بغیر کسی پابندی یا قید کے عطا کر دیا ہے۔ اُن کی تمام کوششوں کا مرکز یہی امر بنا ہوا ہے کہ جسقدر عجلت کے ساتھ ہوسکے۔ سعیدہ کو ساجد کے گھر میں باندھ دیا جائے۔ آخرکار سعیدہ کی فرخنت یعنی عقد کا دن تاریخ مقرر ہوگیا۔ دونوں میاں بیوی کامیابی کی اس نصف منزل کے طے کرنے پر اطمینان کی سانسیں لے ہی رہے تھے کہ عابد کو اپنی جیب میں سعیدہ کا لکھا ہوا دوسرا رقعہ ملا۔ "ابا جان۔ رحم رحم۔ اپنی سعیدہ کی قسمت نہ پھوڑیئے یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ میں یہ نسبت کسی طرح منظور نہیں کرسکتی"۔ یہ رقعہ پڑھکر عابد کی برافروختگی جنون میں تبدیل ہوگئی۔ قصاب کی چھری کے نیچے گائے کو بار بار تڑپنے کا

آخر کیا حق ہے۔ صیاد اگر کسی چڑیا کو ایک قفس سے دوسرے قفس میں منتقل کر رہا ہے تو اس کے پھڑپھڑانے کے معنی کیا ہیں؟ وہ مُنہ میں کف بھرے ہوئے آنکھیں لال لال انگارا بنائے ہوئے اندر آئے اور اپنی بیوی ناظرہ سے مخاطب ہو کر بولے "سعیدہ کی بیباکی اور بدلحاظی حد سے زیادہ بڑھ گئی ہے اُسے خاندانی شرافت کا ذرّہ برابر پاس نہیں ہے اُس نے پھر اسی قسم کا بیہودہ رقعہ جیب میں ڈالا ہے۔ خدا اسے موت دے۔ اُسے دنیا سے اُٹھائے دیکھوں وہ بھی کتنی ضدن ہے۔ ہڈیاں پسلیاں توڑ کر رکھ دوں گا زندہ درگور اسے دفن کر دونگا۔ ذرا ہاتھ تو آئے "سعیدہ اپنے کمرہ میں سے باپ کی یہ گرج سُن رہی ہے اور گرز رہی ہے مگر ناظرہ نے جب عابد کے تیور بدلے ہوئے دیکھے اور اُن کی برافروختگی حد سے زیادہ پائی تو آہستہ آہستہ اُن کا غصہ دھیما کرنا شروع کیا معاملہ کی اونچ نیچ سمجھائی کہ "اس صورت میں بدنامی اور زیادہ ہو گی ناک پورے طور سے کٹ جائے گی۔ اگر اس نے تمھارے سامنے بھی گستاخی سے بات چیت کی تو نتیجہ کیا ہوگا، میں سب معاملہ ٹھیک کر لوں گی" "تم اس سجیا لڑکی کو منہ نہ لگاؤ۔ اسیر ہاتھ نہ چھوڑد چند دنوں کی بات اور ہے۔ شادی کے بعد یہ بلا ہمارے سر سے ٹل جائے گی"

(۴)

اب برات میں تین ہی دن باقی رہ گئے ہیں۔ گھر میں عروسی کی ہر طرف چہل پہل نظر آ رہی ہے۔ سعیدہ اپنی خالہ زاد بہن صابرہ کے ذریعہ سے والدین کو یہ بار بار جتلاتی رہی کہ اس نسبت کا انجام بُرا ہو گا وہ اپنے اس سودے پر چپ چپاتے راضی نہیں ہو جائے گی۔ اس کے ہاتھ پاؤں ہندوستانی معاشرت کی رسیوں میں اگرچہ پورے طور سے جکڑے ہوئے ہیں لیکن وہ چھری کے نیچے پوری قوت سے تڑپے گی اور اپنے خون کی چھینٹوں سے ذبح کرنے والوں کے کپڑوں پر بھی دھبے ڈال دے گی۔ مگر سعیدہ کے ان احتجاجات سے والدین کی ضدیں اور بڑھتی جا رہی تھیں وہ یہ چھری سعیدہ کے گلے سے ہٹانے کے لئے کسی طور سے تیار نہیں ہوئے اُن کے خیال میں ساجد سے سعیدہ کا بیاہا جانا اب اور بھی ضروری ہو گیا تھا۔ ناظرہ تو خیر سے بالکل

جاہل تھی۔ عابد پڑھے لکھے تھے مگر ہندوستانی شرافت کے تخیل کے بُری طرح سے شکار۔ وہ اسکی بھینٹ قربانگاہ پر مذہب عقل اور لڑکی کی محبت غرضکہ سب چیزوں کو بھینٹ چڑھا چکے تھے۔

سعیدہ جب پورے طور سے ناامید ہو چکی اور اُس بلا سے اُسے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو اُس نے عالم مایوسی میں والدین کے اس ظالمانہ فیصلہ کی مخالفت کو بغاوت کی حد تک پہنچانے کا ارادہ کر لیا اور اس کیفیت میں اُس نے حاکم ضلع کو اپنی موجودہ مصیبتوں کی اطلاع دیتے ہوئے اُسکی اعانت چاہی۔

(۵)

شام کو بارات آنے والی ہے۔ عابد کے گھر میں اس جشن عروسی کے منانے کی پوری تیاریاں ہو چکی ہیں۔ اندر باہر مہمانوں کا مجمع ہے۔ سعیدہ کو مار مار کے دلھن بنا دیا گیا ہے۔ اب صرف یہی باقی ہے کہ دولھا والے آئیں، دو بول پڑھے جائیں اور اس بدنصیب لڑکی کو اپنے گھر بیاہ کر لیجائیں کہ اتنے میں حاکم ضلع کے مقرر کردہ ایک مسلمان ڈپٹی صاحب عابد کے مکان پر وارد ہوتے ہیں اور انھیں سعیدہ کی عرضی دکھلا کر اصل معاملہ کے متعلق استفسار کرتے ہیں۔ اب عابد کے غصّہ کی کوئی حد نہ تھی اُس کی شرافت کا شیشہ سعیدہ نے اپنی بیحیائی کے پتھر سے چکنا چور کر دیا تھا۔ اگر اُس وقت وہ سامنے آجاتی تو وہ اسکی بوٹی بوٹی اڑا دیتا۔ لیکن اب وہ کیا کر سکتا تھا۔ معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

ڈپٹی صاحب ایک روشن خیال انسان تھے۔ وہ اس ہندوستانی شرافت کی دیوی کے پجاری نہ تھے۔ انھیں ہندوستان کی مسلمان لڑکیوں سے ان معاملات میں ہمدردی تھی۔ اُن کی نگاہوں میں سعیدہ کوئی بڑی مجرم نہ تھی وہ چاہتے تھے کہ اس غریب کو ظلم سے بچا لیا جائے مگر اُن کی یہ بھی خواہش تھی کہ معاملات طول نہ کھینچیں۔ ایک شریف خاندان کی زیادہ رسوائی نہو۔ انھوں نے اس کی کوشش کی کہ عابد اپنے طرز عمل کی غلطی سمجھ لیں اور اس ظلم سے دستکش ہو جائیں۔ انھوں نے صاف صاف کہا کہ یہ غیر اسلامی قدامت پسندی نہایت خطرناک ہے۔ انھیں اس معاملہ میں سعیدہ کی خوشی کا پورا لحاظ کرنا چاہیے سعیدہ کی روش اس معاملہ میں بظاہر کتنی ہی غیر پسندیدہ نظر آتی ہو لیکن آپ حضرات کی ضدیں دیکھتے ہوئے

وہ اس میں بڑی حد تک معذور رہے" عابد ڈپٹی صاحب کی اس فہمائش سے ذرا بھی متأثر نہ ہوئے وہ سعیدہ کو اب بھی قابل گردن زدنی ہی سمجھ رہے تھے اُنکی وکالت سے اُن کے زخم کی اور نمک پاشی ہو رہی تھی۔ لیکن کرتے کیا چپکے سُنا کیے۔ اب اس سودے کے انجام تک پہنچنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی تھی۔ شادی کا وہ سارا کارخانہ درہم برہم ہو گیا تھا۔ دولھا والے اب خود ہی اس نسبت کے لیے تیار نہ تھے

عابد کے خاندانی غرور کو اس واقعہ سے سخت صدمہ پہنچا تھا انھیں یہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان کی شرافت کا دامن سعیدہ نے بالکل چاک چاک کر دیا۔ اس کی آبرو خاک میں ملادی۔ مگر حالات نے کچھ ایسی کروٹ بدلی تھی کہ وہ سعیدہ کو اس کی سزا نہیں دے سکتے تھے۔ ڈپٹی صاحب کو عابد کے تیور اچھے نظر نہیں آئے۔ انھوں نے دوسرے عزیز کی نگرانی میں سعیدہ کو دیدیا۔

(۶)

سوء اتفاق سے ڈپٹی صاحب کا ایک سال کے بعد اس مقام سے تبادلہ ہو گیا اور لڑکی کو پھر ناظرہ اور عابد کے پاس آنا پڑا۔ ان لوگوں کے یا تو انتقامی جذبات ابھی ہلکے نہیں پڑے تھے۔ یا وہ شادی کے معاملہ میں سعیدہ کی رائے ماننا ہی گناہ سمجھتے تھے۔ پہلی نسبت ختم ہی ہو چکی تھی لیکن جوش انتقام۔ ضد اور کنواری بیٹی کے گھر میں نہ بٹھائے رکھنے کے خیال نے عابد کو دوسری نسبتوں کی جستجو پر آمادہ کیا۔ ہمارے ہندوستانی شرفا کی سوسائٹی میں کسی لڑکی کا اپنی شادی کے متعلق رائے دینا بھی اتنا بُرا ہے جتنا کہ کسی بُرے فعل کا واقعی مرتکب ہونا اور پھر سعیدہ کا قصور تو اس سے زیادہ تھا اُسنے والدین کی مخالفت کی تھی اور دھڑنّے سے۔ اب وہ اس قابل کہاں رہی تھی کہ برادری میں قبول کی جا سکتی۔ وہ خوبصورت سہی۔ پڑھی لکھی سہی۔ شائستہ سہی لیکن لوگوں کے خیال میں آبرو باختہ تھی دریدہ دہن تھی۔ اُس کی آنکھوں کا پانی گر چکا تھا۔ اب اسکی ہم پلہ خاندانوں میں کیا سمائی ہو سکتی تھی۔ جس سے ذکر آتا وہ منہ بنا لیتا یعنی صاحب ہمیں ایسی بہو کی ضرورت نہیں۔ ادھر عابد کی ضد ہر انکار پر پھر آ کامیابی کے ساتھ

بڑھتی جاتی تھی۔

(۷)

ایک دن میاں بیوی نے آپس میں بیٹھ کر بہت دیر تک سرگوشیاں کیں۔ بیوی کچھ اختلاف بھی کرتی رہیں مگر میاں کے کڑوے تیوروں نے انھیں چُپ کردیا۔ سعیدہ کے بڑے بھائی بُلائے گئے اُنھیں آہستہ آہستہ مگر تفصیلی احکام دیے گئے اور وہ سعیدہ کو لیکے ایک گاؤں پر جہاں کچھ قرابتدار رہتے تھے چلے گئے۔ چلتے وقت سعیدہ نے جبت پوچھنے کی ہمت کی "بھائی جان۔ کہاں لیے جا رہے ہو" تو اُنھوں نے اس زور سے تھپّڑ مارا کہ اُس کے گلاب سے رُخساروں پر انگلیوں کے نشان بن گئے۔ اور وہ روتی، سسکتی، ہچکیاں بھرتی ہوئی یکہ میں بند کردی گئی اور روانہ کردی گئی۔

دوسرے دن شام کے وقت عابد نے مکان کا باہری حصہ صاف کرایا۔ کمرے میں سفید فرش بچھایا۔ قالین تکیے لگوائیے۔ اور باورچی خانہ میں تیس آدمیوں کے کھانے کا انتظام کیا۔ کوئی نو بجے شب کے قریب تانگوں اور یکوں پر کچھ لوگ آئے جن میں سے ایک صاحب چیچک رو، سیاہ رنگ، دوہرے جسم کے۔ تیمور لنگ، مرغ زرین بنے ہوئے تھے۔ یہ عابد کے ماتحت چپراسیوں میں کام کرتے تھے، اور آج اُن کی دامادی کی عزت سے سرفراز ہونے والے تھے۔ وہ اپنی ایک ٹانگ پر جتنا بھی اتراتے کم تھا۔ معزز خاندان کی اور اتنی پڑھی لکھی۔ جیندے آفتاب۔ جیندے ماہتاب لڑکی بھلا ہر شخص کو ملتی ہے۔ بلی کے نصیبوں چھینکا ٹوٹا تھا سعیدہ نے ہندوستانی شرافت کا دامن چاک کیا تھا۔ باپ نے اُس چاک کو اِس "رشتہ" سے سیناطے کیا۔ اب کس کی مجال تھی کہ چون و چرا کرتا۔

عابد نے بآواز بلند بسم اللہ کرنے کو کہا اور انھوں نے دلی کی اجازت پاتے ہی اپنے فرض کو ادا کرکے سبکدوشی حاصل کرلی۔ جوش انتقام کے اور ہندوستانی شرافت کے ملے جُلے جذبات نے گلاب کی کلی کو گھورے میں پھینکدیا۔ عطر عروس

سُوئی کے بدن میں مل دیا گیا!

(۸)

غریب بے بس سعیدہ نہ ان اسرار سے واقف اور نہ اپنی اس نئی قید سے۔ وہ تو دیہات کے ایک کچے مکان میں بند تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے بھائی گالیاں دیتا مارتا بھوکا رکھتا اور لعن وطعن کرتا۔ وہ سب کچھ سہتی اور برداشت کرتی۔ البتہ تنہا بیٹھ کر اپنی حالت پر چار آنسو بہا لیتی۔ ایک روز بھائی کے ہاتھ میں ایک خط دیکھ کے ڈرتے ڈرتے بولی گھر سے خط آیا ہے کیا لکھا ہے؟ اُس نے بالکل قصائیوں کی طرح ہنس کے کہا۔ تیری شادی کی خوشخبری ہے۔ اور جب سعیدہ یہ سنتے ہی سر پکڑ کے بیٹھ گئی تو اس نے لیٹے ہی لیٹے ایک لات مار کر کہا "باجی۔ ننگ خاندان تیرا آخر عقد ہو ہی گیا۔ ساجد کے ساتھ نہ کرے گی بہت اچھا۔ تیرا منہ تھا کہ تو ساجد سے بیاہی جاتی۔ بس تو اسی جاہل لنگڑے کے قابل تھی۔ جس سے تو بیاہی گئی۔ آج وہ آبھی رہا ہے۔ دیکھوں اب تو کیا کرتی ہے!" سعیدہ کو ایسا معلوم ہوا جیسے کسی نے ایک بہت ہی بلند پہاڑ کی چوٹی سے اُسے نیچے پھینک دیا ہو۔ اس نے بے بسی سے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔ دو تین بار جھومی اور وہیں زمین پر بیہوش ہو کر گر پڑی۔ جب ہوش آیا تو شام ہو چکی تھی۔ گھر میں اندھیرا تھا۔ اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں زمین پر پڑے رہنے سے جسم میں درد محسوس ہو رہا تھا۔ کراہ کے اُٹھی تو چکر سا آیا۔ مگر دیوار کے سہارے اُٹھ کے کھڑی ہو گئی۔ آنکھیں تاریکی کی عادی ہو چکی تھیں سامنے پلنگ دکھائی دیا اُس پر بھائی کا بستر بچھا تھا۔ حافظہ نے ساری باتیں یاد دلا دیں بھائی کے ہاتھ میں خط۔ بھائی کی لات۔ بھائی کی ہنسی اور شادی کی خوشخبری۔ کانپنے لگی منہ سے گھبراہٹ میں بار بار یہی آواز نکلتی تھی "یا اللہ میں کیا کروں۔ یا اللہ میں اب کیا کروں؟" اور اسی کے ساتھ وہ گھبرائی ہوئی جلدی جلدی صحن میں چلنے لگی۔ اس تنگ و دو میں دروازہ کے قریب گئی دیکھا تو کواڑ یونہی بھڑے پڑے تھے۔ بھائی آج پہلی دفعہ دروازہ بند کر کے جانا بھول گیا تھا۔ کواڑ کھولے۔ گلی میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی نہ دکھائی دیا۔ جلدی سے گھر سے نکل کے ایک طرف بالکل اسی طرح بھاگی جس طرح کوئی پر شکستہ طائر قفس سے نکل کے

بھاگتا ہے"، اُس نے جلدی جلدی دیہات کی گلیاں طے کیں۔ اتفاق سے کوئی نہیں ملا اب کھیتوں میں پہنچی۔ وہاں تاریکی اُس کے دل کی طرح آہستہ آہستہ سبزہ و باغ پر قبضہ کرتی جاتی تھی۔ وہ عورت جو گھر سے کبھی نہ نکلی ہو اُس کے لیے یہ سماں حد درجہ بھیانک ہوتا ہے۔ ذرا ٹھٹکی۔ دم بھی بھول گیا تھا۔ اُسے بھی درست کیا۔ پھر آگے بڑھی مڑ مڑ کے پیچھے بھی دیکھتی جاتی تھی۔ ڈر تھا کہیں بھائی تعاقب میں نہ آتا ہو۔ سامنے ارہر کا کھیت تھا اُس کی تاریکی میں اُس کی پتیوں کی ہلکی کھڑکھڑاہٹ بالکل سانپ کی چال سے مشابہ تھی ڈری۔ سہمی لیکن بھائی کا ڈر اُس پر غالب آ گیا جھپٹ کے آگے بڑھی۔ جیسے ہی چند قدم چلی ہو گی کہ سامنے سے دو مرد ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آتے دکھائی دیئے۔ ٹھٹھر کے کھڑی ہو گئی وہ دونوں قریب آ گئے۔ ایک کا انداز بھائی کا سا تھا اور دوسرا کوئی اجنبی تھا مگر لمبا تڑنگا۔ سعیدہ کے مُنہ سے بیساختہ چیخ نکلی اور وہ مُڑ کے بدحواس بھاگی۔ ان دونوں مردوں نے تعاقب کیا اور چند ہی منٹ میں اُسکی نازک کلائیاں اُسکے بھائی کے مضبوط ہاتھوں میں تھیں۔ اور پھر وہی کنج قفس ہے اور وہی دل شکستہ و ملول سعیدہ!

نوٹ۔ دکن کے مشہور مزاحیہ نگار جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب نے حال میں "عشق کی گولیاں" ایک ناتمام مزاحیہ فسانہ لکھا تھا اور ملک کے دوسرے مزاحیہ نگاروں کو اسکی تکمیل کی دعوت دی تھی وہ ایک خیالی چیز تھی۔ دوسروں کے خیالات اُسے ایک حد تک پہنچا سکتے ہیں راقم الحروف نے حقیقت نگاری کی ہے۔ افسانۂ بالا تخیل کا بالکل ممنون نہیں ہے وہ دوسرے افسانہ نگاروں کو اسکی ضرور دعوت دیتا کہ اسے مکمل کر دیا جائے لیکن تخیل سے حقیقت کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اسکی تکمیل قدرت کے ہاتھ میں ہے۔

سعیدہ اس زبردستی کے بنائے ہوئے شوہر کی گود میں واقعتہً دیدی گئی یا ابھی نہیں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یہ ٹریجڈی ابھی کوئی اور کروٹ لیگی یا نہیں "میری پیشینگوئی کی حدود سے بہت آگے ہے۔ البتہ یہ میری دعا ضرور ہے کہ خدا کرے سعیدہ اور اُس کی تمام ہندوستانی بہنیں اس طرح کے مظالم سے جلد سے جلد محفوظ ہو جائیں اور ایسی غیر اسلامی زندگی بسر کرنے کے لیے مجبور نہ کی جائیں جو موت سے بدتر ہے!

(جملہ حقوق نقل و اشاعت محفوظ ہے)

دوستداران بشر

اگنس جونس

(از محترمہ سیدہ ساجدہ بیگم)

اس سے قبل اس نوع خواہ خاتون کے حالات ہدیۂ ناظرین و ناظرات کیے جا چکے ہیں جسنے مریضوں کی تیمارداری کا بار اپنے ذمہ لیکر انسان کی دوستی کا ثبوت دیا ہے۔ چونکہ اس قسم کا کام درحقیقت عورتوں سے مختص ہے۔ اور متعدد خواتین اسمیں فداکاریاں دکھلا کر اپنا ذکر جمیل دنیا میں چھوڑ گئی ہیں۔ لہٰذا اگر ایسی ہی ایک اور خاتون کا حال لکھا جائے تو غالباً نامناسب نہ ہوگا۔

جو شخص ذرا بھی غور و تامل سے کام لیگا وہ بخوبی سمجھ جائیگا کہ اس کام (پرستاریٔ مرضا) کی زحمتیں اور اُسکے مخاطرے اس درجہ بڑھے ہوئے ہیں کہ جن خواتین نے ایسے کارہائے بزرگ انجام دیے ہیں اور عالم انسانیت کے ساتھ شایاں خدمتیں کی ہیں وہ کمال تحسین و تمجید کی مستحق ہیں۔ مناسب تو یہ ہے کہ جملہ ممالک کے مردان خواتین کے حالات سے عبرت حاصل کریں اور اپنے وجود کو جو تمام اقسام کی ترقیات عالیہ کے قابل اور جملہ انواع کے عملیات نافعہ کے لائق ہے معطل نہ رکھیں۔ بلکہ کم از کم وہ کام کر دکھائیں جو دوسری اقوام کی عورتوں کے لیے باعث تقلید ہو۔ واقعاً اگر متمدن قوموں کی عورتیں جنمیں افراد نوع دوست بکثرت ہیں اور جنکے اعمال نافعہ تحریر و تقریر سے باہر ہیں صرف اس درجہ فداکاری کرکے انسان دوستی کی راہ میں قدم زن ہوتی ہیں تو اور اقوام کا کیا ذکر کیا جائے جنمیں ایسے نفوس یا تو اتنے کم ہیں کہ انگلیوں پر شمار کر لیے جائیں یا بالکل ہی معدوم ہیں۔

بہرحال اگنس جونس انگلستان کے مشہور شہر کیمبرج میں ۱۰ نومبر ۱۸۳۲ء مطابق ۱۶ جمادی الثانیہ ۱۲۴۸ھ کو پیدا ہوئیں اُن کے والد کرنل جونس انگلستان کے نامور فوجی امرا میں شمار ہوتے تھے۔ جب اگنس دس سال کی ہوئیں تو اُس فوج کو جسمیں اُنکے والد تھے موریس جانے کا حکم ملا جو بحر ہند میں ایک خوبصورت جزیرہ ہے۔ مشار الیہا

گیارہ سال کی عمر تک وہاں مقیم رہیں۔ اُن آفات و صدمات سے متاثر ہو کر جن کا سامنا مڈاگاسکر کے عیسائیوں کو رہا تھا۔ اگنس کو یہ خیال ہوا کہ وہ اپنی عمر دعوت و تبلیغ کے کاموں میں صرف کر دیں۔ اُن کے والدین مورسیس سے انگلستان واپس آنے کے بعد چار سال تک آئرلینڈ میں جا کر رہے۔ مشارالیہا اس مدتِ قیام آئرلینڈ میں اکثر صاف و شفاف پانی والے دریاؤں کے کنارے یا خوشنما سبزہ زاروں میں سیر کیا کرتی تھیں۔ جب اُن کی عمر کا سولھواں سال شروع ہوا تو انگلستان کے مدرسہ میں بھیج دی گئیں۔ اور اپنے والد کی وفات کے زمانہ تک جو ۱۸۵۰ء میں واقع ہوئی اس مدرسہ میں رہیں۔ اگرچہ تحصیل علوم میں انھوں نے جلد ترقی نہ کی لیکن پھر بھی اس توجہ کے ساتھ محنت کی کہ اس ساری تاخیر و سستی کی تلافی ہو گئی۔ اُن کے والد کے انتقال کے بعد اُنکی ماں محض اپنے لڑکوں کی تکمیل تعلیم کی غرض سے ڈبلن آئیں جہاں اگنس کو ایک بڑے مبلغ کے جلسہ وعظ میں شرکت کا موقع ملا جس کے مواعظ و نصائح سے بخوبی مستفیض ہوئیں۔ اسکے کچھ ہی عرصہ بعد ایک ایسی درسگاہ میں جہاں مفت تعلیم دیجاتی تھی اور جو فقراء کے بچوں کے لیے مخصوص تھیں معلمہ ہو گئیں۔ انھیں اپنے اِن بینوا شاگردوں کے حال پر خاص توجہ رہا کرتی تھی۔ وہ اُن کے ذہنوں کو روشن بنانے اور اُن کے نفوس کو پاکیزہ کرنے کے ساتھ ہی ساتھ انھیں ورزش اور کثرت میں بھی مشغول رکھا کرتی تھیں۔ حتیٰ کہ تعطیل کے زمانہ میں بھی انھیں فقراء و ضعفاء کے درمیان رہ کر اُن کی اعانت و دستگیری کیا کرتی تھیں۔ لیکن سب سے پہلا قدم جو انھوں نے اپنی زندگی کے بزرگترین کام میں رکھا اُن کا وہ سفر فرانس تھا جو ۱۸۵۳ء میں انھوں نے کیا تھا۔ وہاں اس مجلس میں شرکت کر کے جو کیسرورت کے ادارۂ خیریہ کے ایک شعبہ نے منعقد کی تھی اُن معلومات سے بہت ہی متاثر ہوئیں جو اس ادارہ کے ترتیبات کے بارہ میں انھیں بہم پہونچی تھیں اور دو ماہ کے بعد خود کیسرورت کا سفر کر کے اس اساس خیرہ کی نسبت حسن ظن میں اور بھی اضافہ کر لیا۔ خود لکھتی ہیں کہ "جس وقت گاڑی میں بیٹھ کر اُس شہر سے باہر جاتی تھی تو یہ سمجھ رکھتی تھی کہ یہ میرا اس مقام کا آخری سفر نہیں ہے"۔ اسکے بعد پھر وہ وہاں گئیں اور ایک ہفتہ تک مقیم رہیں۔ تاکہ وہاں کے عملیات اور اُن کے طرز و طور سے بالکل واقف ہو جائیں۔

وہاں کے بندوبست متواتر کام۔ اسکے علاوہ انتہائی تقویٰ و پرہیزگاری سے جو وہاں پائی جاتی تھی۔ اگنس بہت محظوظ ہوئیں اور ان کا دل بیحد چاہا کہ تعلیم و تدریس کی غرض سے پھر وہاں پلٹ کر جائیں اور قیام کریں۔ اسلیے کہ اُن کے خیال میں یہ نہایت درجہ ضروری تھا کہ انسان جس کام کے درپے ہو اُسکی تعلیم بدرجۂ اتم و اکمل حاصل کرے۔ ۱۸۵۶ء میں وہ اپنی والدہ اپنے اصلی وطن ڈبلن واپس آئیں۔ چونکہ ابتدا ہی سے انھیں اس مقام سے اُلفت تھی اور اسکے علاوہ اُن کے والدین یہیں مدفون تھے۔ لہٰذا اس جگہ کو بہت ہی عزیز رکھتی تھیں اور اُسکی بڑی قدر کرتی تھیں۔ یہاں رہ کر بکمال سعی مریضوں اور ضعیفوں کی تیمارداری میں مشغول رہیں۔ خود اُن کی ہمشیرہ لکھتی ہیں "مدرسہ ہو یا کسی محتضر کا کنارِ بستر یا کوئی یکہ و تنہا چھونپڑا ہو جہاں کسی ناگہانی حادثہ یا نزولِ بلا سے لوگ مصائب میں مبتلا ہوں ہر جگہ ان کا وقار اور انکی دلداری باعثِ تسلی و تسکینِ قلب رہا کرتی تھی۔ اسی قسم کے جملہ مقامات پر جا کر قربۃً الی اللہ لوگوں کی دستگیری کیا کرتی تھیں جسنے ایک مرتبہ بھی انھیں دیکھا ممکن نہیں کہ ان کا یہ ایثار فراموش کرے۔ اسلیے کہ وہ ایسی حالت میں مسافت بعیدہ طے کر کے آیا کرتی تھیں کہ پہاڑ کی ہوا میں چلتے چلتے اُن کے چہرہ کا رنگ ارغوانی ہو جاتا تھا اور گیسو بکھر جاتے تھے اور اُن کے فرحناک اور زیبا چہرہ سے مترشح ہوتا تھا کہ دیدہ و دانستہ انھوں نے یہ ساری زحمت محض فقرا کی راحت رسانی کی غرض سے برداشت کی ہے"

مریضوں کے لیے دوا تجویز کرنے اور زخموں اور خاصکر جلے ہوئے اعضا کے زخموں پر پٹی باندھنے میں انھیں مہارت تامہ حاصل تھی۔ اعضائے جسم کے جل جانے کی شکایت اُن مقامات پر عام تھی اسلیے کہ دہقانیوں کے لڑکے بخاری (چمنی) یا چولھے کی آگ کے بالکل پاس بیٹھا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے اُن کے بدن کا کوئی نہ کوئی حصہ اکثر جل جایا کرتا تھا۔ جب تک کہ انکے مریض شفایاب نہ ہو جاتے برابر اُنکی عیادت و تیمارداری کیلیے جایا کرتی تھیں۔ بلکہ اکثر اوقات اُن کے لیے کچھ مٹھائی یا میوہ وغیرہ لیجاتیں اور شاذ و نادر ہی اس بارہ میں اُن سے غفلت ہوتی۔ انکا معمول یہ تھا کہ جب کسی کو دیکھنے جاتیں تو چلتے وقت انجیل کی کوئی نہ کوئی آیت ضرور پڑھ لیتیں بلکہ بعض موقعوں پر نا سمجھ بچوں یا جاہل ترین لوگوں کو

سمجھانے کی غرض سے تشریح طلب آیات کی تفسیر بھی بیان کردیتیں۔ سات سال کے زمانہ میں سارے یورپ کا دورہ ختم کرلینے کے بعد پھر انھیں کیسرسٹ آنے کا موقع ملا۔ اُن کا قصد تھا کہ یہاں صرف ایک یا ڈیڑھ ماہ تک رہیں گی لیکن رئیس ادارۂ خیریہ نے اُن سے یہاں زیادہ قیام کرنے کے فوائد اس شرح وبسط سے بیان کیئے کہ انھوں نے ارادہ کرلیا کہ جاڑے کا موسم یہیں گذاریں اس ادارہ کے لوگ (از قسم اُناث) اعمال خانگی اور امور دانگی کے ہر ہر شعبہ میں تعلیم پاتے تھے اسلیئے کہ مُیں ادارہ کا خیال تھا کہ یہ لوگ جب عبادت کی غرض سے باہر جائیں تو بشرطِ امکان لوگوں کو اُنکے امور خانگی میں بھی مدد دیں اسلیئے کہ اُنکی بات زیادہ مؤثر ہوگی۔ چونکہ اہالی ادارہ (برائے مراسم مذہبی و قرأت انجیل کے بجد پابند تھے اور روزانہ ڈیڑھ گھنٹہ عبادت میں صرف کرتے تھے اسلیئے اُن کی حسِ مذہبی بڑھ گئی تھی اور باوجود اسکے کمروں کا روزمرہ کا خانگی کام صرف جھاڑو دینا۔ کمروں کی صفائی کرنا یا برتن دھونا تھا لیکن اگنس جونس کو ایسی معمولی باتوں میں بھی اسقدر مسرت حاصل ہوتی تھی کہ وہ کہا کرتی تھیں کہ گو دن بہت بڑے ہوتے ہیں لیکن ان کی درازی اس راحت و مسرت کی بدولت نصف سے بھی کم معلوم ہوتی ہے

(باقی آئندہ)

رعنائی تخئیل

(محترمہ ملک سلطانہ رعنا جواد)

کس کس سے نہیں تیری عالم میں شناسائی
انداز عجب تیرے ہیں اے بت ہرجائی

نیرنگیٔ قسمت کا اک یہ بھی کرشمہ ہے
قاصد نے پلٹ کر بھی شکل اپنی دکھلائی

پوچھے تو کوئی جاکر اس رشک مسیحا سے
بیمار محبت کی ممکن ہے مسیحائی

انجام اگر یہ تھا آوارۂ الفت کا
اے عشق زمانہ میں کیوں خاک یہ چھنوائی

دنیا کے جھمیلوں سے کیا کام انھیں رعنا
فطرت سے ملی جن کو تخئیل کی رعنائی

نقد و تبصرہ

بس کا روکھ
یا
زہریلا درخت

مترجمہ فدا علی خاں ایم اے علیگ صدر شعبۂ فارسی و اردو ڈھاکہ یونیورسٹی

صفحات ١٦٥ قیمت عہ ملنے کا پتہ "کتابستان" الہ آباد

بنگال کے مشہور ناول نویس بنکم چندر چٹرجی کے ایک نہایت عمدہ ناول کا ترجمہ ہے پلاٹ اور اسکی دلچسپیوں کا کیا کہنا۔ پورے ناول میں نہ معلوم کتنی اچھوتی باتیں اور قیمتی جواہر پارے موجود ہیں۔ فاضل مترجم اس لحاظ سے ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایسی گرانقدر تصنیف کو اردو میں منتقل کیا۔ لیکن موصوف نے جو التزام مالا یلزم اپنے اوپر عاید کر لیا اس سے دقتیں بہت بڑھ گئیں۔ موصوف نے اسکی زبان نہ اردو رکھی ہے نہ ہندی بلکہ اسے دونوں زبانوں کے اتحاد کے نتیجے میں ایک تیسری زبان بنا دی ہے خیال تو یہ بھی قابل قدر ہے لیکن اس سے جو عملی دشواریاں ہو گئیں اُن کا بدیہی نتیجہ یہ ہوا کہ انکی یہ اردو ایسی معجون مرکب ہو گئی جس کے اجزاے ترتیبی آسانی سے سمجھ میں نہیں آتے۔ بہت سے محاورے اور لفظیں غلط استعمال ہوئی ہیں۔ ایسا خلط ملط ہوا ہے کہ نہ اس کا کوئی معیار سمجھ میں آتا ہے اور نہ کوئی اصول اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر جگہ عبارت کا مفہوم واضح نہیں ہوتا روانی اور سلاست بالکل مفقود ہے۔ ایک تو بھاشا اور بگڑی ہوئی اردو کا جوڑ اس پر ٹائپ کی چھپائی نتیجہ یہ ہے کہ جو کتاب دو گھنٹے میں ختم کی جا سکتی تھی اُس کے لیے چار گھنٹے کی ضرورت ہو گی۔ تاہم صورت موجودہ میں بھی یہ کتاب غنیمت ہے اور چونکہ فاضل مترجم کی اس طرح کی غالباً پہلی کوشش ہے اسلیے یہ امید ہے کہ اور ترجمے اس سے بہتر ہونگے۔ کم از کم یہی ناول دوسری اشاعت میں اپنی متحدہ زبان کو اس سے بہتر صورت میں پیش کر سکتا ہے۔

اقدام بہرحال قابل لحاظ ہے خدا کرے اُردو اور ہندی میں اسطرح مصالحت ہو سکے اور دونوں متحد ہو سکیں اس ناول کو ضرور پڑھنا چاہئے اُردو میں ایسے ناول بہت کمیاب ہیں۔

مثنوی ناسخ

جناب حبیب اللہ خاں غضنفر صاحب ایم اے نے شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی کی ایک کمیاب مثنوی جو ذکر میلاد و مناقب پر مشتمل ہے ایک مقدمہ کے ساتھ شایع کی ہے شروع میں "فہرست ماخذ" ہے اُسکے بعد "عرض حال" ہے اور اُسکے بعد "مقدمہ مرتب" ہے جسمیں "حالات مصنف اور تاریخ مثنوی سے بحث کی گئی ہے اور "مثنوی پر رائے" بھی ظاہر کی گئی ہے۔ اِن تمام مقدمات کے بعد ۵ صفحات پر مثنوی کے اشعار ہیں اور سب کے آخر میں شرح متعلقات ہے جسمیں حل طلب الفاظ و فقرات کی تشریحیں ہیں۔

مثنوی کے سر ورق پر یہ عبارت ہے:۔

"شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی کی مثنوی مشتمل بر ذکر میلاد و مناقب جو مدت سے کمیاب تھی اب مع ایک بسیط مقدمہ نوشتہ حبیب اللہ خاں غضنفر ایم۔ اے ریسرچ اسکالر الہ آباد یونیورسٹی بحلیہ طبع آراستہ شد"

موجودہ دور میں جبکہ زبان اسقدر ترقی کر چکی ہے اُردو فارسی کی اس قسم کی بے ربط آمیزش سے عبارت کو خراب نہ کرنا چاہیئے مطبع میں ان باتوں کا لحاظ ہونا چاہئے۔

عرض حال میں پہلا جملہ بیکار ہے۔ مقدمہ بسیط اور بہت خوب ہے۔ جناب غضنفر کا تحقیقی ذوق قابل ستائش ہے۔ اُردو ایسے کام کرنے والوں کی زیر بار احسان ہے۔

مثنوی کا کیا کہنا۔ پاکیزگی زبان اور صفائی بیان کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ ناسخ سے صاحب قدرت نے ساری عمر اسی کد و کاوش میں گذاری۔ پھر کیوں نہ یدطولیٰ حاصل ہو آج کل کے شعرائے الوالعزم تخیلی دنیا میں بلند پروازیاں جتنی بھی چاہیں کریں لیکن پرانے با اصول اساتذہ کی طرح اپنے مافی الضمیر کو مکمل اور سنجیدہ طریقے پر کبھی ظاہر نہیں کر سکتے۔ بڑی بڑی نقطوں کی اوٹ میں اپنے اس عجز کو چھپانے والے اگر انصاف سے کام لیں تو انھیں اعتراف کرتے ہی بن پڑیگی لیکن بُرا ہو کم سوادی اور مغرب پرستی کا کہ جس نے ایک طوفان بدتمیزی کا بپا

کر رکھا ہے۔ ماضی کے مقابلے میں حال زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ پرانے شاعروں نے یہ بتایا تھا کہ "خیالات کا اظہار کیونکر ہونا چاہیئے"۔ اب چاہیئے تھا کہ دقیع و رفیع خیالات کو اسی طریقے سے ظاہر کیا جاتا کہ لفظ و معنی دونوں کی تکمیل ہو جاتی اور متکلم کے خیالات سامع پر یوں واضح ہو جاتے کہ وہ پکار اٹھتا کہ "یہ بھی میرے دل میں ہے"۔ پرانے اساتذہ کے خیالات میں ہمالیہ کی سی بلندی نہ سہی لیکن اُن کے بیان میں ایک لذت ہوتی تھی جو کچھ وہ کہنا چاہتے تھے وہ کہہ سکتے تھے اور کہتے تھے اسی لیے وہ قابل تعریف سمجھے جاتے تھے اور اب بھی ہیں۔ میرا سوال ہے کہ آپ نے اس ہنر کو کیوں عیب سمجھ لیا ہے۔ تخیلات کو جسقدر بھی چاہیئے رفعت دیجئے لیکن ناسخ کی مثنوی سے یہ سبق ضرور لیجیئے کہ انھیں اپنی زبان میں مکمل طریقے سے ادا کیونکر کیا جاتا ہے۔

چھوٹی تقطیع پر ۸۰ صفحات ہیں۔ ٹائپ میں چھپی ہے لیکن بہت صاف چھپی ہے۔ غلطیاں بہت کم چھوٹی اور مسخ ہوئی ہیں۔ قیمت صرف ۱۲/ آنے ہے "کتابستان الہ آباد" سے منگائیے۔

دی گولڈن ڈیڈز آف امام حسینؑ

بہار پراونشل شیعہ کانفرنس نے انگریزی کے چودہ مضامین کا مجموعہ ۷۰ صفحات پر نہایت آب و تاب سے شایع کیا ہے۔ اس کا ہر مضمون کربلا کے عدیم المثال ہیرو کے بینظیر کارناموں سے متعلق ہے۔ نواب موید الملک سر سید علی امام، آنریبل سر ایس ایم سلیمان، سر شاہ نواز بھٹو، پروفیسر اس۔ دی۔ بنتم بیکار ہیڈ آف ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری بنارس ہندو یونیورسٹی، عبداللہ یوسف علی صاحب ایم اے۔ ال، ال ایم۔ سی۔ آئی۔ اِی، سچیدانند سنہا صاحب بیرسٹر، محمد حبیب صاحب پروفیسر علی گڈھ یونیورسٹی اور دیگر ممتاز افراد ہند اس مجموعہ کے مضمون نگار ہیں۔

اس مجموعہ کا مقصد اپنے ہیرو کے کارناموں کے لیے سند پیش کرنا نہیں ہے بلکہ مقتدر اہل قلم اور سر برآوردہ افراد ملک کو ایک ایسے موضوع کی جانب متوجہ کرنا ہے جو ہر طبقہ ہر مذہب اور ہر قوم کے لیے یکساں مفید ہے اور یہ ظاہر کرنا ہے کہ حضرت امام حسینؑ کے زریں کارنامۂ حیات کو مختلف اقوام عالم کس نظر سے دیکھتے اور اس سے کس حد تک متاثر ہوتے ہیں۔ مضامین بہت دلچسپ اور مجموعہ نہایت قابل قدر ہے۔ کتابت طباعت اور کاغذ بھی اعلیٰ قسم کا ہے۔ قیمت علاوہ محصولڈاک صرف ۱۲/ ہے۔ دفتر سکرٹری صوبہ شیعہ کانفرنس محلہ مغلپورہ...

کارنامۂ حسین

یہ مجموعۂ اُردو میں ہے اسکی بھی یہی خصوصیات ہیں جو گولڈن ڈیڈ کی ہیں۔ منشی پریم چند صاحب، خواجہ حسن نظامی صاحب، آنریبل خان بہادر سر سیّد محمد فخرالدین وزیر تعلیمات اور دیگر محترم ہستیوں کے مضامین نثر و نظم اسمیں موجود ہیں۔ یہ مجموعہ ۵۶ صفحات پر نہایت نفاست سے شائع کیا گیا ہے اسکی قیمت علاوہ محصولڈاک صرف ۶ ہے۔ مندرجہ بالا پتے سے اسے بھی منگائیے۔

باغبانی پروجکٹ اور بچوں کی چند کہانیاں

(مرتبہ محمد عبدالغفار مدہولی نگران تعلیمی مرکز نمبر ا جامعہ دہلی)

جیساکہ نام سے ظاہر ہے یہ کتاب بچوں کی تعلیم و تربیت سے تعلق ہے۔ جامعہ دہلی کے ممدوح صدر فاضل نے اپنے طالبعلموں کے مضامین کے اقتباسات اور اُنکی "باغبانی" سے دلچسپیوں کی حکایات اس میں درج کی ہیں۔ بچوں کی مختلف حالتوں کی بہت سی تصویریں بھی ہیں۔ اور اُن کی نقاشیوں کے عکس بھی ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے یہ طریقۂ کار بہت مفید ہے۔ اس سے انھیں علم کے ساتھ ساتھ عمل بھی آئے گا۔ کتاب بہت کارآمد ہے بچوں کو ضرور پڑھنا چاہیئے۔ کتابت اور طباعت بہت عمدہ ہے قیمت ۸ ہے

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ قرولباغ دہلی (۲) مکتبہ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن۔

اسکول کی زندگی

یہ تصنیف بھی عبدالغفار صاحب مدہولی استاد جامعہ کی ہے یہ چھوٹی تقطیع کے ۵۶ صفحات پر بچوں کے لیئے ایک ڈرامہ ہے جو جامعہ ملیہ میں سنہ ۲۹ء میں کھیلا جا چکا ہے۔ چند طالبعلموں کا قصہ ہے دو بہت شریر اور ایک نیک طالبعلم ہے۔ شریر طلبا کی صحبت میں نیک بھی برباد ہونے لگتا ہے کہ خوبی قسمت سے اُسے اپنی بربادی کا احساس ہوتا ہے اور وہ اُن سے الگ ہو کر دنیا میں نام پیدا کرتا ہے۔ بچوں کے مطالعہ کیلئے ڈرامہ خراب نہیں ہے قیمت ۴ ہے۔ ملنے کا پتہ وہی ہے جو باغبانی پروجکٹ کا ہے۔

شیون اور جواب شیون

جناب حکیم آشفتہ صاحب نے ایک نظم "شیون" لکھی۔ جناب سراج لکھنوی نے اس کا جواب تحریر

"ادب"

فرمایا اور پیرزادہ سید فدا حسین صاحب بی اے (علیگ) نے دونوں نظموں کو ایک کتابی صورت میں شایع کردیا۔ تینوں صاحبان اپنی کوششوں کی کامیابی پر مبارکباد کے مستحق ہیں نظمیں نہایت خوب ہیں۔ اقبال کے شکوہ و جواب شکوہ کے طرز پر لکھی گئی ہیں پھر بھی بہت الگ رہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اشعار میں زور اور بندش میں چستی ہے نظمیں واقعاً ایک مردہ قوم کی بے حسی اور تغافل کی سچی تصویریں ہیں۔ افراد قوم کو چاہیئے کہ اسے غور سے پڑھیں اپنی حالت زار پر نہ صرف آنسو بہائیں بلکہ سبق بھی حاصل کریں۔ اس مجموعہ کی قیمت ۸ر ہے اور ملنے کا پتہ "دی یونائیٹیڈ انڈیا پریس لکھنو" ہے۔

اسرار ہارمونیم عرف ٹھاٹھ بھید

مصنفہ سید ابن علی صاحب مصاحب اعلیحضرت فرمانروائے ریاست رامپور۔ ہارمونیم سیکھنے میں یہ رسالہ بہت مدد دیگا۔ مصنف نے اس میں بہت سے قاعدے بنائے ہیں جنکی مشق کرنے سے مبتدی کا ہاتھ صاف ہوگا ٹھاٹھوں کی واقفیت ہوگی اور لے سمجھ میں آئے گی۔ جو صاحب ہارمونیم کا نیا شوق رکھتے ہوں وہ ۸ر خرچ کرکے اس رسالہ کو مصنف سے یا "حامدی پریس رامپور" سے حاصل کریں۔

سراج الحق کا زور علم

حصہ اول۔ مرتبہ حافظ شیخ صدر الدین احمد صدیقی

سراج الحق صاحب مچھلی شہری مدرس عربی و فارسی گورنمنٹ انٹرمیجیٹ کالج الہ آباد اپنے غیر ضروری اور بے بنا مذہبی تعصب کیلیے اسقدر مشہور ہوگئے ہیں کہ اب انکے متعلق کسی مزید تعارف کی ضرورت نہیں رہی ہے۔ موصوف نے پروفیسر سید محمد ضامن علی صاحب صدر شعبہ اردو کے خلاف بہت لکھا اور شایع کیا۔ یہ رسالہ اُن کی تحریروں کے جواب میں ہے جو شخص بھی سراج الحق صاحب کے مضامین پڑھ چکا ہے اور ان کی اس دریدہ دہنی کو دیکھ چکا ہے جو نہ صرف کسی فرد واحد پر تمام ہوتی ہے بلکہ جس کی زد میں مذہب اور اُسکی مقدس ہستیاں بھی آجاتی ہیں وہ بھی اس رسالہ یا ایسے بہت سے رسالوں پر اعتراض نہیں کرسکتا۔ سخت افسوس کا مقام ہے کہ اس بیسویں صدی عیسوی میں بھی ایسی تنگ نظری کی مثالیں موجود ہیں جن پر

نظر کرکے شرم آتی ہے۔ دیکھیے ہندوستان تعصب کی لعنت سے کب نجات پاتا ہے!

"ندیم" گیا

بڑی تقطیع کے ۷۲ صفحوں کا خوشنما اور جاندار رسالہ ہے اس میں اچھے اچھے مضامین اور اچھی اچھی تصویریں ہیں۔ اس کے مدیر جناب انجم صاحب ہیں اور معین مدیر عبدالقدوس ہاشمی ندوی صاحب ہیں۔ آئین ندیم میں ایک دفعہ غیر معمولی یہ ہے کہ "اسمیں اخلاق سوز افسانے اور روایاتی عاشقی کی غزلیں ہرگز درج نہونگی" غزل شایع نہ کرنے کے اعلان سے صاف ظاہر ہے کہ کارکنانِ ندیم غزل سے سخت بیزار ہیں لیکن طرفہ بات یہ ہے کہ خود جناب مدیر کے نظرات (بروزن نبلات) کی ابتدا روایاتی عاشقی کی غزل کے اس شعر سے ہوئی ہے۔

ہمہ شب دریں امیدم کہ نسیم صبحگاہی　　بہ پیام آشنائی بنوازد آشنا را

اتنا ہی نہیں بلکہ اس رسالہ میں جو نظم "سادہ کاغذ" ایک محترم ٹریبل ایم اے کی شایع ہوئی ہے اسکے ہر شعر نہیں ہر مصرع نہیں بلکہ ہر لفظ سے وہی روایاتی عاشقی کا تغزل ظاہر ہو رہا ہے۔ عنوان نظم اور پھر شاعر کی مغربی شخصیت کو دیکھ کر یہی امید ہوتی ہے کہ اسمیں خالص غیر مشرقی خیالات کی بلند پروازیاں ہوں گی اور علی الخصوص ایسی صورت میں جبکہ "سادہ کاغذ" کی معنویت کو مکمل کرنے اور نظم کو بالکل نیچرل بنانے کے لیے سادے کاغذ کا ایک ورق نظم کے سامنے لگا دیا گیا ہے۔ لیکن ان تمام جدتوں کے باوجود اسمیں وہی روایاتی معاشقہ دکھائی دیتا ہے۔ پوری نظم اسی طرح کے اشعار کا مجموعہ ہے:۔

سادے کاغذ سے ہو کیا خاک تسلی دل کی　　کم نہیں ہوتی ہے بڑھتی ہے مری بیتابی
وہ خفا ہے نہیں چلتا ہے پتہ اس کا بھی　　یہ بھی کھلتا نہیں اسکو ہے محبت میری
دلدہی بھی نہیں الفت کا اثر کچھ بھی نہیں
یوں تو سب کچھ ہے لکھا اسمیں مگر کچھ بھی نہیں

بہر عنوان ہمیں حد درجہ مسرت ہے کہ "گیا" سے ایک ادبی جریدہ شایع ہوا بیسیوں رسالوں سے اس کا معیار بلند ہے اور پرچہ بحیثیت مجموعی بہت اچھا ہے خدا کرے کہ رسائل کے معاملے میں بہار یوپی سے اور "گیا" "لکھنؤ" سے زیادہ خوش قسمت ثابت ہو۔ ندیم کی سالانہ قیمت للعہ ہے نمونہ کا پرچہ ۶ر میں ملتا ہے

سعید دہلی

"کامیابی" کو اس کے مالکوں نے بند کر دیا۔ اس کے فاضل اڈیٹر جناب ڈاکٹر سید احمد صاحب بریلوی نے اب خود ایک پرچہ "سعید" نکالا ہے۔ اس کی صوری و معنوی خوبیاں اور اغراض و مقاصد وہی ہیں جو کامیابی کے تھے۔ ڈاکٹر سید احمد صاحب موصوف کی لیاقت سعادت مندی اور زندہ دلی سے ہمیں قوی امید ہے کہ "سعید" کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہو گی۔ ہم نہایت خلوص کے ساتھ سعید کا خیر مقدم کرتے ہیں اور دست بدعا ہیں کہ خداداد بخشی ہوئی سعادت بھی سعید کو نصیب ہو۔

سعید کی قیمت سالانہ سے ہے۔

قہقہے

(واہ صاحب واہ)

شیخ جی تسبیح چھوڑو اب چلن مالوں کا ہے
تول کر رکھو قدم کو راج بقالوں کا ہے

لیلیٰ ہند اپنی زلف ناز ہے کھولے ہوئے
اب ہر رُت برسات کی زد آج کل کالوں کا ہے

اک لنگوٹی باندھ کر عالم مسخر کر لیا
حُسن عریاں کا اثر ہر یا پھٹے حالوں کا ہے

رو رہے ہیں مینچسٹر والے رکھے سر پہ ہاتھ
ہو نہ ہو یہ سب اثر چرخے اتیرے نالوں کا ہے

اک اشارہ پر کٹے مرتے ہیں شیخ و برہمن
یہ تو اک ادنیٰ کرشمہ یار کی چالوں کا ہے

گھٹ گئی دشمن کی قوت ظاہری ہے ٹیم ٹام
رک گیا پانی فقط اب شور پرنالوں کا ہے

جب سے چرخا کاتتے بڑھیا کو دیکھا چاند میں
ابر کے ٹکڑوں پہ دھوکا روئی کے گالوں کا ہے

دین میں کیوں نہ گرمی آئے کیوں اسلام کی
نیرا کمبل شیخ جی کی ریش کے بالوں کا ہے

واہ کی یورپ کی گو تقلید کورانہ ...... مگر
وہ بھی تو رتبہ نہیں پایا جو نقالوں کا ہے

ادب

جلد (۴) | فہرست مضامین بابتہ ماہ ستمبر، اکتوبر ۱۹۳۱ء | نمبر ۳، ۴

افکارِ تازہ[1]

حضرت صفی مدظلہ

جو میرا عقیدہ ہے وہ زاہد کا نہیں ہے
رحمت میں اسے شک ہے مگر مجھ کو یقیں ہے

اندازۂ قسمت میں مساوات نہیں ہے
ہے تخت نشیں کوئی کوئی خاک نشیں ہے

رفتار یہی ہے اگر اے دہرِ فراموش
فردا سے قیامت بھی بہت دور نہیں ہے

اب چاہو گر ساز محبت کو نہ چھیڑو
اک تار شکستہ نفس باز پسیں ہے

جچتی ہے نظر باز جسے داغ محبت
وہ خاتمِ فطرت کا دل افسردہ نگیں ہے

اک وہ ہیں کہ حاصل ہے جنھیں عشرت کونین
اک ہم ہیں کہ قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دیں ہے

جب مزرعِ عقبیٰ ہے یہ دنیا تو سمجھ لو
جنت بھی یہیں اور جہنم بھی یہیں ہے

بے لوث محبت ہو جسے ملک سے اپنے
وہ سر برہنہ پا خسرو بے تاج و نگیں ہے

گو پیرزنِ دہر میں ثروت ہے نہ سیرت
تصویر جو دیکھو تو قیامت کی حسیں ہے

ہے زیر زمیں کیا ہی مساوات کا برتاؤ
محکوم ہیں حاکم ذرا فرق نہیں ہے

اک شور ہے آشفتہ نواؤں کا چمن میں
ویران ہے گلشن کہ بہار آج نہیں ہے

وہ دیکھ چکے غور سے بیمار کی حالت
دل اور کہیں جن کی نظر اور کہیں ہے

وہ ایک ہی تصویر ہے جس کے ہیں یہ دو رخ
بالائے زمیں جو ہے وہی زیر زمیں ہے

آئینۂ دل میں نظر آتے ہیں کئی بال
معلوم ہوا مجھ سے کوئی چیں بجبیں ہے

سجادہ پرستوں سے تو بہتر ہے بہرکیف
مانا کہ صفی رند خرابات نشیں ہے

[1] انجمن بہار ادب لکھنؤ کا پہلا مشاعرہ ۱۱ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس مشاعرہ میں حضرت صفی اور حضرت آرزو نے بھی غزلیں پڑھی تھیں۔ ہندوستان کے ان دونوں مایۂ ناز و باعث افتخار کاملین فن کے اس تازہ ترین کلام کو حاصل کر کے ادب کے صفحات کی زینت بڑھائی جا رہی ہے ناظرین مطالعہ کریں اور لطف اندوز ہوں۔ (اعظم)

افکار تازہ

حضرت آرزو مد ظلہ

دم بھر بھی نظر ایک مزاج ایک نہیں ہے — کیونکر کہوں گردش میں فلک ہے کہ زمیں ہے

نقش قدم اُس کا کہ مرا نقش جبیں ہے — اب ایک ہیں دونوں کوئی پہچان نہیں ہے

دیدار کہاں اور کہاں حُسن نظر سوز — کیونکر اسے سمجھائیے جس دلکو یقیں ہے

خلوت کدہ دل کا بھرم جائیگا اے شوق — آواز نہ دینا کہ یہاں کوئی نہیں ہے

دو چار لکیریں جو پڑھی بھی نہیں جاتیں — اک کھیل مقدر کا مرا خط جبیں ہے

اے ضبط ہوا تیری عرق ریزیوں کا خون — بُو اب تو پسینے میں پسینے کی نہیں ہے

ہاں پاس ہمارے بھی ہے اک حُسن کا معیار — تم اتنے ہی پیارے ہو نظر جتنی حسیں ہے

بے راہنما چلا ہے جس راہ پہ دل سے — اتنی ہے خطرناک کہ رہزن بھی نہیں ہے

جنبش رگ گردن کی صدا دیتی ہے ہر گام — ناداں کہاں چلتا ہے مطلوب یہیں ہے

ابر کہو، دلجو کہو، جو دل کہے کہہ دو — نام اُسکے بہت جسکا کوئی نام نہیں ہے

تربت میں جو تربت ہے تو مدفن میں ہے مدفن — وہ بھی کب اکیلے کی ہے دو گز جو زمیں ہے

کہہ سکتا ہے کیا راز دلی دم بخود عشق — یوں بند ہے شیشہ کہ کہیں سانس نہیں ہے

دنیائے محبت ہے عجب آئینہ خانہ — لاکھوں ہیں مکاں اور فقط ایک مکیں ہے

لوں کس سے ضمانت میں اس اقرار وفا کی — کہتی ہے یہ چتون کہ تری "ہاں" بھی "نہیں" ہے

سدھ آئی ہے پھر باد بہاری کو وطن کی — پلٹا ہوا جھونکا نفس باز پسیں ہے

اے آرزو انساں کے عوض سنگ در دوست — سجدہ سے جو اُٹھتا ہی نہیں یہ وہ جبیں ہے

بزمِ ادب

مدیر نگار لکھنؤ نے عرصہ سے "ادبی سرکشی" کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ وہ اپنی شوخ تحریروں کے حربے سے ادبی بزرگوں کو مجروح کرنے میں مصروف تھے۔ چنانچہ اردو کے مایہ ناز انشاپرداز حضرت آزاد کے پامال کرنے میں اُنھوں نے ساری قوتیں صرف کردی تھیں۔ ہم نے اُن کی اِس بے راہ روی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تھی۔ لیکن بارگاہ نگار میں شنوائی کا موقع ہی کیا تھا، کاش کہ اُنھوں نے اِس ادبی تمرد ہی پر اکتفا کی ہوتی اور "مذہبی بغاوت" کا علم بھی نہ بلند کیا ہوتا۔ لیکن انھیں ہمہ دانی کا غرہ ہے۔ وہ اگر ایک طرف اپنے کو زبردست ادبی نقاد سمجھتے ہیں تو دوسری طرف انھیں یہ خیال ہے کہ مذہب کے فلسفہ کا بھی اُن سے بڑھ کے کوئی ماہر نہیں ہے۔ اِس "غرور علامگی" کا یہ نتیجہ تھا کہ اُنھوں نے کئی سال سے مذہب کے نظام پر بھی تیرباراں کر رکھا تھا۔ کوئی اسلامی نظریہ اُنکے غلط تصرفات سے محفوظ نہ تھا۔ مستشرقین مغرب نے اسلامی اُصول پر جو اُلٹے سیدھے اعتراضات وارد کیے ہیں وہ نیاز صاحب کے قلم سے، اُن کے نام نہاد اجتہاد کے قالب میں، نگار کے صفحات پر برابر نظر آتے تھے۔ اِس پر طرہ یہ تھا کہ لہجہ میں خشونت حد سے زیادہ نمایاں تھی اور جملوں میں سوقیت شریک غالب تھی۔ کبھی جنت دوزخ کی تصویرکشی مضحک طریقے سے کی گئی۔ کبھی رسول و آل رسول کا دل آزار طریقہ پر مذاق اُڑایا گیا۔ اِس غیر مہذب جسارت کی انتہا یہ ہوئی کہ اللہ سے ٹھٹھول ہونے لگا اور اس واحد جبار کے نام خط لکھا جانے لگا!

ظاہر ہے کہ اِس قسم کی حرکتیں کسی عنوان سے برداشت نہیں کیجا سکتی تھیں۔ مذہب کے متعلق یہ نازیبا طریق عمل کسی مذہب طبقہ میں خواہ اِس کا تعلق اسلام سے ہو یا نہ ہو پسند نہیں کیا جاسکتا اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ مسلمانوں میں ایک ہیجان و شورش پیدا ہوا اور وہ مدیر نگار کے خلاف احتجاجات کریں۔ چنانچہ تمام اسلامی اخبارات میں نیاز صاحب کی اِس روش کے خلاف فریادیں بلند ہونے لگیں۔

اور ہو رہی ہیں۔ مدیر نگار نے ایک توبہ نامہ "اگر مگر" کے شرائط کے ساتھ مسلمانوں کی خدمت میں پیش کیا ہے اور اپنی زیادتیوں کی معافی چاہی ہے سُنا ہے کہ مسلمانوں کے ایک عام جلسہ نے اسے رد کر دیا اور نیاز صاحب سے غیر مشروط توبہ نامہ کے پیش کرنے کی خواہش کی ہے۔

ہم نیاز صاحب کو یہ رائے دینگے کہ وہ مسلمانوں کی خواہش پوری کر دیں اور آیندہ سے اپنی غیر مہذب و دل آزار روش ترک کر دیں۔ اُنکے حق میں یہی مفید ہے۔

حلقۂ "ادب" کے قابل قدر مضمون نگار و مورخ مکرمی شیر احمد علوی صاحب بی اے اردو شاعرات کا ایک تذکرہ مرتب فرما رہے ہیں۔ اُن کا قصد ہے کہ وہ چند اولین شاعرہ سے لیکر ۱۹۳۱ء کی شاعرات تک سب کو اس "تذکرۂ جمیل" میں جمع کر دیں۔ وہ اسلیئے خواہشمند ہیں کہ "ادب" کی ناظرات میں سے جو محترم شاعرہ ہوں وہ انکے پاس اپنے سوانح اور کلام کے نمونے او رٹیل بلڈنگ ہاوس نمبر ۲ امین آباد پارک لکھنؤ کے پتہ سے جلد سے جلد ارسال فرمائیں۔

ہندوستان کا علم دوست طبقہ یہ سُن کے تاسف کریگا کہ امریکہ کے سب سے بڑے موجد اور سائینس دان ٹی۔ اے۔ ایڈیسن نے ۱۸ر اکتوبر کو انتقال کیا۔

ایڈیسن ۱۱ر فروری ۱۸۴۷ء میں پیدا ہوا تھا۔ صرف تین ماہ اس نے اسکول میں باقاعدہ تعلیم پائی تھی۔ ۱۲ سال کی عمر میں وہ اسٹیشنوں پر اخبارات بیچنے لگا۔ اور ۱۵ برس کی عمر میں وہ تار بابو ہو گیا ۲۱ سال کی عمر میں اس نے سب سے پہلے چیز ایجاد کی۔ اور اسوقت سے اسوقت تک برابر ایک کے بعد عجیب و غریب آلے اور کلیں ایجاد کرتا رہا۔ اپریل ۱۹۲۸ء تک اس نے ایک ہزار تینتس چیزوں کو ایجاد کر کے پیٹنٹ کرایا تھا۔ اس تین برس کے عرصہ میں خدا معلوم اس نے اور کون کون سے آلے ایجاد کیے ہونگے۔ ہم ہندوستانیوں کو ایڈیسن کی زندگی سے سبق لینا چاہیے۔

آہ رسوا۔ آہ مرزا

پرچہ مرتب ہو کے مطبع میں جا چکا تھا کہ ہمیں خبر ملی کہ لکھنؤ کے سب سے بڑے ادیب و عالم پروفیسر مرزا محمد ہادی رسوا و مرزا، بی۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ ڈی۔ او۔ اس۔ نے اس دنیائے فانی کو خیرباد اور عالم جاودانی کی طرف رحلت فرمائی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ پروفیسر ہادی مرحوم صرف ہندی، فارسی اور عربی ہی پر عبور نہ رکھتے تھے بلکہ انگریزی، عبرانی، یونانی اور دوسری زبانوں پر بھی قدرت رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ صرف ایک عدیم المثال ادیب ہی نہ تھے بلکہ وہ فلسفی بھی تھے اور منطقی بھی۔ وہ جوتشی بھی تھے اور رمال بھی۔ وہ طبیب بھی تھے اور ہومیوپیتھی کے ڈاکٹر بھی۔ وہ علم الابدان سے بھی واقف تھے اور علم کیوان سے بھی۔ وہ ریاضی داں بھی تھے اور شاعر بھی۔ المختصر وہ صرف مختلف زبانوں کے ماہر ہی نہ تھے بلکہ تمام علوم کے عالم متبحر بھی تھے۔ وہ صحیح معنوں میں حکیم تھے۔ اُن کی موت ہندوستان کے علمی و ادبی طبقہ کے لیے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ "ادب" کے سرپرستوں اور بانیوں میں سے اکثر بزرگوں کو اُن کی شاگردی کا شرف حاصل ہے۔ ہم اُن کی خدمت میں "ادب" کی طرف سے پروفیسر ہادی کے سوانح تحریر کرنے کی استدعا پیش کرتے ہیں۔ اور درگاہ ارحم الراحمین میں دست بدعا ہیں کہ وہ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور اُن کے پس ماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

ہمیشہ رہے نام اللہ کا!

سوامی رام تیرتھ

(جناب سید مقبول حسین صاحب احمد پوری بی اے)

ہم بغل دریا سے ہے اے قطرۂ بیتاب تو ۔۔۔ پہلے گوہر تھا بنا اب گوہر نایاب تو
آہ کھولا کس ادا سے تو نے راز رنگ و بو ۔۔۔ میں ابھی تک ہوں اسیر امتیاز رنگ و بو
مٹ کے غوغا زندگی کا شورش محشر بنا ۔۔۔ یہ شرارہ بجھ کے آتش خانۂ آذر بنا
نفی ہستی اک کرشمہ ہے دل آگاہ کا ۔۔۔ لا کے دریا میں نہاں موتی ہے الا اللہ کا
چشم نابینا سے مخفی معنی انجام ہے ۔۔۔ تھم گئی جس دم تڑپ سیماب سیم خام ہے
توڑ دیتا ہے بت ہستی کو ابراہیم عشق ۔۔۔ ہوش کا دارو ہے گویا مستی تسنیم عشق
کیا کہوں زندوں سے میں اس شاہد مستور کی ۔۔۔ دار کو سمجھے ہوئے ہیں جو صدا منصور کی

اقبال[۱]

اگر مغرب بڑے بڑے سائنٹسٹ اور فلسفیوں پر ناز کرتا ہے تو مشرق کو اپنے فقیروں اور سنیاسیوں پر فخر ہے، اول الذکر نے صرف جسم کی راحت اور دنیا کی آرائش کے ذرائع بہم پہنچائے جن کو بمصداق کل من علیہا فان ایک روز ضرور مٹ جانا ہے۔ لیکن مؤخر الذکر یعنے ارباب حقیقت نے اُس وجود کو سنوارنے کی کوشش کی ہے جسکو کبھی فنا نہیں۔ روحانی آرام ہی حقیقی آرام ہے، اور اس حقیقی آرام ہی کو حاصل کرنیکے لیے عالم وجود کو خلق کیا گیا ہے، تاکہ انسان آزمائشوں میں کامل ثابت ہوکر اس قوت کے ذریعہ سے جسکو قوت روحانی یا "آتما شکتی" کہا گیا ہے عیش دوامی حاصل کرسکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس قعر دریا میں برہم آتما ایک جزو کی صورت میں جسم و اسم کے امتیاز کے ساتھ "تختہ بند" ہے اور تاکید یہ ہے کہ دامن تر نہ کرنا، یعنی جسم کو روح کی مسجد بنا کر رکھنا۔ کیونکہ

؎۱ بانگ درا۔

"ما خلقت الجن والانس الالیعبدون"

مگر موجودات کی اس صورت گری سے اُس مصورِ بے نیاز کا مطلب محض آزمائش ہی نہیں بلکہ ایک قسم کی الٰہی تربیت بھی ہے جسکو حاصل کیے بغیر حال "امر ربی" "مکاناً علیا" کا کیس نہیں ہوسکتا اسی لیئے ہم صرف "لہو و لعب کیلیے ہی نہیں پیدا کیے گئے ہیں"[۱]

غرض جس طرح راحت جسمانی کے ذرائع کی تحقیق کرنے والوں میں نیوٹن ایسے محققین اپنے اپنے اوقات میں گزرے ہیں اسی طرح بیسویں صدی کے ربع اولین میں ہندوستان کو قدرت نے سوامی رام تیرتھ ایسا کامل وجود عطا فرمایا جس نے عیش روحانی کی تعبیر کچھ ایسی طرح بیان کی کہ اس دور علم باعمل رہ ہر قوم پر اسکا اثر ہوا، اور دنیا کی وسیع قوموں نے تسلیم کرلیا کہ واقعی اگر عیش روحانی کی کچھ حقیقت ہے تو اسکی تحقیق مشرق سے بڑھ کر کہیں ممکن بھی نہیں۔ فلسفۂ ویدانت کا وجود ہندوستان میں عہد مہابھارت سے بھی قرنہا قرن پیشتر ہوچکا تھا، اور بھگوت گیتا نے اسکی اچھی خاصی مختصر سی تفسیر بھی ہم پہونچائی تھی مگر اس میں وہ کیف نہ تھا جو تصوف نے اپنی ایک صدائے الا اللہ سے پیدا کردیا، چنانچہ سوامی رام تیرتھ نے جام معرفت ہی سے سرشار ہوکر جب فلسفۂ ویدانت پر نظر ڈالی تو جیسا کہ اُنھوں نے خود فرمایا ہے یہی معلوم ہوا کہ ؎

"انتربا ہر برہم ہے سرب وسا بھی رام
استی بھاتی آپ ہر آپ ہی روپ از نام"

اور سوامی جی نے تسلیم کرلیا کہ واقعی حیات دنیوی کا حاصل اگر کچھ ہے تو صرف یہ ؎

کہ بہ چشمان دل مبیں جز دوست ہر چہ بینی بدانکہ مظہر اوست

غرض جس طرح کبیر گسائیں نے تصوف سے فیض حاصل کیا تھا اور رامانندجی سے ویدانت اور بھگتی کی تعلیم حاصل کرکے خود کو عارف کامل ثابت کردیا تھا، اسی طرح سوامی رام تیرتھ نے بھی فلسفۂ ویدانت اور صوفیائے اسلام کے فیض سے اپنی ہستی کو سنوارا جسکا ثبوت آگے چلکر تشریح کے ساتھ پیش کیا جائیگا۔ لیکن ابھی سوامی تیرتھ کے سوانح زندگی پر ایک نظر ڈالنا زیادہ مناسب ہے۔

سوامی رام تیرتھ جو پہلے گوسائیں رام تیرتھ کے نام سے اپنے احباب میں مشہور تھے ۱۸۷۳ء

---

[۱] کلام پاک۔ تفسیر حسینی

کی دیوالی میں ضلع گجرات (پنجاب) کے موضع مرآلی والا میں پیدا ہوئے۔ گوسائیں برہمنوں کے گھر میں جنم لینے کی وجہ سے اُن کا سلسلۂ نسب فقیر کامل بابا تلسی داس مصنف ہندی رامائن سے ملتا ہے، اس طرح بہ اعتبار علم وکمال اُن کو والمیک جی سے بھی نسبت تھی۔ ان کی والدہ کا انتقال صغرسنی ہی میں ہوگیا تھا۔ ماں کی وفات کے وقت ان کی عمر صرف پانچ دن کی تھی اسلیے سوامی جی کے بڑے بھائی گوسائیں گورودواس نے ان کی پرورش کی۔ کہا جاتا ہے جنم پتر اچارتے وقت برہمنوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ بے ماں کا بالک اپنے خاندان میں چند رماں ہوکر چمکے گا چنانچہ یہی ہوا، کیونکہ بچپن ہی سے رام گوسائیں کو مہابھارت، پران، اور بھاگوت کے فسانے سننے سے دلچسپی ہوتی تھی اور اسکا دماغی سکون اس بات کا ثبوت تھا کہ ضرور کبھی نہ کبھی اس بے ماں کے بچے سے نہ مٹنے والی شانتی کا ظہور ہوگا۔

ممکن ہے کہ سوامی رام نے بچپن کے دن لہو ولعب میں گذارے ہوں مگر ہمیں اس کا علم بالکل نہیں۔ اُنکے گاؤں والے تو یہی کہتے ہیں کہ گوسائیں تیرتھ کو کبھی کھیلتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ وہ خلوت پسند تھے، اور تنہائی میں مگن رہا کرتے تھے، حتیٰ کہ طالب علمی کے زمانے میں بھی اُن کو اپنی کتابوں کے سوا کسی اور چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ ادھ اخبار مطبوعہ ۱۰ مئی ۱۹۰۷ء میں یوں بیان کیا ہے:-

> "بوجہ خاندانی تخصیص جب وہ لاہور میں تھے سب اُنھیں گوسائیں جی کہا کرتے تھے۔ ابتدا میں گوسائیں جی لالہ جوالا پرشاد صاحب کے ہمراہ کایستھ بورڈنگ ہوس میں بہ غرض قیام تشریف لائے تھے .... گوسائیں جی چارپائی کی بہ نسبت زمین پر سونے کو زیادہ پسند فرماتے تھے۔ استراحت کے بھی بہت کم عادی تھے۔ صبح قریب چار بجے بیدار ہوکر شغل مطالعہ جاری کردیتے تھے"

اگرچہ حرمان ومایوسی نے سوامی جی کو بچپن ہی میں گھیر رکھا تھا، مگر اُنھوں نے اپنی زبان سے کبھی بدقسمتی کا گلہ نہیں کیا اور ہمیشہ محرومیوں اور نااُمیدیوں کو زیر ہی کرتے رہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ:-

"گوجرانوالہ شہر میں دھنا بھگت نامی ایک نیک خیال شخص رہتے تھے۔ بچپن میں جب سوامی جی

مرالی والا سے پرائمری اسکول کا امتحان پاس کر کے گوجرانوالہ میں آئے تو انھیں کے پاس رہتے تھے ۔۔ ۔۔ ۔۔ انٹرنس کا امتحان پاس کر لینے کے بعد سوامی جی کے والدین نے ان کو اسکول سے اٹھا لینا چاہا کیونکہ وہ بہت غریب تھے اور کالج کے اخراجات برداشت نہ کر سکتے تھے دفعتاً بھگت جی نے اس موقع پر سوامی جی کی مدد کی اور ان کو لاہور کے مشن کالج میں داخل کرایا، یہاں انھوں نے ۱۸ سال کی عمر میں ایم اے کا امتحان پاس کیا اور پھر سیالکوٹ کے مشن اسکول یا کالج میں کچھ عرصہ ملازمت کر کے مشن کالج لاہور میں پروفیسر ہو کر واپس چلے آئے۔ ایک عرصہ تک امریکن مشن کالج میں کام کرتے رہے۔ بعد اورنٹل کالج لاہور میں پروفیسر ہو گئے۔"[1]

اور یہی نہیں کہ کسی نہ کسی طرح انھوں نے ایم اے پاس کر کے ترقی حاصل کر لی۔ بلکہ انٹرنس کے بعد ہر امتحان میں امتیازی درجہ رکھتے تھے حتیٰ کہ:

"امتحان بی اے، پنجاب یونیورسٹی میں تو شاید بی اوّل رہے تھے۔ اسلیے انھیں ساٹھ روپیہ ماہوار کے وظائف مل گئے تھے، اس رقم میں سے پچیس روپے اپنے صرف کے لیے رکھ لیا کرتے تھے باقی گھر بھیجا کرتے تھے ۔۔ ۔۔ ۔۔ امتحان ایم اے کے لیے انھوں نے مضمون ریاضی انتخاب فرمایا تھا اور اسی کی جانب شروع سے ان کا میلان طبع تھا"[1]

انکی خداداد ذہانت کی وجہ سے گورنمنٹ کالج کے پروفیسر مسٹر بل نے تو یہانتک کوشش کی تھی کہ وہ سول سروس کے امتحان مقابلہ میں شریک ہوں، مگر سوامی جی کو علم ریاضی کی تحصیل سے زیادہ انس تھا اسلیے بجائے سول سروس کے علم ریاضی کی تکمیل کے لیے سرکاری وظیفہ کے خواہاں ہوئے تاکہ کیمبرج جا کر ریاضی کی تکمیل کریں، مگر وظیفہ ان کو نہ مل سکا۔ اورنٹل کالج لاہور کی پروفیسری کے زمانے میں سنہ ۱۹۰۱ء میں جب ان کی عمر صرف ۲۸ سال کی تھی انھوں نے ملازمت چھوڑ دی اور دھرم سادھن کے لیے ہمالہ پہاڑوں میں چلے گئے

شاید زمانہ طالب علمی ہی میں سوامی جی کو بعض اوقات عارضی ملازمت کی ضرورت پڑتی تھی، اسی بنا پر بیان کیا جاتا ہے کہ۔

---

[1] اودھ اخبار مطبوعہ ۱۰ مئی ۱۹۰۶ء

"رائے رام سرنداس صاحب رئیس اعظم لاہور نے انھیں اپنا اتالیق مقرر فرمایا تھا۔ انکی کوٹھی میں ایک وسیع بالاخانے پر وہ رہا کرتے تھے، اسوقت بالعموم وہ ورزش بھی کیا کرتے تھے"

اس ورزش کے باوجود وہ نہایت نحیف الجثہ تھے جسکی وجہ عموماً یہ بیان کیجاتی ہے۔

"سوامی جی کے پیدا ہونے تھوڑے ہی دن بعد انکی ماتا گذر گئی تھی اور والد غریب تھے . . . والد نے کچھ عرصہ کے بعد دوسری شادی کرلی تھی۔ بچپن میں ماں کے مرجانے سے ان کو ماں کا دودھ نہیں ملا جس سبب سے یہ ابتدا میں بہت دبلے پتلے اور کمزور تھے"[5]

سنیاس لینے سے پیشتر ان کی طرز معاشرت اور سیرت سے واقفیت یا تو انکے متعلقین کو تھی یا چند احباب کو، ایک صاحب ست اپدیش میں لکھتے ہیں کہ۔

"پوشاک ان کی حد درجہ سادہ تھی . . . . . ٹوپی انکے فرق مبارک پر کبھی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا . . . . . انگریزی وضع کے کپڑوں اور جوتوں سے حد درجہ احتراز فرماتے تھے، عینک ضرور وہ ہر وقت لگاتے تھے . . . . . خاص احباب کی خاطر و تواضع دودھ سے کیا کرتے تھے . . . . گوسائیں جی کے اشغال تفریح طبع بھی بہت ہی مختصر تھے صبح و شام دریائے راوی کی روانی آب اور تلاطم امواج کو بغور دیکھتے۔ خاص خاص احباب بھی فرصت کے وقت ملنے جایا کرتے تھے کبھی کبھی وہ اردو فارسی کے تصوفانہ اشعار پڑھا کرتے تھے۔ بعض شعرا کا کلام سنکر ان پر عالم وجد طاری ہوجاتا تھا۔ غرضیکہ یا تو گوسائیں جی پڑھتے لکھتے یا باتیں کیا کرتے تھے، جب ان امور سے فارغ ہوجاتے تو فی الفور آنکھیں بند کرکے اسم اعظم "اوم" کا ورد شروع کردیتے۔ ان کا قول تھا کہ دل سیماب وش ہے، اسے ہر لمحہ اپنے قابو میں رکھنا چاہیے ورنہ شوخیوں پر آمادہ ہوجائیگا . . . . . مناجات کے وہ ازبس قائل تھے"

کھانے پینے کے معاملے میں سوامی رام کو اعتدال پسند ہی نہیں بلکہ تپسی کہنا چاہیے، کیونکہ ان کی خوراک

"محض دودھ قرار دینی چاہیے۔ کبھی کبھی وہ دن میں کھانا بھی کھا لیا کرتے . . . . ادویات کا

---

[5] ست اپدیش۔

استعمال کرتے ان کو کبھی نہیں دیکھا گیا۔ ۔ ۔ ۔ زکام میں سوڈے کی بوتل نوش کرتے تھے، گوشت سے نفرت تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ منشیات کو وہ زہر ہلاہل سے تشبیہ دیا کرتے تھے"۔

ایک دن چند احباب نے سوامی جی سے پوچھا کہ مہاراج اس دنیاوی زندگی میں آپ کا دلی منشا کیا ہے، آیا آپ کالجوں میں طلبار کا پڑھانا پسند کرتے ہیں یا خاموشی سے مطالعہ کتاب کرنا، آپ کو تصنیف و تالیف کا شوق ہے یا اور کچھ۔ اسپر آپ نے نہایت خلوص سے فرمایا کہ:-

"یہ سلسلہ عارضی ہے، بیوی بچوں کی ضروریات کے لیے کچھ مہیا کر دینے کے بعد شب و روز تمام ملک میں ست اپدیش (وعظ حسنہ) میرا آخری مقصد ہے جس جگہ جایا کرینگے طالب علموں کو پڑھا کے کچھ دودھ کے لیے لے لیا کرینگے۔ اور ہمیں کسی شئے سے سروکار نہو گا"۔

سنیاس لینے کے بعد جب سوامی جی ہر وقت محویت کے عالم میں رہا کرتے تھے ان کے شاگردوں میں سے ایک صاحب کا بیان ہے کہ بعض وقت ان پر ایسی بیخودی طاری ہوتی کہ آبدیدہ ہو جاتے اور اسی عالم میں نہایت دردناک لہجے سے گانے لگتے۔ انکے ایک دوست سوامی ہری جی نے ایک مرتبہ ٹہری کی پہاڑیوں میں رام سے ملاقات کی وہاں کی سادہ زندگی کا کیا ہی دلچسپ نوٹوبیشن کیا ہے:-

"رام بھگوان کی کٹی۔ ۔ ۔ ۔ ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر قریب ایک فرلانگ کے میدان میں ہے۔ ۔ ۔ کٹی کی لمبائی تقریباً ۳ گز اور چوڑائی ۲ گز کی ہوگی۔ اسکے اندر رکھا کیا ہے؟ پانچ چھ چھوٹے بڑے صندوق ہیں جن میں سوائے کتابوں کے اور کچھ نہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چاروں وید، ویدانت کی مشہور کتابیں جو آجتک سنسکرت میں لکھی گئی ہیں، اور مولانا روم و شمس تبریز فارسی میں، اور امرسن اور والٹ وہٹ مین انگریزی میں۔ ۔ ۔ ۔ ایک بکس میں رام بھگوان کے ہاتھ کی لکھی کتابیں تھیں جو دو تین فلسکیپ کے ریم سے کم نہ ہونگی"

اسی دوران میں جب سوامی جی سے بات چیت شروع ہوئی تو آپ نے فرمایا "ہری جی حقیقی

لہ ست اپدیش وعظ اکہ ٹہری المورہ اور گڑھوال کی ہمسایہ ایک ریاست ہے۔

محبّت کا مخرج دل ہے، دل جامِ جم سے کم نہیں" اسکے بعد بلھا شاہ کی کافیاں نکا گُرسنانے لگے، دیسی دیسی ہوا چل رہی تھی اسوقت رام کے دل میں پریم کا سمندر اُمڈا اور رام نے ملیتے ہوئے یہ گایا:-

ہے ردکر یہ تکرار اُلفت تو تجھ سے
مرے جسم و جاں میں ہی حرکت تو تجھ سے
اُڑے ماہئی کی جو شرکت تو تجھ سے
ملے صدقہ ہونے کی عزت تو تجھ سے
سدا ایک رہنے کی لذت تو تجھ سے
رفیقوں میں گر ہے مسّرت تو تجھ سے
عزیزوں میں گر ہے محبت تو تجھ سے
خزانوں میں جو کچھ ہے دولت تو تجھ سے
امیروں میں ہی جاہ و صولت تو تجھ سے
حکیموں میں ہے علم و حکمت تو تجھ سے
ہے رونق جہاں یا ہے برکت تو تجھ سے

بعد ازاں بُلھا شاہ کی دو کافیاں جو اُنسے اپنے پیر شاہ عنایت کی مفارقت میں کہی ہیں دل چیرنے والے لہجے میں سنائی گئیں۔ ایسا آنند اُمڈا کہ ہم لوگ بے سدھ ہو گئے، اور رام جگران کو بھی گاتے گاتے یہ خیال نہ رہا کہ کیا وقت ہے اور ہم کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں[۵]"

غرض سوامی جی ہر وقت حقیقی روحانی خوشی میں مگن رہا کرتے تھے یہ وہ خوشی تھی جسکو دنیا کی کوئی شئے زائل نہیں کر سکتی۔ اگر ان کو مجسم خوشی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ دنیا کی ہر شئے سے اُن کو محبت تھی بے جان چیزوں تک سے وہ محبت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اپنی کتابوں اور قلم دوات وغیرہ کو بھی جانداروں کی طرح مخاطب کرتے۔ ان کے نزدیک نہ تو کوئی امیر تھا نہ غریب۔ جاندار اور بے جان ہر چیز کے ساتھ ان کی محبت شامل حال تھی۔ ذات پات اور چھوت چھات سے ان کو نفرت تھی۔

---

[۵] رسالہ "۱۰"

چنانچہ آپ نے ایک لکچر میں وہ لکھتے ہیں:-

"پنڈت کون ہے؟ ماہر علم و فن۔ دلمیں الفت اور صفائی رکھنے والا انسان پنڈت ہے
(مصداق) ہے۔

ڈھائی اچھر پریم کے پڑھے سو پنڈت ہوئے۔

یہ جائیکہ پنڈت وہ کہلائے جسے حضرت انسان کے سائے سے نفرت ہو۔ مسلمان کو چھونا
پاپ جانے اور عملاً پتھر ہی میں بھگوان مانے"[۱]

یہی راستی، اخلاص اور صداقت تھی جو سوامی رام کے چاروں طرف ہالہ قمر کی طرح نمودار تھے۔ سوامی جی جب بڑے بڑے ملکوں یعنی امریکہ، جاپان، مصر وغیرہ کے سفر کئے سچی محبت کی وجہ سے امریکہ والے مسافر جہاز میں سوامی جی کو اپنے ملک کا باشندہ سمجھتے، اور جاپان والے انکو جاپانی خیال کرتے تھے۔ کیلی فورنیا میں ان کو علم الٰہی کی مشعل سمجھا گیا۔ اور ریاست ہائے متحدہ کے کالجوں اور کلیساؤں میں جا کر سوامی جی نے وحدت الوجود پر مختلف لکچر دیئے۔ مصر میں اہل اسلام نے سوامی جی کا خیر مقدم کیا۔ اور قاہرہ اعظم کی جامعہ میں انھوں نے بزبان فارسی ایک لکچر دیا۔ امپیریل کالج جاپان کے سنسکرت پروفیسر نے سوامی جی کی نسبت کہا کہ:-

"اگر کوئی سچا ہندوستانی فلسفی میری نظر سے گذرا ہے تو سوامی رام ہیں"[۲]

انکے کمال محبت کی ایک دوسری مثال یہ ہے کہ سفر سے واپسی پر متھرا میں جب ان کے معتقدین اور احباب نے ایک نئی سوسائٹی "رام بھائی" کے نام سے قائم کرنا چاہا اور سوامی جی سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے آبدیدہ ہو کر نہایت درد بھرے لہجے میں فرمایا:-

"عیسائی، ہندو، مسلمان، پارسی، آریہ، سکھ، سماجی اور سب وہ جنکے رگ و ریشہ میں میری پیاری اشت دیوی بھارت بھومی کا پلا یا ہوا خون رواں ہے میرے بھائی ہیں نہیں بلکہ وہ میرے ہی جسم و جان ہیں میں ان کا ہوں وہ میرے ہیں۔ مجھے کوئی علٰحدہ نہیں ہو سکتا نہ میں کسی سے الگ کیا جا سکتا"[۳]

---

[۱] کلیات رام ص۲ ست اپدیش
[۲] و [۳] لائف اسکیچ آف سوامی رام از مسٹر پورن۔

انکی اکثر راتیں محبت کا رونا رونے میں گذر جاتی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ جب سناتن دھرم سبھا میں سوامی جی بھگتی پر لکچر دینے لگتے تو مجلس کی فضا پر ایک کیفیت بھری خاموشی طاری ہو جاتی تھی۔ باوجود صوفی منش ہونیکے فلسفہ و سائنس سے بھی سوامی جی کو دلچسپی تھی۔ مغربی و مشرقی بڑے مصنفین میں سے کوئی ایسا ہی ہوگا جسکی تصانیف کا مطالعہ اُنھوں نے نہ کیا ہو۔ قدیم ہندو فلسفیوں میں سے شنکر، کناد، کپل، جیمنی، پتنجلی، اور بیاس وغیرہ کی تصانیف کو ہر پہلو سے مطالعہ کر لیا تھا۔ مغربی فلسفیوں میں سے کینٹ، ہیگل، اسپنوزا، اسپنسر، ڈارون، ہکسلے و گیٹے کے سے ماہرین کمال سے اُن کو بخوبی واقفیت تھی۔ فارسی ادب سے اُن کو خاص دلچسپی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر تصانیف اردو زبان ہی میں ہیں۔ شعرائے عجم میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جسکے اشعار سوامی جی کو برزبان نہ یاد ہوں۔ دیوان حضرت شمس تبریز تو قریب قریب بالکل حفظ تھا۔ مثنوی خواجہ عطار وہ اکثر پڑھا کرتے تھے۔ مثنوی مولانا روم کی عزت وہ اسی طرح کرتے تھے جس طرح ایک پرہیزگار ہندو رامائن اور بھاگوت کی عزت کرتا ہے۔ اگر انکے اردو لکچروں کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان میں شعرائے عجم کے اشعار انگریزی اور ہندی اقتباسات سے کہیں زیادہ ہیں۔ مسٹر پورن[1] نے اُن کے انگریزی لکچروں کے مقدمہ میں لکھا ہے:۔

> "وہ ہمیشہ صوفیائے عجم کے ساتھ رہے۔ کیونکہ حافظ، خواجہ عطار، مولانا روم اور حضرت شمس تبریز ہر وقت انکے مطالعہ میں رہتے تھے۔ ان کے علاوہ تلسی داس، سور داس، تکارام، نانک اور چیتن وغیرہ کے خیالات سے بھی اُن کو خاص موافقت تھی اور بابا فرید، کبیر داس، حسن شاہ، حضرت بوعلی قلندر، میرن بائی اور بلھا شاہ سے بھی اسی طرح فیض حاصل کیا جاتا جس طرح امرسن، تھورو، والٹ وٹمن اور گیٹے سے[2]"

امریکہ میں سوامی جی تقریباً دو سال رہے، مگر اس اثنا میں عموماً امریکن مصنفین ہی کی تصانیف کا مطالعہ کیا گیا۔

کہا جاتا ہے کہ قدیم آرین برہم ودیا پر غور و فکر کرنا بغیر یوگ کے ممکن نہیں، یہی وجہ تھی کہ سوامی جی

---

[1] مسٹر پورن سوامی جی کے شاگرد رشید کا نام ہے زیادہ تر انھیں کی کوششوں سے سوامی جی کی تصانیف طبع ہوئی ہیں

[2] WOODS OF GOD REALIZATION

اپنشدوں اور ویدوں کے مطالعہ کے لیے لاہور کی مشغول زندگی کو خیر باد کہا اور ہمالیہ پہاڑ کی خاموش اور دلفریب فضا میں زندگی کے آخری ایام گذار دیے۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ جب رشی کیش کے نزدیک برہم پوری کے جنگل میں سوامی رام روحانیت کی آخری منزلیں طے کر رہے تھے تو ان کی مراد مل گئی اور اس فیض الٰہی کی ترجمانی خود انھیں کے دل کی آواز سے ہونے لگی ؎

توجئیں نہاں در سینے کردے بہ زیر میغے   بہ دراں تو میغ تن را کہ مہی و خوش لقائی

آخر اسی عالم بیخودی میں ایک دن سوامی جی نے قید جسم سے بیزار ہو کر کہہ دیا کہ:-

"اے موت بیشک اڑا دے میرے اس ایک جسم کو۔ میرے اور اجسام ہی مجھے کچھ کم نہیں۔ ... ... پہاڑی ندی نالوں کے بھیس میں گیت گاتا پھروں گا۔ بحر مواج کے لباس میں لہراتا پھرونگا۔ میں ہی باد خوشخرام نسیم مستانہ گام ہوں۔ میری یہ صورت سیلانی ہر وقت روانی میں رہتی ہے۔ اس روپ میں پہاڑوں سے اُترا مرجھاتے پودوں کو تازہ کیا گلوں کو ہنسایا۔ بلبل کو رُلایا۔ دروازوں کو کھٹکھٹایا۔ سوتوں کو جگایا۔ کسی کا آنسو پونچھا کسی کا گھونگھٹ اڑایا۔ اسکو چھیڑ۔ اُسکو چھیڑ۔ وہ گیا۔ وہ گیا۔ نہ کچھ ساتھ رکھا نہ کسی کے ساتھ آیا۔" اور اپنی دنیاوی زندگی کے آخری واقعہ پر اشارہ کرکے ایک دن یہ بھی فرمایا کہ:-

"اگر رام کے چرنوں میں گنگا نہ بھی تو رام کا جسم گنگا پر ضرور ہے گا[1]"

غرض گنگا ندی کی لہروں سے ہم آغوش ہو کر سوامی جی ایک دن غسل کرتے ہوئے جسم ورد ح کی پاکی کے ساتھ دارفانی کے طوفانی سمندر سے پار اُتر گئے۔ مجلہ بت اُپدیش ۲۵ر نومبر ۱۹۰۶ء نے یوں لکھا ہے کہ:-

"۱۷ر اکتوبر ۱۹۰۶ء کی تاریخ، دیوالی کے روز، شکروار کے دن، ۱۲ بجے دن کے قریب سوامی رام تیرتھ مہاراج گنگا جی میں اشنان کرنے گئے۔ ... ... چونکہ وہ اعلیٰ درجہ کے تیراک تھے اور کہا جاتا ہے کہ وہ جس طرح امریکہ میں خشکی پر سپاہیوں کے ساتھ تین میل تک لگاتار دوڑتے تھے اور سب سپاہیوں میں اول نمبر رہے تھے۔ ... ... اسی طرح سے وہ امریکہ میں بیس میل تک

---

[1] کلیات رام

ایک جگہ سمندر میں تیرے تھے اور وہاں بھی سب سے آگے نکل گئے تھے۔ ... ...

(گنگا میں اشنان کرتے ہوئے) پانی کا مقابلہ کرنا چھوڑ کر جسم کو گنگا جی کی موج پر چھوڑ دیا۔

تھوڑے فاصلے پر گنگا ایک پہاڑی گپھا میں سے گذرتی تھی جہاں اُن کا جسم پتھروں میں کئی روز تک اٹکا رہا، اور باوجود سخت تلاش کے کئی روز تک نہیں ملا۔ جب اُن کا پیارا شاگرد مسٹر پورن لاہور سے جلکر ٹہری[1] پہنچا تب گنگا جی میں گپھا کے اندر سے سوامی جی کا جسم خود بخود باہر نکل آیا۔ پھر اسکو صندوق میں بند کرکے ... ... گنگا جی میں غرق کردیا گیا۔

یہ واقعہ دیوالی سے کوئی ایک ہفتہ بعد وقوع میں آیا۔"

سوامی جی کی وفات پر ملک کے معزز اخباروں نے اظہار تعزیت کیا جن میں سے اودھ اخبار رسالہ مخزن، اندرزمانہ قابل ذکر ہیں۔ ملک کے بڑے بڑے شعرا نے مرثیے لکھے۔ چنانچہ ڈاکٹر سر اقبال نے بھی لکھے جو اس مضمون کے شروع میں درج ہیں۔ سناتن دھرم سبھا کے ایک ممبر پنڈت نبی لعل صاحب فارغ نے قطعہ تاریخ وفات بھی لکھا ہے جو حسب ذیل ہے:۔

کسقدر دنیا میں آ آ کر بنی آدم سگئے — جم گئے، حاتم گئے اور پہلوان رستم گئے

جانا اُن کا ہے کہ آوا گون[2] جنکا ست گیا — جیسے سوامی رام تیرتھ بے ملال و غم گئے

بے تکلف مصرعۂ تاریخ فارغ نے کہا — واہ واہ رام تیرتھ رام میں جا رم گئے[3]

سوامی جی کی زندگی کو تین نمایاں مدارج میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اول زمانۂ طفلی جبکہ گوسائیں رام حصول علم کی ابتدائی منزلیں طے کررہے تھے، دوم زمانۂ شباب جس میں انھوں نے اصلاح معاشرت کی طرف توجہ کرتے ہوئے ابدی راحت کی تلاش شروع کردی تھی۔ سوم وہ زمانہ جب حسن فطرت نے حسن تخیل سے ہم آہنگ ہوکر سوامی رام کو بے نیاز آرزو کردیا تھا۔ چنانچہ داستان رام تیرتھ میں مسٹر پورن نے لکھا ہے کہ اسکول لائف میں گوسائیں جی صبح چار بجے ہی سے شغل مطالعہ جاری کردیتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اسوقت تک دنیاوی مفاد کی رو میں

۱؎ ریاست ٹہری جو گڑھوال کی پہاڑیوں سے ہے۔ ۲؎ شاعر نے اپنے عقیدے کے موافق یہ شعر لکھا ہے۔ گو اس سے موافقت ہو سکے۔ ۳؎ سوامی جی ۰ کاتک سمبت ۱۹۳۰ میں پیدا ہوئے اور انھوں نے یکم کاتک سمبت ۱۹۶۳ میں وفات پائی، اس طرح وہ آٹھ دن کم ۳۳ سال زندہ رہے

انکی تعلیم سے وابستہ تھیں لیکن علم کا شوق اُنکو ہمیشہ رہا اور جوانی میں اِس شوق سے دنیاوی مفاد کی آرزوئیں بھی جدا ہو گئیں چنانچہ جب مسٹر بل پرنسپل گورنمنٹ کالج لاہور نے اُنسے پوچھا کہ آپ کالج کی پروفیسری کو سرکاری وظیفہ اور سول سروس پر کیوں ترجیح دیتے ہیں تو آبدیدہ ہو کر کہا کہ میں نے دن رات محنت کر کے علم اسلیے حاصل نہیں کیا ہے کہ اُسے بیچ ڈالوں بلکہ اسلیے کہ اُسے تقسیم کر دوں"

عالم شباب کے آخری ایام میں سوامی رام کی طبیعت حُسن فطرت میں محو ہو کر حسن مطلق کی نورانی کیفیتوں کا احساس کرنے لگی تھی۔ مسٹر اینڈریوز جو دہلی میں ایک امریکن مشنری کی حیثیت سے رہتے تھے، لکھتے ہیں کہ: "ہمیشہ سوامی رام کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ انسان کے دل کو بجائے کشیدہ کرنیکے جیت لیں، بجائے پُرعتاب تنبیہ کے تعریف کے ذریعہ سے اسکو سنوار دیں، بجائے بحث وتکرار کرنیکے اپنے روحانی کمال سے اسکو اپنی طرف کھینچ لیں"[1]

مگر شفقت و مہربانی کے یہ جذبات آنے والی کسی اور ہی حالت کا پتہ دے رہے تھے چنانچہ کامل سنیاسی ہو جانے کے بعد مسٹر پورن کے بیان کے مطابق، وہ اپنی خودی سے ایسے بیخود ہو گئے تھے کہ "پڑھنے لکھنے سے بھی اُن کو دلچسپی نہ رہی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ خاموش رہا کرتے تھے اور اِس حالت خاموشی کو۔ ۔ زندگی میں موت ۔ ۔ سے تعبیر کرتے تھے"[2]

شروع شروع میں سوامی جی کو اصلاح معاشرت کا خیال ضرور تھا اور اسی غرض سے اُنھوں نے دنیا کے تمام مہذب ملکوں کا سفر کیا۔ امریکہ گئے، جاپان گئے، مصر ہو آئے اور ان ممالک کی حالت کا مقابلہ ہندوستان سے وقتاً فوقتاً کرتے رہے، مگر اصلاح معاشرت سے ان کا مطلب کسی ایسی اصلاح سے نہ تھا جسکے پرچار میں کوئی مخصوص ذاتی مفاد پنہاں ہو، یا اِس سے مذہبی یا سیاسی پہلو نمایاں ہو۔ نہیں بلکہ وہ ہندوستان کے نوجوانوں میں ایک ایسی روح پھونکنا چاہتے تھے جو مہذب ملکوں کے نوجوانوں میں جاری و ساری تھی۔ ذیل کی سطروں میں امریکہ کی حالت کا مقابلہ ہندوستان سے سوامی جی نے کیا ہی دلچسپ پیرائے میں کیا ہے:-

"ہندوستان اور امریکہ میں کیا فرق ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہاں دن ہے تو وہاں رات ہے۔ ۔ ۔ جن دنوں ہندوستان کا ستارا بالا تھا امریکہ کو کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پوجا اور تعظیم کے

---

[1] کتاب WOOLS OF GODREALIZATION

[2] THE STORY OF SWANIRAMTIRATH

وقت یہاں جوتا اتارتے ہیں وہاں ٹوپی، یہاں گھروں میں راج مردونکا ہے وہاں عورتونکا، اِس ملک میں یہ شکایت ہے کہ بیوہ ہی بیوہ ہیں، اُس ملک میں کنواری ہی کنواری عورتیں زیادہ ہیں۔۔ ۔۔ ۔۔ ہندوستان میں گدہا، اُلّو، بیوقوفی کی علامت ہے، اُس ملک میں گدہا اور اُلّو نیکی اور عقلمندی کی نشانی ہیں، یہاں کوئی کارآمد بات معلوم ہو جائے تو اُسے چھپا رکھتے ہیں، وہاں مطبع میں چھپا دیتے ہیں، یہاں مذہب پرستی بہت زیادہ ہے وہاں تقدِ دھرم بہت ہے۔ ہمارے ہاں اس بات میں بڑائی ہے کہ اوروں سے نہ ملیں، اپنے ہی ہاتھ سے پکا کر کھائیں اور سب سے الگ رہیں، وہاں جتنا اوروں سے ملیں اُتنی ہی قدر ہے۔ یہاں پر غیر ملکوں کی زبان پڑھنا کچھ معیوب سمجھا جاتا ہے[1]، وہاں جسقدر غیر ملکوں کی زبان سے واقفیت حاصل کرو اُتنی ہی عزت ہوتی ہے، جب رام جاپان کو جارہا تھا تو جہاز پر امریکہ کا ایک عمر رسیدہ پروفیسر دوست بن گیا، وہ روسی زبان پڑھ رہا تھا، معلوم ہوا کہ ۱۱ زبانیں پہلے بھی جانتا ہے، اِس سے پوچھا گیا کہ اس عمر میں یہ نئی زبان کیوں سیکھتے ہو، جواب دیا کہ میں جیالوجی (علم طبقات الارض) کا پروفیسر ہوں۔ روسی زبان میں جیالوجی کی ایک نادر کتاب لکھی گئی ہے اگر اسکا ترجمہ کر سکوں گا تو میرے اہل ملک کو فائدہ کثیر پہونچے گا۔ اِسلئے روسی زبان پڑھتا ہوں۔ رام نے کہا اب تم موت کے قریب ہو اب کیا پڑھتے ہو اب خدا کی خدمت کرو، ترجمہ کرنے میں کیا دھرا ہے جواب دیا کہ بندوں کی خدمت خدا کی خدمت ہے[2]

سوامی جی اسی کو نقدِ دھرم کہتے ہیں بقول شاعر ؎

گذشتہ خواب و آئندہ خیال است   غنیمت داں ہمیں دم را کہ حالست

سوامی جی کو ہندوستان کے طریقۂ تعلیم سے بہت کچھ اختلاف تھا۔ ان کو امریکہ کا طریقۂ تعلیم بہت پسند تھا، کیونکہ وہاں تعلیم میں بجائے بیگار کے اخلاص برتا جاتا ہے۔ کوئی عارضی مفاد مدنظر نہیں ہوتا بلکہ حقیقی تربیت۔ ہندوستان کے طریقۂ تعلیم کی تنقید کرتے ہوئے امریکہ کے اصول تعلیم کو کیا ہی دلچسپ پیرایہ میں بیان کرتے ہیں:-

---

[1] یعنی ۱۹۰۶ء کے خیال کے مطابق [2] کچھ سوامی رام بعنوان "امریکہ کا قدرے مفصل حال"۔

"باغ جنت میں ہزاروں درخت تھے لیکن جب یہ قید لگائی گئی کہ یہ نہ کھانا تو خواہ مخواہ اسکے کھانے کی خواہش ہوئی بہت ہی مشہور سروری اشتہاروں کا اخبار میں یہ ہوتا ہے کہ اسکو مت پڑھنا" کسی شخص نے ایک فقیر سے منتر چاہا۔ مہاتما نے منتر بتلا کر کہا کہ تین مالا جپنے سے منتر سدھ ہو جائیگا، مگر شرط یہ ہے کہ خبردار مالا جپتے کہیں بندر کا خیال نہ آجائے تھوڑے عرصہ کے بعد وہ چیلا فقیر سے آکر کہنے لگا۔ پیرومرشد بندر تو میرے خواب میں بھی نہ تھا لیکن آپکے خبردار کرنے سے اب تو بندر مجھے چھوڑتا ہی نہیں۔ یہ اثر معکوس والی استادی کا ڈھنگ امریکہ میں نہیں ہے۔ بچوں کی تعلیم وہاں کنڈرگارٹن (گلستان نونہال) کے طریق پر ہوتی ہے۔ استاد بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے، ناچتے، گاتے، پڑھاتے چلے جاتے ہیں اور بچے دل لگی کے طور پر کمال حاصل کرتے ہیں[۹۱]"

ہندوستان میں ابھی تک لڑکوں کو زدوکوب کرنے کا دستور چلا آتا ہے، مگر امریکہ میں مار پیٹ کا نام تک نہیں، وہاں تنبیہ و تاکید بھی نہایت امن و سکون سے کی جاتی ہے، چنانچہ سوامی جی نے امریکہ کے ایک مدرسہ کا واقعہ یوں بیان کیا ہے[۹۲]:-

"ایک یونیورسٹی میں جو طالب علموں اور استادوں کی کمائی پر چل رہی تھی۔ طالب علم وہاں فیس وغیرہ کچھ نہیں دیتے تھے، علاوہ اور تعلیم کے پروفیسروں کے زیر اہتمام کالج کی زمین یا مشینوں پر کام کرتے تھے۔ پروفیسر اختراع و ایجاد کرتے اور ایجاد کرنا سکھاتے، زمین کے انوکھے ڈھنگ کی زرائی پیداوار اور نئی کاریگری کی آمدنی سے سب اخراجات ادا ہوتے تھے، رام کی موجودگی میں ایک کمرے میں طالب علموں کی آپس میں تکرار ہو پڑی، پریزیڈنٹ کے یہاں مقدمہ گیا۔ اس نے اس کمرے میں سب کام بند کر دیا۔ پیانو باجا بجانا شروع کیا۔ ۵ منٹ میں مقدمہ فیصل ہو گیا۔ یعنے خودبخود صلح ہو گئی۔۔۔۔۔۔ دلوں کی کھٹ پٹ آپ ہی رفع ہو گئی"

تعلیم کی تحت میں ایک بات اور قابل غور ہے وہ یہ کہ آجکل ہندوستان میں قابلیت کا اندازہ عموماً ڈگری یا سارٹیفکٹ سے کیا جاتا ہے۔ یا ایسا ہوتا ہے کہ امتحان مقابلہ کی صورت میں ایک ادنیٰ

---

۹۱ کلیات سوامی رام بعنوان "امریکہ کا قدرے مفصل حال"۔

سیدھا معیار قائم کرکے طالب علم کی قابلیت کا اندازہ کر لیتے ہیں۔ برخلاف اسکے امریکہ میں طالب علم کے میلان طبع کو دیکھتے ہیں، نیز یہ کہ اُس میں اصلاح، آراستگی اور ترمیم و تنسیخ کا مادہ کہاں تک ہے، چنانچہ سوامی جی اپنے ایک لکچر میں لکھتے ہیں کہ:-

"شکاگو یونیورسٹی کے ایک انڈر گریجوٹ نے رام کے چند (فلسفہ پر) لیکچروں کے نوٹ لیے اور تھوڑے دنوں میں اپنی طرف سے اضافہ و تقریظ کے بعد ان کی ایک کتاب بنا کر یونیورسٹی میں پیش کی۔ اس طالب علم کو ایک جماعت کی ترقی فی الفور دی گئی۔ یہ نہیں دیکھا گیا کہ آیا اس نے بل اور ہملٹن کی کتابوں سے اپنے دماغ کو لیترکوں بنایا ہے کہ نہیں۔ بیشک اصلی تعلیم کا معیار یہ ہے کہ ہم اندر سے کس قدر علم باہر نکال سکتے ہیں۔ یہ نہیں کہ باہر سے کس قدر اندر ڈال سکتے ہیں"

سوامی جی کے خیالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہندوستان کی معاشرت کے بہت زیادہ مخالف تھے۔ ہندوستان میں کسی جماعت کے معاشرتی اصول ان کی نظروں میں نہ سمائے جسکی وجہ جیسا کہ اُنھوں نے بیان کیا ہے عموماً یہ تھی کہ ہندوستان والوں میں اخلاقی انحطاط کے ساتھ ساتھ ہمت و استقلال کی بڑی کمی ہے۔ نیز یہ کہ اپنی زندگی میں وہ کوئی اعلیٰ مقصد مدنظر نہیں رکھتے۔ لیکن بقول مرزا غالب ہندوستانیوں کا یہ کہنا بھی ایک حد تک بجا ہے کہ؎

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

اسی وجہ سے ان کا دل کا شانۂ اُمید بھی نہیں ہمت و استقلال بڑھانے کے لیے سوامی جی نے لکھا ہے کہ ہر ہندوستانی کو بڑی بڑی اُمیدوں سے دل کی دنیا آباد رکھنا چاہیے کیونکہ "خواہشیں دیر سویر ضرور پوری ہونگی۔ چھوٹی خواہشیں جلدی پوری ہونگی اور بڑی خواہشوں میں دیر ہوگی" لیکن خواہشوں کو پورا کرنے کے لیے ان کے مطابق اعمال کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر آزادی کی خواہش ہے تو عمل بھی ایسا ہی ہونا چاہیے جو آزادی سے موافقت رکھتا ہو۔ اگر اخوت و اتحاد قومی کی طرف میلان طبع ہے تو برابری و ہمدردی کا خیال بھی ضروری ہے۔ اسی خیال کو مدنظر رکھ کر ایک جگہ سوامی جی نے لکھا ہے:-

"کرم کانڈ (جادۂ عمل) کے متعلق عجیب کیفیت زمانۂ حال کے ہندوستان کی ہے۔ بیج یعنی خواہشیں تو زمین دل میں بوئے بیٹھے ہیں، بیسویں صدی کی اور باتیں لگاتے ہیں، بیسویں صدی قبل مسیح

والی ... ... بیارے کھا تو لیا جال گڑنا اب جنگل جانے میں عار مانتے ہو (لینے چھوت چھات چھوڑ دو)۔[1]

اسی طرح کیا ہی دلچسپ پیرایہ میں سوامی جی نے ایک جگہ اور ذات پات کی تمیز پر اظہار خیال کیا ہے :-

"امریکہ سے آتے وقت رام جرمن جہاز پر سوار تھا ... ... دن کے وقت عموماً جہاز کی بالاترین چھت پر رام بیٹھا تھا۔ تنہائی میں پڑھتا لکھتا تھا، یا دھیان بچار میں لگ جاتا تھا، لیکن جرمن لوگ جہاز کے اوپر کی چھت پر آن کر رام کو نیچے لاتے تھے اور رام کے لکچر کراتے تھے، رام کو غیر ملک کا سمجھکر چھدیا کا فر کا سلوک تو نہ تھا۔ یہ خیال تھا کہ جتنا بھی علم اس غیر ملک والے سے مل سکتا ہے لے لیں"

سوامی جی کی یہ دلی خواہش تھی کہ ہندوستان میں اتحاد و اتفاق کی برکتیں ظاہر ہوں۔ ہر فرقہ ملک میں اسی طرح خوش و خرم ہوکر رہے جیسے کہ ایک گھرانے میں اہل خاندان خوش و خرم ہو کر رہتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے سوامی جی نے ہندو مسلم اتحاد کے حامی مغل بادشاہ یعنی اکبر اعظم کی بہت تعریف کی ہے۔ لکھتے ہیں کہ:-

"اکبر کے پاس اسکے کوکا کی کئی بار شکایت آئی۔ بار بار کی بغاوت اور کئی مرتبہ کی سازش کی خبریں اکبر نے اس کان سے سنکر اُس کان سے نکالدیں، جب ہوا خواہان دولت نے سخت گلہ کیا کہ جہاں پناہ سے اسقدر نرمی اور رعایت کیوں روا رکھی جارہی ہے تو جواب دیا کہ تم لوگ نہیں سمجھتے کہ میرے اور اُس کوکا بھائی کے درمیان دودھ کا ایک دریا بہ رہا ہے، جسکو چیرنا میرے لیئے نا ممکن ہے میں بھلا کیونکر اسے عتاب کر سکتا ہوں۔ اکبر اور اُسکے کوکا نے ایک ہی راجپوت ماں کا دودھ پیا تھا۔ کیا ہندو مسلمان ایک ہی ماں (ہندوستان) کا دودھ نہیں پی رہے ؟"[2]

نیز یہ کہ اکبر بادشاہ کا سا دل رکھنے والا انسان تو وہی ہوگا جسکی ہمدردی ہر ایک کے ساتھ یکساں ہو اسکی طبیعت میں جانب داری کی بو باس تک نہ ہو پیئے۔ وہ آدمی اکبر دل با دھا تما ہرگز نہیں ہوسکتا جسکا دل ایک محدود چھوٹے سے دائرے میں بند رہے۔ جسکی ہمدردی صرف ہندو مسلمان یا عیسائی

---

[1] ست اُپدیش مضمون کرم کانڈ [2] مضمون اکبر ولی" کلیات رام

نام سے وابستہ ہے۔ ... ... وہ تو صغر دل ہے ... ... تھا تماہیں۔[۵]

سوامی جی کے نزدیک دنیا کے مذاہب صرف مختلف پیالوں کی طرح ہیں، جن میں تلاش حق اور عشق الٰہی کا ایک ہی شربت بھرا ہوا ہے، اسی تشبیہ کو لیکر اکبر بادشاہ کی اُن دلچسپیوں کی طرف بھی سوامی جی نے اشارہ کیا ہے جن کا تعلق مذہب سے ہے لکھتے ہیں کہ:۔

"بظاہر ہندوپن، مسلمان پن، عیسائی پن وغیرہ مختلف پیالوں کی طرح ہیں جن میں پاکیزہ عشق عالمگیر کا دودھ پلانے کی کوشش وقتاً فوقتاً ہوتی رہی ہے۔ ... ... ان پرلنے پیالوں کی طرح اکبر نے بھی ایک نیا جام گڑھا ... ... یعنے دین الٰہی ... ... ہندو مسلمانوں کو شیر و شکر کر دینا اسکا مقصد تھا"[۶]

اس میں شک نہیں کہ تاریخ نے قوموں کے جذبات پر بڑا اثر کیا ہے جسکی مثال اہل فرنگ کی لکھی ہوئی تواریخ سے بہم پہونچ سکتی ہے جو عموماً اسلام اور فتوحات اسلامی کی تنقید بیجا کے سوا کچھ نہیں، یہ تنقید بیجا ہندوستانی اخوت و حریت کے لیے سم قاتل سے کم نہیں، کیونکہ اسکا مطلب تاریخ نہیں بلکہ پروپگنڈا اور پالیسی ہے۔ تاریخ کا تو اصل مطلب یہ ہی کہ عہد ماضی کی اُن معاشرتی مثالوں کو قائم رکھے جو آیندہ زمانہ کے لیے نمونۂ تقلید ہی نہیں بلکہ معیار معاشرت ثابت ہوں۔ کسی قوم کے تاریک پہلو کو نمایاں کرکے اپنی معاشرت کو چمکانا اور اپنا اقتدار قائم رکھنا علم کے ذریعہ سے تجارت ہی نہیں بلکہ قزاقی ہے۔ اسی وجہ سے سوامی جی نے لکھا ہے کہ تاریخ پر کبھی اعتبار ہی نہ کرنا چاہیے کیونکہ اس میں صداقت نہیں۔ اور اسی ضمن میں سوامی جی نے چند مشاہیر کی آرا سے اتفاق کرتے ہوے ان کے خیالات کو بطور تصدیق پیش کیا ہے مثلاً:۔

سر آرتھر ہیلپس ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"تاریخ میرے سامنے مت پڑھو، میں جانتا ہوں کہ سوائے غلط اور جھوٹ ہونے کے یہ اور کچھ نہیں ہوگی"

ہنری تھورو کا مقولہ ہے:۔

"میتھالوجی (دیاستانیات) میں زیادہ سچائی پائی جاتی ہے بہ نسبت تاریخ کے"

---

[۶] مضمون "اکبر ولی" کلیات رام

شاپن ہاور کا قول ہے :-

"تاریخ عالم کے لیے اخبارات منٹ بلکہ اکثر دفعہ سکنڈ کی سوئی کا کام دیتے ہیں، جس گھڑی کے منٹ ہی درست نہیں گھنٹے کہاں ٹھیک ہونگے"

سوامی جی کے نزدیک تو اُس شخص سے بڑھ کر کوئی مورخ نہیں جسنے اپنے دل کو بُت میں مٹا دیا ہو۔ اور جذبات کے ذریعہ سے کل دنیا کے حالات کو معلوم کرسکتا ہو خواہ وہ گذشتہ واقعات ہوں خواہ آیندہ کیونکہ:-

"چھپ کر رونیوالی ہندوستان کی عورت کی آنکھ سے ٹپکتا ہوا آنسو جو کسی نے بھی گرتے ہوئے نہیں دیکھا اُسی (قانون کشش ثقل) کا مظہر ہے جسکا کہ آسمان پر نمودار ہوا اور سب کو نظر آتا ہوا شہاب ثاقب۔ شاہی قلعوں میں اور اندھی بڑھیا کے جھونپڑے میں دلکی خواہش تو ایک جیسی ہے اور اندرونی رنج و راحت بھی ایک جیسے اور قانون کامیابی بھی ایک ہی ہے۔ اِس قانون کو جان لیں تو گویا تاریخ عالم کو جان گئے یہی تاریخ سے دلچسپی کا راز ہے"[1]

اس طرح سوامی جی نے بیسویں صدی کے اوائل میں اپنے ملک کو ریفارم کرنا چاہا مگر وہ تو ایک ریفارمر کی حیثیت سے کہیں زیادہ بلند تر ہونے والے تھے، اس لیے یہ کام اورونکے حصے میں آیا۔

یہ ظاہر ہے کہ سوامی جی مدارج طریقت میں عالم جذب ہی تک پہنچے۔ اگر کوئی رہبر کامل ہوتا تو ان کو منازل سلوک کی بلندیوں تک بھی پہنچا دیتا۔ مگر باوجود جذب و بیخودی کے سوامی جی نے جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی علمی قابلیت اور دماغی توازن کی شہادت ظاہر ہے۔ عالم جذب ہی میں اُنھوں نے سالکوں کی سی باتیں کہیں ہیں جنکا اندازہ اُنکے اُن لکچروں سے ہوسکتا ہے جو ویدانت اور توحید سے متعلق ہیں۔

یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ اسلام ہی نے اوّل اوّل صراحت کے ساتھ رمز توحید کو دنیا پر ظاہر کیا جسکا اثر ہر قوم اور ہر ملت کے افراد پر ایسا ہوا کہ آج دنیا میں غیر عقائد والے اپنے مذہب کو توحید پر مبنی ثابت کرنا فخر سمجھتے اور اِس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ دنیا کو یہ یقین دلادیں کہ توحید ہماری

---

[1] کلیات رام۔

پھیلائی ہوئی ہے یا توحید ہی پر ہمارے مذہب کی بنیاد قائم ہے۔ چنانچہ پیروان مسیح نے تثلیث کے توحید سے بدلنے کی اتنی کوشش کی کہ جو عالم کے آخری اور پُرامن مظہر یعنی (MILLENIUM) کو مظہر وحدت سے وابستہ کردیا۔ ہنود میں شنکراچاریہ نے قدیم زمانہ میں اور سوامی ویکانند نے دور حال میں فلسفۂ ویدانت پر ایسی تفسیریں لکھیں کہ ویدانت کو جو عموماً یوگ کے اصولوں اور روحانیت کے چند رسموں سے متعلق ایک فلسفہ تھا بھگتی اور تصوف سے ہم آہنگ کردیا، اور رمز توحید کی تفسیر ثابت کردیا۔

ناظرین اِس جگہ ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ وہ یہ کہ اگر ہم ویدانت کا علم حاصل کرنا چاہیں تو ہمکو لازم ہے کہ اہل ہنود کے بڑے بڑے عالموں اور فلسفیوں کی اُن تصانیف کو پڑھیں جو ویدانت سے متعلق ہیں۔ اِسی طرح اگر کسی غیر مذہب والے کو اسلام اور حقیقت اسلام سے واقفیت حاصل کرنا ہو تو اُسکو چاہیے کہ اسلام کے بڑے بڑے عالموں کی تصانیف پڑھے، اور صوفیائے کرام کے کلام سے فیض حاصل کرے، اسلام کے سچے حالات اسکو رذائل یا دیگر غیر مذہب والے علما کی تصانیف سے نہیں مل سکتے۔ کیا ہم ہندو معاشرت کو سچے جذبات وخیالات کے اعتبار سے مس میو کی "مدر انڈیا" سے معلوم کرسکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہم کو تو ہنود کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اِسی طرح اسلام سے اگر واقفیت حاصل کرنا ہے تو اُن تصانیف کو دیکھنا ایک قسم کا ظلم ہوگا۔ جن کا مقصد محض پروپگنڈا ہو۔ چنانچہ سوامی رام تیرتھ نے اسلام کو پہچاننے کے لیے صوفیائے کرام کی تصانیف کو پڑھا اور وہ فیض حاصل کیا جسکی بدولت وہ آغوش محبت میں ہمیشہ کے لیے محبت ہو کر متمکن ہوگئے۔ محبت جس نے اِن کو عالم لاہوت کی جھلک دکھلادی۔ خود سوامی رام تیرتھ کی مندرجہ ذیل سطور سے ظاہر ہوگا کہ انھوں نے ہر ملت کی تحقیق اس مخصوص ملت کے علما کی تصانیف سے کی ہے، چنانچہ لکھتے ہیں کہ:-

"سنسکرت میں ویدانت کے از حد مستانہ نسخے ہیں۔ دتاتریہ کی اجدوت گیتا، اشٹاوکر گیتا۔ شنکراچاریہ کے استوتر یا بعض حصے یوگ باشٹھ کے، فارسی میں سب سے بڑھ کر توحید میں کلام حضرت شمس تبریز کا ہے۔ مثنوی مولانا روم اِس سے اُتر کر مثنوی شریف شیخ عطار اور مغربی وغیرہ امریکہ میں والٹ وہٹمن کے اوراق گیاہ۔"

Vivekananda

برخلاف اسکے ہندوؤں کے ایک اور عالم یعنے سوامی ویویکانند ہیں جن کا مقابلہ اسوقت سوامی رام تیرتھ سے خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ کیونکہ سوامی ویویکانند مذہب اسلام کو مسیحی تصانیف کی عینک سے دیکھتے ہیں سبکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں کہیں وہ اسلام پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں اسکے جہل و لاعلمی کا اظہار ہوجاتا ہے، چنانچہ براق کو وہ "براک" لکھتے ہیں اور لفظ "محمدؐ" کا تلفظ تک صحیح نہیں معلوم ہے برخلاف اسکے سوامی رام تیرتھ نے جہاں کہیں اسلام پر اپنی رائے ظاہر کی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا کسی مخلص مسلمان کے لکھے ہوئے الفاظ ہیں۔ چنانچہ ہمت و استقلال کی مثالیں پیش کرتے ہوئے سوامی رام تیرتھ لکھتے ہیں کہ:۔

"اگر تمہارے دل میں یقین اور راستی گھری ہے تو تمہاری نگاہیں لوہے کے ستون چیر سکتی ہیں۔ تمہارے خیال کی قوت سے پہاڑ چکنا چور ہو سکتے ہیں سب سے پہلے مسلمان حضرت محمدؐ کا قول ہے کہ "اگر میرے دائیں طرف سورج کھڑا ہو جائے اور بائیں طرف چاند اور دونوں مجھکو دھمکا کر کہیں کر چل ہٹ پیچھے تو بھی کبھی میں نہیں ہٹ سکتا"[۱]

ان سطروں کے مقابلہ میں ذرا سوامی ویویکانند کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

"محمد (صلعم) نے یہ دعوی کیا تھا کہ ایک دن فرشتہ جبرئیل میرے پاس ایک "غار" میں آیا اور ایک آسمانی گھوڑے یعنی "براک" پر آسمان لیگیا۔ ... ... اس میں شک نہیں کہ اس آدمی (یعنے محمد صلعم) کو وحی ضرور آتی تھی۔ اگر تم قرآن (شریف) پڑھو تو اس میں حیرت ڈالدینے والی سچائیاں ملیں گی۔ مگر وہ محمد (صلعم) تربیت یافتہ یوگی نہ تھا۔ اسکو یہ معلوم تما کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں اسکا کیا سبب ہے[۲]۔ ... ... "

اس عبارت کی معنوی غلطیاں ظاہر کرنا یا لکھنے والے کی لاعلمی و ناواقفیت پر کچھ کہنا بالکل بیسود ہے کیونکہ بقول سوامی رام تیرتھ "سبکا دل ایک محدود چھوٹے سے دائرے میں بند ہے" اس میں وسعت خیال کہاں۔ سوامی رام تیرتھ نے جہاں کہیں پیغمبر اسلام پر اظہار خیال کیا ہے وہ ایسے دل سے کیا ہے جو کسی جوشیلے مسلمان کے دل سے بالکل ہم آہنگ ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

---

[۱] کلیات رام حصہ ۲ [۲] ملاحظہ ہو راج یوگ صفحہ ۴۰ مطبوعہ اُدبودھن پریس کلکتہ سنہ ۱۹۰۱ء

"کیا تو نجر عرب کا ایک ان پڑھ یتیم جنگلوں میں رہنے والا جسکے دل میں شعلۂ اسلام بھڑک اُٹھا یقین کی آگ جاگ اٹھی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یعنی نہیں ہے کچھ بھی سوائے اللہ کے، ریگستان عرب کے بیجان ذرے اس آگ نے بارود کے دانے بنا دیے..... جو آسمان تک پہنچی اُچھلتی تھوڑے ہی دنوں میں ایشیا کے اس سرے سے یورپ اور افریقہ کے پرلے سرے تک پھیل گئی مشرق و مغرب کو احاطہ کر لیا۔ دہلی سے تنجر تک کو گھیر لیا۔ آہ، ایک دل، غریب دل، بادشاہ کا نہیں، عالم کا نہیں، ایک اُمّی یتیم کا۔"[۱]

اور یہ انکے سچے سوامی ہونے کا کامل ثبوت ہے۔

اس تجلی مقابلہ سے ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ اگر ہنود کے فلسفے اور ہنود کے سچے جذبات کا اندازہ کرنا ہو تو ایسی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے جو سوامی رام تیرتھ ایسے عارف کامل کے قلم سے لکھی گئی ہوں۔ آئیے ذیل میں ہم سوامی جی کے فلسفہ پر بھی ایک سرسری نظر ڈال لیں انکا فلسفہ جو فلسفۂ ویدانت کی جان اور مسئلہ جبر و اختیار کی تفسیر ہے۔ فلسفۂ تصوف سے ملتا جلتا ہے، لیکن پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ ویدانت سے کیا مطلب ہے آیا یہ "ہمہ اوست" کا دوسرا نام ہے یا کچھ فرق ہے۔

فلاسفۂ ہنود میں پتنجلی کی تصانیف میں ویدانت کے معنی ہمہ اوست ہی کے لیے گئے ہیں شنکر اچاریہ کی تفسیروں سے بھی یہی مفہوم ظاہر ہے۔ چنانچہ پتنجلی پر جو تفسیر لکھی گئی ہے اس میں ایک جگہ دوسرے الفاظ میں یہ بھی لکھا ہے کہ "ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف پلٹ جاتا ہے۔" وہ عبارت یہ ہے:-

"ہمارا وجود ایک سبب مطلق سے ہے جو ہمارے موجودہ وجود یعنی رشتہ و مناسبت رکھنے والے وجود سے پیچھے رہ گیا۔ ہم آگے بڑھ رہے ہیں تاکہ پھر اُسی سبب مطلق میں مل جائیں۔"[۲]

مگر کیا یہ رشتہ و مناسبت رکھنے والا وجود سبب مطلق سے بالکل علیحدہ ہے؟ کیا پابندی آب و گل اور امتیاز رنگ و بو کے باوجود کائنات کے ذرہ ذرہ اور جسم انسانی کے رگ و ریشہ پر اس سبب مطلق کا اثر نہیں؟ اگر ایسا ہے تو ہمہ اوست کے کوئی معنی ہی نہیں۔ مگر دراصل ایسا نہیں برہم آتما کی وہ قوت جسکو آتما شکتی کہا گیا ہے ہر جگہ جاری و ساری ہے، اسکی تفسیر سوامی رام تیرتھ نے ایک

---

[۲] کلیات راما دست ایڈیشن ۵۲ راج یوگ۔ مصنفہ سوامی ویکانند۔

مکالمہ میں نہایت خوبصورتی سے بیان کی ہے جسکو باوجود طویل ہونیکے ذیل میں مختصر کرکے لکھا جاتا ہے:-

"ایک مرتبہ ریاست ہائے الموڑہ کے ایک راجہ کا لڑکا پہاڑوں میں رام سے ملنے آیا اور پوچھا سوامی، سوامی، خدا کہاں ہے؟ سوامی نے کہا۔ شہزادے یہ وہ سوال ہے جسکی تحقیق ابتدائے تخلیق سے آجتک دنیا کے تمام مذاہب اور تمام علماء و فلاسفہ کرتے رہے ہیں تم اسکا جواب چند منٹ میں چاہتے ہو؟ لڑکے نے کہا۔ ہاں سوامی۔ تو پھر میں اور کس سے پوچھوں۔ سوامی بولے۔ پیارے شہزادے تم خدا سے ملنا چاہتے ہو لیکن کیا تم نہیں جانتے کہ بڑے لوگوں سے ملنے کے لیے پہلے کارڈ پر اپنا نام اور پتہ لکھ کر اپنی اطلاع کیجاتی ہے۔ تم خدا سے ملنا چاہتے ہو لہذا چاہیے کہ ایک کارڈ پر اپنا نام و نشان لکھ کر اسے مطلع کرو کہ تم کون ہو کہاں سے آئے ہو۔ میں اس کارڈ کو اسکے پاس لیجاؤنگا۔ شہزادہ نے اپنا نام و پتہ اور جائے قیام وغیرہ لکھ کر کارڈ سوامی جی کو دیا۔ اور سوامی نے یہ کہکر واپس کر دیا کہ شہزادے تم کو یہ تو معلوم نہیں کہ تم کون ہو۔ نہ تم نے اپنا اصل نام لکھا خدا تم سے کیونکر ملیگا۔ لڑکے نے غور کرنا شروع کیا۔ اسکے بعد سوامی جی نے پوچھا۔ شہزادے یہ کارڈ کسکا ہے۔ لڑکے نے کہا میرا، سوامی نے کہا کارڈ تمھارا ہے۔ اچھا یہ ہاتھ (شہزادے کا ہاتھ پکڑ کے) کسکا ہے۔ شہزادہ بولا میرا ہے۔ سوامی نے کہا بالکل ٹھیک کارڈ بھی تمھارا ہے، ہاتھ بھی تمھارا۔ خود تم کارڈ یا ہاتھ نہیں۔ بعد ازاں شہزادے کے جسم کی طرف اشارہ کرکے کہا اچھا یہ جسم کس کا ہے۔ لڑکے نے کہا میرا۔ سوامی نے کہا تو پھر تم جسم نہیں۔ بھلا شہزادے تم نے یہ کارڈ میں اپنے جسم کا پتہ نشان کیوں لکھا۔ تم نہ ہاتھ ہو نہ پیر۔ نہ سر ہو نہ جسم، جو کچھ تم واقعی ہو وہ لکھو۔ اب شہزادے نے پھر خیال کرنا شروع کیا اور کہا۔ اچھا تو میں دماغ ہوں۔ خیال کے سوا میں کیا ہو سکتا ہوں۔ اسکے بعد سوامی جی نے پوچھا شہزادے کیا تم بتا سکتے ہو کہ تمھارے جسم کی کتنی ہڈیاں ہیں۔ کتنی رگیں ہیں اور تمھارا کھانا جو آج تم نے کھایا ہے کس طرح ہضم ہوتا ہے۔ شہزادے نے کہا سوامی میں نے علم تشریح البدن نہیں پڑھا۔ میرا دماغ ان باتوں کا اندازہ نہیں کر سکتا۔ سوامی نے کہا تم خود کہتے ہو کہ میرا دماغ، میرا خیال! اور اس طرح تم اقبال کرتے ہو کہ دماغ اور خیال تمھارے ہیں تم دماغ اور خیال نہیں پھر غور کرو تم کیا ہو۔ ٹھیک ٹھیک اپنا نام بتاؤ۔ شہزادہ گھبرا گیا اور کہا۔ سوامی

میرا خیال وہاں تک نہیں پہونچ سکتا۔ میرا دماغ کام نہیں کرتا۔

اہا۔ کیا ہی سچے الفاظ ہیں۔ بیشک خدا عقل و سمجھ اور خیال وغیرہ سے پرے ہے۔ اُس تک کسی کا خیال نہیں پہونچ سکتا۔ اِن الفاظ کے بعد سوامی نے شہزادہ سے کہا۔ اچھا بیٹھ جاؤ اور خیال کرو کہ تم نہ جسم ہو، نہ دماغ ہو، نہ خیال ہو، اتنی سچائی کا معلوم کر لینا اور اس کا یقین کر لینا ہی تمھارے لیے خوشی و مسرّت کا باعث ہوگا۔ تم کو افکار سے نجات حاصل ہوگی۔ اسکے بعد لڑکے سے پوچھا گیا۔ شہزادے تم نے آج کیا کیا۔ آج صبح سے ابتک تم نے کون کون سے کام کیے۔ اسکے جواب میں شہزادے نے مختلف کام تبلائے کہ میں سو کر اُٹھا، غسل کیا۔ یہ کیا وہ کیا، ناشتہ کیا، پڑہا، چند خطوط لکھے، دوستوں سے ملاقات کی۔ اور بعد ازاں سوامی کے درشن کو آیا۔ سوامی نے کہا بس یہی کام تم نے کیے اور دوسرے بہت سے کام نہیں کیے خیال کرو تم نے اور بہت کچھ کیا ہے۔ اِن الفاظ کو سنکر شہزادہ کو بہت تعجب ہوا اور کہا کہ نہیں سوامی میں نے سوا اِن کاموں کے اور کچھ نہیں کیا۔ سوامی نے پوچھا۔ شہزادے سوامی کی طرف اِسوقت کون دیکھ رہا ہے۔ لڑکا بولا "میں" سوامی نے کہا تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ تم سامنے بہتی ہوئی گنگا کو دیکھ رہے ہو، تم ہمالیہ پہاڑوں کی دلفریب سینری کو دیکھ رہے ہو، مگر یہ تو تبلاؤ کہ یہ چیزیں دکھلانے کے لیے تمھاری آنکھ کی پتلیوں کو اِدہر اُدہر کون حرکت دیتا ہے؟ لڑکے نے کہا میں ہی حرکت دیتا ہوں۔ سوامی نے کہا اِسوقت کون بول رہا ہے۔ شہزادے نے کہا "میں" پھر سوامی نے کہا شہزادے تم نے صبح کھانا کھایا۔ کس نے اسکو ہضم کیا۔ کس نے خون بنایا۔ کس نے اسکو جسم کے رگ و ریشے میں تقسیم کیا۔ شہزادے ذرا غور کرو اِس کھانے کو جو تم نے کھایا کس نے تمھارے جسم کی صورت میں تبدیل کر دیا۔ کیا تمھارے سوا کوئی اور ہے۔ کھانا تم کھاتے ہو، ہضم تم کرتے ہو۔ سانس تم لیتے ہو۔ خون تم بناتے ہو۔ جسم کی نشو و نما کا ذریعہ تم ہو۔ تم ہر وقت اتنے کام کرتے ہو۔ کیا یہ کام کسی اور کے ہیں۔ شہزادے نے کہا فی الحقیقت سوامی جی میں یہ سب کام کرتا ہوں جن کو دماغ میں خیال بھی نہیں کرتا۔ اسکے بعد سوامی جی نے کہا شہزادے تمھارے جسم میں دو طرح کے افعال واقع ہوتے رہتے ہیں ایک وہ جو دماغ کے ذریعے سے ہوتے ہیں جو افعال بالارادہ ہیں، دوسرے وہ جو بغیر کسی ارادہ کے

ہوتے رہتے ہیں۔ مثلاً سانس لینا، خون کا رگوں میں دوڑنا، بالوں کا بڑھنا وغیرہ۔ اول الذکر
کو خیال سے تعلق ہے، موخر الذکر کا خیال نہیں کیا جاتا۔ ان خیال نہ کی ہوئی باتوں کی نسبت
بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ سب "فطرۃ" کے ماتحت ہیں۔ میں کھاتا ہوں فطرۃ ہضم کر دیتی ہے۔
میں دیکھتا ہوں فطرۃ بصارت کا ذریعہ ہے، میں سنتا ہوں فطرۃ اعصاب سماعت کو متحرک
کرتی ہے۔ مگر اس طرح "میں" اور فطرۃ دو قوتیں ہیں۔ لیکن دراصل یہ بات نہیں۔ غور کرو تم ہی
کھاتے ہو، تم ہی کھانے کو تحلیل کرتے ہو، تم ہی دیکھتے ہو، تم ہی آنکھوں کی پتلیوں کو دیکھنے
کے لیے پھراتے ہو۔ تم ہی فطرۃ ہو۔ تم وہی لا انتہا ہستی ہو جسکو ہی لاہوت کہا گیا ہے۔ ابھی
نہیں سمجھے۔ اچھا بتاؤ جب تم سو جاتے ہو تم مردہ ہوتے ہو یا زندہ، شہزادہ نے کہا میں زندہ
رہتا ہوں۔ سوامی نے کہا اچھا بتلاؤ تمہارا دماغ کیا کرتا ہے، تم یہ کہو گے کہ خواب دیکھتا ہے۔ لیکن
بعض وقت ایسی نیند بھی آتی ہے جس میں خواب نہ دکھائی دیں اور جسکو گہری نیند کہا جاتا ہے اسوقت
دماغ کیا ہوتا ہے۔ شہزادے نے کہا اسوقت دماغ کو معدوم کہنا چاہیے۔ سوامی نے کہا
اچھا یہ بتلاؤ کہ گہری نیند میں خود تم تو موجود ہوتے ہو گو ذہنی اور دماغی قوتیں اچکن اور کوٹ کی
طرح اتار کر کھونٹی پر ٹانگ دی جاتی ہیں اور ان میں کوئی جان باقی نہیں رہتی۔ لیکن جب تم
بیدار ہوتے ہو تو یہی کہتے ہو کہ آج میں خوب سویا۔ آج رات بھر میں نے خواب تک نہیں دیکھے
تو گویا تم نے اپنی اس حالت کو بیان کیا جب تم خوب سوئے۔ تم نے نہ دریا دیکھے نہ پہاڑ۔ اس حالت
میں نہ ماں تھی نہ باپ، نہ گھر نہ خاندان۔ کچھ نہ تھا۔ تو پھر کیا تھا۔ شہزادے نے کہا کچھ نہ تھا۔ کوئی
نہ تھا۔ سوامی نے کہا شہزادے تمہاری حالت تو اس گواہ کی طرح ہے جس نے عدالت کے
سامنے کہا کہ "آدھی رات کے وقت فلاں فلاں مقام پر کوئی انسان نہ تھا" عدالت نے یہ
الفاظ لکھ لیے اور گواہ کے دستخط لیکر پوچھا مسمی فلاں۔ تم کہتے ہو کہ آدھی رات کے وقت فلاں
مقام پر کوئی انسان نہ تھا۔ کیا تم نے کسی سے سنا ہے یا اپنا چشم دید واقعہ بیان کر رہے ہو۔ گواہ
بولا "جناب یہ میرا چشم دید واقعہ ہے کوئی انسان نہ تھا" عدالت نے کہا اچھا اگر کوئی انسان نہ تھا
اور تم چشم دید واقعہ بیان کر رہے ہو تو بتلاؤ کہ تم خود کیا ہو۔ آیا تم انسان ہو یا نہیں، اس پر گواہ نے
کہا "میں انسان ہوں" عدالت نے کہا اگر تمہارا بیان تمہارے نزدیک صحیح ہے تو ہمارے نزدیک

اسکو غلط ہونا چاہیے، کیونکہ تم جو انسان ہو موجود تھے۔ اسی طرح شہزادے جب تم گہری نیند سے بیدار ہوے اور تم نے کہا کہ اسوقت کچھ نہ تھا تو بھلا تمہارے تنفس کا ذریعہ کون ہوا۔ غذا کو کس نے تحلیل کیا۔ کس نے تمہاری رگوں میں خون دوڑایا۔ کس نے تمہارے جسم کو بڑھایا۔ معلوم تو یہ ہوتا ہے کہ خود تم نے یہ سب کچھ کیا۔ تم موجود تھے۔ لہذا تم کوئی ایسی چیز ہو جسکو کبھی نیند نہیں آتی۔ تمہارا دماغ سوتا ہے تم نہیں سوتے۔ تم جسم و اسم اور دماغ و خیال سے پرے ہو۔ شہزادہ نے کہا سوامی جی میں سمجھا تو سمجھ گیا کہ میں کوئی لامتناہی قوت ہوں جسکو نہ تو نیند آتی ہے نہ تغیر و تبدل ہے۔ جسم و دماغ کو تغیر و تبدل ممکن ہے مگر اس الٰہی قوت کو تغیر نہیں جو در اصل میں ہوں۔ جسم کو زوال ہے لیکن مجھے جو الٰہی قوت ہوں زوال نہیں۔ سوامی نے کہا شہزادے اگر تم وہی الٰہی قوت ہو جو تمام کائنات کو قابو میں کیے ہوے ہے۔ جو ہر جگہ موجود ہے تو پھر در اصل تم کیا ہو؟ شہزادہ بہت متحیر ہوا اور کہا سوامی جی بیشک میں خدا کو جاننا چاہتا تھا۔ اب مجھے معلوم ہو گیا کہ خدا کیا ہے۔ واقعی خدا کو جاننے سے پہلے مجھے اپنی خبر ہونا ضروری تھی۔[۱][۲]

یہی وہ اظہر من الشمس حقیقت ہے جس پر فلسفہ ویدانت کی بنیاد قائم ہے۔ اور جو اس آیۂ پاک کی تفسیر ہے کہ:- قُلْ إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ۔

لیکن یہاں چند ایسے مشکل سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا تعلق مسئلہ جبر و اختیار سے ہے۔ ان سب کا جواب سوامی رام تیرتھ نے فلسفۂ ویدانت کے ماتحت ذیل کے اقتباسات میں یوں دیا ہے:-

"یہ خیال کہ ایشور سب کچھ کرتا ہے یا پرماتما سے سب کچھ ہوتا ہے در اصل ایک خیال ہے۔ ویدانت تو اُن تمام لوگوں کی خدمت میں جو یہ کہتے کہ ایشور سب کچھ کرتا ہے یہ کہتا ہے کہ پہلے صرف اتنا بتاؤ کہ آپ ایشور کا سروپ کیا مانتے ہیں۔ آیا وہ نراکار یعنے بے صورت ہے، یا ساکار با صورت آیا وہ فاعل "یعنے کرتا ہے"، یا محض "درشٹا"، وہ با تعلق یعنے سنگ وان ہے یا بے تعلق یعنی اسنگ۔۔۔۔

---

[۱] ترجمہ از کتاب IN WOODS OF GOD REALIZATION

[۲] اس عبارت کو پڑھ کر غالب کے اس شعر کا مطلب بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

لوگ کہتے ہیں کہ نپولین نے اپنی ہمت سے یورپ میں تہلکہ ڈالدیا۔ لیکن اگر غور سے اس کی سوانح عمری پڑھیں تو ضرور یہ بات پائیں گے کہ جبوقت نپولین کامیابی حاصل کر رہا تھا اُسوقت اسکے دل میں کبھی یہ خیال پیدا نہ ہوا تھا کہ میں کام کر رہا ہوں بلکہ جبوقت جوشِ مستی میں بیخبر ہوکر لڑتا تھا اسوقت کامیابی حاصل ہوتی تھی جب خودی کو ساتھ لیکر لڑا ہے اسوقت شکست کھائی اور قید ہوا۔ کیونکہ قانون قدرت یہ ہے کہ جہاں خودی ہوتی ہے وہاں کامیابی کبھی نہیں ہوتی......جب کام کرتے وقت آدمی کے اندر سے خودی دور ہو جاتی ہے تو اسکے اندر وہ طاقت یا شکتی کام کرتی ہے جو اہنکار یعنی انانیت سے دور ہے۔ اس شکتی کو جو خود غرضی اور اہنکار سے پرے ہے ویدانت میں خدا کہتے ہیں۔ پس کامیابی حاصل کرتے وقت صرف خدا ہی کام کرتا ہے اگرچہ اسوقت کامیابی حاصل کرتا ہوا نپولین دکھلائی دے۔ اور کامیابی اسکے نام سے نامزد ہو جاتی ہے۔......جیسے سمندر کا حصہ جب بنگال کے نیچے ہوتا ہے تو اس کا نام خلیج بنگال ہوتا ہے اور جب عرب کے نیچے ہے تو بحیرۂ عرب کہلاتا ہے۔......مگر اصل میں ایک سمندر کے ہی نام بوجہ مختلف مقامات کے مختلف پڑجاتے ہیں، اسی طرح ایک سرودیاپی شکتی (سب پر محیط قوت) جسم کے ذریعہ سے کام کرتی ہے تو ہمت کہلاتی ہے اور دماغ کے ذریعہ سے کام کرتی ہے تو علم...... لہذا لوگوں کا یہ کہنا کہ نپولین نے فتح پائی بالکل بے معنی ہے اور فتح ہونے کی حقیقت کو نہ جاننا ثابت کرتا ہے۔

اب اُن اصحاب کو لیجیے جو کہتے ہیں کہ تمام کام ایشور کی مرضی سے ہوتے ہیں۔ آدمی میں دو طاقتیں موجود ہیں۔ ایک آزاد خود مختار یعنی کرم کرنے کی طاقت دوسری مقید یا پابند۔ مطلب یہ ہے کہ قسمت خود مختار نہیں ہے۔......جیسے ریشم کے کیڑے کا حال ہے کہ جب تک اُس نے اپنے اندر سے ریشم نہیں نکالا ہے وہ آزاد ہے اور اسوقت تک وہ خود مختار کہا جاسکتا ہے مگر جب ریشم نکال چکتا ہے تو پھنس جاتا ہے یعنی قیدی کہلاتا ہے۔ اسی طرح جو کرم آدمی سے ہو چکتا ہے اسکے رو سے وہ اسکے پھل بھوگنے کا پابند ہے[۱] یا قید ہے، مگر جو کرم کہ ابھی تک کیا ہی نہیں ہے اسکی رو سے وہ آزاد ہے اور اسکے کرنے نہ کرنے کا اختیار رکھنے کے سبب سے خود مختار

---

[۱] لیکن اہل اسلام کے نزدیک توبہ کرنے، اور صدق دل اور ندامت و استغفار کرنے سے تقصیر معاف ہوسکتی ہے۔

کہا جا سکتا ہے ...... وہ شخص جسکے دل سے سب خواہشیں دور ہوگئی ہوں اسکا کوئی دوسرا جنم نہیں ہوتا۔ ایسے ہی آدمی رشی منی ہوتے ہیں ...... غرض آدمی اپنی قسمت اپنے ہاتھوں بناتا ہے۔ ہربرٹ اسپنسر صاحب فرماتے ہیں کہ ملکی حالات ہی خود اپنے مطابق آدمی پیدا کرلیا کرتے ہیں، چنانچہ جب غور سے حالت مجموعی پر نظر ڈالی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ نپولین بوناپارٹ جو بہئیت جزوی خود مختار ہے سے کام کرتا نظر آتا تھا اسکی ایسے وقت میں، ایسے زمانے میں آنے کی ٹھیک ضرورت تھی ..... جیسے ہر ایک چیز میں قوت برق مثبت و منفی اکٹھی ہوتی ہے اسی طرح وہ قانون بھی ہے جو اگر ادھر خواہش مندوں کو پیدا کرتا ہے تو ادھر انکی خواہشوں کو پورا کرنے والا بھی پیدا کرتا ہے اس طرح دونوں پلڑے برابر تُلے رہتے ہیں ...... غرض آتما جو آپکے اندر سارے کا سارا موجود ہے۔ انسان اسکے لحاظ سے آزاد ہے، اور شریر (جسم) کے لحاظ سے بالکل مقید ہے[1]"

اور انھیں سب باتوں کو مد نظر رکھ کر سوامی جی اپنے کیفیت بھرے انداز سے انسان کو مخاطب کرکے لکھتے ہیں کہ:-

"اے دریائے وحدت کی موج کے بلبلے، اہل نشاط کے قہقہے میں، بلبل کے چہچہے میں، نعرۂ کارزار میں، نالۂ دلفگار میں ...... کیا بازار کیا گلزار، کیا کچکول گدائی، اور کیا تاج شاہی سب تیرے دربار میں بار پانے کو ترستے ہیں ؎

نیست غیر از ہستی تو در جہاں موجود ہیچ	خواہ در انکار کوش و خواہ در اقرار باش

تیری روپی کرنیں روزن دیدہ سے نکلکر ایوان گوناگون کو وجود میں لاتی ہیں۔ تیری شعور کی شعائیں کانوں سے نکلکر میٹھے اور کرخت آوازوں کو موجود کرتی ہیں۔ اے پشت پناہ صغیر و کبیر تیرے بھروسے دلیر ہوکر صبا کو اٹھکھیلیاں سوجھتی ہیں ؎

جلوہ گاہ رخ تو دیدۂ من تنہا نیست	ماہ و خورشید ہمیں آئینہ می گردانند[1]"

لیکن ان باتوں سے تو اب بھی بہت لوگوں کو واقفیت ہے، مگر سوامی جی کی طرح سب متوالے کہاں

---

[1] کلیات رام۔

نہیں ہو جاتے؟ اسکے جواب میں ہم یہی کہیں گے کہ نحن اقرب من حبل الورید کے مفہوم سے آگاہ ہو جانا ہی انسان کو عارف کامل نہیں بنا سکتا۔ بلکہ اس آیۂ پاک کی ظاہر کی ہوئی حقیقت میں جبتک محویت نہو گی نجات نہیں۔ اور اس محویت کا ذریعہ محبت ہے اور محبت اسی وقت ممکن ہے جب بیغرضانہ فعال کی حقیقی خاصیت سے اور بے نیاز آرزو ہونے کی ماہیت سے انسان واقف ہو، اور اس واقفیت کے تقاضے پر تمام دنیا اسکو اپنی جان کی طرح پیاری معلوم ہو۔ بے نیاز آرزو ہونا کیا ہے: اس حلقۂ دام خیال» سے وابستہ تمام آرزؤں اور خواہشوں سے برگشتہ ہونا اور برگشتہ ہو کر خود سب کی حقیقی خواہش بن جانا۔ اگر یہ ممکن ہو جائے تو ساز "انا البحر" پر نغمہ سرائی کرنے والا قطرہ اس سمندر میں مل جائیگا جس میں بقول سوامی رام تیرتھ کے "ہر طرف آنند موجزن ہے اور سکھ کی لہریں لہرا رہی ہیں" محبت کیا ہے؟ غیریت سے نجات، غیریت کیا ہے ترببیت نجات، جہاں غیریت ہے وہاں "ایک دوسرے کو دیکھتا ہے۔ ایک دوسرے کو سنتا ہے، ایک دوسرے کا ذکر کرتا ہے لیکن جہاں سب کچھ ایک ہی آتما ہے وہاں کس کو کس سے دیکھے، کسکو کس سے سنے، کس کا کس سے ذکر کرے .... وہ عین العلم بھلا کس سے جانا جا سکتا ہے"۔

اگر ویدانت اور تصوف میں کچھ فرق ہے تو صرف یہ کہ ویدانت نے محض ہمہ اوست پر زور دیا ہے اور یوگ کے ذریعہ سے حصول راحت کا طریقہ تبلایا ہے[1] برخلاف اسکے تصوف نے یوگ یعنی ریاضت کے ساتھ ساتھ منازل محبت بھی قائم کیے ہیں اور محبت ہی کو عیش دوامی کا ذریعہ تبلایا ہے۔ چنانچہ ہمہ اوست کے ساتھ محبت کا تعلق قائم کرنا ہی روحانی فلسفہ میں ایک قسم کے انقلاب کا باعث ہوا، کیونکہ بارھویں صدی عیسوی میں تصوف کے اثر سے ویدانت کو مجبوراً بھگتی کی صورت میں تبدیل ہونا پڑا، اور بھگتی کا پرچار اسی طرح ہوا جس طرح آجکل بادشاہ پرستی یا راج بھگتی کے شیدائیوں میں آزادی کا پرچار ہو رہا ہے۔ غرض ویدانت اور تصوف میں کوئی فرق نہیں بجز اسکے کہ تصوف نے محبت پر زیادہ زور دیا ہے

× × ×　× × ×　× × ×　× × ×　× × ×　× × ×　× × ×　× × ×

چونکہ سوامی رام تیرتھ کو کئی زبانوں پر عبور حاصل تھا، لیکن زیادہ تر اردو زبان ہی میں انھوں نے مواعظ بیان فرمائے، لہذا اردو لٹریچر کا ایک یہ بھی فرض ہے کہ انکے ان اقتباسات میں جو فلسفہ سے متعلق ہیں

---

[1] کرم یوگ، مصنفہ سوامی ویکانند۔

چند اشعار بھی نہایت قدر و احترام کے ساتھ شامل کر کے جو اُردو میں لکھے گئے۔ گو سوامی جی کی تصانیف ہیں انگریزی میں THE WOODS OF GODREALIZATION (جو لکچروں کا مجموعہ ہی) ہندی میں "رام تیرتھ گرنتھ والی" (جو نظموں کا مجموعہ ہی) "سری مد بھگوت گیتا" (جو گیتا کا ترجمہ ہی) اور "ویدان بچن" (جو فلسفہ ویدانت پر ایک کتاب ہی) نہایت قابل قدر کتابیں ہیں لیکن اردو داں پبلک کے لیے بھی اور زبانوں سے کہیں زیادہ ذخائر چھوڑے ہیں چنانچہ مشہور تصانیف میں "کلیات رام" (لکچروں کا مجموعہ) "رام تیر" (خطوط کا مجموعہ) اور "رام درشن" (نظموں کا مجموعہ) ہیں اسلیے لازم ہی کہ تحریری نقطۂ خیال سے بھی سوامی جی پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔

بہ حیثیت ایک شاعر کے بھی سوامی جی کو اچھا خاصا صوفی سمجھنا چاہیے کیونکہ ان کا کلام صوفیائے کرام کے کلام کی یا تو تفسیر ہے یا تقلید۔ ان کی شاعری میں عقیدۂ رضا بالقضا کو زیادہ دخل ہی۔ اگرچہ اس میں کوئی منطقی توازن نہیں۔ نہ فلسفیانہ استدلال ہے، مگر جو کچھ اُنھوں نے عالم بیخودی میں لکھدیا ہے اس کی مثال بڑے بڑے شعرا نہیں پیش کر سکتے۔ ہم ان کی نظم کو تین حصوں میں منقسم کرتے ہیں۔ تقلید، تفسیر، اور تحقیق، چونکہ مضمون طویل ہو گیا ہے اسلیے ان تینوں قسموں کے صرف چند نمونے یہاں پیش کیے جائیں گے۔

(۱) سوامی جی حضرت عثمان ہارونی کی یہ مشہور غزل جو کیف و جذب سے بھری ہوئی ہے اکثر پڑھا کرتے تھے۔ غزل یہ ہے ؎

نمی دانم کہ آخر چوں دم دیدار می رقصم — مگر نازم بریں ذوقے کہ پیش یار می رقصم
تپش چوں حالتے آرد بروے شعلہ می رقصم — خلش چوں لذتے بخشد بنوک خار می رقصم
خوشا رندی کہ پامالش کنم صد پارسائی را — زہے تقویٰ کہ من با جبہ و دستار می رقصم
بیا جاناں تماشا کن کہ در انبوہ جانبازاں — بصد سامان رسوائی سر بازار می رقصم
تو آں قاتل کہ از بہر تماشا خون می ریزی — من آں بسمل کہ زیر خنجر خونخوار می رقصم
منم عثمان ہارونی کہ یار شیخ منصورم — ملامت می کند خلقے و من بر دار می رقصم

اسی مضمون سے اتفاق کر کے سوامی جی نے پنجابی زبان میں جسقدر اشعار لکھے ہیں جن کا ایک ایک لفظ کیف میں ڈوبا ہوا ہے، چونکہ اُن اشعار سے غیر زبان والوں کو بھی لطف حاصل ہوگا اسلیے ذیل میں

تمام وکمال لکھے جاتے ہیں:-

سورج ناچون تارے ناچون ناچون بن مہتاب رے
تن تیرے میں من ہو ناچون ناچون تاڑی تاڑ رے

ناچون میں مہاراج

بادر ناچون بایو ناچون ناچوں ندی ارناپ رے
ذرہ ناچون سمندر ناچون ناچون موگھر کاج رے

ناچون میں مہاراج

مدھو الب خوش مستی والا ناچون پی پی آج رے
گھر لاگو رنگ رنگ گھر لاگو ناچون پاپا داج رے

ناچون میں مہاراج

راگ گیت سب ہوت ہر دم ناچون پورا ساج رے
رام ہی ناچت رام ہی باجت ناچون ہوں نرلاج رے

ناچون میں نٹ راج رے

ناچون میں مہاراج

پہلی قسم کی مثال کے لیے یہ نظم کافی ہے، لیکن چونکہ سوامی جی نے انگریزی زبان میں بھی بہت سی نظمیں لکھی ہیں اسلیے اُن کی ایک ایسی نظم بھی یہاں لکھنا نامناسب نہ ہوگا جس میں ایرانی تصوف کے ساتھ ساتھ شعرائے مغرب کا وہ انداز بھی شامل ہے جسکو نیچرلزم کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے اگر مسٹر اینڈریوز نے سوامی جی کو مغربی و مشرقی خیالات کا رشتۂ اتحاد کہا تو بہت ٹھیک کہا۔ وہ نظم یہ ہے ؎

پہاڑوں کا ہر سمت خاموش سونا دو شالہ وہ گنجان پیڑوں کا ہونا
وہ دامن میں سبزہ کی مخمل بچھونا ندی کا بچھونے کی جھالر پرونا

یہ راحت مجسم یہ آرام میں ہوں
کہاں کوہ و دریا یہاں ہیں ہی میں ہوں

یہ پربت کی چھاتی پہ بادل کا پھرنا وہ دم بھر میں ابروں سے پربت کا گھرنا

کڑکنا، گرجنا، چمکنا، نکھرنا،		چھما چھم چھما چھم، یہ بوندوں کا گرنا
عروس فلک کا وہ ہنسنا یہ رونا
مرے ہی لیے ہے فقط جان کھونا
یہ وادی کا رنگیں گلوں سے لہکنا		فضا کا یہ خوشبو سے ہر سو مہکنا
یہ بلبل ساخنداں لبوں کا چہکنا		وہ آواز نے کا بھر سُر لپکنا
گلوں کی یہ کثرت ارم روبرو ہے
یہ میری ہی رنگت یہ میری ہی بو ہے

....

عجب لطف ہے کوہ پر چاندنی کا		یہ نیچر نے اوڑھا ہے جالی دوپٹا
دکھاتا ہے آدھا چھپاتا ہے آدھا		دوپٹے نے جوبن کیا ہے دوبالا
یہ دل لینا جاں لینا کسکی ادا ہے
مری جان کی جان جس پر فدا ہے

(۳) شاعری کو اگر محبت کی تفسیر کہا جائے تو نامناسب نہیں۔ سوامی جی کے زیادہ تر اشعار تفسیر محبت اور عیش روحانی کی بشارت ہیں۔ مثلاً

ٹھنڈک بھری ہے دلمیں		آنند بہ رہا ہے
امرت برس رہا ہے		اور دل یہ کہہ رہا ہے
تتوام اسی، تتوام اسی
پھیلی ہے صبح شادی		کیا چین کی گھڑی ہے
سُکھ کے چھٹے فوارے		کیا نور کی جھڑی ہے
تتوام اسی تتوام اسی

اور اس نظم کا مفہوم دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا گیا ہے ؎

سرود و رقص شادی دم بدم ہے		تفکر دور ہے اور غم کو رم ہے
مبارک ہو طبیعت کا یہ کھلنا		یہ رس بھینی اوستھا جام جم ہے

مبارک دے رہا ہو چاند جھک کر — سلاموں سے کمر میں اسکی خم ہے
رکھیں گے آگے کیا کیا ہم نہ اُمید — کہ مارا گرگِ غم پہلا قدم ہے
نہ کہتا تھا تمھیں کیا رام پہلے — صباح عید آ کی رات کم ہے

(۳) تیسری اور آخری قسم میں وہ اشعار ہیں جو سوامی جی کے ذاتی جذبات کہے جا سکتے ہیں۔ دیکھیے کیا ہی پیارے اور دلفریب انداز میں سوامی جی نے ہمہ اوست کی تفسیر بیان کی ہے، اسمیں شک نہیں کہ یہ انکا خاص انداز ہے۔ محبت کو مخاطب کرکے سوامی جی لکھتے ہیں ؎

پتیم پتیاں جب لکھوں جب تم بسو بدیس — من میں تن میں جان میں واکو کیا سندیس
لکھتا پڑھتا آپ ہوں سننے ہار بھی آپ — واحد میری ذات میں کوئی نہ مائی باپ
انتر باہر برہم ہے سرب وِشا بھی رام — استی بھاتی آپ ہو آپ ہی روپ ارنام

ممکن ہے کہ بعض بعض انگریزی نظموں میں سوامی جی نے عروض[1] کی طرف توجہ نہ کی ہو لیکن اردو میں انھوں نے بہت کم ایسی غلطیاں کی ہیں اور صاحب جذب تو یہی کہے گا کہ "من نداںم فاعلاتن فاعلات" اسکی اصطلاحی غفلت پر اعتراض کرنا فضول ہے، کیونکہ اسکا سبب لاعلمی نہیں ہو بلکہ عالم محویت بقول شاعر ؎

نہ کبھی تھے بادہ پرست ہم نہ ہمیں یہ کیف شراب ہے
لب یار چومے تھے خواب میں وہی جوش مستی خواب ہے

سوامی جی نے چند پنجابی اور ہندی گیت بھی لکھے ہیں جن کی مثال پیش کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ ان کا یہ گیت نہایت مشہور معلوم ہوتا ہے:-

ہری سنگھ بیاہ رچو رنگنا
آؤ رے بھنا — بیٹھو مورے انگنا
کھول رہے پوتھی — دیکھو مورے لگنا
ہری سنگھ بیاہ — ہری سنگھ سنگھنا

۱؎ سوامی جی کی انگریزی نظموں پر اظہار خیال کرتے ہوئے مسٹر اینڈریوز نے لکھا ہو کہ ان پر نظر ثانی اور اصلاح کی ضرورت ہی۔ مگر اردو نظمیں تو نہایت صحیح معلوم ہوتی ہیں۔

ہری سنگھ منگنی ہری سنگھ منگنا

ہری سنگھ بیاہ رچو رنگنا

ایک گیت اور ہے جو انگریزی طرز پر نصف ہندی اور نصف اُردو انداز لیے ہوے ہے۔ انگریزی طرز پر اس لیے کہ اس میں کورس کی سی تکرار ہے:-

ندیوں کے سردار گنگا رانی

چھینٹے جل کے دیں بہار گنگا رانی

سو سو غوطے گن گن مار گنگا رانی

کبھی وار کبھی پار گنگا رانی

طوالت کے خوف سے ہم سوامی جی کے اُن اشعار کو نظر انداز کرتے ہیں جو انسان کو مراتب اعلیٰ تک پہونچانے والی خاصیتوں پر لکھے گئے ہیں مثلاً ہمت سے متعلق یہ اشعار

اگرچہ قطب بھی اپنی جگہ سے ٹل جائے ہمالہ باد کی ٹھوکر سے گو بھسل جائے

اگرچہ بحر بھی جگنو کی دم سے جل جائے اور آفتاب بھی قبل عروج ڈھل جائے

× کبھی نہ صاحب ہمت کا حوصلہ ٹوٹے کبھی نہ بھولے سے اپنی جبیں پہ بل آئے

یا اخلاق سے متعلق یہ شعر

× ہے ترا ایسی برت کر جیسی برچھہ کرے دھوپ سہے سر آپنے اوروں چھاؤں کرے

لیکن اگر غور سے دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ سوامی جی کی ساری زندگی ہی ایک سبق آموز شعر[1] تھی۔ سبق جیسیں اگر ایک طرف یہ بتلایا گیا ہے کہ دنیا کو کس طرح برتنا چاہیے، تو اسکے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ثابت کردیا گیا ہے کہ کیونکر اس سے کنارہ کشی کرکے روحانی مسرت اور ابدی راحت حاصل ہوسکتی ہے۔ ہر شخص کو کم از کم اس بات کی اُمید ضرور کرنا چاہیے کہ کارساز مطلق اسکو حقیقی عیش اور دوامی مسرت کے منازل تک کبھی نہ کبھی ضرور پہونچا دیگا اگرچہ ع۔

قطع راہ باطنی ما کار پائے دیگر است

---

[1] اس موقع پر یہ لکھنا ایک فخر کی بات ہے کہ گو سوامی جی نے سرزمین پنجاب میں جنم لیا، مگر دھرم سادھن کے لیے ان کو یو پی ہی میں رہنا پڑا یعنی عیش روحانی ان کو یو پی ہی کی سرزمین میں حاصل ہوا۔

تاہم خبردار ہونا ضروری ہے، گو پابندی آب و گل کا عادی انسان کہتا ہے کہ "ایک دن مرنا ہے" مگر حیرت تو یہ ہے کہ کاروبار کا سلسلہ جاری ہے اِس سوال کا جواب بقول سوامی جی کے یہی ہے کہ "ہماری ذات میں مرنا نام کو بھی نہیں۔ ہمارا آتما امر ہے، اکال ہے۔ اصلی ہمارا اپنا آپ ست سروپ ہے، حی لایموت ہے" ــہ

الا یا گوہرِ بحرِ مصفا　　که در عالم توئی پنہاں و پیدا

(نوٹ) جن اشعار پر نشان (×) بنا ہے وہ دیگر اساتذہ کے مجموعہ کلام میں بھی پائے گئے ہیں۔

میر تقی میر کی تاریخ پیدائش اور اُنکے آباؤ اجداد کے حالات

از جناب سراج الحسن صاحب ایم اے

(اِس مضمون میں قوسین کے اندر مطبوعہ نسخے کے صفحوں کے حوالے دیے گئے ہیں)

مناسب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اوپر کی پشتوں کا حال لکھ کر میر صاحب کے والد کا حال لکھا جاتا اور پھر خود میر صاحب کا بیان ہوتا لیکن تاریخی مشکلات اور مضمون کی موجودہ نوعیت مجبور کرتی ہیں کہ پہلے میر صاحب کے والد یعنی میر محمد علی متقی کی تاریخ ہائے پیدائش و وفات متعین کر لی جائیں اور پھر ان کی بنا پر دوسری ضروری تاریخوں کے معلوم کرنیکی کوشش کیجائے۔

میر محمد علی متقی کی علالت اور وفات کے متعلق جو حالات ذکر میر میں درج ہیں (صفحہ ۷ و ۸) ان میں سے تاریخی نقطۂ نگاہ سے قابل لحاظ یہ امور ہیں۔ (۱) ان کا ایک عزیز کی عیادت کے لیے آفتاب گرم میں جانا اور تمازت کے اثر سے بیمار ہونا (۲) ایک ماہ کی علالت کے بعد تشخص ہونا کہ مرض سخت ہی (۳) ۱۲ رجب کو دوا پینے سے انکار کرنا اور چند وصیتیں کرنیکے بعد انتقال کرنا۔ اِس بیان سے دو باتیں متعین ہو جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ میر علی متقی جمادی الآخر میں علیل ہوے اور دوسرے یہ کہ ۱۲ رجب کو انتقال کیا۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ وفات کا سنہ کیا تھا۔ خود میر صاحب نے لکھا نہیں اِسلیے سوائے اسکے اور دوسری کیا سبیل ہی کہ دیگر واقعات کے سنین متعین کر کے استنباط کیا جائے۔

ذکر میر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب نے تقدیم و تاخیر کا لحاظ رکھ کر واقعات کو ایک سلسلہ سے بیان کیا ہے اور ایسا نہ کرنے کی بظاہر کوئی وجہ بھی نہیں معلوم ہوتی۔ اِس نظریہ کے تسلیم کر لینے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ میر صاحب نے پہلے اپنے لہو و لعب کا ذکر کیا ہے (صفحہ ۸ مرا سرگرم بازی یافت) اور اسکے بعد میر علی متقی کے لاہور جانے کا حال لکھا ہے۔ (صفحہ ۹) میر علی متقی ایک درویش معروف

بہ خفشاں نمود کی ملاقات کو لاہور گئے۔ اِس درویش کا اصلی نام محمد حسین تھا اور خفشاں نمود یا نمود اللہ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ ایران سے کابل ہوتا ہوا لاہور پہنچا اور بالآخر وہیں آکر قضا کر گیا۔ اِس کا مفصل ذکر سیر المتاخرین میں موجود ہے۔ اور صاحب سیر المتاخرین نے اسکے لڑکوں سے دہلی میں ملاقات کی تھی۔ اِس بنا پر اُمید کیجاتی ہے کہ اُنھوں نے اسکے حالات صحیح صحیح لکھے ہونگے۔ اِن کے قول کے مطابق یہ فقیر یعنے خفشاں نمود فرخ سیر کے اواخر عہد میں دہلی آگیا تھا اور وہیں تقریباً ۱۱۳۵ھ میں قضا کر گیا۔ اگر میر صاحب کا یہ بیان صحیح ہے کہ انکے والد خفشاں نمود کی ملاقات کو لاہور گئے تو یقیناً یہ سفر فرخ سیر کے اواخر عہد میں ہوا ہوگا۔ فرخ سیر نے ۱۱۳۱ھ میں انتقال کیا اسلیے میر محمد علی متقی کا سفر غالباً ۱۱۳۰ھ میں ہوا ہوگا اور اسوقت میر صاحب کی عمر یقیناً ۸ یا ۹ برس کی ہوگی۔ اب اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اِس سفر کے بعد کتنی مدت تک وہ زندہ رہے تو سنہ وفات کا پتہ چلا لینے میں کوئی دقت نہ رہے گی۔ یہ مدت صراحتہً کہیں مذکور نہیں، البتہ مختلف حوالجات اور انداز بیان سے اِسکا تخمینہ کیا جاسکتا ہے۔

لاہور میں قیام ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ دو روز

لاہور سے دہلی کو واپسی ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ دوازدہ روز (صفحہ ۱۰)

دہلی میں قیام ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ پندرہ روز (صفحہ ۱۵ کی عبارت سے کچھ ایسا ہی اندازہ ہوتا ہے گو صراحتاً مذکور نہیں۔

دہلی سے بیانہ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ دو سہ روز (صفحہ ۱۲)

بیانہ میں قیام ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ یک روز (صفحہ ۱۳)

بیانہ سے اکبر آباد ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ یک و نیم روز (صفحہ ۱۴)

مذکورہ بالا مدت میں میر علی متقی آگرہ واپس آگئے اور پھر آخر وقت تک یہیں رہے۔ اِس دوران میں انکی خدمت میں بیانہ کا ایک نوجوان امان اللہ نامی ہو نکلتا ہے جسکی شادی میں شرکت کی غرض سے اُنھوں نے ایک شب بیانہ میں قیام کیا تھا اور جس پر ان کی پرکیف زندگی نے اتنا اثر ڈالدیا تھا کہ وہ انکی روانگی کے بعد ہی گھر بار چھوڑکر نکلتا ہے اور تقریباً ایک ماہ کی تلاش و جستجو کے بعد آگرہ پہنچکر ان کی خدمت میں باریاب ہوتا ہے یہ امان اللہ وہی ہیں جن کو میر صاحب عم بزرگوار کے لقب سے

یاد کرتے ہیں اور جنکی آغوش شفقت میں اُنھوں نے تربیت پائی ہی۔ یہ میر علی متقی کے مریدوں میں داخل ہو کر ریاضت شروع کرتے ہیں جسکا زمانہ میر صاحب کے الفاظ میں "اندک مدت ہی (صفحہ ۱۹) جو قرائن سے تقریباً ایک سال کے برابر ہے۔ ریاضت کے بعد مرجع خاص و عام ہونے کے ڈر سے عزلت اختیار کرتے ہیں جسکی مدت بھی ایک برس ہی (صفحہ ۱۹ "سالے بریں گذشت") اپنے پیر کے ایما سے عزلت کو ترک کرکے خلق اللہ کی فائدہ رسانی میں مصروف ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا بیان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ میر امان اللہ کی عزلت ۱۱۳۳ھ کے اواخر میں ختم ہوئی ہوگی اور اسوقت میر صاحب کی عمر سات برس کی تھی (صفحہ ۲۰ "من دراں ایام ہفت سالہ بودم") اسکے بعد ہی وہ زمانہ آتا ہی کہ میر امان اللہ درویشوں کے یہاں آمد و رفت شروع کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ساتھ کمسن میر محمد تقی بھی آتے جاتے ہیں۔ یہ ملاقاتیں گویا ۱۱۳۴ھ میں واقع ہوتی ہیں۔ اور اسی درمیان میں چند ملاقاتی درویشوں کا وصال بھی ہو جاتا ہے۔ اسکے بعد ہی ایک روز میر علی متقی دوران گفتگو میں قرآن کو حفظ کرنیکی خواہش ظاہر کرتے ہیں، خوش اعتقاد مرید امان اللہ فوراً آمادگی ظاہر کرتے ہیں اور پیر و مرید دونوں قرآن حفظ کرنا شروع کرتے ہیں جس میں ڈیڑھ برس صرف ہوتا ہے (صفحہ ۴۹ "یک و نیم سال") اگر اب اسے حفظ قرآن ۱۱۳۴ھ کے شروع میں تصور ہو تو اس کا اختتام ۱۱۳۵ھ کے درمیان میں سمجھنا چاہیے۔ قرآن حفظ کرنے سے فارغ ہونے کے بعد دوسرا واقعہ جو پیش آتا ہے وہ اسد اللہ نامی درویش کا میر علی متقی کے پاس آنا ہی۔ یہ دونوں پیر بھائی تھے اور بقول میر علی متقی اس پیر بھائی سے ملاقات کے بعد ایک سال کے اندر ہی ان کی موت کا واقع ہونا ضروری تھا۔ چونکہ یہ درویش حفظ قرآن کے بعد ہی آتا ہے اسلیے اسکی آمد تقریباً شعبان ۱۱۳۵ھ قرار دیجا سکتی ہے۔ راسخ العقیدت میر امان اللہ کو جب معلوم ہوا کہ ان کے پیر کی وفات ایک سال کے اندر ہی واقع ہوگی تو اُنھوں نے اپنے پیر سے پہلے مرجانے کی خواہش ظاہر کی اور عجیب اتفاق کہ ان کی خواہش پوری بھی ہو گئی۔ چنانچہ یکم شوال ۱۱۳۵ھ کو بیمار ہو کر ۲ شوال ۱۱۳۵ھ کو علی الصباح انتقال کیا۔ اسوقت میر صاحب کی عمر دس سال کی تھی (صفحہ ۵۸ "الحمد للہ کہ دہ سالہ ام") میر امان اللہ کی وفات کے بعد ہی ۱۰ رجب کو میر علی متقی کا بھی انتقال ہو جاتا ہی۔ اور اسوقت میر صاحب کی عمر گیارہ سال تھا۔ مذکورہ بالا دلائل سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ میر علی متقی کا انتقال ۱۰ رجب ۱۱۳۶ھ کو ہوا۔ اسکی تائید میں ایک دوسری دلیل بھی لائی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ میر علی متقی کی علالت کا زمانہ جمادی الآخر

۱۱۳۶ھ ہے جو فروری و مارچ ۱۷۲۴ء کے مطابق ہے۔ مارچ کے مہینے میں تمازت آفتاب کا اثر گو اتنا سخت تصور میں نہ آئے تاہم میر علی متقی ایسے گوشہ نشین کے لیے ماہ مارچ میں آگرہ کی گرمی بھی ناقابل برداشت ہو سکتی ہے۔ اسلیے تمازت کے اثر سے علیل ہو جانا ایسا تعجب انگیز امر نہیں ہے۔ اگر ۱۱۳۶ھ کو سنہ وفات نہ مانکر ۱۱۳۵ھ یا اسکے بعد والے سنین میں علالت و وفات قرار دیجائے تو جمادی الآخر اور بھی موسم سرما میں پڑتا چلا جائیگا اور تمازت کے اثر کا احتمال کم ہوتا جائیگا۔ اگر ۱۱۳۶ھ کے بجائے ۱۱۳۵ھ میں (یا اس سے قبل) وفات قرار دیں تو امان اللہ کی وفات ۱۱۳۴ھ میں (یا اس سے قبل) ماننی پڑے گی۔ ایسی حالت میں میر صاحب کی پیدائش کا سنہ ۱۱۲۵ھ سے پہلے ہی ہوتا جائیگا۔ جو موجودہ سندات اور قرار داد کے خلاف ہے۔ اگر مولانا عبدالحق صاحب کی تحقیق کے مطابق میر صاحب کی پیدائش ۱۱۳۷ھ کو تسلیم کرکے ۱۱۴۸ھ میں میر صاحب کے والد کی وفات قرار دیں تو یہ مشکل آن پڑتی ہے کہ میر صاحب کا ترک وطن ۱۱۴۸ھ یا اسکے بعد ماننا پڑیگا لیکن صفحہ ۱۰۳ میں میر صاحب اپنا دوبارہ آگرہ جانا تیس سال کے بعد بتلاتے ہیں اور یہ جانا تاریخی حساب سے ذیقعدہ ۱۱۷۴ھ میں ہوتا ہے۔ اس طرح دونوں تاریخوں میں تطبیق نہیں ہوتی۔ اسلیے لامحالہ میر علی متقی کی وفات ۱۲ رجب ۱۱۳۶ھ کو واقع ہوئی۔

قرآن حفظ کرنے سے پہلے اور امان اللہ کی عزلت گزینی کے بعد ایک روز دوران نصیحت میں میر علی متقی اپنی عمر کے متعلق فرماتے ہیں "بشصت سالگی کشید" (صفحہ ۴۴) ہم بتا چکے ہیں کہ میر امان اللہ کی عزلت گزینی ۱۱۳۲ھ میں ختم ہوتی ہے اور قرآن حفظ کرنیکی ابتدا ۱۱۳۴ھ کے اوائل میں واقع ہوتی ہے۔ اسلیے یہ کلمات غالباً ۱۱۳۳ھ میں کیے گئے اور اس حساب سے ان کی پیدائش ۱۰۷۳ھ میں قیاس کیجا سکتی ہے

میر صاحب کے دادا کے متعلق اس سے بھی کم حالات معلوم ہیں اسلیے مدلل بحث کی بہت کم گنجائش ہے زیادہ سے زیادہ ظن و تخمینہ سے کام لیا جاسکتا ہے اگرچہ وہ ظن غالب ہی کیوں نہ ہو۔ صفحہ ۴ کی عبارت سے اس بات کا اندازہ معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کے دادا کے انتقال کے وقت میر علی متقی اور انکے بڑے بھائی جوان ہو چکے تھے۔ شاید میر علی متقی کی عمر اسوقت سولہ سترہ برس کی ہو۔ اس بنا پر میر صاحب کے دادا کا انتقال ۱۰۹۰ھ کے لگ بھگ فرض کیا جاسکتا ہے اور چونکہ انتقال کے وقت ان کی عمر پچاس برس کی ہو چکی تھی (صفحہ ۴) اسلیے انکی (میر صاحب کے دادا) کی پیدائش تقریباً ۱۰۴۰ھ ہجری میں

ہوئی ہوگی۔

میر صاحب کے پردادا گجرات سے آکر آگرہ میں متوطن ہوئے لیکن تبدیل آب و ہوا کے اثر سے بیمار ہوکر کچھ ہی عرصہ میں وفات پا گئے۔ ان کے صاحبزادہ یعنے میر صاحب کے دادا انکے ساتھ آئے ہونگے اور غالباً اپنے باپ کی وفات کے وقت جوان تھے کہ اکبرآباد کے نواح میں ملازمت کرلی اور فوجداری کے عہدہ پر مامور ہوئے۔ اِس بنا پر ظنی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ میر صاحب کے پردادا ۱۰۶۰ھ کے قریب آگرہ میں آکر متوطن ہوئے۔ ان سے اوپر کی پشتوں کے متعلق سوائے ان واقعات کے اور کیا کہا جاسکتا ہے جنکا ذکر خود میر صاحب نے کیا ہے یعنی انکے آباو اجداد حجاز سے دکن میں پہونچے پھر وہاں سے گجرات کی طرف چلے گئے جہاں کچھ تو آباد ہوکر پھلے پھولے اور کچھ مر کھپ گئے۔ ان میں ایک یعنی میر صاحب کے پردادا آگرہ چلے آئے۔ ممکن ہے کہ یہ خاندان گیارھویں صدی ہجری کے ربع ثانی میں دکن پہونچا ہو۔ اور وہاں سے گجرات ہوتا ہوا ربع ثالث میں اکبرآباد پہونچ گیا ہو۔

میر صاحب کی تاریخ پیدائش مولانا آزاد نے روایتی طور پر ۱۱۲۵ھ لکھی ہے، لیکن مولانا عبدالحق نے جدید تحقیقات کی بنا پر ۱۱۳۷ھ قائم کی ہے۔ ان کی دلیل کا خلاصہ یہ ہے کہ ذکر میر کی تاریخ تالیف ۱۱۹۷ھ ہے اور عبرت و خاتمہ والی عبارت میں میر صاحب نے اپنی عمر ساٹھ سال بتائی ہے اسلیے، ۱۱۹۷ میں سے ساٹھ منہا کردیے۔ اِس دلیل کا جواب مفصل طور پر ذکر میر کی تاریخ تصنیف کی بحث میں درج ہے لیکن مختصراً یہ ہے کہ اگر ذکر میر کی موجودہ ترتیب کو ملحوظ رکھا جائے تو ذکر میر کی تاریخ اختتام ۱۲۰۳ھ ہونا چاہیے کیونکہ جو آخری واقعہ اِس میں بیان کیا گیا ہے وہ ۱۲۰۳ھ کا ہے۔ اسوقت میر صاحب کی عمر ساٹھ سال کی ہرگز نہیں ہوسکتی کیونکہ اگر اسوقت ۶۰ سال کی عمر تسلیم کی جائے تو سال پیدائش ۱۱۴۳ھ قرار پاتا ہے جو دیگر قرائن کے اعتبار سے بالکل غلط ہے۔ جس عبارت میں میر صاحب نے اپنی عمر ۶۰ برس کی بتائی ہے وہ فی الحقیقت ۱۱۸۵ھ کے اوائل کی لکھی ہوئی ہے اور اِس اعتبار سے میر صاحب کی تاریخ پیدائش ۱۱۲۵ھ نکلتی ہے جسکی تائید ان دلیلوں سے بھی ہوتی ہے جن کو ہم میر علی متقی کی تاریخ وفات متعین کرنیکے ضمن میں بیان کرتے آئے ہیں اور ہر اہم واقعہ کے وقت خود میر صاحب کے بیان کے مطابق انکی عمر کا حوالہ دیتے گئے۔ اِس معاملہ میں آزاد مرحوم کا قول درست ہے اور مولانا عبدالحق کی تحقیقات غلط۔

علاوہ اسکے مصحفی نے اپنے تذکرہ ہندی میں میر صاحب کی عمر ۸۰ سال تحریر کی ہے اور تذکرہ

ہندی کی تالیف کا زمانہ سنہ ۱۲۰۳ھ سے لے کر سنہ ۱۲۰۹ھ تک ہی۔ اس حساب سے بھی میر صاحب کی عمر تقریباً سو سال کی ہو جاتی ہی

اِس جگہ اہم واقعات اور ان کے سنین لکھنا غیر مناسب اور خالی از فائدہ نہ ہوگا۔

بزرگان میر کا دکن میں آنا اور گجرات کو منتقل ہونا ... ... سنہ ۱۰۲۵ھ تا سنہ ۱۰۵۰ھ

میر صاحب کے پردادا کا آگرہ میں توطن اختیار کرنا ... ... سنہ ۱۰۶۰ھ

میر صاحب کے دادا کی پیدائش ... ... سنہ ۱۰۴۰ھ

میر صاحب کے دادا کی وفات ... ... سنہ ۱۰۹۰ھ

میر صاحب کے والد کی پیدائش ... ... سنہ ۱۰۷۳ھ

میر صاحب کے بڑے بھائی کی وفات ... ... سنہ ۱۰۹۵ھ

میر علی متقی کا لاہور جانا ... ... سنہ ۱۱۳۰ھ

میر صاحب کی پیدائش ... ... سنہ ۱۱۲۵ھ

میر علی متقی کے مرید میر امان اللہ کی وفات ... ... ۱۲ شوال سنہ ۱۱۳۵ھ

میر علی متقی کی وفات ... ... ۲۱ رجب سنہ ۱۱۳۶ھ

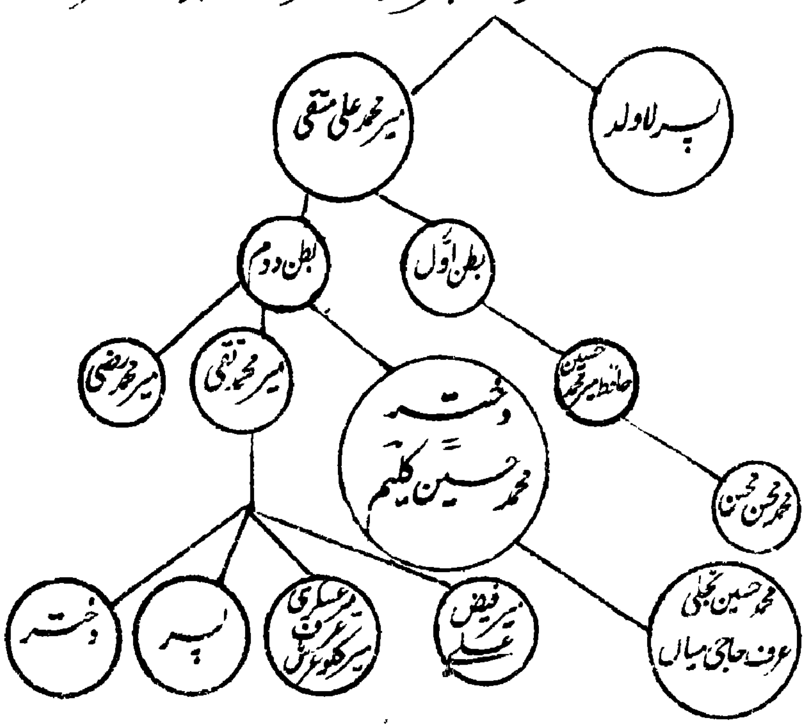
میر صاحب کا ترک وطن ... ... سنہ ۱۱۴۴-۵ھ

میر صاحب کے دادا کے جو تعلقات گوالیار سے بتلائے گئے ہیں اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید میر صاحب کی دادی گوالیار ہی کی تھیں اور ممکن ہی کہ سراج الدین علیخاں آرزو ہی کے خاندان سے ہوں اِسی خاندان میں یعنے نانہیالی قرابت داری میں میر علی متقی کی بھی پہلی شادی ہوتی ہے اور دوسری شادی بھی شاید اِسی خاندان میں ہوئی، لیکن انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب کے نانا خاص گوالیار میں نہیں بلکہ آگرہ کے نواح میں بود و باش رکھتے تھے جہاں دہلی سے پہلی مرتبہ واپس آنے پر میر صاحب نے قیام کیا اور تا حملہ نادر شاہ وہیں رہے۔ آگرہ میں میر صاحب کا مکان عیدگاہ کے قریب تھا اور میر صاحب کے ترک وطن کے بعد ہی غالباً گر پڑ کر خاک میں مِل گیا۔

میر صاحب کے والد صاحب کے نام میں بھی کچھ اختلاف ہو گیا ہے۔ مولانا آزاد اور صاحب گلزار ابراہیمی میر عبد اللہ لکھتے ہیں اور خود میر صاحب نے ان کو میر علی متقی یا میر محمد علی کے نام سے یاد کیا ہے۔ ذکر

میر کی بنا پر مولانا عبدالحق نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ نام علی متقی تھا نہ کہ عبداللہ۔ ذکر میر (صفحہ ۵) میں ہی "بخطاب علی متقی امتیاز یافت" اور صفحہ ۶۲ میں صرف محمد علی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اصل نام محمد علی تھا۔ متقی جزو نام نہ تھا بلکہ صرف خطاب تھا۔

میر محمد علی متقی کی اولاد میں سے صرف تین پسر اور ایک دختر کا حوالہ ملتا ہے جن کا شجرہ حسب ذیل ہے



پروفیسر مسعود حسن صاحب رضوی نے رسالہ فیض میر کے مقدمہ میں محمد محسن کی ولدیت کے بارے میں اقوال نقل کیے ہیں۔ سب تذکرہ نگاران کو میر کا برادر زادہ لکھتے ہیں، لیکن بعض کلیم کا بیٹا لکھتے ہیں بعض ان کا بیٹا نہیں بتاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب کے سوتیلے بھائی اور بہنوئی کا نام ایک ہی تھا۔ اسلیے بعض تذکرہ نگاروں کو دھوکا ہو گیا ہو گا۔ ورنہ نکات الشعراء میں محسن کو برادر زادہ لکھا ہے اور ذکر میر میں برادر کا نام حافظ محمد حسین بتایا ہے۔

ترا جلوہ کرم آفریں، ہے ازل سے مظہر نورِ دل　　تری چشم بادہ گسار میں، ہے نشاطِ قلب و سرورِ دل

تری شانِ حسن کے افتخار سے بڑھ گیا ہے غرورِ دل　　چہ شود کہ آتشِ حیرتے بزنم بہ قلۂ طورِ دل

فسلکتہ دکّلکتہ، متدکدکا، متزلزلا

سرِ آستانۂ ناز پر یہ جھکی ہے گردنِ بے گنہ　　ہے رضائے یار اگر سنے وہ فغان و شیونِ بے گنہ

اُسے اختیار ہے وہ بھرے مرے خوں سے دامنِ بے گنہ　　اگر آن صنم ز رہِ ستم، پے کشتنِ منِ بے گنہ

لقد استقام بسیفہ فلقد رضیت بما رضا

شبِ ہجر میں جو ہوئے ستم، کہوں کیسے کیسے اٹھائے غم　　کبھی ہچکیوں نے لبوں پہ دم، کبھی آنسوؤں نے تھی چشم نم

کٹی روتے روتے شبِ الم، مگر انتظار ہوا نہ کم　　سحر آن نگارِ ستمگرم، قدمے نہادہ بہ بسترم

واذا رأیتُ جمالہ، طلع الصباح کانما

تجھے حرصِ کشور و کشوری، مجھے فخرِ فقرِ پیمبری　　تجھے شوقِ تاجِ مظفری، مجھے ذوقِ خاک گداگری

مری آن عجز و فروتنی، تری شان نخوت و خودسری　　تو و ملک و جاہِ سکندری، من و رسم و راہِ قلندری

گر آن نکوست تو درخوری، وگر ایں بدست مرا سزا

زنگاہ صاعقہ بار او، ز چہ شعلہ رقص شرار او　　ز چہ نور حسن عذار او، ز چہ دست آئینہ دار او

ز چہ کاکل رسن تار او، ز چہ گنج کسوتِ مار او　　ز چہ زلف غالیہ بار او، ز چہ چشم فتنہ شعار او

شدہ نافۂ ہمہ ختن، شدہ کافری ہمہ خطا

غزل دیگر

بہ دیارِ عشق تو ماندہ ام، ز کسے نہ دیدہ عنایتے　　بنگر بہ ہیم نظرے فگن، کہ تو بادشاہ ولایتے

گنہے بود مگر اے صنم، کہ ز سرِ عشق تو مبدم　　اہجرتنی، و قتلتنی، و اخذتنی بجنایتے

سلہ ناصر الدین شاہ کو قرۃ العین نے یہ شعر قید خانے سے لکھ کر بھیجا تھا۔ یہ بھی مشہور ہے کہ ناصر الدین شاہ اوسکے شمع جمال پر پروانہ وار فدا ہو گیا تھا۔ لیکن وزیر سلطنت نے مذہب کی وجہ سے اُسکی مخالفت پر کمر باندھی، اور موقع پاکر ایک رات کی تاریکی میں حبشیوں کے ذریعہ سے باغ طہران کے کسی اندھے کنوئیں میں گرا کر اُسکی زندگی کا چراغ ہمیشہ کیلئے گل کر دیا۔ مگر یہ سب افواہ ہے۔ ابتک اُسکی زندگی کے صحیح حالات کسی کتاب میں میری نظر سے نہیں گذرے۔ نشتر

نبود طاقت صبرے، بکشم فراق و تاب کے — ہمہ بند بند مرا چو نئے، بود از غم تو حکایتے
عجز العقول لدرکہ، نقص الحسوس لوصفہ — بکمال تو کہ برد رہے، بود عجز تو نہایتے
چو صبا برت گذر آورد، زبلاکشان خبر آورد — رخ زرد و چشم تر آورد، چہ شود کنی تو عنایتے
قدمے نہی تو بہ بسترم، سحرے نیاگئی از کرم — بہوائے قرب تو پرپرم، بہ دو بال وہم بجا ہتے
برہانیم چہ ازیں مکاں، بکشانیم سوئے لامکاں
گذرم زجان جہانیاں، کہ تو جان و جان دہ خلقتے

(نوٹ) مذکورہ بالا اشعار کی توضیح الفاظ سے ممکن نہیں، صاحبان شوق و ذوق اسکی رنگینی طبع کا اندازہ فرما سکتے ہیں۔

جناب دیوان کالی پرشاد صاحب استھانہ سندیلوی

(خالص اردو باتباع اُستاد معظم حضرت آرزو لکھنوی)

اُمنڈ کے آئے ہیں کالے بادل سنہری بجلی چمک رہی ہے — بنی ہے متوالی ڈالی ڈالی ہر ایک کھیتی لہک رہی ہے
ڈھلی ہو سانچے میں گات اُنکی انوکھی ہے بات بات اُنکی — وہ بانکے تیور وہ ترچھی چتون کٹار بنکر لٹک رہی ہے
کسی سے جا ہو جو لو لگانا تو چاہ سورج مکھی سے سیکھو — جدھر جدھر جا رہا ہے سورج اُدھر اُدھر وہ بھی تک رہی ہے
اندھیری راتیں ہیں بیکلی ہے نہ نیند اک پل نہ چین ہی ہے — نہ بولیاں بول او پپیہے کریوں ہی چھاتی دھڑک رہی ہے
جو سانس لمبی سی کھینچ کے آئی تو جھنجھلی منہ پہ اک ہوائی — یہ آگ کیسی لگی ہے جی میں کہ ہر گھڑی جو بھڑک رہی ہے
ہر ایک ستو الا ہے پیے ہی ہر ایک گھر بیٹھے جھومتا ہے — لپٹ ہی جو لگی سانس اسکی کہ جس سے بستی مہک رہی ہے
سنبھل کے اے شاد پاؤں رکھنا بہت کٹھن چاہ کی ہیں گلیاں
ہم ایسے پائینگے کیا ٹھکانا بڑے بڑوں کو جھجک رہی ہے

گم شدہ جواہرات

(جناب سید ناظم حسین صاحب نقوی صفی پوری، بی، اے، ال، ال، بی،)

میری کشتی ایک نہانے والے قدیم گھاٹ کے کنارے لنگرانداز ہوئی، یہ جگہ بھی کسی وقت مرکز حسینان تھی، مگر اب وہ حالت باقی نہیں رہی، زمانے کے سخت ہاتھوں نے اسکی شان و دلکشی کو خاک میں ملا دیا جسکی شکستہ حالی پر دریا بھی سر پٹکتا تھا۔ آفتاب غروب ہو چکا تھا۔ کشتی کی چھت پر خدا کے یاد کرنیوالے نمازیں مشغول ہوے۔ اُنکی خاموش عبادت مغربی آسمان پر خفیف و ہلکی روشنی میں ایک تصویر سی معلوم ہوتی تھی، دریا کی خاموش سطح پر اُس روشنی کا عکس پڑ رہا تھا۔ اوس کا سُنہرا اور نیلا رنگ نہایت دلکش معلوم ہوتا تھا۔

ایک نہایت وسیع مکان جسکی کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی، جسکا برآمدہ جا بجا سے گرا ہوا جسکی شباہت اوسکے قدیم ہونیکی دلیل تھی میرے سامنے۔ میں گھاٹ کی سیڑھیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ سیڑھیاں ایک برگد کے درخت کی دور تک پہونچنے والی جڑوں کے سبب سے شگافتہ اور شق ہو گئی تھیں کہ دفعتہً ایک آواز نے یہ کہتے ہوے مجھے چونکا دیا۔

«جناب آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟»

میری نظریں اوپر اوٹھ گئیں، ایک شخص کو اپنے قریب پایا جو گرسنہ معلوم ہوتا تھا اور جسکو گردش زمانہ نے ستا رکھا تھا۔ اوسکے چہرے پر پریشانی و فکر کے علامات نمایاں تھے، جیسا کہ عام طریقہ سے میرے اُن ہموطنوں میں پایا جاتا ہے جو وطن سے دور ملازمت یا روزگار اختیار کرتے ہیں۔

وہ ملک آسام کا بنا ہوا کوٹ پہنے ہوے تھا جس پر جا بجا چکنائی کے بدنما دھبے پڑے ہوے تھے، سامنے کے جانب کھلا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے دن کے کام سے فراغت پا کر دریا کے کنارے اسوقت تفریح کے لیے چلا آ رہا ہے جبکہ اُسے اپنے شام کے کھانا کھانے میں مشغول ہونا چاہیئے تھا۔

آنیوالا میرے پاس سیڑھیوں پر بیٹھ گیا، میں نے اوسکے سوال کے جواب میں کہا:-
"میں رانچی سے آیا ہوں"
"آپ کیا کام کرتے ہیں"
"تاجر ہوں"
"کس قسم کی تجارت"
"لکڑی اور لٹھے کی"
"نام بھی آپ بتا سکتے ہیں"

ایک منٹ توقف کے بعد میں نے نام بتلایا، لیکن حقیقت میں میرا نام دوسرا تھا۔ اسنے پھر پوچھا آپ یہاں کیسے آئے۔ میں نے جواب دیا "تبدیل آب وہوا کیلیے"

یہ سنکر میرا جرح کرنیوالا متحیر ہوا۔ اُس نے کہا "جناب میں تقریباً ۲ سال سے اِس جگہ کی آب وہوا سے لطف اندوز ہو رہا ہوں، ۱۵ گرین کونین روزانہ استعمال کرتا ہوں لیکن بظاہر میری صحت وتندرستی کو اسوقت تک کوئی فائدہ نہیں پہنچا"

میں نے جواب دیا "تاہم آپ یہ تسلیم کرینگے کہ رانچی کے بعد یہ جگہ تبدیل آب وہوا کے لیے اچھی ہے"

اُس نے کہا "واقعی آپکے خیال سے کچھ زائد۔ اچھا! آپ کہاں قیام پذیر ہونگے ؟"

گھاٹ کے اوپر منہدم مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا
"وہاں"

اوسکی متجسس نگاہوں سے میں نے یہ اندازہ کیا کہ میرے دوست کو یہ ضرور شبہہ ہوا ہے کہ میں دفینہ کی تلاش میں آیا ہوں۔ الغرض اُسنے اسکے متعلق زیادہ گفتگو نہیں کی بلکہ اتنا کہا کہ پندرہ سال پہلے اِس منہدم مکان میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ وہ اس جگہ کا اسکول ماسٹر ہے، اُسکے سر پر بال نہ تھے۔ اسکی دونوں آنکھیں اپنے حلقے میں روشن تھیں، اس کا چہرہ جو گرسنگی و بیماری کے باعث لاغر تھا غیر فطری روشنی سے منور تھا۔

کشتی والے نماز سے فارغ ہو کر کھانے کی طرف متوجہ ہوگئے۔ دن کی روشنی شب کی تاریکی میں

تبدیل ہو چکی تھی۔ خالی و متوحش مکان، ویران گھاٹ پر ساکت نظر آ رہا تھا۔

دفعتہً وہ پھر میری طرف متوجہ ہوا اور نہایت سنجیدگی سے کہنے لگا "اگر آپ اجازت دیں اور اس قصہ کو بغور سننا چاہیں تو میں بیان کروں۔ سمع خراشی تو ضرور ہو گی"

مجھے اس قصے کے سننے کے لیے کچھ تو خوشی تھی اور کچھ رنج، اگر وہ اس بات کی جلدی نہ کرتا تو میں خود اسکے کہنے کی فرمائش کرتا۔ میں نے اپنا اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے کہا ہاں بیان کیجیے،

اسکول ماسٹر نے آواز صاف کرتے ہوئے یوں کہنا شروع کیا "تقریباً ۱۰ سال ہوئے جبکہ میں یہاں آیا تھا۔ بھوشن شاہ اس مکان میں رہتے تھے۔ وہ اپنے چچا درگا شاہ کی کثیر جائداد اور تجارت کے وارث تھے کیونکہ انکے کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ تہذیب یافتہ تھے انھوں نے تعلیم بھی پائی تھی اور وہ صرف بلا غلطی کے انگریزی ہی نہیں بول سکتے تھے بلکہ جوتے پہنے ہوئے صاحب لوگوں کے آفسوں میں بھی چلے جایا کرتے تھے۔ انھوں نے داڑھی بڑھائی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ یورپین تو نہیں معلوم ہوتے تھے مگر اپنے کو ثابت کرنیکی کوشش کرتے تھے۔ اگر آپ ان کو دیکھتے تو فوراً کہہ اٹھتے کہ وہ ایک روشن خیال موجودہ تہذیب کے دلدادہ بنگالی تھے۔ علاوہ اسکے اپنے خانگی معاملات میں بھی اون میں ایک خامی تھی، اونکی بیوی خوبصورت تھیں۔ کالج کی تعلیم ایک طرف اور خوبصورت بیوی کا ہونا دوسری جانب۔ انکے گھر میں ہمارے قدیم اور عمدہ رسوم کے محفوظ رہنے کی کیا امید تھی؟

جناب آپ تو یقینی شادی شدہ ہیں۔ آپ سے یہ امر مخفی نہیں کہ ایک معمولی عورت، ترش اور کچے آم، گرم مرچ اور ایک سخت مزاج شوہر کی شائق ہوتی ہے، ایک آدمی کو اپنی بیوی کی محبت سے دھوکا کھانے کے لیے بدشکل یا غیب ہونا ہی ضروری نہیں بلکہ اس کا ضرورت سے زیادہ نیک ہونا بھی!

اگر آپ مجھ سے پوچھیں کہ ایسا کیوں ہے تو اس موضوع پر بیان کرنے کے لیے میرے پاس کافی مواد موجود ہے کیونکہ میں نے اس مسئلہ پر بہت غور و خوض کیا ہے۔ بارہ سنگھا اپنے سینگوں کو تیز کرنے کے لیے ایک سخت لکڑی کے درخت کی تلاش کرتا ہے۔ سینگوں کو برگد کے درخت سے رگڑنے میں اسکو کوئی خوشی نہ ہو گی جب قسمت سے مرد و عورت دو مختلف فرقے قرار دیے گئے ہیں عورت اپنی ساری قوت مختلف ترکیبوں اور طریقوں سے مرد پر قابو پانے اور اسکو اپنا دلدادہ و گرویدہ بنانے میں صرف کرتی ہے۔

وہ شخص جو اپنی خوشی سے مطیع ہو جاتا ہے اوسکی بیوی قریب قریب بلا کسی شغل کے رہتی ہے۔ وہ تمام ہتھیار جو بیشمار صدیوں سے عورت کو وراثتاً ملے ہیں اوسکے ہاتھ میں بیکار ہو جاتے ہیں۔ اوسکے آنسوؤں کا نہ اوسکے غصہ کی آگ۔ اوسکی نگاہوں کا جال سبکے سب سست اور ان پر کاہلی کا زور دورہ ہو جاتا ہے۔ موجودہ سحر نما تہذیب کے تحت میں آدمی نے اپنی خداداد طاقت یعنے نظری تصی العقلی کو ضایع کر دیا ہے، اور اسی سبب سے رشتہ ازدواج کی بندشیں ڈھیلی پڑ گئی ہیں -

بدنصیب بھوشن کو موجودہ تہذیب کی مشین نے ایک بلا خطا انسان بنا دیا تھا اسوجہ سے وہ نہ تو اپنی تجارت میں اور نہ اپنی خانگی زندگی ہی میں کامیاب تھا

مانی بھوشن کی بیوی تھی۔ زبان کو جنبش دیے بغیر اوسکی خواہشات نفسانی پوری ہو جاتی تھیں بغیر آنسو بہائے ڈھاکے کی ململ کی ساریاں بہم ہو جاتی تھیں اور اوسکے سونے کے کڑے بغیر اپنی کامیابی پر فخر کیے ہوئے مہیا ہو جاتے تھے اسی طرح سے نہ صرف اوسکی نسوانی فطرت ضائع ہو کر زنگ آلود ہو چکی تھی بلکہ اوسکے ساتھ ہی اوسکی محبت اوسکے شوہر کیلئے بھی" وہ بلا کسی بدل کے تحائف کے، قبول کر لیا کرتی تھی، اوسکا بے ضرر اور ناسمجھ شوہر اسی خیال میں مست تھا کہ دیدینا ہی حاصل کرنیکا طریقہ ہے، حالانکہ یہ خلاف واقعہ تھا۔ اسکا نتیجہ یہ تھا کہ مانی ہمیشہ اپنے شوہر کو ڈھاکے کی ململ، اور سونے کے کڑے بنانے کی مشین سمجھتی تھی، ایک ایسی مشین جسکے پہیوں میں اوسکو ایک روز بھی تیل دینے کی ضرورت نہ پڑتی تھی -

بھوشن کی بیوی زیادہ بات چیت کرنیکی عادی نہ تھی اور نہ ہمسایوں سے ملتی جلتی تھی، برہمنوں کا بھوج لگانا، کسی سنیاسی کو کچھ دینا اوسکا طریقہ نہ تھا۔ اپنے ہاتھوں سے اوسنے کوئی شئے صرف نہیں کی بجز اپنے شوہر کی محبت اور پیار کی یادداشت کے جو کچھ اوسکو ملا اوسنے جمع کیا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اوسکے شباب کی خوبصورتی کے علامات بجنسہ ہنوز باقی تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ عمر اوسکی کچھ بھی ہو لیکن وہ سولہ [16] برس سے زیادہ کی نہیں معلوم ہوتی تھی، میرا خیال ہے کہ شباب اطمینان قلب سے جو مانند ایک تھرماس کے ہے زیادہ محفوظ رہتا ہے جہانتک کام کا تعلق تھا مانی بہت مستعد تھی، وہ کبھی ضرورت سے زیادہ نوکر نہ رکھتی تھی، اوسکا خیال تھا کہ جس کام کو وہ خود انجام دیسکتی ہے اوسکے لیے نوکر رکھنا محض اپنے روپیہ کے ساتھ گرہ کٹ کا پارٹ کھیلنا تھا۔ نہ اوسکا دل کسی کے لیے بیقرار تھا نہ وہ محبت کی ناکامی سے تلخ ذائقے سے

واقف تھی۔ ہمیشہ کام کرنا اور پس انداز کرنا اوس کا مشغلہ تھا۔ بدیں وجہ نہ وہ کبھی بیمار ہوتی اور نہ مغموم۔

شوہروں کی ایک بڑی جماعت کیلیے یہ کافی ہے، صرف کافی ہی نہیں بلکہ خوش نصیبی ہے، کیونکہ محبت کرنیوالی بیوی وہ ہے جسکو فراموش کردینا اوسکے شوہر کے لیے محال ہو جاتا ہے اور متواتر یادداشت کی تھکن زندگی کے شباب کو گھٹا دیتی ہے۔ آدمی اپنی کمر سے اُسی وقت واقف ہوتا ہے جبکہ اوسکو درد کمر کی شکایت ہوتی ہے۔ اور درد کمر کی شکایت کو گھر کی تمام زندگی میں لوگ محبت اور بیوی کی موجودگی پر مبنی کرتے ہیں۔ میری آزاد رائے یہ ہے کہ ضرورت سے زیادہ شوہر کی اطاعت بیوی کی ایک اچھی خاصیت کی دلیل ہو تو ہو لیکن یہ شوہر کے لیے تسکین دہ نہیں ہے۔

مجھے اُمید ہے کہ میں جناب کی سمع خراشی نہیں کر رہا ہوں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ میں تنہا رہتا ہوں۔ اپنی بیوی سے بالکل علحدہ۔ بدیں وجہ مجھے اسکا موقع ملتا ہے کہ میں اس قسم کے سوالات کے متعلق سوچ سکوں لیکن میں اسکی بحث اپنے شاگردوں سے نہیں کرسکتا ہوں۔ دوران گفتگو میں آپ دیکھیں گے کہ میں نے ان پر کتنا غور و خوض کیا ہے"

جیسے ہی اونسے سلسلہ کلام کی ابتدا کی تھی قریب کی جھاڑی سے گیدڑوں نے شور مچانا شروع کردیا۔ اسکول ماسٹر نے سلسلۂ کلام کو ایک منٹ کے لیے منقطع کردیا۔ جب شور کم ہوگیا اور سطح زمین پر دوبارہ خاموشی چھیل گئی اوس نے اپنی روشن آنکھیں رات کی تاریکی میں کھولیں اور پھر اپنا قصہ بیان کرنا شروع کردیا۔

"دفعتہً بھوشن کی تجارت میں کچھ خرابیاں واقع ہوئیں۔ میں فی الواقع یہ نہیں بتا سکتا کہ کیا اور کس قسم کی۔ صرف اسقدر کہدینا کافی ہے کہ کسی سبب ناگہانی سے بازار میں اوسکا اعتبار جاتا رہا تھا۔ اور اگر وہ پھر ڈیڑھ لاکھ روپیہ کسی نہ کسی طریقے سے فراہم کرکے اہل بازار کے سامنے پیش کرسکتا تو گئی ہوئی ساکھ واپس لے سکتا تھا اور پھر دوبارہ اپنی تجارت میں کامیابی حاصل کرسکتا تھا۔

پس اونسے یہ دیکھنا شروع کیا کہ آیا وہ قرض لے سکتا ہے لیکن ایسی صورت میں اوسکو قابل اطمینان ضمانت دینا ضروری ہوگی اور سب سے بہتر ضمانت جواہرات ہیں۔

بھوشن اپنی بیوی کے پاس گیا، مگر بدقسمتی سے اونسے اپنے کو اسکا اہل نہ پایا کہ وہ اپنی بیوی سے اتنی آزادی سے آنکھ ملا سکے جیسا کہ عموماً لوگ کرتے ہیں۔ اوسکی محبت اپنی بیوی کے لیے اس قسم کی تھی جسکی راہ میں قدم رکھنے کے لیے نہایت احتیاط کی ضرورت تھی اور جو کچھ اوسکے دماغ میں تھا اوسکو

وہ آزادی سے بیان نہ کر سکتا تھا۔ اوسکی مثال ایسی ہے جیسی آفتاب کی کشش زمین کے لیئے جو باوجود زیادہ مستحکم ہونے کے اسکے درمیان میں کافی فاصلہ رکھتی ہے حتیٰ کہ بسا اوقات ایک بڑے فسانہ کا ہیرو بھی جب وہ بالکل مجبور ہو جاتا ہے اپنی محبوبہ سے ایسی چیزوں کا متلاشی مثلاً روپیہ نوٹ کا ذکر کرتا ہے تو الفاظ رُک رُک کر نکلتے ہیں آواز دبی ہوئی اور کشیدہ خاطری کی جھجک نمایاں ہوتی ہے، بدنصیب بھوشن یہ کہنے سے مجبور تھا۔ "دیکھو مجھے روپیہ کی ضرورت ہے اپنے جواہرات لے آؤ"

آخر کار اوسنے اپنی بیوی سے اِس موضوع پر گفتگو شروع کی لیکن اُسی شرم و نزاکت کے ساتھ اوسکی بیوی بجائے اسکے کہ ہمدردی ظاہر کرتی چراغ پا ہو گئی اور اوسکے قلب میں خواہ مخواہ اختلاف کی آگ مشتعل ہو گئی۔ جب مانی کی سخت نگاہیں بھوشن کے چہرے پر پڑکر خاموش ہو گئیں تو اوسکے دل پر ایک کاری چوٹ لگی۔ مگر اُس چوٹ کے واپس کرنیکی قابلیت اُسمیں نہ تھی، اوسکا سبب یہ تھا کہ غریب بھوشن میں اُس سنگدلی کا جو مرد کی خصوصیات میں سے ہے نشان تک بھی نہ تھا اگر کسی نے اُسکو اِس بارہ میں لعنت ملامت کی ہوتی تو غالباً اوسنے حسب ذیل پاکیزہ حسیات کا اظہار کیا ہوتا۔

"اگر میری بیوی خوشی سے اپنے جواہرات میرے اعتبار پر نہیں دینا چاہتی تو مجھے کوئی حق نہیں ہے کہ میں زبردستی اُس سے لیلوں" میں جو کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کیا خدانے طاقت اور سنگدلی انسان کو محض اسلیے عطا کی ہے کہ وہ اپنا وقت پاکیزہ و نفیس خیالات کی نزاکت تولنے میں صرف کرے؟

الغرض کچھ بھی ہو بھوشن کی حمیت نے یہ گوارا نہ کیا کہ وہ جواہرات کو ہاتھ لگائے۔ وہ فوراً کلکتہ چلا گیا تاکہ دوسرے ذرائع سے قرض دستیاب کرے۔

یہ کلیہ ہے کہ بیوی شوہر کو برخلاف اسکے کہ شوہر بیوی کو زیادہ بہتر طریقے سے پہچانتی ہے، لیکن موجودہ زمانہ میں آدمی بلا لحاظ اپنی خلقت کے اس غیر آمیزش عقل حیوانی کی قطار سے جسکو عورتوں نے صدہا سال میں حاصل کیا ہے بالکل دور ہیں۔ یہ آدمی ایک نئی نسبت میں اور قریب قریب اتنے ہی راز دار بن گئے ہیں جتنا کہ عورتیں خود، معمولی طبقہ کے لوگ سرسری طریقہ سے تین قسموں میں منقسم ہوسکتے ہیں، کچھ انمیں سے وحشی ہیں، کچھ بیوقوف، کچھ اندھے، لیکن جدید تہذیب کے آدمی ان میں سے کسی میں بھی نہیں آتے ہیں۔

مانی نے اپنے مشیر کو صلاح کے لیے بلایا۔ اوسکا خود ایک بھتیجہ بھوشن کی ریاست میں نائب داروغہ کے عہدے پر مامور تھا، وہ اِس قسم کا آدمی نہ تھا کہ محنت و مشقت سے اپنی ذات کو فائدہ پہونچا سکے۔

لیکن خاندانی عہدہ کی وجہ سے وہ اپنی تنخواہ یا اس سے زائد بچا لیتا تھا۔

مانی نے اوسکو بلایا اور جو کچھ پیش آیا تھا بیان کر دیا۔ آخر میں اوسنے دریافت کیا کہ اوسکی کیا صلاح ہے۔ اوسنے اپنے سر کو عقلمندوں کی طرح سے حرکت دی اور کہا کہ میں بیزدوں کی شکل دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ اور عقلمند آدمی ایسا ہی کرتے ہیں۔ پھر اُسنے کہا کہ بابو کو قرض ملنا دشوار ہے وہ یقیناً تمہارے جواہرات پر ہاتھ صاف کرینگے۔ انسانی فطرت کو مدنظر رکھتے ہوے اُسے بھی اس کا یقین آگیا۔ اُسکی پریشانی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی۔ اوسکے کوئی بچہ نہ تھا جسکی محبت اوسکے دل میں ہوتی۔ البتہ ایک شوہر تھا وہ مشکل سے اسکی اہل تھی کہ اپنے شوہر کے وجود کو محسوس کر سکتی۔ پس اوسکا خون یہ سوچ کر منجمد ہو گیا کہ اوسکی محبت کا انتہا مقصد دولت جو ایک بچہ کے مانند سال بسال بڑھی ہے ذرا سے تفنن میں تجارت کے عمیق گڑھے میں پھینک دی جائیگی۔ وہ ٹھہری "پھر کیا کرنا چاہیے"

مادہو نے کہا۔ "جواہرات لیکر اپنے باپ کے گھر چلی جاؤ" اوسنے اپنے دل میں سوچا اور یہ اُمید کی کہ اُن جواہرات میں سے تھوڑا یا بہت حصہ اوسکے ہاتھ لگ جائیگا۔

مانی فوراً راضی ہو گئی۔ موسم گرما کا اختتام تھا اور رات میں پانی برس رہا تھا۔ اُس گھاٹ پر ایک کشتی لائی گئی۔ مانی نے سر سے پیر تک ایک شال لپیٹ لی اور کشتی میں سوار ہو گئی۔

گھٹا چھائی ہوئی تھی غضب کی تاریکی تھی۔ مینڈک شور مچا رہے تھے۔ مادہو نیند سے چونک کر کشتی سے اُٹھا اور یوں گویا ہوا "جواہرات کا صندوقچہ مجھے دیدو" مانی نے جواب دیا "ابھی نہیں بعد میں۔ اب ہمکو روانہ ہو جانا چاہیئے" کشتی روانہ ہوئی اور نہایت تیزی سے دریا کے بہاؤ کے سمت چلدی۔ مانی نے تمام شب اپنے جسم کے ہر حصے کو مع جواہرات کے پوشیدہ رکھنے میں گذار دی وہ خائف تھی کہ اگر اوسنے جواہرات کو صندوقچہ میں رکھدیا تو ممکن ہے کہ صندوقچہ اوسکے ہاتھوں سے چھین لیا جائے اگر وہ اُن کو پہنے رہے گی تو کوئی شخص بلا اوسکو قتل کیے ہوے نہ لے سکیگا۔ یہ سچ ہے کہ مانی بھوشن کو نہ پہچان سکی مگر اوسکو مادہو کے پہچاننے میں کوئی شبہہ نہ تھا۔

مادہو نے داروغہ کو یہ خط لکھدیا کہ وہ اپنی ملکہ کو اوسکے باپ کے یہاں پہنچانے جا رہا ہے۔ داروغہ بھوشن کے باپ کے قدیم ملازمین میں سے تھا۔ وہ برافروختہ تھا اوس نے ایک طویل خط غلطیوں سے بھرا ہوا اپنے مالک کو لکھا حالانکہ خط قواعد کی غلطیوں سے پُر تھا تاہم اوسکے الفاظ زوردار تھے

اور کاتب کی ناپسندگی کا اظہار عورتوں کی بہت زیادہ خاطر و مدارات کرنے کے معاملے میں کر رہی تھے۔

بھوشن کو جب یہ خط ملا وہ سمجھ گیا کہ مانی کا اس پوشیدہ روانگی سے کیا مقصد ہے۔ وہ نہایت مغموم ہوا کہ باوجود اس امر کے کہ وہ اِس مصیبت کے وقت میں اپنی بیوی کے خلاف مرضی جواہرات لینے کے لیے آمادہ نہ تھا پھر بھی اُس سے مشکوک و بدگمان تھی

بھوشن بجائے غصہ ہونے کے صرف ملول خاطر تھا۔ قدرت اسکی متقضی ہے کہ انسان کو ایک نہایت معمولی بات پر جنگل کی آگ کے مانند غصہ آجاتا ہے۔ عورت بلاکسی وجہ کے آنسوؤں کا دریا بارش کی طرح بہانے لگتی ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قدرت کے نظام میں تغیر ہوگیا ہے اور اب یہ کلیہ صحیح نہ تھا۔ بھوشن نے اپنا سر جھکا لیا۔ اور دل میں کہنے لگا۔ خیر اگر تمھارا یہی خیال ہے تو ہو میں صرف اپنے فرض کو انجام دونگا۔ اب سے پانچ چھ صدیاں پہلے بھوشن کا وجود ہونا چاہیے تھا جبکہ دنیا کے جذبات کی پنہاں قوتیں جنبش دیکھتی تھیں، صرف یہی اوسکی بدقسمتی نہ تھی کہ وہ اُنیسویں صدی میں پیدا ہوا بلکہ ایک ایسی عورت کے ساتھ شادی کرنا بھی جو اس ابدی و ابتدائی زمانہ سے متعلق تھی جو ہر زمانے میں قائم رہنے کی کوشش کرتی ہے۔ اوسنے ایک لفظ بھی اپنی بیوی کو نہ لکھا اور ارادہ کیا کہ وہ کبھی پھر اُس سے اسکا اظہار نہ کریگا۔ آہ کیا ہی خوفناک سزا۔ بھوشن دس یا بارہ روز کے بعد جبکہ ضروری قرض حاصل کرسکا اپنے مکان واپس ہوا۔ اوسنے خیال کیا کہ مانی اپنا مقصد پورا کرنیکے بعد اپنے باپ کے یہاں سے واپس آگئی ہوگی۔ وہ اندر کے کمرے کے دروازہ کے پاس پہونچا اوسنے یہ سوچا کہ آیا اوسکی بیوی اپنے بیجا شکوک پر اظہار شرم و تاسف کرے گی یا نہیں۔ اوسنے دروازہ کو بند پایا۔ قفل کو توڑ کر کمرے میں داخل ہوا کیا دیکھتا ہے کہ وہ خالی ہے۔ بیوی کی عدم موجودگی پر پہلے بھوشن متفکر نہیں ہوا اُسنے خیال کیا کہ اگر وہ آنا چاہے گی چلی آئے گی۔ آخر کار اوسکا قدیم داروغہ اوسکے پاس آیا اور کہنے لگا

اگر کوئی خبر نہ لیگی تو اس سے کیا فائدہ نکلے گا۔ آپ کو بیگم صاحب کی خبر منگانا چاہیئے۔ اِس صلاح پر عمل کرتے ہوئے خدام مانی کے یہاں بھیجے گئے، وہاں سے یہ اطلاع آئی کہ اس وقت تک نہ مانی یہاں پہونچی اور نہ مادھو۔ اب ہر طرف تلاش ہوئی۔ پولیس سے مادھو کی حلیہ تبلائی گئی لیکن سب بیکار۔ اُن کو اس کا علم نہ ہوسکا کہ کونسی کشتی میں وہ لوگ سوار ہوئے اور کس ملاح کو

کرایہ پر لیا۔ یا کس راستے سے گئے۔

ایک دن شام کو جب تمام اُمیدیں منقطع ہو گئیں بھوشن اپنے اُجاڑ کمرے میں گیا۔ کرشن جھلاج کی سالگرہ کا دن تھا۔ بارش صبح سے متواتر ہو رہی تھی۔ سالگرہ کی خوشی میں گاؤں کے لوگ خوشیاں منا رہے تھے میلہ لگا ہوا تھا۔ ایک عارضی عمارت میں تھیٹر ہو رہا تھا۔

بھوشن تاریکی میں تنہا کھڑکی کے کنارے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نہ پانی کے گرنے کی آواز، اور نہ گانے کی صدا، نہ ہوا کی تیزی کو محسوس کر سکا۔ اسکے کمرے کی دیوار پر لکشمی اور سورستی دیویوں کی خوبصورت تصویریں لگی ہوئی تھیں، کپڑے ٹانگنے کی قطار میں ایک تولیہ ایک باڈی اور ایک جوڑ ساڑی گویا استعمال کرنیکے لیے نکالکر ٹانگی گئی تھیں، کمرے کے گوشے میں ایک چھوٹی میز پر باندان رکھا ہوا تھا جس میں مانی کے بنائے ہوئے پان موجود تھے، جو اَب بالکل خشک ہو گئے تھے اور کھانیکے قابل نہ تھے۔ شیشے کی ایک الماری میں سب چیزیں مثلاً اوسکے بچپن کی چین کی گڑیاں، عطر کی شیشیاں، رنگین شیشے کے قرابے، نہایت خوبصورت تاش کی جوڑی، بڑے چمکیلے اور پالش کیے ہوئے گھونگھے۔ حتیٰ کہ صابون کے خالی بکس قرینے اور سلیقے سے آراستہ تھیں۔ ایک طاق میں مانی کا پسندیدہ چھوٹا لمپ مع اپنے گول گلوب کے رکھا ہوا تھا۔ ہر شام کو مانی اوسکو اپنے ہاتھ سے جلایا کرتی تھی۔ وہ شخص جو ہر شئے کو خالی چھوڑ کر چلا جاتا ہے اپنی زندہ دلی کا نشان بھی چھوڑ جاتا ہے۔

رات کی خاموش تاریکی میں جبکہ پانی تھم گیا تھا اور گاؤں کے تھیٹر کے گانے والوں کی آوازیں ساکت ہو گئی تھیں۔ بھوشن پہلے کی طرح اپنی جگہ پر اُسی حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ کھڑکی کے باہر کے سمت غضب کا اندھیرا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا فراموشی کا دروازہ اُسکے سامنے ہے جو آسمان تک پہونچ رہا ہے وہ چلنے ہی والا تھا کہ پھر ایک بار اُن چیزوں کا نظارہ کرے جو ہمیشہ کے لیے اوجھل ہوتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

جس وقت وہ اِس خیال میں غرق تھا ایک جھجھناہٹ کی آواز زیورات کی جھنکار کے مانند اوسکو سنائی دی۔ یہ آواز گھاٹ کی سیڑھیوں کی طرف بڑھتی ہوئی معلوم ہوئی۔ دریا کے پانی رات کی تاریکی اِن دونوں میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ بھوشن میں ایک غیر معمولی جوش پیدا ہوا اوسکی مشتاق آنکھوں نے تاریکی میں گھسنے اور چلنے کی کوشش کی، یہانتک کہ وہ تھک گئیں اور دُکھنے لگیں لیکن وہ کچھ نہ دیکھ سکا

جتنا اوسکا اشتیاق دیکھنے کے لیے بڑھتا گیا، تاریکی اُس سے زیادہ ہوتی گئی اور باہری دنیا اور بھی دھندھلی ہو گئی،

آواز نہانے کے گھاٹ کی آخری سیڑھی تک پہونچکے مکان کے سمت آنا شروع ہوئی اور اُس دروازہ کے پاس تک آکر رک گئی جسکو دربان نے میلہ جانے کے قبل مقفل کر دیا تھا۔ پھر ایسا معلوم ہوا گویا کوئی شخص دروازہ کو زیورات سے کھٹکھٹا رہا ہے۔ اب بھوشن کو اپنی جگہ پر بیٹھنے کی تاب نہ رہی۔ وہ اندھیرے کمروں سے گذرتا ہوا تاریک زینے سے اُتر کر بند دروازہ کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔ اوسنے اپنی پوری قوت سے اوسکو ہلانا شروع کیا۔ اِس زوردار آواز نے جس سے اسنے دروازہ کو جنبش دی دفعتہً اوسکو بیدار کر دیا اوسکو معلوم ہوا کہ وہ سو رہا تھا اور نیند میں وہ نیچے مکان کے دروازہ تک آپہنچا۔ اوسکا سارا جسم پسینے میں ڈوبا ہوا تھا، اوسکے ہاتھ پیر برف کے مانند سرد تھے۔ اوسکا دل ایک جلد گل ہو جانیوالے چراغ کی طرح دھڑک رہا تھا۔ اوسکی نیند اُچٹ گئی۔ اوس نے معلوم کیا کہ باہر سوائے پانی برسنے کی آواز کے اور کوئی آواز نہ تھی۔

میلے کا سلسلہ دوسرے روز بھی باقی تھا اور دربان پھر رخصت پر تھا۔ بھوشن نے حکم دیا کہ بڑے کمرے کے دروازے تمام رات کھلے رہیں۔ شب میں روشنی ٹھنڈی کر نیکے بعد بھوشن پہلے کی طرح اپنے سونے والے کمرہ کی کھڑکی کے کنارے بیٹھ گیا۔ آسمان بادل کی گھٹاؤں سے سیاہ ہو رہا تھا۔ ہر شئے پر خاموشی کا دَور دَورہ تھا۔ مینڈکوں کا پریشان کن شور و غل دور کے گانے کی آوازیں بجائے خاموشی توڑنیکے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اوسمیں مطابقت کا اضافہ کر رہی ہیں۔ شب کا بڑا حصہ گذرنے پر مینڈک جھینگر اور جھیلر کے لڑکے خاموش ہو گئے اور تاریکی پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ پہلی رات کی طرح پھر ایک جھنجھناہٹ کی آواز دریا کے گھاٹ کی طرف سے آئی لیکن اِس بار بھوشن نے اِس طرف نہیں دیکھا، مبادا بیقراری دیکھنے کے باعث اوسکی قوت بصارت زائل نہ ہو جائے۔ اوسنے اپنے کو سنبھالنے کی ایک بلیغ کوشش کی اور خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔

زیورات کی آواز گھاٹ کی طرف سے آہستہ آہستہ بڑھی اور کھلے ہوئے دروازہ میں داخل ہو گئی۔ پھر چکر لگاتی ہوئی اُس زینہ کی طرف آتی ہوئی معلوم ہوئی جو کہ اندر کے کمرے سے ملحق تھا۔

بھوشن کو اپنے تئیں سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ اوسکا دل زوروں سے اُچھلنے لگا۔ اسکا حلق جوش وخروش کے دبنے کے باعث جکڑ گیا آواز زینے کے سرے پر پہونچکر برآمدے سے گذرتی ہوئی کمرے کے دروازہ کی طرف آتی ہوئی معلوم ہوئی جہاں کہ وہ جھنجھناہٹ کے ساتھ رک گئی۔ بھوشن سے اب ضبط نہ ہوسکا وہ بیساختہ چلا اُٹھا "ماتی" اور نہایت تیزی سے اپنی کرسی پر اُچھل پڑا۔ اُسکی آنکھ کھل گئی اُسنے دیکھا کہ اوسکی چیخ سے کھڑکیوں کی سلاخیں گونج رہی ہیں اور باہر کی طرف سے مینڈکوں کی آواز اور پانی برسنے کا شور سنائی دے رہا ہے۔

نااُمیدی میں بھوشن نے اپنی قسمت پر ہاتھ مارا۔

دوسرے روز میلہ ختم ہوگیا۔ دوکاندار اور تماشبینوں کی جماعت چلی گئی۔ بھوشن نے حکم دیا کہ گھر میں سوائے اوسکے کوئی شخص اِس رات کو نہ سوئیگا۔

شام کے وقت وہ خالی مکان کی کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ اِس رات کو بادل جابجا سے منتشر ہو گیا تھا اور ستارے نظر آرہے تھے۔ ماہتاب دیر میں نمودار ہوا تھا اور چونکہ میلہ ختم ہو گیا تھا اسوجہ سے دریا میں کوئی کشتی نہ تھی۔ باشندگان دیہہ متواتر دو رات جاگنے کی وجہ سے گہری نیند میں مشغول تھے۔ بھوشن اپنے سر کو کرسی کے تکیہ پر ٹیکے ہوئے تھا۔ اوسکی نظر ستاروں پر جمی ہوئی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ستارے ایک ایک کرکے غائب ہوگئے۔ جسطرح پلکیں تھکی ہوئی آنکھوں پر بند ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں، اِسی طرح آسمان اور زمین کے سیاہ اور تاریک پردے مل رہے تھے۔ آج کی رات بھوشن کا دماغ کافی مطمئن تھا، اوسکو یقین تھا کہ وہ وقت آگیا ہے کہ اوسکے دل کی تمنا پوری ہوگی اور موت اُن تمام رازوں کا انکشاف کردیگی۔

دریا کے گھاٹ کے جانب سے آواز گذشتہ راتوں کی طرح آئی اور سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ بھوشن نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور مراقبہ میں بیٹھ گیا۔ آواز خالی ہال میں پہونچی۔ وہ زینے کے چکردار سیڑھیوں پر سے گھومتی ہوئی آئی پھر اوسنے برآمدے کی لنبان کو طے کیا اور سونے کے کمرے کے دروازے پر کچھ دیر کے لیے ٹھہری۔

بھوشن کا دل زوروں سے دھڑکنے لگا۔ اوسکا سارا جسم تھرتھرا رہا تھا۔ مگر ابکی بار اوسنے آنکھیں نہیں کھولیں۔ آواز دہلیز کو پار کرکے کمرے میں داخل ہوئی۔ اور آہستہ آہستہ کمرے میں چلنا

شروع کیا اور کھونٹیوں کے پاس جہاں کپڑے ٹانگے جاتے تھے لیمپ رکھنے کی جگہ پر جہاں بیز جیسی خشک بان پڑے ہوئے تھے۔ الماریاں جس میں طرح طرح کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں ٹھہرتی ہوئی بھوشن کے قریب آکر رک گئی۔

بھوشن نے آنکھیں کھولیں۔ اُسنے چاند کی دھندلی روشنی میں کیا دیکھا ہے کہ اوسکی کرسی کے سامنے ایک ڈھانچہ سیدھا کھڑا ہے اُسکی انگلیوں میں انگوٹھیاں تھیں۔ کلائیوں میں کڑے، بازوبند بازوؤں پر، چندن ہار گلے میں اور سر پر ایک سنہرا پھول۔ اوسکا تمام جسم سونے اور جواہرات سے مزین اور چمک رہا تھا۔ زیورات اپنے اپنے مناسب جگہ پر لٹک رہے تھے مگر گرتے نہ تھے۔ سب سے زیادہ خوفزدہ یہ منظر تھا کہ دونوں آنکھیں جو کہ چھوٹے چہرے پر چمک رہی تھیں اُن میں زندگی کے آثار پائے جاتے تھے۔ دو سیاہ اور نم پتلیاں پلکوں کے درمیان دیکھ رہی تھیں۔ جوں ہی اُسنے دیکھا اوسکا خون رگوں میں منجمد ہوگیا، اُسنے آنکھیں بند کرنیکی کوشش کی لیکن ناکامیاب رہا۔ اوسکی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ایک مردہ انسان کی آنکھوں کی طرح دیکھ رہی تھیں۔

اُسوقت اُس ڈھانچہ نے ساکت اور خاموش بھوشن کے چہرے پر اپنی نظر جمائے ہوئے آہستہ سے اپنے ہاتھ پھیلائے، جواہرات کی انگوٹھیاں اوسکی نازک اور چھوٹی انگلیوں میں چاند کی ہلکی اور خفیف روشنی میں چمک رہی تھیں۔ بھوشن حواس باختہ انسان کی طرح کھڑا ہوگیا تھا اور ڈھانچے کا جس نے کمرہ چھوڑ دیا تھا تعاقب کیا۔ اوسکی ہڈیاں اور زیورات خالی آواز کے مانند کڑک رہے تھے۔ برآمدہ طے کیا گیا تاریک سیڑھیوں سے اُترتے ہوئے زینے کے نیچے حصے تک پہونچے۔ نیچے کے برآمدے سے گذر کر خالی اور تاریک ہال میں پہونچے۔ ہال سے گذرتے ہوئے باغ کے ملحق پختہ راستے پر آئے۔ راستے کی اینٹیں ہڈی دار پیروں کے نیچے چرچرا رہی تھیں۔ چاند کی دھندلی روشنی شاخوں کے گھنے جال سے لڑ رہی تھی۔ راستہ مشکل سے نظر آتا تھا۔ تاریکی میں کبھی کبھی جگنو کی چمک راستہ کے تلاش کرنے میں مدد دیتی تھی۔ وہ دریا کے گھاٹ تک پہونچے انھیں سیڑھیوں سے جن سے آواز آئی تھی مرصع و مزین ڈھانچہ قدم بہ قدم سخت آواز و رفتار کے ساتھ نیچے اُترا۔ دریا کی تیز موجوں پر جن میں بارش کی زیادتی سے طغیانی آئی ہوئی تھی چاند کی روشنی کی ایک دھندلی لکیر نمایاں تھی۔ ڈھانچہ دریا میں اُترا اور بھوشن نے اُسکا تعاقب کرتے ہوئے ایک قدم پانی میں رکھا جیسے ہی اوس نے پانی کو مس کیا وہ چونک کر جاگ پڑا۔

اوسکا نمایندہ اب دکھائی نہ پڑتا تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر صرف درخت خاموش کھڑے تھے۔ سر پر نصف چاند مسلط تھا گویا وہ متعجب تھا۔

بھوشن کے جسم میں سر سے پیر تک ایک سنسناہٹ پیدا ہوئی، اوسکا قدم پھسلا اور وہ سر کے بل دریا میں گر پڑا، وہ دنیائے خواب سے جسمیں اُسنے ایک منٹ کے لیے قدم رکھا تھا بیدار ہوا تاکہ دوسرے لمحہ ہمیشگی کی نیند میں غافل ہو جائے!

اپنا قصہ ختم کرنیکے بعد اسکول ماسٹر تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ جوں ہی وہ ٹھہرا میں نے یہ محسوس کیا کہ صرف اسکے لیے تمام دنیا خاموش و بیحرکت ہو گئی تھی۔ عرصہ تک میں بھی بلا کسی گفتگو کے بیٹھا رہا اور تاریکی میں وہ یہ دیکھنے سے معذور تھا کہ میرے چہرے کا کیا رنگ ہے!

بالآخر اُس نے دریافت کیا "کیا تم اِس قصہ کو باور نہیں کرتے ہو؟" میں نے پوچھا "کیا تم؟" اُسنے کہا "نہیں۔ میں ایک دو سبب بھی بتلا سکتا ہوں کہ کیوں نہیں۔ سب سے پہلے یہ سبب ہے کہ قدرت جو مانند ایک شریف عورت کے ہے ناولیں نہیں لکھتی ہے۔ اُسے اِن باتوں کے علاوہ بہت کچھ کرنے کو رہتا ہے"

میں مخل ہوا اور کہا "دوسرا سبب یہ ہے کہ اتفاق سے میرا ہی نام بھوشن شاہ ہے" اسکول ماسٹر نے بلا کسی شرم و حیا کی علامت کے کہا "میں خود استعد شیانہ سے جان گیا تھا۔ اور تمھاری بیوی کا کیا نام تھا؟" میں نے جواب دیا "مانی"

(ترجمہ ٹیگور)

جناب چودھری صابر علی صاحب صابر شاہ ڈیلوی

ہے نالۂ عندلیب جان سوز ... فریاد دلِ حزین جہاں سوز
مضطرب مرا دل تڑپ گیا ہے ... کیا ساز میں ہے ترے نہاں سوز
ارمان مرے خاک ہو گئے ہیں ... کاشانۂ دل ہے میہماں سوز
تدبیر صعود بامِ رفعت ... تقدیر نہ ہو جو نرد بان سوز
نظارہ کی آنکھ کو نہ تھی تاب ... خود تیر نظر بنا کمان سوز
جل جاتا ہے دیکھ کر نشیمن ... تنکے ہیں یہ چند باغبان سوز
میں جیب تو نہیں ہوں گریہ رہا ہوں ... ہاں شمع فراق ہے وہاں سوز
صابر کہیں کس سے حالتِ دل ... غمخوار رہا نہ کوئی جاں سوز

دوستداران بشر

فلورنس نائٹ انگیل

گزشتہ سے پیوستہ

محترمہ ساجدہ بیگم صاحبہ

مشار الیہا کے کیسر ورت آنے کے کچھ ہی دنوں بعد اُنکی نگرانی میں چودہ بیمار لڑکے دیے گئے جنکی تیمارداری میں روزانہ ۱۲ گھنٹے صرف ہوتے تھے۔ اور یہ کوئی آسان بات نہ تھی اسلیے کہ ان سب کی نگرانی تنہا اُن کے ذمہ تھی۔ اُن میں سے بعض کی صحت اس قابل ہوگئی کہ اُنھیں ہر وقت بستر پر پڑے رہنے کی حاجت نہ تھی لہذا ضروری تھا کہ یا تو وہ اپنے روزمرہ کے درس میں یا اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہیں لیکن چند ہی ہفتہ کے بعد اس انتظام میں تبدیلی کردی گئی۔ اور چند ماہ کے بعد مشار الیہا ناظم مدرسہ بنادی گئیں اور کل لڑکوں کا انتظام اور بندوبست انکی نگرانی میں دیدیا گیا۔ ایک وقت تو اُن کے دلمیں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کام کو بکمال یاس و حرماں ترک کردیں لیکن بہت جلد انھوں نے ملاحظہ کیا کہ لڑکوں کے اطوار و حرکات میں تغیر پیدا ہو رہا ہے اور ان کی حالت بہتر ہوتی جاتی ہے۔ ایک خط میں جو اپنی قوم کے نام تحریر کیا تھا لکھتی ہیں "ان (لڑکوں) کے حق میں ایک گونہ مادرانہ محبت محسوس کرتی ہوں

روز بروز انکی حالت سدھرتی جاتی ہے۔ ایکدن اتفاق سے کیسر ورث میں یہ خبر مشہور ہوئی کہ ملک شام کا انگریزی مریضخانہ نہایت ابتر حالت میں ہے اور مریض تندرست دونوں ایسی جگہ میں رہتے ہیں جو کوڑے کرکٹ سے پٹی ہوتی ہے۔

چنانچہ اگنس جونس کو وہاں جانیکا خیال ہوا۔ اپنی ماں کو خط لکھ کر اجازت طلب کی لیکن رئیس ادارہ خیریہ کی رائے سے انگلستان واپس آئیں اور یہاں آکر ایک خاتون سے ملیں جو رئیس ادارہ دعات تھیں اور جنھوں نے اگنس کے لیے یہ تجویز کیا کہ وہ کل انجمن ہائے دعاۃ زنانہ کی ناظمہ ہو جائیں چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں مشار الیہا متعدد اشغال میں مصروف و سرگرم ہوئیں یعنی کبھی مجالس مادران اطفال اور مدارس مذہبی کے کاموں کو انجام دیتیں اور کبھی خاص خاص مطبخوں اور دعاۃ زنانہ کے ملاقات اور سونے کے کمروں کی نگرانی کرتیں اور اس محکمہ کے ہر شعبہ میں بے انتہا امداد دیکر مردانہ کوششوں سے کام لیتیں لیکن شہر لندن کے اندر اُن کے ان تمام کاموں کا یکایک خاتمہ ہوگیا اسلیئے کہ انھیں ایک تار موصول ہوا کہ اُن کی بہن روم میں مرض تپ میں مبتلا ہیں اسکے بعد ہی دوسرا تار ملا اُن کے وہاں جلد پہنچ جانے کی ضرورت ہے چنانچہ یہاں کا اپنا سب کام ٹھیک ٹھاک کرکے روم آئیں جہاں انھیں معلوم ہوا کہ اب ان کی بہن کی حالت خطرناک نہیں رہی لیکن اتفاق سے اُسی زمانہ میں اُن کے چچازاد بھائی بھی جو اسی جماعت میں سے تھے تپ میں مبتلا ہو گئے جنکی تیمارداری لازمی تھی۔ چونکہ دونوں مریضوں کی بیماری لطبی العلاج تھی اسلیئے اگنس نے قصد کرلیا کہ وہ فی الحال اپنے لندن کے مشاغل ترک کرکے ان مریضوں کی طرف متوجہ ہوں۔ چنانچہ کئی مہینے تک وہ روم میں رہیں لیکن اس اثنا میں خود انکی صحت خراب ہو گئی۔ لہذا تھوڑے عرصہ کیلیئے تبدیل آب و ہوا کی غرض سے سوئس چلی گئیں اور وہاں کے ادارات خیریہ میں اپنا وقت گذارنے لگیں۔

جسوقت مشار الیہا پیرس میں اپنی ماں اور بہن سے ملیں تو پہلی بات جو اُن سے کہی وہ یہ تھی کہ انھیں اس امر کی اجازت دی جائے کہ اپنی ساری عمر مریضوں کی تیمارداری میں صرف کردیں انھیں یقین تھا کہ جو خاص کام ان کے سپرد کیا جائے گا وہ یہی پرستاری مرضا ہوگا

اسی اثنار میں اُن سے یہ خواہش کی گئی کہ وہ مدرسہ مخصوص دایگان فقرار کی ناظم ہوجائیں لیکن اگنس جونس ایسی نہ تھیں کہ کسی کام کو اسمیں قابلیت حاصل کیے بغیر اپنے ذمہ لے لیتیں۔ اور اپنی استعداد کو جملہ کاموں کے قابل سمجھ کر یہ رائے قائم کرلیتیں کہ جس قسم کی خدمت بھی انھیں سپرد کی جائے گی اُسے بخوبی انجام دے لینگی۔ انھیں معلوم تھا کہ جس طرح اطبار کے لیے تعلیم و تربیت ضروری ہے اسی طرح دایہ بھی تعلیم کی محتاج ہے۔ لہذا ارادہ کرلیا کہ لندن کے مریضخانہ سینٹ طامس میں شامل ہوکر فن دائگی کی تعلیم حاصل کریں۔ خود انکا قول تھا: "اگر تمام لوگ عدم درایت کے عذر پر اپنے کام میں پہلو تہی کرنے لگیں تو پھر کب کوئی کام ہوسکے گا"۔ خلاصہ یہ کہ مریضخانہ مذکور میں داخل ہوگئیں۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ انھیں مریضوں اور دایوں کے درمیان رہ کر شایاں خدمتیں کرسکیں گی۔ کچھ ہی زمانہ کے بعد اجازت حاصل کرکے ایک چھوٹا سا مدرسہ تعلیم انجیل کے لیے قائم کیا جو سب مریضوں کے حق میں نافع ثابت ہوا۔ اُن کے جملہ احساسات جو مقرون بہ لطف و بشاشت تھے وہاں کے مریضوں کے نزدیک سورد تحمید و تحسین بنکر اُن کے دلوں کو شاد الٰہیا کی طرف کھینچ لیتے تھے اور وہ خود اپنی اس سجید مشغولیت سے بہت ہی خوش رہا کرتی تھیں چنانچہ لکھتی ہیں۔

"میں وہاں بہت خوش تھی اور اپنے کام کو بہت درست رکھتی تھی"۔

موصوفہ نے اس مدرسہ میں کامل ایک سال تک بڑی جانفشانی سے کام لیا جسکے بعد ہی لندن کے ایک چھوٹے سے مریضخانہ کی متکفل بنادی گئیں جہاں سے مریض خانہ کبیر شمال میں انکا تبادلہ ہوگیا۔ لیکن یہ کام اُنکے حوصلہ اور طاقت سے بڑھ کر تھا۔ اطبار کی رائے سے انھوں نے جاڑے کا موسم اپنے گھرانے والوں کے ساتھ آئرلینڈ میں گذارا اور ضمناً اپنے فرائض کی انجام دہی کے طور پر وہاں کے مریضخانہ کا انتظام بھی دیکھ لیا کرتی تھیں۔ اور اوائل ۱۸۶۵ء میں اپنے وطن مالوف سے پھر روانہ ہوگئیں۔

سارے انگلستان میں بعض عمارتیں ایسی ہیں جنھیں کارخانہ کہتے ہیں۔ یہاں ہٹے کٹے فقیروں کے لیے کام مہیا رہتا ہے لیکن ایسے فقیر جو کام کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں۔ انھیں مفت کھانے کو دیا جاتا ہے اور ان کارخانہ جات سے ملحق چند مریضخانے بھی رہتے ہیں۔ پہلے

تو یہ انتظام تھا کہ کارخانہ کے رہنے والے بھی (جو اکثر بدسلیقہ اور بداخلاق ہوا کرتے تھے) مریضوں کی تیمارداری کیا کرتے تھے معلوم ہی ہے کہ ایسے انتظام کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔ چنانچہ کسی سوداگر نے یہ رائے دی کہ ان بے علم اور ناہنجار تیمارداروں کے بجائے اگر دایگان باعلم رکھی جائیں تو زیادہ اچھا ہوگا۔ اُسنے خود اس بات کا ذمہ لیلیا کہ برابر تین سال تک اُن کے جملہ مصارف ادا کرتا رہیگا۔ اس کا خیال تھا کہ تین سال کے تجربہ کے بعد لوگ جب اس نئے انتظام کی خوبی اور وضع سابق کی برائی سے واقف ہو جائینگے تو پھر وضع قدیم کے لیے تقاضا نہ کرینگے۔ چنانچہ اگنس جونس یہاں کے دستۂ دایگان کی افسری کے لیے پیش کی گئیں۔

اب جس کام کا ذمہ مشار الیہا نے لیا تھا بہت ہی دشوار تھا۔ انکے زیر نگرانی تقریباً ۵۰ دائیں اور ۵۰۰ مریض تھے وہ روزانہ صبح سے ۵ بجے شام تک اپنے کام کی انجام دہی میں مشغول رہتی تھیں۔ کبھی کھانا تقسیم کراتیں دائیوں کے کام کی نگرانی کرتیں اور کبھی مریضوں کو دیکھنے جاتیں اور ان کی تیمارداری میں مصروف رہتیں غرضکہ محنت و مشقت برداشت کرنے سے کبھی منھ نہ موڑتیں۔ اُن کی کوشش ہمیشہ یہی رہتی کہ دوسروں کو راحت پہنچا کر انھیں خوش و خرم رکھیں مریض بھی اس جدید انتظام کے فوائد سے آگاہ ہو گئے اور دیکھ لیا کہ پہلے کی سختی اور غفلت کی جگہ اب جدید دایگان کے لطف آمیز برتاؤ نے لیلی ہے۔ اگنس جونس ایسے مریضوں کیلیے جو پڑھ سکتے تھے اُن کے کمروں میں مفید کتابیں رکھوا دیا کرتی تھیں اور محض اس خیال سے کہ مریضوں کا دل نہ گھبرائے کمروں کو رنگ برنگ کے پھولوں سے معطر اور مزین رکھا کرتی تھیں۔ اور مریضوں کے لیے اُن کے دوست و احباب سے ملنے کے واسطے آسانیاں بہم پہنچائی تھیں یہ معلوم ہوتا تھا کہ اگنس جونس کو ہمیشہ یہی فکر رہتی ہے کہ کون سا ایسا کام کریں جس سے مریض ہشاش بشاش رہ سکیں۔ یہاں دو سال تک رہنے کے بعد انھوں نے انجیل پڑھنا شروع کیا۔ چنانچہ یہ معمول ہو گیا کہ ایک ایک فقرہ کے درس کے وقت ۲۰-۳۰ آدمی موجود رہا کرتے تھے اور اتوار کے دن تو ایک سو سے بھی زیادہ مجمع ہو جاتا تھا۔ آئیے ذرا دیر کیلیے اگنس جونس کے اپنے زیر نگرانی مریضوں کے کمروں میں گردش کرنیکی حالت کا فوٹو نگاہ کے سامنے پیش کریں اور دیکھیں کہ کس طرح مریضوں اور کمزوروں کے ساتھ خاص توجہ سے پیش آتی ہیں۔ انکی طبیعت کو

جو وقار اور سکون حاصل تھا اُسکے آگے سخت سے سخت مزاج والے لوگ بھی سر اطاعت خم کر لیتے تھے۔ وہ جس طرف سے نکل جاتی تھیں لوگ بنگاہ شوق انکی طرف دیکھتے اور اس بات کے منتظر رہتے کہ وہ اُن سے ہمکلام ہوں۔ وہ خود لکھتی ہیں "کہ ایک نیک ذات لڑکا جسکا سارا بدن زخموں سے چور رہی بہت ہی شاد و مسرور رہے۔ چنانچہ جب وہ بانسری بجاتا ہے تو اُس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں حدقہ چشم میں رقص کرنے لگتی ہیں۔ اُسکے علاوہ کئی حبشی بھی یہاں ہیں جسوقت سے میں یہاں آئی ہوں ایک تو مر چکا ہے باقی کی حالت قابل اطمینان ہے انکی ہلاکت کا باعث زیادہ تر زکام ہوتا ہے۔" "مانیلا کا ایک شخص حالت احتضار میں ہے۔ مریضوں میں سے صرف ایک میری زبان سمجھتا ہے۔ آج پھر ایک بیچارہ حبشی کمرہ میں حالت احتضار میں پڑا ہے۔ اسکے سوکھے ہوے ہونٹ موت کا پتہ دے رہے ہیں۔ دل میں آیا کہ چلو اسکی تیارداری کریں۔ چنانچہ فوراً ہی اُسکی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی اور مصائب حضرت مسیح کے بارے میں چند باتیں اس سے بیان کیں۔" وہیں کے رہنے والے ایک پیر مرد کے خوش و خرم چہرہ سے بخوبی ظاہر ہو جاتا تھا کہ وہ جونس کی زیارت سے کس درجہ خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ خود مشار الیہا سے کہا کرتا تھا "مجھے ساری عمر میں ایک دوست بھی (حقیقی معنی میں) نصیب نہوا تھا حتیٰ کہ جب یہاں آیا تو خوش قسمتی سے آپ ملیں۔" مشار الیہا لکھتی ہیں "روزمرہ جب میں گشت کیلئے کمروں میں جاتی ہوں تو ایک نہ ایک شخص جسے کل زندہ چھوڑا تھا آج مردہ ملتا ہے۔"

اس سے بہت ہی پہلے ایک مرتبہ اگنس جونس اور انکی بہن کے درمیان یہ ذکر آیا کہ اگر اپنے امکان میں ہو تو اُن میں سے ہر ایک کس قسم کی موت پسند کرے گی۔ اگنس نے کہا "بہترین موت وہی ہے جو انسان کو اپنے فرائض کی انجام دہی کی حالت میں نصیب ہو۔" اتفاق کی بات ہے کہ مشار الیہا کا انتقال ایسی ہی حالت میں ہوا۔

کیا غزلگوئی امرد پرستی کی محرک ہے؟

(از جناب محمد حسین صاحب ادیب ایم، اے، بی، ای، ڈی حیدر آباد دکن)

(سلسلہ کے لیے جولائی، اگست ۱۹۳۱ء نمبر ملاحظہ ہو)

معشوق کے بظاہر مردانہ اوصاف کی تشریح۔ معشوق کے ناز و انداز کی آلات حرب سے تشبیہ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اول اول تو اس قسم کی تشبیہیں اور استعارے صرف اسلیے استعمال کیے گئے تھے کہ وہ بالکل سیدھے سادے اور فطری تھے اور ان سے کلام میں تازگی۔ دلچسپی اور بامزگی پیدا ہو جاتی تھی۔ لیکن انکے بکثرت استعمال اور سامعین کی لطف اندوزی کے اور بھی زبردست اسباب موجود تھے۔ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ کسی عہد کی ادبیات متعدد داخلی و خارجی قوتوں کے زیر اثر تشکیل پذیر ہوتی ہے۔ ان میں قومی خصائل اور سیاسی حالات کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جس زمانہ میں فارسی شاعری معرض وجود میں آئی وہ جنگ وجدل کا زمانہ تھا۔ ہر طرف کشت و خون کا بازار گرم تھا۔ حکومتیں بنتی اور بگڑتی تھیں۔ آئے دن سازشیں اور بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں۔ کوئی ایسا قرن نہیں گذرا جس میں عظیم الشان جنگ نہ ہوئی ہو۔ خونریزی کے چھوٹے چھوٹے واقعات کا تو ذکر ہی نہیں۔ وہ روزمرہ کی چیزیں تھیں جن کی طبیعتیں عادی ہو گئی تھیں۔ جرأت کش امن و امان کی نعمتیں مفقود تھیں۔ ایسے پُر آشوب زمانہ میں ہر شخص کو مدافعت یا اپنے بچاؤ کے لیے سپاہیانہ زندگی بسر کرنی پڑتی تھی۔ سب کی زبان پر جنگی واقعات کا ذکر رہا کرتا تھا۔ حربی آلات لوگوں کو جان کی طرح عزیز تھے۔ فن سپہ گری کی سب سے زیادہ قدر تھی۔ ایسے دور عسکریت اور فضائے جنگی میں جو شاعری نشو و نما پائے اسکی تشبیہوں اور استعاروں میں آلات حربی۔ اشیائے جہلکہ اور واقعات خونریزی کا کثرت سے حوالہ دیا جانا ایک فطری و ناگزیر امر تھا۔ مولانا محمد حسین صاحب آزاد فرماتے ہیں کہ "کسی ملک کا شاعر جو اپنی تشبیہیں اور استعارے کلام میں لاتا ہے اسے اسکا قصد آ ارادہ نہ سمجھو بلکہ وہاں کی اشیا جو ہر دم سامنے رہیں مجبور کرتی ہیں کہ ہم ہی سے

کام لو۔ اور ہمارے ہی ذریعہ سے مطلب ادا کرو اور شاعر بھی جانتا ہے کہ وہ اسی طرح اپنے مقصد میں جلد کامیاب ہوگا۔ کیونکہ اشیائے موجودہ کے پیرائے میں جو باتیں ادا کی جاتی ہیں وہ سننے والوں کے دلوں میں فوراً اثر کرتی ہیں طبیعتیں لطف اٹھاتی ہیں اور اسی کے چٹخارے سے زبان سے واہ واہ کے غل مچاتے ہیں۔

ہم جس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں اسوقت اسلحہ و اوزار لوگوں کا اوڑھنا بچھونا بنے ہوئے تھے۔ سرحد پار قبائلی علاقوں میں آج بھی وہی منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ ہر گاؤں میں رائفلوں کے کارخانے ہیں ہر قبائلی پٹھان اسلحہ سے لیس رہتا ہے۔ سفر ہو یا حضر کبھی وہ بغیر ہتھیار کے نظر آئیگا۔ اسوقت بھی ہر شخص آلات حرب سے آشنا تھا اور سب چیزوں سے زیادہ انکی قدر کرتا تھا۔ اسلیے شاعروں نے حربی آلات کو اظہار مطلب کا ذریعہ بنایا۔ اہل ملک نے بھی انکے کلام سے خوب لطف اٹھایا اور خراج تحسین ادا کیا۔

ہندی مسلمانوں کو بھی جنگی جذبہ اور جوش و تہور اپنے نبرد آزما و شجاعت شعار اسلاف سے وراثتاً منتقل ہوا تھا۔ ان خصائل ارثی و شعائر قومی کا اثر اردو شاعری پر بھی پڑنا ضرور تھا۔ حکومت انگلشیہ کے قیام تک اہل ہند کو صلح و آشتی کی "ہمت شکن برکتیں" اور امن و چین کی "جرأت سوز نعمتیں" اس فراوانی کے ساتھ کبھی نصیب نہیں ہوئی تھیں جیسی آج ہیں۔ یہاں اکثر بغاوتیں اور خانہ جنگیاں ہوا کرتی تھیں۔ کبھی جانشینی کے جھگڑے تھے کبھی اعلان خود مختاری کی کوششیں۔ کہیں حکومت کے خلاف سازشیں تھیں کہیں ملک گیری کی خواہشیں۔ غرض عجب ہنگامہ خیزیوں اور معرکہ آرائیوں کا زمانہ تھا۔ فوجی ملازمت ذریعہ عزت تھی بڑے بڑے امرا اور شہزادے فوجی منصبوں اور عہدوں کے گرویدہ تھے۔ عوام کو بھی فن سپہ گری سے خاص دلچسپی تھی۔ بعض شعرا بھی فن حرب میں خاص مہارت رکھتے تھے۔ چھوٹے بڑے، جوان بوڑھے سب کے دلوں میں جوش مردانگی موجزن تھا۔ بہادری و شجاعت کے اوصاف انسان کے جوہر تھے۔ غرضکہ لوگوں میں دلاوری و مردانگی کی روح باقی تھی اور ان کو آلات حرب سے اتنی مغائرت نہ تھی جتنی آج ہے۔ اسلیے معشوق کے ناز و انداز اور غمزہ و عشوہ کو آلات حرب سے تشبیہ دیتے ہیں شعرا اور سامعین دونوں کو لطف حاصل ہوتا تھا لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ ذرائع آمد و رفت اور حمل و نقل کی سہولتوں نے اہل ہند کو تن آسان و عیش پسند بنا دیا ہے۔ قانون اسلحہ کے نفاذ نے رہی سہی جنگی روح کو بھی فنا کر دیا۔ سائنس کی ترقی نے میدان جنگ کا نقشہ ہی بدل دیا۔ دشمن سے مردانہ وار مقابلہ کی ضرورت باقی نہ رہی بلکہ فاتح حریف کے متعلق کہا جاتا ہے کہ "چھپ چھپ کے آسمان سے گولہ گرا دیا

مارا" اہل ہند کو تو چھپ چھپ کر بھی کسی کو مارنے کی ضرورت نہیں بلکہ ان کو خود اپنی حفاظت و مدافعت کی ورد سری بھی اٹھانی نہیں پڑتی کیونکہ ایک سات بار سمندر بسنے والی قوم نے بنی نوع انسان کی ہمدردی کے خیال سے انکی حفاظت و نگہداشت کا سارا خوش آیند بار اپنے دوش ناتواں پر اٹھا لیا ہے۔ ہر طرف امن و خاموشی طاری ہے۔ نہ بیرونی خطرہ ہے نہ اندرونی امن شکنی کا خدشہ۔ اگر ملک میں حد سے زیادہ بےچینی بھی رونما ہوتی ہے تو اسکا اظہار غیر متشدد ترک موالات یا مقاومت مجہول کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ غرضکہ جنگی جذبات اسقدر مردہ ہو گئے ہیں اور آلات حرب سے بیگانگی و مغایرت اتنی بڑھ گئی ہے کہ اگر شاعری میں بھی کہیں تیر و کمان۔ تیغ و خنجر، نیزہ و سنان کا نام آجاتا ہے تو کلیجا کانپنے لگتا ہے اور حسن کا مرقع خوف ناک میدان جنگ بنکر دلوں میں ہول و دہشت پیدا کر دیتا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ معشوق بھی اپنی تمام رعنائیوں اور دلربائیوں کے باوجود معتصم باللہ کے سفاک و بیدرد سپاہی کی شکل میں ہوا نظر آتا ہے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ تشبیہیں اور استعارے کلام کی زینت، خوبی اور بامزگی کیلیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ان سے بیان میں نہ درداور لنگر بھی پیدا ہوتا ہے اور پیچیدہ ادق و مشکل خیالات سریع الفہم بنجاتے ہیں۔ طرفین تشبیہ کو ہر اعتبار سے یکساں و مساوی سمجھنا نری حماقت ہے۔ مشبہ اور مشبہ بہ میں کوئی خاص صفت مشترک ہوتی ہے جو وجہ شبہ کہلاتی ہے۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ "زید شیر ہے"، تو اسکے یہ معنی ہونگے کہ زید شیر کی طرح بہادر ہے۔ بہادری کی صفت وجہ شبہ ہے۔ لیکن اگر کوئی نادان یہ جملہ سنکر زید کو فی الحقیقت ایک درندہ جانور سمجھ لے اور اسکے پنجے اور دم بھی تلاش کرنے لگے تو اسکے فقدان عقل پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے اسی طرح تیر نظر سے مراد یہ ہے کہ معشوق کی نگاہ عاشق کے دل میں ویسا ہی درد و خلش پیدا کرتی ہے جیسا پیکان تیر۔ نظر اور تیر کی مشترک صفت یا وجہ شبہ خلش آفرینی ہے اسی پر سے دوسرے آلات حربی کی تشبیہوں اور استعاروں کا مطلب و منشا قیاس کر لیا جائے۔ اب اگر کوئی شخص محض معشوق کے ناز و غمزہ کی آلات حربی سے تشبیہ کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کرے کہ کسی زمانے میں معشوق فی الحقیقت سپاہی زادے ہوتے تھے جو ان اوزار و آلات سے مسلح تھے اور معتصم باللہ یا اسکے جانشینوں کی فوج میں نوکری کرتے تھے تو ایسے آدمی کی ذہنیت اس شخص کی عقل و ذہنیت سے بھی زیادہ افسوس ناک ہوگی جو زید کو حقیقی شیر سمجھ کر اُسکے پنجے، دُم اور پھاڑنے والے دانت تلاش کر رہا تھا۔

اب غور طلب امر یہ ہے کہ فارسی وار دو شاعری کا معشوق تیغ زنی، تیر اندازی، نیزہ بازی، خنجر آزمائی، شہسواری اور سپہ گری وغیرہ کے بظاہر مردانہ اوصاف سے کیوں متصف کیا جاتا ہے؟ جاننا چاہیئے کہ جس طرح مختلف قوموں کے نزدیک حسن صورت کا معیار جداگانہ ہوتا ہے اسی طرح انکے حسن سیرت کا معیار بھی متفرق ہوتا ہے۔ ہر قوم کا مذاق و پسند ایک دوسرے سے الگ ہے کوئی چشم کبود کا گرویدہ ہے اور کوئی چشم غزال کا شیدائی۔ کسی کو معشوق کے بھورے بال سنہرے اور پیارے معلوم ہوتے ہیں اور کسی کا دل زلف شبگوں میں پھنستا ہے۔ چینیوں کو محبوب کی "زرد روئی" پسند ہے لیکن ایرانی عارض گلگوں کے شیدائی ہوتے ہیں۔ کوئی شیام برن پر جان دیتا ہے اور کوئی گوری رنگت پر۔ اسی طرح کوئی شوخ اور چنچل معشوق کا گرویدہ ہے اور کوئی باحیا اور خاموش محبوب کو پسند کرتا ہے۔ کوئی اپنے جفا شعار معشوق کی ہر ادائے قاتل پر جان نثار کرتا ہے اور کوئی گل اندام نازنین تلاش کرتا ہے۔ کوئی صرف وفادار و اطاعت شعار محبوب سے دل لگانا چاہتا ہے اور کوئی معشوق کی بیوفائی و سفاکی کی مطلق پروا نہیں کرتا بلکہ ناصحوں کو جھنجھلا کر کہدیتا ہے کہ ؎

ہاں وہ نہیں وفا پرست، جاؤ وہ بیوفا سہی　　جسکو ہو جان و دل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

غرضکہ صورت اور سیرت دونوں کے لحاظ سے ہر قوم بلکہ ہر فرد کا مذاق و پسند جداگانہ ہوتا ہے اب تم ایک جفاکش، جری، جنگجو اور تہور شعار قوم کا تصور کرو اور سوچو کہ اسکے نزدیک نیکی و خوبی کا معیار کیا ہوگا؟ قدیم رومی قوم نہایت جانباز و جنگجو تھی۔ اُس نے اپنی شجاعت و مردانگی سے ایک عالم کو مسخر کر لیا تھا۔ اِسلیے رومیوں کے نزدیک نیکی اور مردانگی کی صفتیں لازم و ملزوم تھیں۔ انکی لغت میں نیکی اور بہادری دونوں کے لیے ایک ہی لفظ "ورٹس" پایا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں جو شخص بہادر نہو وہ کبھی نیک ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسی طرح ہر جنگجو و جفاکش قوم شجاعت کو تمام انسانی خوبیوں اور نیکیوں کا سرتاج سمجھتی ہے۔ فارسی شاعری کی بھی حربی فضا میں نشو و نما ہوئی تھی۔ فارسی شاعری جس قوم کے خیالات و جذبات کی ترجمان ہے وہ بھی نہایت جوانمرد و تہور شعار تھی۔ اِس قوم کے افراد ایسے اسلاف کے نام لیوا تھے جنکی عورتیں بھی میدان جنگ میں اُترتی تھیں۔ لڑنے والے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کرتی تھیں۔ بھاگنے والوں کو غیرت دلاتی تھیں۔ اور کبھی وقت دشمن کی مسلح سپاہ کا صرف قنات کی ڈوریوں سے مقابلہ کر چکی تھیں۔ ایسی قوم کے نزدیک قابل تعریف اور واجب التعظیم ہستی خواہ وہ

جنس ذکور سے ہو یا اناث سے وہی ہو سکتی تھی جو فن سپہ گری میں اپنی نظیر رکھتی ہو۔ اس وقت دلاوری، شجاعت، شہسواری اور جنگی مہارت وغیرہ انسان کے اعلیٰ ترین اوصاف میں شمار ہوتی تھیں اور نیزہ بازی، شمشیر زنی، تادر اندازی، ناوک فگنی، خنجر آزمائی وغیرہ سپاہیانہ زندگی کا لازمہ تھیں جو افراد ایسی جنگی فضائیں پرورش پائیں۔ انکے مزاج میں سختی، درشتی، بیدردی اور سفاکی کا پیدا ہونا بھی ایک فطری امر تھا۔ غرضکہ جنگجویانہ زندگی کے تمام لوازمات وصفات اس زمانہ میں انسان کا جوہر خیال کیے جاتے تھے۔ اگرچہ موجودہ مذاق ان میں سے بعض عناصر کو معائب وقبائح میں شمار کرتا ہے لیکن ہم جس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں اُسوقت یہ تمام باتیں اعلیٰ درجہ کے مکارم وفضائل اخلاق میں شامل تھیں۔

یہ بھی ایک مسلمہ وطے شدہ امر ہے کہ ہر عاشق اپنے معشوق کو نہ صرف بہترین حسن صورت کا بلکہ اعلیٰ ترین حسن سیرت کا بھی حامل سمجھتا ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے لوگ اسے فروتر درجہ دیں لیکن عاشق کا معیار انتخاب معشوق کو ظاہری وباطنی خوبیوں کے بلند ترین زینہ پر متمکن پاتا ہے۔ چنانچہ مشہور قصہ ہے کہ

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی   کز تو مجنوں شد پریشاں وغوی

از دگر خوباں تو افزوں نیستی

لیلیٰ نے اس کا جو جواب دیا تھا اسکے سوا اور کوئی صحیح جواب ہو ہی نہیں سکتا کہ

گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی

اسی زمانہ سے یہ مقولہ رائج چلا آ رہا ہے کہ "لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید"۔ شاعر عاشق کے جذبات و خیالات کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ معشوق کو اسی رنگ میں پیش کرتا ہے جس رنگ میں چشم عاشق اسے دیکھتی ہے۔ ہر عاشق اپنے محبوب کو ان تمام خوبیوں کا سرمایہ دار خیال کرتا ہے جو اس زمانہ میں تمام انسانی اوصاف سے بالا و ممتاز متصور ہوتی ہیں۔ الغرض شعرائے متقدمین تیراندازی، شہسواری، دلاوری، سفاکی، بیدردی وغیرہ کے اوصاف کا انتساب معشوق کے ساتھ اسلیے نہیں کرتے تھے کہ وہ فی الحقیقت فن سپہ گری کا ماہر کوئی امرد ہوتا تھا بلکہ اسلیے کہ بہ تقاضائے فطرت بشری ہر عاشق اپنے محبوب کو ان اعلیٰ اوصاف کا حامل دیکھنا چاہتا تھا جن کی اس زمانہ کے معاشرت میں سب سے زیادہ قدر تھی۔ علاوہ بریں ان اوصاف کو ان آلات حرب سے خاص مناسبت بھی تھی جن سے معشوق کے ناز و انداز کی تشبیہ دی جاتی تھی۔ اگر نظر

تیر ہے تو نظر کرنا یا نگاہ ڈالنا استعارتاً تیر اندازی و ناوک فگنی سے تعبیر کیا جائیگا۔ ابرو اگر خنجر ہے تو ابرو سے اشارہ کرنے کو خنجر آزمائی کہیں گے۔ وقس علی ہذا۔ ممکن ہے کہ عام طور پر صنف نازک میں شہسواری اور فن حرب و صید افگنی کی مہارت نہ پائی جاتی ہو لیکن اگر یہ اوصاف کسی خاتون میں موجود ہوتے تو لوگ اسکی بے انتہا قدر کرتے۔ چنانچہ رضیہ بیگم اور چاند بی بی اعلیٰ درجہ کی بہادر، شہسوار اور فن جنگ کی ماہر تھیں لیکن کیا ان مردانہ و شجاعانہ اوصاف کی سرمایہ داری نے انھیں صنف نازک کے زمرہ میں اور بلند رتبہ نہیں بنادیا۔ ہندی مسلمانوں کے قویٰ اگرچہ یہاں کی جرأت کش آب و ہوا کے زیر اثر مضمحل ہوگئے اور سلطنت مغلیہ کے زوال کے وقت وہ نہایت تن آسان و عیش پرست بنگئے تھے تاہم وہ اپنے بہادر آباو اجداد کے نصب العین کے پیرو تھے۔ اگرچہ ان کی عملی زندگی شجاعانہ اوصاف سے تہی دست ہوگئی تھی لیکن وہ اپنے جلیل القدر اسلاف کے خیالات و جذبات اور بلند آہنگیوں اور اولوالعزمیوں کی دل سے قدر کرتے تھے۔ ترقی پذیر اور زوال پذیر قوموں کے تخیلات جدا گانہ ہوتے ہیں۔ اول الذکر قوم کے افراد اپنے اسلاف کو جاہل اور بیوقوف سمجھتے ہیں۔ وہ ڈارون کے مسئلہ ارتقا کو جلد قبول کر لیتے ہیں۔ لیکن زوال پذیر قوم اپنے اسلاف کے درخشاں کارناموں کے آگے اپنی ٹمٹماتی ہوئی کارگذاریوں کو بلحاظ پرحقیر سمجھتی ہے اور قدیم وضع کی پابندی کو باعث افتخار خیال کرتی ہے۔ اردو شاعری کے معرض وجود میں آنے کے وقت تک قدامت پسندی کا جذبہ لوگونکے دلوں میں موجود تھا۔ ابھی مغربی تمدن کے تصادم نے مشرقی تہذیب کی بیخکنی نہیں کی تھی۔ اگرچہ عملی زندگی سے شجاعت رخصت ہوچکی تھی لیکن خیال و تصور میں اسکی قدر موجود تھی۔ اصول شاعری نے مستقل صورت اور مستحکم ہیئت اختیار کرلی تھی۔ معشوق کو شہسواری، خنجر آزمائی، دلاوری و شجاعت کے اوصاف سے متصف کرنے کا طریقہ مضبوط و غیر متزلزل بنیادوں پر قائم ہوچکا تھا۔ یہ طریقہ ان خدایان سخن کا قائم کیا ہوا تھا جن کی خاک پا کو دور انحطاط کے شعرا سرمہ بینش تصور کرتے تھے۔ بغرضکہ اردو شعرا نے اپنے عدیم المرتبت اسلاف کے قابل قدر خیالات و جذبات کی پیروی کی اور اپنی شاعری میں معشوق کو ان شجاعانہ اوصاف سے متصف کیا جنھیں ہر بہادر اور تہور شعار قوم انسان کا اعلےٰ ترین جوہر سمجھتی ہے۔ قوم اگرچہ اسلاف کی فولادی سیرت کھو چکی تھی۔ لیکن مذاق پسند میں فرق نہیں آیا تھا۔ لوگ قدیم آئین و وضع کے بڑے پابند تھے۔

لیکن آج زمانہ کا رنگ بالکل بدلگیا ہے۔ قدیم و جدید مذاق و پسند میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

پہلے کے لوگ صرف عملی زندگی میں اپنے نامور اسلاف سے بہت پیچھے پڑ گئے تھے لیکن خیالات وجذبات رسم ورواج اور مذاق ولپسند کے لحاظ سے وہ قدامت پرست ہی تھے۔ برخلاف اسکے اب نہ صرف اعمال وافعال میں بلکہ خیالات وجذبات اور طرز بود وماند میں بھی غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہو گئی ہیں۔ موجودہ مذاق تیراندازی وشہسواری اور صید افگنی وخنجر آزمائی وغیرہ کو شان محبوبی کے منافی خیال کرتا ہے۔ لیکن اختلاف مذاق کا یہ کرشمہ بھی قابل ذکر ہے کہ آجکل معشوق کی نزاکتوں اور دلربایوں کا جو تصور قائم کیا گیا ہے اُسے قدما کا شجاعت پسند مذاق بالکل مکروہ ونفرت انگیز خیال کرتا۔ موجودہ معاشرت جس قسم کے نازک اندام معشوق کا شیفتہ وگرویدہ ہے اِس سے پٹیالہ کا مشہور مطرب بھائی چھیلا ہندوستان کی پبلک کو گراموفون کے ریکارڈ کے ذریعہ سے اِس طرح تعارف کراتا ہے۔

نازک کمر لچک گئی بالوں کے بار سے ۔۔۔ سینہ پسینہ ہو گیا پھولوں کے ہار سے

آجکل آزادی کی ایسی ہوا چلی ہے کہ جدید شاعری کے حامی نہ صرف نحوی وعروضی قید وبند سے رہائی حاصل کرنا چاہتے ہیں بلکہ زبان ومحاورہ کے مسلمہ اصول سے بھی بے نیاز ہو گئے ہیں اسلیے اِس شعر میں اگر زبان ومحاورہ کے مسلمہ اصول سے بھی بے نیاز ہو گئے ہیں اِسلیے اِس شعر میں اگر زبان ومحاورہ کی غلطی پائی جائے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ بہرکیف اسوقت ہمیں شعر کے صرف مضمون سے بحث ہے۔ اگر قدما کے سامنے ایسی دبلی پتلی۔ نحیف ولاغر اور نازک وکمزور معشوق پیش کیجاتی جسکی کمر اسکی زلف گرہ گیر کے بار سے لچک کھاتی ہو جو پھولوں کے ہار کے بوجھ سے پسینہ پسینہ ہو جاتی ہو۔ کف دست پر رنگ حنا کے بار سے جسکی کلائی لچکتی ہو تو بھلا ان کی شجاعت پسند وتہور شعار طبیعت کبھی اسے رفیقہ حیات بنانا گوارا کر سکتی تھی ہ یقیناً وہ اِس سے منھ پھیر لیتے اور اسے چڑیل سمجھ کر اظہار نفرت کرتے یا اگر یہ نازنین جندے آفتاب وچندے ماہتاب بھی ہوتی تو وہ زیادہ سے زیادہ اسے دلبستگی کا ایک سامان یا چینی کی سُرخ وسفید مورت یا چکڑے یا ربڑ کی ایک گڑیا سمجھتے۔ غالباً اِسی قسم کے نازک اندام معشوق کی نسبت مرزا غالب فرما گئے ہیں کہ

اِس نزاکت کا بُرا ہو وہ بھلے ہیں تو کیا ۔۔۔ ہاتھ آئیں تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

خیر یہ اپنے اپنے زمانہ کا مذاق ہے۔ جنگ وجدل کی خوگر طبیعتیں ایسی ہی معشوق تلاش کرتی ہیں جو بہادر ہو۔ تیغ زن ہو، تیرانداز ہو، شہسوار ہو، برخلاف اسکے عدم تشدد ومقاومت مجہول کی فضا میں پرورش پائی ہوئی طبیعتوں کو بھولا بھالا نحیف ولاغر۔ نازک اندام محبوب پسند آتا ہے۔ مذاق ولپسند میں

تمدنی انقلابات سے تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ ممکن ہو کہ آنیوالی نسلوں کا مذاق موجودہ نزاکت پسند مذاق سے جداگانہ اور قدما کی شجاعت پسندیوں کا حامی ہو۔ بہرحال خود معترضوں کے طرز استدلال کے مطابق بھی معشوق کے ساتھ مہارت جنگی کا انتساب اشعار غزل کو امرد پرستی کا محرک نہیں بنا سکتا۔ کیونکہ اگر شہسواری نیزہ بازی، خنجر آزمائی۔ سفاکی و بیدردی کے اوصاف عام طور پر صنف نازک میں نہیں پائے جاتے تو سبزہ آغاز امرد لڑکے بھی اِن اوصاف سے بے بہرہ ہی ہوتے ہیں۔ سپاہی زادوں کو بھی اعلیٰ درجہ کی دلاوری، شہسواری اور جنگی مہارت اُسوقت حاصل ہوتی ہو جب ان کا عارض گلگوں حسن پوش بنجاتا ہے اور رعنائی و دلربائی کا زمانہ گذر جاتا ہو۔ الغرض ان تمام باتوں سے صاف ظاہر ہے کہ غزل گو شعرا کا معشوق بھی صنف نازک ہی کا ایک فرد ہوتا ہے۔ اسکے ساتھ شجاعانہ جنگی اوصاف کا انتساب یا اسکے ناز و انداز کے لیے آلات حرب کی تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال جنگی فضا۔ عسکری ماحول اور فوجی ارتقی خصائل کا اقتضا تھا۔

(باقی آیندہ)

خالص اُردو

(حضرت آرزو لکھنوی)

رس اُن آنکھوں کا ہے کہنے کو ذرا سا پانی
سیکڑوں ڈوب گئے پھر بھی ہے اتنا پانی

آنکھ سے بہ نہیں سکتا ہے بھرم کا پانی
پھوٹ بھی جائیگا چھالا تو نہ دیگا پانی

چاہ میں پاؤں کہاں آس کا میٹھا پانی
پیاس بھڑکی ہوئی ہے اور نہیں ملتا پانی

دل سے لوکا جو اُٹھا آنکھ سے ٹپکا پانی
آگ سے آج نکلتے ہوئے دیکھا پانی

کسنے بھیگے ہوئے بالوں سے یہ جھٹکا پانی
جھوم کر آئی گھٹا ٹوٹ کے برسا پانی

پھیلتے دھوپ کا ہے روپ لڑکپن کی اٹھان
دوپہر ڈھلتے ہی اُتریگا یہ چڑھتا پانی

ٹکٹکی باندھے وہ تکتے ہیں میں اِس گھات میں ہوں
کہیں کھانے لگے چکر نہ یہ ٹھہرا پانی

کوئی متوالی گھٹا تھی کہ جوانی کی اُمنگ
جی بہالے گیا برسات کا پہلا پانی

ہاتھ جل جائیگا چھالا نہ کلیجے کا چھوؤ
آگ مٹھی میں دبی ہے نہ سمجھنا پانی

رس ہی رس جنمیں ہے پھر سیل ذرا سی بھی نہیں
مانگتا ہے کہیں ان آنکھوں کا مارا پانی

نہ ستا اسکو جو چپ رہکے بھرے ٹھنڈی سانس
یہ ہوا کرتی ہے پتھر کا کلیجہ پانی

یہ پسینا ہی آنسو ہیں جو پی جاتے تھے تم
آرزو لو وہ کھلا بھید وہ چھوٹا پانی

"گرم زمین کے پھول"

(جناب سید محمد صالح صاحب شمس نونہروی)

اظہر کے لئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کسی غیر معمولی شخصیت کے مالک تھے لیکن یہ بھی کہنا صحیح نہ ہوگا کہ صغیرہ کی آنکھوں میں بھی وہ بالکل ویسے ہی نظر آتے تھے جیسے ہلوگوں کی نگاہوں میں تھے۔ ہلوگوں کو تو وہ ساڑھے پانچ فٹ کے۔ گندمی رنگ، گداز بدن۔ اور غلافی آنکھوں والے حیوان ناطق معلوم ہوتے تھے۔ ان کا ذہن بھی اوسط درجے سے زیادہ کا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ مگر صغیرہ کی آنکھوں نے اللہ جانے ان میں کیا دیکھا تھا۔ عشق کے لئے صرف آنکھیں ہی بصارت کا ذریعہ نہیں ہوتیں اس کام میں دل بھی شریک ہوتا ہے۔ بلکہ وہی خاص آلہ بصارت بن جاتا ہے۔ اس لئے کہ آنکھوں کے لئے تو یہ کہا بھی جا سکتا ہے کہ ع مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی۔

مگر حضرتِ دل تو نہ معلوم کتنی باریک تہوں میں بھی تاک جھانک سے نہیں چوکتے اور سب کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ بہر نوع اظہر کو صغیرہ نے دل کی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اور اُن میں وہ تمام اوصاف اور خوبیاں ڈھونڈھ نکالی تھیں جنھیں اُس کی صنف کی نہ چوکنے والی آنکھیں ڈھونڈھ سکتی تھیں۔ اور صغیرہ کا انتخاب کوئی معمولی انتخاب نہیں تھا، اس لئے کہ خود صغیرہ معمولی عورت نہ تھی۔ وہ محمود نگر کے سب سے بڑے خاندان کی چشم و چراغ تھی۔ وہ حسنِ ظاہری سے مرصع تھی۔ وہ حسنِ باطنی سے آراستہ تھی۔ وہ ملنسار تھی۔ خلیق تھی۔ حلیم تھی۔ بُردبار تھی۔ حیا پرور تھی۔ نیک سیرت تھی۔ تعلیم یافتہ تھی وہ سینا پرونا جانتی تھی۔ وہ کشیدہ کاڑھنا اور زر دوزی بنانا جانتی تھی۔ اس نے اُردو فارسی کے چھوٹے چھوٹے امتحانات پاس کئے تھے۔ گھر کے کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹاتی تھی، عزیزوں کی خاطر کرتی تھی اور بھائیوں سے تواضع برتتی تھی۔ المختصر وہ بالکل انھیں خوبیوں کی مالکہ تھی جو مردوں کو فرشتہ اور عورتوں کو حور بنا دیتی ہیں پھر باوجود ان تمام باتوں کے اگر وہ اظہر سے محبت کرنے لگے تو سوائے

اسلئے کہ دوسرے اظہر کی قسمت کو قابلِ رشک سمجھیں اور اسکے شباب پر رحم کھا کے اس کی کامرانی کی دعا کریں اور کیا کرسکتے ہیں۔ مگر صغیرہ کے والدین کے حقوق دوسروں سے زیادہ تھے۔ وہ ان دونوں کو ملاکر بامراد اور کامیاب بھی بنا سکتے تھے اور انکے یک جان دتن ہونے میں مانع ہوکر ان کی زندگی بھی برباد کرسکتے تھے۔ انکے متعلق یقین سے یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ ان دونوں کی جدائی ہی پسند کریں گے، اس لئے کہ وہ بھی کچھ کم روشن خیال نہ تھے۔ صغیرہ کی ماں ممکن تھا کہ دیہاتی آب ہوا کے اثر سے اپنی اسلامی تعلیم بھول گئی ہوں مگر صغیرہ کے وجود کے باعث خان بہادر شیخ جمیل احمد صاحب تو ماشاءاللہ ایک خوش فکر شخص تھے۔ وہ معاشرتی اصلاح کے حامی بھی تھے اور خود بار بار اس موضوع پر اخبارات و رسائل میں لکھ بھی چکے تھے۔ اسکے علاوہ انھیں قدیم و جدید فلسفیوں کے بہت سے اقوال بھی یاد تھے۔ وہ موقع موقع سے انکے نظریے بھی پیش کرنے کے عادی تھے اس لئے یہ امید کرنا بیجا نہ تھا کہ وہ بیلے کی شاخ چمیلی میں لگا دیں گے اور اپنے ہی سینچے ہوئے دونوں پودوں سے نئے قسم کے پھول پیدا کرکے اپنی مشام جان کو معطر بنائینگے۔

لیکن اس موضوع پر گفتگو ہوتے ہی یہ معلوم ہوگیا کہ یہ ساری آزادیاں اخباری تھیں اور دوسروں کے لئے تھیں نہ کہ اپنے لئے۔ انکے فلسفہ پر حرص دولت وجاہ اور روشن خیالی پر قدیم طور کی حیا پروری غالب رہی۔ انھوں نے سوچا یہ لڑکوں اور لڑکیوں میں عشق کیسا؟ وہ محبت کے معنی تک سے واقف نہیں۔ ان میں لگاؤ ناممکن۔ پھر شرفاء کا یہ دستور نہیں۔ خاندان کا یہ طریقہ نہیں۔ اس طرح کی حرکت حد درجہ بیحیائی کی مرادف ہے۔ علاوہ بریں یہ دو ہونہار ذاتیں خاندان کے لئے دو ایسے ستون بن سکتے ہیں جن پر دو دمانی عمارت علٰحدہ علٰحدہ سہارا لے سکتی ہے۔ دونوں کو ایک بنا کے حصول جاہ و عزت کے دو ذریعوں کو صرف ایک ہی نہیں بنانا ہے بلکہ انھیں کھو دینا ہے۔ اظہر کو ایک ثروت والے گھر میں بیاہا جاسکتا ہے اور صغیرہ ایک روپیہ والے خاندان کا ماہتاب بن سکتی ہے۔ ایسی صورت میں ان بچوں کے جذبات کا خیال کرنا وقتی ہیجان کو عقل پر ترجیح دینا ہوگا۔ انھوں نے اظہر کی ماں سے تو یہ نہیں کہا لیکن اعزاء اور احباب سے جنھوں نے انھیں اس پیش پا افتادہ بات کی طرف توجہ دلائی تھی۔ مہاتما بدھ کا یہ زرّیں قول نقل کیا "خواہش مصائب کا سرچشمہ ہے۔ اس لئے خواہش کو مار دو" وہ یہ کہتے تھے کہ لڑکوں اور لڑکیوں کو انتخاب کا حق عقلاً ضرور ہونا چاہئے۔ لیکن اظہر اور صغیرہ

تو بالکل بچے ہیں۔ نادان ہیں۔ انھیں اس طرح کا حق دینا اتنا ہی خطرناک ہے جتنا کسی چھوٹے بچے کو سان رکھا ہوا چاقو کھیلنے کے لئے دیدینا۔ اس لئے اخلاقی، عقلی اور اقتصادی ہر حیثیت سے شادی ناممکن اور رشتہ نامناسب ہے۔

اب جنھیں خان بہادر صاحب کی ضد، غصہ اور استبدادیت کا حال معلوم تھا وہ بھلا اسکے بعد کیا بول سکتے تھے۔ جو اُن کی پبلک یا اخباری زندگی سے آشنا تھے وہ کیا چون وچرا کر سکتے تھے۔ مگر باطن اور ظاہر دونوں کی ایک ہی صورت نہیں ہوا کرتی ہے۔ صغیرہ اور اظہر ان امور سے اچھی طرح واقف تھے، اس لئے اُن پر اِن باتوں کا اُلٹا اثر پڑا۔ گرہ کو مضبوط کرنے کے لئے کھینچنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ خان بہادر صاحب کی افتراقی کوشش نے صغیرہ اور اظہر میں قوتِ مقاومت اُبھار دی۔ اور انکے تعلقات میں وہ استواری و استقلال پیدا ہو گیا جو پہلے موجود نہ تھا۔ باقاعدہ دو جماعتیں مترتب ہو گئیں۔ خان بہادر اور ان کی بیوی صاحبہ ایک طرف۔ صغیرہ اور اظہر دوسری جانب۔ دونوں کی ارادی قوتوں میں خاموش مقابلہ ہونے لگا۔ اس لئے کہ دونوں بالاعلان جنگ سے گریزاں تھے خاندان کا معاملہ تھا۔ اظہر اپنا تھا۔ اپنا ہی لختِ دل۔ اپنا ہی جگر پارہ۔ چھوٹے بھائی کی اکیلی یادگار۔ اپنا ہی پالا پوسا، پڑھایا لکھایا۔ کیونکر ہو سکتا تھا کہ یہ صاف صاف کہہ دیا جائے کہ تم گھر میں اب نہ آؤ۔ تم سے صغیرہ پردہ کرے گی۔ چھوٹی بھاوج۔ بھائی کی بیوہ کا دل حد سے زیادہ نازک تھا۔ وہ کیسے دُکھایا جا سکتا تھا۔ پھر وہ زود رنج بھی تھیں۔ ذری ذری سی بات کا رنج کرتی تھیں۔ اس لئے گو اظہر اور صغیرہ کے سامنے آنے میں حد درجہ خطرہ تھا مگر کیا کیا جاتا مجبوری تھی۔ اُدھر صغیرہ تیوریاں پہچانتی تھی اسنے سمجھ لیا کہ ماں باپ کو اس کا خون منظور ہے۔ آنکھوں میں کبھی کبھی محبت کی جگہ شقاوت کی بھی جھلک دکھائی دینے لگی ہے۔ وہ بدلی ہوئی نظر دیکھ کے اپنی جگہ سہمی تو ضرور مگر اس کا پڑھا لکھا ہونا اسوقت آڑے آیا۔ اگر وہ دیہات کی دوسری جاہل لڑکیوں کی طرح ہوتی تو وہ اپنے حقوق سے ناواقف ہونے کی وجہ سے چوپایوں کی طرح اپنی بیع غالباً خاموشی سے منظور کر لیتی۔ مگر تعلیم نے اسے اسکے حقوق سمجھا دیئے تھے۔ وہ جانتی تھی کہ شرعاً عقلاً اور قانوناً اسکو اپنے ہونے والے شوہر کے انتخاب کا حق ہے اور وہ اظہر میں سوائے خوبیوں کے کوئی بُرائی نہ دیکھتی تھی۔ اسی لئے اسنے اپنے دل میں طے کر لیا تھا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو وہ اظہر ہی سے شادی کرے گی۔ جو باتیں خان بہادر کو عیب

دکھائی دیتی تھیں وہی اس کی آنکھوں میں خوبیاں نظر آتی تھیں۔ انکے نزدیک اظہر سے محبت اخلاقی گناہ تھا۔ صغیرہ کی آنکھوں میں وہ سب سے بہتر وسیلۂ نجات۔ خان بہادر کی نظر میں اظہر کا غریب ہونا ایک بہت بڑا عیب تھا۔ صغیرہ کے نزدیک وہ سب سے بڑی خوبی تھی۔ وہ کہتی اگر دال روٹی کھا کے خوشی نصیب ہو سکے تو وہ اس طرح کے پلاؤ قورمہ سے لاکھ درجہ اچھی ہے جس کے بعد زندگی غم کا مجسمہ بنے۔ پھر اسے اپنی قوت بازو پر، اپنے ذہن پر اپنے دل و دماغ پر بھروسا تھا۔ وہ کہتی تھی میں غریب گھر میں جانے سے نہیں ڈرتی۔ میں تھوڑے سے پیسوں میں گھر کو اچھا سے اچھا بنا سکتی ہوں۔ لیکن ماں باپ سے ان باتوں کے اظہار کا موقع نہ ملتا تھا۔ یہ باتیں اپنے دل سے کرتی۔ یا کبھی کبھار اشاروں اشاروں میں ظاہر کر کہتی۔ ایک روز رات کے نو بجے تھے۔ خان بہادر کہیں دعوت میں گئے ہوئے تھے۔ بڑی بی کچھ ماندی تھیں۔ شام ہی سے منہ لپیٹ کے پڑی تھیں۔ اظہر اور صغیرہ تھوڑی دور پر بیٹھے ہوئے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ اظہر نے کہا "مجھے روز بروز ناامیدی ہوتی جاتی ہے۔ اماں جان نے پرسوں چچا صاحب سے تذکرہ کیا تھا۔ وہ منہ سکھا کے بولے "کچھ خبطی ہوئی ہو۔ صغیرہ ابھی بہت چھوٹی ہے۔ میں اکیس برس سے کم میں اس کی شادی نہ کروں گا۔ ہندوستان کی عورتوں کی صحت محض کمسنی کی شادی کی وجہ سے برباد ہو رہی ہے۔ پھر صغیرہ کو ابھی بہت کچھ پڑھنا لکھنا ہے"۔ والدہ نے کہا "تو آپ نسبت طے کر دیں۔ میں تین چار برس اور انتظار کر لوں گی۔" اس پر چچا جان بولے "نہیں۔ میری ذات میں یہ مناسب نہیں ہے۔ اظہر کی شادی جلد ہونا چاہیے۔ ماشاءاللہ تیس کے قریب سن ہو گیا۔ خود کماتا ہے۔ اب اس کا گھر نہ بساؤ گی تو کس کا؟" والدہ نے فرمایا کہ "ہاں یہی تو سوچ رہی ہوں۔ اس لئے تو آپ سے صغیرہ کو مانگ رہی ہوں۔" چچا صاحب نے کہا "خیر اس کا خیال چھوڑ دو۔ ابھی اس میں بہت دیر ہے۔ کوئی اور فکر کرو۔" صغیرہ نے یہ تمام باتیں خاموشی سے سن لیں۔ پھر ایک ٹھنڈی سانس بھر کے بولی "چچی اماں سے انکار کرنے کے لئے بہانہ تو اچھا ڈھونڈھا۔ یہ سچ ہے کہ میری صحت کچھ زیادہ اچھی نہیں۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ میں ابھی بہت کچھ پڑھنا بھی چاہتی ہوں۔ مگر اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلتا ہے کہ آپ سے انکار ہی کر دیا جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ میری صحت انھیں لوگوں نے خراب کر رکھی ہے۔ یہ روز روز کی تکلیف۔ آپ سے چھٹ جانے کا ہر آن خیال مجھے کیا اچھے اچھے کو گھلا سکتا ہے۔ اسکی دوا تو وہ نہیں ہے جو ابا جان نے سوچی ہے۔ رہی تعلیم سو وہ جیسے اب جاری ہے

ویسے ہی اسوقت بھی جاری رہے گی۔ یہ تو میری خواہش پر منحصر ہے۔ دراصل ان لوگوں نے ہمیں چھڑانے کا قصد کر لیا ہے" صغیرہ نے یہ باتیں اس طرح کے مایوس لب ولہجہ میں کہیں کہ اظہر کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس نے اُنکی طرف دیکھ کے کہا "رونے دھونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ لوہے کو لوہا ہی کاٹتا ہے۔ میں بھی اپنے باپ ہی کی بیٹی ہوں۔ مجھ میں بھی انھیں کی طرح ضد موجود ہے۔ آخری فیصلہ تو پھر بھی میرے ہی ہاتھوں میں ہے" اظہر نے کہا "صغیرہ۔ ہاں یہ سب تو ہے مگر والدہ نے چچا کے اشارے سے میرے لئے اور مقامات پر بھی گفتگو شروع کر دی ہے"

صغیرہ کے گالوں میں وہی سُرخی پیدا ہو گئی جو صبح چہروں میں آگ کے پاس بیٹھے رہنے سے پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ بولی "تو یہ کہئے کہ آپ بھی دھوکا دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ۔ ۔"

اظہر نے قسم کھانا شروع کیا "واللہ نہیں قسم رسول پاک کی" اُسنے ہاتھ کے اشارے سے روکا "اچھا میں اپنی بات واپس لیتی ہوں آپ قسم نہ کھائیے۔ لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ چچی اماں کو آخر اسقدر جلدی کیوں پڑی ہے"

اظہر نے کہا "انھیں بہو لانے کی بڑی تمنا ہے۔ پھر ادھر چچا صاحب نے خود انھیں جلدی کرنے پر تیار کر دیا ہے" صغیرہ نے تیکھی ہو کے پوچھا "تو پھر آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

اظہر نے قدرے گھبرا کر کہا "میرا؟ میرا اسکے سوا کیا ارادہ ہو سکتا ہے کہ میں انکار کر دوں" صغیرہ نے ان پر ایک محبت کی نظر ڈالی پھر بولی "آپ ایک بات یاد رکھئے گا۔ میں اور لڑکیوں کی طرح نہیں ہوں۔ میری بات میری جان کے ساتھ ہے۔ میں نے آپسے اقرار کیا ہے کہ میں آپسے محبت کرتی ہوں میں جھوٹی نہیں ہوں۔ میں اب آپکے سوا دُنیا میں کسی کو نہیں دیکھ سکتی۔ میری شادی اگر ہو گی تو آپ ہی کے ساتھ ہو گی۔ دنیا میں اور کسی کے ساتھ نہیں ہو سکتی۔ لیکن ہاں اتنا ضرور خیال رکھئے کہ اگر آپنے انتظار نہ کیا تو میں یقینی اپنی جان دیدوں گی اور میرا خون آپ ہی کے سر ہو گا!"

اظہر نے اور قریب آکر بھرائی ہوئی آواز میں کہا "نہیں میری ملکہ یقین کرو تمھارے سوا میرا دُنیا میں کوئی نہ ہو گا" یہ کہتے کہتے اسنے صغیرہ کا دست نازک اپنے ہاتھ میں لیکر اپنی پُرنم آنکھوں سے لگا لیا!

دو برس یُوں ہی گزر گئے اظہر نے ہر جگہ شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ ماں بیوہ تھی۔ بیٹا جوان۔ پڑھا لکھا اور خود کمانے والا تھا۔ کیا کرتی۔ زبردستی کر نہیں سکتی تھی۔ اپنے طور پر اسے بار بار سمجھاتی رہی۔

اپنے ارمانوں کی کہانیاں سناتی رہی مگر اظہر کی آنکھوں سے صغیرہ کی صورت ایک منٹ کے لئے اوجھل نہ ہوتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ صغیرہ سے اسکی شادی نہ ہوگی۔ خان بہادر اسکے لئے کسی بہت بڑے گھر کی فکر میں ہیں۔ ایک آدھ جگہ سے کچھ گفتگو بھی ہے۔ اسکو اس کا بھی احساس تھا کہ اسکی مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ صغیرہ سی لڑکی کو جو دولت کے آغوش میں پلی ہو اپنے گھر میں لاکے آرام دے سکے لیکن عشق و محبت اس طرح کی عقلیات پر ہمیشہ سے ہنسا کئے ہیں۔ وہ جب ان باتوں پر غور کرتا تو اس کا دل یہی کہتا، اچھا یونہی سہی۔ پھر بھی تھوڑا بہت انتظار ضروری ہے۔ صغیرہ کو وہ بیاہ لیں تو میں پھر غور کر سکتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ جبتک کہ اس کا عقد نہ ہو جائے میں آس لگائے بیٹھا رہوں گا۔ خدا بڑا کارساز ہے۔ وہ بڑا مسبب الاسباب ہے ممکن ہے کہ میری بگڑی وہی بنادے!"

قریب قریب یہی باتیں اسنے ماں سے بھی ایک دن کہہ ڈالیں۔ الفاظ ذرا اس سے زیادہ محفوظ استعمال کئے مگر مطلب یہی تھا۔ وہ بھی برسوں سے اظہر اور صغیرہ کی باتوں کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اسکے لئے اشارہ کافی تھا۔ اُسنے سب کچھ سمجھا اور محسوس کیا۔ مگر اسنے بال دھوپ میں نہیں پکائے تھے۔ وہ جانتی تھی یہ بات ہونے والی نہیں ہے۔ اس لئے اسے اپنے لال کی ناکامی پر غصہ سا آگیا۔ وہ جھلاکے بولی۔

"میاں تم اپنے چچا کو اچھی طرح جانتے ہو۔ انکے خیالات بہت بڑے ہیں۔ وہ بھلا کاہے کو صغیرہ کو میرے گھر میں دینگے۔ لڑکی ماشاءاللہ بہت اچھی ہے۔ مجھے بھی دل سے پیاری ہے مگر میں اُن سے پہلے ہی کہہ چکی ہوں اور وہ انکار کر چکے ہیں۔ اب تو دو برس میں لڑکی اور بھی لائق فائق ہو گئی ہے۔ اللہ رکھے رسالوں میں اسکے مضامین نکلتے ہیں۔ ہندوستان بھر میں مشہور ہو گئی ہے۔ سیکڑوں اچھے سے اچھے پیغام آتے ہیں وہاں تمھارا کہاں گزر ہے۔ تم اس خیال کو دل سے نکال ڈالو"

اظہر نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف اُداس ہو کے سر جھکا لیا۔ ماں کا دل ممتا سے بھر آیا۔ بیٹے کا سر چھاتی سے لگا کر بولی "اچھا میں آج تمھارے چچا کے ہاں پھر جاتی ہوں۔ دیکھوں وہ اب کیا جواب دیتے ہیں"

جب یہ مشورہ ہو چکا تو ماں ڈولی منگا کر سیدھی خان بہادر کے ہاں پہنچیں۔ جٹھانی نے دیورانی کا اسی جذبۂ غیرت سے خیر مقدم کیا جو اس طرح کے اعزا میں دولت و غربت کے فرق کے بعد پیدا ہو جاتا ہے۔ اظہر کی والدہ نے اس کا کچھ زیادہ خیال نہ کیا۔ وہ غرض لے کے آئی تھیں۔ انھیں تو ابھی اس دیونی

کو زبان کی شیرینی سے رام کرنا تھا۔ اسی لئے انھوں نے جھٹانی کے سامنے رکھی ہوئی ڈلی کی چھوٹی ٹوکری اپنے سامنے اٹھا کے رکھ لی اور ڈلی کاٹنے اور ادہر اُدہر کی باتیں کرنے لگیں۔ یہاں تک کہ صغیرہ جو حد درجہ تپاک سے ملی تھی اُٹھ کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اظہر کی ماں نے اسوقت جھٹانی سے کہا۔ "میں آپکے پاس ایک غرض لے کے آئی ہوں۔ ممکن ہو کہ آپ اُسے چھوٹا منہ بڑی بات سمجھیں مگر کیا کروں دل کو لگی ہو۔ لاکھ ہمت نہیں پڑتی پھر بھی بن کہے رہا نہیں جاتا۔"

خان بہادر کی بیوی ترشروئی سے بولیں "اے تو کہو گی بھی کہ پہلے سے ایک طوفان باندھ دیا۔"

وہ بولیں" بات تو وہی پرانی ہو کہ صغیرہ کو مجھے دیدیجئے۔ مگر ہمت اس لئے نہیں پڑتی کہ اظہر اگرچہ آپ ہی کا ہے مگر مقدر کی خرابی سے بہت زیادہ متمول نہیں ہو۔" خان بہادر کی بیوی بولیں "اے تو اس میں میرا کیا اختیار ہے۔ تم جانو اور صغیرہ کے ابا جانیں۔ میں بھلا کون ہوں کہ صغیرہ کے معاملے میں بولوں انھوں نے اسے لڑکوں کی طرح پالا ہے۔ صغیرہ کیا پڑھ رہی ہو۔ اسنے کھانا کھایا یا نہیں۔ اسکے لئے حلوا منوا دو۔ اسکے لئے ساریاں خرید دو۔ طرح طرح کی فرمائشیں ہر وقت ہوتی رہتی ہیں۔ پھر کہتے ہیں کہ اگر کوئی اسے تکلیف دیگا تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ ذرا سا میں ڈانٹتی ہوں تو لال پیلی آنکھیں دکھانے لگتے ہیں۔"

اظہر کی ماں نے دیکھا کہ گفتگو کا سلسلہ ختم ہونے والا نہیں ہو۔ معلوم ہوتا تھا جیسے بھری بیٹھی تھیں بس ذرا چھیڑنے کی دیر تھی۔ اسی لئے انھوں نے جلدی سے کہا "ہاں بھابھی یہ تو میں بھی جانتی ہوں لیکن صغیرہ ماشاء اللہ اب جوان ہوئی آخر اسکی شادی ہوگی کہ وہ خدا نہ کرے ہمیشہ یونہی بیٹھی رہے گی؟"

خان بہادر کی بیوی اپنی باتوں کے سلسلے کے منقطع کئے جانے سے اور آزردہ ہوگئیں چمک کے بولیں "اوئی نوج، بیٹھی کیوں رہے گی۔ مگر ہاں اس کی شادی کہاں ہوگی اس کے باپ ہی بتا سکتے ہیں۔ میں نگوڑی تو دائی سے بھی بدتر ہوں۔ میری کون سنتا ہے۔ اور مجھ سے کون پوچھے گچھے گا۔ میں بھی چپ سادھے بیٹھی ہوں۔ دیکھوں آخر کہاں بات طے کرتے ہیں۔ کونسا لڑکا ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ سیکڑوں پیغام آئے مگر انھیں پسند ہی نہیں آیا۔ اے ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ جج صاحب کی بیوی مجھ سے کھڑے کھڑے ملنے آگئی تھیں۔ صغیرہ نے پہلے پہل جو انھیں دیکھا تو شرما کے چھپ رہی مگر انھوں نے خاص طور پر بلا کے اس سے باتیں کیں۔ اور جب چلنے لگیں تو مجھ سے علٰحدہ لیجا کے

چپکے سے کہہ گئیں کہ ان کا ایک لڑکا ہی، ماشاء اللہ ابھی انگلستان سے آیا ہے چار ہزار تنخواہ پاتا ہی۔ بس اسی سے صغیرہ کی شادی کر دیجائی۔ میں نے اُن سے بھی یہی کہا کہ اپنے میاں سے کہیں کہ وہ "اُن" سے کہیں میں اس معاملہ میں کوئی دخل نہ دونگی۔ اے ہاں بی بی، میں کیوں پڑنے لگی جب انھوں نے مجھ سے صاف صاف کہدیا کہ میں صغیرہ کی شادی اپنی پسند سے کروں گا۔ اس میں تمھاری رائے کی مجھے ضرورت نہیں۔ تو تمھیں انصاف کرو چھوٹی دلہن، مجھے بیچ میں بولنے کی ضرورت۔ میں کاہے کو پرائے پھٹے میں پاؤں ڈالوں اور خواہ مخواہ نکّو بنوں؟"

اظہر کی والدہ کو جو اس سوال کے بعد ذرا موقع ملا تو انھوں نے جلدی سے کہا "جی ہاں مگر یہ معاملہ تو اس طرح کا نہیں۔ جج صاحب کا لڑکا تو پھر بھی غیر ہے مگر آپ تو اظہر کی ماں ہیں۔ وہ آپکا بچّہ اسی طرح ہے جس طرح میرا ہے۔ اس لئے اگر صغیرہ کی طرف سے کچھ نہیں کہہ سکتیں تو اظہر کی طرف سے تو کہہ سکتی ہیں"۔

خان بہادر کی بیوی ہاتھ جھپکا کے بولیں "نا بی بی۔ میں اس معاملہ میں دخل نہ دوں گی۔ میں جانتی ہوں یہ بات ہونے والی نہیں۔ اور اس میں رنجش ضروری ہی۔ میں کیوں مفت میں تم سے اور اظہر سے بُری بنوں!" یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ خان بہادر آگئے۔ دونوں انھیں دیکھ کے بالکل اس طرح چپ ہو گئیں جس طرح سانپ کو دیکھ کے بولتی ہوئی مرغیاں چپ ہو جاتی ہیں!۔

"کہو چھوٹی دلہن اچھی تو رہیں؟" خان بہادر نے بے اعتنائی سے پوچھا

وہ بولیں "جی ہاں سب اللہ کا فضل ہی۔ آپ کا مزاج تو اچھا ہے؟" بولے "اچھا ہوں۔ یہ آج بہت دنوں کے بعد تم کہاں بھول پڑیں؟"

انھوں نے سوچا۔ لاؤ اسی موقع سے فائدہ اٹھاؤں۔ دل کا مطلب کہہ چلوں۔ بولیں "جی آپکو یاد ہوگا کہ میں نے آج سے دو برس قبل آپسے صغیرہ کو اظہر کے لئے مانگا تھا......"

خان بہادر قدرے جھلاہٹ سے بات کاٹ کے بولے "ہاں ہاں مجھے یاد ہی پھر!"

اظہر کی ماں یونہی ڈری ہوئی تھیں۔ اس "پھر" کے لب و لہجہ نے انکو اور بھی سراسیمہ کر دیا۔ مگر ماں تھیں۔ اپنے خوف کو چھپا کے بولیں "جی آپنے اسوقت مجھ کو یہ جواب دیا تھا کہ صغیرہ کی شادی آپ ابھی نہ کریں گے بلکہ دو برس بعد..."

خان بہادر صاحب نے رکھائی سے پوچھا "ہاں تو پھر؟"

وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھر کے بولیں "جی تو اب وہ دو برس گزر گئے میرا اظہر بھی بیٹھا ہے۔ اگر آپ....." خان بہادر نے کہا "مگر تمھیں شاید یہ یاد نہیں رہا کہ میں نے تم سے یہی تاکید کی تھی کہ اظہر کی شادی فوراً کر دی جائے۔ مگر تم نے معلوم ہوتا ہے کہ ساعت ہی نہیں کی!"

وہ گھبرا کے بولیں "جی میں نے کوشش تو کی مگر اظہر نے نہ مانا۔ وہ کہتا تھا میں شادی ہی نہ کروں گا۔"

خان بہادر نے کڑک کے پوچھا "آخر یہ کیوں۔ میں یہی تو دریافت کرنا چاہتا ہوں۔" انتہائی گھبراہٹ اور سراسیمگی میں اظہر کی ماں کے منہ سے نکل گیا کہ "وہ یہ کہتا ہے کہ میں صغیرہ کے سوا کسی سے بیاہ نہ کروں گا!"

بس کیا تھا۔ بارود کو آگ دکھا دی گئی۔ خان بہادر صاحب برس پڑے "کمبخت۔ ناشدنی۔ ناہنجار مردود۔ آجکل کے لونڈے اتنے بے شرم اور بے حیا ہو گئے ہیں کہ اب انھوں نے گھروں کو بھی چکلا بنا لیا ہے۔ اب اپنی بہنوں اور عزیزوں سے عشق کیا جانے لگا۔ صغیرہ کے سوا کسی اور سے شادی نہ کرینگے، ہونہہ!۔۔ اسے یہ کہتے شرم نہیں آتی؟ اس کا منہ اور صغیرہ، مردود نے آخر دنیا میں کیا کیا ہے، سو روپلی کی نوکری ہی خود اپنے اور ماں کے کھانے کو اچھی طرح اٹھتا نہیں۔ اس پر یہ دماغ کہ میری بیٹی سے شادی کرینگے۔ میں کہتا ہوں وہ تو لونڈا ہے مگر چھوٹی دلہن تمھیں کیا ہو گیا تھا جو تم مجھ سے اس طرح کی بات بار بار کہنے آتی ہو؟" چھوٹی دلہن کی بھلا اتنی کہاں ہمت تھی کہ وہ اس ڈکارتے ہوئے شیر کے آگے دم مار سکیں مگر ممتا نے چپ نہ رہنے دیا۔ بولیں "بھائی جان۔ یوں تو اظہر آپ کا بچہ ہے آپ اسے جو کچھ جی چاہے کہیں مگر اسنے ایسی خواہش کرنے میں کیا برائی کی۔ اسکی اور صغیرہ کی جوڑ اللہ نے خود بنائی ہے۔ دونوں ایک ساتھ کھیلے کودے بڑے ہوئے۔ اور پڑھے ہیں سن میں بھی مناسبت ہے۔ صغیرہ کا اللہ رکھے بیسواں سال ہے اور میرا اظہر ابکی میرا جی میں تیس برس کا ہو جائے گا۔ ہاں ہمارے پاس روپیہ پیسہ نہیں ہے۔ سو یہ مقدر کی بات ہے۔ اللہ چاہے آج نہیں ہے۔ کل ہو جائے۔" خان بہادر نے نہایت رکھائی سے منہ بنا کے کہا "خیر مجھے منظور نہیں ہے۔ میں نے صغیرہ کے لئے کچھ اور ہی سوچ رکھا ہے۔ بہتر ہے میاں اظہر تو ان کی شادی کہیں اور سے طے کر دو۔ اور اگر تمھارے کہنے سے نہیں راضی ہوتے ہیں تو میرے پاس بھیجدو۔ دیکھوں تو مجھ سے وہ کیا فرماتے ہیں۔"

خان بہادر کی بیوی اب تک چپ تھیں۔ وہ بولیں نا چھوٹی دلہن تم خدا کے لئے یہ نہ کرنا۔ جوان لڑکا ہے۔ ان کا مزاج جیسا کڑوا ہے ظاہر ہے۔ اگر اسنے سوال جواب شروع کر دیا تو اور بھی بُرائی ہوگی۔۔۔۔"

خان بہادر نے سُرخ ہو کے جواب دیا "مجال ہی جو بد تہذیبی کر سکے اور میری بات کا جواب دے!"

اظہر کی ماں تو گردن جھکائے چُپکی بیٹھی رہیں مگر خان بہادر کی بیوی بولیں "اے جب بے عقلی کی بات کہو گے تو چھوٹا بڑا ہر ایک جواب دیگا!"

یہ برجستہ جواب ایسا تھا کہ خان بہادر چُپ چاپ باہر چلے گئے۔

اظہر نے ماں کی زبانی ساری گفتگو سنی۔ کئی گھنٹے روتا کیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ شروع شروع میں تو اس کی محبت میں حیوانیت زیادہ تھی۔ وہ صغیرہ کو اس لئے چاہتا تھا کہ وہ صنفی لذات کا مجموعہ تھی۔ مگر اس دو برس کے انتظار نے روحانی اور دماغی کشش زیادہ بڑھا دی تھی، اب وہ اسے اس لئے چاہنے لگا تھا کہ وہ ایک پاکیزہ نفس اور اعلیٰ خیالات کی لڑکی تھی یعنی عشق میں جذباتی اور جسمانی عناصر کے علاوہ دماغی اور روحانی عناصر بھی بڑھ گئے تھے۔ صغیرہ سے اب جدائی واقعی روح سے جُدائی تھی۔ اور یہ جیتے جی ناممکن تھا۔ اسی لئے اسنے خود اپنے ہاتھ سے خان بہادر صاحب کے نام خط لکھا اور اپنی خواہش ظاہر کی۔ آخری جملہ یہ تھا "خدارا مجھ پر رحم فرمائیے۔ اس لئے کہ اس رشتہ کی نامنظوری کی صورت میں میرے لئے زندگی محال ہی۔" پھر خود ہی خط لکھ کے کوٹھی پر پہونچا۔ باہر ملازموں سے معلوم ہوا کہ خان بہادر کہیں گئے ہیں اندر چچی کے پاس گیا۔ وہاں تھوڑی دیر بیٹھا ادہر اُدہر کی باتیں کرتا رہا۔ صغیرہ نہیں دکھائی دی۔ پوچھا کہاں ہے معلوم ہوا اپنے کمرے میں پڑی ہی۔ کل سے بخار ہے۔ اُٹھ کے اسکے پاس آیا۔ وہ اسے دیکھتے ہی اُٹھ بیٹھی، معمولی مزاج پرسی کے بعد انھوں نے ماں اور چچا کی گفتگو دُہرائی۔ اسکی سُرمگیں آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور آہ سرد بھر کے بولی "ہاں میری قسمت میں خوشی نہیں۔ میں اس دُنیا سے نامراد ہی اُٹھوں گی۔"

انھوں نے بھی ٹھنڈی سانس بھری اور جیب سے وہ خط نکال کے دیا جو انھوں نے خان بہادر کے نام لکھا تھا۔ اسنے اسے شروع سے آخر تک کئی بار پڑھا اور پھر تھوڑی دیر تک سوچتی رہی۔ پھر ان سے فاؤنٹن پن مانگ کے انکے دستخط کے نیچے اپنے قلم سے لکھا "ابا جان میں دنیا کے تمام دولتمندوں اور عقلمندوں پر انھیں ترجیح دیتی ہوں اور آج آپ پر یہ بات ظاہر کر کے رحم کی طالب ہوں۔ صغیرہ"

اظہر نے اس کے ہاتھ سے خط لیا۔ اور اس مقام کو جہاں یہ چند فقرے لکھے گئے تھے۔ آنکھوں سے لگایا پھر کھڑے ہوکے بولے "میں آج اس قضیہ کا ہمیشہ کے لئے فیصلہ کراکے چھوڑوں گا۔ یا تو چچا جان مجھے مار ہی ڈالیں گے......"

صغیرہ نے بات کاٹ کے کہا "نہیں اتنی سخت سزا کی امید نہیں ہے وہ مجھے دُنیا کی تمام چیزوں سے زیادہ چاہتے ہیں" اظہر نے بات کا سلسلہ جاری رکھ کے کہا "یا پھر منظور ہی کرلینگے!"

صغیرہ نے دھیمی آواز میں کہا "ممکن ہے"

خان بہادر آٹھ بجے شب کو اپنے دفتر میں بیٹھے ہی تھے کہ انکے ملازم خاص نے اظہر کا خط دیا۔ اور یہ کہہ کے چلا گیا "اظہر میاں جواب کے لئے باہر بیٹھے ہوئے ہیں"

خان بہادر صاحب نے استعجاب سے خط لے کے کھولا۔ جس جس طرح خط پڑھتے جاتے تھے وہ آپے سے باہر ہوتے جاتے تھے۔ صغیرہ کی دو سطروں نے تو انھیں خاصا دیوانہ کردیا۔ انھوں نے خط کو ہاتھ میں سمیٹ کے مسل ڈالا۔ پھر اسے زمین پر پھینک کے پاؤں سے کچلتے رہے۔ پھر بھی غصّہ بڑھتا ہی گیا وہیں سے چیخ کے پکارے "اظہر۔ اے او اظہر!"

اظہر ڈرتے سہمتے کمرے میں داخل ہوئے۔ خان بہادر انھیں دیکھتے ہی دانت پیسنے لگے۔ تہذیب بالکل بھول گئے۔ نہایت ہی غصّہ میں بولے "کیوں بے اب تو غیرت اور حمیت سب کھو بیٹھا۔ اب تیری یہ مجال ہوگئی کہ تو مجھے اور اس طرح کا خط لکھے؟" اظہر نے بہت ہی ادب سے کہا "چچا ابّا۔ یہ معاملہ موت و زندگی کا ہے!" خان بہادر کرسی سے اُچھل پڑے "موت و زندگی کا معاملہ ہے۔ اچھا تو مردود یہ لے۔ یہ لے۔ یہی اس کا جواب ہے!" یہ کہتے جاتے تھے اور بغل میں جو چھڑی رکھی تھی اس سے بھتیجے کو پوری قوت سے مارتے جاتے تھے۔ اظہر کا ہاتھ بیکار ہوگیا۔ پیٹھ کئی جگہ سے کٹ گئی۔ کنپٹی سے خون جاری ہوگیا مگر وہ خاموش کھڑا مار کھاتا گیا۔ یہاں تک کہ یہ خود اپنی شقاوت سے تھک کے چھڑی پھینک کے کرسی پر دھم سے بیٹھ گئے۔ اور ہانپنے لگے۔ وہ اسی طرح زرد خون میں رنگا ہوا سامنے کھڑا رہا۔ جب یہ بیٹھ گئے تو بولا "چچا ابّا۔ اب تو آپ غصّہ اُتار چکے۔ اب میرے خط کا جواب؟"

یہ تو آگ پر تیل چھڑکنا تھا "قسم خدا کی اگر تو میرے سامنے سے نہیں جاتا تو میں تجھے مار ہی ڈالوں گا" اور یہ کہتے کہتے جھپٹ کے سامنے آتشدان پر جو دو کرچیں کیلوں کے سہارے لٹکی ہوئی تھیں ان میں سے

ایک کرچ کاٹھی سے کھینچ کے باہر نکال لی۔ پھر اظہر کے سامنے آ کے چیخ کے بولے "جا۔ ابھی خیریت ہے میرے سامنے سے دور ہو جا۔ نکل جا۔" مگر وہ اسی طرح ان سے نظر لڑائے دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے کھڑا رہا۔ ان کا غصہ جنون کی حد تک پہنچ گیا۔ آج تک کسی کی اتنی مجال نہ تھی کہ وہ خان بہادر کے غصہ کی تاب لا سکے۔ یہ کل کا لونڈا۔ اور اس کی جرأت۔ بس غصے نے آخری حد کو بھی پار کیا۔ انھوں نے کرچ اظہر کے سینے میں بھونکنے کے لئے ہاتھ پیچھے کھینچا کہ صغیرہ زنانہ حصہ مکان سے جھپٹتی ہوئی آئی۔ اور انکے ہاتھوں سے چمٹ گئی۔ ایک تو یوں ہی تھک چکے تھے۔ اس پر غصہ میں آپے سے باہر ہو رہے تھے اس طرح اسکے اچانک چمٹ جانے سے اپنے کو سنبھال نہ سکے اور مع اسکے زمین پر آ رہے۔ مگر اس طرح کہ کرچ صغیرہ کی پشت سے پار تھی۔ اظہر کے جسم کو حرکت ہوئی۔ وہ شیر کی طرح جھپٹا۔ اسنے اپنے چچا کو کاغذ کی طرح اٹھا کے دور پھینک دیا اور کرچ کا قبضہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے بہت پھرتی سے کھینچ لیا۔ خان بہادر ابھی تک بدحواس تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ کیا ہوا یا انہیں کیا کرنا چاہئے۔ اظہر نے صغیرہ کے خون سے رنگین کرچ کو بیچ سے پکڑا اور پوری قوت سے اپنے سینے میں بھونک لیا۔ صغیرہ نے تڑپتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو اپنے قریب اظہر کو دم توڑتے پایا۔ اسنے اپنا نازک ہاتھ اسکے سینے پر رکھا۔ اور بڑی نرمی سے پکارا "پیارے؟" اظہر نے مسکرا کے کہا "پیاری.... چلو۔ اب وہیں.... شادی ہوگی!" پھر اسنے پوری قوت سے کام لے کے صغیرہ کو اپنی طرف کھینچا۔ خود بھی کھسکا۔ یہاں تک کہ اسنے اس کا سر اپنے زخمی سینے پر رکھ لیا۔ پھر دونوں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مسکرائے۔ دو چار مرتبہ ہاتھ پاؤں پھیلے اور سمٹے اور گرم زمین پر گرے ہوئے پھولوں کی طرح مرجھا کے رہ گئے!

جناب لچھمی نرائن دھون صاحب رونق

نہ پڑ تو پھیر میں زندوں کے زاہد راہ سے اپنی — انھوں نے ایک چلو مے پہ جنت بیچ ڈالی ہے
کھڑے ہیں لوگ باندھے ٹکٹکی سکتے کا عالم ہے — دکھا کر بام پر کس شوخ نے صورت چھپائی ہے
خبر لیتا نہیں وہ بت نہ لے پروا نہیں ہم کو — ہم ایسے بیکسوں کا ہجر میں اللہ والی ہے
جھکایا آسماں نے سر زمیں کے سامنے اتنا — وہ فخر سرفرازی تھا یہ اوج پائمالی ہے
عنادل مست شاخیں جھومتی ہیں باغ میں رونق — خبر آنے کی کس میخوار کے ان سب نے پالی ہے

احوالِ واقعی

"منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی"　　"کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے"

ہمیں ہمیشہ سے اسکی تمنا تھی کہ ہم بھی شاعر بنجائیں۔ یا کم از کم لوگ ہمیں شاعر سمجھنے لگ جائیں۔ یہ ظاہر ہے کہ ہماری اس تمنا کو ذوقِ شعری سے کوئی خاص تعلق نہ تھا بلکہ اپنے مختصر سے نام کے ساتھ ایک عدد تخلص چسپاں دیکھنے اور سننے کی بے ضرر خواہش اسکی تہ میں پوشیدہ تھی۔ ہمارے نزدیک شاعری کی حیثیت محض ایک زینہ کی تھی جسکی مدد سے ہم تخلص کی چھت پر چڑھنا چاہتے تھے۔ آپ جانیں شوق بری بلا ہوتا ہی۔ اور پھر وہ بھی شاعری کا! چنانچہ ہم نے سب کام چھوڑ چھاڑ کر اس زینہ کی بنیادیں کھودنا شروع کردیں مگر طبیعت کی زمین خشک اور سنگلاخ ثابت ہوئی۔ مجبور ہو کر علم عروض کی مختلف کتابوں کو شروع سے آخر تک پڑھ ڈالا۔ مگر معلوم یہ ہوا کہ اصول فن کا سیکھ لینا اور بات ہی اور اینٹ گارے سے جیتی جاگتی عمارت بنا لینا اور بات ہی۔ اس طرح کی کامیاب معماری کیلیے سب سے پہلے دماغ کو شاعرانہ انداز خیال کے سانچے میں ڈھالنے کی ضرورت ہی۔ اس نکتہ پر پہونچتے ہی ہمنے کئی مستند دیوانوں کا بصد شوق مطالعہ کیا یعنے شعرا کے نفسیات و حسیات کا جائزہ لے لیا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے رنگ میں یکتا نظر آیا۔ مگر افسوس کہ ہمارے پختہ رنگ دماغ نے ان میں سے کسی کا بھی اثر قبول نہ کیا غالباً دل میں رشک یا ندامت اور بظاہر غصہ کے تاؤ میں ہم نے ان سب دیوانوں کا پلندا باندھ کر الماری میں بند کردیا۔ اوپر سے ایک سنگین قفل کا اضافہ کرکے اسکی کنجی اللہ جانے کہاں گم کردی۔

چندروز کے بعد کسی کتاب میں ہم نے پڑھا کہ شاعر نہ علم عروض کے حاصل کرلینے سے آتی ہے نہ کلیات کے مطالعہ سے۔ بلکہ اصل چیز ہے جذبات کا برانگیختہ ہونا۔ شاعر کا نرم نرم دل اپنے ماحول سے کچھ اس طرح متاثر ہوتا ہے کہ کلام میں موزونیت خود بخود پیدا ہو جاتی ہی۔ دوسرے ہی دن ہمنے ایک ہفتہ کی رخصت حاصل کرکے مناسب ماحول کی تلاش میں مسوری کا ٹکٹ خریدا۔ ادیہ محض استعارہ ہی۔ ورنہ

وہاں سب کو کسی اور مقام کی طرح بلا ٹکٹ جانا پڑتا ہے) اس پہاڑ پر مناظر فطرت بکثرت گرے پڑے ملتے ہیں بلکہ راستہ ہی سے پستہ قامت پہاڑیوں کی غیر مانوس شکلیں۔ ڈراونے کھڈ اور گھنے جنگل طرح طرح کے جذبات کو ابھارنے لگتے ہیں۔ ہر ڈھال پر اچانک پھسل پڑنے اور ہر موڑ پر کسی نئی صورت سے یکبارگی بغلگیر ہو بیٹھنے یا سر ٹکرا دینے کا امکان جذبات کے سمندر میں مدوجزر کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔ اسکے علاوہ "ڈانڈی" کی سواری (جسے موٹر کی نثر نما ہموار سڑک قصۂ پارینہ بنا دے رہی ہے) خود بھی بہت کچھ محرک جذبات ہوتی ہے۔ جیتے جی چار کے کندھوں پر لدے چلنا سرائے فانی کے مسافر کی عام بے بسی اور دنیا کی بے ثباتی کی تصویر کشی کرتا ہے۔ اور زندگی میں موت کا لطف آجاتا ہے۔ یہی ہیں وہ بیش بہا تاثرات و مشاہدات جو شاعری کے تاروں پر مضراب کا کام دیتے ہیں اور ہر قدم پر نغمہ سرائی کے جوش کو بھڑکاتے ہیں۔ چنانچہ اسکا اثر کچھ ہم پر بھی ضرور ہوا، اور ہم راستہ بھر "ٹھہر ٹھہر داری" کی ردیف میں مصرعے موزوں کرنیکی کوشش کرتے رہے۔

پہونچتے پہونچتے شام ہوگئی تھی۔ کچھ کھا کے سو رہے۔ دوسرے دن نیا سوٹ نکالکر پہنا۔ نئی سینٹ کی شیشی انڈیلی۔ نئی پاکٹ بک مع پنسل جیب میں رکھی اور چھڑی ہاتھ میں لیکر جذبات برانگیختہ کرنے کے ارادے سے چل نکلے۔ کچھ دور گئے تھے کہ ایک چھوٹے سے پارک میں درختوں کی چھاؤں تلے ایک باغی (یا باغیانہ) کرسی نظر پڑی۔ چونکہ شاعری کی طرح لکھنؤ (شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے قول میں) ہماری جسمانی راحتوں کا مرکز بھی ہے لہٰذا ہم "کرسی" کو شاعری کی پہلی منزل سمجھ کر وہیں بیٹھ گئے۔ سماں فی الحقیقت نہایت دلکش تھا۔ سامنے عوج بن عوق کی طرح بلند پہاڑ۔ نشیب میں قبر سیاوش کی طرح سبزے سے ڈھکی وادی۔ فضا میخانے کی طرح خوشگوار۔ چاروں طرف پرندوں کے چہچہے اور بیچ میں ہم۔ قریب تھا کہ اس دلفریب منظر کی محویت شاعری کی تلاش کے خیال کو ہمارے ذہن سے بیدخل کردے کہ اتنے میں ایک نرس دو تین بچوں کو ہمراہ لیے وہاں پہونچی۔ بچے گھانس پر کھیل میں مصروف ہو گئے اور نرس نے اپنی جیب سے ایک کتاب (جو یقیناً کوئی جذباتی ناول ہوگا) نکالکر بڑے انہماک سے اسکا مطالعہ شروع کردیا۔

اب بتائیے کہ اس سے زیادہ شعریت خیز ماحول اور کیا ہوسکتا ہے۔ فطرت کا منظر دلفریب بچوں کی چہل پہل روح پرور۔ اور نرس کا پُر انہماک مطالعہ شاعرانہ پرواز خیال کا ضامن۔ چنانچہ ہم نے فوراً پاکٹ بک

نکالی اور پنسل ہاتھ میں لیکر شعر کی آمد آمد کا انتظار کرنے لگے۔ مگر اُس ظالم کو نہ آنا تھا نہ آیا۔ یعنی بالکل نہ آیا۔ گو جذبات کی کمی نہ تھی بلکہ دنیائے باطن میں ایک اچھا خاصہ طوفان برپا تھا۔ ایک آدہ شعر تو کیا چیز ہے چھوٹا موٹا دیوان مرتب ہو جاتا تو بھی تعجب کا محل نہ تھا۔ مگر شعر نے آنے (یا شعر کے یہاں ہونے) کی قسم کھا رکھی تھی۔ سوچے کہ کیا معاملہ ہے۔ یاد آیا کہ جب تک بحر۔ ردیف۔ اور قافیہ وغیرہم کا جال پہلے سے نہ پھیلا لیا جائے اُسوقت تک شعر نہیں پھنستا۔ سیانا کوا ہے۔ حرفوں کا بنا ہوا۔ بڑی ترکیبوں سے قبضے آتا ہے۔

شکار گاہ فکری میں مصرعہ طرح کی حیثیت اس سدھے ہوئے جانور کی ہے جسکی مدد سے تازہ شکار پھنسایا جاتا ہے۔ لہذا ضرورت ہے ایک تربیت یافتہ مصرع طرح کی۔

یہ بھی سچ کہا گیا ہے کہ کسی وقت کی دماغی محنت رائگاں نہیں جاتی۔ وہ جو ابتدا میں چند دیوانوں کو الٹ پلٹ لیا تھا وہ اب کام آیا اور ہم نے اُستاد میر کی "شاید کہ بہار آئی زنجیر نظر آئی" والی غزل کو میاں شعر کے پھسلانے کا ذریعہ قرار دیکر تھوڑی ہی دیر میں مطلع کا پہلا مصرعہ یوں نظم کیا۔

"نرس کے بچوں میں فطرت کی تصویر نظر آئی"

لیکن جب پہلے پہل کے شکار کی انتہائی خوشی کا جوش ذرا ٹھنڈا پڑا تو معلوم ہوا کہ جس طرح نرس کے ساتھ بچوں کا وجود لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح اس مصرعہ کا دامن بھی دو مایوس کن خامیوں میں اُلجھا ہوا ہے یعنے جس طرح اعضاء کا لوچ اور کمر کی لچک رفتار میں نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح اسکی ناموزونیت زبان پر رواں کرنے میں پھوٹ نکلی۔ اور غلط بیانی یوں کہ بچے فی الحقیقت نرس کے نہ تھے۔ لہذا اسکو نامنظور کر کے پورا مطلع از سرِ نو یوں نکالا۔

ہمکو تو وہاں ایک زلف گرہ گیر نظر آئی ۔۔۔ ہر نرس کو ناول میں تقدیر نظر آئی

اس شعر میں معنویت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ جب میر صاحب جیسے حرمان نصیب و حسرت نوا بزرگ کو دوج ہوا میں زنجیر کی کڑیاں نظر آسکتی ہیں تو ہمیں متعرض آشنا سنہری زلفوں میں پیچ در پیچ گرہوں کا دکھائی دینا عین مقتضائے فطرت تھا۔ اور نرس کی تقدیر کا معاملہ یوں ہے کہ جذباتی ناولوں کے ناتجربہ کار پڑھنے والوں کو ہر ناول کے اُلجھے ہوئے پلاٹ میں اپنی ہی تصویر نظر آتی ہے۔ نرس کے بشرہ سے صاف ظاہر تھا کہ تصورات دلنواز کی دنیا میں وہ خود تو افسانوی "ہیروئین" کی زندہ تصویر ہے، اور کتنوں نے کی

فوجی بارکوں کا کوئی خوش نصیب نامی ہیرو، کی وردی پہنے مملکت حسن کے محاصرہ میں جانبازیوں کا مظاہرہ کر رہا ہو۔ مگر دانے ناکامی قسمت کہ پیمائش کرنے پر یہ شعر بھی پورا نہ اترا ہمیں کیا خبر تھی کہ ریاضی کا ساتھ یہاں بھی نہ چھوٹے گا۔

اس شعر کی چولیں بٹھانے۔ اسکی معنویت سے لطف اندوز ہونے اور پھر موزونیت کمیاب پا کر اُسے پنسل زد کرنے میں اتنا وقت صرف ہو گیا کہ جب ہمنے نئے شعر اور نئے مضمون کے فراق میں بچوں والی نرس کی طرف نگاہ شوق اُٹھا کر دیکھا تو وہاں مطلع صاف پایا۔ البتہ آسمان پر اندر دیوتا کی کالی اور بھوری فوجیں آراستہ نظر آئیں۔ انکے مقابلہ میں چھتری بیکار ثابت ہوئی اور ہم ماحول کا پورا اثر جذب کر کے پانی برساتے ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان پہاڑی مقامات کی تلون مزاج آب و ہوا شاعروں اور فلسفیوں کے لیے حد درجہ ناموافق ثابت ہوتی ہے۔ بلا نوٹس پانی برسنے لگتا ہے اور پھر بلا وجہ دھوپ نکل آتی ہے۔ سیلاب باراں کی تیزی ان لوگوں کے تسلسل خیال کو میلوں بہا لیجاتی ہے اور چلچلاتی دھوپ انکے رہے سہے حواس خبط کر دیتی ہے۔ گویا یہاں کی فضا بھی چھیڑ خوانی سے باز نہیں آتی۔

خیر یہ تو تھا مشتے نمونہ از خروارے۔ پورا ہفتہ اسی طرح مشق سخن میں گزرا۔ کبھی کبھی آبشار کے کنارے بیٹھکر نامکمل مصرعے گنگنائے۔ کبھی کبھی اونچے پہاڑ کی چوٹی کو بلند پروازی خیال کا زینہ بنایا۔ کبھی لائبریری کے سامنے والی بنچوں پر بیٹھکر اور تاثرات حُسن سے مضمحل ہو کر خزینہ کلام کہنا چاہا۔ کبھی رنک اور سینما کے قہقہوں میں انبساط آمیز اشعار کی تلاش کی۔ کبھی ہوٹل کے غل غپاڑہ میں مصرعہ موزوں کرتے کرتے نیچر سے جا بھڑے۔ کبھی لنڈھور بازار کے ماحول میں مشرقی مذاق سخن پر گامزن ہوئے۔ کبھی "ہیپی ویلی" کی سیر گاہوں میں مغربی مذاق سخن پر جہل قدمی کی۔ کبھی "کلہڑی" کی دوکانوں اور چار خانوں میں مدہوشوں کے "طرز کلام" میں اول فول بکے۔ کبھی انکی یاد میں قصیدہ خوانی۔ کبھی ان کی یاد میں غزلگوئی کی۔ مگر نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا یعنے چھٹی ختم ہوئی اور ہمنے تصورات شاعری کی شبانہ روز فرصت کو "باصد حسرت و یاس" خیر باد کہہ کے اپنے مرکز کی طرف شاندار پسپائی کی۔

تجربہ معلم حقیقی ہے اسکے طفیل ہمیں اب پورا یقین ہو گیا کہ بام تمنا تک ہماری رسائی شعر گوئی کے زینہ سے نہیں ہو سکتی۔ لہذا کسی ایسی حکمت عملی سے کام لینا چاہیے کہ زینہ منہ دیکھتا رہ جائے اور ہمارے قدم چھت پر ہوں۔ چنانچہ چند روز کی سوچ بچار کے بعد ہمنے تُک بندی کر کے نثر میں ڈبل قافیہ ہانکنا شروع کر دیا۔ شاعری

اور رند مشربی میں فطری موانست ہونیکے علاوہ رند بہ اعتبار تخلص بھی مشہور شاعر رہ چکے ہیں۔ لہذا بہت دن نہ گزرے تھے کہ خود ہمیں اور ہمارے احباب کو بھی یہ مغالطہ ہونے لگا کہ ہم شاعر ہیں اور رند ہمارا تخلص ہے بلکہ بعض احباب تو اسدرجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے ہماد شما کے سامنے ہماری رند مشربی کا راز افشا کرنا شروع کردیا۔ رفتہ رفتہ عارضی تصرف نے قبضۂ مخالفانہ کی صورت اختیار کرلی۔ اور اب ہم بلاخوف و خطر اپنے نام کے ساتھ اس تخلص کے اضافہ کرنیکے قانونی حقدار ہوگئے ہیں۔ اطلاعاً تحریر ہے۔ باقی سب خیریت ہے۔ فقط۔ والسلام۔

خادم ادب
خواجہ اطہر حسین رند (ایم اے)

غزل

جناب ابوالبیان مائل لکھنوی

کہنے کو تو کہدوں مجھے دیوانہ بنا دے
ایسا نہ ہو اپنے سے وہ بیگانہ بنا دے

صحرا بھی جسے ایک نظر دیکھ کے شرمائیں
ایسا مرے غمخانے کو ویرانہ بنا دے

برعکس تمنا ہی جو کرنا ہے تو اچھا
فرزانہ کہوں میں مجھے دیوانہ بنا دے

ہر تار نفس کو مرے معبود محبت
ہنگام سحر سبحۂ صد دانہ بنا دے

یہ قید خرد تنگ ہے اے کشمکش عشق
ہاں ہاں مجھے منظور ہے دیوانہ بنا دے

باز آئے ہم اس حشر در آغوش سے یارب
آبادئ دل میٹ دے ویرانہ بنا دے

جاہے تو ابھی اک نگہ نرگس مخمور
ہر ذرۂ میخانہ کو میخانہ بنا دے

تھم تھم کے جلانا ہو تو دے شمع صفت دل
اک دم سے جلانا ہو تو پروانہ بنا دے

کچھ دیر و حرم پر نہیں موقوف ہی مائل
بن جائے جو جلوہ جانانہ بنا دے

ادارہ ادب میں اعظم ترین صفات کا شہرۂ آفاق پلنگ

حضرت آرزو ایک مرتبہ اُس حصۂ مکان میں جہاں دفتر ادب ہے چند دنوں کیلیے قیام پذیر ہوے، آدمی نے موصوف کیلیے جو پلنگ لاکر بچھایا وہ اتفاق سے ٹیڑھا اور بولنے والا تھا۔ ہم لوگوں نے اُسے دیکھکر دوسرا پلنگ منگانیکو کہا لیکن موصوف نے اسکو رہنے دیا۔ آپنے اسی پلنگ پر بیٹھے بیٹھے چند اشعار لکھ ڈالے جو آج ناظرین کی دلچسپی کیلیے درج ذیل کیے جاتے ہیں۔ اِسکی سُرخی میں ایڈیٹر اور منیجر دونوں کے نام موجود ہیں (مدیر)

عجب پلنگ ہے بانکا ہمارے سونے کا
کہ جس کے پاؤں ہیں ہے کج کلاہ کی دستار

بشر کے ہوتے ہیں دو، چار کان اسکے ہیں
مگر نہ اس لیے ہرگز کہ کچھ سُنیں گفتار

زباں نہیں ہے مگر اسقدر کرخت آواز
کہ ہیچ سامنے جس کے پلنگ کی بھی ڈکار

جو سونے کے لیے لیٹو تو پاتے ہی آہٹ
زباں میں اپنی دعا پڑھ کے باندھتا ہے حصار

دیے ہی جاتا ہے لوری ہر ایک کروٹ پر
ملے گا کاہے کو ایسا رفیق شب بیدار

مُشاہرہ ہے نہ یومیہ ہے نہ سالانہ
غریب اس پہ بھی ہے رات دن کا چوکیدار

ہر ایک چول ہے اسکی کلاک کی گھنٹی
ہے جسکے سامنے صنعت فرنگ کی بیکار

وہ کوک اِس میں بھری ہے کہ بے تعیُّن وقت
جو سونے والے کو آہٹ پہ کرتی ہے بیدار

خبر نہیں اسے پالا پڑا ہے کیسوں سے
کہ بند ہی نہیں ہوتی ہے اسکی چیخ پکار

خدا نہ کردہ اگر تخلیہ میں کوئی بچھائے
یہ نیک کار کو مشہور کر دے بدکردار

اسی پہ بسترِ راحت لگائے بیٹھے ہیں
جو ہم سے بڑھ کے ہے خود مبتلائے صد آزار

خموش ہم ہیں مگر یہ کراہے جاتا ہے
جو کچھ بھی مرضی معبود بندہ ہے ناچار

دلچسپ انعامی مقابلہ

خاص نمبر کے انعامی مقابلہ کے بہت سے معزز شرکا میں سے جناب سید اصغر مہدی صاحب نگرامی کے جوابات سب سے زیادہ صحیح ہیں۔ پانچ شعروں میں سے آپکے تین شعر لفظ بلفظ صحیح ہیں۔ بقیہ دو میں سے تیسرے میں صرف ایک غلطی ہے۔ اور پہلے میں دو غلطیاں ہیں۔ دوسرے اصحاب کے یہاں ان سے زیادہ غلطیاں موجود ہیں ہم موصوف کی خدمت میں حسب اعلان اپنا حقیر ہدیہ اندر ہفتہ پیش کرینگے۔

صحیح اشعار ناظرین کی آگاہی کے لیے درج ذیل ہیں

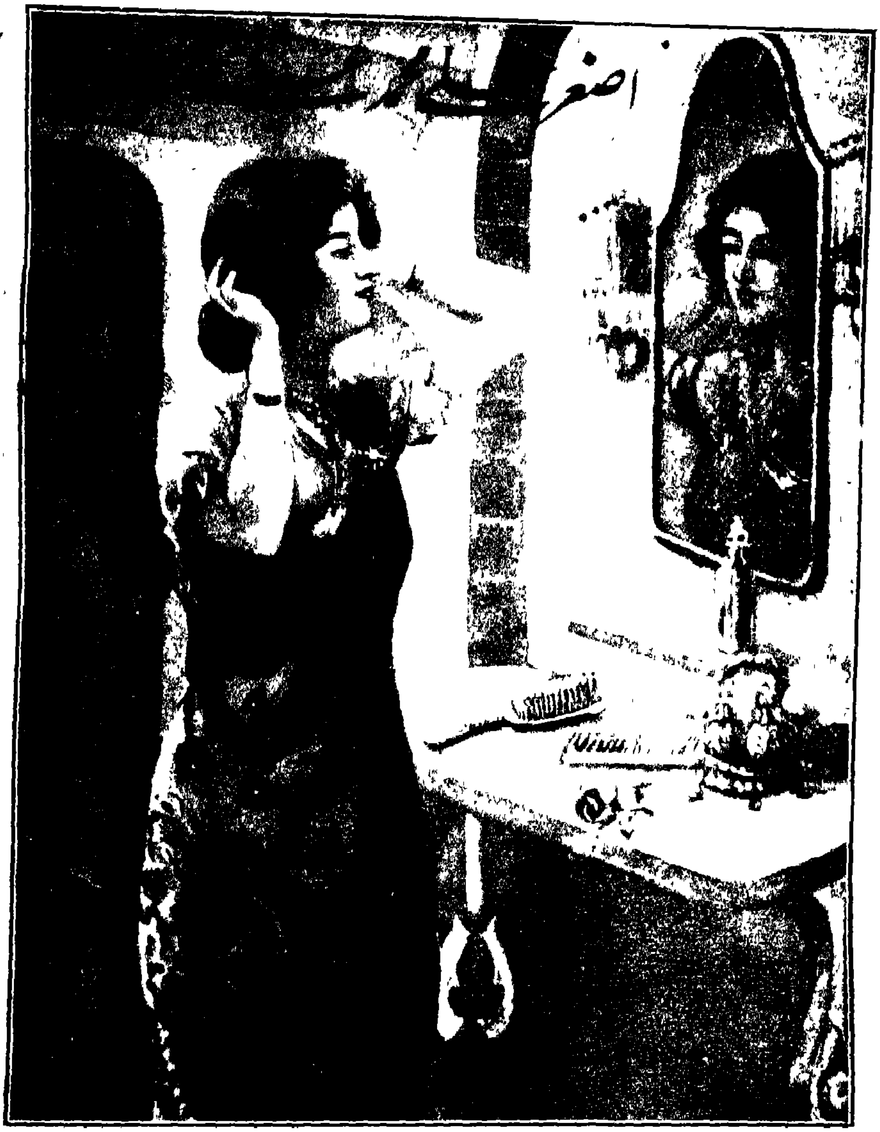
(۱) منحصر ڈوبنا کشتی کی تباہی پہ نہیں — پاؤں ساحل پہ جو ٹھہرا تھا کہ لنگر ٹوٹا (آرزو)

(۲) ایک دل کتنا ہے کیجے اُس سے رسم و راہ ترک — ایک دل کتنا ہے کچھ دن اور دیکھا چاہیے (داغ)

(۳) لگا دو تیر کر آئینہ کا پہلو ہو — فرشتہ موت کا ہے شوق بہانے کا (آرزو)

(۴) پاس کافر ہے مجھے خاطر دنیا اچھی ہے — در زینہ کو میں جاتا ہوں کلیسا ہو کر (امیر)

(۵) خدا ہو دوست تو دشمن بھی دوست ہوتا ہے — رقیب ان سے مرا انتقام لیتے ہیں (داغ)



فہرست مضامین

جلد ۴ بابت ماہ دسمبر ۱۹۳۱ء نمبر ۶

سید علم حسین پبلشر نے باہتمام سید محمد رضی مینیجر سرفراز قومی پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ ادب لکھنؤ سے شایع کیا

ہمدردان ادب سے درخواست

موجودہ اقتصادی کشمکش کی وجہ سے لٹریچر جو بدقسمتی سے مادی زندگی کی ضروریات میں سے نہیں ہے سخت کس مپرسی اور بے سروسامانی کے عالم میں ہے متعدد ادبی رسائل بند ہوچکے ہیں اور اکثر دم توڑ رہے ہیں، ایسے پرچے جو محض تجارتی حیثیت رکھتے ہیں یا صرف تیسرے درجے کا لٹریچر فراہم کرتے ہیں بند ہو جاتے ہیں تو چنداں افسوس نہیں ہوتا لیکن خالص علمی و ادبی خدمت انجام دینے والے جرائد کی موت یقیناً قابل تاسف ہوتی ہے، ملک کے نامور و سربلند ادبا و فضلا کی رائیں شاہد ہیں کہ "ادب" بھی انہیں مخصوص جرائد میں سے ہے جنکا بند ہو جانا صاحبان ذوق کے ملال اور قوم کے نقصان کا باعث ہے اسی لئے "ادب" کو اس روز بد سے بچانے کی کوشش کیجا رہی ہے۔ لیکن ہماری تنہا جدوجہد اسوقت تک کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتی جبتک کہ ناظرین مخلصین "ادب" ہماری مدد نہ فرمائیں اسلئے ہمدردان "ادب" سے درخواست ہے کہ وہ خود خریداری قبول فرمائیں اور دوسروں کو خریدار بنائیں۔ مینیجر

گاندھی جی جس کام کو اب کر رہے ہیں

اسی کو میں نصف صدی سے کامیابی کے ساتھ انجام دے رہی ہوں

مہاتما گاندھی کا خاص اصول ہے کہ ہر انسان کیساتھ خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، عیسائی ہو یا بودھ، برہمن ہو یا چمار ایک سا برتاؤ کیا جائے ممالک غیر کی چیزوں سے پرہیز کر کے اپنے ملک کی اشیا کی قدر کیجائے اب دیکھئے اور غور سے دیکھئے کہ میرا بھی ٹھیک یہی اصول ہے۔ مجھ میں ہند کی پاک و صاف زمین میں پیدا ہونیوالی چیزوں کے سوا اور کچھ نہیں یعنی ہندو مسلمان عیسائی بودھ، برہمن چمار یکساں فائدہ اٹھاتے ہیں میں جوانوں بڈھوں مردوں عورتوں ہر ایک کیلئے یکساں ہوں، میں ہر ایک کی تکلیف کو دور کرتی ہوں، کمزوروں کو مضبوط بنانا میرا خاص کام ہے جو میری خدمت کو قبول کرتا ہے اس کا قبض، بدہضمی خون اور قوت مردمی کی خرابی و کمی اور جریان احتلام سرعت رقت وغیرہ کو دور کر کے اعلیٰ درجہ کی طاقت و توانائی عطا کرتی ہوں دماغ اور قوت حافظہ کو اعلیٰ درجہ کی تقویت دیتی ہوں اپنے غلط افعال کا خمیازہ بھگتنے والوں کو اعلیٰ درجہ کی مردمی عطا کرتی ہوں میرا نام آتنک مجمرہ گولیاں ہے، قیمت فی ڈبیہ ۳۲ گولیاں صرف ایک روپیہ، پانچ ڈبیاں للعہ ایک کارڈ تجربہ کیلئے

وید شاستری منی شنکر گووند جی جام نگر کاٹھیاواڑ سے منگوا کے تجربہ کریں۔

نہایت عمدہ مضامین سے مزین صحت و تندرستی کی راہبر ۲۰۰ صفحات کی کتاب کام شاستر بالکل مفت منگا کر مطالعہ کریں۔

بزمِ ادب

حال ہی میں ہمارے صوبے کی چار یونیورسٹیوں میں کانوکیشن کے جشن منائے گئے ہیں۔ ملک کے نامور فرزندوں نے ان جلسوں کی صدارت کرتے ہوئے جو تقریریں کی ہیں وہ یقیناً اس قابل ہیں کہ بغور پڑھی جائیں۔ علی الخصوص کلکتہ کے مشہور پروفیسر اور "نوبل پرائز ہولڈر" سر سی، وی، رمن کے لیکچر بہت زیادہ نفع بخش و قابل تقلید ہیں۔

سر سی، وی، رمن ہندوستان کے اُن چند صاحبان علم و کمال میں سے ہیں جن کے کارنامے اس کم مایہ ملک کا نام دنیا میں روشن کر رہے ہیں اور جن کے وجود ہندوستانی جہالت کی تاریکی میں بجلی کی تیز روشنی کا کام کرتے ہیں یقیناً اگر اسی طرح کے روشن دماغ مفکرین ہماری یونیورسٹیوں کو اپنے خیالات سے مستفید کرتے رہے تو وہ دن دُور نہیں جب ان دار العلوم کی فضائیں بھی علمیت سے معمور ہو جائیں اور ان کے سند یافتہ بھی حقیقی معنوں میں تعلیم یافتہ کہلائیں۔

سر سی، وی، رمن نے الٰہ آباد یونیورسٹی میں صدارت کرتے ہوئے یونیورسٹی کی غائت، اہمیت، ضرورت کو بڑی قابلیت سے واضح فرمایا ہے۔ آپکی اس تقریر کا تھوڑا سا حصّہ ناظرین کی دلچسپی کے لئے درج ذیل کیا جاتا ہے۔ یونیورسٹی کی مالی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے آپنے کہا:۔

"بعض لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہندوستان کی مالگذاری اور دولت کا ایک بہت ہی مختصر سا حصہ صحیح تہذیب کی نشو و نما پر صرف کیا جاتا ہے۔ ہم ہندوستانی بعض حیثیتوں سے ابھی تک پندرہویں صدی میں بسر کر رہے ہیں ہم میں سے بعض نے زمانۂ وسطیٰ کے توہمات، اعتقادات اور خیالات سے آگے کوئی ترقی نہیں کی۔ یہاں جب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کوئی مندر بنائیں، کوئی مذہبی ادارہ قائم کریں یا مذہبی اعتقادات و خیالات کی ترویج و تبلیغ کریں تو ہمیں کثیر تعداد میں روپیہ مل جاتا ہے مگر جب مطمح نظر حقیقی تہذیب و علم یا سائنٹفک تحقیق کی ترقی ہوتا ہے تو پھر کہیں روپیہ نہیں ملتا۔ آج صحیح تعلیم اور حقیقی علم کی ترویج میں ہندوستان کا کتنا روپیہ صرف ہوتا ہے؟ ان اُمور پر جن پر میں روپیہ صرف کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے اگر اس کا تناسب ایک روپیہ میں ڈھونڈا جائے تو کیمیاوی تجزیہ کی ضرورت ہوگی!! اسپر بھی اگر بجٹ میں کسی کمی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو سائنس اور تعلیم

کے اخراجات پر ہوس و حرص کی نگاہیں پڑنے لگتی ہیں اور کمیٹی بٹھائی جاتی ہے کہ وہ اس بات کو غور سے دیکھے کہ الہ آباد یونیورسٹی کے بجٹ میں کمی کرکے کتنا روپیہ بچایا جا سکتا ہے۔ اگر مجھے اختیار ہوتا تو میں الہ آباد یونیورسٹی کے خرچ کی عدد کے آخر میں ایک صفر اور بڑھا دیتا۔ الہ آباد یونیورسٹی کی آمدنی اور خرچ کا مقابلہ مثلاً اس روپے سے کرو جو [illegible] اڈاپل پر خرچ کیا جاتا ہے۔ امریکہ کی چھوٹی سے چھوٹی یونیورسٹی سے مقابلہ کرو تو تمھیں زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ ہم لوگ آج ہندوستان میں درس و تدریس کے متعلق جو کچھ کر رہے ہیں اور جتنے کم روپے میں کر رہے ہیں وہ واقعاً تعجب خیز ہے۔ یہ خیال ہی کہ یونیورسٹی کا بجٹ کم کرنے سے ہم حقیقی طور پر اقتصادی حالت درست کر لینگے ہندوستان کے مستقبل کے لئے حد درجہ خطرناک ہے۔ ہمیں یہ بات یاد رکھنا چاہئے۔ ایک زمانہ میں مجھے یہ مشکوک فخر حاصل تھا کہ میں اکاؤنٹ کا افسر تھا۔ میرے فرائض میں سے ایک فرض یہ تھا کہ میں یہ غور سے دیکھوں کہ الاؤنس اور سفر خرچ کے جو بل گورنمنٹ کے افسران بھیجتے ہیں ان میں وہ کتنا روپیہ زیادہ لے لیتے ہیں۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جتنا روپیہ ہندوستان بھر کی تمام یونیورسٹیوں پر صرف ہوتا ہے اس سے زیادہ گورنمنٹ افسران کے مفروضہ زاید خرچ وصول کر لینے کی جانچ میں لگتا ہے۔ تمام ہندوستان کے معلمین کی مجموعی تنخواہیں اس روپیہ سے کم ہیں جو آج محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر صاحبان اور انسپکٹر صاحبان کو دیا جاتا ہے۔ آج ہماری یونیورسٹیوں کی نشو و نما اور جد و جہد میں وہ شخص بغیر پس و پیش کئے دخل انداز نہیں ہو سکتا جو ہندوستان سے حقیقی طور پر محبت کرتا ہے جو باقاعدہ ترقی، اتفاق اور عدم اختلاف مذہبی و سیاسی و قومی کا امیدوار ہے اور ملک کی حقیقی بہبود و فلاح کا خواہاں ہے۔ بدانتظامی و اختلال میں ہر اُس روپیہ کا لاکھ گنا اضافہ ہو جائے گا جو یونیورسٹی بجٹ سے کاٹ لیا جائے گا۔ جو روپیہ آج یونیورسٹیوں میں صرف کیا جاتا ہے وہ قانون اور امن و امان کی طرف داری میں صرف کیا جاتا ہے وہ عقلی نشو و نما پر صرف کیا جاتا ہے وہ تہذیب پر صرف کیا جاتا ہے وہ اختلال، افتراق اور معاشرتی ہنگامہ آرائیوں کے بجائے اتفاق و ارتقا پر صرف کیا جاتا ہے۔"

سر سی، وی، رمن نے آگرہ یونیورسٹی کنووکیشن میں یونیورسٹی کے لئے جس طرح کی عمارت اور لائبریری کی ضرورت بیان کی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

"اس طرح کا عالیشان مکان نہیں بلکہ میں اس سے خوش ہوں گا کہ ایک ٹین کا چھپر یا ایک بڑا پھوس کا جھونپڑا ہو بشرطیکہ اس میں تمام جدید ترین کتابیں اور ہر زبان کے رسالے موجود ہوں۔ ہر زبان کی کتابیں اور رسالے، صرف انگریزی، جرمن، فرانسیسی، اسپینش، اطالوی، روسی، سویڈش، ڈینش وغیرہ ہی نہیں بلکہ ترکی بھی۔

دنیا کا کوئی حصہ اس کام سے انکار نہیں کر سکتا جو دنیا کے کسی دوسرے حصے میں کیا جا رہا ہے آجکل کے لوگ بہ امر کو محسوس کرینگے کہ عقل و ذہن کسی خاص ملک کا حصہ نہیں ہے۔ ہر ملک کو دوسرے ملک سے کچھ سیکھنا ہے۔ اور یہ مخصوص بات صرف مطبوعہ کتابوں ہی سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ایسی یونیورسٹی بالکل کاغذی یونیورسٹی ہے جس میں ایک ایسی لائبریری نہ ہو جہاں جا کر یونیورسٹی کا غریب سے غریب طالب علم ہر قسم کی کتابیں مفت پڑھ سکے ایسی یونیورسٹی کا وجود سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں سے صرف ایک دن کے لئے ہوتا ہے۔ آپکے پاس ایک بہت بڑی لائبریری ہونا چاہیے (بلکہ ممکن ہو تو دو) تا کہ غریب سے غریب لڑکا بغیر کسی دقت کے انسانی علوم کے خزانے تک پہنچ سکے۔ آپ خیال کرتے ہونگے کہ یہ بہت معمولی سی بات ہے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آج علم و تحصیل علم کی ترقی میں سب سے بڑی دقت یہی ہے کہ طلبا کو نہیں معلوم ہونے پاتا کہ دوسرے ممالک بلکہ خود ہندوستان میں کیا کیا جا رہا ہے"

جامعہ ملیہ دہلی قابل قدر ادارہ ہے۔ اسکے کارکن نہایت خلوص و انہماک سے مشغول کار ہیں۔ انھوں نے اس ادارہ میں ایک شعبہ تصنیف و تالیف کا قائم کیا ہے۔ اس شعبہ کا نام "اردو اکاڈمی" ہے۔ ہمارے پاس اسکے مختصر قواعد آئے ہیں۔ فیس کی رقم ادا کر کے ہر شخص اس کا ممبر ہو سکتا ہے۔ ممبر کو سال میں جدید تصانیف اور رسالہ جامعہ مفت ملے گا۔ ہر ادبی ذوق رکھنے والے کو چاہیے کہ اس اکاڈمی کا ممبر ہو کر اردو کی بہبودی میں عملاً حصہ لے۔ مفصل حالات ناظم اردو اکاڈمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی سے معلوم کئے جا سکتے ہیں۔

'ادب' کا یہ نمبر اس کی چوتھی جلد کا آخری نمبر ہے۔ جنوری ۳۲ء سے انشاء اللہ پانچویں جلد شروع ہوگی جن حالات میں 'ادب' کا اجرا ہوا تھا ان کی موجودگی میں "ادب" کی بقا کے متعلق اکثر احباب کو شک تھا مگر ادبی خدمتگزاروں کے خلوص نیت نے رفتہ رفتہ مشکوکین کے شک کو زائل کر دیا اور اب ہم بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ البتہ موجودہ اقتصادی کش مکش کی بنا پر ادب نوازوں سے مزید توجہ اور ہمت افزائی کی امید کرتے ہیں

ہمیں یہ دیکھ کر رنج ہوا کہ 'ادب' کے چند قدیم کرم فرما حضرات نے ابکی اسکے وی۔ پی واپس کر دئیے۔ اگرچہ ہم اس خطرہ سے پہلے ہی سے واقف تھے مگر پھر بھی علم و ادب کی بقا کی اہمیت ظاہر کرنے کے لئے ہیں

کے مترادف یہ طریقہ کار اختیار کرنا پڑا۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ اپنے لٹریچر سے بے پروائی برتنا اپنی تہذیب کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہے۔ اور اسی اعتقاد کی توقع ہمیں اپنے ناظرین کے سنجیدہ طبقے سے بھی ہے۔ ہر طرح کے اخراجات میں تخفیف کی جا سکتی ہے مگر ادبی ضروریات کو تا امکان کم نہیں کیا جا سکتا۔ ریشمی موزے اور رومال اگر نہ استعمال کئے جائیں تو حقیقی عزت و وقار میں کوئی فرق نہیں آ سکتا لیکن اگر لٹریچر کو دفتر بے معنے سمجھ کر گمنامی کے گڑھے میں چھوڑ دیا جائے تو یقیناً ہمارا شمار اُن قوموں میں ہوگا جنھیں قدرت نے مسخ کر دیا ہے۔ اس لئے علم و ادب کے قدردانوں سے ہماری اپیل ہے کہ موجودہ سیاسی ہنگامہ آرائیاں خواہ کتنی ہی ابتری سے دوچار کریں مگر انھیں لٹریچر کا دامن نہ چھوڑنا چاہئے۔

'ادب' کو سیاسیات سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ مگر جب سیاسیات کی زد میں ادبیات آ جاتی ہے تو ضرور کچھ نہ کچھ اظہار خیال کرنا پڑتا ہے۔ خریداران 'ادب' کی ایک بڑی جماعت زمیندار پیشہ ہے اور بدقسمتی سے یہی گروہ آجکل سیاسی تیر اندازیوں کا شکار سب سے زیادہ ہے۔ یوں تو تجارت اور ملازمت بھی ابتری کے عالم میں ہیں مگر زمینداروں کی بربادی اس لئے بہت زیادہ نمایاں ہے کہ وہ دوسروں کی بہ نسبت کہیں زیادہ پہلے ہی سے مفلس تھے۔ ہمارے پیش نظر چند راجہ مہاراجہ نہیں ہیں بلکہ وہ صدہا چھوٹے چھوٹے زمیندار ہیں جو سال بھر اپنا خون پسینہ ایک کرکے اپنے خاندان کے لئے عزت اور قوت فراہم کرتے ہیں اور یہی طبقہ علم و ادب کی بقا میں بھی مدد کرتا ہے۔

کانگریس ملک کے نام پر جدّ و جہد کر رہی ہے اس لئے ہر ہندوستانی کا دل اسکی طرف نظرتاً کھنچتا ہے مگر ساری جدوجہد اسی وقت تک مفید ہے جب تک وہ تعمیری ہو۔ تخریبی کوششوں کا تو کوئی نتیجہ نہیں۔ بے پروبال ہوکر آزاد بھی ہوئے تو کیا۔ بقول حضرت آرزو ؎

پھڑپھڑانے سے قفس ٹوٹتا جاتا ہے تو کیا
گھٹتی جاتی ہے جو قوت پر پرواز میں ہے

(اعظم)

علامہ بہائی

(جناب مولانا سید اختر علی صاحب تلہری)

پیدائش و وفات آسمان علم و فضل کے اس مہر درخشاں کا طلوع شہر بعلبک میں یوم پنجشنبہ ۲۷ ربیع محرم ۹۵۳ھ کو ہوا تھا۔ زندگی کی اٹھتر بہاریں دیکھکر ۱۰۳۱ھ میں عالم آخرت کی طرف رحلت فرمائی لیکن آپ کے لائق شاگرد جناب محمد تقی مجلسی کا بیان ہے کہ آپ نے اکاسی یا بیاسی برس کی عمر میں انتقال فرمایا ہے۔

شہر اصفہان میں آپ کا انتقال ہوا تھا لیکن وہاں سے آپکی نعش مشہد رضوی میں منتقل کردی گئی اور آپ وہیں روضہ مقدسہ کے پہلو میں دفن ہیں۔ جناب رضا کے زائرین آپ کی زیارت سے بھی مشرف ہوتے ہیں۔

علامہ بہائی کے معلمین و معاصرین آپ نے تعلیم اپنے پدر بزرگوار جناب شیخ حسن سے جو خود بھی ایک جلیل القدر فاضل تھے پائی ہے اور علامۂ عبد اللہ یزدی محقق دوانی کے نامور شاگرد کے حلقۂ درس میں بھی بیٹھے ہیں۔

بحر العلوم میر باقر داماد مصنف افق المبین اور جناب مقدس اردبیلی آپکے معاصرین میں تھے۔ شاہ عباس صفوی کی بارگاہ میں آپکو خصوصیت خاصہ حاصل تھی۔

آپ کی جامعیت علوم متداولہ کا کوئی ایسا شعبہ نہ تھا جس میں آپ کو دسترس کامل حاصل نہ ہو۔ منطق، فلسفہ، ریاضیات، تفسیر، فقہ، اصول فقہ، حدیث اور کلام میں آپ کو

امتیازی مہارت حاصل تھی۔ ان تمام فنون میں آپ کے فضل و کمال کی قلمی نشانیاں موجود ہیں۔

آپ کی تصنیفات اصول فقہ میں آپ کا مشہور متن زبدہ ہے جو اپنے متانت و ثقاہت کی وجہ سے شیعوں کے عربی۔ ادرس کے نصاب میں اب تک داخل ہے شیعی عقیدہ میں مشرق الشمسین اور جامع عباسی وغیرہ کتابیں موجود ہیں۔ تہذیب نحو میں آپ کی تصنیف ہے۔ علم وراثت میں آپنے رسالہ ذخیرہ تحریر فرمایا ہے۔ تشریح الافلاک ہیئت میں آپ کی یادگار موجود ہے۔ خلاصۃ الحساب علم حساب میں آپ کی مشہور کتاب ہے۔ فوائد صمدیہ علم عربیہ میں آپنے تحریر فرمائی ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے رسائل و حواشی تفسیر و ہیئت وغیرہ کے متعلق عروۃ الوثقی عین الحیات۔ حبل المتین۔ مفتاح الفلاح۔ رسالہ ہلالیہ۔ رسالہ اصطرلابیہ حواشی تفسیر کشاف حواشی بیضاوی وغیرہ بھی موجود ہیں۔

کشکول و مخلات آپکی مشہور تالیفیں ہیں جن میں آپ نے مختلف معلومات کے خزانے بھر دیے ہیں۔

اس طولانی فہرست پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ آپ کس قدر بلند پایہ جامع فاضل تھے ان تمام تصنیفات میں آپ کا مذاق مجتہدانہ ہے۔ دقت نظر اور باریکی فکر آپ کے بحث کی خاص خصوصیتیں ہیں۔ آج کل کے مدعیان علم کی طرح سطحی باتیں آپ کے کمال کی سرمایہ نہیں ہیں۔ آپ نے جس فن کی طرف بھی توجہ فرمائی ہے اسمیں مستقل یادگاریں چھوڑی ہیں۔

علامہ بہائی کا شاعر و ادیب ہونا خیال ہوگا کہ ایسا شخص جسکے غور و فکر کی قوتیں حکمت و فلسفہ کے دقیق مسائل کی گرہ کشائی میں مصروف رہتی ہوں جو فقہ و اصول فقہ و تفسیر و حدیث کے مباحث میں نظر و بحث کا عادی ہو اُسے ادب و شاعری کی زلفیں آراستہ کرنے سے کیا تعلق ہوسکتا ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ علامہ بہائی اگر ایک طرف زبردست حکیم و فقیہ تھے تو دوسری طرف ایک باکمال شاعر و ادیب بھی۔

میں ذیل کی سطور میں اُنکی شاعری ہی سے بحث کرنا چاہتا ہوں۔

علامہ بہائی کو عربی اور فارسی دونوں زبانوں کی شاعری پر یکساں دسترس حاصل تھی۔ اُن کا عربی کا کلام جس قدر نغز و دلپسند ہوتا تھا اُسی قدر فارسی کا کلام بھی۔ اُن کے اشعار میں

شوخی بھی ہے جوش بھی۔ زبان میں شیرینی بھی ہے متانت بھی۔

عربی میں اُنھوں نے قصائد، جیسے بھی لکھے ہیں اور مراثی بھی۔ مختلف مثنویاں بھی نظم کی ہیں اور کچھ قطعات بھی۔

البتہ فارسی میں اُنکی دو مثنویاں ملتی ہیں مثنوی نان وحلوے اور مثنوی شیر و شکر۔

میں اولاً اُنکے عربی کلام سے بحث کرونگا اور پھر فارسی کلام سے۔

علامہ بہائی کی عربی شاعری

اُن کے عربی کلام میں سلاست و روانی عام طور سے پائی جاتی ہے۔ اُنکی طرز ادا اُلجھاؤ اور پیچیدگی سے بالکل پاک ہے۔ اُنھوں نے قطعات میں حسن کی کرشمہ زائیوں اور عشق کی جانگدازیوں کی نہایت لطیف عنوان سے مرقع کشی کی ہے۔

قصیدہ صاجیہ

علامہ کے قصائد میں قصیدہ صاجیہ کو بہت زیادہ شہرت حاصل ہے اس میں آپ نے جناب مہدی آخرالزمان کی مدح فرمائی ہے اور بے نظیر طریقے سے مدح فرمائی ہے۔ قصیدہ اچھا خاصا طولانی ہے۔

قصیدے کی تشبیب میں آپنے معمولی عشق و عاشقی کے دُکھڑے نہیں روئے ہیں بلکہ زیادہ تر اپنی افتادِ طبع کا تذکرہ فرمایا ہے اور زمانہ کی بے التفاتیوں اور کج نگاہیوں کا قصہ کہا ہے۔ ان اشعار سے اس کا اندازہ ہوگا کہ علامہ بہائی کو زبان عربی پر کس قدر دسترس حاصل تھی اور اُن کا شاعرانہ مذاق کس قدر صاف اور ستھرا تھا۔ وہ کس قدر سلاست و روانی کے ساتھ مسلسل خیالات شاعرانہ پیرایہ میں نظم فرما سکتے تھے۔

ملاحظہ ہو:-

قصیدہ صاجیہ کی تشبیب

سری البرق من نجد فجدد تذکاری — عہوداً بحزوی والعذیب وذی قار

وہیج من اشواقنا کل کامن — واجج فی احشائنا لاعج النار

الا یا لبیلاب الغویر وحاجر — سقیت بہام من بنی المزن مدرار

ویا جیرۃ بالمازمین خیامہم — علیکم سلام اللہ من نازح الدار

خلیلی مالی والزمان کانما — یطالبنی فی کل وقت باوتار

فابعد اجبابی واخلی مرابعی — وادینی من کل صفو باکدار
وعادل بی من کان اقصیٰ مرامہ — من المجد ان یسموا الیٰ عشر معشار
الم یدرانی لا اذل لخطبہ — وان سامنی نجساً وارخص اسعاری
مقامی بفرق الفرقدین فما الذی — یؤثرہ مسعاہ فی خفض مقداری
وانی امرءٌ لا یدرک الدہر غائتی — ولا تصل الایدی الیٰ سر اغوار
اخالط ابناء الزمان بمقتضی — عقولہم کے لا یفوہوا بانکار
واظہر انی مثلہم تستفزنی — صروف اللیالی باحتلاً وامرار
وانی ضاوی القلب مستوفز النہیٰ — اسر بمیسرا وامل باعسار
ویضجرنی الخطب المہول لقاءہ — ویطربنی الشادی بعود و مزمار
ویصبی فوادی ناہد الثدی کاعبٌ — باسمر خطار واحور سحار
وما علموا انی امرءٌ لا یروعنی — توالی الرزاء فی عشی وابکار
اذا دک طود الصبر من وقع حادثٍ — فطود اصطباری شامخٌ غیر منہار

ترجمہ = نجد کے سمت سے بجلی چمکی اور مجھے وہ صحبتیں نئے سرے سے یاد آگئیں جو مقامات خرذی غذیب وذی قارین احباب سے کبھی گرم رہی تھیں - اس چمکنے والی بجلی نے ہماری اُن خواہشوں کو جنھیں ہم دنیا والوں سے چھپائے ہوئے تھے پھر سے اُبھار دیا اور ہمارے دلوں میں جلا دینے والی آگ کے شعلے اچھی طرح بھڑکا دیے۔ اے وہ مختصر راتو، جو مقام غویر و حاجر میں احباب کے ساتھ پر لطف طریقے سے کٹی ہیں - خدا کرے تم برسنے والے بادلوں سے سیراب کی جاؤ۔ اور اے وہ میرے دوستو جو کبھی مقام مازین میں میرے ہر وقت کے ساتھی تھے اور جن کے ہجر و فراق کے صدمے مجھے اب اُٹھانا پڑ رہے ہیں تم تک ایک دورافتادہ بچھڑے ہوئے کا سلام پہونچے -
اے میرے دوستو مجھے بتلاؤ کہ آخر زمانہ کو مجھ سے کیوں دشمنی ہے کہ ہر وقت وہ مصیبتیں لیے ہوئے مجھے تلاش کرتا پھرتا ہے جیسے کہ میں نے اُس کا کوئی جرم کیا ہو اور وہ اُس کا عوض مجھ سے لینا چاہے۔ (اس بے رحم زمانے) میرے دوست مجھ سے جُدا کر دیے - میرے مکانات ویران کر دیے اور نعمتوں کے بدلے کلفتیں میرے حق میں رکھدیں -(اس ناہنجار زمانے) میری

توہین میں کوئی کمی نہیں کی اُن اشخاص کو جن کا انتہائی مقصد یہ ہو سکتا تھا کہ وہ میری بزرگیوں اور فضیلتوں کے دسویں حصہ کے دسویں حصہ تک ($\frac{1}{100}$) پہونچ سکیں میرے برابر کر دیا گیا۔ زمانہ یہ نہیں معلوم ہے کہ وہ مصیبتوں اور حوادث میں مجھے گرفتار کر کے کتنا ہی میری توہین و تذلیل کا ارادہ کرے اور میرے فضل و کمال کے نرخ کو ارزاں بنانا چاہے لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میری علو مرتبت کی یہ حالت ہے کہ فرقدین (دو مشہور ستارے ہیں) کے سر پر میرے قدم ہیں ایسی حالت میں میری منزلت کو کوئی شئے کیونکر صدمہ پہونچا سکتی ہے۔ میں ایک فرد فرید ہوں۔ ابنائے زماں میرے فضائل و کمالات کی انتہا تک نہیں پہونچ سکتے۔ اُنکی فکریں میرے مخفی معارف کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ میں دنیا والوں سے اُن کے عقول کے مطابق خلا ملا رکھتا ہوں۔ جتنی اُنکی فہم ہے اُسی کے اندازہ سے بات چیت کرتا ہوں۔ وہ نکتے جن کے ادراک کے لیے اُن کے عقول تربیت یافتہ نہیں ہیں اُن سے بیان نہیں کرتا۔ اس لیے کہ اُنھیں ان کے ماننے میں تامل ہوگا۔ میں اہل زمانہ پر یہ امر ظاہر کرتا ہوں کہ انھیں کی طرح سے دنیا کے حوادث مجھے مغموم و محزوں بناتے ہیں اور مقصد و کامرانی سے ہم آغوش ہونا مسرور و شادماں۔ اور یہ کہ میرا قلب بالکل کمزور ہے۔ مصائب کے نزول کے وقت میری عقل صحیح نہیں رہتی۔ کسی ہیبت ناک حادثہ کے وقوع پر میں گھبرا اُٹھتا ہوں اور جہاں کسی خوش آواز گویے نے آلات موسیقی سے شغلہ شروع کیا تو میں خاص طرح کا وجد محسوس کرنے لگتا ہوں۔ جوانی کی بہار پر آئی ہوئی دوشیزہ عورتیں اپنے قامت سے جو نیزے کی طرح لچکدار اور اپنی سُرمگیں آنکھوں سے جن میں بے شمار جادو بھرے ہوئے ہیں مجھے مقتول بناتی ہیں۔ مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ میں ایسا شخص ہوں جس کو یہ نازل ہونے والی مصیبتیں خوف زدہ نہیں بنا سکتیں۔ میرے علاوہ دوسرے لوگوں کا پائے صبر مصیبتوں کے نزول سے متزلزل ہو جائے تو ہو جائے۔ میرے قدم استقامت میں جنبش نہیں ہو سکتی"۔

قصائد میں گریز کا مقام بھی خصوصیت سے نظر کے قابل ہوتا ہے۔

گریز میں جس قدر لطافت ہوتی ہے اُسی قدر قصیدہ کی عظمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ بہائی علیہ الرحمہ نے اس نکتہ کو بھی ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ اس قصیدہ میں بھی اُنھوں نے مدح کی طرف جس عنوان سے گریز کی ہے وہ نہایت لطیف ہے۔ فرماتے ہیں۔

اجزع للبلوےٰ واغضی علی القذےٰ | وارضی بمایرضی بہ کل مخوا
وافرح من دہری بلذۃ ساعۃٌ | واقنع من عیشی بقرص واطمار
اذًا لادریٰ زندی وہ عز جانی | وہ بزغت فی قمۃ المجد اقماری
ولابل کفی بالسماح ولا شرت | بطیب احادیثی الرکابُ اخباری
ولا انتشرت فی الخافقین فضائلی | ولاکان فی المہدی زائق اشعاری

ترجمہ۔ مصائب اور آزمائشیں کسی موقع پر مجھے ذلیل نہیں کرسکتیں اور نہ میں اپنے نفس کو اُن امور کے ارتکاب کی اجازت دیتا ہوں جو میری عزت وآبرو کو برباد کرنے والی چیزیں ہوں میں اُن چیزوں سے کبھی راضی نہیں ہوتا ہوں جن پر کمزور عقل والے راضی ہوجاتے ہیں۔ مجھے کبھی دنیا کی فانی لذتوں سے (جو موسم سرما کی دھوپ کی طرح گزرجانے والی ہیں) مسرت نہیں ہوتی میں اگر غیر پسندیدہ امور کے ارتکاب میں مسامحہ کرنے والا ہوتا یا ضعفا العقول کی غیر عاقبت بینی مجھ میں ہوتی اور دنیا کے عمدہ مطاعم مشارب و ملابس کا والہ وشیدا ہوتا تو نہ میں کبھی اپنے مقصود تک پہونچ سکتا اور نہ کبھی مجھے عزت ملتی۔ اور نہ میرے فضائل وکمالات کی روشنیاں بزرگی کی بلندی پر چمکتیں اور نہ میں جود وکرم کی صفتوں سے کبھی متصف ہوسکتا۔ اور نہ سواریاں میرے محاسن اخلاق دیار بدیار لے جاتیں اور نہ میرے صفات حمیدہ کا مشرق ومغرب میں شہرہ ہوتا اور نہ اُن امام مہدیؑ کے متعلق جو آئندہ زمانہ میں اپنے ظہور کے نور سے دنیا کی ضلالتوں اور گمراہیوں کی تاریکیوں کو دور کرینگے۔ اتنے اچھے دلپسند اشعار کہہ سکتا۔"

ایک عصمت پناہ وہادی برحق ہستی کی مدح میں عمدہ اشعار کہنے کے لیے یہ شرائط لگانا ظاہر ہے نہایت لطیف اور پرکیف عنوان ہے۔

مدح کی شان ملاحظہ ہو:۔

خلیفہ ربُّ العالمین و ظلہ | علیٰ ساکنی الغبراء من کل دیار
ہوالعروۃ الوثقی الذی من بذیلہ | تمسک لایخشیٰ عظائم اوزار

ترجمہ۔ مہدی ہی وہ سلطان اعظم واعدل ہیں جو تمام بندوں پر ایزدی احکام نافذ کرنے میں خلیفۃ اللہ اور ظل اللہ فی الارض ہیں۔ ممدوح ایسے مستحکم جائے پناہ ہیں کہ جو شخص اُن کے دامن

عزت سے وابستہ ہوجاتا ہے اور اُنکی پیروی کرتا ہے۔ اُسے بڑے بڑے گناہوں کا کوئی خطرہ نہیں رہتا (کیونکہ وہ امام برحق ہیں اُن کی پیروی کی بدولت وہ گناہوں سے بالکل محفوظ ہوجائیگا)

جناب صاحب الامر کی مدح فرماتے ہوئے جناب بہائی نے چند شعر ایسے لکھے ہیں جن کی رفعت خیال کی نظیر نہیں مل سکتی۔ شاعرانہ بلند پروازی واقعیت سے اس درجہ متحد ہوگئی ہے کہ صحیح المذاق سامعین پر ایک عجیب وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ اسکا ذوق بے اختیاری طور سے ان اشعار کی معجزانہ خصوصیتوں کے سامنے سربسجود ہوجاتا ہے۔ اگرچہ ترجمہ اُن لطافتوں کو ادا نہیں کرسکتا جو عربی اشعار کی جان ہیں لیکن تاہم اسکا اندازہ تو ہو ہی سکتا ہے کہ جناب بہائی کی فکر کس قدر عالی ہے۔ الفاظ ترکیبیں اور اسلوب ادا، فصاحت وبلاغت کی جن ساحرانہ خصوصیتوں کے مالک ہیں۔ میرے قلم میں طاقت نہیں ہے کہ اُنھیں اُردو نثر میں منتقل کرسکوں لیکن بہرطور کسی نہ کسی حدتک اُس جوش کا پتہ تو چل ہی سکیگا جو اس تخیل میں موجود ہے۔

علوم الوریٰ فی جنب ابحر علمہ　　کغرفۃ کف او کغمسۃ منقار

فلو زار افلاطون اعتاب قدسہ　　ولم یعشہ عنہا سواطع انوار

رأے حکمۃ قدسیۃ لایشوبہا　　شوائب انظار وادناس افکار

تمام دنیا کے علوم اگر اُن کے علم کے زخار دریاؤں کے مقابلے میں رکھے جائیں تو اُنکی حقیقت چُلّو بھر پانی یا طائر کی منقار بھر پانی سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اگر افلاطون جو حکمائے اشراقیئین کا میر کارواں سمجھا جاتا ہے آپ کے آستانۂ قدس کی زیارت کرے اور وہاں کی چکاچوند پیدا کرنے والی روشنیاں اُسکی بصارت زائل نہ کردیں تو وہ "حکمت قدسیہ کے اُن انوار کو دیکھیگا جن میں نظر وفکر کے گرد وغبار کا ذرّہ بھر نشان نہیں ہے"۔

ممکن ہے کہ بے بصیرتوں کو ان اشعار میں مبالغہ نظر آئے لیکن اگر ممدوح کی پُرعصمت روحانی جلالتوں پر نظر ڈالی جاتی ہے تو اس وہم کا شائبہ بھی نہیں پیدا ہوسکتا۔ شاعر کے مذہبی اعتقاد کی رو سے جناب صاحب الامر معصوم ہیں) اور اُن کے تمام علوم الہامی اور وہبی۔ خطائے بالکل پاک۔ ایسی صورت میں افلاطون کو وہ حکمائے اشراقیین کا سالار قافلہ سہی۔ اس۔

بارگاہ قدس کے علوم سے کیا نسبت ہو سکتی ہے اور جناب صاحب الامر کے اسرار و حکم کی پاکیزگیوں کو افلاطون کا دماغ کیا سمجھ سکتا ہے۔ وہ پھر ایک خاطی انسان تھا اور اُس کے نظر و فکر کی قوتیں گرد و غبار میں آلودہ۔

غرضکہ یہ قصیدہ اسی قسم کے بلند مرتبہ اشعار سے بھرا ہوا ہے۔ افسوس کہ طول کا خوف اس سے زیادہ نقل اشعار کی اجازت نہیں دیتا۔

علامہ بہائی کی عربی کی مثنوی

علامہ بہائی نے بلدۂ ہرات کی مدح میں ایک مثنوی بھی لکھی ہے جس میں ہرات کی مختلف چیزوں کی تعریف کی ہے۔

اس مثنوی کی شان نزول یہ ہے کہ آپ ایک مرتبہ شہر قزوین میں قیام فرما تھے۔ وہاں آشوب چشم کی شکایت آپکو ہو گئی۔ علمی مطالعہ آپ کر نہیں سکتے تھے۔ فضول باتوں میں آپ سے وقت گزارا نہیں جا سکتا تھا۔ اس لیے آپ نے اسی حالت میں یہ مثنوی لکھی ہے۔ چنانچہ آپنے خود تمہید میں اسکا تذکرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

بلیت فی قزوین وقتا برمد — مقرح للقلب من فرط الکمد
یمنع من صرف النهار فیما — یرضی اللبیب الحاذق الفهیما
من بحث او تلاوة او فکر — او درس او عبادة او ذکر
حتی سئمت من لزوم منزلی — والنفس عن اشغالها بمعزل
ولم تکن من عادتی البطالة — لانها من شیم الجهالة
فلم اجد ابهی من الاشعار — ولیس نظم الشعر من شعاری

اس مثنوی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب بہائی کو مختلف چیزوں کے بیان کرنے کا نہایت اچھا شاعرانہ سلیقہ تھا۔ اور پھر اُن کی طبیعت میں آمد تھی۔ بہت جلد اشعار نظم فرماتے تھے۔ اس مثنوی میں اُنھوں نے ہرات کی مختلف چیزوں کی تصویر کشی کی ہے۔

ہرات کی تعریف فرمانے کے بعد اُسکی آب و ہوا اُسکے پھول اور اُسکی عورتوں کی توصیف نہایت لطف سے کی ہے۔ جستہ جستہ چند اشعار درج کیے جاتے ہیں۔

ہوا کی تعریف

هواؤها من الوباء جنة — کانه من نفحات الجنة

فیبسط الروح وینفی الکرب　　ویشرح الصدور ویشفی القلب

فمن رماہ الدہر بالافلاس　　حتیٰ عن المسکن واللباس

فلا یصاحب بلدۃ سواہا　　لانہ یکفیہ فی ہواہا

ترجمہ - ہرات کی ہوا وبائی امراض کے لیے سپر ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُسکے جھونکے بہشتی ہیں - ہرات کی ہوا روح کو فرحت بخشتی ہے کرب کو دور کرتی ہے سینوں میں انشراح پیدا کرتی ہے اور قلب کو شفا دیتی ہے - جس شخص کو زمانہ افلاس کی مصیبتوں میں مبتلا کر دے یہاں تک کہ اُسکے پاس نہ تو کوئی لباس باقی ہے اور نہ رہنے کی جگہ تو پھر اُس سے ہرات کے سوا اور کہیں نہ رہنا چاہیے - اس لیے کہ وہاں کی ہوا اُن تمام باتوں کی تلافی کر دی گئی -

آب ہرات کی تعریف

لو قیل ان الماء فی الہرات　　یعدل ماء النیل والفرات

لم یک ذاک القول بالبعید　　فکم علیٰ ذلک من شہید

تراہ فی الانہار جار صافیا　　کانہ لیالی الا صدا ف

تظن غور عمقہ شبرین　　من الصفا وہو علی رمحین

ترجمہ - اگر ہرات کے پانی کے متعلق یہ کہا جائے کہ وہ نیل اور فرات کے پانی کے مانند ہے تو اُس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے - اسکی شہادت دینے والے بہت سے ہیں - اس کا پانی نہروں میں بہتا ہوا اتنا صاف معلوم ہوتا ہے جیسے کہ سیپی کے موتی ہوں - اسکا پانی گہرائی میں اگرچہ دو نیزوں کے فاصلہ پر ہو لیکن اُسکی صفائی کی وجہ سے یہی معلوم ہوگا کہ وہ دو بالشت کے فاصلہ پر ہے -

ہرات کی عورتوں کی تعریف

نسائہا مثل الضباء النافرۃ　　ذوات الحاظ مراض ساحرۃ

من کل خود عذبۃ الالفاظ　　فتقتل من تشاء بالالحاظ

ترنو بطرف ناعس فتاک　　یفسد دین الزاہد النساک

والجسم فی رقتہ کالماء　　والقلب مثل الصخرۃ الصماء

وقدہا دنہدہا والخذ — عصن ورمان طری ورد
والشعر واصناب الاجفان — صوارم یدامۃ ثعبان

ترجمہ - ہرات کی عورتیں آہوان وحشی ہیں - اُنکی چشمہاے بیمار سحر وساحری میں مشاق ہیں وہ نازک اندام ہیں، شیریں بیان ہیں - نگاہوں سے جسکو چاہتی ہیں قتل کردیتی ہیں - اُن خوابِ آلود اور قاتل آنکھوں سے دیکھتی ہیں جو زاہد متقی کے دین ومذہب پر ڈاکہ ڈالتی ہیں - اُن کا جسم لطافت میں صاف پانی کی طرح ہے اور اُنکے قلب سخت پتھر کی طرح - اُنکے قد اُبھرے ہوے سینے اور رخسارے لچک دار شاخیں تر وتازہ انار اور خوش رنگ گلاب ہیں اُنکے بال اُنکا آب دہن اور اُنکی پلکیں شمشیر ہاے برندہ - شراب وسانپ ہیں -

غرضیکہ اسی عنوان سے پوری مثنوی تمام ہوئی - الفاظ میں لطافت ہے تشبیہوں میں ندرت ہے اور بیان میں سلاست ہے -

جناب بہائی علیہ الرحمہ نے بہت سے قطعات بھی لکھے ہیں جن میں سے بعض میں اُنھوں نے حسن وجمال کی شوخیاں دکھلائی ہیں اور بعض میں دنیاے ناپائدار کے زوال کا راگ سنایا ہے -

موت راحت ہے

ان ہذا الموت یکرہہ — کل من یمشی علی الغبرا
وبعین العقل لو نظروا — لرادہ الراحۃ الکبری

تمام زمین پر چلنے والے موت سے کراہت کرتے ہیں - لیکن اگر عقل کی نگاہوں سے دیکھیں تو یہ موت اُنھیں عظیم الشان راحت معلوم ہو"

فی الحقیقت موت پر اگر عقلی نگاہیں ڈالی جاتی ہیں تو وہ راحت ہی معلوم ہوتی ہے کیونکہ اسکے ذریعہ سے انسان تمام دنیاوی مخمصوں سے نجات پا جاتا ہے اور پھر اُسے اصل سے اتصال نصیب ہوتا ہے - اس سے بڑھ کر اور راحت کیا ہو سکتی ہے -

معشوق کی شوخی

القی یدیہ علی صدری فقلت لہٗ — بروح حرفواد انت موجعہ
فقال لاتعجلن عینای قدرمتا — سہما فاجلبیت ادری این موضعہ

معشوق نے میرے سینہ پر ہاتھ رکھے میں نے اُس سے کہا کہ تو نے اُس دل کی حرارت کو ٹھنڈا کر دیا جسے تو درد میں مبتلا کیا کرتا ہے۔ اُس نے (شوخی سے) جواب دیا تعجیل نہ کر۔ میری آنکھوں نے تیرے تیر مارا تھا۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ معلوم کروں کہ اُن تیروں کا مقام کہاں ہے۔

ہجر

یا بدر دجی بوصلہ احیانی		اذ زار وکم بہجرہ قد افنانی

باللہ علیک عجلی سفک دمی		لا طاقۃ لی بلیلۃ الہجرانی

اے تاریکیوں کے ماہ چہاردہم میرے پاس آکر تو نے اپنے وصل سے مجھے زندہ کر لیا۔ اس سے پہلے اپنے ہجر سے تو مجھے بارہا ہلاک بھی کر چکا ہے میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں تو میرے خون بہانے میں جلدی کر، مجھ میں اب شب ہجر کے صدمے برداشت کرنے کی طاقت نہیں ہے"۔

ان اشعار سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ بہائی تغزل میں بھی کیسے کیسے لطیف اور شوخ مضامین پیدا کر سکتے تھے۔ اُن کا عربی کلام اچھی خاصی مقدار میں ہے۔ لیکن جو کچھ یہاں نقل کیا گیا ہے اُس سے ان کی عربی شاعری کی بلند پایگی کا اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔

فارسی کا کلام

اس ذیل میں ہمیں اُنکی مثنوی "نان وحلوے" پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ جناب بہائی کی یہ مثنوی بیحد مقبول ہے۔ جناب مفتی میر عباس صاحب اعلی اللہ مقامہ نے اسی کی تقلید میں مثنوی "من وسلوے" لکھی ہے لیکن "نان وحلوے" کی لطافت و شیرینی اُس میں کہاں؟

جناب بہائی کا مذہب جناب بہائی کی فارسی شاعری پر اظہار خیال کے سلسلہ میں اس لطیفہ کا ذکر کیے بغیر نہیں رہا جاتا کہ ایسے جلیل القدر شیعی فاضل کے متعلق بھی بعض خوش فہم حضرات نے یہ تحریر فرما دیا ہے کہ وہ مذہباً سُنی تھے۔ جناب بہائی کے قصیدہ صاحبیہ کی ایک سنی فاضل نے شرح کی ہے۔ جو "کشکول" کے آخر میں موجود ہے۔ اُنھوں نے بر سبیل تذکرہ یہ لکھا ہے کہ جناب بہائی سیاحت کرتے ہوئے ترکستان میں تشریف لے گئے تھے۔ وہاں ایک سُنی عالم سے اُنھوں نے اپنی سنیت کا اظہار فرمایا تھا۔

"افاد الشیخ الاجل العارف العلامۃ البہائی قدس سرہ فی الکشکول بعد ما نقل ترجمہ ابی یزید البسطامی ان ملاقات ابی یزید البسطامی لابی عبداللہ جعفر بن محمد الصادق وکونہ سقاءً فی دارہ اوردہا جماعۃ من اصحاب التاریخ واوردہا العلامۃ الرازی فی کثیر من کتبہ الکلامیۃ انتہی بقدر الحاجۃ۔ اقول ہذا ہو الحق عندنا واما ماطعن بہ علی العارف السامی البسطامی والواصل الاجل الکرخی حزب القشریۃ من علماء الامامیۃ کالملا طاہر القمی والشیخ الحر العاملی وفاضلنا النصیرآبادی فی شہاب ثاقب فعندی کلیۃ مسطرد ودانما منظم اعتماد المتکلم الفاضل النصیرآبادی فی کتابہ ہذا علی رسالۃ الملا طاہر وقد نقضناہا علی اتم الوجوہ فی مقدمات کتابنا الجعفریۃ بحیث القمنا الحجر فی فیہ واہدمنا قصور اوہامہ علیہ الخ"

کشکول میں جناب علامہ بہائی نے ابو یزید بسطامی کے حالات لکھنے کے بعد بیان کیا ہے کہ ابو یزید بسطامی کی ابوعبداللہ جعفر بن محمد صادق سے ملاقات اور اُنکے گھر میں سقائی کے فرائض ادا کرنے کا واقعہ بہت سے مورخین نے لکھا ہے اور علامہ رازی نے اپنی بہت سی کتب کلامیہ میں اسے وارد کیا ہے اسکے بعد سید مرتضی صاحب فرماتے ہیں "ہمارے نزدیک یہی حق ہے۔ عارف بسطامی اور واصل کرخی پر چند سطحی علمائے شیعہ مثل ملا طاہر قمی حر عاملی اور فاضل نصیرآبادی کا زبان طعن دراز کرنا ہمارے نزدیک مسطرود ہے۔ ہم نے اپنی کتاب مقدمۂ حقائق جعفریہ میں اسکی پوری رد کردی ہے"

صفحہ ۱۸۴ پر استغراق سے فلسفیانہ بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں:-

"ولکن القشریۃ من محدثی الامامیۃ واہل السنۃ والجماعۃ وفقہاہم لعدم التفطن بحقائق الاسرار وجحودہم الوصول والاتصال بعوالم الانوار یکفرون وعلی اولیاء الرحمن یجسرون فذرہم فی خوضہم یلعبون الخ"

"شیعوں اور سنیوں کے قشری محدثین اور فقہا چونکہ حقائق اسرار سے واقفیت نہیں رکھتے اور عوالم انوار سے متصل ہونا نہیں چاہتے اسی لیے نہایت جسارت کے ساتھ اولیائے رحمن کی تکفیر کرتے ہیں الخ"

یہ بالکل صحیح ہے کہ شیعہ پیری مریدی اور بیعت کے سلسلہ پر اعتقاد نہیں رکھتے اور اسی طرح وہ ہر مجنون کو مجذوب سمجھ کر اُسے اپنی نیازمندیوں کا مرکز بھی نہیں بنا لیتے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اُن کا دامن حقیقی تصوف کے خیالات سے خالی ہو۔

صحیفہ کاملہ۔ دعائے صباح۔ دعائے کمیل۔ دعائے عرفہ۔ دعائے ابی حمزہ وغیرہ سے زیادہ

اسرار تصوف اور کہاں نہیں گے۔ ان دعاؤں میں کون سے جواہر عبودیت ہیں جو نہیں ہیں۔ ذکر، شکر، صبر، خوف، رجا، فقر، توکل، انس، محبت، شوق، عشق، محو، فنا، بقا اور اُن کے علاوہ تمام چیزیں ان میں موجود ہیں۔

ایسی صورت میں یہ کہنا کہ شیعہ تصوف سے تہی دامن ہیں بالکل غلط ہے۔ البتہ قشیری علما کے کلمات و خیالات میں ان پاکیزہ حقیقتوں کی تلاش فضول ہے۔ اس میں شیعہ اور سنی علما کی خصوصیت نہیں ہے۔ مجادلہ اور مکابرہ کا مذاق اُن میں حقیقت رسی کے جوہر مفقود کر دیتا ہے۔

یہ موضوع اپنے مقام پر خود مستقل ہے۔ اس مقام پر اس سے زیادہ گنجائش نہیں ہے انشاء اللہ پھر کبھی تصوف اور شیعہ کے عنوان سے کوئی مستقل مضمون لکھا جائیگا۔ یہاں صرف اس خیال کا ابطال مقصود تھا کہ چونکہ علامہ بہائی نے ایسے پاکیزہ صوفیانہ خیالات "مثنوی نان و حلوے" میں لکھے ہیں۔ اس لیے وہ شیعہ نہیں ہو سکتے۔

بہرحال یہ ایک ضمنی بحث تھی۔ اصل ذکر مثنوی "نان و حلوے" اور علامہ بہائی کی فارسی شاعری کا تھا۔

جناب بہائی مثنوی نان و حلوے میں حقیقی صوفی نظر آتے ہیں۔ اس میں اُنھوں نے دنیوی مخمصوں اور دولت و جاہ کی خواہشوں سے علیحدگی کی تعلیم دی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ اصلی علم کیا ہے اور اخلاص فی العبادت سے کیا مراد ہے۔ پوری مثنوی میں اسی قسم کے اخلاقی موعظے بھرے ہوئے ہیں۔

علامہ بہائی پر عربیت غالب تھی اسی لیے فارسی میں لکھتے لکھتے اُن کے قلم سے عربی اشعار اور مصرعے بے اختیار ٹپک پڑتے ہیں۔ میں درمیان سے عربی اشعار حذف کرتا جاؤں گا۔ مثنوی کا آغاز یوں ہے —

مرحبا اے بلبل بستان حے — کامدی از جانب بستان مے
مرحبا اے عندلیب خوش نوا — فارغم کردی ز قید ما سوا
اے نواہائے تو نار موصدہ — زدہ بر بندم ہزار آتش کدہ
مرحبا اے ہدہد شہر سبا — مرحبا اے پیک جانان مرحبا

مرحبا اے طوطیِ شکر شکن — قل فقد اذہبت عن قلبی الحزن
باز گو از نجد و ز یاران نجد — تا در و دیوار را آری بوجد
باز گو از زمزم و خیف و منا — وارہاں دل از غم و جاں از عنا
باز گو از مسکن و ماوائے ما — باز گو از یار بے پروائے ما
آنکہ از ما اے سبب افشاند دست — عہد را ببرید و پیماں را شکست
از زبانِ آں نگارِ تند خو — از پئے تسکینِ دل حرفے بگو
یاد آیا اے کہ با ما داشتی — گاہ خشم از ناز و گاہے آشتی
اے خوش آں دوراں کہ گاہے از کرم — در رہِ مہر و وفا میزد قدم
شب کہ بودم با ہزاراں کوہ درد — سر بزانوے ادب بنشستہ فرد
جاں بلب از حسرتِ گفتار او — دل پُر از نومیدیِ دیدار او
آں قیامت قامتِ پیماں شکن — آفتِ دوراں بلائے مرد و زن
فتنۂ ایام و آشوبِ جہاں — خانہ سوزِ صد چو من بے خانماں
از درم ناگہ در آمد بے حجاب — لب گزاں از رخ برافگندہ نقاب
کاکلِ مشکیں بدوش انداختہ — وز نگاہے کارِ عالم ساختہ
گفت اے شیدا دلِ محزونِ من — وے بلاکش عاشقِ مفتونِ من
کیف حال القلب فی نار الفراق — گفتمش واللہ حالی لا یطاق
یک دمے بنشست بر بالینِ من — رفت و با خود برد عقل و دینِ من

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جناب بہائی کو فارسی شاعری پر بھی کس قدر قدرت حاصل تھی۔ خیالات کی پاکیزگی و شستگی کے ساتھ زبان بھی کس قدر لطیف اور شیریں ہے عشقِ مجازی کے واردات جن لفظوں میں ادا کیے جاتے ہیں اُن کی آڑ میں حقیقت کے کیسے کیسے لطیف رموز و اسرار بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ ان اشعار کی بلندی و حقیقت سرائی کا وہی قلب مزے اُٹھا سکتے ہیں جنھوں نے حقیقی تصوف کے بادۂ آتشیں کے کچھ جرعے پی لیے ہیں۔

کاکلِ مشکیں بدوش انداختہ — وز نگاہے کارِ عالم ساختہ

میں محبوب کی جو قیامت خیز تصویر کھینچی ہے وہ بے پناہ ہے۔

علم رسمی کا قیل و قال ہونا علامہ بہائی نے یہ بتلاتے ہوے کہ رسمی علوم کے حاصل کرنے سے درحقیقت انسانیت مکمل نہیں ہوتی اور نفس ناطقہ کی حقیقی جلا نہیں ہوتی بلکہ تکمیل کے لیے علم عاشقی (یعنی علت العلل کی سچی محبت) درکار ہے۔ فرماتا ہے۔

علم رسمی سربسر قیل ست و قال ‌ ‌ ‌ نے ازو کیفیتے حاصل نہ حال

طبع را افسردگی بخشد مدام ‌ ‌ ‌ مولوی باور ندارد ایں کلام

گر کسے گوید کہ از عمرت ہمیں ‌ ‌ ‌ ہفت روزے ماند و آں گردد یقیں

تو دریں یک ہفتہ مشغول کدام ‌ ‌ ‌ علم خواہی گشت اے مرد تمام

فلسفہ یا نحو یا طب یا نجوم ‌ ‌ ‌ ہندسہ یا رمل یا اعداد شوم

علم نبود غیر علم عاشقی ‌ ‌ ‌ مابقی تلبیس ابلیس شقی

زاں نگردد بر تو ہرگز کشف راز ‌ ‌ ‌ گر بود شاگرد تو صد فخر راز

ہر کہ نبود مبتلائے ماہ رو ‌ ‌ ‌ اسم او از لوح انسانی بشو

سینۂ خالی ز مہر گلرخاں ‌ ‌ ‌ کہنہ انبانے بود پر استخواں

چند چند از حکمت یونانیاں ‌ ‌ ‌ حکمت ایمانیاں را ہم بخواں

چند زیں فقہ و کلام بے اصول ‌ ‌ ‌ مغز را خالی کنی اے بوالفضول

علم و زہد کی تعریف علم و زہد کے متعلق فرماتے ہیں۔

علم چہ بود آنکہ رہ بنمائدت ‌ ‌ ‌ زنگ گمراہی ز دل بزدائدت

زہد چہ بود از ہمہ پرداختن ‌ ‌ ‌ جملہ را درد او اول باختن

ایں ہوسہا از سرت بیروں کند ‌ ‌ ‌ خوف و وحشت در دلت افزوں کند

خشیتہ اللہ را نشاں علم داں ‌ ‌ ‌ انما یخشیٰ تو در قرآں بخواں

سینہ را از علم حق آباد کن ‌ ‌ ‌ رو حدیث لو علمتم یاد کن

علم یابد زیب از فقر اے پسر ‌ ‌ ‌ نے ز زاغ و زاغ و اسپ و گاؤ خر

مولوی را ہست دائم بے گماں ‌ ‌ ‌ کاں بیاید زیب اسباب جہاں

نقص علم ست اے جناب مولوی — حشمت مال و منال دنیوی
تا قم و خز چند پوشی چوں شہاں — مرغ و ماہی چند سازی زیب خواں

ضرورت ہے کہ ہمارے آج کل کے مدعیان علم و فضل اس تعلیم سے سبق حاصل کریں۔ فی الحقیقت ایسے علوم کا فائدہ کیا جو دلوں سے گمراہی کا رنگ دور نہ کر سکے۔ حقیقی علم خود ایک ایسی نعمت ہے جسکے بعد انسان کو دوسری دنیوی نعمتوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ جس شخص کا سینہ علم کے خزانوں سے مالامال ہے۔ اُسے دنیوی جاہ و حشمت سے آخر تعلق ہی کیا۔ علم کی زینت یقیناً بے نیازی ہی سے ہو سکتی ہے۔ علم میں جہاں ثروت کی خواہش پیدا ہوئی وہاں فوراً اُسکا حقیقی وقار زائل ہوا۔

روح کی تربیت مقدم ہے

جناب بہائی نے نہایت لطیف عنوان سے روح کو انسانیت کا وطن قرار دیتے ہوئے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ بدن کی تربیت سے زیادہ روح کی تربیت کی طرف متوجہ رہنا چاہیے۔ اور واقعہ بھی یہ ہے کہ اگر جسم تندرست ہے مگر روح بیمار ہے تو اس سے انسانیت کی ترقی نہیں ہو سکتی۔

گنج علم ما ظہر مع ما بطن — گفت از ایمان بود حب الوطن[ع]
ایں وطن مصر و عراق و شام نیست — ایں وطن شہریست کاں را نام نیست
زانکہ از دنیاست ایں اوطان تمام — مدح دنیا کے کند خیر الانام
حب دنیا ہست راس ہر خطا — از خطا کے می شود ایماں عطا
اے خوش آنکہ یابد از توفیق بہر — کاورد رو سوے آں بے نام شہر
تو دریں اوطاں غریبی اے پسر — خو بہ غربت کردۂ خاکت بسر
آں قدر در شہر تن ماندی اسیر — کاں وطن یکبارہ رفتت از ضمیر
رو بتاب از جسم و جاں را شاد کن — موطن اصلی خود را یاد کن
تا بہ چند اے شاہباز پر فتوح — باز مانی دور از اقلیم روح
حیف باشد از تو اے صاحب ہنر — کاندریں ویرانہ ریزی بال و پر
تا بکے اے ہدہد شہر سبا — در غریبی ماندہ باشی بستہ پا

ع مراد رسول اللہ صلعم

تا بہ کے در چاہِ طبعی سرنگوں ۔۔۔ یوسفی یوسف بیا از چہ بروں

تا عزیزِ مصرِ ربانی شوی ۔۔۔ وا رہی از جسم و روحانی شوی

عبادت کو شوق جنت اور خوف جہنم سے کوئی واسطہ نہیں ہونا چاہیے

جنابِ امیرالمومنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے" واللہ ما عبدتک خوفاً من نارک ولا طمعاً فی جنتک ولکن وجدتک اہل العبادۃ فعبدتک" اس حکیمانہ قول کو جناب بہائی نے اپنا مبنیٰ قرار دیتے ہوئے عبادت کے منشا کی تشریح فرمائی ہے۔ ؎

نان و حلوا چیست اے نیکو سرشت ۔۔۔ ایں عبادِ تہائے تو بہر بہشت

نزد اہلِ دیں بود دیں کاستن ۔۔۔ در عبادت مزد از حق خواستن

رو حدیث ماعبدناک اے فقیر ۔۔۔ از کلامِ شاہِ مرداں یاد گیر

چشم بر اجرِ عمل از کور یست ۔۔۔ طاعت از بہرِ طمع مزدوریست

عابدے کو اجرتِ طاعات خواست ۔۔۔ کج عبادت گر نہی نامش رواست

تا یکے بر مزد داری چشم تیز ۔۔۔ مزد زیں بہتر چہ خواہی اے عزیز

کو ترا بالطف و با فضلِ مزید ۔۔۔ از برائے خدمتِ خود آفرید

با ہمہ آلودگی قدرت نکاست ۔۔۔ بر قدت تشریفِ خدمت کرد راست

عبادت یقیناً خلوص کی مقتضی ہے۔ عبادت کا یقیناً اعلیٰ مرتبہ یہی ہے کہ اس میں کوئی غرض شامل نہ ہو۔ عبادت صرف عبادت کے لیے ہو۔ جنت کے لالچ یا دوزخ کے خوف سے اگر عبادت کی گئی تو پھر وہ بے لوث نہیں رہی۔ اُس میں تجارتی حیثیت شامل ہو گئی۔ اسی مفہوم کو ہمارے اُردو کے مایۂ ناز شاعر غالب نے بھی اپنے رنگ میں ادا کیا ہے۔ ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ ۔۔۔ دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

عبادت کی عالی مرتبتی جب ان آلودگیوں کو بھی پسند نہیں کرتی تو وائے ہے اُن لوگوں پر جو عبادت کو تحصیل زر کا آلہ بنائے ہوئے ہیں۔

اُن اصحاب تدریس کی خدمت جن کا مقصد صرف اظہار فضل ہے

تعلیم و تدریس کا مقصد اگر اپنی دماغی برتری کا اظہار اور عقلی تفوق کی نمائش ہے تو اس سے بڑھ کر کوئی

سے قابل مذمت نہیں ہوسکتی تعلیم و تدریس کا مقصد تو صرف یہ ہونا چاہیے کہ اپنے ابنائے نوع کو فائدہ پہونچایا جائے۔ اُنکی عقلی و اخلاقی رفعتوں کے لیے راستے پیدا کیے جائیں۔

علامہ بہائی فرماتے ہیں :۔

نان و حلوا چیست ایں تدریس تو — کاں بود سرمایۂ تلبیس تو
بہر اظہار فضیلت معرکہ — ساختی افتادی اندر ہلکہ
تا کہ عامی چند سازی رام خویش — با صد افسوں آوری از دام خویش
چند بکشائی سر انبان لاف — چند بنمائی گزاف اندر گزاف
نے فروعت محکم آمد نے اصول — شرم بادت از خدا و از رسول
اندریں رہ چیست دانی غول تو — ایں ریائی درس نامعقول تو
درس اگر قربت نباشد زو غرض — لیس درسا انہ بیس المرض
اسپ دولت بر فراز عرش تاخت — آنکہ خود را زیں مرض آزاد ساخت

بنے ہوئے فقیروں کی مذمت دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو فقیری کا ظاہری لباس پہن کر اپنے کو واقعی فقیر سمجھنے لگتے ہیں اور اُنھیں اسکا غرہ ہو جاتا ہے کہ اُنھوں نے سلوک و معرفت کی منزلیں طے کر لی ہیں۔ اُنکی نگاہوں میں جو کچھ ہے ظاہر ہے۔ باطن کوئی وقعت نہیں رکھتا ایسے لوگ درحقیقت ننگ انسانیت ہیں۔ انکی ریائی صورتیں دنیا کے لیے ایک عذاب ہیں۔

جناب بہائی اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

نان و حلوا چیست ایں اعمال تو — جبۂ پشمیں ردا و شال تو
ایں مقام فقر خورشید اقتباس — کے شود حاصل کسے را از لباس
زیں ردا و جبۂ ات اے کج نہاد — ایں دو بیت از مثنوی آمد بیاد
ظاہرت چوں گور کافر پر حلل — و اندروں قہر خدائے عز و جل
از بروں طعنہ زنی بر بایزید — وز درونت ننگ میدارد یزید
رو بسوز ایں جبۂ ناپاک را — ویں عصا و شانہ و مسواک را
ظاہرت گر ہست با باطن یکے — خواستی تا فاش گردد اندکے

در مخالف شد درونت با بروں رفتہ باشی در جہنم سرنگوں

غرضکہ پوری مثنوی اسی قسم کی نصیحتوں اور موعظتوں سے مالامال ہے۔ اُسکے مطالعہ سے روح کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ جگہ کی تنگی کی وجہ سے اس سے زیادہ اشعار نہیں دیے جا سکتے۔

جناب بہائی کی دوسری مثنوی "شیر و شکر" باوجود تلاش مجھے دستیاب نہیں ہوئی اسی طرح مجھے اُن کی فارسی کی کوئی غزل بھی نہیں ملی

غزل جناب وحشت کلکتوی

اُدھر اک بیخودی سی چھا گئی تو نے جدھر دیکھا
تری محفل میں میں نے جس کو دیکھا بیخبر دیکھا

نظر کو محو حیرت اور دل کو بے خبر دیکھا
بتا تو ہی کہ میں نے تجھ کو کیا دیکھا اگر دیکھا

ہر اک قطرہ خبر دیتا ہے دریائے مصیبت کی
ہوا احوال دل ظاہر جو حال چشم تر دیکھا

مری تقدیر پہ ہنس کر پوچھتی ہے میرے یاروں سے
دعائیں کچھ اثر پایا دعا میں کچھ اثر دیکھا

بقدر نا اُمیدی ہے ہوس کی گرم بازاری
نہ اِس کو مختصر پایا نہ اُس کو مختصر دیکھا

دل آشفتہ کو گم گشتۂ کوئے وفا پایا
سر شوریدہ کو منت گزار سنگ در دیکھا

کسی نے بھی نہ پوچھا ماجرائے درد پنہانی
بس اب رہنے بھی دے تیرا کمال اے چشم تر دیکھا

مری افسردگی محفل کو ہے افسانۂ عبرت
کہ انجام شب عشرت کو اے شمع سحر دیکھا

نشاط زندگی کیا گلشن آفاق میں مجھ کو
تمناؤں کی دنیا ہی کو جب زیر و زبر دیکھا

وہ آنسو باوجود ضبط جو نکلے قیامت تھے
غم طولانی دل کو بہ شکل مختصر دیکھا

یہ کہہ کر داد دی اُس سنگ در نے جانفشانی کی
کہ ہاں ہم نے کمال وحشت شوریدہ سر دیکھا

اثر کا تغزّل

کم سخن

سلسلے کے لیے دیکھو

رسالہ ماہ نومبر ۱۹۳۱ء

زور بیان اور جوش و خروش :-

شعر میں زور بیان اور جوش و خروش کا ہونا بہت ضروری ہے ورنہ شعر جذبے روح ہوکر رہ جائے گا اور اس میں تاثیر نام کو نہ رہیگی۔ اگر زور بیان اور جوش و خروش دیکھنا ہو تو فارسی میں عرفی اور حافظ اور اُردو میں سودا اور آتش کے دیوان کا مطالعہ کرنا چاہیے کلام اثر سے چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔ ؎

بتوں نے ٹیک دیں پیشانیاں زمیں پہ اثر
طلوع مہر ہوا مشرق حجازی سے

ان سادہ الفاظ میں شیر کی گرج کا زور موجود ہے

ستم سے جب ہوئی راہِ عشق میں لغزش
بنا کرم کی ہوئی میرے امتحاں کے لئے

الاماں خطرے ترے اے وادیٔ پرخارِ عشق
جس جگہ دم لے لیا غفلت کا الزام آگیا

وہ اسیرِ رنگ و بو ہوں کہ اگر قفس میں پھڑکوں
تو بہار پھوٹ نکلے خس و خارِ آشیاں سے

کفر پر مائل ہوئی پھر طبعِ آزاد اثر
دھجیاں اڑنے لگیں پھر جامۂ احرام کی

نام کے ساتھ بدلتی ہے ہمیں نیت
جس کا جی چاہے وہ کعبہ کہے بتخانے کو

گرمیٔ حسنِ رخِ دوست الٰہی توبہ
جلوۂ شمع سے انکار ہے پروانے کو

بدنام اور نام محبت نہ ہو کہیں
ہاں ہاں مٹا ہی دیجئے نقشِ مزار کو

آگ کیا پھونکتی اک اُف نے جلایا جیسا
چشمکیں اور کریں خارِ بیاباں ہم سے

حسرتِ عرضِ تمنا میں جو لذت ہے نہ پوچھ
ساز میں نغمے بھرے اتنے کہ خاموش ہوا

گلریز ہیں سجدے مرے گلپوش ترا در
اب اتنی خبر کسکو جبیں ہے کہ نہیں ہے

آستاں ہی سہی دلدار نہیں قسمت میں
آؤ اک سجدہ سرِ راہ گزر ہو جائے

ذرا خبردار وحشیو سے چمن میں فصلِ بہار آئی
پھر ان کی زنجیرِ پا کے حلقے جنوں کے سانچے میں ڈھل رہے ہیں

خلق افسانہ کہا کرتی ہے
دیکھ یوں مرتے ہیں مرنے والے

حسنِ الفاظ اور سادگیٔ ادا:-

اگر بلند تخیل کے ساتھ الفاظ عمدہ موزوں اور مناسب ہوں تو شعر میں خامی رہ جائیگی، ایسے اشعار کا اثر بجائے دل کے دماغ پر ہوتا ہے بقول مولنا شبلی،

"لفظ جسم ہے اور مضمون روح، دونوں کا ارتباط باہم ایسا ہی جیسا روح اور جسم کا ارتباط۔ اگر وہ کمزور ہوگا تو یہ بھی کمزور ہوگی، پس اگر معنی میں نقص نہ ہو اور لفظ میں ہو تو شعر میں عیب سمجھا جائے گا، جس طرح لنگڑے یا لُنجے میں روح موجود ہوتی ہے لیکن بدن میں عیب ہوتا ہے، اسی طرح اگر لفظ اچھے ہوں لیکن مضمون اچھا نہ ہو تب بھی شعر خراب ہوگا اور مضمون کی خرابی الفاظ پر بھی اثر کرے گی، اگر مضمون بالکل لغو ہو اور الفاظ اچھے ہوں تو الفاظ بھی بیکار ہونگے جس طرح مُردے کا جسم کہ یوں دیکھنے میں سب کچھ سلامت ہے لیکن درحقیقت کچھ بھی نہیں اسی طرح مضمون گو اچھا ہو لیکن الفاظ بُرے ہوں تب بھی شعر بیکار ہوگا کیونکہ روح بغیر جسم کے پائی نہیں جاتی"۔

لہ شعر العجم جلد چہارم

شاعر کا انتہائی کمال یہ ہے کہ بلند تخیل کو سادہ الفاظ میں ادا کر دے جیسے ؎

اپنی حالت دیکھ کر جب اپنی حالت یاد کی
دل بھر آیا، آہ کی، نالہ کیا، فریاد کی

شعر کیا ہے انسان کی پستی کا پُر درد مرثیہ ہے۔ ایک دن وہ تھا کہ فرشتوں نے اسے سجدہ کیا بہشت اس کا مسکن تھا ایک دن یہ ہے کہ دنیائے دوں میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ عروج کی یاد کے ساتھ ہی دل پر اثر ہونا بھی ناگزیر ہے۔ ایسی حالت میں آنکھوں میں آنسو بھی بھر آئینگے اور بیساختہ آہ بھی نکل جائیگی۔ پہلا مصرع

"دل بھر آیا آہ کی، نالہ کیا، فریاد کی"

میں رفتہ رفتہ اثر ہونے کا کسقدر عمدہ نقشہ دکھایا ہے ؎

اللہ ری نگاہ غلط انداز کی شوخی
کھائی ہے کہیں چوٹ مگر درد کہیں ہے

کسقدر پُر کیف شعر کتنے سادہ الفاظ میں کہا ہے ؎

کل تک تھا وہی فتنہ و آشوب کا مسکن
جس کنج میں پلکوں کے حیا آج مکیں ہے

اسی خیال کو ایک دوسرے مقام پر کس خوبی سے ادا کیا ہے ؎

جہاں پلکوں کے سائے میں ہزاروں فتنے سوتے تھے
وہاں فطرت نے چپکے سے نگاہ شرمگیں رکھ دی

کتنا بلند خیال ہے اور الفاظ کسقدر سادہ "چپکے سے" نے تو اور بھی قیامت ڈھا دی ہے ؎

تری ادا کا مقابل ترا شباب ہوا
اک آفتاب تھا جو محو آفتاب ہوا

یہ شعر سادگیٔ ادا کا اعلیٰ نمونہ ہے ؎

عشق ہے جان مری عشق ہے ایماں میرا
تم نے آزاد کیا میں سبکدوش ہوا

یہ شعر بلند خیالی کا اعلیٰ نمونہ ہے اور سادگیٔ ادا کی بہترین مثال ؎

نظر سوئے زمیں ہے گوشۂ دامن ہے ہاتھوں میں
معاذ اللہ کوئی کیا کہے ایسے پشیماں کو

جیسی تخیل ہے ویسے ہی الفاظ، پھول جسقدر خوشرنگ ہے ویسی ہی نفیس خوشبو بھی ہے۔ معاذ اللہ جس خوبی سے استعمال ہوا ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔

سہل ممتنع :-

جب تخیل کی رفعت اور الفاظ کی سادگی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو شعر سہل ممتنع ہو جاتا ہے۔ ہر شخص خیال کرتا ہے کہ ہم بھی ایسا کہہ سکتے ہیں لیکن ایسا کہنا بس کی بات نہیں ہوتی سعدی کا یہ شعر سہل ممتنع کی اعلیٰ مثال خیال کیا گیا ہے

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو
تو کجا بہرِ تماشا می روی

جناب آثر کی غزلیات میں ایسے شعر کثرت سے پائے جاتے ہیں اور خاص کر چھوٹی بحروں کی غزلوں میں چند شعار حوالۂ قلم کئے جاتے ہیں ؎

تکیہ دیوار جساناں عمر بھر کافی ہوا
جس طرح لیٹا ہوا تھا اپنا بستر رہ گیا

کیا بھروسا ہو زندگانی کا
آدمی بلبلا ہو پانی کا

وہ گزر راہ سے جو بیگانہ
چراغ لحد جھلملانے لگا

لے لیا دل مڑ کے نہ دیکھا ادھر
جاؤ تمھارا ہی بھلا ہو گیا

وہم ہے ہستی بیمار فراق
ایک پرچھائیں سی ہے بستر پر

بھولنے والے سے کوئی پوچھے
تجھ کو میں دل سے بھلاؤں کس طرح

ہاتھ دل پر رکھ کے کوئی اٹھ گیا
ہاتھ میں دل سے اٹھاؤں کس طرح

ناز و نیاز کے جھگڑے چکائے جاتے ہیں
نشانِ گورِ غریباں مٹائے جاتے ہیں

روگ ہیں جان کو دنیا بھر کے
ہم تو پچھتائے محبت کرکے

فاتحہ سے مجھے محروم نہ رکھ
میری تربت پہ گزرنے والے

دور سے کچھ دور سہی در کے برابر نہ سہی
مجھ کو تھوڑی سی جگہ چاہیے بستر کے لئے

آتا ہے ایک رنگ تو جاتا ہے ایک رنگ
لو آئے تھے وہ پرسشِ بیمار کے لئے

ردیف و قافیہ:۔

کلام آثر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ شعر اس خوبی سے ادا ہوتا ہے اور الفاظ کی نشست اتنی عمدہ ہوتی ہے کہ یہ اندازہ دشوار ہو جاتا ہے کہ شعر کسی ردیف و قافیہ میں کہا گیا ہے یا نہیں جیسے ؎

جب کہا میں نے وفا مشکل ہے
کہدیا سچ تو کہا مشکل ہے

اک دور تھا جو ہو چکا اک دور ہے جو آئیگا
اک خواب دیکھا جا چکا اک خواب دیکھا جائیگا

معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کسی ردیف و قافیہ میں کہا ہے۔ یہ خصوصیت صرف ایک یا دو شعروں تک محدود نہیں ہے بلکہ پوری پوری غزلوں میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک غزل درج کی جاتی ہے ؎

راہزن چاروں طرف ہیں راستہ گھیرے ہوئے
اس بہانے اس کے در پے شب کئی پھیرے ہوئے

بن گئی دنیا کسی کی اور کسی کی عاقبت
وہ ملا جو جسنے مانگا اک نہ تم میرے ہوئے

فرد طاعت میں مبارک زاہدوں کو حور و خلد
انکے شناتوں کے یہ سب تحفے ہیں پھیرے ہوئے

زندۂ جاوید ہیں حسرت اہل دل اہل کمال
صاحب جاہ و حشم ہونے کو جیتے ہوئے

ناز ہے بندوں کو رحمت پر تری رب کریم
تو ہمارا ہو چکا جسوقت ہم تیرے ہوئے

رنگ رخ، زلفیں عرق افشاں، بدن میں تھرتھری
یوں کوئی اٹھا مری بالیں سے منہ پھیرے ہوئے

رشک صد فردوس یعنی ارض پاک کربلا
فضل خالق سے اثر اپنے وہاں ڈیرے ہوئے

لکھنؤ کا رنگ:۔

لکھنؤ کا رنگ عام طور پر پسند نہیں کیا جاتا، اسمیں سوائے کنگھی چوٹی، خط و خال، زلف و ابرو کے اور کچھ نہیں، غرض کہ تمام تر لکھنؤ کی عاشقانہ شاعری تصنع اور آورد ہے۔ حضرت اثر کو کبھی کبھی جذب وطن اس طرز کی طرف کھینچ لاتا ہے مگر آپکے ذوق سلیم نے اس رنگ میں بھی دلفریبی اور مزہ پیدا کر دیا ہے۔ خاص لکھنؤ کے طرز میں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

طوق و زنجیر لئے مست ہوائیں آئیں
کوچۂ زلف سے گھنگھور گھٹائیں آئیں

لکھنؤ کے بدترین رنگ میں کس قدر مزہ پیدا کر دیا ہے ؎

ماتم میں غیر کے تری زلفیں بکھر سکیں
اب کچھ حیات و مرگ کا حاصل نہیں رہا

خود بخود رخ پہ بکھرنے لگیں زلفیں انکی
آج بیمار کے جینے کے کچھ آثار نہیں

لکھنؤ کا اوسط کا رنگ ہے مگر دلکشی اوسط سے زیادہ ہے ؎

اک عمر کی حسرت کا صلہ کیا یہ بہت ہے
اکبار ادھر دیکھ لو فرصت جو حیا دے

وہ نیم نگہ جس پہ حیا چھائی ہوئی ہے
میں کیا ہوں فرشتے کو بھی دیوانہ بنا دے

نشیلی انکھڑیوں میں مرنے کی تحریر دیکھیں گے
در میخانے سے لپٹی ہوئی زنجیر دیکھیں گے

وفا کا سیکھ لے تم سے کوئی صلہ دینا
بجائے فاتحہ نقش لحد مٹا دینا

اکدل تھا دے چکا لاؤں کہاں سے اور دل
روٹھنے والے تجھے کیونکر منانا چاہئے

نگاہ کچھ کہے چتون کچھ اور ادا کچھ اور
تمھیں بتاؤ کہ اب کس کا اعتبار کرے

خدا معلوم کس سے نیم باز آنکھوں نے سیکھا ہے
کبھی بیمار کر دینا کبھی بیمار ہو جانا

اساتذۂ قدیم کا اثر:۔

جناب اثر نے اساتذۂ اردو کے کلام کا گہرا مطالعہ کیا ہے۔ کثرت سے ان پر تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ آپکی شاعری میں غالب کی بلندیٔ تخیل، آتش کا بانکپن، سودا کا زورِ بیان، درد کا تصوف، مومن کی نازک خیالی اور میر کی ہمہ گیری موجود ہے۔

غالب اور اثر:۔

غالب کی نمایاں خصوصیت دقت پسندی، بلند خیالی، اور فارسی ترکیبوں کا استعمال ہے۔ جناب اثر کی اس غزل میں غالب کی یہ خصوصیتیں کس قدر نمایاں ہیں ؎

شوق نے جب گُم کیا اور رشک نے پایا مجھے　جو نظر آیا ترا جویا نظر آیا مجھے
کیسی عجزِ رحم کے قابل ہر اک سمجھا مجھے　اس طرح پامال کرنا تھا نہ اے دنیا مجھے
نقشِ نقشِ سجدہ ہو اک یوسفستانِ جمال　تو نے شوقِ جبہ سائی کر دیا رسوا مجھے
میری طینت ہے خیال آسودۂ حسنِ عمل　دوش بھولا خواب ہے افسانہ ہے فردا مجھے
اک ذرا گردن جھکائی اور دل خالی ہوا　کاش مل جائے خلوصِ سجدۂ مینا مجھے
تنگ جب ہوتی ہیں دل پر دو جہاں کی وسعتیں　پوچھ جاتا ہے وہ میرا پوچھنے والا مجھے
بے نیازِ وصل و ہجراں محرمِ اسرارِ عشق　تو نے سب کچھ دے دیا جب دل لیا مجھے
دل کی دل ہی میں رہ گئی اور دم لبوں پر آگیا　اسنے دیکھا اور اس انداز سے دیکھا مجھے
غمزہ و ناز و ادا کا اک حشم ہمراہ تھا　اور کہنے کو ملا بیداد گر تنہا مجھے
دم بخود حیرت سے ہوں کیونکر نہ مانند حباب　موج بھی آئی نظر لب تشنۂ دریا مجھے
ساز و برگِ عافیت تم کو مبارک ہو اثر　اور اک دنیا کی ہے تمہید یہ دنیا مجھے

آتش اور اثر:۔

بانکپن، تصوف، سنگلاخ زمینوں میں عمدہ شعر نکالنا، اور ردیف و قافیہ کا دست و گریباں رہنا خاص آتش کا حصہ تھا۔ ناظرین خود اندازہ فرمائینگے کہ یہ خصوصیاتِ آتشی جناب اثر کی اس غزل میں کسقدر نمایاں ہیں ؎

چاہتا ہوں رُخ بدل دے گردشِ افلاک کا　اُڑ چلا ہے کس قدر انسان پتلا خاک کا
میں نہ کہتا تھا صبا غماز ہے آنے نہ دے　آج بزمِ گل میں چرچا تھا مری پوشاک کا
پائے خم کی لغزشِ مستانہ کا عالم نہ پوچھ　آنکھ جھپکی اور پھیرا ہو گیا افلاک کا

وہ نظر آئے جو آنکھوں نے کبھی دیکھا نہیں
چشم دل سے دیکھ جلوہ اسکے حسن پاک کا

منتظر ہیں آپکے، کروٹ بدلنے کے لئے
اللہ اللہ یہ دماغ آسودگان خاک کا

صید ہونے کو چلے آتے ہیں آہوئے حرم
تر ہے کس کے خون سے حلقہ تمہارے فتراک کا

ناظر اس گلزار کے ہم رہ چکے ہیں مدتوں
برق کو رتبہ نہیں جس میں خس و خاشاک کا

خلد کہتے ہیں کسے معلوم ہے واعظ مجھے
ہاتھ شیشے کے گلے میں اور سایہ تاک کا

دامن اندیشۂ اہل تمنا جل گیا
الحذر اُف الحذر شعلہ ترے ادراک کا

اس سے بڑھ کر اور کیا ہو خونبہائے عشق اثر
سر دیا، بوسہ لیا تیغ بت سفاک کا

موتن اور اثر:-

مومن کی نازکخیالی، ایہام اور عشق مجازی کی شوخ تصویریں ان کے کلام میں جو مزہ پیدا کر دیتی ہیں وہ محتاج بیان نہیں لیکن حضرت اثر نے جو اس طرز میں کامیابی حاصل کی ہے وہ بھی محتاج ثبوت نہیں۔ یہاں پر یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ دونوں باکمال شاعروں کی غزلیں درج کر دی جائیں تاکہ ناظرین خود اندازہ کر سکیں کہ مومن کے طرز میں اثر کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں ؎

مومن

دل بستگی سی ہے کسی زلف دوتا کے ساتھ
پالا پڑا ہے ہمکو خدا کس بلا کے ساتھ

کب تک نبھائیے بت ناآشنا کے ساتھ
کیجئے وفا کہاں تلک اُس بیوفا کے ساتھ

اُٹھے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذر جفا کے ساتھ

اس کی گلی کہاں یہ تو کچھ باغ خلد ہے
کس جائے مجھ کو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

یاد ہوائے یار نے کیا کیا نہ گل کھلا
آئی چمن سے نکہت گل جب صبا کے ساتھ

مانگا کرینگے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

ہے کس کا انتظار کہ خواب عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آواز پا کے ساتھ

اللہ رے سوز آتش غم، بعد مرگ بھی
اُٹھتے ہیں میری خاک سے شعلے ہوا کے ساتھ

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر
یوں زار زار روئے تو اہل عزا کے ساتھ

ہر دم عرق عرق نگہ بے حجاب ہے
کس نے نگاہ گرم سے دیکھا حیا کے ساتھ

مرنے کے بعد بھی وہی آوارگی رہی
افسوس جاں گئی نفس نارسا کے ساتھ

دست جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا
اُلجھا ہے ان سے شوخ کے بند قبا کے ساتھ

میں کینہ سے بھی خوش ہوں کہ سب تو کہتے ہیں
اس فتنہ گر کو لاگ ہے اس مبتلا کے ساتھ

اللہ ری گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

اثر۔

اب دیکھتے ادھر نہیں کس طرح حیا سے آپ
باز آئے بھی تو باز نہ آئے جفا سے آپ

یہ میرا دم ہے حسن کے ترس آئے گا ضرور
واقف نہیں ہیں حال دل مبتلا سے آپ

شوخی نے کیا حیا سے کہا پیش آئینہ
شرما رہے ہیں آج تو اپنی ادا سے آپ

یہ تو جدا نہ کردہ جفا کا گلہ نہیں
کیوں بدگمان ہوتے ہیں ذکر وفا سے آپ

کہتے ہو جرم عشق نہ ہوگا کبھی معاف
یہ بات چاہتے تھے ہم اپنے خدا سے آپ

چشمک ہر بات بات پہ طعنے گھڑی گھڑی
یہ بات کر نہ سکتے تھے اک دن حیا سے آپ

مجرم بنا تھا لذت تعزیر کے لئے
لو اُلٹے شرمسار ہیں میری خطا سے آپ

میں مانتا ہوں خون شہیداں حنا نہیں
کل کی ہر بات چڑھتے تھی جیسے حنا سے آپ

اک روز ہوگی چشم عنایت بھی اس طرف
کچھ منفعل تو ہیں ستم ناروا سے آپ

چہرے کا رنگ دیکھئے آئینہ میں اثر
کہنے چلے ہیں حال دل اس بے وفا سے آپ

اگر مقطع نکال کر دیکھا جائے تو یہ اندازہ دشوار ہوگا کہ کونسی غزل مومن کی ہے اور کونسی اثر کی، اچھا ہوگا اگر دونوں کی ایک ایک ہم طرح غزل بھی لکھ دی جائے ؎

مومن

کیونکر یہ کہیں منت اعدا نہ کرینگے
کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کرینگے

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کرینگے
وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کرینگے

ہنس ہنس کے وہ مجھ ہی سے مرے قتل کی باتیں
اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کرینگے

بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسیٰ　　اچھا بھی کرینگے تو کچھ اچھا نہ کرینگے
گر سامنے اسکے بھی گرے اشک تو ہے دل　　کیوں روزِ جزا خون کا دعویٰ نہ کرینگے
ناصح کفِ افسوس نہ مل چل تجھے کیا کام　　پامال کرینگے وہ مجھے یا نہ کرینگے
گر ذکرِ وفا سے یہی غصہ ہے تو اب سے　　گو قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کرینگے

اے حضرتِ مومن یہ مسلم جو ہے ارشاد
بھولے سے کبھی ذکرِ بتوں کا نہ کرینگے

لیکن جو بتوں نے ہی بھلا آپ سے کی بات　　پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کرینگے

اثر

اب تیری خوشی اے دلِ شیدا نہ کرینگے　　بھولے سے کبھی اظہارِ تمنا نہ کرینگے
مت جاؤ دلِ زار کا کہنا نہ کرینگے　　اب سے گلۂ رنجشِ بیجا نہ کرینگے
آوارہ کہ سرگشتہ و رسوا نہ کرینگے　　یہ حضرتِ دل دیکھئے کیا کیا نہ کرینگے
بے آپکے کرتے نہ تھے ہم ہوش کی باتیں　　بے آپکے اب ہوش میں آیا نہ کرینگے
اے دل مرے ناشاد دل رہا بھرِ دل　　وعدہ بھی کرینگے تو وہ ایفا نہ کرینگے
یہ وہم غلط کانے کیا کان میں پھونکا　　وہ طالبِ دیدار سے پردا نہ کرینگے
کیا کیا تری اُلفت میں گوارا نہ کیا ہے　　کیا کیا تری اُلفت میں گوارا نہ کرینگے
جیتا ہے کہ تبک کوئی امیدِ شفا میں　　کیا میرے مسیحا مجھے اچھا نہ کرینگے
کیا مصر کا بازار ہے بازارِ محبت　　سودا ہے کوئی جو ترا سودا نہ کرینگے
بے کیف ہے وہ سجدہ جو سو بار ادا ہو　　تقلیدِ سبو بیعتِ مینا نہ کرینگے
آئینہ جنھیں عشق کی حیرت نے بنایا　　اس طرح تمھیں دیکھینگے دیکھا نہ کرینگے
کہتی ہیں ان شوخ حسینوں کی نگاہیں　　دل لیں گے مگر دل کا تقاضا نہ کرینگے
یہ تازہ ستم عہدِ وفا کے ہیں ستمگر　　کہتے ہیں ذرا پاسِ وفا کا نہ کرینگے
ارمانوں کو اک راہ نکلنے کی نہ ملجائے　　پہلو سے جدا تیر تمھارا نہ کرینگے
در پردہ اگر یہ بھی شکایت ہے تمھاری　　تو شکوۂ بیداد تمنا نہ کرینگے

معلوم نہیں کس سے وہ حال دل بیاں
کچھ فکر کرینگے بھی آثر یا نہ کرینگے

اگر مقطعے موجود نہ ہوں تو سمجھ میں نہیں آسکتا کہ کونسی غزل کس کی ہے۔

میر اور آثر:۔

جناب آثر کو میر کے کلام سے عشق ہے اسکو ایک بار نہیں ہزاروں مرتبہ پڑھا اور سبق حاصل کیا، اسپر متعدد مضامین لکھے۔ میر کے مطالعہ سے فیض حاصل کرنے کے متعلق خود کہتے ہیں ؎

شعر آخر کہ ہے عطیۂ خاص — آثر اعجاز میر کامل تھا

وہ عطیۂ خاص یہ الہامی شعر ہے ؎

رات کو ہوک ایسی دل میں اٹھی — اک گرہ رہ گئی جہاں دل تھا

ایک اور غزل کے مقطع میں کہا ہے ؎

آثر ہے میر سے نادیدہ بیعت — نہ کیوں تاثیر ہو میرے سخن میں

میر کے گہرے مطالعہ کا اثر یہ ہوا کہ آپکے کلام میں بھی وہی کیف اور وہی درد و خستگی پیدا ہوگئی جو میر کے کلام کا جوہر ہے۔ یہ غزل دعوے کے ثبوت میں پیش کی جاتی ہے ؎

بالیں پہ نہ لائیں کوئی اسے کیا فائدہ تنہا جائیگا — احوال زبوں زار مرا اس سے بھی نہ دیکھا جائیگا
وہ صید ضعیف و لاغر ہوں سب دیکھ کے مجھ کو کہتے ہیں — اس بیچارے سے زخمی ہو کر کیونکر تڑپا جائیگا
آہ سوزاں رد کی تو ردکی آنسو پینا قہر ہوا — اب چھالے پہ چھالا چھالے سے چھالا اور پا جلتا جائیگا
کیا عرض تمنا سے حاصل وہ ایک ہی پرفن ہے لیکے دل — بات بنائی جائیگی یا باتوں میں ٹالا جائیگا
الزام نہ دو نار اض نہ ہو اس دل سے بہت مجبور ہوئے — اب تم جو سہارا دو اٹھیں یوں ہم سے نہ اٹھا جائیگا
میں اس سے کہوں تم کہہ دو ترا بس میری تو ایذا طلبی ہے — سب آئی گئی مجھ پر ہوگی کمبخت ترا کیا جائیگا
فریاد کا شنوا کوئی نہیں بیکس کا سہارا کوئی نہیں — کچھ دیکھ لیا اس دنیا میں کچھ حشر میں دیکھا جائیگا
دیدار کی حسرت جو ہو سہتے دلکی تپش کو کیا کیجیے — بیہوشی سی چھا جائیگی جب وہ اٹھایا جائیگا

جب یاد دلایا روز جزا کا فتنہ کہا اور ہنس کے کہا
سی جائینگے تیرے ہونٹ آثر جب نام دو کا آجائیگا

معلوم ہوتا ہے کہ غزل میر تقی علیہ الرحمہ کی زبان کی نکلی ہوئی ہے۔

شاعر کا اصلی طرز سخن :-

کامیاب شاعر کسی کی تقلید کرے مگر ساتھ ہی ساتھ اپنا مخصوص طرز ضرور قائم رکھتا ہے۔ حضرت اثر نے متقدمین کا نہایت کامیابی سے تتبع کیا لیکن یہ دیکھتے ہوئے کہ اپنی انفرادیت بھی قائم رکھی ہے یہ امر اور قابل تحسین ہو جاتا ہے۔ آپ کا رنگ جدا، طرز جدا، روش جدا، آپ کی بلند خیالی، جذبات نگاری اور جدت ادا کا اندازہ شاید ان دو غزلوں سے صحیح طور پر ہو سکتا ہے ؎

اسقدر ٹھوکریں کھائی ہیں ترے در کے لئے
گردشیں رہ نہ گئیں میرے مقدر کے لئے

در سے کچھ دور سہی در کے برابر نہ سہی
مجھ کو تھوڑی سی جگہ چاہیے بستر کے لئے

عید نو روز ہے اتنی تو پلا دے ساقی
سال بھر بہکے نہ نیت مری ساغر کے لئے

طرح اندازیٔ آشوب قیامت کیا خوب
جیسے کچھ کم تر آسودہ اٹھا مرے سر کے لئے

دل میں ہمت ہو اگر چھوڑ دے ساحل کا خیال
شور امواج میں نغمہ ہے شناور کے لئے

آہ امید حسین شل ہوئے بازو لیکن
رعشہ ترتیب ہے پرواز کی شہپر کے لئے

ہجر اور ہجر میں اک وعدہ فراموش کی یاد
ہے مصیبت پہ مصیبت دل مضطر کے لئے

بیوفا ٹوٹے ہوئے دل کو مرے نام نہ رکھ
حسن ہے دل کے لئے عیب ہے ساغر کے لئے

ہوس سجدہ میں جو کچھ ہے کہاں سجدے میں
دور پھرتا ہوں ترے در سے ترے در کے لئے

خشت خم ہے کبھی سنگ در میخانہ ہے
غم نہیں جو کا زانو جو نہیں سر کے لئے

ہاتھ کانپا ہی کیا شوق میں ساغر کے اثر
دل تڑپتا ہی رہا بادۂ احمر کے لئے

رہ صبر و رضا میں اس طرح کس نے جبیں رکھ دی
کہ بڑھ کر اوج میں کعبے سے مقتل کی زمیں رکھ دی

فلک پر جب کسی محبوب کے نقش قدم دیکھے
تڑپ کر کہکشاں نے گوہر آلودہ جبیں رکھ دی

سحر ہوتے ہی افسانہ تھی مرگ بیکسی اپنی
یہ کیا تاثیر تجھ میں اے نگاہ واپسیں رکھ دی

جہاں پلکوں کے سائے میں ہزاروں فتنے سوتے تھے
وہاں فطرت نے چپکے سے نگاہ شرمگیں رکھ دی

نظر آیا جو ہر قطرے میں طوفاں خون حسرت کا
وہاں زخم پر قاتل نے ہنسکر آستیں رکھ دی

نگاہِ ناز تیری شوخیوں سے بدگمانی ہے — یہ چنگاری مرے سینے میں تو نے تو نہیں رکھ دی
شریعت کس کو کہتے ہیں نہیں معلوم آثرؔ لیکن — وہیں اک بن گیا کعبہ جہاں ہم نے جبیں رکھ دی

شعر کی انتہائی خوبی یہ ہے کہ دل اسکے مزے اٹھائے اور زبان مطلب ادا کرنے سے قاصر ہے اسکی نزاکت پھول کی لطیف خوشبو کے مانند ہو، ہر شخص اس سے لطف اندوز ہو، دماغ معطر ہو جائے لیکن اس کی تشریح محال اگر اس کا مطلب بیان کرنے کی سعی کی جائے تو اس کی خوبیوں کا اظہار تو درکنار اسکی لطافتوں کا خون ہو جائے۔

ایسے ہی شعر شاعر کے شاہکار سمجھے جاتے ہیں، ان کے پڑھتے ہی دل رنج و غم، سرور و انبساط، نفرت و غصہ، رحم و ہمدردی، کرم و مروت، حیرت و استعجاب، یا اور کسی جذبہ سے فوراً مشتعل ہو جاتا ہے۔ انکی تاثیر بجلی کی لہر کی طرح ہوتی ہے۔ لیکن اس تاثیر کے اظہار پر زبان قادر نہیں۔ ایسے ہی اشعار کے متعلق مرزا غالب نے کہا تھا ؎

اگرچہ شاعرانِ نغز گفتار — زیک جام اند در بزمِ سخن مست
ولے با بادہ بعضے حریفاں — خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست
مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم — ورائے شاعری چیزے دگر ہست

اب جناب آثرؔ کے اشعار پڑھیے اور سر دھنیے ؎

اے فلک شمس و قمر تیرے بھی ہیں گرمِ سفر — خوش نہ ہو بربادیٔ گورِ غریباں دیکھ کر
کار فرما دہ نگاہِ غلط انداز نہیں — آہ کیونکر ہو حریفِ غمِ پنہاں کوئی
وقتِ اخیر عشق کی دنیا بدل گئی — کچھ مہرباں سے وہ ہیں تو نامہرباں سے ہم
نظریں اٹھیں اور اٹھ کے جھکیں تمکنت سے تھا — گویا یہی جواب تھا میرے سوال کا
سانس لی اور رگِ جاں کو چھوا بجلی نے — بات کی اور دلِ زار میں نشتر ٹوٹا
نیند کے حیلے سے وہ برہم زنِ مژگاں ہوا — ہمنشیں اب ہم یونہیں سا کرینگے خواب کو
یہ خلافِ امید اس سے ہوا — بیکسی پر مری نگاہ نہ کی
ہمنے رو رو کے رات کاٹی ہے — آنسوؤں پر یہ رنگ تب آیا
کسی نے بات نہ پوچھی کسی نے داد نہ دی — جگر کا خون ہوا آہ رائیگاں کے لئے

یہ دیکھتے ہوئے ماننا پڑتا ہے کہ آثرؔ کے کلام میں بھی

"ورائے شاعری چیزے دگر ہست"

[illegible]

"رانی درگاوتی"

(جناب سید ناظم حسین صاحب نقوی صفی پوری وکیل)

غالباً کسی کو اس کلیہ سے انحراف نہ ہوگا کہ فطرت اس کی مقتضی ہو کہ ایک ہندو۔ ہندو کا۔ ایک مسلمان مسلمان کا اور ایک عیسائی عیسائی ہی کا سچے اور حقیقی معنوں میں ہمدرد ہو سکتا ہو۔ خواہ وہ بظاہر کتنا ہی کیوں نہ اپنے کو آزاد خیال اور ایک غیر متعصب ہستی بتلائے۔ فی زمانہ بہت سے لوگوں کو اپنے مذہب کے اصولوں کو قطع نظر کرنے اور یہ کہنے میں عار نہیں کہ بھائی ہم تو نہ ہندو ہیں۔ نہ مسلمان۔ نہ شیعہ ہیں۔ نہ سنّی۔ ہم تو آزاد خیال آدمی ہیں۔ لیکن جب کوئی وقت آن پڑتا ہے۔ تو ارباب بصیرت سمجھ لیتے ہیں کہ آزاد خیالی کا دعویٰ کس حد تک صحیح تھا۔

مندکرۂ بالا کلیہ کو مدّنظر رکھتے ہوئے اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ مسلم مورخوں نے اپنی تاریخوں میں ہندوؤں کے متعلق انصاف سے کام نہ لیا ہوگا۔ مذہبی جنگ جو ہندوستان میں مسلم حکومت کی بانی ہوئی۔ اور اس زمانے کے تعصب کو خیال کرتے ہوئے مسلم مورخوں کی نفرت کے سبب کو سمجھ لینا مشکل نہیں۔ لیکن مسلم مورخوں نے جو اپنی ایک ہزار سال کی دراز حکومت کے حالات سپرد قلم کئے ہیں۔ انکی ورق گردانی سے ہمکو ایک قابل قدر۔ غیر معمولی ہستی ملتی ہے۔ وہ مستثنیٰ ہستی ایک ہندو عورت کی ہے، جسکے واقعات اور کارناموں کو بہت سے ممتاز مسلم مورخوں نے لکھا ہے۔ ان مورخوں کے بیان میں سب سے زیادہ خوش کن بات یہ ہو کہ ان میں سے ایک نے بھی کوئی سخت یا اہانت کا لفظ اس عورت کے بارے میں استعمال نہیں کیا ہو۔ گو فطرتاً وہ اس کی سیاسی خواہشات کو پسند نہیں کرتے ہیں مسلم مورخوں نے مان سنگھ اور ٹوڈرمل ایسے ہندوؤں کی جو تعریف کی ہو اس کا سمجھنا آسان ہو کیونکہ وہ مغل سلطنت کے ستون تھے۔ ہمارے اس مختصر مضمون کا موضوع انکے نزدیک ایک باغی ہستی تھی تاہم وہ اسکی خوبصورتی۔ دلیری۔ شہرت، انتظام کرنے اور ترتیب دینے کی قابلیت۔ فن سپاہ گری کی یکتائی اور سب سے زیادہ اسکی بہادرانہ موت کے متعلق نہایت زوردار اور قابل قدر الفاظ میں لکھتے ہیں۔

اس عورت کا نام درگاوتی تھا۔ یہ گونڈوانا یا گڑھا کٹنگا جسے اب جبل پور کہتے ہیں وہاں کی رہنے والی تھی۔

اکبر کے دوران حکومت میں آصف خاں کی فوج سے جنگ کرتے ہوئے ۱۵۶۰ء میں مری مسلم تاریخوں کے صفحات میں اس کی زندگی کے حالات بہت اختصار کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اس کی بہادرانہ خوبی کا اظہار ایک ایسے پیرائے میں کرتے ہیں کہ ہم بلا تعریف کئے بغض نہیں رہ سکتے۔ ہر چہار مورخ جنکے حوالے ذیل میں دئے جاتے ہیں اسکے ہمعصر تھے بدیں وجہ انکے بیان کی صحت میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں ہے۔

(۱) تاریخ الفی جسے اکبر کے حکم سے کئی مورخوں نے ملکر تیار کیا اور مولنا احمد اس گروہ کے سرآوردہ تھے

(۲) طبقات اکبری جو نظام الدین احمد کے قلم کا نتیجہ ہے۔

(۳) دو اور تاریخیں ہیں جو اکبرنامہ کے نام سے موسوم ہیں۔ ان میں سے ایک ابوالفضل کی سی قابل احترام ہستی کی جو اکبر کے وزیر اعظم تھے لکھی ہوئی ہے اور دوسری شیخ فیضی سرہندی کی لکھی ہوئی ہے۔

(۱)

تاریخ الفی۔ گرہا کی فتح (۹۶۸ ہجری - ۱۵۶۰ عیسوی)

"خواجہ عبدالماجد جن کو آصف خاں کا خطاب ملا تھا۔ کڑا کے گورنر مقرر ہوئے اور اس صوبہ میں انھوں نے عمدہ خدمات انجام دئے منجملہ انکی خدمات کے گرہا کی فتح بھی تھی۔ جو پہاڑیوں اور جنگلوں سے گھرا ہوا تھا اور جسکو ہند کے کسی بادشاہ نے ابتدار اسلام سے اسوقت تک فتح نہ کیا تھا۔ اسوقت وہاں ایک رانی حکمراں تھی اور اس ملک کے تمامی..... اسکے مطیع اور فرمانبردار تھے۔ آصف خاں اکثر اپنے بھیدی مختلف بہانوں سے اسکے ملک میں بھیجا کرتا تھا اور جب اسکو ملک کے حالات ،خصوصیات، اور رانی کے مرتبہ اور خزانہ کا علم ہوگیا۔ اسنے معہ ایک فوج کے حملہ کردیا۔ رانی پانچسو ہاتھیوں اور بیس ہزار گھوڑوں کی ہمراہی میں مقابلہ کے لئے آئی۔ دونوں فوجوں نے حتی الوسع کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ رانی سواروں کی پہلی قطار میں تھی کہ اسکے ایک تیر لگا اور جب اسکو یہ یقین ہوگیا کہ اب وہ ضرور قید کرلیجائے گی۔ اسنے اپنے فیلبان سے خنجر چھین کر پیٹ میں بھونک لیا اور یوں راہی عدم ہوئی۔ آصف خاں کو فتح نصیب ہوئی۔

(۲)

طبقات اکبری

گرہا کٹنگا کا ملک آصف خاں کے نزدیک تھا۔ اسنے اسکے فتح کرنے کی ترکیب سوچی تھی۔ اس ملک کا

خاص مقام چوراگڈھ ہی۔ وہ کافی وسیع ہی۔ ستر ہزار خوشحال دیہات اسمیں شامل تھے۔ اسوقت اسپر ایک عورت مسمی درگاوتی حکمراں تھی۔ جو بیحد حسین تھی۔ جب آصف خاں کو اسکے حالات معلوم ہوئے۔ اسنے اس کا فتح کرنا آسان سمجھ کر پچاس ہزار سوار اور پیدل لے کر چڑھائی کر دی۔ رانی نے اپنی فوجیں جمع کیں اور غنیم کے مقابلہ کے لئے سات سو ہاتھی۔ بیس ہزار سوار اور ایک کثیر تعداد پیدل کی لیکر چل کھڑی ہوئی۔ جنگ شروع ہوئی اور طرفین نے نہایت جانبازی سے ایک دوسرے کا مقابلہ کیا۔ لیکن بدقسمتی سے رانی کے ایک تیر لگا اور وہ خائف ہوکر کہ مبادا زندہ دشمنوں کے ہاتھ میں نہ پڑجائے اپنی جان فیلبان کا خنجر بھونک کر دیدی۔ فتح کے بعد آصف خاں چوراگڈھ پہنچا۔ رانی کا لڑکا جو قلعہ میں تھا اسکے مقابلہ کے لئے نکلا۔ لیکن وہ مارا گیا۔ قلعہ پر قبضہ ہوگیا۔ اور سارا خزانہ فاتحین کے ہاتھ لگا۔

(۳)

اکبرنامہ۔ ابوالفضل

گرہا کٹنکا کی فتح

خواجہ عبدالماجد آصف خاں گوتارق اور اہل قلم میں سے تھا۔ تاہم بادشاہ کی خوش نصیبی کی مدد سے اسنے وہ کارنمایاں انجام دئے تھے کہ اسکی موجودگی میں ترک بھی خفیف ہوتے تھے۔ اسنے گرہا کٹنکا کی فتح کا مصمم ارادہ کیا۔ ہندوستان کے وسیع ملک میں ایک خطہ گونڈوانا کے نام سے موسوم ہی۔ یہاں ایک فرقہ جو گونڈ کہلاتے تھے آباد تھا۔ یہ لوگ زیادہ تر اپنا وقت کھانے، پینے اور بچوں کے پیدا کرنے میں صرف کرتے تھے۔ ان کا شمار ایک ذلیل فرقہ میں کیا جاتا تھا۔ ہندوستان کے لوگ انکو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور انکے مذہب اور ضوابط کے نزدیک وہ جلاوطن یا مردود تصور کئے جاتے تھے، شمال کی جانب پنا اور جنوب میں دکہن واقع تھا اس کا عرض تقریباً اسی کوس تھا۔ یہ ملک گرہا کٹنکا کے نام سے مشہور تھا۔ اور اس میں بہت سے مضبوط مستحکم اور بلند قلعہ تھے۔ بہت سے قصبہ اور قریہ اسمیں شامل تھے۔ بعض مورخوں نے لکھا ہی کہ اسمیں قریب ستر ہزار گانوں تھے۔ گرہا خاص شہر کا نام تھا اور اسی سے ملحق حصہ کٹنکا کہلاتا تھا۔ اور سارا ملک انھیں دو مقاموں کے نام سے مشہور تھا۔ دارالسلطنت چوراگڈھ کے قلعہ میں تھا۔ ہندوستان میں مسلمان حکومت کے آغاز سے اسوقت تک کوئی بادشاہ نہ تو اس ملک کے قلعوں کو فتح کرسکا اور نہ اس ملک ہی کو سلطنت میں شامل کرسکا تھا۔

اسوقت جبکہ آصف خاں کو کڑا کی جاگیر مرحمت ہوئی اور اسنے پنا کی فتح انجام دی۔ اس ملک کی عنان حکومت رانی درگاوتی کے ہاتھ میں تھی۔ جو عام طریقہ سے "رانی" کہلاتی تھی۔ وہ اپنی دلیری۔ قابلیت اور فیاضی کے لئے مشہور تھی۔ انھیں خصوصیات کے باعث سارا ملک اسکے تحت میں تھا۔ مورخ نے ذہین اور قابل اعتماد آدمیوں سے جو وہاں ہو آئے ہیں سُنا ہے کہ اس کی حکومت تیئس ہزار آباد قریوں پر تھی۔ ان میں سے بارہ ہزار کا انتظام وہ خود کرتی تھی اور بقیہ پر خراج گذار سردار قابض تھے۔ مختلف فرقوں کے سردار اسکی اطاعت کرتے تھے۔ وہ چندیل خاندان کے راجہ سلیبہان کی لڑکی تھی جو رآتا اور مہوبہ کا راجہ تھا۔ اسنے اسکی شادی دلپت راجہ امن داس کے لڑکے سے کی تھی۔ راجہ امن داس گو کسی معزز خاندان سے نہ تھا لیکن بہت امیر تھا۔ زمانہ کی ناموافقت کے باعث راجہ سلیبہان اس رشتہ پر رضامند ہو گیا تھا۔ رائےسین کی فتح کے موقع پر امن داس نے سلطان بہادر گجراتی کی قابل قدر امداد کی تھی۔ اسکے صلہ میں سنگرام شاہ کا خطاب اور مزید وقار و منزلت اسکو عطا ہوئی تھی اپنی وفات پر اسنے ایک پانچ سالہ بچہ بیر نرائن چھوڑا۔ ادہر کائستھ (مسلم مورخوں نے پہلے پہل اکبر کے زمانہ میں کائستھوں کا ذکر بحیثیت ایک ممتاز فرقہ کے کیا ہے۔ کائستھ کا لفظ اکثر کلہن کی راج ترنجینی میں آیا ہے لیکن سر اورل اسٹین Sir Aurel Stein کے نزدیک اس سے مراد سردار ہیں بالخصوص برہمن) کی مدد سے رانی نے عنان حکومت ہاتھ میں لی اور کسی قسم کی بزدلی یا کمی قابلیت کا اظہار نہ ہونے دیا۔ اور غیر ملکوں کے تعلقات کو نہایت ہوشیاری اور عقلمندی سے قائم رکھا۔ اسنے بہت سی لڑائیاں باز بہادر اور اسکے سرداروں سے کیں اور سب میں کامیاب ہوئی۔ اس کے پاس بیس ہزار سورما سوار اور ایک ہزار ہاتھی تھے۔ اس ملک کے اگلے بادشاہوں کا سارا خزانہ اس کے قبضہ میں تھا۔ تیر و تفنگ دونوں سے اچھا نشانہ لگاتی اکثر شکار کو جاتی اور اپنی بندوق سے جانور مار کر لاتی تھی۔ جب کبھی اسنے کسی چیتے کے متعلق سُنا اسکو اسوقت تک اطمینان نہ ہوتا تھا جب تک اس کا شکار نہ کر لیتی تھی۔ اس کی بہادری اور ہمت کے اکثر قصے ہندوستان میں مشہور ہیں۔ لیکن اسمیں ایک بڑی خامی تھی۔ اپنے خوشامدیوں اور ستائش کرنے والوں کی واہ واہ کو نہ صرف سنتی ہی بلکہ اسپر اعتماد کرتی تھی۔ اپنی طاقت کے غرہ پر اسنے بادشاہ کی اطاعت نہ کی۔

جب آصف خاں نے پنا کو فتح کر لیا۔ رانی درگاوتی نے اپنی فوج۔ بہادری اور اپنی قابلیت کے گھمنڈ کے باعث اپنے نئے ہمسایہ کی کوئی پرواہ نہ کی۔ آصف خاں نے پہلے تو اسکے ساتھ دوستانہ

تاجر اور تعلقات رکھے لیکن بعدۂ چالاک بھیدی اور فطین تجار داخلہ اور نکاس کی راہوں سے واقفیت حاصل کرنے کے لئے اس کے ملک میں بھیجے۔ جب اس کو رانی کی دولت اور خزانوں کا حال معلوم ہوگیا تو اس ملک کا مالک بننے کا خیال پیدا ہوا۔ پہلے سرحد کے گانوں پر حملہ کرنا شروع کیا حتیٰ کہ اسی سال شاہی فرمان گرہا کے فتح کرنے کا اسکو ملا۔

(۴)

اکبرنامہ　—　شیخ فیضی

اس ملک کا خاص مقام چوراگڈھ ہے۔ ستر ہزار آباد گانوں اسمیں شامل ہیں۔ ایک طرف اسکے مالوا اور دکھن واقع ہے دوسری جانب گرہا۔ یہ ایک خودمختار ملک تھا جسپر درگاوتی حکمراں تھی۔ وہ اپنے حسن۔ دلبری اور ہر دلعزیزی میں مشہور تھی۔ آصف خاں جس کے مقبوضات اس ملک کو گھیرے ہوئے تھے اور جس کے آدمی برابر اسکے ملک میں جاتے آتے تھے۔ اس کی مالگذاری اور عام حالت سے بخوبی واقف ہوگیا۔ موقع کا انتظار کرتے ہوئے اسنے مختلف گانوں پر لوٹ مار شروع کردی۔ آخر کار ۹۷۱ سنہ ہجری میں جو حکومت کی نویں سالگرہ کا سال تھا دس ہزار سوار اور پیدل لے کر سارا ملک فتح کرنے روانہ ہوا۔ اس کی شجاعت کے نزدیک یہ مہم ایک آسان کام تھا۔ رانی اپنے غرور۔ اپنی ذہانت اور ہمت پر اعتماد کے باعث اپنے ذاتی مشاغل میں محو رہی اور اس امر کو بالکل نظرانداز کردیا، کہ اس کا ہمسایہ اپنی شجاعت کا ثبوت اکثر مواقع پر پیش کرچکا ہے۔ یوں تو رانی ہمیشہ بیس ہزار سوار رکھتی تھی۔ لیکن اسکو دفعتاً یہ اطلاع کہ بادشاہ کی فوج دموہ اس کے ایک خاص شہر میں پہنچ گئی ہے اسوقت ملی جبکہ اس کی فوج درہم وبرہم تھی۔ صرف پانچسو آدمی اس کے پاس تھے۔ ادہر نے جس کے متعلق سارا انتظام تھا رانی کو ان واقعات کی اطلاع دی۔ رانی نے کہا "یہ سب تمھاری بیوقوفی کا نتیجہ ہے۔ میں ایک عرصہ سے اس ملک پر حکمراں ہوں اور میں نے کبھی کوئی کام اس طریقہ سے انجام نہیں دیا جو میری بے عزتی اور ناموسی کا سبب ہوتا۔ اب جیسا تم کہہ رہے ہو اگر بادشاہ خود موجود ہوتا تو میں اپنے تئیں اس کے حضور میں پیش کرتی لیکن اب سوائے جنگ کے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔"

رانی اس مقام سے چار پڑاؤ کے بعد شاہی فوج کے مدمقابل پہنچ گئی۔

آصف خاں نہایت سرعت کے ساتھ دموہ تک گیا لیکن وہاں اسنے توقف کردیا۔ یوں رانی کو موقع مل گیا اسنے چار ہزار آدمی اور جمع کرلئے۔ اسکے مصاحبین نے یہ مشورہ دیا کہ وہ کسی محفوظ جگہ میں قیام

کرے اور جنگ اسوقت شروع کرے جبکہ کچھ اور زیادہ فوج آجائے۔ رانی نے یہ صلاح پسند کی اور جنگلوں کے محفوظ مقاموں میں چلی گئی۔ پس آصف خاں اسکے حرکات وسکنات سے بالکل غافل ہوگیا۔ آصف خاں نے اس جگہ سے واپس آکر گڑھا کے ملک و دیار پر قبضہ کرلیا۔ اس اثنا میں پانچ ہزار آدمی اور جمع ہوگئے جب آصف خاں کو رانی کی نقل وحرکت کی اطلاع ہوئی، اسنے ایک فوج گڑھا میں چھوڑی اور بذات خود رانی کے مقابلہ کے لئے روانہ ہوا۔ جب یہ خبر رانی کو ملی اسنے اپنے آدمیوں سے کہا "تا بہ کے ہملوگ جنگلوں اور درختوں میں پناہ گزیں ہونگے"۔ اسنے جنگ کا مصمم ارادہ کرلیا اور ہاتھی پر سوار ہوکر اپنے لشکر میں پہنچی۔ اور سپاہیوں کو جنگ پر آمادہ کیا۔ جب دونوں فوجیں مقابلہ میں آئیں گھمسان کی لڑائی شروع ہوئی۔ تین سو مُغل شہید ہوئے اور رانی نے پس ماندگان کا تعقب کیا۔

دن کے اختتام پر رانی نے اپنے سرداروں سے دریافت کیا کہ کیا کرنا چاہئے۔ ہر ایک نے کچھ نہ کچھ صلاح دی خود رانی کا یہ خیال تھا کہ وہ اپنی جائے قیام پر واپس جاکر وہاں سے شبخون مارے یا صبح ہونے تک اسی مقام پر ٹھہری رہی اور پھر جنگ شروع کردے۔ کیونکہ اس کی خاموشی کی حالت میں آصف خاں پہاڑی پر قبضہ کرے گا اور اپنا توپخانہ وہاں لگادے گا۔ شبخون کا ارادہ کرکے اپنے کیمپ میں واپس گئی۔ لیکن دوسرے لوگوں نے نہ تو اسکی موافقت کی اور نہ کوئی دوسری ترکیب بتلائی۔ صبح ہوتے وہی ہوا جو اس کا خیال تھا۔ آصف خاں پہاڑ کی چوٹی پر تھا۔ قلعہ بندی کرکے معہ اپنی فوج کے اسمیں داخل ہوگیا رانی نے دوبارہ جنگ کا ارادہ کرکے اپنے سپاہیوں کو بلایا اور خود سب سے اچھے ہاتھی پر سوار ہوئی۔ ادہر کوجس کا اوپر ذکر آچکا ہے اپنے آگے ہاتھی پر بٹھایا۔ ایسی غضب کی جنگ ہوئی کہ طرفین بندوقیں اور تیر پھینک کر ایک دوسرے کی گردن پکڑ دست بدست لڑنے لگے۔

راجہ بیر شاہ (بیر نرائن۔ ابوالفضل) ولی عہد نے سب سے زیادہ شجاعت اور بہادری دکھلائی۔ پہر تک جنگ ہوتی رہی اور راجہ نے شاہی فوجوں کو تین بار مار بھگادیا لیکن آخر کار وہ زخمی ہوگیا۔ جب رانی کو ولیعہد کے زخمی ہونے کا علم ہوا تو اسنے اپنے معتمد نوکروں کو یہ ہدایت کی کہ وہ اسکو میدان جنگ سے کسی محفوظ مقام پر بسہولت اور آرام سے لیجائیں۔ خدام نے ایسا ہی کیا۔ جسوقت یہ واقعہ پیش آیا ایک کثیر تعداد فوج کی رانی کے پاس سے چلی گئی اور صرف تین سو آدمی باقی رہ گئے۔ وہ اس کا خیال نہ کرتے ہوئے اپنی جگہ پر اڑی رہی اور سپاہ کو ہمت دلاتی رہی۔ بالآخر شومئ قسمت سے ایک تیر اس کی پیشانی پر لگا

اسنے تیر بڑی دلیری سے نکالکر پھینک دیا لیکن تیر کا انکڑا زخم میں ٹوٹ کر رہ گیا۔ اسکے بعد ایک دوسرے تیر نے اس کی گردن زخمی کر دی جسکو بھی اسنے پہلے کی طرح نکال ڈالا۔ لیکن درد کی زیادتی سے اسپر غشی طاری ہونے لگی اور اسی وقت اسنے آدہر سے جو اسکے سامنے موجود تھا کہا "میں نے ہمیشہ تم پر ایسے ہی دن کے لئے اعتماد کیا ہو۔ پس میری شکست کی صورت میں تم یہ گوارا نہ کروگے کہ میں زندہ دشمنوں کے ہاتھ میں پڑ جاؤں"۔ آدہر میں اُس کی آخری تمنا پوری کرنے کی طاقت نہ تھی۔ پس اُسنے خود اپنا خنجر نکال لیا اور اپنی زندگی کا قصہ بہادرانہ موت سے تمام کر دیا۔ اسکے بہت سے معتمدین اور بہی خواہوں نے بھی اسی جگہ جان دے دی۔ مقدر کی یاوری اور بادشاہوں کے بادشاہ کی خوش نصیبی سے ایک ایسی فتح نصیب ہوئی جس کی شان و شوکت دوسری فتوحات سے بڑھ گئی۔ ایک ہزار ہاتھی اور بہت سامال غنیمت فاتحین کے ہاتھ لگا اور ایک وسیع ملک کا بادشاہ کی سلطنت میں اضافہ ہوگیا۔

آصف خاں دو ماہ کے بعد چوراگڈھ کی سمت روانہ ہوا۔ رانی کا لڑکا جو میدان جنگ سے وہاں بھیجدیا گیا تھا مقابلہ کے لئے نکلا مگر ایک مختصر مجادلہ کے بعد بادشاہ کی فوج قلعہ پر قابض ہوگئی۔ قلعہ کے اندر بہت سا سونا۔ قیمتی جواہرات۔ سونے اور چاندی کی طشتریاں اور دیوتاؤں کی مورتیں معہ دیگر بیش بہا سامان کے جسکو راجاؤں نے حسب دستور صدہا سال میں ذخیرہ کیا تھا پایا گیا۔ یہ سب اور ایک سو ایک کھانے کے برتن جو بڑے اور قیمتی سونے کے سکوں سے پُر تھے آصف خاں کے ہاتھ لگے۔ اس قابل امتیاز خدمت نے آصف خاں کے جاہ و حشم کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ ....

چوراگڈھ میں ایک عجیب غریب واقعہ پیش آیا۔ جب راجہ بیرشاہ کو قلعہ میں گھیر لیا گیا اسوقت چند آدمی اسپر معمور ہوئے کہ اگر خدانخواستہ شکست کا منہ دیکھنا پڑے تو ہند کے راجاؤں کا قدیم دستور جوہر کو انجام دیں۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنی عورتوں کو مکان میں بند کرتے ہیں اور اسکے چاروں طرف پیال۔ لکڑی، روئی اور گھی جمع کر کے ڈھیر میں آگ لگا دیتے ہیں۔ اور ان کو جلا دیتے ہیں۔ اور اس طریقہ کو وہ اپنی عزت کی حفاظت خیال کرتے ہیں۔ جب قلعہ قریب قریب سر ہوگیا۔ انھوں نے ایسا ہی کیا اور تمام خوبصورت عورتیں جلا کر خاک سیاہ کر دی گئیں۔ فتح کے بعد دوسرے روز جبکہ شعلے ٹھنڈے ہو گئے تو وہ جگہ دیکھی گئی اور دو عورتیں ایک لکڑی کے ڈھیر کے نیچے نکلیں۔ ان میں سے ایک رانی کی بہن اور دوسری راجہ کی بیوی تھی ان کو بلا کسی قسم کی تکلیف دئے شاہی حرم میں بھیجدیا گیا۔"

نقاب پوش

(جناب سید محمد معین رضا ایم اے)

مس سوہنی ہوشنگ آباد ضلع اسکول کی ایک نہایت حسین لڑکی تھی۔ وہ اب مڈل کلاس میں تھی۔ اس کی دلکش اور دل پذیر ادائیں ہر ایک کو مسخر کرنے کے لئے کافی تھیں۔ اُس کی سُریلی اور خوش آیند آواز نے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دئیے تھے۔ اسکول کی افسر مدرس کی یہ رائے تھی کہ اسکے دورِ ملازمت میں اتنی تیز فہم اور ذہین لڑکی کبھی اس کی نظر سے نہیں گذری۔ فن موسیقی کی اُستانی اس کی مدّاحی میں دم بھرتی لیکن سوہنی کی سی پاکیزہ ہستی کو اپنی رنگینئ شباب اور دل فریب اداؤں پر مطلق ناز نہ تھا۔

مسٹر ورما ایک نوجوان شخص تھا اُن کی نظر اس دلفریب مہ پارہ پر بیشتر پڑ چکی تھی اور وہ اکثر اسکو دیکھ کر گھنٹوں حیرت میں رہجاتا۔

ایک روز چاندنی رات تھی۔ دھیمی دھیمی ہوا چل رہی تھی مس سوہنی تنہا ٹہل رہی تھی، وہ کچھ اُداس تھی۔ اس کے دل میں خیالات کا ہجوم تھا۔ اتنے میں مسٹر ورما کا ادہر گذر ہوا۔ شب مہتاب۔ محبّت سے لبریز دل، اس منظر نے عشاق کے دلوں میں ایک عجیب منظر پیدا کر دیا تھا۔ خدا معلوم نظروں نظروں میں کیا راز و نیاز کی باتیں ہوگئیں کہ اس واقعہ کے بعد ہفتہ کے اندر ہی اندر دونوں محبت سے بے قرار ہونے لگے۔ لیکن یہ پُر لطف صحبتیں فلک کجرفتار نے دیر پا نہ رہنے دیں کہ مسٹر ورما کو یکایک کارزارِ عراق عرب میں مُہم پر جانا پڑا۔ محبّت کا نشہ کافور ہوگیا اور اب خوابِ خیال میں لڑائی کے سیاہ بادل اُمنڈتے ہوئے نظر آنے لگے۔

مس سوہنی معمول سے زائد تعلیم میں منہمک رہنے لگی لیکن پریشان کُن خیالات نے شب کی نیند حرام کر رکھی تھی مسلسل بے خوابی نے اسکو بالکل کمزور بنا دیا تھا۔ ایک دن جب وہ خواب راحت میں مصروف تھی اسنے پچھلے پہر خواب میں دیکھا کہ ایک قوی ہیکل دیو نے اسکو پکڑ کر دھمکایا کہ اگر وہ ورما سے محبّت کرنا ترک نہیں کریگی

تو وہ دہکتے ہوئے انگاروں میں زندہ جلادی جائے گی۔ معًا زور سے اس کی چیخ کی آواز نکل گئی اور ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کہ وہ سُرخ انگاروں میں کھنچی جا رہی ہے اور پھر یکایک بیہوش ہو گئی۔ جب وہ بیدار ہوئی تو اسنے اپنے کمرہ کو دھواں دھار دیکھا اور "آگ، آگ" کے چلانے کی آوازوں نے سارے گھر کو سر پر اُٹھا لیا تھا۔ فوراً وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اسنے دیکھا کہ واقعی تمام گھر آگ سے سُلگ رہا ہے۔ صرف زینہ اور نیچے کا حصہ ابھی محفوظ تھا۔ کمرہ کے سامنے کے برآمدہ سے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ ہوا تیزی سے چل رہی تھی جسنے شعلوں کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ چند منٹ میں آگ کمرہ میں لگ جائے گی اور دیو کا دھمکانا اصلیت ہو جائیگا اور وہ آگ سے زندہ جلکر خاکستر ہو جائیگی صرف ایک طریقہ آگ سے محفوظ رہنے کا اختیار میں رہ گیا تھا اور وہ یہ کہ سُرخ شعلوں کو چیرتی پھاڑتی ہوئی نکلکر زینہ تک پہنچ جائے۔ لڑکیاں دُور پر کھڑی چلّا چلّا کر اسکو بلا رہی تھیں۔ گھر میں مرد کے نام سے صرف ایک چوکیدار تھا مگر وہ آگ بجھانے والے انجن کی اطلاع کو گیا ہوا تھا لڑکیوں میں کسی کی اتنی ہمّت نہیں تھی کہ وہ اسکو بچانے آتی۔ بالآخر وہ خود ہمت کر کے شعلوں کے درمیان سے نکلتی ہوئی برآمدہ کے اس پار جست کر گئی۔ اُس کا چہرہ جھُلس گیا تھا اور باقی بدن محفوظ تھا مگر اس کو سخت صدمہ تھا اور وہ دیر تک بیہوش پڑی رہی۔ اسکے علاج کے واسطے اُسکو اسپتال میں داخل کرا دیا گیا وہاں وہ متواتر ایک ماہ زیرِ علاج رہی۔ اسکے چہرہ پر جرّاحی پٹّی باندھی گئی تھی۔ جب وہ صحتیاب ہوئی تو اسنے ایک دن اپنا چہرہ آئینہ میں دیکھا اسکو انتہائی صدمہ ہوا کیونکہ وہ چاند کے مانند چمکتا چہرا جسنے کہ ہوشنگ آباد کے بہت سے نوجوانوں کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا اب اسمیں سیاہ داغ پڑ گئے تھے اسنے اپنے چہرہ پر نقاب ڈال لیا اور قسم کھائی کہ وہ تمام عمر چہرہ کو نقاب پوش رکھے گی اور بقیہ عمر خلقِ خدا کو آسائش پہنچانے میں گذاریگی اور بس یہی اب اس کا مطمحِ نظر تھا۔

بصرہ کے اسپتال میں مسٹر ورما مریض بنا ہوا لیٹا ہے۔ آنکھوں میں اس کے زخم ہے اسنے لڑائی پر بہادری کے کارنامے انجام دیئے تھے اسکے صلے میں اس کو بہت سے اسناد ملے اور کپتان کے عہدۂ جلیلہ پر فائز کیا گیا تھا۔ بدقسمتی سے ایک چھوٹی سی مہم میں جھُلستی ہوئی بارود نے اس کی بینائی کو خراب کر دیا تھا، ہر ایک کو اس کے اُس واقعہ سے ہمدردی تھی۔ آج خلافِ معمول اس کی نرس تبدیل تھی۔ یہ ایک نقاب پوش نرس تھی جو عملہ بھر میں بہت زیادہ مستعد اور اپنے کام میں ہوشیار سمجھی جاتی تھی۔ لیکن یہ ایک عجیب واقعہ پیش آیا کہ جوں ہی وہ مریض کے کمرہ میں داخل ہوئی معًا اس کی چیخ نکل گئی، کپتان ورما اپنے

بستر سے چونک پڑے اور بیہوش نرس کی جانب بہ مشکل تمام اپنی آنکھوں میں پٹی باندھے لپک پڑے۔ کپتان نے اپنے ہاتھ میں اسکے ملائم ملائم ہاتھ لے کر یوں مخاطب ہوا۔ محبت کی دیوی۔ تم یہاں کیسے؟ ادہر مس سوہنی کے گرم گرم آنسو چھن چھن کر کپتان ورما کے ہاتھ گر رہے تھے۔ ایک منٹ کے وقفہ کے بعد اس نے پھر کہا پیاری سوہنی کیا تم مجھ ایسے اندھے سے محبت قائم رکھوگی۔ مس سوہنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی "بیشک کیوں نہیں؟ محبت دل کے گہرے گھر میں بستی ہے نہ کہ محض زبان پر، پیارے زندہ دل رہنا چاہئے ہم تم ہمیشہ خوش و خرم رہینگے"۔

کپتان ورما بہت جلد صحتیاب ہو کر اپنے وطن واپس آیا اور اسکو بیماری کی پنشن ملنے لگی۔ کلکتہ میں پہنچکر دونوں کی بہت تزک و احتشام کے ساتھ شادی ہوئی۔ یہ شادی بھی عجیب قسم کی تھی۔ دولہن کا چہرہ سیاہ نقاب سے ملبوس تھا۔ دولھا کی آنکھوں پر گہرے رنگ کی سیاہ عینک قرین تھی۔ کپتان ورما نابینا ہونے کی وجہ سے نقاب کے راز سے کچھ واقفیت نہ رکھتا تھا۔

ڈاکٹر اشرف کلکتہ کا مشہور معالج چشم کمرہ میں مریضوں کی دیکھ بھال میں منہمک تھے یکا یک ان کی نظر ایک نقاب پوش خوبصورت لڑکی پر پڑی جو کہ کمرہ میں نہایت شائستگی کے ساتھ ایک کونے میں کھڑی ڈاکٹر صاحب کی منتظر تھی۔ اسنے فوراً اس کو بلا کر اس سے دریافت کیا کہ آپکی آنکھوں میں کیا خرابی ہے۔ اسنے کہا جناب میری آنکھ میں کچھ نقص نہیں ہے لیکن میں اپنے خاوند کی آنکھوں کے متعلق کچھ مشورہ لینا چاہتی ہوں۔ جو شاید کل آپکے پاس حاضر ہوئے تھے، کپتان ورما ان کو کہتے ہیں۔ ڈاکٹر جی ہاں ضرور مجھے یاد ہے کہ کل اس نام کے کوئی صاحب آئے تھے مس صاحبہ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کی بینائی اب نہیں آسکتی۔ سوہنی نے دریافت کیا، کیا بالکل ناممکن ہے۔ ایک گہری سانس لی۔ خدا کا شکر بھیجا اور خدا حافظ کہہ کر چلنے کو تھی اسنے اپنا چھاتا اٹھایا اور پھر بیٹھ گئی۔ ڈاکٹر نے کہا البتہ تھوڑی سی امید کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ اس طرح سے ممکن ہے کہ شملہ پہاڑ پر ایک فرانسیسی ڈاکٹر ہیں جو کہ حال میں ہندوستان تشریف لائے ہیں ان کو لڑائی کے اسپتال کا بہت وسیع تجربہ ہے اور بارود سے کھوئی ہوئی بینائی کا بہت علاج کر چکے ہیں۔ بہت سے مریضوں نے انکے علاج سے شفا پائی ہے۔ آپکے صاحب انکے علاج کو اور آزما دیکھیں۔

مسز ورما تھوڑی دیر بیٹھی رہی اس کا چہرہ نقاب پوش تھا لہذا ڈاکٹر اسکے چہرے سے کچھ پتہ نہ لگا سکے

مسز ورما نے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کچھ دیر کامل سکوت کے بعد وہ وہاں سے چل دی۔ ڈاکٹر نے اپنے دل میں کہا یہ کیونکر اپنے کو وفادار بیوی کہتی ہے وہ اپنے خاوند کی نابینا حالت پر بجائے اظہار تاسف کے بشاش نظر آتی ہے اور اپنی بشاشت کو نہ ظاہر کرنے کی وجہ سے برقعہ سے منہ چھپائے ہوئے ہے۔ مسز ورما با دل ناخواستہ مضمحل گھر کو واپس آئی۔ دل میں یہ خیال کرتی جاتی تھی کہ اگر اسکے خاوند کی بینائی عود کر آئی اور اسنے اس کے چہرہ کو دیکھا تو پھر کیسی ہوگی۔ اس خیال سے وہ ٹھٹھری اور اسنے پھر کچھ غور کیا کہ محبت کی گرمجوشی جو کہ اس کی زندگی کے وجود کا باعث ہے کافور کے مانند ہوا ہو جائیگی جس طرح سے کہر طلوع آفتاب سے غائب ہو جاتا ہے۔ اسنے یکایک اپنے خیالات کو تبدیل کیا اور وہ فوراً مسٹر ورما کے پاس پہنچی جو کہ رنجیدہ آرام کرسی پر دراز تھے۔ کیا محبت کے معنی قربانی کے نہیں ہیں۔ وہ ضرور اپنی زندگی کو اپنے شوہر کی زندگی کی خوشنودی پر قربان کرے گی۔

دوسرے دن مسٹر اور مسز ورما شملہ پہنچے اور وہاں پر فرانسیسی ماہر سے مشورہ کیا۔ اسنے بہت کچھ امید دلا کر اس کی آنکھ میں نشتر دیا۔ پٹی کے کھولنے سے ایک یوم قبل ڈاکٹر نے اس سے ضابطے سے کہا کہ اس کو یقین کامل ہے کہ اسکے شوہر کی بینائی عود کر آئی ہے۔ کپتان کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا لیکن مسز ورما کا چہرہ کچھ مضمحل سا ہو گیا تھا۔ کپتان ورما سہارا دیکر اٹھے اور خوشی خوشی بولے "پیاری کل میں اس قابل ہو جاؤں گا کہ ایک مرتبہ پھر تمہارا دلکش چہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر دل کی آرزوؤں کو سیراب کروں گا۔ سوہنی بت بنی کھڑی رہی، کپتان نے بڑھ کر اسکے چہرہ کو بوسہ دیا۔ سوہنی کی آنکھ سے گرم گرم آنسو جاری ہو کر کپتان کے ہاتھ پر گر رہے تھے یہ اسکی محبت کا جواب تھا۔ کپتان نے خیال کیا کہ یہ آنسو جوش مسرت کے آنسو ہیں۔ دوسرے دن کپتان کی پٹی کھولی گئی اور دنیا کو دوبارہ اور پرلطف نیرنگیوں سے معمور دیکھا، وہ فرط مسرت سے چلا پڑا اور اسکی بیتاب نگاہیں سوہنی کی ملاقات کے لئے ڈھونڈھ رہی تھیں لیکن وہاں پر سوہنی کا پتہ نہ تھا۔ اسنے ہر چند تلاش کیا نوکر چاکر اس کی تلاش میں دوڑائے گئے لیکن شملہ میں اس کا وجود نہ ملا۔ شکستہ دل اور بدحواس اسی دن ناچار وہ کلکتہ آیا دنیا اسکے سامنے اب اندھیر تھی۔ ڈاکٹر اشرف سے ملا اسنے کل واقعات شملہ سے روانگی کے قبل کے بیان کئے۔ سننے اسکے سیاہ نقاب کا بھی تذکرہ کیا اور رازداری کے متعلق اپنا شبہہ ظاہر کیا لیکن کپتان ورما کو اپنی بیوی کی وفاداری میں قطعی شبہہ نہ تھا۔ ڈاکٹر اشرف کو بھی اس واقعہ سے بہت دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اسنے اسکی تلاش

میں پولیس کی معیت کوشش کی۔ پولیس نے اس قدر پتہ دیا کہ دو تین روز ہوئے ایک عورت نقاب پوش کچھ دن ڈیرنگ روم میں قیام کرکے ہوشنگ آباد کی گاڑی سے روانہ ہوگئی۔ ڈاکٹر اشرف اسی شام ہوشنگ آباد پہنچے اور سیدھے ضلع اسکول گئے۔ وہاں کے افسر مدرس سے سوہنی کے متعلق بات چیت رہی اور اس اصلیت کا بھی پتہ لگایا کہ سوہنی کی پریشانی اور یکایک غائب ہوجانے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔ سوہنی اسکول میں فن موسیقی کی استانی کی امیدوار تھی۔ ڈاکٹر اشرف نے کپتان ورما کو تار دیکر بلوایا۔ دوسرے ہی صبح کپتان ورما نسواں اسکول میں موجود تھا۔ وہ بدحواس تھا اسنے کہا سوہنی کو اس کی طرف محبت کی دیرپائی کا کیوں یقین نہ تھا؟ جو محبت محض خوبصورتی تک محدود رہتی ہے وہ البتہ دیرپا نہیں ہوتی۔ سوہنی کے کمرے کو کھٹکھٹایا۔ اسنے جوں ہی کمرہ کھولا اس کی نظر کپتان ورما پر پڑی وہ بے ساختہ چیخ پڑی اور گر پڑی۔ اسنے اپنے سیاہ برقعہ کو مضبوطی سے دونوں ہاتھوں سے پکڑلیا۔ کپتان ورما نے بغلگیر ہوکر اسکے نقاب کو الٹ دیا اور ....

.... اور یوں مخاطب ہوا "محبت کی دیوی۔ اب بھلا مجھ سے بچکر کہاں جاؤگی۔ ہمارا تمہارا ساتھ اب عمر بھر رہے گا"۔ اسنے معصومیت سے دریافت کیا کہ آپ سوختہ چہرے سے محبت کرنا پسند کرینگے۔ "بے شک، کیوں نہیں؟ کیا تم نے نہیں کہا تھا کہ محبت دل کی گہرائی میں رہتی ہے۔ محبت کی اڑان صرف زبان تک محدود نہیں رہتی ہے"۔ یہ جواب تھا اسکے سوال کا اور بس۔

غالبؔ کا ایک غیر مطبوعہ خط

مکرمی، محترمی - سلام مسنون -

حسن اتفاق سے غالب مغفور کا ایک غیر مطبوعہ خط مجھ کو مل گیا جسمیں حروف تہجی کی تذکیر و تانیث پر بحث کی ہے - ناظرین ادب کی ضیافت طبع کے واسطے اسکی نقل درج ذیل کرتا ہوں شائع فرما کر ممنون فرمائیے -

نیازمند

سید فرخ حیدر (بی - اے - ال - ال - بی - (علیگ)
از شمس آباد - ضلع فتح گڈھ

سعادت و اقبال نشان مرزا یوسف علی خاں کو بعد دعا کے دلنشین ہو کہ تانیث و تذکیر ہرگز متفق علیہ جمہور نہیں - لے لو لفظ اس ملک کے لوگوں کے نزدیک مذکر ہے - اہل پورب اس کو مونث بولتے ہیں - خیر، جو میری زبان پر ہے وہ میں لکھ دیتا ہوں - اس باب میں کسی کا کلام حجت اور برہان نہیں ہے - ایک گروہ نے کچھ مان لیا، ایک جماعت نے کچھ جان لیا - اسکا قاعدہ منضبط نہیں - الف مذکر - بے تے ثے مونث - جیم مذکر - حے خے مونث - دال ذال مونث - رے زے مونث - سین شین مذکر - صاد ضاد طا ظا مونث - عین غین مذکر - فے مونث - قاف کاف لام میم نون مذکر - واؤ ہ یے مونث - ہمزہ مذکر - لام الف حروف مفردہ میں ہیں مگر بولنے میں مذکر بولا جائیگا - مثلاً لام الف کیا خوب لکھا ہے کہیں گے - کیا خوب لکھی ہے نہ کہیں گے - خزادہ خداوندزادہ کا مخفف ہے - لیکن فارسی نہیں عربی نہیں اردو کا روزمرہ تھا خزادہ اور خزادی مرادف صاحبزادہ و صاحبزادی ہے - مگر فی زماننا متروک ہے - فق فارسی لغت نہیں ہو سکتا - عربی بھی نہیں - روزمرہ اردو ہے جیسا کہ میر حسن کہتا ہے ؎ کہ رستم جسے دیکھ رہ جائے فق :: شعرائے حال کے کلام میں نظر نہیں آیا -

تکیہ لفظ عربی الاصل ہے فارسی و اُردو میں مستعمل دونوں زبانوں میں ہم معنی بالش اور ہم بمعنی مکان فقیر آتا ہے - ایران میں تکیہ میرزا صائب مشہور ہے - گل تکیہ لفظ مرکب ہے - ہندی اور فارسی سے گل مخفف گال کا - اور تکیہ بمعنی بالش وہ چھوٹا گول تکیہ جو رخسار کے تلے رکھیں گل تکیہ کہلاتا ہے گل بمعنی پھانسی (غالبا Gall ows سے مراد ہوگی) انگریزی لغت ہے - انگریزی زبان سے بنگالہ میں سو برس سے اور دلی اکبرآباد میں ساٹھ برس سے رواج پایا ہے - گل تکیہ وضع کیا ہوا نورجہان بیگم کا ہے - جہانگیر کے عہد میں اہل ہند کیا جانتے تھے کہ گل کیا چیز ہے - معنی مفرد بہ لفظ جمع اس جملہ کو میں اچھی طرح نہیں سمجھا معنی مفرد معانی جمع اور یہ جو اردو کے محاورے میں تقریر کرتے ہیں کہ اس شعر کے معنے کیا ہیں یا اس شعر کے معنے کیا خوب ہیں - اس میں دخل نہیں کیا جاتا - خاص و عام کی زبان پر یوں ہی ہے معانی کی جگہ معنے بولتے ہیں - رتھ لفظ ہندی الاصل ہے بہ ہائے مضمرہ - بعض مذکر بولتے ہیں بعض مونث ۱۲ شعر بہت اچھا ہے صاف و ہموار -

راقم غالب ۱۲

نوٹ :- خط میں کوئی تاریخ نہیں لکھی ہے - خطوط وحواشی میرے ہیں - (سید فرخ حیدر)

سروش لاہور کا سالنامہ

پنجابی رسائل میں سروش ایک پیارا رسالہ ہے جو تعلیم یافتہ اصحاب کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے - ابکی اس کا سالنامہ بہت خوب ہے - پنجابی رسائل کے سالنامے اور روزنامے علی العموم ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں دیکھکر دعا کرنا پڑتی ہے کہ خدا نظر بد سے بچائے - نہ یہ کہ خاص طور سے دیدہ زیب رنگین بنایا جائے - آپ جانئے اسے دیکھکر محو حیرت ہو جانا پڑتا ہے مشتاق حضرات ضرور ہیں منگوا کر ضرور ملاحظہ فرمائیں مگر اسکی لطافتوں میں محو ہو کر غریب ادب کو نہ بھول جائیں !

"اعظم"

ریختی

(جناب محمد عباس صاحب بی۔ اے میرٹھی)

ریختی کے معنی

فی زمانہ ریختی کا لفظ مذاقِ سلیم پر گراں گذرتا ہے آج وہ زمانہ ہو کہ ریختی اور فحش مترادف خیال کئے جاتے ہیں اور میرا اس موضوع پر قلم اٹھانا بھی عام نظروں میں مستحسن نہ خیال کیا جائے گا گو دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگوں کی حاشیہ آرائیوں سے اصل حقیقت روپوش ہو جاتی ہو وہی سلوک ریختی کے ساتھ ہوا۔ نا اہلوں کے ہاتھ اس کی وہ مٹی خراب ہوئی کہ آج ہم اور آپ اُس کا نام سننے کے روادار نہیں ہو اور اصل حقیقت ہماری نظروں سے روپوش ہوتی چلی جاتی ہو۔

شعر الہند میں ریختی کو "غزل ہی کی ایک بگڑی ہوئی شکل" کہا گیا ہو مسٹر رام بابو سکسینہ نے بھی اس کی ایجاد کی بنیاد ہوسناکی اور شہوت پرستی بتائی ہو لیکن دونوں باتیں حقیقت سے بہت بعید ہیں ہر شخص جانتا ہے کہ ٹکسالی زبان مستورات کی زبان سمجھی جاتی ہو اور زبان کا بہترین تحفظ محلات ہی میں ہو سکتا ہو مرد ذات ہر قسم کے آدمی سے ملتا ہو اپنی زبان کا اثر اور لوگوں پر ڈالتا ہو اُن کی زبان اور گفتگو کا اثر اُس کی زبان پر قبضہ پاتا ہے اور زبان کی روک تھام مشکل ہو جاتی ہو۔ میر تقی میر کے متعلق مشہور ہو کہ "جب لکھنو چلے تو گاڑی کا کرایہ بھی پاس نہ تھا ناچار ایک شخص کے ساتھ شریک ہو گئے اور دلی کو خدا حافظ کہا تھوڑی دور آگے چل کر اُس شخص نے کچھ بات کی یہ اُس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے تھوڑی دیر بعد پھر اُسنے بات کہی میر صاحب چیں بجبیں ہو کر بولے کہ صاحب قبلہ آپنے کرایہ دیا ہے بیشک گاڑی میں بیٹھے مگر باتوں سے کیا تعلق اُسنے کہا حضرت کیا مضائقہ ہو راہ کا شغل ہو باتوں میں جی بہلتا ہو میر صاحب بگڑ کر بولے خیر آپ کا شغل ہو میری زبان خراب ہوتی ہو۔"

واقعہ صحیح ہو یا غلط مگر یہ ضرور ظاہر ہو جاتا ہو کہ زبان کا تحفظ کس قدر مشکل ہو شرفا کے یہاں مستورات نہیں کہ عام لوگوں کی عورتوں کی آمد و رفت اُنکے گھروں میں ہو سکے اسی لئے عورتوں کی زبان محفوظ رہجاتی ہو اور وہی ٹکسالی زبان ہوتی ہو اُردو شاعری فارسی کی ممنون احسان ہو بلکہ یوں سمجھئے کہ اُردو میں ابتدا جو کچھ بھی تھا

وہ فارسی سے مستعار تھا یا اس کی نقل۔ زبان بھی بیشتر فارسی میں رنگی رہی۔

دورِ اول کی شاعری میں ہندی کے الفاظ خال خال نظر آتے ہیں فارسی عربی لغت کی بہتات ہے اسی ایرانی اثر کے ماتحت اظہارِ تعشق مرد سے مرد کی جانب رہا اظہارِ تعشق کے تین طریقے رائج ہیں اول مرد سے عورت کی طرف یہ عربوں کے لئے مخصوص ہے۔ دوسرا۔ عورت سے مرد کی جانب یہ خالص ہندی ہے۔ تیسرا۔ مرد سے مرد کی جانب جو سب سے زیادہ خلافِ فطرت ہے اور سب سے زیادہ رقبہ پر حاوی نظر آتا ہے (ممکن ہے کہ اسمیں فطرت انسانی کا یہ دخل ہو کہ ممنوعہ شے کی طرف زیادہ مائل ہوتی ہے)

ایران ترکستان وغیرہ اب اس غلبہ سے مغلوب نظر آتے ہیں اسی کا اثر اردو شاعری نے بھی قبول کیا۔

غرض اس طور پر اردو شاعری بھی فارسی شاعری بنکر رہ گئی تھی کہ ہندوستان کی جدت پسند طبیعتوں نے ایک ایسی چیز ایجاد کی جو جذبات کے لحاظ سے اپنی سرزمین کی پیداوار اور زبان کے لحاظ سے خالص اردو اس کا نام ریختی رکھا

یہ لفظ جیسا کہ ظاہر ہے ریختہ سے نکلا ہے جو اردو بیچاری کا لقب ہے اگرچہ یہ نام تحقیر کن ہے مگر پھر بھی یہ تو ہے ہی ریختی اسی ریختہ کا صیغہ تانیث سمجھ لیجئے اور حقیقتاً اس صنف شاعری کی جس میں دوہری نسائیت موجود تھی (ایک باعتبار جذبات دوم باعتبار زبان) اس سے بہتر اور کیا نام ہو سکتا تھا۔ ریختی کا اظہار عشق عورت کی طرف سے مرد کی طرف قرار پایا جو اعلیٰ ترین عشق ہے کیونکہ محبت کی اہلیت عورت میں مرد سے زیادہ ہے۔ زبان ریختی کی عورتوں کی زبان رہی جو بہترین زبان ہے۔

ریختی میں فحشیات

زبان یا جذبات کے لحاظ سے ریختی بہترین صورت رکھتی تھی لیکن لوگوں نے اس کی آڑ میں عجب گل کھلائے اور اُن کی وہ دُرگت بنائی کہ غریب ساری برادری میں بدنام ہوگئی اسی انگشت نمائی کا انجام یہ ہوا کہ آج کوئی اسے اپنے گھر رکھنے کا روادار نہیں ہوتا مجھے تو اس کی زیست کا بھی علم نہ ہوتا مگر اتفاقاً ایک جگہ سامنا ہو گیا (جس کا ذکر آگے آئے گا) انسان میں فطرتاً ظاہری نمائش کا مادہ زیادہ ہوتا ہے لوگ عموماً ظاہری شان و شوکت پر مٹتے ہیں جوہرِ اصلی کے پرکھنے والے کم ہوتے ہیں لوگوں نے بھی ریختی کے ظاہری لباس اور بناؤ سنگار (زبان) پر توجہ کی اور اسکے اصلی جوہر (جذبات) کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ ہر بات کی حد ہوتی ہے۔ عورتوں کی زبان آخر پھر بھی محدود تھی ان بیچاروں کے اپنے گنے محاورات اور اصطلاحیں کہاں تک ساتھ دیتیں۔ آخر اصطلاحات و محاورات سے آگے بڑھے اور اُن کے سربستہ رازوں پر دست درازی ہونے لگی جو مردانی محفل میں باعث شرم خیال کئے جاتے تھے۔ ہماری زبان کے بیسیوں الفاظ ایسے ہیں جو ہم اپنی

جس طرح مردوں کے ہاں بعض الفاظ ایسے ہیں جو شرمناک خیال کئے جاتے ہیں اور مستورات کے سامنے کبھی نہ کہینگے اسی طرح عورتوں کے بھی مخصوص الفاظ ہیں جو مردوں کی محفل میں شرمناک خیال کئے جاتے ہیں مگر ان ریختی گویوں نے اس کا مطلق خیال نہ کیا اور زنانی اصطلاحات پر خوب چھاپہ مارا اتفاق سے جن لوگوں نے ریختی لکھنی شروع کی اُن کا مشرب بھی کچھ اچھا نہ تھا اور کوئی خالص مرد ریختی لکھ بھی کیوں کر سکتا تھا عورتوں کی زبان وہی سمجھ سکتا ہے جو عورتوں میں بیٹھے یہ شرفا کا دستور نہیں لہذا یہ غریب بچوں کے پلّے پڑی جنھیں کسی کی بے آبروئی کرنے میں ذرا باک نہ تھا۔ شرفا نے جو اس کی ایسی صحبت دیکھی کنارہ کشی اختیار کر لی ان کی محفل میں اس کا نام باعث ننگ سمجھا جانے لگا تب اس کا رواج جاتا رہا جو اکّے دُکّے کہنے والے تھے وہ چوری چھپے کہا کرتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ بیچاری کا سہاگ جوان ہونے سے پہلے لُٹ گیا یہ اس بیچاری کے حق میں اور بُرا ہوا۔ شرفا نے منہ لگایا مگر جوان جہاں عورت اور پھر وہ بھی جس کے دیدے کا پانی ڈھل چکا ہو کہاں تک صبر کئے بیٹھی رہتی نکل کھڑی ہوئی اور بُری بُری صحبتوں میں پہنچی جنھوں نے اس کا خاتمہ ہی کر ڈالا۔

ریختی کی ایجاد کچھ دنوں پہلے جون ۱۹۲۸ء کے نگار میں جناب آرگس نے اپنے مضمون "تذکرہ آبحیات پر ایک ناقدانہ نظر" کے ضمن میں ریختی کی ایجاد پر بھی تھوڑی سی روشنی ڈالی ہے حقیقتاً یہ ایسا مسئلہ ہے کہ جس پر مختلف رائیں ہیں اور پیچیدگی سے خالی نہیں ہم بھی اپنی بحث کی بنیاد جناب آرگس ہی کے مضمون پر قائم کرتے ہیں اس سے حقیقت واضح ہونے میں ذرا آسانی ہوگی۔ جناب آرگس فرماتے ہیں:۔

"ریختی کا شوخ رنگ سعادت یار خاں رنگین کا ایجاد ہے مگر سید انشا کی طبع رنگیں نے بھی موجد کم سگھڑاپا نہیں دکھایا ہے" (یہ آزاد کے الفاظ ہیں آب حیات صفحہ ۲۵۹) آزاد کی اس رائے میں بھی بڑا کلام ہے رنگین کو ریختی کا موجد کہنا آزاد ہی کی ایجاد ہے ورنہ اصل واقعہ نہیں ہے "خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم" میں ریختی کے متعلق یہ عبارت ہے کہ بعض کے نزدیک اس کا مخترع رحیم معاصر رحمان دہلوی ہے جس کے یہ دو شعر ہیں ؎

اے ناداں تیں اپنے سجن کو کیوں رُٹھایا ہے ۔۔۔ رُٹھا کر پیو کو جگ میں کسی نے ذوق پایا ہے
بہت پچھتائے گی میری نصیحت مان کہتی ہوں ۔۔۔ سکھی کو رات سوئی ہے پیارے کو جو بھایا ہے

تذکرہ شعرائے دکن میر آصفی ملکاپوری نیز تذکرہ دکن میں اردو وغیرہ میں ہاشمی بیجاپوری کے جو انشا اور رنگین سے صدیوں پہلے کے شاعر ہیں یہ دو شعر لکھے ہیں ؎

رضا گر مجھ کو دیتی ہو کروں گی گھر میں جا داؤ ۔۔۔ اگر مجھ ہو دیگی فرصت سحر پھر آ دنگی چھوڑ دو
اگر کوئی آکے دیکھے گا تو کیا دل میں کہیگا وہ ۔۔۔ مجھے بدنام کیا کرتے نہیں میں جا دنگی چھوڑ دو

صابر اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ دیوان دوم کے دیباچہ میں رنگین نے ریختی کو اپنا ایجاد بیان کیا ہے راقم کے عندیہ میں تو ادعائے محض ہے"

جناب آرگس کے طعن و تشنیع اور اُن کے مقصد سے ہمیں یہاں بحث کرنا نہیں ہے ہم صرف اُن کی تحقیق پر اپنی تحقیق کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے بیان کی تائید میں تین شہادتیں پیش کرتے ہیں اوّل "خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم" دوم تذکرہ "شعرائے دکن" اور تذکرہ "دکن میں اردو" تیسرے مرزا قادر بخش صابر کا تذکرہ گلستان سخن۔

اوّل "خزینۃ العلوم فی متعلقات المنظوم" کو لیجئے۔

جناب آرگس کی متذکرہ بالا نقل شدہ عبارت کے بعد اس تذکرے کے مصنف نے اپنی رائے لکھی ہے کہ میرے نزدیک اس طریقے کے بانی بھی خسرو ہی تھے اور اس فعل کا شاہد خود ان کا کلام معجز نظام ہے۔ ع

سکھی پیا کو جو میں دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری تیاں"

اب خواہ آپ اسکو مصنف کی اپنی رائے تصور کریں یا اس کا جذبۂ خسرو پرستی مگر یہ حقیقت سے بعید ہے امیر خسرو اور دیگر قدما کے اس قسم کے اشعار ریختی نہ تھے بلکہ محض ہندی شاعری کے طرز پر لکھے گئے تھے جس میں عورت عاشق اور مرد معشوق قرار دیا گیا تھا خسرو کے اسی قسم کے صدہا اشعار زبان زد خلائق ہیں انھوں نے تو ہندی کی بحریں تک استعمال کی ہیں۔ اُن کی پہیلیاں۔ کہہ مکرنیاں۔ دوسخنے۔ ان کی ہندی پر شیفتگی ظاہر کرتے ہیں ان کی تصنیف خالق باری کو دیکھ لو حقیقت روشن ہو جائیگی۔

اسی ضمن میں جناب آرگس کی دوسری شہادت بھی طے ہو جاتی ہے یہ قدما کے اشعار محض ہندی شاعری کے طرز و روش پر لکھے گئے ہیں چنانچہ ہمکو کہیں ریختی کا لفظ انکے لئے نہیں ملتا۔

جناب آرگس کے علاوہ مولنا سید عبدالحی صاحب مرحوم نے بھی گل رعنا میں یہی غلطی کی تھی۔ مولنا مرحوم ہاشمی بیجاپوری کے متذکرہ بالا دو شعر لکھنے کے بعد فرماتے ہیں "مولنا ہاشمی کے بعد سید محمد قادر ایک باکمال شاعر گذرے ہیں جو غالباً دلی کے رہنے والے تھے ان کا تخلص خیالی تھا اور ریختی کا مکمل دیوان ۱۱۲۲ھ کا لکھا ہوا مولنا حبیب الرحمن خاں شروانی کے کتب خانہ میں موجود ہے جس میں ایک دو ریختیاں لکھی ہیں جو ہندی شاعری کا نمونہ ہیں"۔ مگر حقیقتاً مولنا کا صرف آخری جملہ صحیح ہے کہ یہ اشعار ہندی شاعری کا نمونہ ہیں ان کو ریختی کسی طرح نہیں کہا جا سکتا۔ فارسی الفاظ اور تراکیب کی بہتات اس کا بین ثبوت ہے۔ ریختی میں اگر آپ کو

فارسی ترکیبیں کہیں ملیں گی مگر ان قدما کے اشعار میں ان کی کثرت ہے۔ انکے علاوہ بھاشا کے الفاظ۔ خالص ٹکسالی اُردو جو بیگمات کی زبان اور ریختی کی جان ہے کہیں نہیں ملتی۔ گویا متقدمین کے ان اشعار میں اور ریختی میں صرف ایک بات مشترک ہے یعنی عاشق عورت ہے اور معشوق مرد لیکن اگر صرف یہ بات متقدمین کو ریختی کا موجد ٹھہرا سکتی ہے تو پھر اسکی ایجاد کا سلسلہ عبد سے نکلکر معبود تک پہنچ جائے گا۔ قرآن شریف میں حسن و عشق کا تذکرہ کیا گیا ہے اس میں بھی عاشق عورت ہے اور معشوق مرد یعنی زلیخا اور یوسف .... تو کیا ریختی کے موجد خود اللہ میاں ہیں .... ریختی اور متقدمین کے متذکرہ بالا اشعار میں جو بات فرق ظاہر کرتی ہے وہ زبان اور مضمون ہے۔ متقدمین نے ان اشعار میں بھاشا استعمال کرنی چاہی ہے۔ کہ اپنے یہاں کی عورتوں کی زبان جو ریختی کی جان ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ بھاشا بھی انھوں نے کوشش کرکے استعمال کی ہے ورنہ ان کی مستورات اس زبان سے یکسر ناآشنا تھیں مضمون بھی متقدمین نے ہندی شاعری کے لئے ہیں اور اکثر ریختیاں مسلسل ہیں جو ہندی کے تتبع کا نتیجہ ہے۔ لیکن ریختی کے لئے ایک الگ میدان پیدا کیا ہے جسے عورتوں کا روزمرہ یا معاملہ بندی کہہ سکتے ہیں۔ اُنھوں نے عورتوں کے ٹھیٹ محاورے لئے ہیں اور انھیں کے طرز معاشرت کا فوٹو کھینچا ہے۔ ریختی میں تخیل کی بلند پروازی شاذ ملے گی لیکن کیا یہ لوگ اسپر قادر نہ تھے۔ کیا رنگین جان صاحب نازنین اگر چاہتے تو تخیل کے پروں پر اُڑ نہیں سکتے تھے؟ مگر نہیں ان کا مقصد تو عورتوں کی ترجمانی کرنا تھا اور عورتوں کا تخیل اور موضوع سخن (کم ازکم اس زمانہ کی عورتوں کا) بہت محدود تھا۔ اور ان لوگوں نے اپنے کلام میں اُس سے زیادہ کی کھپت نامناسب سمجھی اور اپنے دائرہ سخن کو عورتوں کی روزمرہ کی باتوں تک محدود رکھا۔

جناب آرگس نے تیسری شہادت صابر کی پیش کی ہے لیکن افسوس ہوتا ہے جناب آرگس کی حق پوشی پر آپنے صابر کا صرف ایک ٹکڑا پیش کیا اور دوسرا قصداً حذف کر گئے صابر کی پوری عبارت یہ ہے (رنگین کا ذکر کرتے ہیں) " دیوان دوم کے دیباچہ میں ریختی کو اپنا ایجاد بیان کیا ہے راقم کے عندیہ میں تو ادعائے محض ہے۔ اس واسطے کہ انشاء اللہ خاں سے بہت ریختیاں مشہور اور السنۂ عوام پر مذکور ہیں" (تذکرہ گلستان سخن صفحہ ۲۵۴)

یہی مرزا قادر بخش صابر اسی کتاب گلستان سخن کے صفحہ ۵۴۴) پر لکھتے ہیں " زبان اُردو میں اول ریختی کا رواج انشاء اللہ خاں انشا تخلص نے دیا اور اُس کے بعد سعادت یار خاں رنگیں نے خواہ اس سبب سے کہ انکی طبیعت کو خود اس صنف کلام کی طرف التفات تھا خواہ انشاء اللہ خاں کے اثر صحبت سے اس نظم میں ایسی زبان آوری کی کہ گویا اسکو اپنا شعار کر لیا" غرض صابر کے نزدیک ریختی انشا کی ایجاد ہے آئیے دیکھیں اس بارہ

میر انشا خود کیا کہتے ہیں۔ "سعادت یار خاں رنگیں تخلص پسر اوسط طہماسپ خاں کہ در شیوۂ آشنا پرستی و صفت شجاعت و سواری اسپ و دیگر مراتب عمل سپاہی نعم البدل است از بسکہ بیشتر با زنان پردہ نشین سروکار داشتہ بندے از مصطلحات شان در فصلے از کتاب تالیف نمودۂ خود نوشتہ بلکہ دیوانے دراں گفتگو بنظم در آوردہ بدیوان ریختی کہ ایجاد اوست موسوم ساخت۔ الحق کہ بانی شعر ہندی دریں زبان خان مذکور است"

ایک اور جگہ میر غفر غینی کی زبانی کہتے ہیں۔

"اور سنئے کہ سعادت یار طہماسپ کا بیٹا انوری ریختہ آپکے جاتا ہے رنگین تخلص ہے ...... اور کرڑائی پن (یا کلہائی پن) جو بہت مزاج میں رنڈی بازی سے آگیا ہے تو ریختہ کے تئیں چھوڑکے ایک ریختی ایجاد کی ہے اس واسطے کہ بھلے آدمیوں کی بہو بیٹیاں پڑھ کر مشتاق ہوں اور انکے ساتھ اپنا منہ کالا کرے" غرضکہ انشا ریختی کو رنگین کی ایجاد بتاتے ہیں لہذا ہر صورت میں صابر کی رائے پر انشا کی رائے کو صحیح سمجھا جائے گا کیونکہ اگر صابر کا خیال صحیح ہوتا اور انشا ہی اس کے موجد ہوتے تو وہ یہ سہرا رنگین کے سر کیوں باندھتے یہ کہنے نہیں سکتے کہ انشا نے ریختی کو اپنے لئے اچھا نہیں سمجھا کیونکہ خود اُن کی ریختیاں اُنکے اپنے مرتبہ دیوان میں موجود ہیں پھر شاعری میں ایک صنف کا اضافہ کرنا کوئی محقرات نہ تھی فحش کلام اسکے علاوہ انکے یہاں بہت اور وجود ہے۔

تذکرہ مہر جہاں تاب میں بھی انشا ہی کو ریختی کا موجد لکھا ہے اور رنگین کو صرف شریک مشورہ چنانچہ انکے الفاظ یہ ہیں۔

"اشارت رنگین ایجاد ریختی کردہ است بسبب شوخ طبعی ریختی او بہ نسبت ریختی رنگین۔ رنگین تر است"

لیکن ہم کیا کریں خود انشا نے ہمارے ہاتھ باندھ دیئے اور رنگین کو اس کا موجد قرار دیا ہے تذکرہ قدرت قلمی میں محمد شاہی دور کے اُمرا میں سے امیر خاں عمدۃ الملک کے حال میں لکھا ہے کہ "مقابل ریختہ کہ لفظے است مذکر ریختی تصنیف نمودہ" لیکن نواب امیر خاں کے اشعار کا کوئی نمونہ نہیں دیا جس سے پتہ چل سکے کہ آیا وہ واقعی ریختی ہے یا محض ہندی طرز کی غزل ہماری ذاتی رائے تو یہی ہے کہ امیر خاں نے بھی اور قدما کی طرح محض ہندی طرز پر شعر کہے ہونگے اُن کو ریختی کہنا صریحی غلطی ہے لہذا یہ بات طے ہو جاتی ہے کہ ریختی کا موجد رنگین ہی ہے۔

(باقی آئندہ)

پیمانِ وفا

محترمہ بیگم صاحبہ سید اسحاق حسین صاحب زیدی وکیل

حال میں ایک دردانگیز واقعہ سننے میں آیا ہے جو اپنی نوعیت میں نیا تو نہیں ہے مگر ہم لوگوں کی معاشرتی زندگی کی تاریکی کا بدترین ثبوت ہے۔ حالانکہ ہم اور ہماری بہو بیٹیاں سات پردوں کے اندر رکھی جاتی ہیں مگر پھر بھی ہمارے کان افسوسناک وحشت انگیز خبریں اکثر سُن لیا کرتے ہیں جن لڑکوں یا لڑکیوں کی تربیت اچھی نہیں ہوتی ہے جن کے معاشرتی و انسانی عقائد نہایت کمزور ہوتے ہیں وہ دوسرے کی بہو بیٹیوں اور اپنی دور کی رشتہ کی بہنوں وغیرہ کا اس قدر احترام نہیں کرتے جس قدر کہ ان پر اخلاقی طور سے واجب ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ ان کے دل میں بنی نوع انسان اور اسلامی شریعت کے احترام کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ ان کا نفس ان کو جس قدر چاہے بدترین اخلاق سوز اور ننگ انسانیت افعال کی ترغیب دے سکتا ہے۔

میں نے اپنی عمر میں سُنے تو کئی واقعے ہیں لیکن حال میں جو سانحہ سُنا ہے وہ بالکل مثنوی "زہر عشق" کا ہولناک منظر پیش کرتا ہے جس کے لیے صرف اسی تشبیہ پر اکتفا کرنا مناسب سمجھتی ہوں۔

ہم کو اپنی اصلاح کس طرح کرنا چاہیے؟

اوّل تو ہم کو (جملہ اناث کو) اپنی مذہبی و رواجی تعلیم میں ایسی قابلیت و اہلیت پیدا کرنے کی ضرورت ہے کہ ہماری گود میں جو بچے پرورش پائیں ان کے عادات و خصائل اخلاقی کمزوریوں سے بالکل پاک و صاف ہوں جس کی وجہ سے ہم کو ایسے سانحات سے دوچار نہ ہونا پڑیگا جو کہ کبھی کبھی اب سننے میں آتے ہیں۔ میرے خیال میں اگر کہیں لڑکے لڑکی میں ایسی محبت پیدا ہو جائے جو انکی تندرستیوں کو خراب کر رہی ہو تو ایسی حالت میں انکی (طالب مطلوب کی) شادی کرکے انکی زندگی کو خوشگوار بنا دینا

لازمی ہے۔ ایسا نہ ہونے پر بہت سے صعوبات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس لیے کہ آئندہ چل کے ان کو ایسے مواقع اور ایسے حالات سے سابقہ پڑ جاتا ہے جو انکی ازدواجی زندگی کو تلخ کر دیتے ہیں۔ جس کی ایک زندہ مثال اب بھی میرے پیش نظر ہے جس کو دیکھ کر دل کڑھتا ہے وہ غریب اپنی زندگی کے مختصر لیکن نہایت تلخ ایام گزار رہی ہے۔ ایسے حادثات بھی ہماری اخلاقی کمزوریوں کا نتیجہ ہیں جو چاہے ساس اور نندوں کے طعنوں اور تشنعوں سے واقع ہوں یا دوسرے اعزا یا شوہر کی زہریلی باتوں سے جو کسی حد تک صحیح بھی ہوتی ہیں۔

جہاں ہم لوگوں کی اسکولوں میں تعلیم ہوتی ہے وہاں معاشرتی و اخلاقی زندگی کے متعلق نہایت مؤثر لکچر بھی ہونا چاہیے میں اس دانشمندی پر نہایت حیران ہوں کہ لڑکیوں اور کمسن لڑکیوں کی تعلیم کے لیے عیسائی استانیاں جنکی معاشرت اور اخلاق میں ہم سے بہت بُعد ہوتا ہے کیونکر ضرورت کے موافق مفید ہو سکتی ہیں۔ مگر اسی کے خیال کے ساتھ یہ خیال بھی اس کی اس طرح تردید کر دیتا ہے کہ ہم میں ایسی عورتیں ضرورت سے کہیں زیادہ کم تعداد میں اور ابھی یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی ایک مدت تک یہ ضرورت پوری نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ اسکے لیے جس قدر قوی احساس کی ضرورت ہے ابھی وہ موجود نہیں ہے لیکن ہماری بہنوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ اگر اس کا خیال ہم لوگوں نے نہیں کیا تو ہماری دین و دنیا دونوں برباد ہیں!۔

ناظرین "ادب" سے درخواست ہے کہ وہ خواتین کے مضامین فراہم کرنے میں ہماری مدد فرمائیں۔ زمانہ کا اقتضا ہے کہ اب خواتین بھی جہالت کے تاریک حجروں سے نکل کر علم کی نورانی محلوں کی سیر کریں! اعظم

"ادب" کے لئے ہر شہر میں دیانتدار ایجنٹوں کی ضرورت ہے۔ ایسے خائن جو ایجنٹوں کے بھیس میں بدمعاملگی کیا کرتے ہیں درخواست کرنے کی زحمت نہ کریں۔ ہمیں سچے کام کرنے والوں کی ضرورت ہے۔

"منیجر"

قاضی جی

(جناب حکیم سید محمد کاظم صاحب موہانی)

(سلسلے کے لیے "ادب" ماہ جولائی و اگست ۱۹۳۱ء ملاحظہ ہو)

شادی کی تیاریاں

پھٹیل رہنے کے ضرر قاضی صاحب دیکھ چکے۔ بچے بی شادی کے نام سے ناسمجھی سے سہم جاتے ہیں۔ ڈریں! ۔ بوڑھے نشہ شادی کے خمار سے نیم مردہ افسردہ ہیں، رہیں! ۔ بالا بڑھا دونوں برابر۔ دونوں کی کچی روئی۔ قاضی دونوں حدوں سے باہر۔ قاضی صاحب بڑے عاقل، بالغ، رشید، جامہ تزویج سے مخلع ہونے میں۔ شرعی، سنتی، قومی، ملکی، عرفی، فوجی فوائد و مسائل کی حفاظت فرض سمجھتے ہیں۔ سنت مؤکدہ رسول کے قیام کی فکر جُدا۔ گروہ اسلام میں چند کلمہ گویوں کی ترقی جُدا مدنظر۔ گورنمنٹ کی آئندہ مردم شماری میں اضافہ الگ منظور۔ فی الحال گورنمنٹ کی جاری کردہ اسکیم ٹریٹوریل فوج میں آئندہ خود ساختہ دو چار چھوٹی گوٹی کے ان کیٹنٹ افسروں کو بھرتی کرانا علیحدہ مطلوب۔

اگر خدانخواستہ ملک غلامی سے نکل گیا تو دس پانچ سوراج کے حامی گاندھی جی کے چیلے چاپڑوں کی بڑھتی مدعائے خاص۔ اگر قسمت سے غلامی میں باقی رہا تو کم سے کم دو چار ننھے کونسل کے نمایندے مصلح ملک سرکار کی ہاں میں ہاں ملانے والے کرسی نشینوں کی ایجاد اشد ضروری اور سب سے بڑی توجہ دو چار پتلے اپنے ہم شکل و ہم شبیہ۔ بقائے نوع و نام و نشان بنائے سفینہ قبل طوفان۔ عصائے پیری و نیز بعد قاضی صاحب شبیہ قاضی صاحب کی زیارت مقلدین کے لیے جیتی جاگتی یادگار کا چھوڑ جانا بسا ضروری تھا۔ اسی لیے جی کڑا کر کے شادی کی ٹھان لی اور دوست احباب، اعزا و اقارب کی سعی و مدد سے اپنے بل بوتوں نہ سہی دوسروں ہی کے صدقے، مگر لگے ہنہنانے! ۔

ساگ پات جو کھات ہیں اُنہے ستاوے کام　　دودھ بھات جو کھات ہیں آنکی جانے رام

اب قاضی صاحب کی شادی کو مہینہ میں دن رہ گئے تھے۔ قاضی صاحب کافی طور پر طبع زوج تلاش کو گرما چکے ہیں۔ جس قدر زمانہ وصل قریب آتا جاتا ہے آتش شوق بھڑکتی جاتی ہے۔ دل ہے کہ بیتابیوں سے متلاطم کشتی۔ پریشانی دماغ کا دریا زور شور سے موجیں مار رہا ہے۔ گھاگرا کی لہروں کا جزر و مد ہیچ۔ عنان ضبط گسیختہ۔ صبر و قرار رو بفرار۔ جولانی طبع بڑھ رہی ہے۔ کانوں سے شعلے نکلنے لگے۔ دماغ جھنلانے لگا۔ دل سینہ سے نکلا بھاگتا ہے۔ بانسوں اُچھلتا ہے قاضی صاحب لاکھ لاکھ روکتے ہیں، پکڑتے ہیں، بہلاتے ہیں، پھسلاتے ہیں ایک نہیں مانتا۔

اس حال میں از روئے قواعد طب فقدان شہوت غذا لازمی۔ بھوک کیسی۔ مگر اس قاعدے میں ترمیم اس کلیہ میں استثنا۔ کچھ طبعی سیر خوری کی بدولت کچھ ادویہ کی کرامات سے قاضی صاحب نے فرمائی۔ اور یہ بھی ہے کہ صائم النہار تو رہ نہیں سکتے۔ ڈرتے ہیں کہیں بی شادی میں کمزوری نہ آئے۔ قائم اللیل مہلتوں سے ہیں۔ ان شب بیداریوں میں وقت بے وقت اگر دواؤں نے زور باندھا تو حضرت کے لیے غضب ہی کا سامنا ہے۔ ان بیداریوں سے جو جو عیتیں دماغ پر گزر جاتی ہیں اُنکی قاضی صاحب کا دل ہی خوب جانتا ہے۔ یہ آثار بظاہر سریع التاثیر دواؤں کے اکثار کے سبب سے معلوم ہوتی ہیں ورنہ حقیقت میں طیش شوق شادی کی گدگدی قاضی صاحب کو پھونکے دیتے ہیں۔ اس قصر مدت کو طول دینے والا اس دھیمی دھیمی آگ کو شعلہ بنا دینے والا جناب کا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بے ہنگام وصال بھی ہے (جو رشتہ میں قاضی صاحب کے چچیا سسر ہوتے تھے) خدا غریق رحمت کرے۔ خود تو چلے گئے۔ مگر قاضی صاحب کو شش ماہہ کرارا دھکا ایسا دے گئے کہ قاضی جی آگ تو ہو ہی رہے تھے لُوکا بن گئے۔ اس سوز و ساز شادی کے انطفا کی غرض سے شب و روز میں سات آٹھ بار غسل فرماتے ہیں۔ گویا ہفتہ بھر کا نہان ایک ہی دن نہا ڈالتے ہیں۔ اُس پر بھی حدت کا یہ عالم کہ العظمۃ للہ جلتے توے پر چھینٹا پڑا چھن سے اور غائب جیسے مسام نے حدت کو دونا کیا۔ اور قاضی صاحب ہیں کہ چکر گھنی۔ جب دیکھیے خلائق باغ میں بے غل و غش جوتہ ٹوپی اُتارے۔ مخلع بالطبع حد نظر بنے ہوئے بیٹھے ہیں۔ کوئی نہ کوئی حسب حال شعر بنے پر بیٹھے گنگنا رہے ہیں۔ جس کا ایک مصرع سب کو یاد رہ گیا۔ ع آگ کے مول ہو گیا پانی ۱۲ غرض ڈیڑھ برس تک یہ غسلا غسلی رہی کہ اہل محلہ کے گھروں کے نیچے قاضی جی کے غسلوں کے زد میں شکست۔ پختہ کنوئیں آب سانی سے کچے

پڑ گئے۔ مگر قاضی صاحب کا طہر متخلل ہے کہ جاری ہے۔

الغرض کاکا صاحب نے جب چھ مہینے اپنے انتقال کے پڑے کرا کے کریا کرم کے سب مراسم ختم کرائے۔ تب گھر کے پنڈت جوتشیوں نے شبھ گھڑی ملا کر قاضی صاحب کی لگن باندھی اور تین چار دن میں بارات جانے کی تاریخ مقرر ہوئی۔

اب آج کے تیسرے دن قاضی صاحب اصل خیر سے دولہا بننے جائینگے۔ مع قدیم رفقائے خویش جس میں گھر کی پارینہ (دیرینہ) طباخہ سے لیکر مع اسکے اطفال خردسال تک کا شمار ہے۔ ادھر قاضی صاحب کے یہاں بی شادی آج کے تیسرے دن آنے والی ہیں، ادھر موسم سرما قریب اختتام اُسکا ٹھہر ٹھہر کے دم نکل رہا ہے۔ قاضی صاحب کا بہ پابندی رسم قدیم غسل ارتش ضروری۔ مگر درازی سن غلبۂ کہولت اور ذوبان اعضائے اصلیہ سے حرارت غریزی غائب، برد مجوری غالب۔ بخوف اضافہ برد و سرایت زمہریت۔ گھر میں نہیں نہاتے۔ بلاناغہ حمام جاتے ہیں کبھی اپنے ہاتھوں کبھی حمامی سے چرک بدن کی صفائی کراتے ہیں۔ بے تکان غسلوں کی کثرت نے جسم کا میل تو باقی نہ رکھا۔ البتہ حمامی کی رگڑے بازیوں میں کہیں نہ کہیں سے جلد ضرور چھل جاتی تھی۔ قاضی صاحب بی شادی کے آنے کی خوشی میں بے حس بے خبر دل ہی دل میں خوش ہیں کہ جتنا صاف ہو جاؤنگا اُتنا ہی سسرال والوں کی نگاہوں میں جچونگا۔ پہروں حمام سے برآمد نہیں ہوتے۔ ہمتی کھریرہ جاری۔ حمامی عاجز۔ مگر قاضی صاحب ہیں کہ بیٹے کے لونڈے کو مات دے رہے ہیں۔ بہ ہزار تقاضائے حمامی بادل ناخواستہ اگر حمام سے برآمد بھی ہوئے تو حمام سے مکان تک کی خاک نے پھر غسل واجب کر دیا۔

تین دن کی قلیل مدت اور خریدنا بہت کچھ۔ قاضی صاحب کی چہل سالہ عمر میں دیسی بدیسی صنعت کی دلچسپ و دلفریب جو چیز جہاں بھی نظر پڑی تھی وہ اب تک حافظہ کے خزانہ میں امانت دھری تھی تخیلہ کے خزانچی نے لباس بنی ہوئی وسامان شادی کی ضرورتوں کی مناسبت سے ایک ایک کو نکال کر پیش کرنا شروع کر دیا۔ گرنٹ، تنسر، جعفر، ململ، ڈوریہ، چوخانہ، تنزیب، ململ لاہی، لنگی، سرمہ، مسی، عطر، تیل، پھلیل، لچکہ، گوٹہ، پٹھا، ویسلین، کوبرا پالش نہ جانے کیا کیا۔ اب اُسکی خرید کا خیال

زہر باد کی طرح دماغ پر چڑھ رہا ہے - اور بیل کی طرح پھیلتا جاتا ہے - قاضی صاحب ہیں کہ شہر کے کونے کونے میں جہاں بھی چیزوں کا ملنا ممکن ہوتا ہے جاتے ہیں اور لا کر گھر پہونچاتے ہیں اور پھر لینے کو جاتے ہیں - بقول دیہاتیوں کے "چٹیا ڈھون" لگی ہے - خواہ اس میں گورنمنٹ کے خلاف منشا ، ہی کیوں نہ ہو قاضی صاحب نے ضمناً سارے شہر کی پیمائش بھی کر ڈالی - موافق حوصلہ تو نہیں البتہ حسب لیاقت (بارتفاع عروض دفعہ ۱۱ ضابطہ افلاس) بلکہ اس سے کچھ بڑھ چڑھ کے خرید فرما رہے ہیں - ہاں کچھ اشیا نظری بھی ہوتے جاتے ہیں - دل تو نہیں چاہتا - مگر یہ مجبوری و معذوری دفعہ ۱۱ پر بھی خرید تو تمام نہ ہوئی - وقت ختم ہو گیا - باقی ! باقی !



نقد و تبصرہ

آنکھ کا نور

حضرت افسر میرٹھی اُن خوش قسمت لوگوں میں سے ہیں جنھیں قدرت نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ صورت شکل، ذہن و دماغ، طبیعت و مزاج، ظاہر و باطن، حالات و ماحول، تمام چیزیں ایسی فراہم کر دی ہیں کہ ان کا جو کچھ بھی چاہتا ہے وہ بڑی کامیابی اور خوبی سے کروا لیتے ہیں۔ نظم کہنے پر آئے تو آسمان سے چاند تارے توڑ لائے۔ نثر لکھنے بیٹھے تو معانی و مطالب کے دریا بہا دیے۔ تنقید کی تو بال کی کھال نکال ڈالی۔ اور فسانہ نگاری کی ہر کردار و سیرت کا مکمل تجزیہ کر ڈالا۔ بلا کی طبیعت پائی ہے اور آفت کا دل و دماغ۔ ہر وقت لکھتے رہنا اور اس طرح لکھتے رہنا کوئی آسان کام نہیں وہ بھی اس وقت جب کہ ایک فطری شاعر کی طرح نازک بدن و نازک مزاج بھی ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ اس کمسنی میں انھوں نے اتنا کام اور اس نوع کا کر ڈالا ہے کہ معمولی صاحبان قلم رشک کرنے اور بڑے سے بڑے انشاپرداز غبطہ کرنے پر مجبور ہیں۔ پچیسوں کتابیں مدارس کے نصاب کے نصاب کے لیے ترتیب دیں۔ بیسیوں دیوانوں کو ایڈٹ کیا۔ خود ایک ضخیم دیوان تیار کر ڈالا۔ پچاسوں مضامین اور فسانے لکھ ڈالے۔ "ڈالی کا جوگ" ان میں سے چند کا مجموعہ ہے۔ اور "آنکھ کا نور" بقیہ منتخب قصص کا۔ ہمیں یقین اور امید ہے کہ جن حضرات نے "ڈالی کا جوگ" دیکھا ہے وہ اس نئے مجموعہ "آنکھ کا نور" کو بھی ضرور ملاحظہ فرمائیں گے۔ یہ واقعی ہر نہج سے بصیرت افروز ہے۔ حضرت افسر کے ہلکے پھلکے جملے، زبان کی سلاست، جملوں کی بندش، فقروں کی چستی، شیریں کلامی اور میٹھی بولی کا ذائقہ جن لوگوں کے کام و دہن ایک بار اٹھا چکا ہے اُن سے سفارش بیکار سی بات ہے۔ مگر جن اصحاب نے اب تک اُن کے شاہکار نہیں دیکھے ہیں اُنھیں "آنکھ کا نور" ضرور دیکھنا چاہیے۔ قریب قریب ہر فسانہ کردار نگاری اور تجزیہ جذبات میں مکمل ہے اور اُردو ادب میں ایک معقول اضافہ۔

یہ نہ سمجھیے گا کہ یہ منہ دیکھی بات ہے بلکہ واقعی ایسا ہی ہے۔ شک ہو تو ہندوستانی پبلشنگ ہاؤس میرٹھ سے ۱۲ کو منگا کے دیکھ لیجیے۔ — "ع۔ ع۔ سیلتی"

احسان عشق (و) ضمیمہ احسان عشق

لسان الحکمۃ مولوی محمد عبدالرحمن صاحب شاطر مدراس کے ایک جلیل المرتبت بزرگ ہیں اور جیسا کہ تخلص سے ظاہر ہے شاعر بھی ہیں۔ مندرجہ بالا دو کتابیں آپ کی شاعرانہ تصانیف میں سے ہیں۔ دونوں میں طرح طرح کے اشعار ہیں اور ان میں گوناگوں مطالب موجود ہیں۔ مولانا تصوف کے بہت دلدادہ ہیں اس لیے کلام بھی صوفیانہ ہے۔ موضوع کے اعتبار سے زیادہ جدت نہیں ہے لیکن نظموں کی حیثیت کے لحاظ سے غیر معمولی تنوع سے کام لیا گیا ہے۔ سباعیات، خماسیات، ثلاثیات، رباعیات، متفرقات بھی کچھ ان دو مختصر سے مجموعوں میں موجود ہیں۔ بیان شریعت اور پیران طریقت کی نعت و منقبت کے ساتھ ساتھ موجودہ تہذیب و معاشرت کی تنقیدیں بھی آپ کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ خیالات کی فراوانی کی وجہ سے شاعری کے بعض لوازمات سے گونہ بے نیازی برتی گئی ہے لیکن پھر بھی کلام قابل داد ہے۔

نمونے ملاحظہ ہوں:-

باطل سے ہے اتحاد باطل سے جدال — حق کے لیے ثابت ہیں تجلی و نزول
والشمس کی میں کھا کے قسم کہتا ہوں — قرآن سے ماخوذ ہیں صوفی کے اصول

اللہ کا شیر اور وصی احمد کا — معصومہ کا زوج مومنوں کا مولا
خیبر کی وہ فتح یہ یمن کی تسخیر — خالد! کس کو نہیں علی پہ غبطہ؟

اخلاق و سیاست کی ہو نہ جیت بنا — مذہب جو گیا بولشویزم آیا
اسلام ہی اس کا ہے عدو سب سے بڑا

تمر ناپاک ہو گیا تھا بمقام — آپنسر وِل نے کیا میراب کا کام
اثمار سے روس نے بنائی ہے شراب — انگورہ کی مستی ہے ہمسی کا انجام

گاندھی وسیل اور یوسس و ٹیگور　　　دنیا میں کم وبیش ہیں چاروں مشہور
پچھلے دونوں بہت جیئینگے لیکن　　　شاعر کی حیات ہوگی ممتاز ضرور
ہے فیض سے زندگی کا رقبہ معمور

اُردو میں ہے اچھے شعرا کی کثرت　　　کس کی نہیں کچھ نہ کچھ وطن پر منت
لیکن اقبال، انیس، اکبر، شاطر　　　چاروں کا تخیل ہے مفید ملت

کتابوں کی قیمت اور ملنے کا پتہ تحریر نہیں ہے۔ البتہ جس پریس میں چھپی ہے اُس کا نام "شاہ الحمیدیہ اسٹیم پریس مدراس" ہے۔ شائقین منگا کر ملاحظہ کریں۔

شاہد غم | نیر آرا ساجدہ بیگم صاحبہ نیر لکھنوی نے اپنے قابل قدر نوحہ جات کا ایک نفیس مجموعہ شائع کیا ہے۔ نوحے سلیس زبان میں ہیں اور بہت پُر اثر ہیں۔ مجلس حسین برپا کرنے والی خواتین کو اسے ضرور خریدنا چاہیے۔ قیمت ۱۲ر

ملنے کا پتہ :۔ ممتاز المطابع پریس لکھنؤ۔

اعلان | مجلس دبیرہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ادبی اور علمی خصوصیات کے ساتھ جو سالانہ کانفرنس کیا کرتی ہے۔ امسال بھی مارچ کے مہینے میں وہ کانفرنس منعقد کریگی۔ اس سال اہتمام کیا جا رہا ہے کہ ادبی اور علمی دلچسپیوں میں کافی اضافہ کیا جائے۔ ادبی علمی لکچروں تقریروں اور دوسری ضروری چیزوں کے ساتھ نایاب و قیمتی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں رسائل وغیرہ کی نمائش اور مشاعرہ بھی اس میں شامل ہے۔ ادبی اور علمی دلچسپی رکھنے والے بزرگوں کی خدمت میں التماس ہے کہ شرکت فرما کر ادب نوازی کا ثبوت دیں اور ہماری عزت اور حوصلہ بڑھائیں۔

نوٹ:۔ جو اہل ذوق مطبوعہ کتاب یا رسالہ اکاڈیمی کی نمائش میں بھیجنا چاہیں اپنے صرفے سے بھیج سکتے ہیں۔ نایاب غیر مطبوعہ کتاب نمائش میں رکھنے کے لیے اکاڈیمی اپنے صرفے سے قبول کر سکتی ہے بشرطیکہ اسکا قبول کرنا خط و کتابت سے طے ہو جائے۔

تاراچند جنرل سکرٹیری "ہندوستانی اکاڈیمی" الہ آباد

خالص اُردو

حضرت آرزو

متوالے پنے سے جو گھٹا جھوم پڑی ہے
چھاتی سے دُھواں اُٹھا ہے جو بوند پڑی ہے

ہاں اور سُنا کچھ وہ بُرا ہو کہ بھلا ہو
جو بات ترے مُنہ کی ہو موتی کی لڑی ہے

رہنا نہیں اس دیس میں جاؤں تو کدھر جاؤں
رستہ ہے کٹھن کوس کڑے دھوپ کڑی ہے

وہ بھی کوئی جینا ہے دُکھوں سے جو بھرا ہو
ہے سانس کہ اک پھانس کلیجے میں گڑی ہے

یہ چاہ کی ناگن کا ہے بِس جان نہ آنسو
چھالا وہیں اُٹھا ہے جہاں بوند پڑی ہے

رت ہے سُکھ اُٹھا لینے کی او اینڈنے والے
سو چین سے دن چھوٹا ہے اور رات بڑی ہے

ہاں بے دھڑک اے آرزو اب کہہ دو کھری بات
رسی بھی یہیں رکھی ہے سولی بھی گڑی ہے

گزارش

"ادب"، کے قلمی معاونین کی خدمت میں عرض ہے کہ آیندہ پرچوں کے لیے مضامین کی خدمت ضرورت ہے۔ براہ کرم اپنے گرانقدر عطیوں کی تازہ قسط سے جلد سرفراز فرمائیں۔

محترمی سید حسن برنی صاحب ایڈوکیٹ اور حضرت جوش ملیح آبادی سے ہمیں اس سلسلہ میں مخلصانہ شکایت بھی ہے کہ ممدوحین نے عرصہ سے "ادب"، کو محروم کر رکھا ہے۔ ہمیں اپنے محترم بزرگ جناب سید علی عباس صاحب حسینی ایم اے سے بھی مؤدبانہ گلہ ہے۔ آپ نے چراغ تلے اندھیرا بالکل ثابت کر دکھایا ہے۔ ہر مہینے ہیں ناظرین ادب ہم سے شکایت کرتے ہیں کہ موصوف کا فسانہ آدب میں نہیں ہے۔ اور ہم ناظرین کی اس خواہش کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔ مگر آپ کوئی عملی توجہ نہیں فرماتے۔ پنجابی رسائل اور دوسری زبانوں کے پرچوں سے تو آدب بہر حال زیادہ مستحق ہے۔ دیکھیے اب اس تحریری احتجاج کے بعد آپ کا طرز عمل کیا ہوتا ہے۔

اعظم

افکارِ تازہ

حضرت آرزو

الزام خامشی کیوں اُس ناز آفریں پر
بنتی ہے جنبشِ لب آ کر شکن جبیں پر

انکا جواب کب ہے موقوف ہاں نہیں پر
جو بات جی میں آئی خود لکھ گئی جبیں پر

او دشمنِ تمنا اسکا جواب دے دے
یہ ہاں نہ تو کیا ہو مرتا ہوں جس نہیں پر

اخفائے غم کا پردہ نامہ ہے شرحِ غم کا
آنکھوں سے اشک گم ہیں دھبے ہیں آستیں پر

نیرنگیوں کے پردے دھوکے میں ڈالتے ہیں
یہ سیکڑوں نقابیں کیوں اک رخِ حسیں پر

پھیلا کے پاؤں سونا کوئے وفا میں کیسا
آرام کی تمنا تپتی ہوئی زمیں پر

نکلی شریکِ قسمت بربادیٔ نشیمن
تنکے جہاں پڑے تھے نوچے گئے وہیں پر

وہ خون کر کے دل کا کس حق سے مدعی ہیں
نقصان بھی ہمارا الزام بھی ہمیں پر

دل آئینہ بنا تھا حسنِ کرشمہ زا کا
سو نقش تہ بہ تہ ہیں چھوٹے سے اک نگیں پر

دل ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تقسیم ہو رہا ہے
دھوکے میں تیرے ظالم مرتا ہوں ہر حسیں پر

جو کہہ کے بھولتا ہو پھر انتظار اس کا
اے دل کی سادہ لوحی صدقے ترے یقیں پر

سوز و گداز پر ہے الفت کی کامیابی
چلتی ہے کشتیٔ دل سیلابِ آتشیں پر

قول و قسم کی خاطر شمعِ وفا بنا ہے
خود حسن آگ رکھ کر اک دستِ نازنیں پر

راہِ وفا کا سالک ہے پاک گردِ رہ سے
پتھر پہ نقشِ پا ہے سایہ نہیں زمیں پر

مثلِ چراغِ کشتہ روشنگرِ وفا ہوں
سو بار اگر ہو جینا مرنا ہے پھر ہمیں پر

ہے آرزو کو نفرت اس کجروی سے ورنہ
اُس کو بھی حرف رکھنا آتا ہے نکتہ چیں پر

تبرکات

جناب علی میاں صاحب کامل مغفور

دوسرا میری مصیبت سے خبردار نہیں
جام خوں دل ہے تو ہو آنکھ تو خونبار نہیں

مرد مفلس کے لیے دربدری عار نہیں
متحد اصل میں کیا ثابت و سیار نہیں ..

فارغ البال علائق سے ہیں کیا اہل عدم
تن نہیں رخت نہیں سر نہیں دستار نہیں

کفر کو مصلحۃً شیخ برا کہتا ہے
ورنہ کیا باطن تسبیح میں زنار نہیں

ہاتھ آلودہ معاصی میں ہیں ایسے میرے
کہ دعا میں بھی اُٹھانے کے سزاوار نہیں

بعد مردن جو ہے پیش نظر اک روئے صبیح
چھٹ پٹا وقت ہے مدفن کی شب تار نہیں

خار کیوں بلبلوں کے ہمراہ چہچہے جاتے ہیں
ان حریفوں کے لیے باغ کی دیوار نہیں

دل میں ارمان چلے آتے ہیں کیوں بے پوچھے
یہ تجلی کدۂ دوست ہے بازار نہیں

مدح قرآں میں ہے صہبائے جناں کی واعظ
اب تو حلیت مے قابل انکار نہیں

وصل کی رات کجا اور کجا ہم **کامل**
خفتہ بختوں کے لیے دولت بیدار نہیں

جناب شاد عظیم آبادی مرحوم

قدم اُٹھا کے مرا تلملا کے رہ جانا
جھکا کے سر کو ترا مسکرا کے رہ جانا

شہید ناز کی بھولی نہیں مجھے صورت
تری طرف کو نگاہیں پھرا کے رہ جانا

وہ بزم غیر میں ہر بار اضطراب مرا
بہ مصلحت وہ ترا سر جھکا کے رہ جانا

بنگاہ ناز سے ساقی کا دیکھنا مجھ کو
پھر اپنے ہاتھ میں ساغر اُٹھا کے رہ جانا

دلوں سے خدمت پیر مغاں کرے واعظ
سند نہیں ترا ہو حق مچا کے رہ جانا

کسی طرح تو یہ چشم کثیف پاک ہو **شاد**
گلی میں یار کے جانا تو جا کے رہ جانا

میر انیس کے کچھ چشم دید حالات

مندرجۂ بالا عنوان سے میرا ایک مضمون رسالہ ادب بابت نومبر ۱۹۳۱ء میں نکلا تھا۔ اس میں کاتب نے متعدد غلطیاں کر دی ہیں جن کی تصحیح ذیل میں کی جاتی ہے۔ چونکہ ان میں سے بعض غلطیاں غلط فہمیوں کا سرچشمہ ہیں۔ اس لیے ناظرین ادب سے بمنت درخواست ہے کہ وہ اس ورق کو اس پرچے سے نکال کر گزشتہ پرچے میں اُس مضمون کے آخر میں لگا لیں یا اس غلطنامے کے مطابق مضمون کی تصحیح کر لیں اور اس طرح غلط فہمیوں کو پھیلنے سے روکیں۔

سید مسعود حسن رضوی ادیب۔ ایم۔ اے۔

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۱۲	شب	شیب	۷	۱۹	حاصل نہ کرتے	حاصل نہ کرتی
〃	۱۳	دیکھیے	دیکھ	〃	۲۳	جاتی تھی	جاتی تھیں
〃	۱۵	کلیات کرنے کا	کلیات جمع کرنے کا	۸	۷	دیوان خانے تشریف لے جاتے تھے اور کھانا	دیوان خانے تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں لوگوں سے ملاقات کرتے تھے۔ نو دس بجے رات کو زنانے مکان میں تشریف لے جاتے تھے اور کھانا
۴	۴	آغا میر	آغا میر صاحب				
〃	۶	گھر جاتا تھا	گھر میں جاتا تھا				
〃	۱۳	راحت حسین	راحت علی				
〃	۲۰ حاشیہ	سید آغا مرحوم	سید آغا میر مرحوم				
۵	۳	معقول	مقبول				
〃	۲۱	علی نقی خاں کے یہاں کے	علی نقی خاں کے				
۶	۸	بہت جلد حرکت	بہت حرکت				
〃	〃	انیس	رئیس	〃	۲۱ حاشیہ	درجہ	مرتبہ
۷	۱۰	میر محمد علی	میر علی محمد	〃	۲۲ حاشیہ	دو برس	دس برس
〃	۱۳	گھٹنوں تک	گٹّوں تک	۵	۴	آخری کلام	آخری وقت کا کلام

فہرست مضامین

جلد ۵ نمبر ۲ و ۳

بابت ماہ فروری - مارچ ۱۹۳۲ء

حصۂ نسواں

"نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ لکھنؤ اور پٹنے کے معزز خریداران ادب، چندے کی ادائگی میں ایسی ناروا تاخیر سے کام لے رہے ہیں جو اس پرچے کی ترقی میں حائل ہو رہی ہے۔ اُمید ہے کہ یہ اصحاب اس طرف جلد توجہ فرمائیں گے۔

منیجر "ادب" لکھنؤ۔

بزم ادب

اوائل مارچ میں لکھنؤ کو آفتاب دکن کی تابندگی نے چار چاند لگائے۔ تاجداران اودھ کا یہ ویران ماتم کدہ چند دنوں کے لیے پھر خانۂ عشرت بن گیا۔ خسرو دکن کی پیشوائی کے لیے یہ مرحومین موجود نہ تھے نہ اُن کی فوجیں تھیں، نہ چوبدار و عصا بردار، نہ اُنکے رایات اقبال تھے اور نہ نقارے اور ڈنکے۔ مگر کیا عجب کہ اُنکی مجبور مگر پاکیزہ روحیں استقبال میں شریک ہوئی ہوں! اس لیے کہ اس بے سروسامانی میں بھی عروس البلاد زلیخا کی طرح نئے سرے سے جوان معلوم ہوتی تھی۔ گویا اُس کا یوسفِ گم گشتہ اُسے مل گیا تھا! ہر طرف چہل پہل تھی، ہر جگہ جشن تھا، طبیعتوں میں جوش تھا اور دلوں میں اُمنگ! جتنے دن اعلیٰ حضرت کا قیام رہا تقریباً لکھنؤ کے ہر گھر میں آپ ہی کا تذکرہ ہوتا رہا۔ اور مراجعت کے بعد بھی یہ دلچسپ و مبارک موضوع فراموش نہیں ہوا ہے۔

ہز اگزالٹڈ ہائینس نے جو ہر دلعزیزی یہاں حاصل فرمائی اسکے باعث زیادہ تر آپکے ذاتی جوہر ہیں۔ آپکے یہاں وہی عالمگیر اخوت و ہمہ گیر محبت ہر مذہب و ملت، ہر خورد و کلاں سے برتی جو حقیقتاً ایک اسلامی فرمانروا کے لیے ضروری ہے۔ دلوں پر حکومت کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہے، اور اعلیٰ حضرت سے بہتر اس طریقے کو اختیار کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ جس طرح آفتاب اپنی روشنی ہر گوشے میں پہنچانے کی یکساں کوشش کرتا ہے، اسی طرح اعلیٰحضرت نے باشندگان لکھنؤ کو بغیر کسی نارو اتخصیص کے فیضیاب فرمایا۔

آپنے مختلف مذاہب کے اداروں کے معائنے فرمائے۔ علما و فضلا کو شرف بخشا، اور امراء و عمائدین کو سرخرو کیا۔ اصغر علی محمد علی کی عمارت کی بنیاد نہایت نیک ساعت میں پڑی تھی کہ اُسکا افتتاح بھی اعلیٰ حضرت کے دست مبارک سے ہوا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس کارخانے کی قابل قدر خدمات نے بارگاہ خسروی میں قبولیت کا شرف بھی پایا۔

علمائے کرام میں سے جناب مولانا قطب الدین عبدالوالی صاحب قبلہ کے علم کدے پر

اعلیٰ حضرت تشریف بھی لائے۔ اس موقع پر جناب مولانا کی جانب سے تین نادر کتابیں اعلیٰحضرت کی نذر کی گئیں۔ ان میں سے پہلی کتاب قرآن مجید تھی۔ دوسری کوئی بیش بہا مثنوی تھی۔ اور تیسری حضرت آرزو لکھنوی کی تازہ ترین تصنیف "نظام اُردو" تھی۔ آخرالذکر کتاب بھی یقیناً اسی قابل ہے کہ وہ ایسے علم نواز و ادب پرور بادشاہ کی خدمت میں ہدیہ کی جائے۔ علم بلاغت میں اس طرح کی اور بے بدل تصنیف اب تک کوئی پیش نہیں کر سکا۔ اگر اسکی قدر نہ کی جاتی تو یگانۂ فن مصنف کی ایک عمر کے حاصل کا خون ہو جاتا۔

آخر میں ہم خالق اکبر کی درگاہ میں دعا کرتے ہیں کہ وہ ہر دلعزیز شہریارِ دکن کو عمر خضر کرامت فرمائے تاکہ اُنکے ظل عاطفت میں اسلامی اخلاق کی ترویج اور زبان اُردو کی ترقی ہوتی رہے۔

این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

ہم ان تمام اصحاب کے شکر گزار ہیں جو "ادب" کی قدردانی اور ہمت افزائی فرماتے ہیں۔ یقیناً ایسے ہی سچے بہی خواہوں کی عملی دلچسپیوں کا نتیجہ ہے کہ غریب اُردو اس کشمکش کے زمانے میں بھی زندہ ہے اور اُسکے خادم اپنی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ ورنہ آج کل کی مغرب پرستی و سرمایہ داری تو ایسی بے مایہ زبان اور اُسکے "دیوانوں" پر ہنستی ہے۔

ایک وقت تھا جب مشرق، مغرب پر ہنستا تھا اور اُسکے سرمایہ داران معنوں میں سرمایہ دار نہیں تھے۔ اُس وقت اُردو بھی باوقعت زبان تھی اور صاحبان تخت و تاج اُسکے شاعروں اور انشا پردازوں میں تھے۔ اب شہریار دکن کے علاوہ کون ہے جسکا نام اس فہرست میں لکھا جا سکتا ہے؟ کہاں ہیں آصف الدولہ فرمانروائے اودھ اور نواب کلب علی خاں والی رامپور ایسے علم دوست و ادب پرور جو کاملین فن کی نازبرداریاں کریں؟ کدھر ہیں ظفر و اختر کے سے بادشاہان وقت جو زبان کے عشق اور سخن کی الفت سے سرشار ہو کر اپنے "پرورش" کو بھلا دیں اور "معاصرین" میں سرخرو ہونے کی دعائیں مانگیں۔ شاہان اودھ کی شاہی چھن گئی، والی رامپور کی توجہ دوسری طرف مبذول ہو گئی، ظفر کی جگہ ہزیمت نے لی اور اختر اقبال ڈوب گیا۔ ہر طرف سوختہ سامانی ہے، صرف حسرت و اندوہ، تپش و آہ باقی ہیں۔ اگر یہی کل یہی عالم رہا تو انکا بھی خدا حافظ ہے! پھر ایسے میں کسی کی

سی ادبی امداد پر اظہار مسرت کیوں نہ کیا جائے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بہت ہے !!

گزشتہ اشاعت میں فاضل اجل جناب خواجہ غلام السیدین صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج علیگڈھ اور دیگر صاحبان نظر کی "ادب" کے متعلق رائیں پیش کی گئی تھیں۔ اس مرتبہ شاعر نکتہ رس مطرب فطرت جناب شبیر حسن خاں صاحب جوش ملیح آبادی اور دوسرے باکمالوں کے محبت ناموں سے ضروری اقتباس پیش کیے جاتے ہیں۔

جناب نہال صاحب موصوف شعبۂ تالیف و ترجمہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے رقمطراز ہیں:۔

"مشفقی، میں آپ کا نہایت منفعل ہوں۔ کیونکر آپ کو یقین دلاؤں کہ میں آپ کے پرچے کی محبت سے سرشار ہوں، یہ میرا پرچہ ہے، محبت ہونا کون سی انوکھی بات ہے .... اب انشاءاللہ پابندی کے ساتھ "ادب" کی خدمت کرتا رہونگا ...."

سحر طراز بنگالہ خان بہادر جناب رضا علی صاحب وحشت کلکتے سے تحریر فرماتے ہیں:۔

"رسالہ ادب میری دلچسپی کا باعث ہے۔ میں اسکا معیار بہ نسبت اور بہت سے رسالوں کے بلند پاتا ہوں۔ کیا نثر اور کیا نظم، دونوں اپنی اپنی جگہ پر بہت وقیع ہیں"

جناب پنڈت نندلال کول صاحب طالب ایم اے۔ ایم او ال۔ منشی فاضل۔ ادیب فاضل پروفیسر ایس پی کالج، سری نگر کشمیر سے لکھتے ہیں:۔

"ایک دوست کی زبانی آپ کے رسالے کی تعریف سنی تھی۔ اپنے کالج کے ریڈنگ روم کے لیے اسکا نمونہ منگوایا۔ اس کے مطالعے سے بیحد مسرت ہوئی۔ اسی وجہ سے ریڈنگ روم کے لیے اب باقاعدہ طور پر منگوانے کی تجویز پاس ہوئی ...... راقم بھی وقتاً فوقتاً علمی و ادبی مضامین (نظم و نثر) ارسال خدمت کرتا رہیگا ...."

ادیب فاضل جناب سید احمداللہ صاحب قادری ایم آر اے ایس، لندن۔ مدیر رسالہ "تاریخ" حیدرآباد دکن ایک تازہ عنایت نامے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"ادب" کی توسیع اشاعت کے سلسلے میں آپ نے جو ذرائع اختیار فرمائے ہیں ان میں خاص جد و جہد کی ضرورت ہے۔ میں بھی ممکنہ کوشش سے دریغ نہیں کرونگا۔ کیونکہ "ادب" ایسے موقر اور بلند مرتبہ رسالے کی اہل علم

بہت سی مجبوریوں سے (جو دراصل ایک ہی مجبوری کی شاخیں ہیں) فروری کے "ادب" کی طباعت میں تاخیر ہوگئی۔ اس لیے مناسب سمجھا گیا کہ مارچ کا پرچہ بھی اسی میں ملا دیا جائے۔ چنانچہ دونوں نمبر مجموعی صورت میں حاضر ہیں۔ ہر نمبر ماہ بماہ نکلتا ہے تو کیا کہنا لیکن اگر کسی وجہ سے دیر ہو ہی جائے تو اس طرح دو نمبروں کا ایک ساتھ پہنچا دینا اتنا برا نہیں ہے جتنا علی العموم خیال کیا جاتا ہے۔ ناظرین کی ایک بڑی جماعت ادائیگی چندہ کے تقاضے پر سکوت اختیار کئے ہوئے ہے ایسی حالت میں ہماری مجبوریاں ظاہر ہیں۔ بہرحال ان نمبروں کے بعد اب اپریل کا پرچہ وقت پر حاضر کیا جا سکتا ہے۔

اس اشاعت کے چند مضامین پر کچھ اظہار خیال ضروری ہے۔

ہماری فسانہ نگاری۔ ملک میں آج کل فسانہ نگاری کی کثرت ہے تاہم یہاں اس فن کا ابتدائی دور ہے اس لیے اصلاح کی بڑی گنجائش اور تنقید کی بہت ضرورت ہے۔ ایسی صورت میں یہ قابل قدر مضمون فائدے سے خالی نہیں۔ امید ہے کہ عام فسانہ نویس اصحاب اسے بغور پڑھیں گے اور واقفکاران فن کے لیے اسکے مطالعے میں دلچسپی ہوگی۔

شگرف نامہ۔ شاہ عالم بادشاہ دہلی کے سفیر منشی اعتصام الدین بنگالی نے اپنے سفر ولایت کے حالات اس کتاب میں قلمبند کیے ہیں۔ جناب چودھری محمد محب اللہ صاحب سندیلوی ڈپٹی کلکٹر نے اسکا ترجمہ فرمایا ہے۔ اس کتاب کا دوسرا باب "ادب" خاص نمبر جنوری سنہ ۱۹۳۱ء میں شائع کیا گیا ہے۔ آج چند دیگر ابواب مترجم کے ایک نوٹ کے ساتھ ہدیۂ ناظرین ہیں۔ اس کتاب کے اور حصے بھی دلچسپ ہیں جو وقتاً فوقتاً حاضر کیے جائیں گے۔

کوئٹہ کے لڑکے اور عید۔ نہایت دلچسپ مضمون ہے۔ اسکے مطالعے سے آپ کو کوئٹہ کے جغرافیائی اور معاشرتی حالات معلوم ہونگے۔

قاضی جی۔ محترم مضمون نگار نے اس مضمون میں قدیم اودھ پنچ کا طرز نگارش اختیار کیا ہے جسکی وجہ سے اس میں بہت سی ایسی لفظیں استعمال کی ہیں جن کا مفہوم سمجھنے میں ناواقف اصحاب دقت محسوس کرتے ہیں۔ مگر زیر نظر حصہ میں ناواقفین کے لیے بھی دقت کم ہے لفظوں کی جو اجنبیت پہلے حصہ میں تھی وہ اب نہیں ہے۔ عبارت میں روانی بھی زیادہ ہے۔ ناظرین ملاحظہ فرمائیں۔ انشاء اللہ لطف اندوز ہونگے۔ آخری حصہ آئندہ اشاعت میں شائع ہوگا۔

حصۂ نظم - ادب کا حصۂ نظم ہمیشہ قابل قدر رہتا ہے ہمیں اُن حضرات سے دوستانہ شکایت ہے جو اس سے سرسری طور سے گزر جاتے ہیں - انکا یہ فعل ادب کی توہین اور ہماری کاوشوں کا خون کرتا ہے - یہ حقیقت ہے کہ تنہائی میں جی بہلانے یا صحبت کو محظوظ کرنے کی اس سے بہتر صورت نہیں کہ ادب کی نظمیں اور غزلیں پڑھی جائیں - ثبوت میں کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے - آپ اسی نمبر کا حصۂ نظم ملاحظہ فرمالیں -

اس سلسلے میں حضرت آرزو کی "**انوکھی باتیں**" جناب جوش کی نظم "**دیدوری**" - اور جناب اثر کی غزل خاص طور سے لائق مطالعہ ہیں - ان میں جو کیف ہے شراب میں نہیں !

"**چھٹیوں میں اسکول سے واپسی**" - ادب کی کوئی نظم اگر ناقابل مطالعہ ہے تو وہ یہی ہے - میں نے اپنی نظموں کو بجا طور پر مہمل سمجھ کر اس پرچے میں اب تک شائع نہیں کیا - 'ریاست' 'چمن' 'سرفراز' وغیرہ میں کبھی کبھی چھپیں مگر اپنے یہاں چھاپنا مناسب جانا - اس سے پہلے احباب کے نسبتاً کم زور اصرار کا لحاظ کر کے اپنی کچھ غزلیں شائع کی تھیں اور موقع پا کر ان کا سلسلہ بھی بند کر دیا تھا - مگر ابکی احباب کا اصرار اتنا پر زور ہے کہ یہی نظم درج کرنا نہ پڑی بلکہ آئندہ بھی اپنی نظمیں شائع کرنا ہوگا - امید ہے کہ عالی ظرف ناظرین اس مہمل نظم کو صبر و تحمل کے ساتھ شروع سے آخر تک پڑھ لیں گے - شاید انکا حسن نظر انھیں مغالطے میں ڈال دے اور کوئی مصرع پسند آ جائے !

حضرت آرزو جانشین جناب جلال لکھنوی نہ صرف اہل زبان اور زباندان ہیں بلکہ ماہر و مجتہد زبان بھی ہیں - تمام عمر زبان کی تحقیق ہی کا شغف رہا اور اردو کی خوش نصیبی کہ آپ اس شغف میں غیر معمولی طرح کامیاب ہوئے - آپکی تازہ تصنیف "**نظام اُردو**" اسکی شاہد ہے - جس حسن و خوبی سے اس کتاب میں اُردو زبان کے متعلق قانون بنا دیے گئے ہیں وہ حیرت انگیز ہے - اس تعریف سے ہماری مراد یہ نہیں ہے کہ اب اس موضوع پر اس سے بہتر تصنیف ناممکن ہے - ہم ناظرین کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ علم زبان اُردو کا جو لٹریچر ہمارے پاس اب تک موجود تھا اُسمیں نظام اردو سے ایک تازہ و گرانقدر اضافہ ہوا - محترم مصنف کی لکھی ہوئی متن کتاب کے علاوہ جناب ادیب صدر شعبۂ فارسی و اُردو لکھنؤ یونیورسٹی کے حواشی بھی نہایت بصیرت افروز ہیں - آسمان اُردو کے آفتاب و ماہتاب جب اک ساتھ ضیا بار ہوں تو علمی دنیا کیوں نہ جگمگا اُٹھے اور باریک باریک باتیں کیوں نہ سوجھنے لگیں ! !

یہاں تفصیل کی گنجایش نہیں ہے۔ نقد و تبصرہ میں اس سے زیادہ وضاحت کی گئی ہے۔ مزید وضاحت کی ضرورت ہو تو آئندہ اشاعت کا انتظار فرمائیے مگر ہم ناظرین کو مشورہ دینگے کہ وہ انتظار میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کتاب کو منگا کر خود ملاحظہ کریں۔

محترمی علی عباس صاحب حسینی ایم اے سے ناظرین "ادب" اچھی طرح واقف ہیں۔ "ادب" کی عمر تو تین ہی سال کی ہے۔ موصوف عرصے سے ملک کے وقیع جرائد میں علمی و ادبی خدمتیں انجام دیتے ہیں۔ آپ کے معیاری فسانے خاص طور پر خاص و عام کی سند حاصل کرتے ہیں۔ اگرچہ موصوف اپنی افتاد طبیعت ذمہ داری ملازمت، کثرت مشاغل علمیہ اور ذوق اصلاح قوم کی وجہ سے لسانی و قلمی پروپیگنڈے سے بہت سخت پرہیز فرماتے ہیں تاہم آپ کا شمار علی العموم اردو کے معدودے چند بہترین فسانہ نویسوں میں ہوتا ہے۔ اور یہ فیصلہ بالکل صحیح ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی صحیح ہے کہ آپ میں ایک ایسی امتیازی شان موجود ہے جس سے آپ کی حیثیت مشاہیر میں نمایاں اور آپکا مستقبل حال سے درخشاں معلوم ہوتا ہے۔

جذبۂ خود پسندی، حوصلہ رقابت فنی، مذاق عیب جوئی اور اقتضائے غیش زنی انسان کو انسان نہیں رہنے دیتا۔ اس سے کھوٹے کھرے کے پرکھنے کی صلاحیت ہی سلب ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ہماری رائیں کسی مصنف کے بارے میں اس قدر مختلف و متضاد ہوتی ہیں، اور یہی بدبختی ہے جو ہماری ادبی ترقی کی راہ میں سب سے زیادہ حائل ہوتی ہے۔ پھر بھی ایک مصنف کو اسی ماحول میں رہنا اور اپنی جانکاہیوں کی داد پانا ہے۔ بنابریں ہم محترمی علی عباس صاحب حسینی سے عرصے سے درخواست کر رہے تھے کہ موصوف اپنی دماغی کاوشوں کے بہترین نتائج یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع فرمائیں۔ بارے اب ہماری خواہش پوری ہوئی اور یہ امر حد درجہ موجب مسرت ہے کہ موصوف کے فسانوں کی پہلی جلد طبع ہو گئی۔

اس مجموعے کا نام "**رفیق تنہائی**" ہے۔ اور اسکے کچھ فسانے مطبوعہ، اور کچھ غیر مطبوعہ ہیں۔ ناشر نے منیجر ادب نے ایک معقول تعداد اس کتاب کی طلب کی ہے۔ ناظرین ادب ہمیں سے حاصل فرمائیں اور میری اس اشتہاری نہیں بلکہ غیر جانبدارانہ رائے کی صحت و عدم صحت کو جانچیں

ناظرین کو اس امر کی خوشخبری بھی سنائی جاتی ہے کہ ملک کے مشہور کامیاب مزاحیہ نویس جناب رشید احمد صاحب صدیقی ایم اے پروفیسر مسلم یونیورسٹی نے ہماری درخواست پر "ادب" کی قلمی اعانت کا حتمی وعدہ فرما لیا ہے۔ جون میں آپ اپنے گراں قدر مضمون سے سرفراز فرمائینگے۔ اور آئندہ بھی یہ عزت مستقلاً بخشتے رہینگے۔

"ادب" کے سچے بہی خواہ جناب شمس نونہروی سے ناظرین واقف ہیں۔ آپ حال ہی میں مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی غرض سے عازم سفر ہوئے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ آپ کے دلی مقاصد پورے ہوں۔ اور آپ اپنی دعاؤں کی مقبولیت سے شاد کام واپس آئیں!

سید اعظم حسین (بقلم)

"ادب" کے چندے میں ایک روپیہ کی رعایت

یکم اپریل سے ۳۱ مئی ۱۹۳۲ء تک جو اصحاب "ادب" کی خریداری منظور فرمائینگے اُن سے بجائے چار روپیہ سالانہ کے تین روپیہ سالانہ چندہ لیا جائیگا۔ اس رعایت کی میعاد سے پہلے جو حضرات اقرار خریداری فرما چکے ہیں یا اس کے بعد جو لوگ خریدار ہونگے وہ اس عارضی و اتفاقی رعایت کے مستحق نہ ہونگے۔ وہ حضرات جو صحیح ادبی ذوق رکھتے ہیں مگر چندے کی زیادتی کی وجہ سے اب تک خریدار "ادب" نہ ہوسکے، اس موقع سے ضرور فائدہ اُٹھائیں۔ "ادب" کی صوری حیثیت بھی عنقریب اس سے بہتر ہو جائیگی اسکے بعد تساہلی کرنے والوں کو اور بھی تاسف ہوگا!

طلبا کے لیے مزید رعایت ہوگی

گرمی کی تعطیل کلاں میں "ادب" کے مطالعے سے زیادہ اور کوئی کام موزوں نہیں ہے، گزشتہ پرچے اور آئندہ اشاعتیں دونوں سے وہ فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ انتہائی رعایت کے ساتھ۔ اس کے بارے میں جو کچھ دریافت کرنا ہو ہم سے دریافت کریں۔

مینیجر "ادب"

ہماری فسانہ نگاری

جناب خواجہ اطہر حسین صاحب ایم اے

سینما کی تصویریں اعلیٰ ماہرین فن کی نگرانی میں تیار کی جاتی ہیں۔ مقامی رنگ اور ملکی خصوصیات کو برقرار رکھنے میں امکانی احتیاط سے کام لیا جاتا ہے۔ گویا کوشش یہ ہوتی ہے کہ نقل مطابق اصل بن جائے۔ بالعموم یہ کوششیں ناکامیاب نہیں رہتیں۔ پھر بھی گاہے گاہے کوئی نہ کوئی ایسی فروگزاشت ہو جاتی ہے جو واقفکاروں کی نگاہ میں تصویر کی ساری خوبیاں برباد کر دیتی اور تعریف کو تنقیص کی خواہش سے بدل دیتی ہے۔

حال ہی میں مجھے ایک ایسی فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا جس میں منجملہ اور چیزوں کے مسلمانوں کی نماز باجماعت کا منظر بھی دکھایا گیا تھا۔ نمازیوں کی وضع قطع، صفوں کی ترتیب اور مقام عبادت کی آراستگی میں کسی قسم کا نقص نہ تھا۔ ارکان نماز کی بجاآوری بھی صحیح طریقے پر شروع ہوئی اور کچھ دیر کے لیے یہ محسوس ہونے لگا کہ مسلمانوں کا ایک بڑا مجمع اپنے مخصوص طریقے پر خدا کی عبادت میں مشغول ہے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اس نماز کی حقیقت ظاہر ہو گئی اور جو سماں دیکھنے والوں کی نگاہوں میں بندھا تھا وہ یکبارگی غائب ہو گیا۔ وجہ یہ تھی کہ نماز کی اس نقل میں رکوع کی درمیانی منزل غائب تھی صفیں کی صفیں حالت قیام سے دفعتہ سجدہ کی حالت میں پہنچ گئیں۔ لہذا کم از کم مسلمان ناظرین کے نزدیک یہ احتیاط اور محنت سے تیار کی ہوئی تصویر محض ایک بھدی نقل ہو کر رہ گئی۔

یہاں اس واقعہ کا تذکرہ کرنے سے میرا مقصد محض اس حقیقت کا اظہار ہے کہ جب ہم اپنے علم اور واقفیت کی محدود دنیا سے باہر نکل کر غیر مانوس چیزوں کی تصویر کشی پر آمادہ ہوتے ہیں تو طرح طرح کے خطرے ہماری راہ میں حائل ہو جاتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ ایک ادنیٰ سی فروگزاشت جو ہمارے نزدیک کوئی خاص وقعت نہ رکھتی ہو دوسروں کی نگاہ میں ہمارے بیان کو مضحکہ خیز بنانے اور ہماری

عدم واقفیت کے راز کو طشت از بام کرتی ہے۔ ہر ملک کے رسم و رواج، باشندوں کے طرز معاشرت اور آئین حیات میں بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کا علم غیر ملکی لوگوں کو خود انھیں لوگوں کے درمیان مدتوں رہنے سہنے کے باوجود بھی حاصل نہیں ہوتا۔ ممالک غیر کے باشندوں کی سیرت کے مطالعہ سے ان کی اہم خصوصیات سے واقفیت حاصل کر لینا کسی نہ کسی حد تک سہل ہے مگر روزانہ زندگی میں ان کی اُن خصوصیات سے باخبر ہونا بہت مشکل ہے جو بظاہر کوئی اہمیت نہیں رکھتیں مگر خاص موقعوں پر ملکی اور غیر ملکی کے امتیاز کی محک بن جاتی ہیں۔ اس لیے جب کبھی ہم اپنے افسانوں یا ڈراموں میں ممالک غیر کے باشندوں کے کردار اور اُن کے طرز معاشرت کی تصویر کشی کرتے ہیں تو ہمیں کبھی اس کا یقین نہیں ہو سکتا کہ ہمارا پیش کردہ مرقع نقائص سے پاک ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ جب ہماری واقفیت کی بنیاد محض کتابی ہو اور ہمیں ذاتی طور پر ان لوگوں سے ملنے جُلنے کے مواقع شاذ و نادر پیش آتے ہوں۔

یہ بات بالکل یقینی ہے کہ ہندوستان کے باشندوں میں بہت کم ایسے ہونگے جو انگریزی زبان میں خاصی مہارت رکھنے کے باوجود بھی اس کا دعویٰ کر سکیں کہ وہ یورپ یا انگلستان کے باشندوں کے طرز معاشرت اور اُن کے رسوم سے پوری طرح واقف ہیں۔ کسی غیر زبان میں مختلف علوم و فنون کی تعلیم حاصل کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہمیں اُس زبان کے بولنے والوں کی روزانہ زندگی اور اُن کے آداب اخلاق سے بھی پوری واقفیت حاصل ہو گئی ہے۔ جن انگریزوں نے ہندوستان میں خاصی مدت تک رہنے اور ہندوستانی طرز معاشرت کا مطالعہ کرنے کے بعد اپنے ناولوں اور افسانوں میں اس طرز معاشرت کی تصویریں کھینچی ہیں۔ اُن کی تحریروں میں بھی ہندوستان کے رہنے والوں کو بسا اوقات ایسی چیزیں مل جاتی ہیں جن سے مصنف کی لاعلمی کا راز آشکارا ہو جاتا ہے۔

اس طرح کا ایک ممتاز مصنف "رڈیارڈ کپلنگ" ہے۔ اینگلو انڈین طرز معاشرت کی تصویر کشی میں اُس سے زیادہ شہرت کسی کو حاصل نہیں ہوئی۔ اس کے افسانے بالعموم دلچسپ ہوتے ہیں لیکن یہ بھی اس قسم کی لغزشوں سے پاک نہیں ہیں۔ بلکہ بعض موقعوں پر وہی چیزیں جنھیں مصنف مقامی رنگ کو گہرا کرنے اور اپنی واقفیت کو نمایاں کرنے کی غرض سے پیش کرتا ہے اس کے برعکس اثر پیدا کرتی ہیں

مثلاً ایک متین اور سنجیدہ مکالمے کے بعد دو شخص ایک دوسرے سے رخصت ہوتے ہیں گفتگو میں ہندوستانی مذاق کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور ہر اعتبار سے مقامی رنگ کی سچی تصویر کشی کی گئی ہے۔ مگر حقیقت نگاری کی یہ تمام کوششیں یوں بیکار رہ جاتی ہیں کہ مکالمے کے اختتام پر جب ان میں سے ایک شخص سوال کرتا ہے "آپ کب ملاقات ہوگی؟" تو دوسرا جواب دیتا ہے "انشاء اللہ کل حاضر ہونگا"۔ محاورہ کی ایک معمولی سی غلطی پوری تصویر کے اثر کو زائل کر دیتی ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ کتاب کا مصنف غیر ملکی ہے۔

اُن دشواریوں کا احساس کرتے ہوئے چاہیے تو یہ تھا کہ ہمارے افسانہ نویس مغربی طرز معاشرت کی تصویر کشی میں بہت احتیاط سے کام لیتے اور جہاں تک ہو سکتا اس غیر محفوظ روش کے اختیار کرنے سے احتراز کرتے۔ لیکن واقعات اسکے خلاف ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے مختصر افسانہ نویس بلا ضرورت اپنے افسانوں کو مغربیت کا جامہ پہنانے اور پلاٹ کو سمندر پار لے جانے کے خواہشمند رہتے ہیں۔ اس طرح کے اکثر افسانوں میں اُن لوگوں کو جو مغربی طرز معاشرت سے سرسری واقفیت بھی رکھتے ہوں۔ طرح طرح کے غلط بیانات یا خلاف واقعہ چیزیں مل سکتی ہیں۔ ایسی صورت میں خود اُن لوگوں کو جنکے طرز معاشرت کی تصویر مصنف نے پیش کی ہے جتنی بھی خلاف واقعہ یا قابل اعتراض باتیں نظر آسکتی ہوں کم ہیں۔

ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس مغرب زدگی کی تہ میں چند خاص وجوہ کام کرتے نظر آئینگے پہلی وجہ تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس قسم کے بہت سے افسانے دراصل توڑے مروڑے ہوئے ترجمے ہوتے ہیں گو اس حقیقت کا اعتراف افسانہ نویس کے قلم سے کسی مقام پر نہیں کیا جاتا۔ اس غاصبانہ تصرف کا نتیجہ بالعموم یہ ہوتا ہے کہ افسانہ ایک معجون مرکب بن جاتا ہے جسمیں نہ مغربی طرز معاشرت باقی رہتی ہے نہ مشرقی۔ کہیں محض اشخاص اور مقامات کے نام مغربی اور باقی سب ماحول مشرقی کہیں حالت اسکے بالکل برعکس، اور کہیں ایسا خلط مبحث کہ اُسے کسی خاص نام سے تعبیر کرنا ہی ممکن نہیں ہوتا۔ اب اگر ترجمہ کو محض ترجمہ رکھا جائے اور اس پر دست تصرف دراز نہ کیا جائے تو اس قسم کی بدنظمی کبھی واقع نہیں ہو سکتی۔

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ غیر مانوس چیزوں کا ذکر کرنے میں افسانہ نگار کا قلم بہت آزادی سے

چل سکتا ہے۔ خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ اسے یہ بھی یقین ہو کہ ان چیزوں کے بارے میں قارئین کی معلومات بھی اتنی ہی محدود ہیں جتنی کہ خود اسکی۔ وہ سمجھتا ہے کہ اقوام غیر کی سیرت نگاری میں صحت بیان کا لحاظ رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ بلکہ یہاں جس چیز کو جس رنگ میں جی چاہے پیش کیا جاسکتا ہے۔

ایسی حالت میں ممکن ہو کہ افسانہ نگار اپنے افسانے کے پلاٹ کو غیر معروف ماحول میں لیجا کر تنقید کی زد سے محفوظ ہو جائے لیکن درحقیقت یہ روش خود اسکے افسانوں کو ان صفات سے محروم کر دیتی ہے جن پر کامیاب افسانہ نگاری کا دارومدار ہے۔ زمانۂ حال کے ناولوں اور مختصر افسانوں کی ہر لعزیزی اسی مسلمہ اور مصدقہ اصول پر مبنی ہے کہ ان میں ہر قدم پر واقعیت موجود رہتی ہے۔ ممکن ہے کہ جو کچھ بیان کیا جائے وہ حقیقۃً واقعات نہ ہوں۔ مگر افسانے کے تمام اجزا ہر حیثیت سے ممکن الوقوع ضرور ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر افسانہ نگار مقامی خصوصیات کو مدنظر نہ رکھیگا تو اسکے قلم سے جیتی جاگتی ہستیوں کی تخلیق بھی ممکن نہ ہوگی اور اسی وجہ سے اسکے افسانوں میں واقعیت کی وہ جھلک بھی مفقود رہیگی جو قارئین کی دلچسپی کا باعث ہو سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ تخلیقی ادب کا مصنف محدود معنی میں واقعہ نگار نہیں ہوتا۔ لیکن اسکا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ اسے زمانی اور مقامی خصوصیات کا لحاظ رکھنے اور فطرت کی صحیح تصویر کشی کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

ایک تیسری وجہ جو افسانہ نگاروں کو ہندوستان کی جانی پہچانی فضا چھوڑ کر یورپ، انگلستان یا دیگر ممالک غیر کی طرف متوجہ ہونے پر مائل کرتی ہے اسکا تعلق خود ہندوستان کے مخصوص طرز معاشرت سے ہے۔ جن افسانوں کے پلاٹ کی بنیاد عشق و محبت کے جذبات پر ہوتی ہے ان کے لیے افسانہ نگار کسی ایسی فضا کی ضرورت محسوس کرتا ہے جہاں مردوں اور عورتوں کو آزادی سے ملنے جلنے کے مواقع حاصل ہوں۔ ورنہ اسکے سوا چارہ کار نہیں رہتا کہ حسن و عشق کے غیر شائستہ افسانوں کی تصویر کشی کی جائے اور مخرب اخلاق لٹریچر کی مقدار میں اضافہ کیا جائے۔ پردہ کی دشواریاں اور رسم و رواج کی پابندیاں مشکل سے اسکا موقع دیتی ہیں کہ معیار اخلاق کو پست کیے بغیر دلچسپ پلاٹ مرتب کیے جاسکیں۔ لہذا افسانہ نویس اسکو غنیمت سمجھتا ہے کہ اپنے افسانہ کو ایسی فضا میں پہونچا دے جہاں شرافت اور شائستگی کا دامن چھوڑے بغیر صنف نازک کو بھی پلاٹ میں شریک کیا جاسکے۔ ہمارے یہاں اس طرح کے ناولوں اور افسانوں کے زیادہ تر مخرب اخلاق ہونے کی خاص وجہ غالباً یہی دشواریاں ہیں جو عورتوں اور مردوں کے باہمی میل جول میں حائل ہیں۔ پردے کے قیود کو مدنظر

"وادب"

رکھتے ہوئے عشق و محبت کے جذبات کا دو غیر ہستیوں کے دلوں میں پیدا ہونا اسکے بغیر ممکن ہی
نہیں ہو سکتا کہ اسکی ابتدا کسی معیوب، قابل اعتراض یا غیر شریفانہ طریقے پر ہوئی ہو۔ اس لیے کہ
اگر پردہ کے معینہ حدود سے قدم باہر نہ رکھا جائے تو اس طرح کے جذبات کے پیدا ہونے کی
نوبت ہی نہیں آ سکتی۔ یا بالفاظ دیگر یوں کہا جائے کہ کسی نامحرم عورتوں اور مردوں کا ایک
دوسرے پر عاشق ہو جانا، بطور خود اسکا ثبوت ہے کہ انکا اخلاقی معیار اتنا بلند نہیں ہے جتنا کہ
ہونا چاہیے تھا۔ اس طرح کے آغاز کے بعد خفیہ پیشہ دوانیاں، نامہ و پیام، چوری چھپے کی ملاقاتیں،
دھوکہ بازی، مکر او فریب۔ یہ سب ایسی باتیں ہیں جو متوقع نتائج کی صورت رکھتی ہیں اور داستان
عشق کو بدسے بدتر بناتی جاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ پردہ فی نفسہ
اچھی چیز ہے یا بری۔ البتہ یہ بتانا مقصود ہے کہ عشقیہ افسانے ہمارے رسم و رواج اور ہماری معاشرت
کے لیے موزوں چیز نہیں ہیں۔ اس لیے کہ جو باتیں پردہ کی قیود سے آزاد ملکوں اور قوموں میں شرافت
اور اخلاق کے اصول کو پامال کیے بغیر واقع ہو سکتی ہیں وہی باتیں رسم پردہ کی پابند قوموں میں اخلاقی
جرم کی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں۔ اسکے ماسوا اگرچہ اہل ہنود میں پردہ جزو مذہب نہیں ہے تاہم
شریف طبقوں میں عملی حیثیت سے موجود ہے اور مردوں اور عورتوں کے باہمی میل جول میں کسی
طرح کی دشواریاں اُن کے یہاں بھی حائل ہیں۔ سوئمبر کی رسم کبھی ہندوستان میں رائج تھی۔ مگر
فی زمانہ شوہر کے انتخاب میں یا غیر مردوں سے رسم و راہ رکھنے میں نہ مسلمان خواتین آزاد ہیں نہ اہل ہنود
کی سوسائٹی میں اسکا چلن ہے۔ لہذا عشقیہ افسانہ کا آغاز کسی ایسے اقدام کا محتاج رہتا ہے جسکی
سوسائٹی اجازت نہیں دیتی۔

ان حالات میں اگر افسانوی ضرورتیں مصنف کو ممالک غیر کے باشندوں کی تہذیب اور انکے
رسم و رواج سے فائدہ اُٹھانے کی طرف مائل کریں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ پھر بھی وہ
مقامی خصوصیات کو برقرار رکھنے اور فطرت کی صحیح ترجمانی کرنے کے فرائض سے سبکدوش نہیں
سمجھا جا سکتا۔ اُسکا فرض ہے کہ جن لوگوں کی سیرت نگاری کا دعویٰ کر کے اس نے قلم اُٹھایا ہے
اُن کے اخلاق و آداب کا پورا لحاظ رکھے اور واقعیت کا دامن کسی وقت نہ چھوڑے۔ اُسے اسکا
حق حاصل ہے کہ دو باتوں میں سے ایک کا انتخاب کر لے۔ یا تو اپنی سوسائٹی کے معینہ حدود کے

اندرونی کر لیتے افسانوں کے ترتیب دے۔ یا تمام کسی غیر کی معاشرت کا خصوصی واقفیت حاصل کرے پھر جو آزادی ہاں ممکن ہیں ان سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن اگر مقامی خصوصیات سے واقفیت حاصل کرنا اسے امر دشوار نظر آئے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ وہ اپنے وطن یا اپنی معاشرت سے باہر قدم رکھے۔ مشاہدہ کرنے والی نگاہوں کے لیے ہر گھر میں ایک افسانہ اور ہر قدم پر ایک انسان موجود ہے۔ اس وقت بھی ایسے افسانہ نویس ملک میں موجود ہیں جو ایران و توران، شام و روم کی دھندلی تصویریں پیش کرنے یا کسی ویلیم اور میری کی خلاف حقیقت سیرتیں اختراع کرنے کی بجائے لکھتے ہیں۔ محدود اور مانوس ماحول میں رہ کر دلچسپ اور کامیاب افسانے لکھنے پر قادر ہیں۔ انکی کامیابی کا راز انکی حقیقت نگاری پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ ان افسانوں میں پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ فطرت کی صحیح ترجمانی اور جیتی جاگتی تصویروں کی تخلیق کی گئی ہے۔ یہاں تک کہ یہ افسانوی ہستیاں پڑھنے والے کی نگاہ میں گوشت پوست سے بنے ہوئے سچ مچ کے انسانوں کا رتبہ حاصل کر لیتی ہیں اور انکی خصوصیات اسکے دل و دماغ پر ہمیشہ کے لیے ثبت ہو جاتی ہیں۔

اس سلسلہ میں مکالموں کا مسئلہ بھی خاص توجہ کا مستحق ہے۔ واقعیت کی شان کو برقرار رکھنے کے لیے اسکی اشد ضرورت ہے کہ افسانہ کی ہر فرد کی زبان سے اس طرح کے الفاظ اور خیالات کا اظہار ہو جسکی توقع واقعیت کی دنیا میں بالعموم کی جا سکتی ہو۔ روزمرہ کی بلا تکلف گفتگو سے زیادہ کوئی چیز انسان کی ذاتی خصوصیات کا آئینہ نہیں ہوتی۔ تحریر میں شخصیتوں کا فرق ایک حد تک مٹ جاتا ہے۔ مگر عام بول چال میں ایک حصۂ ملک کا رہنے والا دوسرے حصۂ ملک کے باشندے سے فوراً علیحدہ کیا جا سکتا ہے۔ اسکے علاوہ اسکے الفاظ یہ بھی پتہ دے دیتے ہیں کہ اسکا تعلق سوسائٹی کے کس طبقے یا درجے سے ہے۔ ایک شریف طبقے کے تعلیم یافتہ شخص کی گفتگو غیر تربیت یافتہ لوگوں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ دیہاتیوں کا مکالمہ شین قاف سے درست نہیں ہو سکتا۔ کلکتے اور لکھنؤ کے انداز تکلم میں فرق ضروری ہے۔ دلی اور بمبئی کے رہنے والے ایک ہی طرح اظہار خیال نہیں کرتے۔ افسانہ نویس کے لیے از حد ضروری ہے کہ وہ افسانے میں واقعیت کی جھلک پیدا کرنے کے لیے زبان کی ان باریکیوں سے واقف ہو اور لب و لہجہ و انداز تکلم کے اس طرح کے فرق کو نظر انداز نہ کر دے۔ کسی افسانے کو کامیاب بنانے کے لیے جس طرح پلاٹ کا مرکزی خیال اور اسکے اجزا کا باہمی اتصال

ضروری ہے۔ اسی طرح اسکے کرداروں کو واقعی و حقیقی بنانے کے [illegible] معاشرت و رعایا کی صحیح مرقع کشی اور آپس کی بول چال کا ہو بہو نقشہ کھینچنا بھی از حد ضروری ہے۔ انھیں چھوٹی چھوٹی فروگزاشتوں کی وجہ سے ہمارے اچھے سے اچھے فسانے بھی تیسرے درجے کی تصنیف ہو کر رہ گئے ہیں اور انھیں اُردو ادب میں اس طرح کی مستقل جگہ نہیں مل سکی جسکے وہ پلاٹ کی خوبی اور بیان کی شیرینی کے لحاظ سے مستحق تھے۔

شگرف نامہ[1]

باب ۳

(راقم کا جہاز میں سوار ہونا اور دریائے شور میں ہگلی سے موریچ تک سفر کرنا)

۹ شعبان سنہ ۱۱۷۹ھ مطابق ۱۳ ماگھ سنہ ۱۱۷۲ ف کو اللہ پر بھروسہ کر کے اور یہ پڑھتے ہوئے۔

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفان شور افزا   دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسا ہا

ہگلی میں موسیو موریل فرانسیسی جہاز میں سوار ہو گیا۔ قاضی علیم اللہ وغیرہ کو جو مجھے رخصت کرنے آئے تھے واپس کر دیا۔ اُس وقت غربت وطن اور جُدائی اقربا سے مجھ پر جو حالت طاری تھی وہ اللہ تعالے کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ جب ناخدائے خدا ترس نے لنگر اُٹھایا اور جہاز کے رسوں کو اوپر کھینچا۔ جہاز نے موافق ہوا پائی چار روز میں دریائے شور کے کنارے پہونچا اور دو ماہ کے بعد فرانسیسی مقبوضہ جزیرہ موریچ میں داخل ہوا۔ دریا کا کنارا بہت وسیع ہوتا ہے اور جیسا کہ کہا ہے ع

بقدر بحر باشد آغوش ساحلہا

کنارے کا پانی میٹھا اور کھاری ملا ہوا ہوتا ہے اور چونکہ زمین سطح آب کے قریب ہوتی ہے اُس کا رنگ سفید ہوتا ہے جب وہاں سے گزر کر دریائے عماں کے کنارے پہونچا، اُسکا پانی نیلا سیاہی مائل تھا اور لہروں کی وجہ سے دریا کے حباب رات کو چراغوں اور جگنوؤں کی طرح تاباں تھے۔ انھیں وجوہ سے حکما کا قول ہے کہ دنیا ایک پہاڑ سے گھری ہوئی ہے۔ وہ پہاڑ سنگ زمردکا ہے بہت بلند ہے جسکو بعض لوگ کوہ قاف کہتے ہیں اور آسمان شیشے سے زیادہ صاف اور آئینے کی طرح شفاف ہے وہ اُسی زمردی پہاڑ کے عکس پڑنے سے نیلگوں دکھائی دیتا ہے سمندر کا پانی آسمان کے رنگ کی وجہ سے نیلا ہو جاتا ہے۔ اسکی دلیل یہ ہے کہ جب دریائے

[1] مترجمہ جناب چودھری محمد محب اللہ صاحب ڈپٹی کلکٹر۔

"اوپ"

پانی نکال لیا جاتا ہے تو اسکا رنگ سفید معلوم ہوتا ہے۔ اور تلخی اور کھاری پن اس وجہ سے ہوتا ہے کہ پانی میں بخارات ملے ہوئے ہوتے ہیں۔

میں مجبوراً اسی دریا کے پانی سے غسل کرتا تھا۔ ڈاکٹر لوگ دریا کی آب و ہوا کو تندرست اور مریض کے حق میں مفید بتاتے ہیں۔ اور مجھ کو بھی ایسا ہی تجربہ ہوا کہ کبھی مجھکو بخار وغیرہ بھی نہیں آیا۔

باب ۴

[کلاہ پوشوں کا بمبئی، مدراس، پھولجہری اور بنگال میں آنا اور اپنے ملک کے تحفے لانا]

چونکہ گزشتہ زمانہ کی جہاز رانی اور کلاہ پوشوں کے ہندوستان آنے کا حال مناسب موقع معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے مختصراً ان واقعات کو قلمبند کرتا ہوں۔ تواریخ سے ثابت ہے کہ گزشتہ زمانہ میں یورپ کی قوم پورچگیز سب کلاہ پوش قوموں میں طاقت و قوت شوکت و حشمت کے لحاظ سے اسی طرح ممتاز تھی جس طرح کہ اس وقت انگریزوں کی قوم ہے۔ وہ اول اول جہاز ملک دکن اور بنگال میں لائے۔ قریب دو سو برس کا زمانہ ہوا کہ اکبر بادشاہؒ کے عہد میں وہ جزیرہ پلوار سیلامن اور نیکو وغیرہ میں پہونچے اور دریائے شور کے قرب جوار کی رعایا کو تباہ و برباد کرنے اور لوٹنے لگے، جیسا کہ اکبر کے زمانہ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ فرنگیوں کی بدبخت قوم دریائے شور کے جزیروں میں شورش برپا کر رہی ہے۔ اُس نے حرمین شریفین کے زائروں کا راستہ روک دیا ہے اور خدا کے بندوں کو بے ساز و سامان کر رہی ہے۔ یہ وہی بدبخت قوم پرتگیز تھی جو اپنی سیاہ کاری ظلم اور مردم آزاری کی وجہ سے قہر خدا کی سزاوار ٹھہری اور وہ خود اس وقت ویسی ہی بے سر و سامان ہے۔ خدا کے حکم سے پرتگال کی دار السلطنت میں زلزلہ آیا۔ شہر اور تختگاہ غرق آب ہوئے۔ کچھ لوگ ہوشیاری سے بھاگ کر بچے اور بقیہ ضایع ہو گئے۔ پناہ پائے ہوئے بادشاہ، عہدہ داران اور تاجروں کا سب مال و اسباب غرق ہو گیا۔ اس وقت سے وہ شکست پر شکست کھانے لگے اور کمزور ہونے لگے۔ اس وقت شاہ انگلستان شاہ پرتگیز کا حامی و مددگار ہے۔

چونکہ نفیس چیزیں مثل سفید و ریشمی کپڑا افیون اور ریشم کی ولایت میں بڑی مانگ ہے اور انکی بڑی قیمت ملتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک سفید تھان جو یہاں مبلغ عہ کو ملتا ہے وہاں جاکر

جہاں یہ مال زیادہ فروخت ہوتا ہے۔ اس لیے ہندوستان، سورت اور گجرات کے تاجر بنگال کے مال کو بصرہ اور جدہ لے جاتے تھے اور وہاں سے عرب کے تاجر خرید کر شام، مصر اور روم لے جاتے تھے اور وہاں سے ہر مغربی ملک میں روانہ ہوتا تھا۔ ایسی حالت میں کلاہ پوشوں نے یہاں براہ راست جہاز رانی کی تدبیر نکالنا چاہی لیکن اُس زمانہ میں اس قدر بڑے اور مضبوط جہاز نہ تھے، اُن کا ساز و سامان اور چلانے کا طریقہ ایسے اعلیٰ پیمانے پر نہ تھا جیسا کہ اب ہے۔ راہداری اور جستجو سمت کے طریقے بھی نہیں معلوم تھے۔ اس لیے وہ یہاں تک آنے سے مجبور تھے۔ آخرکار شاہ پرتگیز نے کمر ہمت باندھ کر تین چار جہاز کا ساز و سامان مع ایک سال کی رسد کے فراہم کر کے انھیں ماہرین فن کی نگرانی میں ممالک شرقیہ کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ راستہ معلوم کرتے ہوئے چلے جائیں۔ یہ ماہرین فن دریائے شور کے کنارے کا اندازہ کرتے ہوئے جہاز چلاتے تھے اور ہزار کوشش و محنت سے دن کو دو تین کوس سے زیادہ راہ طے نہ کرسکتے تھے۔ ہر وقت پانی میں رسی ڈال کر گہرائی کی پیمائش کرتے تھے اور مخدوش مقامات و چٹانوں سے بڑی احتیاط کے ساتھ بچتے جاتے تھے۔ جہاز کنارے کے باہر بھی نہیں لے جاتے تھے کیونکہ اُس وقت تک قطب نما راستہ معلوم کرنے کے لیے ایجاد نہیں ہوا تھا۔ دریا کے کنارے سے اندازہ کر کے راستہ معلوم کرتے تھے اور بچا بچا کر احتیاط سے جہاز چلاتے تھے۔ جہاں کہیں خشکی یا پہاڑی مل جاتی تھی وہاں واپسی کی آسانی کے خیال سے نشان قائم کرتے جاتے تھے۔ چنانچہ اس طرح ایک سال میں ۴۵ کوس طے کرتے تھے۔

اس آمد و رفت میں کئی جہاز اور آدمی ضائع ہوئے یہاں تک کہ وہ مقام کاف پر جسکو انگریز "کیپ آف گڈ ہوپ" کہتے ہیں پہونچے۔ یہ ملک حبش کے جنوبی گوشے پر دریائے شور میں واقع ہے۔ یہاں پہونچ کر یقین ہوا کہ دنیا اس سے آگے نہیں ہے اور اب ملک دکن نزدیک ہے اور وہاں آسانی سے جا سکتے ہیں۔ جب یہ خبر ولایت پہونچی اُس وقت سب لوگ خوشی میں اپنی ٹوپیاں اُچھالنے لگے۔ اس وجہ سے اُس مقام کا نام "کیپ آف گڈ ہوپ" رکھا جسکے معنی "اچھی امیدوں کی جگہ" کے ہیں۔ القصہ وزبرہ زر کی بڑی کوششوں سے ضلع مدراس، جزائر بلوار، نیکو اور لنکا میں دکن کے قریب سات سال کے عرصے میں داخل ہوئے اور اس ملک کی نفیس چیزیں اپنے ملک میں لے گئے۔ کلاہ پوشوں کو اس درجہ خوشی ہوئی کہ گویا اُن کو ہفت اقلیم کی بادشاہت مل گئی۔ سمندر کا راستہ صاف

"ادب"

ہوگیا اور جیسے جیسے جہاز رانی میں ترقی ہوتی گئی وہ تجار دو تین چار سال میں سفر کرنے لگے۔ دانشمندان فرنگ نے سمندر کے راستوں کے نقشے بنائے اور اس ملک کے مشہور حالات پر کتابیں لکھی اور تمام ملک میں شائع کیں۔ ہر کلاہ پوش قوم مثلاً فرانس انگلستان اور ولیس یکے بعد دیگرے یہاں آئے۔ اور بمبئی، مدراس، پھولچیری اور بنگال میں مکانات بنائے اور تجارت شروع کی اور اس ملک کے باشندوں کو ولایت کی عجیب و غریب چیزوں سے خوش کیا۔

باب ۵

[انگریزوں کا بہ حکم جہانگیر مکانات تعمیر کرنا اور بعد وفات عالمگیر بادشاہ قلعہ بنانا]

چونکہ اہل پرتگال اکبر بادشاہ کے عہد میں جزائر دریائے شور کی رعیت کو بہت پریشان کرتے تھے اور ہمیشہ لشکر شاہی سے جنگ کرتے رہتے تھے۔ اس لیے بادشاہ کی رضامندی نہ ہوئی کہ وہ یہاں اپنے قیام کے واسطے مکانات تعمیر کریں۔ جہانگیر بادشاہ کے عہد میں سب کلاہ پوشوں نے نہایت عاجزی اور خوشامد سے التماس کرکے عجیب و غریب تحفوں سے اُن کو خوش کر دیا۔ بادشاہ بڑے رحمدل تھے۔ اُن لوگوں کی عاجزی اور بیکسی پر نظر کرکے اور اُنکی سرمایہ دارانہ اور تاجرانہ سہولت کا خیال کرکے اور ملک فرنگ کی عجیب و غریب اشیا کی آمد کی وجہ سے عوام کی بہبودی اور ملک کی ترقی مدنظر رکھتے ہوئے حکم دیا کہ دریائے شور کے کنارے کے ملکوں میں تجارت کی کوٹھیاں تعمیر کرلیں، نہ یہ کہ قلعے بارہ برج جیسے کہ اس وقت موجود ہیں اُنکی تعمیر کا حکم دیا ہو۔ رحلت بادشاہ کے ایک عرصہ کے بعد اُنھوں نے ولایت کے تحائف اور نذرانہ سے عہد عالمگیری میں ناظموں اور فوجداروں کو اپنے موافق کرکے قلعے بنائے جیسا کہ اس وقت تک گرجا سے ثابت ہوتا ہے۔ پرتگیز نے بالاگڈھ میں ہگلی کے قریب سکونت اختیار کی۔ فرانسیسیوں نے چین نگر عرف فرانسس ڈانگہ میں قیام کیا اور انگریزوں نے بمقام کول گھاٹ ہوگلی میں گدی بنائی جو اس وقت تک وہاں قائم ہے۔ الجانہ ڈانگہ کو اب قواب گنج کہتے ہیں اہالیان ولیز مجرہ میں آباد ہوئے اور وہاں اب تک آباد ہیں اور اہالیان ڈنمارک نے شیورامپور میں قیام کیا۔

باب ۶

حضرت اورنگ زیب کا قلعہ گولکنڈہ فتح کرنا، انگریزوں کا غلہ وغیرہ بھیجنا۔ اور انعام میں چالیس بیگہ اراضی معافی، اور معافی محصول اشیاء ولایتی حاصل کرنا

چونکہ انگریزوں کی کوٹھی کول گھاٹ میں ہوگلی کے فوجدار کے نزدیک تھی وہ سب اتوار کے دن اپنی عبادت کے وقت گھنٹہ زور زور بجاتے تھے جسکی آواز فوجدار ہوگلی اور جامع مسجد کے نمازیوں کے کانوں میں پہونچتی تھی اور اُنکی نماز میں خلل پڑتا تھا اس لیے فوجدار ہوگلی کو جو بے حد پابند شرع تھا یہ حرکت بُری معلوم ہوئی۔ اُس نے بارہا کہلا بھیجا کہ گھنٹہ اس قدر آہستہ بجاؤ کہ ہمانتک آواز نہ آئے اور ہماری نماز میں خلل نہ پڑے۔ مگر اُن لوگوں نے اسکو منظور نہیں کیا اور ویسی ہی اپنی عادت کے موافق بجاتے رہے۔ لہذا بادشاہ عالمگیر کے حکم سے انگریزوں کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ مسٹر چارنک وہاں سے نکل کر ایک موضع میں آئے، اور وہاں گرجا بنایا۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ موضع اچانک کے نام سے مشہور ہے۔

چونکہ انگریز ہمیشہ سے "اُولوالعزم" عالی ہمت اور بلند حوصلہ ہیں۔ اس لیے جب بادشاہ عالمگیر دکھن میں گولکنڈہ کی فتح میں مصروف تھے۔ اُسکی مضبوطی کی وجہ سے فتح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی اور ایک مدت دراز تک محاصرہ جاری رہا لشکر شاہی میں رسد وغیرہ کی کمی پڑی اُس وقت مسٹر چارنک بنگال سے غلہ وغیرہ سے جہاز بھر کر دکھن پہونچ گئے۔ غلہ اور رسد بکثرت فراہم کر کے لشکر کو قحط سے نجات دی اور خود بادشاہ کی اشیاء نویسی کو حاضر ہو کر طرح طرح کے تحائف پیش کیے اور قلعہ فتح کرنے کے سامان کی فراہمی اور خوش انتظامی سے تھوڑے عرصہ میں قلعہ کو فتح کرلیا۔ ان خدمات کی وجہ سے بادشاہی مہربانی حاصل کی۔ صلہ میں چالیس بیگہ رقبہ کی جاگیر کوٹھی وغیرہ بنانے کے لیے لی اور مال تجارت کے محصول کی معافی حاصل کر کے واپس آئے۔

نوٹ:۔ اس مقام پر یہ ظاہر کرنا باعث فخر ہے کہ مترجم کے مورث اعلیٰ نواب حبیب اللہ خاں نے بہ حیثیت فوجی افسر کے قلعہ گولکنڈہ اور قلعہ واکن کھیڑہ فتح کیا تھا۔ اس واقعہ کا تذکرہ مترجم کے پردادا کے چچا جناب مولوی شیخ احسان اللہ خاں صاحب ممتاز الشعراء ممتاز ادنامی نے اپنی اُس عرضداشت میں کیا تھا جو آپ نے حضور بادشاہ

سراج الدین محمد بہادر شاہ کیجی تھی اور اس پر حسب ذیل حضرت کی تصدیق ہے:-

(۱) سید طالب علی چودھری پرگنہ انام دیوان محمد علی شاہ بادشاہ۔

(۲) مرزا شگفتہ بخت بہادر۔

(۳) جواں بخت مرزا جہاندار شاہ ولی عہد شاہ عالم بادشاہ غازی۔

(۴) خادم شرع شریعت قاضی محمد روشن۔

(۵) خادم شرع جمیل تصدق نبی

اصل سترجم کے ماموں شیخ محمد روح اللہ صاحب وکیل اُناؤ کے قبضہ میں اس وقت تک موجود ہے اور اسکی نقل مترجم نے فارسی مثنوی بحر مواج مولفہ حضرت تمنا میں درج کردی ہے۔ اس میں تحریر ہے کہ جد امجد دیوان شیخ فتح اللہ عالم بے بدل اور یکتہ ہر فن نے حضرت شاہ جہاں بادشاہ کے زمانہ میں دارا شکوہ کے ہم درس ہو کر تعلیم حاصل کی اور کل ہندوستان کے دیوان رہے۔

ان کے بڑے بیٹے نواب حبیب اللہ خاں بکتر پوش پنج ہزاری فن سپاہ گری میں یکتائے زمانہ تھے حضرت عالمگیر کے زمانہ میں ترقی کی اور مہم دکن میں شہید ہوئے۔

دیگر بزرگان کے کارنامے دکھاتے ہوئے تمنا نے اپنے والد بزرگوار نواب عظمت اللہ خاں کے بارہ میں لکھا ہے کہ وہ حضرت شاہ عالم بادشاہ کے ساتھ الہ آباد و عظیم آباد میں تھے۔ گرچند وجوہ کی بنا پر اُناؤ میں آکر خانہ نشین ہو گئے۔

اسی طرح ایک دوسری عرضداشت میں جو نظم کر کے جناب تمنا نے حضرت اکبر شاہ ثانی کی خدمت میں ارسال کی تھی۔ بزرگان کے اعزاز و خدمات دکھاتے ہوئے لکھا ہے کہ

جد اعلاش شیخ فتح اللہ — بہ جمیع علوم و فن آگاہ
داشت ترک فلک ز تیغش ترس — بود دارا شکوہ را ہم درس
داد شاہجہانش دیوانی — بوسہ زد طالعش بہ پیشانی
پسر ارشد ش حبیب اللہ — بود دارا شکوہ را ہمراہ
تا بیفزود جاہ تاج د سر ید — شاہ اورنگ زیب عالمگیر
خواندہ دیدش دلیر و شیر گیر — با فنون شجاعتش نہ دگر

کرد اورا خطاب بکتر پوش — ہم ز تشریف و جاہ گوہر پوش
آں سر قدر دانی آں شاہ — عَلَم و طبل یافت جاہ و سپاہ
در دکن حملۂ تحت او کرد — فتح آخر بآخرت رو کرد
عظمت اللہ پور آں مغفور — یافت زاں آفتاب عظمت نور
تقی اللہ خاں نایب یعنی — شاہ عالم حضرت یعنی
در رکاب خدیو پاک بہاد — بہ سفر بود تا عظیم آباد
مرخش انتزاع طاقت کرد — بہ وطن اختیار عزلت کرد
یعنی او نام
بود شام و سحر دریں عزلت — بدعاے بقائے ایں دولت

غرضیکہ مترجم کا خاندان حضرت بابر سے اخیر وقت تک نمک حلال و وفادار رہا۔ جب حضرت شاہ عالم بادشاہ نے لارڈ کلایو کو دیوان کی سند عطا فرمائی تو نواب عظمت اللہ خان بوجہ اپنے وطن ضلع اوناؤ میں گوشہ نشین ہو گئے۔

گویا رباعی ذیل پڑھتے ہوئے چلے گئے۔ ؎

صبح عشرت کی شام ہوتی ہے — بزم آخر تمام ہوتی ہے
ہاں اجل آج آ جو آنا ہے — انجمن اختتام ہوتی ہے
(از بزم آخر)

ریختی

جناب منور عباس صاحب شہاب بی اے

(گزشتہ سے پیوستہ)

عصمت

امانت نے جان صاحب کے مقابلہ پر دو ریختی گو عصمت اور ہدایت تیار کیے تھے عصمت کا نام امجد علی خاں تھا۔ ان کے باپ حسین علی خاں محمد علی خاں مسیحا کے شاگرد تھے۔ کلام کا نمونہ حاضر ہے۔

نہ لیتی نام تک ہرگز نکھٹو کا کبھی ماما
مگر کچھ پاس ہے مجھ کو بڑے بوڑھوں کی عزت کا

نگوڑے شیخ نے پھر آج افیوں لے کے کھائی ہے
میں ڈرتی ہوں بوا پھر سامنا ہوگا قیامت کا

تری خاطر سے گھر سے ان اٹھے آتی ہوں ورنہ
کسی نے آج تک آنچل نہیں دیکھا ہے عصمت کا

پری

جھمن نام تھا دہلی کے رہنے والے تھے۔ مرزا رحیم الدین حیا کے شاگرد تھے۔ انکے زیادہ حالات نہ مل سکے۔ ہر تذکرہ میں انکے تین ہی شعر ملتے ہیں۔

دنیا کے مردوے مرے اوپر فدا ہوے
مجھ آشنا مزاج سے سب آشنا ہوے

اب کے تو مردوے ہیں غا باز بے وفا
اگلے تماش بین خدا جانے کیا ہوے

....

نازنین

مرزا علی بیگ نام تھا۔ نازنین تخلص کرتے تھے، ذوق کے شاگرد تھے۔ نساخ کا قول ہے کہ جان صاحب سے اچھی ریختی کہتے تھے۔ کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ ؎

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا جواں تاکا
بُوا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا

مجھے کہتے ہیں بھابی تو نے تاکا چھوٹے دیور کو
نہیں ڈرنے کی میں بھی ہاں ہنیں تاکا تو اب تاکا۔

اگر اے نازنیں تو دبلی پتلی کامنی سی ہے
چھریرا سا بدن نام خدا ہی تیرے دولھا کا

ذوق کے مرنے کی تاریخ کہی ہے۔ قدسی کی مشہور غزل پر مصرعے لگائے ہیں۔ طوالت کے خوف سے نظمیں یہاں نہیں لکھی جاتیں۔

خانم

عبد اللہ خاں نام تھا ریختہ میں محشر اور ریختی میں خانم تخلص کرتے تھے۔ اپنے تئیں غالب کا شاگرد بتلاتے تھے۔ پڑھتے تھے بڑے مزے لے لے کر۔ تین شعر ہدیہ ناظرین ہیں۔

کیا بُرے ہیں یہ چلے دل کے جلانے والے
اور یہ آگ میں آگ آئے لگانے والے

جاؤ گے ٹنڈیاں کسوا کے ذرا چھو دیکھو
لو بڑے آئے مجھے ہاتھ لگانے والے

کہنے سننے پہ کسی کے نہ تم آنا خانم
آگ پانی میں لگاتے ہیں لگانے والے

رنجور

ان کو ریختی کے طبقۂ متوسلین میں سمجھ لیجیے۔ دو برس اُدھر نیرنگ خیال میں ان کی ایک ریختی چھپی تھی۔ چند شعر حاضر ہیں۔ ؎

غرض سرمہ لگانے سے نہ مطلب پان کھانے سے
ہوئی خاصی فرنگن اختری تعلیم پانے سے

عوض پاجامۂ و شلوار کے میں گون کیوں پہنوں
مجھے کیا نفع انگلش لیڈیوں کا مُنہ چڑھانے سے

نہ پایا میں انھیں ہٹی نہ دونگی کچھ بھی ہو جائے
پناہ اللہ کی اقبال مرزا کے گھرانے سے

کہاں ممکن کہ بی بی کو وہ نظروں سے جدا رکھیں
کسی کی نوج اسکی سی محرم کی ہو پیدائش
میاں آخر بجوریوں سے بار آئیں اپنی مرضی سے

وہ دیکھو آ رہے ہیں پیارے مرزا زچہ خانے سے
اُنھے ہی کام روز و شب ہیں اک شوہر جانے سے
مگر ممکن نہیں آیا کہ وہ آئیں بلانے سے

عابد مرزا بے غم و بیگم

ان کے بزرگ شیروان سے آئے تھے اور کتاب خوانی کرتے تھے۔ عابد مرزا کے والد کا نام حسین مرزا تھا۔ نواب فخر محل اور خاص محل کی سرکار میں کتاب خوانی پر مامور تھے۔ عابد مرزا ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ جھوائی ٹولہ میں رہتے تھے۔ ان کی عمر چھ برس کی تھی کہ حسین مرزا مع اہل و عیال کے مٹیا برج چلے گئے۔ لکھنؤ کی ایک ڈومنی تھی نوروزی وہ ایک روز آئینہ کے سامنے بیٹھی نرت کر رہی تھی۔ بیگم کا سن تیرہ چودہ برس کا تھا انکے جی میں بھی گدگدی اٹھی مگر والد کے ڈر سے جان نکلتی تھی جب کبھی موقعہ ملتا، تنہائی ہوتی، اپنی چھل بل دیکھ دیکھ کر خود ہی خوش ہوتے۔ ریختی میں آغا حجو شرف سے اصلاح لیتے تھے۔ ایک دن بیگم میر صادق حسین کے یہاں بیٹھے ہوئے تھے کہ میر صاحب سے ملنے خانم آئے اور اپنا کلام بتا بتا کے سنانا شروع کیا۔ بے غم نے ریختی کبھی پہلے نہ سنی تھی۔ اب جو خانم کو سنا تو پھڑک اٹھے۔ بازار سے جان صاحب کا دیوان خرید لائے۔ اول سے آخر تک بتا بتا کر پڑھ گئے۔ یہ شوق اس قدر بڑھا کہ ریختی کہنے کا خیال پختہ ہو گیا۔ جا کے مرزا علی بہار گلشن الدولہ کے شاگرد ہو بیگم بن گئے۔ نواب گلشن الدولہ گو خود ریختی نہ کہتے تھے لیکن شاگرد کو خوب مانجھا۔ ابتدا میں دوستوں کے ہنسانے کو کہتے رہے۔ یہاں تک کہ اس فن میں کمال پیدا کیا۔ ۱۳۱۵ھ میں عظیم آباد میں نواب لطف علی خاں مرحوم کے بیٹے نواب ابراہیم علی خاں کے مکان پر تین رات دن مشاعرہ جاری رہا۔ بیگم کی باری آئی تو دو رباعیاں پڑھیں۔

جاہل شاعر ہوئے بورچی کے میٹ
اوروں کے کلام کو نگوڑے دیا میٹ
تیرے ہی لیے کہی گئی تھی یہ مثل
رکھوا لیا جیٹھ کے بھروسے پہ پیٹ

جو شاد تھا اسکے دل کو ناشاد کیا
محفل کو مشاعرے کی برباد کیا
[illegible] تھا غزل
آ کے مجھ سے موئے نہ کیوں یاد کیا

دوسری رباعی میں امیر علی محمد شاد اور انکے شاگردوں پر چوٹ تھی۔ شاد بہار کے اکابر میں تھے بیگم سے کھٹک گئے اور طنز آ فرمائش کی لیکن جب انکا کلام سنا تو بہت متاثر ہوئے۔ ام لگا کر بغلگیر ہوئے اور کہا کہ بدمعاشوں نے میرے دل میں آپ کی طرف سے کدورت ڈال دی تھی۔ جو ہوا اُسے بھول جائیے۔ بیگم نے بھی بہت کچھ عذر معذرت کی۔ چلو صفائی ہو گئی۔ پٹنے سے چل کر بیگم حیدر آباد قسمت آزمائی کرنے پہونچے۔ نواب محبوب یار جنگ کے توسل سے مرحوم نظام میر محبوب علی خاں تک رسائی ہو گئی۔ بیگم جب وہاں پہونچے تو داغ بھی موجود تھے۔ نظام نے کوئی دو لاکھ کا بھاری دوپٹہ عنایت فرمایا۔ اُنھوں نے داغ سے دریافت فرمایا بیگم کا کلام کیسا ہے۔ داغ نے بے پروائی سے کہہ دیا اس قسم کے شاعر مبلغ علم سے عاری ہوتے ہیں اور میں تو میرا یہ علیحاں کو سُن چکا ہوں بیگم کو دربار میں اس قسم کی گفتگو پسند نہ تھی۔ آزردہ خاطر ہو گئے۔ اتفاق سے مہاراجہ چندو لال شاداں کی بارہ دری میں ایک مشاعرہ ہوا اس میں جہاں پناہ بہادر شاہ ظفر کے پوتے مرزا خورشید عالم نے جو داغ کے علاقی بھائی تھے کہیں یہ شعر پڑھ دیا۔ ؎

اُردو اپنی ہے زباں ہو وارثی یا پیکی
سب مقلد ہیں ہمارے سب ہمارے خوشہ چیں

بیگم نے اہل لکھنؤ کی طرفداری میں اسکا جواب لکھا اور خوب خوب چوٹیں کیں۔ اُردو کی تاریخ اور اُسکی بتدریج ترقی کا تذکرہ کیا اور داغ پر چوٹ کر کے بڑی خوبی سے گریز کی ہے۔ زبان کی سلاست اور فصاحت کے لحاظ سے یہ قطعہ بے مثل ہے۔ ریختی میں اسکا مثل دوسرا نہیں۔ طوالت کی وجہ سے درج نہیں کیا جاتا۔

بیگم کا کلام بہت ہے لیکن اب تک شائع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ انکی ایک غزل کے چند شعر ملاحظہ کیجیے۔ اس میں سیاسی معاملات کی بھی ترجمانی ہے۔

پھر نہ موئی عورتوں پر جو نہ ہو تھوڑا ہے ظلم
کونسلوں میں جب کوئی بیگم نہیں خانم نہیں

ہاتھ میں جن کے قلم ہے بات میں جنکی اثر
اے بوا وہ عورتیں بھی مردوں سے کم نہیں

بیویاں بیٹیری لیکن انکی مجلس بھی تو ہو
چند تصویریں ہیں حیراں اور کوئی البم نہیں

جنگ سے ہے صلح بدتر نوج ایسا ہو ملاپ
کون سا دن ہے یہاں جل جل نہیں اٹھتے ہیں

یاد رکھیگی سُنت گھر میں یار رہیں گے راج ہم
ابتو دل میں ٹھان لی ہے وہ نہیں یا ہم نہیں

عابد مرزا۔ بیگم کے کلام میں پختگی بہت ہے اور جان صاحب کا تتبع پایا جاتا ہے ؎

آنکھ نرگس پر جو ڈالی جائے گی ۔۔۔ شاخ پھر کوئی نکالی جائے گی
آہ میری یوں نہ خالی جائے گی ۔۔۔ سوت سر مونڈی نکالی جائے گی

مہاراجہ کرشن پرشاد نے بھی ایک نظم ریختی میں لکھی ہے جسمیں توحید اور تصوف کے رموز میں محاورات کی بہت کھپت ہے۔ زن و شوہر کے تعلقات خوشگوار رکھنے کے لیے نصیحتیں ہیں۔ اختلاف مذہبی سے اجتناب کرنے کی تعلیم دی ہے اور بڑے انوکھے اچھوتے چلبلے پیرایہ ہیں۔

عنقا

کوئی صاحب ہیں پنجاب کے رہنے والے محمد محسن نام ہے۔ لکھنؤ میں شاید عرصہ تک رہے ہیں۔ انھوں نے دیوان ریختی چھپوایا ہے۔ جان صاحب کی گدی چھیننا چاہتے ہیں۔ مگر یہ انکی خواہ مخواہ کی زبردستی ہے۔ مجھے تو انکے کلام میں کچھ لطف نہیں آیا۔

شیدا

ان کے نام و نشان سے میں واقف نہیں ہوں۔ صرف اس قدر جانتا ہوں کہ الہ آباد کے قدیم باشندے ہیں۔ میں نے انھیں مسلم بورڈنگ ہوس الہ آباد ۱۹۲۹ء کے مشاعرے میں سنا تھا۔ ریختی کے لیے حقیقتاً بڑی سنگلاخ زمین تھی۔ لیکن اچھے اچھے شعر نکالے تھے۔ ؎

ہوں نہیں کرتیں وا دہی بی سب کی طرح نیاز میں ۔۔۔ باتیں بھی کرتی جاتی ہو تم تو بوا نماز میں
تم سے میاں سے لاگ ہے جیسے میاں مرے مُرید ۔۔۔ تم سی نہیں ہے سوتیں مجھ سی نہیں ہے ساز میں
کھائے غریب دیں دعا اس سے غرض ہے یہ بوا ۔۔۔ نذر میں کچھ نہیں دھرا، رکھا ہے کیا نیاز میں
سمجھوں جو اُٹھکے بیٹھ جائیں گھر سے خدا کے پھر میں ۔۔۔ لیٹی پڑی ہیں بھابی جان رات سے جانماز میں
شیدا سمجھ کے تم پڑھو لڑکے ہیں کالجوں کے یہ ۔۔۔ لکھ کے تمہاری ریختی رکھیں گے سب بیاز میں

اسکے بعد ان کی ایک ریختی الہ آباد کے "چاند" میں چھپی تھی۔

رونق

سید محمد محسن نام ہے۔ تکیہ ضلع رائے بریلی کے رہنے والے ہیں۔ عبد الباری صاحب آسی کے شاگرد ہیں۔ انہیں کے تذکرۂ خندۂ گل سے ان کا پتہ چلا۔ ورنہ میری نظر سے ان کا کلام کسی

رسالہ وغیرہ میں نہیں گزرا۔ آسی صاحب کے شاگرد ہیں تو ابھی غالباً نو عمر ہی ہونگے۔ مگر اس سے یہ
اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر مشق جاری رہی تو کچھ کہنے لگیں گے۔ ابھی ان کے اشعار میں
خالص ریختی کا رنگ کم ہے اور عامیانہ ظرافت زیادہ۔

خاتمہ ۔ مجھے ریختی کی بابت جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ سنا ہے کہ جناب سید تمکین کاظمی صاحب نے
ریختی پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے اور "تذکرہ ریختی" کے نام سے چھپوایا ہے۔ اس خیال سے
غالباً میری بکواس رائیگاں جائیگی۔ ابھی مجھے تذکرہ ریختی دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا مگر غالباً
جناب تمکین کاظمی نے ریختی کی ایجاد میں وہی رائے قائم کی ہوگی جو میں نے کی ہے اور اگر
انھوں نے .... اسکی ایجاد کا فخر بھی سرزمین دکن کو دیا ہے تو ان کا تذکرہ دیکھنے کے
بعد میں اپنے مضمون کا ضمیمہ لکھدونگا۔

پوسٹ ماسٹر

(جناب سید فرید جعفری صاحب مچھلی شہری)

پوسٹ ماسٹر نے پہلے پہل الاپور کے گانوں میں کام کرنا شروع کیا۔ حالانکہ گانوں چھوٹا تھا لیکن اسکے نزدیک ہی ایک کارخانہ تھا جسکا مالک انگریز تھا۔ اُس نے انتظام کیا کہ ایک ڈاک خانہ قائم ہو جائے۔

ہمارے پوسٹ ماسٹر کا وطن کلکتہ تھا۔ وہ اس غیر آباد گانوں میں خود کو اس طرح محسوس کرتا جیسے ایک مچھلی پانی سے باہر محسوس کرتی ہے۔ اسکا دفتر اور رہنے کا مکان ایک تاریک جھوپڑی تھی جو پانات کے قدرتی فرش سے زیادہ دُور نہیں تھی اور چاروں طرف سے گھنے درختوں گھری ہوئی تھی۔

کارخانہ کے ملازمین کو فرصت نہ تھی اور نہ وہ ایک تہذیب یافتہ انسان کی صحبت کے متجسس تھے۔ کلکتہ کا لڑکا صحبت وغیرہ سے گھبراتا بھی ہے۔ اجنبی کی نگاہ میں یا تو وہ مغرور نظر آتا ہے یا بداخلاق۔ جو کچھ بھی ہو، پوسٹ ماسٹر کی صحبت کم لوگوں سے تھی۔ اسکو زیادہ کام بھی نہیں کرنا پڑتا تھا۔

اکثر اس نے اشعار کہنے کی کوشش کی۔ پتیوں کی نقل و حرکت اور آسمان کے بادل خوشی خورمی کے جذبات پیدا کرنے کے لیے کافی تھے ——— یہی وہ مناظر تھے جنکی مصوری کا اُس نے ارادہ کیا۔ لیکن خدا جانتا ہے کہ اگر "الف لیلیٰ" کا کوئی جن ایک رات میں درختوں پتیوں اور تمام چیزوں کو اُٹھا لیجاتا اور اُنکے بجائے کنکروں کی ایک سڑک بنا دیتا اور لمبے مکانوں کی صف کھڑی کر کے بادلوں کو چھپا دیتا تو وہ اُسکو "نئی زندگی کے ایک تحفے" کی طرح محسوس کرتا!

پوسٹ ماسٹر کی تنخواہ معمولی تھی، وہ اپنا کھانا خود ہی پکاتا۔ اس کو ایک یتیم لڑکی مدت سے

ی مدد مل جاتی جو اسکے کام کیا کرتی۔

شام کو جب گاؤں کے گلہ خانوں سے دھوئیں کے بادل اُٹھتے اور فضا پر چھا جاتے چڑیاں جھاڑیوں میں چھپ جاتیں، جھینگر اپنے پُراثر گیتوں سے دیہاتی فضاء کو مسحور کرتے اور اُسی مقام پر جہاں وہ روز اکٹھا ہوتے شاعر کو جو بانس کی گھنی جھاڑیوں کی پتیوں کی سرسراہٹ محسوس کرتا۔ احساس ہوتا کہ اسکے پیچھے روحانیت کی ایک لہر موجزن ہے۔ اس وقت پوسٹ ماسٹر اپنا چھوٹا چراغ جلاتا اور رتن کو آواز دیتا۔

رتن باہر اسکی آواز کی منتظر رہتی اور فوراً حاضر ہو جانے کے بجائے جواب دیتی "کیا حضور نے مجھے آواز دی ہے"

پوسٹ ماسٹر۔ "تم کیا کر رہی ہو"

رتن۔ "مجھ کو چولھے کی آگ روشن کرنا چاہیے۔"

پوسٹ ماسٹر۔ "اوہ! چولھے کی آگ جلتی رہیگی، پہلے میرا حقہ تیار کر دو"

آخر کار رتن داخل ہوتی۔ اسکے پاس تازہ کوئلوں سے تیار کردہ ایک شعلہ جوالہ ہوتا جس سے تمباکو کو آگ دکھائی جاتی۔ شعلہ کی آنچ اسکے گالوں کو سرخ کر دیتی۔ پوسٹ ماسٹر کو موقع ملتا کہ اُس سے باتیں کرے۔ شاید وہ گفتگو کا آغاز یوں کرتا۔ "ہاں! رتن! کیا تمہیں اپنی ماں کی کچھ یاد ہے؟" یہ ایک زرخیز موضوع ہوتا۔ رتن کو بہت سی باتیں یاد ہوتیں اور بہت سی بھولی ہوتیں۔ اس کے باپ کو اس سے بہ نسبت اُسکی ماں کے زیادہ محبت تھی۔ اسکو وہ زیادہ یاد آتا۔ اسکے دماغ میں اسکی مختلف تصویریں متحرک رہتیں کہ وہ روز شام کو کارخانہ سے آتا ہے اور اُسکو پیار کرتا ہے وغیرہ وغیرہ

رتن پوسٹ ماسٹر کے پیروں کے پاس فرش پر بیٹھ جاتی۔ جونہی کہ خیالات کا بائیسکوپ متحرک ہوتا اُسکو چھوٹے بھائی کی یاد آتی، وہ خیال کرتی کہ ایک دن جب کہ بدلی تھی اس نے تالاب میں کٹیا سے مچھلی کا شکار کھیلا تھا۔ یہ چھوٹے چھوٹے واقعات اسکو بڑے واقعات کی مانند دلا دیتے۔ انکو باتیں کرتے کرتے بہت دیر ہو جاتی اور پوسٹ ماسٹر کو کھانا پکانے میں کاہلی محسوس ہوتی۔ رتن اُس وقت جلدی جلدی آگ جلاتی، اور کچھ موٹی موٹی روٹیاں سینک دیتی جو صبح کے بچے ہوئے سالن سے رات کو کھانے کے لیے کافی ہوتیں۔

اکثر شام کو پوسٹ ماسٹر اپنی میز ہی پر بیٹھا ہوا اپنے وطن کے خیالات میں محو ہو جاتا۔ اسکو ماں یاد آتی بہن یاد آتی اور وہ یاد آتے جن کے لیے وہ اس جلاوطنی میں مضمحل رہتا۔

یہ خیالات وہ تھے جو اس کو ہمیشہ ستاتے لیکن جن سے وہ مالکان کارخانہ کو قائل نہ کر سکتا تھا۔ حالانکہ وہ فطرتی طور پر انھیں معصوم چھوٹی لڑکی کے سامنے بلند آواز سے دُھراتا۔ کچھ دنوں بعد تو ایسا ہو گیا۔ کہ لڑکی اسکے خاندان والوں کو اس طرح یاد کرتی جیسے "وہ" اُسی کے عزیز تھے۔ اسکے دل پر ان میں سے ہر ایک کی تصویر منقوش تھی۔

ایک دن دوپہر کو جب کہ بارش سے ذرا دیر کے لیے سکون ہو گیا تھا، ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ نم گھاس اور پتیوں کی خوشبو دھوپ میں اس طرح محسوس ہوتی جیسے کہ کوئی اکتایا خستہ زمین کا آرام کرتے ہوئے ایک جسم پر سانس لے رہا ہو۔ ایک غم زدہ چڑیا دوپہر بھر قدرت کے دربار میں اپنی مصیبتوں پر نوحہ خوانی کرتی۔

پوسٹ ماسٹر کو کچھ کام نہیں تھا، غسل دی ہوئی پتیوں کا نظارہ بادل کے ٹکڑوں کی دوڑ کیسے دلکش اور دلفریب مناظر تھے۔ پوسٹ ماسٹر انھیں دیکھ رہا تھا اور خود سے کہہ رہا تھا "آہ! اگر کوئی معصوم روح نزدیک ہوتی ——— ایک محبت کرنے والی انسانی ہستی جسکو میں اپنے دل سے لگا لیتا" یہ وہی خیالات تھے جنکے اظہار کی وہ چڑیا کوشش کر رہی تھی اور یہ وہی جذبات تھے جنکا اظہار پتیوں کی سرسراہٹ سے ہو رہا تھا لیکن کوئی نہیں جانتا اور نہ کوئی یقین کریگا کہ ایک معمولی تنخواہ والا گاؤں کا پوسٹ ماسٹر ایک خاموش دوپہر کو ان خیالات کا ادعا بھی کر سکتا ہے۔

پوسٹ ماسٹر نے دیکھا اور رتن کو بلایا۔ رتن اُس وقت امرودوں کے درخت کے نیچے امرود توڑنے میں منہمک تھی اور کچے کچے امرودوں کو گلہری کی طرح کتر رہی تھی۔ اُس نے جونہی اپنے آقا کی آواز سنی، امرود توڑنا چھوڑ دیا اور ہانپتی ہوئی دوڑی، کہتی جاتی تھی "دادا کیا مجھے بلا رہے ہیں؟" پوسٹ ماسٹر نے کہا "میں خیال کر رہا تھا کہ تمہیں پڑھنا سکھاؤں"۔ اور اُسی دوپہر کو اُس نے اُسے حروف پہچاننا سکھایا۔

اسی طرح تھوڑے ہی دنوں میں رتن کچھ پڑھ لکھ گئی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بارش ختم ہونے کا کبھی نام ہی نہ لیگی۔ نہریں، خندقیں اور نیچی جگہیں سیلاب

مرکز بن گئیں۔ دن رات موجوں کا تلاطم اور مینڈکوں کے راگ سُنائی دیتے۔ گاؤں کی سڑکوں پر پانی بہنے لگا اور بازار کشتیوں پر لگنے لگا۔

ایک صبح کو جب کہ گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی تھی پوسٹ ماسٹر کی چھوٹی شاگردہ "بلائے جانے کی" دیر سے منتظر تھی لیکن غیر معمولی طریقے پر دیر ہوتے دیکھ کر اس نے "اپنے کتے کے کانوں والی کتاب" سنبھالی اور آہستہ سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے دیکھا کہ اسکا آقا چارپائی پر پڑا ہے۔ یہ خیال کر کے کہ وہ آرام کر رہا ہے وہ انگوٹھوں کے بل واپس ہونے کو تھی کہ اس نے یکایک اپنا نام سُنا۔ "رتن!" وہ فوراً واپس ہوئی اور پوچھا "دادا! کیا سو رہے تھے؟" پوسٹ ماسٹر نے رقیق آواز سے جواب دیا "میں بیمار ہوں' میرے سر پر ہاتھ رکھو۔ اُف! کس قدر گرم ہے!!"

خواہشات میں افسردگی تھی اور بارش کے دن۔ اُسے محبت کی تیمارداری" کی ضرورت تھی۔ اُسکو خواہش ہوتی کہ نازک اور ملائم ہاتھ اُسکی پیشانی کی گرمی کو محسوس کریں جب کہ کڑے بجتے ہوں اور اُن کا پیدا کردہ نغمہ فضا پر سحر کر رہا ہو۔ محبت کی دیوی بیوی، ماں اور بہن کی موجودگی کا احساس ہو۔ اور اُسے مایوسی کا سامنا نہیں ہوا۔ اب رتن کی فطرت چھوٹی لڑکیوں کی طرح نہ تھی۔ اُس نے ان کی ممتا سی محبت دکھائی۔ گاؤں کے ڈاکٹر کو بلوا بھیجا۔ مریض کو دوائیاں برابر پلاتی رہی۔ اس کی پٹی کے پاس شب بیداری کی۔ اسکا کھانا تیار کیا اور ذرا ذرا سی دیر میں پوچھتی "اب طبیعت کیسی ہے دادا! کچھ صاف ہے یا نہیں؟"

کچھ دنوں کے بعد پوسٹ ماسٹر نے چارپائی چھوڑی گو اسکی طبیعت ابھی تک بالکل صاف نہ تھی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ تبادلہ کی درخواست دیگا۔

اس نے کلکتہ فوراً تبادلہ کے لیے درخواست بھیجی۔ تیمارداری کی خدمت سے کنارہ کشی کرنے کے بعد رتن نے پھر دروازہ کے باہر رہنا شروع کیا۔ لیکن اُس نے پھر کبھی پوسٹ ماسٹر کو اُسے آواز دیتے نہیں سُنا۔ وہ بعض وقت اندر جھانکتی۔ پوسٹ ماسٹر کو یا تو کرسی پر بیٹھا ہوا پاتی۔۔۔ یا چارپائی پر۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا۔ جب رتن منتظر ہوتی کہ وہ اُسے بلائے گا۔ وہ اپنی درخواست کے جواب کا منتظر ہوتا۔ لڑکی اپنے پُرانے سبق کو بار بار پڑھتی۔ اُس کو بڑا خوف لگا رہتا کہ کبھی آواز آئے اور وہ اپنے سبق میں منہمک ہو اور جواب نہ دے سکے۔

ایک ہفتے کے انتظار کے بعد، ایک شام کو وہ بلائی گئی۔ مسرت کے دریا میں سیلاب آگیا۔
رتن کمرے کی طرف جھپٹی اور حسب معمول بولی۔ "دادا! کیا مجھے بلایا ہے؟"
پوسٹ ماسٹر نے جواب دیا۔ "رتن! میں کل جا رہا ہوں۔"
"کہاں؟ دادا!"
"گھر! رتن!!"
"کب، دادا!!"
"آج ہی کل میں، رتن!!"
"کب واپس آئیں گے؟"
"کبھی نہیں، رتن!"
رتن نے پھر کوئی سوال نہ کیا۔ پوسٹ ماسٹر نے خود ہی گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ اس کی "درخواست تبادلہ" مسترد ہو گئی اس لیے وہ استعفا دے کر گھر جا رہا ہے۔
بہت دیر تک ان میں سے کوئی نہ بولا۔ چراغ دھندلا جل رہا تھا اور گوشے میں چھت کے سوراخ سے بوندیں ٹپک رہی تھیں!۔
تھوڑی دیر کے بعد رتن اُٹھی اور باورچی خانے میں کھانا تیار کرنے چلی گئی لیکن اب اس کی چال میں پہلے کی سی چستی اور پھرتی نہ تھی۔ اسکے دماغ میں خیالات کا ہجوم تھا۔
پوسٹ ماسٹر نے جب کھانا کھا لیا تو لڑکی نے یکایک پوچھا "دادا! کیا مجھے اپنے ساتھ مکان لے جائیے گا؟"
پوسٹ ماسٹر ہنسا۔ "کیا خیال ہے!" ——— لیکن اُس نے مناسب نہیں سمجھا کہ اس کے سوال کی لغویت کا اُس پر انکشاف کرے۔
رتن کی تمام رات بیداری میں گزری، ذرا آنکھ لگ جاتی تھی تو خواب میں پوسٹ ماسٹر کا وہی تمسخر سنائی دیتا تھا ——— "کیا خیال ہے!"
وہ صبح کو بیدار ہو کر غسل کے لیے چلا گیا۔ اُس نے اپنی کلکتہ کی عادت جاری رکھی تھی کہ برتنوں میں رکھے ہوئے پانی سے غسل کر لیتا تھا۔ اُس نے گاؤں کی تہذیب اختیار نہیں کی یعنی دریا میں

عادی نہیں لگتا تھا ممکن ہے کوئی سبب نہ ہو یا کوئی اور بات ہو۔ لڑکی اسکی مراجعت کا وقت دریافت نہیں کر سکی۔ اس لیے اُس نے طلوع آفتاب سے کہیں قبل پانی تیار رکھا تاکہ جیسے ہی ضرورت ہو وہ مہیا کر سکے۔ غسل کے بعد پوسٹ ماسٹر نے رتن کو بلایا۔ رتن بغیر کسی آواز کے کمرے میں داخل ہوئی اور خاموشی سے حکم کی منتظر کھڑی ہو گئی۔ آقا نے کہا۔ "رتن! تم میرے چلے جانے کا غم نہ کرو۔ میں اپنے قائم مقام سے کہہ دونگا وہ تمہاری دیکھ بھال کریگا۔"

ان الفاظ میں کوئی شک نہ تھا۔ "لیکن عورت کا دل فلسفہ ہے۔"

رتن نے آقا کی قمچیاں بغیر کسی شکایت کے برداشت کر لی تھیں لیکن یہ الفاظ اسے تیر سے لگے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور کہا "نہیں! نہیں! دادا! میرے بارے میں کسی سے کچھ تذکرہ نہ کیجیے۔ میں یہاں اب ایک لمحہ نہ ٹھہرونگی۔"

پوسٹ ماسٹر کو سکتہ ہو گیا اُس نے رتن کی ایسی حالت کبھی نہ دیکھی تھی۔

نیا آدمی آ گیا۔ پوسٹ ماسٹر نے اُسے چارج دیدیا۔ اور جانے کی تیاریاں کرنے لگا۔ روانہ ہونے سے قبل اُس نے رتن کو آواز دی اور کہا "یہ تمہارے لیے ہے مجھے امید ہے کہ یہ تمہیں تھوڑے دن کام دیں گے۔" اُس نے اپنی جیب سے اپنی ایک ماہ کی تنخواہ نکال کر دے دی۔ صرف زادِ راہ کے لیے تھوڑا سا نکال لیا۔ رتن اُسکے پیروں پر گر پڑی اور چلائی "آہ! دادا، خدا کے لیے مجھے کچھ نہ دیجیے۔ میری وجہ سے کسی قسم کی تکلیف گوارا نہ کیجیے۔" اور یہ کہتے ہی وہ چھلاوہ کی طرح غائب ہو گئی۔

پوسٹ ماسٹر نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ پھر اپنا بیگ اُٹھایا، چھتری کندھے پر رکھی اور ایک آدمی کی ہمراہی میں جو اُسکا "آرگس رنگ کا صندوق" لیے تھا، چل پڑا۔

جب وہ کشتی میں بیٹھ گیا، کشتی چل پڑی اور سیلاب زدہ دریا مثل آنسوؤں کے ایک سوتے کے جو آنکھوں سے پھوٹ نکلا ہو، بلک بلک کر رو رہا تھا۔ اُس وقت اُسکے دل میں حسرت اور افسردگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ ایک حسرت زدہ دیہاتی لڑکی کا چہرہ اسکو ایسا معلوم ہوتا جیسے مادر گیتی بذاتِ خود غم کے سمندر میں غرق ہے۔ ایک مرتبہ تو اُس نے ارادہ کر لیا کہ وہ واپس جائے اور اُس غم زدہ "آسمان کی شاہی" لڑکی کو واپس لائے۔ لیکن بادبانوں میں ہوا بھر چکی تھی، کشتی کو بھی موجوں کے تلاطم اور گرداب سے گزرنا چکا تھا۔ گاؤں پیچھے رہ گیا تھا اور تپتی ہوئی زمین نظروں کے سامنے تھی۔

اس لیے مسافر تیز رو دریا کے سینہ کو ملتا ہی گیا۔ وہ دنیا کی لاتعداد ملاقاتوں اور جدائیوں اور موت جو سب سے بڑی جدائی ہے، جہاں سے واپسی ناممکن ہے، اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کے فلسفیانہ استدلال کرنے کے بعد مطمئن ہو گیا۔

لیکن رتن فلسفی نہیں تھی۔ وہ ڈاک خانہ کے گرد چکر کاٹ رہی تھی جب کہ اسکی پیاری آنکھوں سے آنسوؤں کی دھار جاری تھی، ہو سکتا ہے کہ اسکو تھوڑی سی اُمید ہو گی جو اسکے دل کے کسی گوشہ میں چنگاریوں کی طرح قائم ہو گی، کہ اس کا دادا واپس آئے گا اور یہی وجہ تھی کہ وہ خود کو فنا نہ کر سکی ـــــ آخر کار ہماری بیوقوف انسانی فطرت کے لیے ـــــ غلطیوں کا ہونا ضروری ہے ـــــ دلائل کا لکھر اظہار جذبات کے لیے زیادہ عرصہ لیتا ہے۔ مضبوط ثبوت کا یقین نہیں ہوتا ـــــ ایک شخص کسی امید موہوم پر بے چین ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن آتا ہے جبکہ وہ دل کو چوس کر خشک کر دیتی ہے اور رتبِ ہستی کے تار بکھر جاتے ہیں۔ اس کے بعد بیداری کی تکلیف کا سامنا ہوتا ہے اور پھر خواہش ہوتی ہے کہ وہی غلطیاں سرزد ہوں !!

(ٹیگور)

بادلوں کا ڈرامہ

جناب سید ناظم حسین صاحب نقوی صفی پوری وکیل

(غروب آفتاب کے وقت شام کے بادل مختلف شکلوں اور رنگوں میں نظر آتے ہیں۔ اکثر یہ متحرک اور متغیر صورتیں ڈرامے میں کام کرتے ہوئے انسان کی سی معلوم ہوتی ہیں اُنکے تماشے کے تفصیلی حالات جو ایک شام کو دیکھے گئے سپرد قلم کیے جاتے ہیں۔)

ایک سنہری کرن نمایاں ہو کر تمام مغربی آسمان پر پھیل جاتی ہے۔ اُسکے درمیان دو خاموش بادل دو عورتوں کے بھیس میں اپنے سر ساریوں سے چھپائے ایک دوسرے کی جانب جھکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

پہلی:۔ چاروں طرف دیکھتی اور حرکت کرتی ہوئی نہایت تعجبانہ لہجہ میں کہتی ہے "صرف ہم دونوں باقی رہ گئے ہیں: اور سب کہاں گئے؟"

دوسری:۔ غالباً تم سو گئی تھیں! کچھ احباب ہمارے پاس سے گزرتے وقت ان کو لیتے گئے۔ لیکن دیکھو!" وہ مشکتی ہے اور سنہری وسیع سمندر کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

پہلی:۔ یہ ہمارا ملک سونے کا ہے! کون ہے جو یہاں کسی قسم کا دھبہ لگانے کی جرات کر سکتا ہے؟ تم تاریکی کا نشان تک بھی کہیں نہیں پا سکتی ہو۔"

دوسری:۔ آپ اس بارے میں اس قدر یقین سے کام نہ لیں۔ میں قدرے بلند ہونے کے باعث آپ سے زیادہ دور تک دیکھ سکتی ہوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اس دور دراز سنہری ملک میں جنگ و جدال کی علامتیں موجود ہیں۔"

پہلی :- جنگ و جدال - آئیں - اس سے تمہارا کیا مطلب ؟"

دوسری :- اچھا ...... غالباً جنگ و جدال نہیں ! ممکن ہے کہ یہ ایک قسم کی معمولی سی لڑائی ہو - یا شب کی تاریکی -

دیکھو ! ...... شمال کی جانب - مشرق ! ...... کیا تم اس کثیر اور سیاہ مجمع کو مع اسکے روپہلے کنارے کے دیکھتی ہو ؟ وہ کسی زمانے میں ابدی راحت کا ملک تھا لیکن یقینی وہاں جنگ و جدال، قتل و غارتگری کے باعث بے گناہ خون بہا ہے - اور اسی سبب سے تم اب اُس سیاہ بھیڑ اور مجمع کو دیکھتی ہو - تاہم اُسکے روپہلے کنارے کی جھلک تم کو فوراً یہ خیال کرنے پر مجبور کرتی ہے کہ کبھی اُسکی کیا حالت تھی، صرف اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ پھر ایک دن کیا ہوگی

پہلی :- ہاں امید تو ایسی ہی معلوم ہوتی ہے - کیا ایسا نہیں ؟

دوسری :- قانون قدرت تغیر پسند ہے ! وہ کہتے ہیں کہ ہمارا اصول بھی یہی ہے - ہر شے کے لیے چڑھاو اور اُتار - عروج اور زوال - زوال کمال کے بعد ہے - ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہا ہے"

ایک ان میں سے (بادلوں میں سے) اپنی سہیلی کا سر برہنہ دیکھکر متعجب ہوتی ہے اور کہتی ہے "کیا تم کو خبر ہے کہ تمہارے سر سے آنچل سرک گیا ہے !'

دوسری شرما جاتی ہے اور کہتی ہے' یہ ہوا کی شرارت ہے وہ ہمیشہ چھپنے اور ہم لوگوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے - وہ برابر اس طریقے سے ہمکو چھیڑتی رہتی ہے ...... تم جا کہاں رہی ہو ؟ ٹھہرو - مہربانی فرما کر کچھ دیر اور ہمارے پاس ٹھہرو !'

دوسری بدلی بلا کسی جواب کے اپنے ساتھی کو چھوڑ کر تیزی سے غائب ہو جاتی ہے -

فوراً ہی وہ بدلی جو تنہا رہ جاتی ہے یہ محسوس کرتی ہے کہ گویا کسی نے پیچھے سے اسکی ساری پکڑ کر کھینچ لی - وہ دفعتاً مڑتی ہے اور ایک دوشیزہ کو صوفیانہ رنگ کی گلابی پوشاک میں پا کر اسکے تعجب کی کوئی انتہا باقی نہیں رہتی ہے - یہ دوشیزہ اسکو اپنے پاس آنے کی دعوت دیتی ہے وہ قبول کرتی ہے - دونوں ایک دوسرے کی جانب بڑھتی ہیں -

پہلی :- تم کیا چاہتی ہو ؟ میں نے تم کو اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا - تم مجھ کو دیکر رہی ہو !'

دوشیزہ :۔ آپ اتنا غصہ کیوں کر ہوتی ہیں ؟ آپ کا خیال ہے کہ آپ مجھکو نہیں جانتی ہیں۔ اچھا .... تعارف یا ملاقات کسے کہتے ہیں ؟ ہمارے ملک میں بھی تعارف کا رواج نہیں ہے۔ جیوں ہی ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں دوست ہو جاتے ہیں کسی ایک وقت میں ہمارا دوست ہمارے پاس پانچ منٹ سے زیادہ نہیں ٹھہرتا ہے۔ ہماری زندگی تغیر پسند ہے ہماری دوستی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ ہماری دوستی کے عمیق سمندر میں ہر گھنٹہ ہزاروں کا داخلہ ہوتا رہتا ہے۔

پہلی :۔ لیکن یقینی۔ جب تمھارے نئے احباب آتے ہیں پُرانے رخصت ہو جاتے ہوں گے۔ کیا وہ نہیں جاتے ؟

دوشیزہ۔ ہاں ایسا ہی ہے لیکن یہ کوئی بات نہیں ہم اپنی ہر لحہ بدلنے والی شکل او صورت کی پرواہ نہیں کرتے ہم اس سے بالاتر ہیں۔ اور تب ہی ہم ہر گھنٹہ ہزاروں کی تعداد میں بلا کسی کو علیحدہ کیے ہوے اپنے دائرہ احباب میں داخل کرنے کے قابل ہوے ہیں۔ مادی دنیا میں ان کے پرے برابر رکھے جاتے ہیں لیکن عالم ارواح میں ایسا نہیں ہے۔ یہاں سارا شمار ختم ہو جاتا ہے ہم بڑھتے اور پھیلتے رہتے ہیں ۔

پہلی ۔ کیا یہ کوئی سائنس کا نتیجہ ہے ؟

دوشیزہ ۔ ہم سائنس کی کیا پرواہ کرتے ہیں ؟ سائنس سے ہمیں کچھ علاقہ نہیں۔ ہم صرف اپنی قوت احساس سے نتائج اخذ کرتے ہیں ...... بحث ہمارا موضوع نہیں اور نہ ہمارے پاس اسکے لیے وقت ہے۔

یہ کہکر دوشیزہ تیزی سے جانے لگتی ہے۔ پہلی خائف ہوکر چیخ اُٹھتی ہے " تم اس قدر تیزی سے کیوں جا رہی ہو ؟" تمھارے کپڑے اور بُندے زمین پر گر پڑے ہیں۔ مہربانی فرماکر ایک منٹ توقف کرو۔

دوشیزہ ۔ کیا آپ یہ نہیں دیکھتی ہیں کہ ہم کو کافی دیر ہوگئی ہے ؟ ہمارا سونے کا سمندر اب صرف ایک دریا کی صورت میں رہ گیا ہے۔ کشتی بان وہاں کھڑا جاتریوں کو آواز دے رہا ہے۔

پہلی :۔ لیکن کیا تم اس ملک سے جہاں تم جا رہی ہو واقف ہو ؟ کیا تمھارے اعزا اور احباب وہاں ہیں ؟ کیا واقعی تمکو کوئی کام ہے جسکے باعث تم اس قدر جلدی میں ہو ؟ کیا تم اس ملک کی

"ادب"

سڑکوں، دریا، آدمی اور زبان سے بخوبی واقف ہو؟ ممکن ہے کہ وہ تمہارے لیے بالکل اجنبی ہوں۔

دوشیزہ:۔ نہیں ہرگز نہیں۔ ہماری لغت میں کوئی لفظ اجنبی نہیں ہے۔ میں اس سے قبل اس ملک میں نہیں گئی ہوں۔ میرے کوئی عزیز وہاں نہیں ہیں۔ بیشک میں اسکی سڑکوں اور آدمیوں سے واقف نہیں ہوں۔ لیکن اس سے ہوتا ہی کیا ہے؟ بادلوں کی زبان ہر جگہ یکساں ہے بادلوں کا گیت ایک دلکش راگ ہے جو ہر جگہ ایک ہی سا گایا جاتا ہے۔ صرف ظاہری شکل میں اختلاف ہے۔

لیکن روح کو دیکھنے کے لیے ہمارے پاس عقل ہے ——— اور جہاں تک روح کا تعلق ہے کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ ہم سب ایک ہیں ——— فردوس کے وسیع خلاء کے ممبر ——— ہمارا مذہب وحدانیت ہے۔ نئے واقعات۔ نئے اسباب۔ نئی جگہوں۔ نئے لوگوں سے ملنا ہمارے لیے باعث خوشی ہے۔ ہم طالبعلم ہیں ——— خدا کی خدائی میں نہ تھکنے والے طالبعلم۔ ہم تغیر پسند نہیں۔ قدیم عادتوں کو ترک کر کے نئی اختیار کرنا ہماری فطرت ہے۔ ہمیشہ وہ نیا واقعہ جو ہمیں پیش آتا ہے کچھ نہ کچھ ہمکو سکھلا جاتا ہے۔ ہم بذات خود کبھی مکمل نہیں ہیں۔ فی الواقعہ وہ حالات جو ہم کو گھیرے ہوئے ہیں ہمکو مکمل بنانے میں مدد دیتے ہیں۔

میں اس وقت تک یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ مجھ میں کیا خامی ہے، جب تک میں یہ نہیں دیکھتی کہ کسی دوسرے شخص میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو مجھ میں نہیں ہیں۔

ہماری روح ایک سیکھنے والے کی روح ہے جو ہمیشہ نئی اور تازہ ہے۔

لہٰذا جیسے ہی ہم کسی سے ملتے ہیں خواہ وہ ملاقات پہلی اور ایک نئے اور اجنبی ملک ہی میں ہو ——— ہم فوراً بلا کسی ارادہ کے اسکا اعتراف کر لیتے ہیں کہ ہم دونوں میں کون سی بات ایک سی ہے۔

کشتی اس وقت تک لب ساحل آ پہنچی۔ کشتی بان اردگرد کے لوگوں کو مشعل دکھلا کر یہ کہہ رہا تھا۔

مسافرو، جاتریو، جلدی کرو۔ میری کشتی میں سوار ہو جاؤ، میں تم کو دوسرے کنارے پہ پہونچا دونگا۔ پردۂ شب بہت جلد ہمارے اس غروب آفتاب کے نظارہ پہ پڑ جانے والا ہے۔ میری کشتی غریب امیر سب کے لیے برابر ہے۔ میری اُجرت ایک خاموش مسکراہٹ ہے اور صرف یہی میری التجا ہے!!

مجمع میں ایک ہیجان پیدا ہوجاتا ہے۔ مرد، عورتیں اور بچے مع اپنے خورونوش کے سامان اور
لے کے بنڈلوں کے کشتی میں سوار ہوجاتے ہیں۔ اس کشتی سے ملی ہوئی ایک چھوٹی کشتی ہے جس میں بڑی
تی میں جانور بالخصوص بھیڑیں سوار کی جاتی ہیں۔ کشتی روانہ ہوتی ہے اور چند منٹ کے بعد کوئی شخص نظر نہیں آتا ہے

دریا نہر کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ رنگت پھیکا اور زردی مائل سُرخ ہوجاتا ہے۔ ایک کمسن
بوان لڑکی دن کی مشقت اور طولانی مسافت سے چور بھورے رنگ کے بادلوں میں سے آتی ہوئی۔
لھائی دیتی ہے۔ وہ آتی ہے۔ نہر کے کنارہ تھم کر کشتی کی واپسی کا انتظار کرتی ہے۔ وہ کھڑی
نظار کرتی ہے حالانکہ کشتی کا کہیں پتہ نہیں۔ اُسکی اُمیدیں نہر کے اس پار والے ملک میں جانے کے لیے
ٹی جاتی ہیں۔ اسکے ہاتھ بلا حس و حرکت پڑے ہیں۔ اسکی پشت تھکن کے باعث جھکی ہوئی ہے
لی آنکھیں عدم کے خوفناک منظر پر گڑی ہوئی ہیں۔
یک بیک اس میں ہمت کی جھلک نمودار ہوتی ہے۔ وہ سیدھی کھڑی ہوجاتی ہے۔ اپنے
تھوں کو یوں ملالیتی ہے گویا وہ دعا کے لیے بلند ہوتے ہیں۔ اسکی پلکیں بند ہوجاتی ہیں۔ اسکا سر آگے کو
ھک جاتا ہے وہ آہستہ آہستہ جُھکتی ہے۔ رفتہ رفتہ اسکا سارا جسم زمین پر آن پڑتا ہے اسکا
ارا جسم گویا تعظیم کے لیے سربسجود ہوجاتا ہے۔ وہ دم بخود ہوجاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سوائے
عا مانگنے کی حرکت کے اور کوئی علامت زندگی کی اسمیں نہیں پائی جاتی ہے۔
ایک تاریک بادل گزرتے ہوئے ٹھہرتا ہے۔ ایک منٹ توقف کرتا ہے پھر آہستہ سے اُسکے
زو کو حرکت دیتا ہے۔ اسکا جسم اس سحر نما جنبش سے کانپنے لگتا ہے۔ وہ کھڑی ہوجاتی ہے۔ اسکا
ہرہ سرخ ہوجاتا ہے اور جسم میں تھرتھری پیدا ہوجاتی ہے۔
عمریں گزریں، زمانہ ہوا کہ میں تمہاری تلاش میں سرگرداں تھا۔ آخرکار میں نے تم کو پالیا"
یک آواز گویا خواب کی حالت میں اسکے گوش زد ہوئی۔
ڑکی:۔ لیکن نہ تم مجھے پہچانتے ہو۔ نہ مجھے یاد ہے کہ میں نے کبھی تم کو دیکھا ہے۔
ادل:۔ تمہارا دل مجھ کو ضرور پہچانتا ہے۔ ورنہ کیوں تم میرے مس کرنے پر کانپ اُٹھیں۔ ہم

بادلوں میں قوت احساس کافی موجود ہے - ہماری روح محبت ہے - قبل محبت کرنے کے ہمکو اسکی ضرورت نہیں کہ ہم دیکھیں یا ایک دوسرے سے گفتگو کریں - ہم پہلے اپنے دلوں میں جذبۂ محبت پیدا کر لیتے ہیں - اس وقت ہم محبت کے مقصود کی تلاش میں بلا ارادہ ہر جگہ گھومتے ہیں - جیوں ہی ہم اپنی ثانی روح کو پا لیتے ہیں - ہم اسکو پہچان لیتے ہیں اور اسکا خیر مقدم کرتے ہیں -

لڑکی :- لیکن تم کافی تاریک ہو میں تم کو صاف طرح سے نہیں دیکھ سکتی ہوں -

بادل :- نہیں - تم نہیں دیکھ سکتیں کیونکہ روشنی کا وقت قریب ختم ہو چکا ہے - صرف چند سکنڈ پہلے میں نے تمہارے چہرہ کو ہاتھی دانت کے مانند سفید دیکھا تھا - اب وہ مدھم اور ہلکا سرخ معلوم ہوتا ہے - چند منٹ بعد غالباً وہ بالکل میری طرح سیاہ ہو جائیگا -

لڑکی :- ہاں - لیکن ایسا کیوں ہے ؟ چند منٹ قبل میں اُس نہر کے کنارہ بیٹھی ہوئی تھی - اسکی ہر معمولی موج موتیوں کے گھونگوں کا ذخیرہ لا کر میرے پیروں کے نزدیک جمع کر دیتی تھی - اور اب اس وسیع سنہرے سمندر کی صرف ایک پتلی سی چٹ باقی رہ گئی ہے -

غروب آفتاب کے وقت یہ شخص کافی مشغول اور چلتا پھرتا نظر آتا ہے - میں خود کتنوں سے ملی، کتنوں سے گفتگو کی، بہت سے ملک دیکھے جو ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے - ہمارے احباب یعنی بادلوں کی پوشاک میں کس قدر تعجب خیز شوخ رنگ تھا - اور اب ہر شئے ایک ہی سی شکل، ایک ہی سی صورت اور ایک ہی سا رنگ اختیار کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے -

اس مختصر وقت میں اس قدر جوش و خروش کیوں تھا ؟ اب وہ تغیر اتنی تیزی سے نہیں ہے - نہ اب وہ شور ہے اور نہ وہ غوغا - ایسا کیوں ہے ؟

بادل :- تغیر ہی سے زندگی کا انکشاف ہوتا ہے - ہم برابر بدلتے رہتے ہیں - کیونکہ یہ ہماری زندہ دلی کا ثبوت ہے - ہماری حسیات ضرورت سے زائد تیز اور ہمارے جذبات شدید ہیں - یہ زمانہ خواہشات کا ہے - ہم سابق کی طرح اپنی خواہشات کے مقصد کی تلاش میں بے چین ہیں - اُسکے بعد تاریکی کی آمد لازمی - دن کے اختتام اور شب کی آمد کے پیغام کا وقت —— اتحاد کا وقت —— وہ وقت جب کہ ساری چہل پہل - تمام حرکات و سکنات روک دیے جاتے ہیں - اور نیچر کشش و پیچ کے عالم میں گم بخود ہو کر رہ جاتا ہے -

ہر عمل کے بعد اسکے نتیجہ کا ظہور یقینی - اپنی خواہشات کے مقصد کو پا لینے سے قبل ہم میں ایک جوش اور ولولہ رہتا ہے۔ جیونہی ہم اپنے مقصد کو پا لیتے ہیں ہم بالکل خاموش نظر آتے ہیں وہ وہ وقت تھا جب کہ ہمارے خواب پورے نہ ہوئے تھے۔ یہ وقت اطمینان کامل کا ہے۔ خاموشی کا ہے اور اس لیے دست برداری کا۔ ہم پہلے خیالی نمونہ کا تصور کرتے ہیں اور پھر ہم حقیقت کو اپنے اس خیال کا جامہ پہناتے ہیں - اس طرح سے ہماری محبت مکمل ہو جاتی ہے۔

لڑکی: لیکن مجھے احتمال ہے کہ اب تم میری نظروں سے چھپ رہے ہو۔ تاریکی بڑھتی جاتی ہے۔ ان متحرک گروہوں کی شکلیں قریب قریب مٹ چکی ہیں اور وہ ایک ٹھوس ڈھیر کی شکل میں تبدیل ہو رہی ہیں - یہ بڑھتی ہوئی تاریکی میری آنکھوں کو اندھا کیے دے رہی ہے۔

بادل:۔ کوئی مضائقہ نہیں - بینائی صرف ایک ابتدائی زینہ ہے۔ کیا تم میری قربت کا احساس نہیں کرسکتی ہو؟ یہ وقت احساس، تصور اور خواب دیکھنے کا ہے۔ نہ خوف کرو، نہ کانپو، میں تمہارے اس تنزل ڈھانچے کو پکڑے رہونگا۔ اس وقت تک کہ ہماری ساری شکل اور سارا سانچہ مٹ جائے۔

لڑکی:۔ میں یہ نہیں بتلا سکتی کہ میں اس بری طرح سے کیوں کانپ رہی ہوں۔ میں ہرگز مطمئن نہیں ہوں - میں کسی ایسی چیز کو پکڑنا چاہتی ہوں جسکو میں چھو سکوں اور محسوس کرسکوں۔ مجھے اپنے نزدیک کھینچ لو ــــ نزدیک ـــــ اور بھی نزدیک ـ

اس لبادے کو یہیں گرا دو۔ کیونکہ میں تم سے بغلگیر ہونا چاہتی ہوں۔

پلیٹو - مجھے اپنی اس چکردار گنجان تاریکی میں لپیٹ لو۔ جو میرے لیے اتنی ہی روشن اور شفاف ہو گی جتنی کہ دن کی روشنی - مجھے بالکل اچھی طرح سے اپنے دامن میں چھپا لو۔ ہماری سچی عبادت اپنی تئیں فراموش کر دینا ہے۔ حقیقی محبت کی قربانگاہ پر اپنی کمتر شخصیت یا خودی کو قربان کر دینا۔

بادل:۔ داخل۔ داخل - میرے دل میں داخل ہو جاؤ۔ بالآخر وہ سیاہ اور تاریک گرد ہم تک پہونچ گئے - بس ایک منٹ اور - پھر پردہ شب پوری طرح سے ہم پر پڑ جائیگا۔ شام کی عبادت کے ناقوس کی صدائیں مندروں سے آ رہی ہیں۔ یہ وقت عبادت کا ہے اتحاد کا۔

نیچر ایک ہے انسان کے ساتھ انسان ایک ہے نیچر کے ساتھ۔ خدا انسان اور نیچر دونوں کے ساتھ ایک ہے۔ اور عبادت مکمل ہے۔
یہ گھڑی وحدانیت کی ہے۔ یہی وقت خودی کو محبت کی ہمہ گیر اور حاوی روح میں فنا کر دینے کا ہے۔
تاریکی۔ تاریکی ——— گنجان تاریکی ہمیں چھپا رہی ہے۔ ہم اور تاریکی ایک ہوئے ہیں۔ نہ ٹوٹنے والی خاموشی اس خوف زدہ سیاہی پر حکمراں ہے ——— ایک سنجیدہ حسن اس مخفی تاریکی میں ——— تاریکی کا عاشق کون ہے؟ زندگی بغیر اپنے تاریک حصہ کے ادھوری ہے۔ تاریکی روح کو بلند اور ممتاز کرتی ہے۔ تاریکی کا دور انسان کی زندگی کو بدل دیتا ہے۔ آؤ۔ ہم خود اپنی ذاتوں اور اپنی فکروں کو اس شب کے عالمگیر سینہ میں چھپا دیں۔

(ماخود)

کب تک

(جناب وحشت کلکتوی)

تری بیداد پنہاں مشتہر ہو جائیگی اک دن
رفاقت چشم گریاں کی کریگی آستیں کب تک

جنونِ شوق ہے خو کردہ اندازِ تغافل کا
حریف سرد مہری ہو گی آہِ آتشیں کب تک

وہ فریادیں جو دل میں جوش زن ہیں کہ نہیں سکتیں
خموشی کا سبق دیگی نگاہِ سرمگیں کب تک

ترے ابرو کے آگے کس نے گردن خم نہ کی ظالم
کھنچیگی صلح جویوں پر تری شمشیر کیں کب تک

کوئی حد بھی ہے وحشت نالہ و فریاد و شیون کی
رہیگی محشر غم اُسکے کوچے کی زمیں کب تک

فریب

(جناب سید محمد عسکری صاحب طباطبائی بی اے، فائنل لکھنؤ یونیورسٹی)

(۱)

"یقیناً جسم میں ایک سنسنی اٹھیگی اگر آپ اس حقیقت کا احساس کریں کہ آپکی ہستی اور بحر اطلانٹک کی گہرائیوں میں صرف چند موٹے تختوں کا فاصلہ حائل ہے"

"معاف کیجئے! میں آپ کا مطلب سمجھا نہیں" جہاز کے عرشے پر ایستادہ اجنبی نے سگریٹ کا ایک کش لیکر آواز کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ اُسکی نگاہیں ایک لڑکی کی حیران گریز حجابانہ نرگسی آنکھوں سے چار ہوئیں۔ ظاہراً وہ ابھی ابھی وہاں آئی تھی۔

"آپ بھی معاف فرمائیں" وہ اطمینان سے بولی "میں غلطی سے آپ کو کوئی اور سمجھی"

اجنبی نے شانوں کی ایک خفیف جنبش کے ساتھ اپنا مُنہ پھیر لیا۔ وہ اتنے کمزور تعارف پر کسی سے بے تکلف نہیں ہونا چاہتا تھا۔

لڑکی نے بہرحال واپس ہونے کا کوئی ارادہ نہیں ظاہر کیا۔ وہ اپنے بوٹ کی نوک سے جہاز کے تختے پر آہستہ آہستہ ٹھوکر لگاتے ہوئے ایک سوچ میں کھڑی رہی۔

"کل شب کو نیچے کمرے میں آپ ہی تاش کھیل رہے تھے نا؟" اُس نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

"میں صرف دیکھ رہا تھا" اُس نے گردن موڑنے کی زحمت کیے بغیر الفاظ گویا اپنے کندھے پر پھینک دیے۔ لڑکی کانپ اُٹھی۔ صبح کی ہوا معمول سے زیادہ سرد تھی۔

"آپ اکثر ایسی صحبتوں میں شریک ہوتے ہیں مسٹر...... مسٹر......" وہ اسکا نام سوچنے کے لیے رُکی۔ مگر اجنبی اُسکا جملہ پورا کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ خاموشی کے ساتھ سگریٹ پیتا رہا۔

جہاز ذرا گرانی کے ساتھ چل رہا تھا اور سمندر کی کف دردہاں موجیں اکثر اُن کے قدموں تک چھینٹیں پہونچا دیتی تھیں۔ اُس وقت وہاں بالکل تنہائی تھی۔ دفعتاً ہی سُریلی امریکن آواز اجنبی کے گوش شنوا میں داخل ہوئی۔

"میں آپ سے بخوبی واقف ہوں۔ سُنا آپنے؟ چاہے آپ مجھے اپنا نام بتا دیں، چاہے اس لیے اُٹھا رکھیں کہ میں خود معلوم کرلوں۔"

اجنبی نے پہلی مرتبہ لڑکی کو نظر بھر کے دیکھا۔ غائر بلکہ تنقیدی نگاہوں سے۔ اُسکے ادھی مونچھ منڈے ہوے چہرے پر ایک استعجابی کیفیت برس رہی تھی۔

"میرا نام وسٹ ہے" اُس نے لحظہ بھر بعد کہا۔

لڑکی گردن ہلاتے ہوے بولی۔ "پیشے والا نام؟ میں خیال کرتی ہوں! درحقیقت آپ ایک پیشہ ور ہیں؟"

"کیوں؟" "درحقیقت اگر دریافت کیا جا سکے۔"

لڑکی نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ سامعہ نواز اور دل خوش کن۔ یقیناً اس لڑکی آواز میں جادو بھرا تھا۔

"میں نہیں خیال کرتی کہ آپ ذرا بھی ذہین ہیں۔" اُس نے کہا "جب میں آپ کو اُس گروہ میں مسافروں کی آمد و رفت کے وقت کھڑے ہوے دیکھا تھا۔ جبھی میں سمجھ گئی تھی کہ آپ کیا ہیں۔ اُس وقت آپ بالکل صاحب پیشہ معلوم ہوتے تھے۔ اور بظاہر آپ اس سے بے پروا تھے کہ جس آدمی کی آپکو فکر ہے وہ پکڑا گیا یا نہیں؟ حالانکہ میں خوب جانتی تھی کہ آپ کو بڑی فکر اور بے چینی تھی۔ اور میری ہنسی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ آپ کے ہاتھ نہیں لگا۔ میں جانتی ہوں اس سفر میں آپ اُسے گرفتار کرلیں گے؟"

وسٹ نے سگرٹ کا گل جھاڑتے ہوے اک مرتبہ پھر اپنی نگاہ سمندر کی طوفانی موجوں کی طرف پھیر لی اور مختصراً کہا "شاید میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔"

"آپ نہیں سمجھے؟" حیران آنکھیں اور زیادہ حیرانی کے ساتھ کُھلیں، لیکن وہ بے نیاز اجنبی کی کم نگاہی سے کوئی تسلی بخش جواب نہ حاصل کرسکیں۔ پھر لڑکی نے چپکے سے کہا۔

"کیا آپ مسٹر ٹ وارن سے واقف نہیں ؟..... نہیں ؟ ۔ تو کیا آپ اسی کی تلاش میں مصروف نہ تھے ؟"

وسٹ نے ایک فوری جنبش کے ساتھ اپنا سر اُٹھاتے ہوئے ایک پُر اسرار قہقہہ لگایا اور کہا "میرا طریقہ اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھتی ہیں۔"

شلیقیا نے اُسکے لہجے کے طنزیہ پہلو پر دھیان دیئے بغیر نہایت معصومیت کے ساتھ اُسکی ہنسی میں اپنا سُریلا قہقہہ شامل کر دیا ۔ وہ اجنبی سے گہری دلچسپی لینے لگی تھی اور اُسکی سربستہ گفتگو تو جیسے اُس کو بھانے لگی تھی ۔ حالانکہ وہ اسکی عادی نہ تھی ۔ ایک لطیف گل اندام لڑکی معصوم ۔ ۔ اور بھولی بھالی ـــــ پھر بھی وہ ان پر اسرار باتوں میں ایک عجیب قسم کی دلکشی محسوس کرتی تھی آخر اُس نے پوچھا :۔

"تو کیا آپ ضرور اُسے گرفتار کرلیں گے ؟"

"کیا آپ نہیں چاہتیں کہ وہ گرفتار ہو ؟" اجنبی نے اپنی سگریٹ سمندر میں پھینکی اور اک خوش آئند انداز کے ساتھ لڑکی کی طرف مُڑ کر دیکھا۔

شلیقیا نے بھی بے حجابانہ نگاہیں چار کیں اور بغیر کسی جھجک کے کہنا شروع کیا ۔

"نہیں ! مجھے اُسکے لیے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے ! میں جانتی ہوں کہ وہ ایک مشتعل فریبی ہے ۔ اُس نے بہت سے آدمیوں کو دھوکا دیا ہے ۔ بلکہ اُسکی "نیرنگی" کے "کشتوں" میں سے میں بھی ایک ہوں ۔ اُس نے پہلے پہل جب میرے سو پونڈ مار لیے تو میں بھی بڑی ناراض ہوئی لیکن اب چونکہ وہ سزا سے بچنے کے لیے بھاگ رہا ہے اس لیے مجھے اُس سے کچھ ہمدردی سی ہوگئی ہے اور میں چاہتی ہوں کہ وہ کسی طرح بچ جائے تو اچھا ہے ۔ مسٹر وسٹ شاید آپ کو میری یہ خواہش ناگوار معلوم ہو لیکن میں کیا کروں میری طبیعت ہی کچھ اس قسم کی واقع ہوئی ہے۔" وسٹ چیں بجبیں ہو رہا تھا ۔ مگر آخری جملے پر ذرا درشتی کے ساتھ مسکرایا اور لڑکی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا! "میں اُسکی ان حرکتوں کو بغیر پسند کیے نہیں رہ سکتی ' دھوکہ دینے کے لیے تو اُس نے عجیب سا ذہن پایا ہے ۔ شاید آپ بھی اس بارے میں میرے ہم خیال ہوں ؟"

قبل اسکے کہ وسٹ کوئی جواب دے ' جہاز کے ایک زبردست ہچکولے نے لڑکی کے قدم

[redacted]

اُٹھا دیے اور وہ سمندر میں گرنے ہی والی تھی کہ دفعتہً نہایت پھرتی کے ساتھ وسٹ نے اُسے
اپنے آہنی بازوؤں کی مضبوط گرفت میں لے لیا اور وہ اُس سے ایک بچے کی طرح چمٹ کر بے تحاشا
ہنسنے لگی۔ "میں تو ابھی غرقِ رحمت ہی ہو جاتی، آپ نے بڑی مدد کی۔ میں نے آپ سے مل کر فائدہ
اُٹھایا۔ سُراغ رسانوں کی طرف سے میں ہمیشہ اچھی رائے رکھتی تھی۔ کل آپ نے میرے بھائی آرکی
کو تاش والے کمرے میں دیکھا ہوگا۔ وہ کہتا تھا کہ آپ ایک غیر دلچسپ اور غیر مفید آدمی ہیں میں نے
تو آپ کو بالکل اُسکے برعکس پایا۔ امید ہے کہ آئندہ آپ مجھ سے اتنا تکلف نہیں برتیں گے۔ کیونکہ
مجھے آپ کو کچھ زحمت دینا ہے۔"

"آپ مجھ سے کیا کام لینا چاہتی ہیں؟" وسٹ کی آواز سخت تھی۔ اُسکی آنکھوں میں
نرمی کا نام بھی نہ تھا۔ پھر بھی اُسکے سوال میں ایک گرمجوشی ایک خلوص تھا۔
سنتھیا اُس پر اعتماد کرنے لگی تھی اُس نے کہا۔

"میرا پھوپھی زاد بھائی آرکی —— آپ نے اُسے دیکھا ہوگا —— بڑا ہی قمار باز ہے
اور اپنی دُھن کا پکا۔ لیکن اُس میں اتنی استعداد نہیں ہے کہ زیادہ روپیہ ہار سکے۔ وہ کسی نہ کسی
دن زک اُٹھا جائیگا۔ اور میں چاہتی نہیں کہ اُس پر کوئی مصیبت آئے۔"

"تو پھر؟" وسٹ نے ہمت شکن لہجے میں کہا۔ اُسکی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔
سنتھیا نے بغیر کسی جھجک کے کہنا شروع کیا۔

"کل آپ اُسکا کھیل بغور دیکھ رہے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھی اس کوچے کے نشیب و
فراز سے واقف ہیں، کیا اچھا ہوتا اگر جب تک ہم لوگ جہاز پر ہیں آپ اُسکی نگہبانی کرتے میں
آپ کا تعارف اُس سے کرا دونگی۔ دیکھیے اُسکی ماں بہت بیمار ہے اور پھر عورت ذات وہ کیسے اُسکی
خبر گیری کر سکتی ہیں۔"

سنتھیا نے بڑی سادگی کے ساتھ درخواست پیش کر دی تھی۔ لیکن اُسکی آنکھوں میں ایک
اضطرابی کیفیت جھلک رہی تھی۔ وسٹ سمندر کی سطح نیلی پر نظریں جمائے خاموش کھڑا تھا۔ کئی
سکنڈ کے بعد اُس نے ایک غیر متوقع سوال کیا۔

"آپ کسی اور سے یہ کام کیوں نہیں لیتیں؟"

کیونکہ اور کوئی ہے نہیں "
کوئی دوسرا ہے ہی نہیں ؟" اُس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔
" کوئی ایسا نہیں ہے جس پر میں اعتماد کر سکوں " سنتھیا نے اپنے جملے کی تشریح کی۔
" اور آپ مجھ پر اعتماد کرتی ہیں ؟ "

" یقیناً "
کیوں ؟ " اور پھر وسٹ نے لڑکی کو متجسس نگاہوں سے گھورا۔ اُسکی آنکھوں میں ایک
دہقانیت تھی —— ناگوار۔ مگر لڑکی کی ہنسی۔
" کیونکہ میں آپکو لائق اعتماد سمجھتی ہوں۔ اسکے علاوہ اور کوئی سبب نہیں پیش کر سکتی "
وسٹ کی نگاہوں میں نرمی آئی۔ وہ جھکنا شروع ہوئیں اور رفتہ رفتہ لڑکی کے چہرے سے
گئیں۔ اُس نے خشک لہجے میں کہا۔
" معلوم ہوتا ہے آپ کافی قوت امتیاز نہیں رکھتیں "
لڑکی نے خوش ہو کر ایک فوری جذبے کے ماتحت نہایت بے تکلفی سے اپنا ہاتھ بڑھادیا۔
" آہا۔ مسٹر وسٹ۔ ہاتھ ملائیے " اُس نے شوخی سے کہا " یہ پہلی اچھی بات ہے جو آپکے
سے نکلی۔ میں آپکو پسند کرتی ہوں۔
وسٹ اپنا سگریٹ کیس جیبوں میں تلاش کر رہا تھا۔ اُس نے لڑکی سے بغیر نظریں ملائے اپنا
پیش کر دیا۔ گویا وہ اُسکے اظہار پسندیدگی پر بہت خوش نہ تھا۔ جب سنتھیا رخصت ہوئی تو وہ
خاموشی کے ساتھ ایک جانب چلا گیا۔ امریکن لڑکی کی رنج پرور اور شگفتہ گفتگو نے بھی اُسکی
طبیعت کو دیگر مسافروں کی بارونق صحبتوں کی طرف مائل نہیں کیا۔

(۲)

واقعاً جیسا کہ سنتھیا نے کہا نوجوان آرکی بڑا بے دھڑک کھیلنے والا تھا۔ اُسمیں جانچ
پڑتال اور سوچنے سمجھنے کا مادہ جو ایک کامیاب کھلاڑی کے لیے اشد ضروری تھے قطعاً ودیعت
نہیں کیا گیا تھا۔ اسکا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ وہ جتنا جیتتا تھا اُس سے کہیں زیادہ ہار جاتا تھا تاش
کھیلنے کی اتنی زبردست خواہش اسمیں موجود تھی کہ کوئی بڑے سے بڑی شکست بھی اسکو اس مشغلے سے
باز نہ رکھ سکتی تھی۔

اور جب کبھی موقع پاتا تھا وہ اپنی یہ خواہش پوری کیے بغیر نہ رہتا تھا۔ عین اُسی وقت جب کہ سنتھیا دست سے اس کے بارے میں سفارش کر رہی تھی۔ وہ کھلاڑیوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں مصروف تھا۔

جب کھانے کا وقت آیا اور جماعت منتشر ہوئی تو حریفوں میں آرکی ہی سب سے زیادہ ہارنے والا ثابت ہوا۔ بہرطور وہ بددل نہ ہوا اور یہ کہتا چلا گیا کہ "اگر اب کی دفعہ پانسہ نہ پلٹ دیا تو نام نہیں"۔ تھوڑی دیر بعد جب کھلاڑی پھر جمع ہوئے تو اُن میں ایک جزو کا اضافہ ہو گیا تھا۔ ایک پستہ قد، چوڑے شانوں اور نیلگوں آنکھوں والا انسان وہاں آ گیا تھا اور اُسنے اُن کھلاڑیوں میں سے ایک سے شناسائی بھی پیدا کر لی تھی۔ جب اُس سے تاش کھیلنے کی صلاح کی گئی تو وہ راضی ہو گیا۔ اس بات پر لوگوں کو تعجب ہوا کیونکہ ابھی تک اس تنہائی پسند انسان نے سب سے الگ تھلگ اپنی سگریٹ پینے کو ان دلچسپ صحبتوں پر ترجیح دی تھی۔ اور کبھی اپنے ہمسفر لوگوں سے گفتگو بھی نہ کی تھی۔ ایک کھلاڑی نے دوسرے سے کہا "اس کی آنکھوں سے جعل سازی ٹپکتی ہے"۔ دوسرا چپکے سے بولا "سراغرساں ہے" اور بات گئی گذری۔

آرکی سب سے بعد میں آیا۔ اُسکی جگہ نئے کھلاڑی کے مقابل تھی جس کو وہ دوستانہ نگاہوں سے دیکھتا ہوا بیٹھ گیا۔ شروع کھیل میں نئے آنے والے نے زیادہ انہماک کا اظہار نہیں کیا۔ لیکن وہ مستقل طور پر جیتتا رہا۔ آرکی ہار رہا تھا۔ دیگر چار کھلاڑیوں کی قسمت کبھی اچھی اور کبھی خراب ہوتی رہی مگر نیا کھلاڑی متواتر جیتتا گیا۔

شام تقریباً نصف ختم ہو چکی تھی کہ آرکی نے دفعتاً بآواز بلند زیادہ رقم بدنے کا اعلان کیا۔ اور کہا کہ اب وہ اپنی قسمت پلٹتا ہے۔ نئے کھلاڑی نے اعلان شدہ رقم دوچند کر دی جانے کی تجویز کی۔ دوسرے کھلاڑیوں نے مشکوک نگاہوں سے اُسکو دیکھا مگر آخرکار سب نے منظور کر لیا اور داؤں بڑی رقم پر بد دیا گیا۔ اس عرصے میں کچھ تماشائی بھی جمع ہو گئے تھے اور آرکی دیوار پر پُشت لگائے فیصلہ کا منتظر تھا کہ دفعتہً اس نے خلاف توقع وہ داؤں جیتا اور پھر مستقل طور پر جیتنا شروع کیا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ اُس کی قسمت پلٹ گئی ہے۔ روپے کی سیل اُس کی طرف رجوع ہو گئی تھی۔

یوانہ وار کھیل رہا تھا اور کامیاب ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی اور نئے آنے والے
ن ہم پلہ ہو کر رہے گی۔ ایک گھنٹہ تک آر کی بغیر توقف متواتر جیتتا رہا۔ یہاں تک کہ
ول میں اُس کی غیر معمولی کامیابی پر کھچڑیاں پکنے لگیں۔ "بہتر ہے کہ اب تم کھیل موقوف
ایک نے اُسے متنبہ کیا" دیکھو یہ کھیل اچھا نہیں ہے۔ تم نے اس پر اعتماد کیا نہیں کہ اس نے
تباہ کر دیا؟" آر کی نے اس کان سُنا اُس کان اُڑا دیا۔ وہ سر جھکائے نگاہیں نیچی کیئے
انہماک کے ساتھ کھیل میں مشغول تھا۔ جُوے کا جن اُس پر سوار تھا۔ "وہ رات بھر یونہی
یا ئیگا" تماشائیوں میں سے ایک نے کہا۔ لیکن یہ پیشینگوئی پوری نہ ہوئی۔ ایک معمولی
نے لڑکے کی متواتر کامیابی کو دیکھتے ہی دیکھتے خاک میں ملا دیا۔ یہ صرف ایک ذرا سی چمکیلی چیز کے گرنے کی
تھی جس کے ساتھ ہی آر کی کی بدقسمتی عود کر آئی۔ وہ ایک ہی داؤں میں سارا روپیہ ہار گیا اور
ی میں اُس کے منھ سے بے اختیار ایک چیخ نکل گئی۔ اُس کے ہم پہلو شخص نے ایک چھوٹا سا
کا آئینہ زمین سے اُٹھایا جس کی پُشت چمڑے کی تھی اور اُس میں ایک پن آویزاں تھی۔ اُسنے
نا سب کو دکھا کر میز پر رکھ دیا اور کہا "کامیابی کا راز"
سب کی نگاہیں آر کی پر جمی ہوئی تھیں جو دم بخود بیٹھا تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک سفید ہو گیا۔
نے کی کوشش میں اُس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ آخر ایک صاف آواز بلند ہوئی۔
کے اطمینانی لہجے نے اس خاموشی کو جو ہزار ہنگاموں سے زیادہ خوفناک تھی توڑا۔ نئے
والے (دسٹ) نے نہایت بُردباری اور متانت کے ساتھ چھوٹے آئینے کو اُٹھایا اور کہا
اس حقیر کی ملکیت ہے۔ اسی کی مدد سے یہ خاکسار اتنی دیر تک آپ لوگوں کو جیتتا رہا"
سب کی توجہ دسٹ کی طرف مبذول ہو گئی۔ جو اتنی بیباکی سے اپنی عیاری کا راز فاش کر رہا
۔ اور اُسنے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنے بیان کو واضح کرنا شروع کیا "درحقیقت میں نے اسکا
مرتبہ تجربہ کیا ہے۔ میں کوئی تاش کا مستقل کھلاڑی نہیں ہوں۔ چند دوسری چیزوں کی تلاش
مجھے یہ آئنہ ملگیا تھا اور چونکہ بعض قسم کی دستی صفائیوں میں مجھے کمال حاصل ہے۔ اس لیے
نے اسکا یہاں تجربہ کرنا چاہا۔ آپ لوگوں نے اندازہ کیا ہو گا کہ یہ چال کتنی خوبصورتی کے ساتھ
میاب ثابت ہوئی۔ آپ حضرات خود غور فرمائیں کہ آپ اپنے تئیں کس آسانی سے خطرے میں

ڈال دیتے ہیں۔ اب غالباً کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ یہ سب کچھ ہاتھ کی صفائی اور اس چھوٹے سے آئینے کو نظروں سے پوشیدہ رکھنے پر منحصر تھا" اس کشف حجاب کے بعد وسٹ نے آئینہ سب کو دکھایا اور پن کے ذریعے کوٹ کی آستین میں لٹکا لیا۔ پھر یہ کہتا ہوا اُٹھا "اگر آپ لوگ مطمئن ہوں تو میں رخصت ہوں"۔ اُسنے بے پروائی کے ساتھ نوٹوں کے گڈے اپنی کہنی کی ایک جنبش سے سمیٹے اور انھیں اُٹھا کر جانے کا ارادہ کیا کہ کھلاڑیوں میں سے ایک شخص * نامی کھڑا ہو گیا۔ اور بآواز بلند بولا "ٹھہریے جناب"۔ وسٹ ٹھہر گیا۔ اُس کی آنکھوں سے شرارت ٹپک رہی تھی۔ اُسنے رُڈ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں جس نے کہنا شروع کیا "میں نہ صرف اپنی بلکہ جملہ حاضرین کی طرف سے احتجاج کرتا ہوں کہ آپکی یہ حرکت انتہائی دغابازی پر مبنی تھی۔ کم از کم ہم لوگ معمولی ایمانداری کا ضرور لحاظ رکھتے ہیں اور ہر ایک سے اس کی توقع رکھتے ہیں۔ آپنے اس رسم پارینہ کے خلاف ایک مکارانہ۔ ناجائز اور ناشائستہ فعل کا ارتکاب کیا جس کی پاداش میں اگر آپ معافی مانگنے کے لیے تیار نہیں تو آپ کی خیریت بھی نہیں"۔ سب سکتے کے عالم میں کھڑے تھے وسٹ نے تمام حاضرین کو مخاطب کر کے کہنا شروع کیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ حضرات کو میرے تجربے سے رنج پہنچا۔ بہرحال آپ اگر مجھ سے معافی منگوانے ہی پر مصر ہیں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں"۔

رُڈ نے وسٹ پر ایک نفرت آمیز نظر ڈالی اور خاموشی اختیار کی۔ ایک دوسرا شخص بولا۔ "آرکی سب سے زیادہ ہارا ہے اگر آپ اُس سے علیحدہ معافی طلب کریں تو بہتر ہے"۔ ایک تیسرے نے آئینہ اُس کی آستین سے نوچ کر زمین پر پٹک دیا اور پیروں سے کچل ڈالا۔

وسٹ نے صرف اپنے کندھے ہلائے اور کہا "میں آپ تمام حضرات سے مجموعی طور پر ہاں فرداً فرداً درخواست کرتا ہوں مسٹر آرکی سے جنکی بدقسمتی پر مجھے انتہائی افسوس ہے معافی مانگتا ہوں۔ اب سب لوگ مطمئن ہو گئے ہوں تو میں رخصت ہوں"۔ کسی نے جواب نہ دیا۔ وسٹ نے اطمینان اور آہستگی کے ساتھ نوٹ جیبوں میں بھرے اور اپنی راہ لی۔

رات اندھیری تھی اور سمندر طوفانی۔ مسافروں کے لیے سیر کا کوئی سامان نہ تھا۔ وسٹ سیدھا جا کر کھڑا ہو گیا جہاں صبح کو اس سے اور مسٹر ... سے ملاقات ہوئی تھی

زینے پر تیز قدموں کی چاپ معلوم ہوئی اور دسٹ نے اُدھر گردن موڑی - اُسے آرکی کا سفید چہرہ دکھائی دیا - جو بغیر کچھ بات کیے ہوئے چلا آیا - تھوڑی دیر میں واپس ہو کر اُس نے دسٹ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا -

"میں آپ سے کچھ گفتگو کر سکتا ہوں"

"اگر ضروری ہو"

"میں پوچھتا ہوں کہ آپ کی یہ کون سی حرکت تھی"

"کیسی حرکت؟"

"آپ سمجھ گئے ہوں گے"

"مجھے خیال نہیں" دسٹ کا لہجہ حقارت آمیز تھا -

"لیکن آپ ضرور سمجھ گئے ہوں گے" آرکی نے اصرار کیا -

"میں جو کام کرتا ہوں سمجھ کر کرتا ہوں"

"پھر میرے ساتھ آپ نے کیا سمجھ کر ایسا کیا؟"

"میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھ سے میرے افعال کی بابت تعارض کرے"

"لیکن دیکھیے" آرکی نے کہا "آپ نے آج میرے ساتھ فریب کیا"

"میں نے کچھ نہیں کیا" دسٹ بولا "تم غلط فہمی میں مبتلا ہو"

"آپ کو ماننا پڑیگا کہ - - - - -"

"میں کچھ نہیں مانونگا" دسٹ جانے کے لیے مڑا مگر آرکی نے اُس کا بازو تھام لیا اور کہا -

"دیکھیے جناب میں بغیر آپ سے منوائے نہیں رہ سکتا میں ابھی آپ کی رپورٹ کر دوں گا"

"تو تم سخت حماقت کرو گے - تم جانتے ہو میں کون ہوں؟"

"سب آپ کو سراغرساں بتاتے ہیں"

"ٹھیک ہے میرے تمام کام صیغۂ راز میں ہوا کرتے ہیں اور میں دُنیا بھر کو اُن کی وجہ نہیں بتاتا - مجھے تمھارے ساتھ کچھ اُن لوگوں سے زیادہ ہمدردی نہیں جنکے ساتھ تم دن بھر جوا کھیلتے ہو - وہ بھی تمھیں فریب ہی دیتے ہیں - اس لیے اگر تم ایسی حرکت کروگے تو خود اپنے کو اور اپنے ساتھیوں کو

خطرے میں ڈالو گے۔ ہاں میں تم کو ایک بات اور بتا دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تم کبھی تاش کے کامیاب کھلاڑی نہیں بن سکتے اور دھوکا دینا تو تمھیں آتا ہی نہیں جو اس کے لیے اشد ضروری ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم اس کھیل کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دو۔"

دسٹ کی نصیحت میں سچی ہمدردی تھی۔ زبان میں اثر۔ اور نگاہیں آرکی کے دل میں اُتری جا رہی تھیں۔ جو شرمندہ سر بگریباں خاموش کھڑا تھا۔ آخر کو ایک جبریہ کوشش کر کے وہ صرف اتنا کہہ سکا۔

"آپ بڑے اچھے آدمی ہیں۔"

وسٹ نے ایک قہقہہ لگایا جو آرکی کو زندگی بھر یاد رہے گا۔ پھر اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "یہ اپنی اپنی رائے ہے۔ خدا حافظ۔ دیکھو یاد رکھنا جو کچھ میں نے کہا ہے۔"

"آرکی نے ہاتھ ملایا اور خلوص کے ساتھ کہا۔ "میں کبھی نہیں بھولوں گا۔"

وسٹ اپنے کندھوں کی مخصوص جنبش کے ساتھ نیچے چلا گیا۔

آرکی نے تاش کھیلنے سے توبہ کر لی۔

(۳)

"مسٹر وسٹ میں آپ سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہوں" ایک سُریلی آواز نے یہ الفاظ وسٹ کے کانوں تک پہنچائے اور وہ ظاہری بے توجہی کے ساتھ گوش بر آواز ہو گیا۔

سنتھیا اُس کے پیچھے صبح کی نورانی روشنی میں کھڑی تھی۔ اُسکے بال چہرے کے چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے اور اُس کی حیران نرگسی آنکھوں میں دوستی کی جھلک صاف نمایاں تھی۔ اُسنے ایک یا دو مرتبہ وسٹ پر نگاہ ڈالی اور کہا۔

"مسٹر وسٹ اگر میں آپسے ایک سوال کروں تو کچھ حرج تو نہیں ہے؟ ہاں! ذرا سچ سچ بتائیے کل شب کو کمرے میں کیا واقعہ گذرا۔"

"کیوں بتاؤں؟" وسٹ نے اپنے مخصوص مختصر اور غیر دوستانہ انداز میں کہا۔

سنتھیا جھجکی نہیں۔

"کیونکہ آپ ایک شریف آدمی ہیں" اُسنے دلیرانہ انداز میں جواب دیا۔

وسٹ نے اپنے کندھے ہلائے اور کہا "میں نے کس بات سے آپکو یہ رائے قائم کرنیکا موقع دیا؟"

"تو کیا ایسا نہیں ہے؟" وہ شوخی سے مسکراتے ہوئے بولی "اگر آپنے کوئی ثبوت نہیں دیا تو مجھے میرے دل نے بتایا۔ اور آپکا کوئی فعل میرے اس خیال کی تردید نہیں کر سکتا۔

"آپ کا شکریہ" وسٹ نے کہا اُس کی نیلگوں چمکیلی آنکھیں سمندر کے اس پار اُفق پر جمی ہوئی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ زیادہ بات چیت سے گھبرا رہا ہے۔

لیکن سنتھیا نے سلسلۂ گفتگو پھر چھیڑا۔

"ہاں مسٹر وسٹ آپ جانتے ہیں کہ وہ لوگ آپ کی بابت کیا کہہ رہے ہیں"

"مجھے جاننے کی ضرورت نہیں"

"مگر مجھے تو بڑی فکر ہے"

"کیوں؟" اُسنے سنتھیا کی طرف دیکھا جس نے اُس سے نگاہ بچانے کی کوشش کی مگر ناکام۔

"ایسے کیا ہوا؟" وسٹ نے ذرا گھبرا کر پوچھا۔

سنتھیا نے گلوگیر آواز میں جواب دیا "مجھے کل کے واقعات کی بابت بجنیی ہے میں نے آپسے ناحق ایسی خواہش کی۔

وہ اُس پر نظریں جمائے رہا سنتھیا نے خاموش ہو کر سر جھکا لیا۔ آخر کار وسٹ نے اُسے پہلی مرتبہ خود سے مخاطب کیا۔

"مس مارٹمر" اور وہ اُس کی طرف تھوڑا سا بڑھا "تمہارے رنجیدہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں میں نے جو کچھ کیا اپنی مرضی سے کیا اور میں تمکو اطمینان دلاتا ہوں کہ کل کے واقعات مجھے کوئی ذاتی نقصان نہ پہونچائینگے"

سنتھیا نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا "سب کہہ رہے ہیں کہ وہ فریبی ہے اُسے گرفتار کر لو"

"وہ جو چاہیں کہیں" وسٹ نے بغیر ذرا سے خوف کے کہا مگر سنتھیا مطمئن نہ ہوئی۔

"ہائے میں نے ایسی خواہش ہی کیوں کی" اُسنے زیر لب کہا۔

وسٹ اپنے مخصوص انداز سے کندھے ہلا کر بولا "تو کیا حرج ہو گیا۔

وہ تنکر کھڑی ہو گئی۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ آخر کو ایک دردناک لہجہ میں اُسنے کہنا شروع کیا "آپ مجھ سے چھپاتے ہیں۔ میں بچہ نہیں ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ کل کے واقعہ کے کیا نتائج ہونگے

اور یہی فکر مجھے ارے ڈالتی ہے"۔

وسٹ کے چہرے پر ایک تغیر رونما ہوا۔ وہ لڑکی کو اس طرح دیکھ رہا تھا جس طرح کوئی ڈاکٹر اپنے مریض کو دیکھتا ہے۔ پایان کار وہ بولا "تم بیکار پریشان نہ ہو۔ اگر یہ وعدہ کرو کہ کسی سے بیان نہ کروگی تو میں کل کے واقعہ کا راز تمکو بتا دوں۔

سنتھیا نے کہا "میں وعدہ کرتی ہوں۔ آپ مجھپر اعتماد کریں۔

"مجھے تم پر اعتماد ہے" وسٹ نے ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہنا شروع کیا۔

"جس آدمی کو ہم گرفتار کرنا چاہتے ہیں وہ اس جہاز پر موجود ہے۔ لیکن میں ایک خفیہ سراغرساں کی حیثیت میں اسکا وارنٹ گرفتاری نہیں رکھتا ہوں جب وہ دوسرے بندرگاہ پر اُترے گا۔ تو گرفتار ہو جائے گا۔

سنتھیا وسٹ کے بالکل قریب آگئی اور پوچھنے لگی "مجھے بتایئے وارنی کون ہے وہ آج کل کس بھیس میں ہے۔

وسٹ نے پس وپیش کیا اور سنتھیا نے اصرار آخر کو اُسے بتانا ہی پڑا۔ وہ رٹو کی طرف اشارہ کرکے بولا "وارنی یہی ہے۔

سنتھیا بولی ہاتھ ملایئے میں اس آدمی سے نفرت بھی کرتی تھی۔

وسٹ نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لےکر آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں اور کہا "مس مارٹمر تم بڑی اچھی لڑکی ہو۔ لیکن میں تمکو دوستانہ صلاح دیتا ہوں کہ تم میری صحبت میں نہ رہا کرو۔ یاد رکھو میں ایک غریب ہوں اور تمھارا دوست بننے کے قابل نہیں"۔

لڑکی زور سے ہنسی وہ دل میں خوش تھی کہ وسٹ نے آخر اُسے اپنا محرم راز بنا ہی لیا۔

"سب یاد رہیگا" اُسنے کہا اور وہ وہاں سے نہ صرف مطمئن بلکہ ایک گونا مسرور چلی گئی۔

(۴)

بقیہ دوران سفر میں ہر شخص کا برتاؤ وسٹ کے ساتھ نہایت غیر ہمدردانہ رہا لیکن اس سے وسٹ پر ذرا سا بھی اثر نہ ہوا۔ وہ اُسی بردباری اور متانت کے ساتھ مجمع میں آتا جاتا تھا۔ اُسی خاموشی کے ساتھ اپنی سگریٹ پیتا تھا جو اُسکا حصہ تھی۔ اکثر سنتھیا اُسے دور سے دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں پسند

کیا کرتی تھی۔ وہ ڈکو پر بھی نگاہ رکھتی تھی۔ ایک مرتبہ اُس نے وسٹ سے چپکے سے کہا۔

" رُوبیچین معلوم ہوتا ہے"

وسٹ ایک طنزیہ ہنسی ہنسا۔ پھر ایک چھوٹے سے بنڈل کی طرف اُسنے سنتھیا کی توجہ مبذول کی۔

" میری خواہش ہے کہ تم اسے قبول کرلو" یہ کوئی بڑی ضروری چیز نہیں ہے۔ لیکن کل تک تم اسے نہ کھولنا"

سنتھیا نے متعجب ہوکر پوچھا " یہ کیا ہے ؟"

" میرے پیشے سے متعلق ایک چیز ہے۔ اگر مجھے تم پر اعتبار نہ ہوتا تو تمھارے سپرد نہ کرتا"

وہ پس و پیش کررہی تھی " تو کیا ۔ ۔ ۔ ۔ کیا میں ۔ ۔ ۔ ۔ اسے لے لوں ؟"

" ہاں ہاں لے لو۔ اگر تم نہ لوگی تو میں اسے جہاز کے کپتان کو دیدوں گا کہ وہ کل تمھارے حوالے کردے۔ مگر میں تم کو اپنے ہاتھوں دینا بہتر سمجھتا تھا"

سنتھیا نے بنڈل لے لیا اور کہا " تو میں اسے کبتک نہ کھولوں ؟"

" اُسوقت تک جبتک کہ ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لیے علٰحدہ نہ ہوجائیں"

" لیکن نیویارک میں ہم پھر ملیں گے!" سنتھیا نے متاثر ہوکر کہا " یا شاید بوسٹن ہی میں وہاں میرے والد آپسے ملکر بہت خوش ہوں گے"

وسٹ مُسکرا کر بولا " لیکن میں زیادہ ملنسار نہیں واقع ہوا ہوں۔ اور اس کے علاوہ بھی شاید میں بوسٹن پہنچ سکوں"

" تو کیا اس کے یہ معنے ہیں کہ ہم کبھی آیندہ ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں گے ؟"

سنتھیا کی آواز انتہائی پُردرد تھی۔ ابھی تک اُس نے صحیح اندازہ نہیں کیا تھا کہ اُسے وسٹ سے کس قدر محبّت ہوگئی تھی۔ وسٹ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اُس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ وہ سنتھیا کی طرف جھکا اور اُس کے کان میں ایک بات کہتے کہتے رُک گیا۔ پھر اُسنے دفعتہً رخصت ہونے کا ارادہ کرتے ہوئے کہا۔

" آیندہ کا حال خدا جانے۔ فی الحال تو میں رخصت ہوتا ہوں۔ خدا حافظ" اُسنے سنتھیا پر اک آخری نگاہ ڈالی۔ اور بغیر ہاتھ ملائے چل دیا۔ وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

(۵)

اندھیرے منھ جہاز نیو یارک پہنچا۔ بہت سے مسافر ناشتہ کرنے کے لیئے ابھی جہاز پر ٹھہرے ہوے تھے۔ بڑا شور و ہنگامہ تھا۔ سنتھیا دسٹ سے ایک مرتبہ مل لینے کے لیئے بیچین تھی۔ اُس کی نرگسی آنکھیں اپنے دوست کو ڈھونڈھ رہی تھیں۔ وہ رات کو نیند بھر سوئی بھی نہیں تھی۔ اور اس وقت جسم میں حرارت محسوس کر رہی تھی۔ اُسے دسٹ کی آخری گفتگو کی یاد ستا رہی تھی۔ اور وہ چاہتی تھی کہ اِک نظر اُسکو دیکھ لے۔ اسی کشمکش میں ٹہل رہی تھی۔ کہ اُس نے اپنی پشت پر دو آدمیوں کو گفتگو کرتے ہوے سُنا۔

"میں تو جانتا ہی تھا کہ وہ اوّل نمبر کا فریبی ہے۔ دیکھو اُس نے آرکی کے ساتھ کیسی چال کی"

"وہی تو نٹ وارنی تھا۔ میں نے نیو یارک سے پولیس منگوا کر اتنی صفائی سے اُسے گرفتار کرا دیا کہ جسکا جواب نہیں"

سنتھیا نے گھبرا کر پوچھا "کیا ہوا۔ ۔ ۔ نٹ وارنی کون تھا؟"

رؤ نے اُسے کن انکھیوں سے دیکھا۔ پھر مسکرا کر کہا "آپ کو تو بہتر جاننا چاہیئے۔ دسٹ ہی مشہور فریبی نٹ وارنی تھا"

سنتھیا دم بخود رہ گئی۔ آخر کار تیزی کے ساتھ اپنے کمرے میں آئی۔ دروازے بند کیئے اور بنڈل کھولا۔ اندر سے سَو پونڈ کے نوٹ نکلے۔ ایک پُرزے پر لکھا تھا۔
"جس نے آپکو کبھی فریب دیا تھا وہ معافی کا خواستگار ہے۔" کوئی دستخط نہ تھا اور نہ دستخط کی ضرورت تھی۔ سنتھیا پر کُل حقیقت روشن ہو گئی تھی۔ جب ایک گھنٹے کے بعد وہ اپنے کمرے سے نکلی تو اُسکی آنکھیں نہایت صاف۔ شفاف اور چمکدار تھیں اُنمیں وہ ذرا نیت موجود تھی جو بہت سا رونے کے بعد پیدا ہوتی ہے!

(باقی آیندہ)

طبقہ اناث کے متعلق چند باتیں

(جناب ملا سرفراز حسین خاں صاحب)

دنیا میں جنس نازک کی گزشتہ زندگی جس قدر افسوسناک تھی اسیقدر آئندہ حیات دردناک ہے میں نہایت ہی کہ جس طرح علم و ادب سے بے بہرہ رکھنا صواب سے دور ہے بعینہ اسی طرح بے پردہ رکھنا عذاب سے نزدیک ہے بلکہ عین عذاب ہے۔ بلاشبہ زیور علم طبقہ اناث کے لیے جوہر ہے اور بالیقین محفوظ حجاب عصمت کے لیے گوہر ہے۔ عورت کو جہاں علم و ہنر کا ماہر ہونا ضروری ہے وہاں پردہ و بے پردگی کی اچھائی برائی کا ناظر ہونا بھی لازمی ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ یہ مرد کی انتہائی نادانی تھی کہ اس نے نافہمی کی پرخار جھاڑیوں میں خود کو الجھا کر فرقہ اناث کے لیے تحصیل علم کو دشمن عصمت قرار دیا۔ آدم کی پیاری اور چہیتی لڑکیوں کو علمی، ادبی، سیاسی، معاشرتی غرضکہ دنیا کے مختلف شعبہ زندگی میں سے کسی کے لائق نہ جانا۔ انصرام خانہ داری و پرورش اطفال کا ناگزیر طوق انکے نازک گردنوں میں بے جبر اکراہ ڈالا۔ انکی مفید ترین جنس کو حیوانات کے مماثل جان کر حصول لذات کا ذریعہ سمجھا۔ مگر آدم کی صابرہ بچیوں نے بخوشی تمام دکھ جھیلے کبھی حرف شکوہ زبان سے نہ نکالا ہمیشہ آستانہ یار پر سر تسلیم خم رکھا۔ مردوں کی جفا سے اکتا کر کبھی بولیں بھی تو یہ بولیں۔

ہم اگر قتل ہے خیر یہ تقدیر اپنی
آپ بدنام نہ ہوں دھو لیجئے شمشیر اپنی

تسلیم و رضا کی صورت گری اور محبت و وفا کی تصویر کشی کر کے خود کو میر کے اس نایاب شعر کا مصداق بنا دیا۔

زیر شمشیر ستم میر تڑپنا کیسا
سر بھی تسلیم محبت میں ہلایا نہ گیا

بیشک یہ مظالم حدود انسانیت سے گزرے ہوئے تھے جنکا اندفاع از حد ضروری تھا لیکن افسوس کہ کوئی انتہا باقی نہیں رہتی جب حیا حیان مروت کی نگاہیں عورتوں کے موجودہ ردعمل پر پڑتی ہیں۔ بجائے اسکے کہ موجودہ نسوانی کالجین احاطہ اعتدال میں ہوتیں وہ اس قدر بے حجاب ہو گئی ہیں کہ انکی تفصیل سے حیا مانع ہوتی ہے۔ فطرت کے خلاف سعی اور اسکی مخالفت میں جد و جہد کرنا نہ صرف کج نہادی و کج فہمی پر دال ہے بلکہ اگر بنظر غائر سے دیکھا جائے تو امر محال و خیال باطل ہے۔ اگر آگ سے حرارت زائل کر دینے پر کمر ہمت چست کی جائے اور پانی سے برودت نکال دینے کی ان تھک کوشش کی جائے تو کبھی یہ ممکن ہو سکتا ہے

"ادب"

کہ آگ آگ اور پانی پانی بھی ہے اور ان میں برودت و حرارت بھی نہ پائی جائے جس طرح یہ بات ناممکن ہے۔ اسی طرح اگر صنف نازک اپنے رخ تابندہ سے نقاب شرم اُٹھا کر زینت محفل بننا چاہے یا اپنی عقل ناقص کو کامل سمجھ کر بجائے انتظام امور خانہ داری کے معاملات ملکی میں دخل اندازی کرنے کی آرزو میں جان کھوئے تو یہ کم عقلی اور ناسمجھی ہوگی۔ صاحبان عقل بخوبی جانتے ہیں کہ عورت باوجود انتہائی کوشش کے اپنے فطری ملبوس شرم کے اُٹھانے میں بالکل عاجز ہے۔ خود اسکی فطرت اس پر نقاب ڈالتی ہے اور وہ مجبور ہوتی ہے کہ بجائے آرایش محفل ہونے کے زینت خانہ رہے۔ غالباً شاعر نے اسی مطلب کی توضیح میں کہا ہے

بہت نرگس نے چاہا پر نہ تاکا چہرۂ گل کو   نظر بازی سے مانع ہوگئی تہذیب نسوانی

عورت کی چشم دزدیدہ میں خداوند کریم نے جہاں تسخیر عشاق کا جادو بھر دیا ہے وہیں سرمۂ ندامت بھی لگا دیا ہے جو لمحہ بھر نگاہ غلط انداز پڑ جانے سے تمام جسم کو شرم و حیا کا پتلا بنا دیتا ہے۔ دوربین آنکھیں عورت کی اس غیر فطری غلط رفتاری کے نتائج کو بخوبی دیکھتی ہیں اور سنجیدہ اصحاب یقیناً کسی پیکر حسن کی جادو بیانی یا کسی چشم فسوں ساز کی سحر کاری سے مسخر ہو کر نشانۂ ملامت نہیں بن سکتے۔

میں اس بات سے بالکل متفق ہوں کہ عورتیں اپنے جائز حقوق کے لیے میدان ترقی میں گامزن ہوں۔ ایوان عدالت میں "سلب حقوق" کی عرضی پیش کر کے مردوں کو مدعا علیہ بنائیں۔ اپنے صحیح مطالبات کے حصول میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کریں۔ مگر برائے خدا مردوں کے ان مخصوص حقوق میں جنھیں کاتب تقدیر نے صرف مردوں ہی کو دیا ہے۔ دست برد کی کوشش نہ فرمائیں۔ بلکہ حصص مشترک میں مساوی تقسیم کے بعد جو حصے جس صنف کے لیے مخصوص ہیں انھیں محفوظ رہنے دیا جائے اسی طرح ہماری عرض طبقۂ ذکور سے بھی ہوگی کہ للہ آپ اپنی مخصوص جائداد کی حفاظت فرمائیے۔ خدارا اپنی بیش بہا پونجی کو حوروں اور پریوں کے سائے سے بچائیے۔ کہیں وہ منحوس دن دیکھنا پڑے کہ آپکی متاع گراں بہا ضائع ہو جائے اور آپ محو خواب ہی رہیں۔ آرام کی نیند بہت سو لیے اب وقت خواب نہیں، بیدار رہ کر مستعد کار ہونا چاہیے۔ ؎

صبح ہوتی گئی اُٹھتے گئے سونے والے

آفریں اے مرے بیدار نہ ہونے والے

ملاقاتِ رُسوا

(جناب سید محمد عسکری طباطبائی صاحب بی اے فائنل لکھنؤ یونیورسٹی)

لکھنؤ کے شرفا میں میر اعجاز حسین صاحب مرحوم سے کون واقف نہیں۔ خدا بخشے نہایت باوضع آدمی تھے۔ بڑے بڑے لوگوں سے شناسائی رکھتے تھے۔ خود کہیں ذرا کم جاتے۔ البتہ اپنے گھر اکثر اہلِ علم کو مہمان رکھتے۔ دُوربینی دیکھیے کہ مرحوم زمانۂ حیات ہی میں اپنے بڑے بیٹے جناب ضمیر کو اپنے ملنے والوں سے روشناس کرا چکے تھے۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۱ء میں مرزا محمد ہادی رسوا کچھ دنوں کے لیے حیدرآباد سے لکھنؤ تشریف لائے تو انھیں کے یہاں قیام پذیر ہوئے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ رسوا کا مہمان خانہ اُن کے دلنواز میزبان سے خالی ہو چکا تھا۔ اگر اُس کی یادگار دو چراغ اب بھی نہ باقی ہوتے تو شاید رُسوا کو مکان اندھیرا نظر آتا۔ پھر بھی جب مرحوم کی بیوی نے ان کو اپنا خاندانی بزرگ اور ہمدرد جان کر زمانہ کی چیرہ دستی کا شکوہ کیا تو اُنھوں نے ایک آہ بھر کے کلیجہ تھام لیا اور بڑے درد کے ساتھ کہا "بیٹا یہ ہماری قسمت کہ بُڑھاپے میں تم کو رانڈ دیکھنا بھی بدا تھا"۔ ایک تو بُڑھاپے کی آواز یوں ہی رعشہ دار اور پھر جب اُس میں آنسوؤں کی تری اور دل کی کسک بھی شامل ہو! بیوہ کا دل ایک تو یوں ہی نازک اور پھر جب تعزیت کا یہ انداز ہو! بس کچھ نہ پوچھیے تھیں جو عالم ہوا۔ دو دل تھے کہ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے اور دیکھنے والے سکتے کے عالم میں۔

اِس تذکرے سے مقصد یہ ہے کہ اُن تعلقات پر ایک حد تک روشنی پڑ جائے جو مرزا کو اس خاندان سے ہیں اور کوئی تعجب نہ کرے کہ ہادی رُسوا ایسی بڑی شخصیت کی مہمانداری لکھنؤ میں کسی بڑے رئیس نے کیوں نہ کی۔

بہر حال۔ میں نے سُنا کہ یہ صاحب کمال میرے ہمسائے کی زینت بنا ہے تو شوق زیارت دل میں چٹکیاں

[1] میر اعجاز حسین مرحوم کے دو بیٹے ہیں سرفراز حسین صاحب ضمیر۔ واجد حسین صاحب ظہیر۔ [2] رُسوا موصوفہ کے عزیز بھی تھے۔

لینے لگا۔ میں نے سطیر کو بلوایا اور کہا کہ "تم مجھے اس یگانۂ روزگار کو نہ دکھاؤگے؟" جسکا عملی جواب اُنھوں نے یہ دیا کہ کچھ دیر کے بعد میں اور وہ اُس بالا خانے کے زینے پر گرم صعود تھے جس میں مرزا متمکن تھے۔ جیسے جیسے میں اپنے کو اپنے مقصد سے قریب تر پاتا جاتا تھا، ویسے ویسے میرے دل کی دھڑکن تیز ہوتی جاتی تھی۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ میں مرزا کی شخصیت سے مرعوب ہو رہا ہوں مگر دراصل یہ تھا کہ ایک مدت کا جاگزیں شوق یکبارگی پورا ہوتے وقت جذبات نے یہ روش اختیار کر لی تھی۔

بسم اللہ کہہ کے میں اُس کمرے میں داخل ہوا جسمیں موصوف بستر نقاہت لگائے لیٹے تھے۔ اپنے سامنے مجھ کو ایک معمر شخص نظر پڑا ـــــ کشادہ ابرو، خندہ پیشانی اور ملیح رنگ، جسم اگرچہ طول سن کی وجہ سے لاغر ہو گیا تھا پھر بھی گزشتہ قوت و صحت کے آثار اپنے میں رکھتا تھا۔ چہرے کی ساخت آفتابی تھی۔ ناک نقشہ دُرست اور متناسب۔ آنکھیں ذرا چھوٹی مگر اُن علوم کی گہرائی کا پتہ دینے والی جنکے مطالعے میں ایک مدت دراز تک وہ مصروف رہی تھیں اور فی الحال بھی تھیں۔ اگر افیون[1] کے خمار کو علیحدہ کر کے دیکھا جاتا تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا تھا کہ اُن میں کسی قسم کی تھکن کے علامات نہ تھے۔ یہ میں نے اس لیے کہا کہ اُس کیف کے عالم میں بھی مرزا نے جب میرے داخلے پر مجھ کو غور سے دیکھا تو اُن کی آنکھوں نے ایک ذرا وسعت کے ساتھ کُھل کر اُس غیر معمولی چمک کو ہویدا کر دیا جسکی تہ میں ذکاوت اور حس صحیح پوشیدہ ہوتی ہے۔ (بعد کو میرے دوران ملاقات میں جب مرزا کو کچھ پڑھنے کی حاجت ہوئی تو اُنھوں نے آسانی سے پڑھا اور میرے مزید تعجب کا باعث ہوتے ہوئے کہا کہ "میں عینک نہیں استعمال کرتا۔")

الغرض سر سے قدم تک ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈال کر میں نے مرزا کا یہ مختصر جائزہ لیا اور سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گیا۔ میرے دوست نے جو مرزا سے پہلے ہی میرا تذکرہ کر چکے تھے۔ دوبارہ یاد دہانی کے لیے رسم تعارف ادا کی، اور مجھے یونیورسٹی کا طالب العلم بتایا تو مرزا مجھ سے یوں گویا ہوئے "آپکے دادا صاحب مرحوم میرے ساتھ الیف اے میں پڑھتے تھے۔ مجھے خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ لکھنؤ کے جاگیرداروں کی اولاد ابھی طلب علم سے بے بہرہ نہیں"۔ پھر مجھے وہ حقہ جسکی سے نئے نوازی فرما رہے تھے، پیش کیا میں نے اُن کے ہاتھوں کی ساخت پر غور کرتے ہوئے انکار کیا۔ اُن کے کف دست کی جلد کچھ زیادہ سُرخ تھی اور شکستہ، جس سے کسی مرض کا دھوکا تھا مگر بعد میں مجھ کو معلوم ہوا کہ اسکا باعث صرف کبرسنی تھا۔

---

[1] موصوف مرتے دم تک افیون کا استعمال کرتے رہے۔

میں نے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا " ایک مدت سے حضور کی زیارت کا اشتیاق تھا۔ آج یہ آرزو پوری ہوئی۔ آیندہ زمانے میں یہ بھی میرے لیے فخر کا باعث ہوگا کہ ایسی باکمال ہستی کا دیدار حاصل کیے ہوئے ہوں "
فرمانے لگے " مجھ میں تو کوئی ہنر نہیں ہے۔ یہ آپکی محبت ہے جو آپ ایسا کہتے ہیں .... کسی شاعر کا یہ مصرعہ مجھے بہت پسند ہے " بے کمالی میں بھی افسوس میں کامل نہ ہوا "

میں نے کہا " اس علم و فضل پر یہ عجز و فروتنی۔ یہ بھی آپ کا ایک بڑا کمال ہے "
مسکرا کر چُپ ہو رہے۔

بیخود صاحب موہانی بھی میرے ساتھ تھے۔ انکی فرمائش سے مرزا نے اپنا کلام سنانا شروع کیا۔

" تو ہی لے درد مرے دل کی دوا ہو جانا   دیکھنے آئے ہیں وہ اور رسوا ہو جانا "

سامعین کی تعریف پر کچھ ہوں ہاں نہیں کی۔ نہ کسی قسم کی خوشدلی کا اظہار کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہم لوگوں کی ستائش اُن کے مرتبے سے چھوٹی پڑ رہی ہے اور وہ اُس سے کوئی اثر نہیں لیتے۔

تین چار شعر اور اسی طرح میں پڑھے پھر خاموش ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد بیخود صاحب سے کہا " یہ بہت زمانے کی باتیں ہیں اب یاد کہاں " اُنھوں نے کہا کہ " شاید جب آپ حیدرآباد تشریف لیے گئے شعر نہیں کہا ؟ " فرمانے لگے " اس کو اعتقاد سمجھو یا جو کچھ سمجھو لکھنؤ کے علاوہ کہیں شعر کہا ہی نہیں جاتا " بیخود صاحب بولے " گزشتہ کلام کا بھی کہیں پتہ نہیں " فرمایا " ہاں وہ ایک صاحب لے گئے تھے کچھ خود اپنے تصرف میں لائے کچھ ضائع کر بیٹھے " ہم لوگوں نے اُس رہزن ادب کی جسارت پر تعجب کیا تو ہنسکر کہنے لگے " جی ہاں ! دیکھئے تو ! اور خود ہی آکر مجھ سے یہ بھی کہا کہ میں نے آپ کا کلام اپنا کہکر لوگوں کو سُنایا اُنھوں نے یاد ہی نہیں کیا " جب ہم لوگوں نے پوچھا کہ اس پر آپنے کیا فرمایا تو وہ مجسمہ صدق و ضبط بولا " میں نے کہا کہ آپ نے میرے حال پر عنایت ہی کیوں کی اور کیا کہتا ؟ " بیخود صاحب نے کہا " کاش آپ کا کلام اُنھیں کے نام سے شایع ہو جاتا کہ صفحۂ زمانہ پر اس طرح یہ نادر نقوش باقی تو رہ جاتے "

حیدرآباد کے مشاغل کا تذکرہ ہونے لگا تو میں نے پوچھا۔

" یونیورسٹی میں کیا خاص خدمت جناب کو تفویض ہوئی ہے ؟ "

فرمایا " میں دارالترجمہ (   ) میں فلسفے کے شعبے کا ایک رکن ہوں۔ آپ کو تعجب ہوگا۔ یہ سُن کر کہ میں نے حیدرآباد میں لکھنؤ سے الگ رہ کر اپنے کو زیادہ

نمایاں نہیں کرنا چاہا۔"

الفت رہی وطن کی محبت کہ غیر جگہ عزت و توقیر حاصل کرنا بھی گوارا نہیں!

میں نے اُس عنایت کا لحاظ رکھتے ہوئے جو کارکنان یونیورسٹی کے دل میں اس ضعیف و معمر شخص کی طرف سے پیدا ہونا متوقع تھی دریافت کیا "کیا آپ صرف تراجم کی تصحیح فرماتے ہیں؟

ارشاد ہوا کہ "میں خود ترجمے کرتا ہوں"

اللہ اللہ! یہ سن - یہ افیون کی کثرت استعمال - اور قوائے ذہنی کی مستعدی دیکھیے کہ فلسفہ ایسے ٹھوس اور دقیق علم کے مسائل کا مختلف زبانوں سے اُردو میں منتقل کرنا۔ پھر زبان کی بے مائگی پر نظر کیجیے اور اُس کاوش کا اندازہ لگائیے جو وضع اصطلاحات اور شرح نکات و دقائق علمیہ میں کرنا ہوتی ہوگی میں نے اپنی حیرت پر غالب آکر پوچھا۔

"اب تو جناب کی پنشن کا زمانہ قریب ہوگا؟"

فرمایا "ہاں یوں بھی میں حیدرآباد سے عاجز آگیا ہوں اور وہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں۔"

وجہ دریافت کرنے کی جرأت کسی نے نہیں کی -

اب گفتگو نے زمانۂ حال کے ذوق سخن اور رسائل و ناول وغیرہ کا رخ اختیار کیا۔ "ادب" کا خاص نمبر رکھا ہوا تھا کسی نے کہا کہ "اس میں آپ کا کچھ کلام چھپا ہے"۔ چونک پڑے - جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز مل جائے فرمایا کہ "سناؤ"۔ ہم لوگوں نے رسالہ پیش کر دیا - خود ہی شعر پڑھنا شروع کیے - سب تعریف کر رہے تھے - مگر وہ بے خبر کسی دوسرے عالم میں تھے - پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر آئے -

"خوش ہیں کیوں دھوم سے اجابُ اٹھا کر میت مرنے والے کا بھی آخر کوئی ارمان نکلا"

تو چہرے پر ایک رنگ دوڑ گیا - پیشانی کی رگیں ذرا نمایاں ہوئیں - آنکھوں میں چمک آگئی اور لہجے میں جوش پیدا ہو گیا - کئی دفعہ اسی عالم میں یہ شعر پڑھا اور مزے لیا کیے - معلوم ہوتا تھا کہ کچھ دیر کے لئے جوان ہو گئے ہیں اور وہ جذبات عود کر آئے ہیں جن کے ماتحت کبھی یہ شعر کہا تھا -

کچھ دیر یہ وارفتگی قائم رہی پھر وہی بیدلی پلٹ آئی - بقیہ کلام روکھے پن سے پڑھا اور کہا "کچھ میرا ہے کچھ میرا نہیں - خیر جو کچھ زمانہ تک پہنچ سکا ہے یہ ہے - ایک غزل کے مقطع پر ختم کیا -

خاموش ہو کے مرزا اُن کا کلام سُنیے جن کی عنایتیں اب اُردو زبان پر ہیں

اور ہنس کر کہا "خاموش ہو کے ! یہ شرط ہے"۔

تھوڑی دیر بعد میں نے ایک اور سوال کیا

"کیا یہ صحیح ہے کہ اپنی ناول "شریف زادہ" میں جناب نے ہیرو کے کیرکٹر میں اپنا کردار پیش کیا ہے؟"۔

جواب دیا "تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ ایسا ہی کیا ہے۔ میری تینوں ناولیں "شریف زادہ" "ذات شریف" اور "امراؤجان" آپس میں ایک قسم کا اندرونی تعلق رکھتی ہیں۔ ذات شریف کا کردار مجھ سے ذرا بلند تر، اور شریف زادہ کا ذرا پست تر ہے۔ امراؤجان کے یہاں میں نے چند وہ باتیں ڈال دی ہیں جو اپنے سے منسوب کرتے شرم آتی تھی۔

میں نے عرض کیا "یہ بھی سنا گیا ہے کہ جناب نے یہ ناولیں نہایت ہی بے توجہی سے لکھی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ بولتے جاتے تھے اور پبلیشر بیٹھا تحریر میں ضبط کرتا جاتا تھا۔ کئی کئی دن کے وقفے کے بعد وہ آتا اور جہاں سے پہلی دفعہ سلسلہ منقطع کیا تھا وہاں کا پتہ دیتا۔ آپ پھر اسی تسلسل کے ساتھ بولنا شروع کر دیتے۔ مسکرا کر فرمایا کہ "آپنے جو کچھ سنا ہے سچ ہے"۔ اُسی دماغ کی رسائی کا کیا ٹھکانا۔ جس نے بے پروائی میں وہ ناولیں لکھدیں جو آج اُردو زبان کی شاہکار خیال کی جاتی ہیں!

پھر بیخود صاحب نے اپنی کتاب "گنجینۂ تحقیق" میں سے وہ مقام نکال کر دکھایا جہاں اُنھوں نے غالب کے شعروں کا فارسی اساتذہ کے اشعار سے تقابل کیا ہے۔ خاموش پڑھتے رہے۔ کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ بیدل کا ایک شعر پڑھ کر کہا۔

"صاحب یہ بیدل بھی غضب کا کہنے والا تھا۔ عوام کے بس کا تو وہ ہے ہی نہیں۔ خواص میں بھی جو مذاق سخن رکھتے ہیں اُسکی باریکیوں تک پہونچ سکتے ہیں"۔

بیخود صاحب نے کتاب نذر دی اور اُس پر کچھ لکھنے کی خواہش ظاہر کی جسکا وعدہ کر لیا گیا۔ اُنھوں نے مزید استدعا کی۔ "میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ حضور اس پر جو کچھ لکھیں اسکو دیکھ کر لکھیں۔ یہ کچھ اختیار ہے جہاں سے چاہیں تھوڑا سا ملاحظہ کر لیں"۔ اور کتاب کے مضامین کی ایک قلمی مشرح فہرست بیخود صاحب نے کتاب میں رکھدی۔

مرزا بولے "آپ اطمینان رکھیے۔ میں ساری کتاب پڑھونگا۔ بغیر پڑھے کسی کتاب پر کچھ کیونکر لکھا جا سکتا ہے"

مجھ کو زمانہ حال کے میدان رسائل کے عام طرز ریویو نگاری کا خیال آکر ہنسی آگئی۔

مینہ جو اس عرصے میں بڑے زور شور کے ساتھ برس رہا تھا اور جس نے ہم لوگوں کو توقع سے زیادہ طول ملاقات کا موقع دیا تھا اب موقوف ہو گیا تھا۔ خود صاحب اور اُن کے ساتھ ہی میں اُٹھا اجازت چاہی گئی۔ جو گردن کے اشارے سے ادا ہوئی۔ اور ہم آداب رخصتی بجا لا کر اُس تنگ کمرے سے جس کو ایک ٹرنک کہنا زیادہ موزوں ہو گا باہر نکل آئے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ علم و فضل کی ایک دنیا سے الگ ہو گئے ہیں اور واقعاً اُس مختصر سے کمرے کو اُس عالم متبحر نے اپنے وجود ذی جود سے ایک دنیائے علم میں تبدیل کر دیا تھا۔

یہ تھی وہ پہلی اور آخری ملاقات جو مجھے رُسوا سے نصیب ہوئی۔ موصوف سے ملنے کے بعد میں نے خدا معلوم کس جذبے کے زیر اثر اپنا انٹرویو قلمبند کر لیا تھا۔ ہائے کیا معلوم تھا کہ جلد ہی یہ طائر قدس اپنے عارضی آشیانے کو خیرباد کہہ دیگا اور اُسکی صورت کا صرف ایک دُھندلا سا نقش میرے دل پر باقی رہ جائیگا۔ اُسکی وہ گھڑی کی نغمہ سنجیاں میرے کانوں میں اُسی طرح گونجا کرینگی جیسے کوئی تیز رو پرندہ رات کے سناٹے میں سر پر سے گذر جائے اور اُسکی صدائے پرواز تھوڑی دیر تک سامعے میں قائم رہے۔

میں روداد ملاقات تحریر میں ضبط کر رہا تھا اور نہیں جانتا تھا کہ یہ باتیں جلد ہی یاد رفتگان میں شامل ہو جائینگی اور موصوف کے انتقال کے بعد اُن میں ایک خاص وقعت آ جائیگی کہ اُن کا منظر عام پر لانا ضروری ہو جائے۔

حصہ نمبر
حصہ نمبر ۱۱

قاضی جی

(جناب حکیم سید محمد کاظم صاحب موہانی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

قاضی صاحب کے پہونچنے پر ناچ گانا شروع ہوتا ہے

محفل جمی ہوئی تھی۔ ارباب نشاط میں دہقانی رقاصہ مع سفردائیوں کے حاضر تھی ساز مل رہا تھا۔ بس نوشاہ کے آنے کا انتظار تھا۔ قاضی صاحب پہنچے۔ رقص مع ہزت شروع ہوا۔ اُدھر ساز کی ٹھنا ہٹ۔ اِدھر رقاصہ کی دہقانیت۔ اور باوصف کھنگی' اچپلا ہٹ (ایلاپن) نے قاضی صاحب کے لیے سونے پر سُہاگے کا کام دیا۔ حضرت تنا کے یہاں بھی گنگنا ہٹ شروع۔ پہلو پر پہلو بدل رہے ہیں۔ مگر تھم تھم کر۔ رقص ختم۔ ترانہ شروع ہوا۔ قاضی صاحب کی بےچینوں میں ترقی ہوئی۔ اب بیتابیاں بھی تال سُر کے حدود کے باہر ہوتی جاتی ہیں۔ اِدھر ٹھمری کی ابتدا۔ اُدھر قاضی صاحب کی بیقراریوں کی انتہا۔ غزل کی باری آئی۔ اُستاد داغ کی غزل گائی گئی۔ صاف صاف معاملہ بندی حسن و عشق کے کرتوت۔ حسب حال۔ اُس نے جو بتا بتا کے گانا شروع کیا۔ قاضی صاحب پر حالت پر کیف طاری ہو گئی۔ بی شادی لگیں کھیلنے۔ آپے سے باہر۔ کسی کل چین نہیں کسی پہلو قرار نہیں۔ وسعت مسند باوصف قصور جسم کافی نہیں۔ جو لوگ پہلو بہ پہلو جمے ہوئے تھے۔ دو ایک ٹھوکے۔ دو ایک کہنیاں کھا کر مسل سے ہو گئے۔ سب لیٹے لیٹے تڑپتے ہیں۔ قاضی صاحب مسند پر بیٹھے ہی بیٹھے تڑپ رہے ہیں۔ گویا بکر کودتی ہے کبھی ٹھنڈی سانسیں بھرتے ہیں۔ کبھی جھرجھریاں لیتے ہیں

کبھی سینے پر ہاتھ ہے۔ دل مسوس کے رکھے دیتے ہیں۔ بی رقاصہ کہنہ۔ اچپل دہقانی مزدور ہیں۔ پھر بھی جہاندیدہ۔ ہزاروں محفلوں کا رنگ دیکھے ہوئے۔ انھوں نے جو قاضی صاحب کا یہ حال دیکھا۔ بے تکان دہانی مشینگن کھل لگیں قاضی صاحب کی طرف رُخ کرکے ٹھمریوں۔ غزلوں۔ معرفتوں کے گولے پر گولے برسانے۔ قاضی صاحب مست ہوتی رہے تھے۔ بدمست ہوگئے۔

قاضی صاحب کی مقامی طبیب سے دو دو باتیں

ایک مقامی طبیب جو اخلا ہیں تھے۔ پہلو میں حاضر ہیں جب ذرا ہوش آجاتا ہے قاضی صاحب نبض دکھاتے ہیں۔ مکرر اور اگر کہا جا سکتا ہو تو سہ کرر استفسار ہے کہ بھئی میرا کیا حال ہے۔ وہ عرض کرتا ہے کہ حضرت خود کچھ ارشاد فرمائیں تو میں بھی اپنے ملکہ و تفرس کو کام میں لاؤں۔ مگر اس پر بھی قاضی صاحب کا یہی جواب ہوتا ہے کہ تمھیں بتاؤ اور مجھ سے نہ پوچھو کہ کیا حال ہے ؎

ظاہر میں گرچہ بیٹھا لوگوں کے درمیاں ہوں
پر یہ خبر نہیں ہے میں کون ہوں کہاں ہوں

قاضی صاحب کا لباس دامادی آتا ہے

اتنے میں تتّر تتّر۔ جھمّم جھمّم۔ ڈھول ڈھول۔ پوں پوں ہونے لگا۔ معلوم ہوا بَری گئی تھی۔ جس میں میوہ مستاں۔ شکر۔ چھوہارے۔ کھیلیں۔ ہانڈیاں۔ مٹکیاں۔ دُلھن کے چڑھاوے کا جوڑا۔ قاضی صاحب کی طرف سے گیا تھا۔ اب ادھر سے لباس دامادی آیا ہے جس میں پگیا۔ جامہ۔ نیمہ۔ ازار۔ پٹکہ۔ سہرا۔ پاپوش آئی ہے۔ اکبری عہد کے درباریوں کے لباس کی یادگار آج دیہاتی نوشاہوں کی بدولت قائم ہے۔ قاضی صاحب اگرچہ نوشاہ تھے مگر نوشاہیت کے سن سے سال خوردہ حدود باہر علاوہ بریں وہ تو نئی سنیا کی پیداوار تھے۔ نئی حکومت، نیا زمانہ، نئے فیشن، نئی تراش خراش میں پلے بڑھے تھے۔ کوٹ پتلون پہن کر نکاح پڑھانے جاتے تو اپٹوڈیٹ کہلاتے۔ بدلتوں لکھنؤ میں رہے تھے۔ شہریت بھی غالب تھی۔ مگر خدا بھلا کرے سسرال والوں کا وہ دہقانیت کے خوگرفتہ۔ قدامت پرستی کو باعث برکت سمجھ کر باپ دادا کی لکیر کے فقیر اور وضع قدیم کے دلدادہ تھے۔ قاضی صاحب کو شادی کی ضرورت تھی۔ کیا کرتے اسی لباس سے مخلع ہونا لازم ہوا۔

قاضی صاحب جوڑا پہنتے ہیں

یہ عام قاعدہ ہے کہ دُلھن کے گھر سے خیاط آتا ہے۔ اور دولھا کے

جوڑے کی ناپ لے جاتا ہے۔ مگر قاضی صاحب کے یہاں اس میں بھی خصوصیت برتی گئی۔ سسرال والے منت کشی خیاط سے مستغنی رہے۔ اور ماشاءاللہ اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ ایک ہی قبیصے کا بلا واسطہ تھا حضرتنا چالیس برس سے سسرال والوں کی نگاہوں میں پنپے پڑے تھے۔ خانہ ساز لیڈی ٹیلروں (گھریلو عورتوں) نے آجکل کے کپڑے کے کال کو ملحوظ رکھتے ہوئے جامہ۔ نیمہ۔ ازار خیالی ناپ قطع کرکے خانہ دوخت جوڑا آناً فاناً تیار کر دیا۔ قاضی صاحب بھی پہنچے ہوئے تھے۔ انھوں نے چالیس سال پیشتر روز اتھاہ اُئے بن ٹوسے۔ اس کلجگ۔ اور موجودہ گرانی پارچہ کا لحاظ کر لیا تھا۔ اس لیئے حد سے نہ بڑھنا تو شئے دیگر ہے اسکے اندر بھی بڑھنا پسند نہ کیا چنانچہ آج سسرال والوں کے بار خاطر بالکل نہ ہوئے۔

سسرال والوں کے حسن ظن کے قربان جائیے۔ کچے گز بھر لمبان سے کچھ کم میں قاضی صاحب بھاری بھر کم ہو جاتے مگر انھوں نے اس میں بھی دو چار گرہ کی مزید کمی کر دی۔ اب اکبری عہد کا شاندار ملبوس۔ اگر مارڑ وارطیوں کے اُٹنگے لہنگے کی طرح چنٹ دار نہیں تو کافر کُرتی ضرور بن گیا۔ غرض یہ لہنگے نما کافر کُرتی۔ نام نہاد جامہ گھٹنوں کے اوپر اس حسرت میں سر پٹک رہا ہے کہ کبھی کدھار کی قدمبوسی قاضی صاحب سے محروم رہا۔ ازار کچے گز بھر سے کچھ کم بھی ہوتی تو بھی حضرتنا اُس میں تیرے تیرے پھرتے۔ مگر شاید سسرال والوں کو شرعی دولہ زیادہ مرغوب ہے۔ انھوں نے اس مناسبت ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اب ٹخنیں کے اوپر ازار قاضی جی کو متشرع دکھا رہی ہے مُقلدین غازی میاں کی دستار زیب سر ہوئی۔ نیمہ جامہ زیب بر ہوا۔ پٹکہ سے کمر ہمت بی شادی کے لیئے چُست بندھی ازار پہن کر نظارہ حرام سے بچایا۔ خود رسوائی سے بمشکل بال بال بچے۔ اب سہرے کی باری آئی۔ چونکہ سہرا سسرال والوں کی دسترس سے باہر تھا۔ اس لیئے اُس میں تناسب بھی غائب۔ مالی غریب ان رموز مختصر کو کیا سمجھتا۔ سہرا پانچ ہاتھ کا سابق دستور رہا۔ مگر انمل بےجوڑ۔ کچے گز بھر کے قاضی صاحب اپنے سے ڈیڑھ پونے دو گز لمبا سہرا لے کر کیا کریں گے۔ مگر حضرتنا نے مجبوراً زیب سر کیا۔ وہ صرف قدمبوسی نہیں کرتا۔ خاکبوسی بھی کرتا جاتا ہے۔ پاپوش لکھنؤ کے چوک بازار سے خریدی گئی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس خرید میں کسی گھر والے کا پاؤں درمیان نہ تھا۔ ورنہ یہ مبالغہ آمیز کاواک۔ طول وعرض و عمق نہ ہونے پاتا۔ بلکہ کچھ اختصار ہی رہتا۔ کوئی اپنی ضرورتوں سے لکھنؤ جاتا تھا

بخیال ہمسائگی شاید بیگار میں اُسے یہ خدمت انجام دینا پڑی تھی۔ پاپوش کا دم رفتار قاضی مغل دخروج۔ اُس کی سٹر پٹر۔ طفال بے زنگولہ سے مشابہ تھی۔ بہر حال برہنگی پا عارضی طور پر اسی سے رفع ہو گئی۔ قاضی جی اس طرح لباس دامادی سے ملبس ہو کر۔ آٹھوں گانٹھ کمیت پونی۔ یا اکبری عہد کے مختصر منصبدار۔ یا غازی میاں کی ننھی للّی گھوڑی بنے۔ صبح سجا کر مسکیوں کی برقباری فرماتے محفل میں جلوہ افروز ہوئے۔ اور سہرے کی چلمن سے رقاصہ کی نظارہ بازی کرنے لگے۔

برات جاتی ہے برات دُلھن کے گھر جانے کو سجی جانے لگی۔ حالت منتظرہ ہی کیا تھی۔ ناچ موقوف ہوا سفر دائیوں کو میر محفل کا حکم ملا کہ دُلھن کے دروازے حاضر ہوں۔ انھوں نے سلامتی دُعا مُنا کر آلات غنا در بغل کیے۔ اور اپنے بستر پر پہونچکر مع سامان چلنے کی تیاری شروع کر دی۔ آخر سفر دائیوں کی پلٹن رقاصہ کی کمان میں بطور ہراول دولھن کے مکان پر پہلے ہی سے جا ڈٹی۔ برات کی ترتیب میں جو کچھ حاضرات میں تھا باقاعدہ لگا یا گیا۔ سب کچھ تھا صرف ہاتھی گھوڑے اور اونٹ نہ تھے۔ برات کی شان بڑھانے میں مقامی مہتروں کا دور دورہ زیادہ تھا مثلاً قرنا نواز مہتر۔ سب کے آگے دُمٹا ہوا دم ترھی نہیں پھونکتا۔ بلکہ براتیوں کے دلوں سے۔ بعد مرگ صُور اسرافیل کی ہیبت مٹانے میں سرگرمیاں دکھا رہا ہے۔ دفلی نواز دستہ دفلی نوازی میں منہمک ہے اور ارغنوں نواز گروپ مختلف راگوں کو ایک ساتھ ملا کر مجموعہ کیفیت پیدا کرنے میں لگا ہوا ہے۔ تنہا نوازوں کی نفیریاں۔ سامعہ شگاف۔ تاشے کی ترتڑاہٹ۔ دمامے کی گڑ گڑاہٹ۔ ڈھول کلاں کی گمکار اور جھانجھ کی جھنکار سے محشر شادی برپا ہے۔

قاضی صاحب کا اسپ سواری جب برات ترتیب سے کھڑی کر دی گئی۔ تو حضرت نا کے لیے سواری طلب ہوئی۔ لکھنؤ کے دھوبیوں کو جانے دیجیے۔ اُنکا دولھا بیل پر سوار ہوتا ہے۔ اسی طرح مضافات لکھنؤ کے ہندو دھوبیوں کو چھوڑیے وہ اپنے دولھا کو گدھے پر سوار کرتے ہیں۔ ہمارے ہندوستان کے شہروں میں تو نہیں۔ البتہ دیہاتوں میں دہقانی دولھا کاہے گاہے اونٹ پر بھی سوار دیکھے گئے۔ مگر سیر ھی کی ضرورت سے اس محل پر اُسکا ذکر بھی بیکار ہے۔ ہاں زیادہ تر سواری فنس۔ ہاتھی۔ گھوڑے پر ہوتی آئی ہے۔ فنس کی سواری قاضی صاحب کی ہمّت مردانہ نے قبول نہ کی کہ جیتے جی اور پھر دولھا بن کر چار کے کاندھوں پر دُلھن کو بیٹھے جائیں۔ رہا ہاتھی بخت واتفاق سے اختتام شاہی کے بعد سے جس کو ساٹھ برس ہوئیں حضرت لقا کی طرح دو سروں کے لیے بھی گروہ بنواح قصبہ کیا ملیح آباد

میں ہاتھی اور عنقا ہمنام تھے۔ اب باقی بچا کلاں راس گھوڑا وہ بھی دس بیس کوس تک ناپید۔ نہیں تو قاضی صاحب کی پہنچ سے باہر۔ اگر ہوتا بھی تو کیا ہوتا حضرتنا کے لیے جامہ نذارم والا مضمون تھا۔ ویسی ٹانگیں سواری والی کہاں سے لاتے۔ کوئی ٹیڑھی کاٹھ کا ٹٹو قاضی صاحب کے لگ بھگ ہوتا تو البتہ پاکا تھا کیا مضائقہ تھا۔ اس طرح کے سب ہاتھی گھوڑے اونٹ بیل گدھے قاضی صاحب کے لیے بیکار تھے۔

جب بیل گدھے کی بے وقعتی۔ فنس کی ناپسندیدگی۔ اونٹ کی نااہلی۔ ہاتھی کی نایابی۔ کلاں راس گھوڑے کی کمیابی نے نزاکت موقع بڑھائی۔ تب ہر پھر کے قصبہ ہی کے ممکن الحصول سہل الاصول سواریئے پر کاربرآری پر نظر گئی۔ چنانچہ اسی پردۂ شب میں آدمی دوڑائے گئے۔ اور قصبے کے پیشہ وراں سے روزی کے ٹھیکرے۔ گوش تراش آہوان ٹٹوئیاں اور ٹٹوے جولے دے کے شمار میں چند تھے جن میں سے کسی ایک نے بھی اپنی زندگی بھر میں باوجود اس محنت اور بارکشی کے ایک وقت کے دانہ گھاس کے لیے بھی اپنے مالکوں کو زحمت نہ دی تھی۔ اور جو ہمیشہ قصبے کے کسانوں کے وسیع دسترخوان پر ناخواندہ مہمان رہے تھے۔ رات کی تاریکی میں بلا امتیاز تذکیر و تانیث کچھ بعینہ بیگار اور زیادہ حصہ بکرایہ لائے گئے۔ قدرت بھی جسم دیکھ کر جامہ قطع کرتی ہے۔ اب ان میں سے جو ذرا بھی جوڑ بند قد و قامت کے سڈول تھے انتخاب کے لیے ایک ایک کرکے پیش ہونے لگے۔ نوشاہیت مذکر سواری چاہتی ہے۔ ایسی صورت میں دوسری قسم کی سواری توہین کے علاوہ بدشگونی بھی سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ قندیل کی روشنی میں جانچ ہونے لگی اور یکے بعد دیگرے سب جانور نظرانداز ہوتے گئے یہاں تک کہ اس نمائش کے آخر میں ایک کنڈی پونی ساز و براق دیہی سے آراستہ۔ ایک سبزی فروش اہل قری کا ملک جو بعد جائزہ نظر انتخاب میں آنے پر ناز کرتا تو بجا نہ تھا لایا گیا۔ باین صفت موصوف کہ کسی ذی روح نے آج تک نہ اس پر قصد سواری کیا نہ سوار ہوا۔ شاید یہ اعجاز یوں تھا کہ حضرتنا کی یہ سواری اسی کی قسمت میں بدی تھی۔ سرکہ بردوش بجائے زین پوش۔ بورکا ٹاٹ کہنہ میں سرکہ روپوش۔ نحافت کے انداز نقاہت کی ادائیں۔ دل میں طرح طرح کے وسوسے۔ آگا پیچھا کرتا آئندہ حالی کی بے وقت مصیبت کے خیال سے نیم مردہ افسردہ تھا۔ ابھی ابھی ایک دیہی مارکیٹ میں قوت و ہمت سے زیادہ سبزی لاد کر لے جا چکا تھا۔ اور پھر واپس لایا تھا۔ اور چند ہی سکنڈ ہوئے تھے کہ تھان پہ ٹھہر کر ثابت طور سے گھاس پر منہ بھی نہ ڈالا تھا۔ کہ اس بارہ بجے شب والی بارکشی کے لیے سبزی فروش کے لونڈے نے

مزدوری کے حرص۔ انعام کے لالچ سے لگام چڑھا کر جلدی سے ڈھیلا ڈھالا سر کس ہی تو دیا۔ اور کشاں کشاں دروازے سے باہر نکالا۔ مگر گھر سے جتنا ہی دور ہوتا جاتا ہے اُسی قدر پونی مذکور قدم بڑھانے سے نفور۔ لونڈا لگام آگے کو کھینچتا ہے مگر اُسکا اثر خلاف۔ یہ دو چار قدم پیچھے ہی ہٹے کھڑے ہیں۔ نوبت بانیجا رسید کہ ضعف قوت۔ اور کمی ہمت نے حیائے مجسم بنا کر گھڑیوں ایک ایک جگہ پر روکا نہیں گاڑ گاڑ دیا۔ دو ایک گنوار جو اِدھر اُدھر سے برات کا تماشا دیکھنے آئے تھے میاں پونی کے یہ کمزوری کے غمزے نخرے دیکھ کر بے دھڑک ضرب چوبدستی سے باخبر کرنے لگے کہ ابے گدھے اسے شتر غمزوں کا یہ وقت نہیں خر عیسیٰ کی ہمعنانی سے بھاگتا ہے۔ یہ ارجنٹ سواری حضرتنا کی لاڈ نامزدگی ہے۔ لیکن باوصف ان استخواں شکن ضربات وکشاکش لجام کے وہ خود نہیں آیا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح لایا گیا۔ چند بد مذاق براتیوں نے پونی مذکور کا یہ ھیولیٰ دیکھ کر اُسے سودا کے گھوڑے کی نسل کی یادگار سمجھا۔ لاریب نقاہت و نحافت میں یہ اُس کی یادگار نہیں بلکہ اُس کے بزرگوں میں معلوم ہوتا ہے۔ ع

فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی الخ

اس کا بھی حال ہے۔ مگر سودا کے گھوڑے کو یہ قدوقامت کس دن نصیب ہوا تھا اُس پر شیطان نے جنت سے خروج کے وقت سواری لی تھی۔ یہ گھوڑا قاضی صاحب کی سواری کا گھوڑا ہے ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

ہاں خر عیسیٰ کچھ لگا کھاتا۔ اگر گھوڑے گدھے کا فرق نہ ہوتا۔ ہنوز خر باشد نے اُسکی مماثلت سے بچایا۔ قاضی بھی فرد۔ قاضی کا پونی بھی فرد۔ قاضی شادی کر کے جنت ہوتے ہیں۔ ان کے ٹٹوے کا بھی خدا مالک ہے۔ اگر نحافت نے قبل وصال معشوق خدا سے وصل نہ کرا دیا۔ سلسلہ کلام کہاں سے کہاں جا پڑا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ سر کا بجائے زین خیر تھا مگر رکابیں غائب۔ کیا معنی ضرورت ہی نہ تھی۔ جس روز سے خدا نے سواری دینے کے قابل کیا سبزی ترکاری ہی سوار ہوتی رہی۔ اُس کے پیر کہاں ہوتے ہیں۔ گھوڑے کو کیا خبر تھی کہ ایک وقت آئیگا۔ کہ حضرتنا نوازیں گے۔ مگر قاضی صاحب کے لیے رکابوں کی عدم موجودگی ایک آفت عظمیٰ تھی۔ اگر رکابیں ہوتیں۔ تو قاضی صاحب جنب جست کرکے شاید خود کو کسی نہ کسی طرح بالائے سر کا پہونچاتے۔ اب بلا اعانت غیرے معراج پانا مشکل احباب پروانہ وار گرد جمع ہیں۔ قاضی صاحب ہیں کہ اہتمام و انہماک سواری میں مصروف۔ مگر اپنے کو مجبور دو

معذور پاتے ہیں۔ سواری سے معذوری کو رفقا نے بہ تفرس قاضی صاحب کے بشرۂ اقدس سے تاڑا پھر کیا تھا فوراً رفیقان دہی میاں وزیر اور رمضان علی کے ہاتھوں پر چند سکنڈ معلق رہ کر بالائے سرڑ کا جلوہ گر ہوگئے۔ بعد صعود حضرتنا معراج کی تکان۔ مسرت کے ہجوم یا سسرال پہنچکر پیش آمدنی نازک مواقع کے خیال یا بی شادی کی عظمت وجلال کے رعب یا ان سب کے مجموعے کی بدولت حواس عشرہ ظاہری و باطنی کے باڈی گارڈ سے بچھڑ گئے۔ سر سے پا تک ارتعاش ہونے لگا۔ بادصرصر کے جھونکے بید کے درخت میں یہ کیکپی یہ تھرتھراہٹ نہ پیدا کر سکے ہوں گے۔ یہ تنزل رفقا نے دیکھ کر۔ طرفین سے دست و بازو تھامے۔ سبزی فروش کے لونڈے کے ہاتھ میں لگام مستحکم۔ کشاکش میں مصروف مگر قاضی صاحب ہیں کہ باوصف تنگی گرفت بالائے سڑکا جھوم رہے ہیں۔ سڑکا بھی قاضی صاحب کے جھومنے کے ساتھ کھسک کھسک کر وجد کر رہا ہے۔ متوالے کی پگڑی ادھر کھسکی روکی گئی۔ اُدھر جھکی سنبھالی گئی۔ یاران شاطر برابر چونکا رہے ہیں۔ قاضی صاحب ہوشیار۔ حضرتنا سنبھلیے ابھی دُلھن کا مکان دور ہے ابھی سے یہ حال۔ مگر یہاں کسے خبر۔ آپے میں ہوں تو کچھ کہیں۔ بارے سبزی فروش کے لونڈے کی کشاکش لجام سے گھوڑے نے قدم آگے بڑھایا۔ اس ناگہانی حرکت نے قاضی جی کو کسی قدر چونکایا۔ اُس وقت اتنا فرمایا کہ بھائیو میری سواری اور یونی کی رفتار۔ آپ حضرات کی دیکھ بھال۔ رد ک تھام۔ اور خدائی بھروسے کے سپرد ہے اور پھر عالم وجد طاری۔ غرضکہ بایں ہما ہمی عالم سے بے خبر جھومتے جھامتے بالائے سڑکا جلوس دست رفقا پر اعتماد۔ آگے آگے ڈھول دمامہ پیچھے پیچھے قاضی صاحب کا یونی مستانہ اُس کے پیچھے براتیوں کی بھیڑ رواں ہے۔ در عروس تک پہونچے۔ الگوانی کی گئی۔ باعانت دست احبا۔ پھر چند سکنڈ معلق رہ کر ہبوط فرمایا۔ نزول تو ہوا مگر قیام مشکل سڑکے کے عرض نے حضرتنا کی رانوں کی درمیانی وسعت سے سوا پھیلا دُ چاہا۔ جو باوجود قصر پا شادی کی خوشی میں کھینچ تان کر پیدا تو کر لیا گیا تھا اور جب تک سوار رہے ضبط سے کار آزما بھی رہے مگر اترتے ہی اعصاب کے متمددوا ذیت نے وہ بے چینی پیدا کی کہ ٹانگیں قابو سے باہر ہو گئیں لڑکھڑاتے ہوئے پشت بہ زمین رسیدہ ہوا ہی چاہتے تھے کہ ایک دست رفیق قاضی صاحب کی کمر نازک میں حمائل ہو گیا۔ رُکے۔

قاضی صاحب اندر جامے میں — با بدست دگرے دست بدست دگرے جوں توں کر کے ڈیوڑھی تک لائے گئے۔ زنانے میں پہنچتے ہی مردانے نے ساتھ چھوڑا۔ دُلھن کی ماں

ڈیوڑھی پر منتظر کھڑی تھی۔ پہنچتے ہی قاضی صاحب کے مُنّے مُنّے پاؤں دھو کر گھوڑے کے اگلے سموں پر چھڑک رہی ہے۔ چھوہارا دے رہی ہے۔ سالیاں سلجھیں مانجی لیے۔ تولا سیاں پکڑے مرمت پر مستعد ہیں کہ آیندہ سُسرال میں سر شوری و سرہنگی نہ دکھلائیں۔ قاضی صاحب ابھی تک حواس سے دستے سے علیحدہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر بے خبر ہیں ایک سلجھ نے پاؤں سا اندا تھا کہ دوسری نے مانجی گردن میں ڈال کر نٹیا بیل کی طرح قاضی جی کو جوت ہی تو لیا اور لگی گھسیٹنے۔ اُدھر سالیوں نے مرمت جاری کر دی۔ دو ایک کرارے ہاتھ جو پڑے نشۂ بیخودی ہرن ہوا۔ چونکے۔ مانجی میں اُلجھے۔ سند ان میں سندے ہوئے بوکھلاہٹ میں اُچکے پھاندے۔ آخر کو مانجی او رسندان کے اندان بندھان توڑ آزاد ہوئے۔ گریزکی ہڑبڑاہٹ (گھبراہٹ) میں بلا قصد بے ارادہ ڈیوڑھی باہر پہونچ چکے تھے۔ مگر تعب و تکان ضرب سے مضمحل رفتار دوڑ سے۔ ہاتھوں ہاتھ مسند پر لا کر رکھے گئے۔ کچھ دیر مراقبے میں رہے حواس کا باڈی گارڈ یک نوکر تا ہوا ایک ایک کر کے ڈھونڈھتا ڈھونڈھتا بدقت پہونچا۔ اب قاضی صاحب دم راست نیا سنبھل کے تکے پر اعتماد فرمایا اور پھر رقص و سرود کے نظارے میں مگن ہو گئے۔

نکاح کی تیاریاں ہیں۔ مُلّا ہوا شادی کے رجسٹرار۔ سوسائٹی کے سند یافتہ دو سر ملانے والے۔ شرعی جامع المتفرقین آتے ہیں۔ قاضی صاحب دُنیا کی گاڑی کو بھی جوڑی کے ساتھ ملکر گھسیٹنے کو تیار ہو بیٹھے۔ مگر نکاح کی خبر سُنتے ہی لرزہ براندام ہو گئے۔ لوگوں نے استفسار کیا حضرت یہ کیا ہی کیا معنی آپ نے تو سیکڑوں نکاح پڑھ پڑھ کر جوڑیاں نکالی ہیں۔ کیا یہ وفور اہتزاز مسرت ہے یا کچھ اور خیال بندھا۔ جواب ملتا ہے۔ کہ دُنیا کی گاڑی قبر تک گھسیٹنا ضروری۔ اور گاڑی کا بلا جوڑی منزل تک پہنچنا دشوار۔ اسی لیے یہ لڑائی شادی خانہ آبادی کا ہے۔ ورنہ پیش بینی دوراندیشی نزاکت معاملہ اور اپنی حالت اس کی متقاضی کب ہے۔ آپ دیکھتے نہیں جملہ احشائے شکم میں اسہال سے کھلبلی مچی ہے۔ خطرۂ صدور ریح خوف نشاط بول و براز ہے۔ بار سے کیکپی پر ٹل جائے تو غنیمت سمجھئے۔

اتنے میں قاضی صاحب پہنچے۔ (ہمارے قاضی جی نہیں) کشتی چھوہارے شکر کی آئی۔ مہر طے پایا۔ ایجاب و قبول ہوا صیغہ جاری کیا گیا۔ قاضی صاحب فوراً دُنیا کی گاڑی کے ایک طرف کے جوے میں سر و گردن بڑھا کر نٹیا بیل کی طرح بلا تامل جُٹ ہی تو گئے۔ اب انشاء اللہ ٹھک ٹھک کے گھٹنے ٹیک ٹیک کر زور لگائیں گے۔ یہاں تک کہ اس گاڑی کو آخری منزل تک پہونچائیں۔

غرض نکاح ختم ہوا۔ چھوہاروں کے ساتھ چہار طرف سے مبارک سلامت کی بوچھار ہوئی۔ ڈوم میراثی "ہمیشہ دلبر سجان" والی مبارکباد الاپنے لگے۔

رسم جلوہ کیلئے اندر جاتے ہیں

مبارک سلامت ختم ہوئی تھی کہ رسم جلوہ و آرسی مصحف کے لیے قاضی صاحب کی طلبی اندر ہوئی۔ ایک لڑکے نے ہاتھ پکڑ کر تھام کر قاضی صاحب کو دلھن کے پلنگ تک پہنچایا۔ اب قاضی صاحب منھ پر رومال دیئے نیچی نگاہیں کیے۔ دلھن کے سامنے پلنگ پر منھ جوڑ تشریف فرما ہیں۔ پلنگ کے اردگرد تمام برادری کی عورتیں صرف آج کے دن کے لیے پردے کی حلّت و حرمت کو بالائے طاق رکھ کر چہار جانب سے چھاپے پڑی ہیں۔۔ رسم شروع کی گئی۔ ڈومنیاں گاتی جاتی ہیں اور ٹونوں کی تعلیم جاری ہے۔ اب قاضی جی میراثنوں کے بتائے ہوئے ٹونے ہر ہر عضو جسم سے بلا عذر لگا رہے ہیں۔ یہاں تک کہ "ڈولی کے ساتھ چلوں گا یا پونٹیں ہاتھ میں لوں گا" والا ٹونہ بھی بطیب خاطر منظور ہو چکا ہے۔ سِل بٹّے پر دست حنا سے سہاگ پڑے کے رگڑنے گھسنے میں منہمک ہیں۔ سورۂ اخلاص کی دم کردہ پھلوں کی مار دلھن دولھا دونوں دست مشاطہ سے کھا رہے ہیں۔ محبّت و اُلفت میں اتنا ہی اضافہ بھی ہوتا جا رہا ہے۔ نگ بھینی کی رسم میں ایکیس(۲۱) بیڑے اور دو تین منٹ میں قاضی صاحب کے کھانے مشکل تھا مگر قاضی صاحب روشن ضمیر پہلے ہی سے پان خوری میں مشتاق تھے۔ دوسرے عمل پوزنہ بھی کرتے جاتے ہیں۔ اب دونوں رُخسار کلّے کی حد سے گذر کر نان پاؤ ہو رہے ہیں۔ اتنے میں نباتین یعنی شکر چٹائی شروع ہوئی۔ شکر رومال میں رکھ کے مشاطہ نے دلھن کے گھٹنوں پر رکھی۔ قاضی صاحب کی خوش غذائی۔ طعام تلاش ظاہر۔ پھر شکر کی حلاوتیں۔ گویا منھ مانگی مراد ملی گھٹنوں تک بیٹھے ہی بیٹھے منھ بڑھا کر کارروائی ختم کی۔ اب کاندھوں کی باری آئی۔ قاضی صاحب قصر قد کی بدولت کچھ ابھرے اترے اُچکے کسی نہ کسی طرح بدقت منھ بڑھا کر فارغ ہوئے کہ شکر سر پر پہنچی۔ اس مرتبہ بھی قاضی صاحب بیٹھے ہی بیٹھے۔ وہی اُچکنے ابھرنے کی تدبیر بر کار نہ ہوئے۔ پھر پھرائے۔ پھر ٹھیرائے۔ تھرتھرائے۔ آخر سے تولے مگر بیکار۔ ان کارروائیوں کام چلتے نہ دیکھ کر پوزنہ کا قیام۔ اور سر ساندے کی اِسنادگی۔ دونوں گھٹنوں کے بل پر بہ تاکر حلیم دولھا کا سا شگفت زبان مشاطہ سے وصول کر کے شکر چاٹتے ہی تو گئے۔

یوں تو سب ہی رسوم قاضی صاحب کے لیے جانفزا تھیں۔ مگر دل آرسی مصحف کا زیادہ مشتاق تھا۔

قرآن شریف مع رحل لایا گیا۔ اُس پر ایک آئنہ قاضی صاحب کے "قلب سے صاف رکھا گیا۔ ایک دوپٹہ دُولھا دُلھن کے سروں پر تانا گیا۔ مشاطہ آرسی مصحف کرانے کو تیار ہو بیٹھی۔ دُلھن کے چہرے سے نقاب سرکایا ایک ساتھ دونوں کو آئنہ دیکھنے کی ہدایت ہوئی پھر مشاطہ دُلھن سے آنکھیں کھولنے کی فرمائش کر رہی ہے۔ قاضی صاحب پہلے ہی سے چیاں ریز آنکھیں جتنی پھیل سکتی ہیں اُس سے زیادہ پھاڑ چکے ہیں۔ دُلھن کے چہرے سے مشاطہ کے پنجہ آہنی کے زدروں میں جتنی انگلیاں کھسکتی جاتی ہیں اُتنی ہی جلد جلد بذوق و شوق تمام قاضی صاحب دامن نظر میں حسن عروس کو لپیٹے جاتے ہیں۔ مگر یہ نظارہ خرمن ہوش و حواس پر بجلیاں گرا رہا ہے۔ تھوڑی دیر بعد یہ نظر فریب کرشمہ بحکم مشاطہ ڈراپ سین کیا گیا۔ قاضی صاحب بھون چکے مبہوت ششدر حیران رہ گئے۔

اب سلام کرائی شروع ہوتی ہے۔ ایک بی بی نے قاضی صاحب کے دونوں ننھے ننھے ہاتھ جوڑ کر پھیلائے اُس پر رومال رکھا۔ قاضی صاحب کو کھڑا کیا۔ بی بیوں نے حسب لیاقت یا بحساب بقایائے قرضۂ حسنہ روپیہ دینا شروع کیا۔ قاضی صاحب روپیہ لیتے جاتے ہیں اور پیسے کے بندر بنے ہوئے چوطرفہ جھک جھک کر سلام کرتے بی بندگی کو پکارتے جاتے ہیں۔ اور مرکز ہی پر گھوم رہے ہیں۔ یہاں تک کہ قاضی صاحب کے ہاتھ دو ہتھے ہی کیا ردیوں سے بھر گئے۔ اور سلام کرائی ختم ہوئی۔ عورتوں نے چہار طرف سے نہارا دیکر ڈیوڑھی تک پہونچایا۔ وہاں سے رفقا مسند تک لائے۔ قاضی صاحب شوہن ٹیک مسند نہ ہونے پائے تھے کہ دُلھن والوں کی طرف سے کندوری کا تقاضا ہوا

کندوری کا کھانا نام یہاں کیا دیر کیا تامل۔ دسترخوان بچھنے لگا۔ چپ و راست سب رفقا۔ سامنے بھائی برادری یوں نشست قرار پائی یہ سب برادری والوں کے کھاتے ہیں سامنے ایک ایک حصہ۔ قاضی صاحب کے سامنے سات کھانے چنے گئے۔ دودھ لیدے پراٹھوں کے اضافوں کے ساتھ۔ اس میں کچھ تو نوشاہیت کی ترجیح کا حصہ سمجھئے اور زیادہ تر قاضی صاحب کی سیر خوری کے جذب صادق کا کرشمہ مانیے۔ ہاتھ دھلائے گئے۔ بعد فراغ دست شوئی "بسم اللہ" ہوئی اُدھر قاضی صاحب نے بمقتضائے عادت طعام تلاشی و بہ سبب موجودگی اغذیہ لطیف و نفیس، بارتفاع تکلف و حیائے نوشاہیت و بطلب صحیح و شہوت صادق معدی۔ دست و دہان کی برقی مشین کو فل سٹیم چھوڑ دیا۔ دھکا بیل تو چل میں آیا ہونے لگا چند ہی لمحے میں من کل قلیل و کثیر صفا چٹ۔

غالباً نوعروسی کی حیا نے آس پاس والوں کے حصوں کو دست درازوں سے بچایا۔ ظروف خالی ہیں۔ حسرتیں تمنائیں ارمان پلاؤ زردے تورمے قلیے کی باقی رہ گئیں۔ کھانا قاضی صاحب کو جہاں پہونچانا تھا بحسن پہونچایا یہ نکلے گا کیونکر۔ اس کو قاضی صاحب کے آلات نفا من جانیں لوگوں نے جب کہا حضرتنا اگرچہ یہ چند لقمہ ہائے تر آپ کی عمر دعیادی زنبیل کی وسعت کے آگے کیا حقیقت رکھتے ہیں۔ مگر آج شب میں مخصوص بیداری کا خیال البتہ ہے۔ یکان سہر کہیں غذائے لطیف کو خمار فرحی نہ بنا دے، تو جواب میں سوائے چند بار ڈکار لینے کے کچھ نہ کہا گیا!

(باقی آئندہ)

ارشادات

سید الشعراء جناب شاد عظیم آبادی - مرحوم

اے آہ یوں نکل کہ کسی کو خبر نہو
روئے کو خوب رو مگر اے چشم تر نہو

بچوں کا کھیل سمجھیں ہم اپنی حیات کو
جینا ہے مرکے پھر یہ تسلی اگر نہو

حسرت اگر تڑپنے کی بسمل رہے رہے
شرمندۂ نگاہ تماشا مگر نہو

منزل رساں نقوش قدم ہیں ہزار ہا۔
تو خود تو چل کھڑا ہو نہو راہبر نہو

دامن الجھ گیا تو چھڑانا ہے درد سر
تو چن ادھر کے پھول کہ کانٹا جدھر نہو

جس جا ہو شام رین بسیرا کرے وہیں
اس کے خوشا بحال کہیں جسکا گھر نہو

مجھکو تو کام یار سے ہے اے شب فراق
میری بلا سے تا بہ قیامت سحر نہو

خط بھیج کر تو اور ہوئے منتشر حواس
ہر راہ رو پہ شک کہ یہی نامہ بر نہو

اے شاد کیا مٹے گا مٹائے سے وہ غریب
جو مدعی علم و کمال و ہنر نہو

مرسلہ:- سید سلطان احمد

"کوئٹہ کے روزے اور عید"

(جناب محمد ارشاد علی صاحب (علیگ) شاہجہاں پوری)

وہ لوگ جو کوئٹے میں عرصہ دراز سے رہتے ہیں یہاں کے موسم کو دغاباز اور ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں۔ چنانچہ میں جب یہاں آیا تو لوگوں نے مجھے نصیحت کی کہ کوئٹہ کے موسم کی وقتی حالت کو بے اعتبار سمجھ کر مجھے کپڑے پہننا چاہیے ورنہ یہاں فوراً نمونیا ہو جاتا ہے۔ جو کچھ میں نے سنا تھا اُسے مشاہدے نے صحیح ثابت کر دیا۔ دن میں اگر بادل نہ ہوں تو گرمی و سردی کا مزہ طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک حاصل ہو سکتا ہے کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سورج اپنی کرنوں کے تیر دہکتی ہوئی آگ کی بھٹی سے نکال کر کوئٹہ والوں کے دل و جگر میں پیوست کر رہا ہے جس کی وجہ سے وہ "گرمی گرمی" چیخ رہے ہیں یا کبھی تند و تیز ہوا چلنے لگتی ہے اور ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ قطب شمالی بالکل قریب ہی ہے جس سے بلکہ یہ ہوا چل رہی ہے۔ ہوا کا ہر جھونکا انسان کو بید کی طرح لرزاں کر دیتا ہے اور وہ بدحواس ہو کر "سردی سردی" کہتا ہوا اپنے گھر کی جانب بھاگتا ہے اور وہاں پہنچ کر آگ کے پاس بیٹھتا ہے یا ایک چھوٹی انگیٹھی کپڑوں کے اوپر سے اپنے گلے میں ڈال لیتا ہے!

کوئٹے میں اگر ایک ہفتہ سردی رہے گی تو دوسرے ہفتے میں گرمی ضرور ہوگی۔ زیادہ گرم موسم کے بعد زیادہ سرد موسم کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ موسم گرما یا برسات میں زیادہ ابر تو دکھائی دیتے ہیں اور نہ لوگ ان کی توقع رکھتے ہیں۔ البتہ موسم سرما میں بادلوں کا انتظار اُسی طرح کیا جاتا ہے جس ہمارے یہاں برسات میں۔ یہ بادل یا تو برف گراتے ہیں یا مینھ برساتے ہیں۔ اس سے یہاں کی نباتات کو زندگی نصیب ہوتی ہے اور اسی سے کوئٹہ موسم بہار میں قدرتی لباس و زیور سج کر بہشت کا نمونہ بن جاتا ہے۔

موسم کی بے استقلالی کے بارے میں جو کچھ سنا تھا اُسے عقل نے کوئٹہ کا پہاڑی خطہ دیکھ کر تجربے سے پہلے ہی قبول کر لیا تھا مگر رمضان المبارک جب قریب آیا اور لوگوں نے یہ کہا کہ یہاں کا رمضان عالم بے خبری میں اُس وقت آ دبوچتا ہے جبکہ انسان غفلت کی نیند سوتا رہتا ہے یا بستر پر بیٹھ کے انگڑائیاں لیکر خمار دُور کرتا ہے تو اس بات کا یقین نہ آیا۔ بظاہر یہ ایسی بات ہی نہ تھی جسے

عقل سلیم قبول کرے۔ خیال ہوا جس طرح رمضان شریف کی آمد کے متعلق ہر جگہ کچھ نہ کچھ مزاحاً کہا جاتا ہے یہاں بھی کہتے ہیں۔

شعبان کی ۲۹ر تاریخ کو شب کے دس بجے تک میں شہر اور بازار میں رہا اور صرف اس خیال سے کہ شاید چاند نکلنے کی خبر یہیں سے آجائے۔ بہت دیر کرکے چھاؤنی پر اپنے بنگلے پر واپس آیا یقین ہوگیا تھا کہ آج چاند نہیں ہوا دوسرے دن۔ ساڑھے دس بجے تھا اگر اطمینان سے دھوپ میں ٹہل رہا تھا کہ یکایک میرے ایک دوست آئے اور کہنے لگے۔ یہیں سے خبر آئی ہے چاند ہوگیا' آج سب لوگ روزے سے ہیں! مجھے بڑا اچنبھا ہوا اور ساتھ ہی ساتھ ایک روزہ جانے کا صدمہ! اللہ میاں نے میرے بار غم کو ہلکا کرنے کی خاطر یہ کیا کہ شام کے وقت مجھے ایک روزہ دار کے گھر پہنچا دیا جہاں صاحب خانہ کے اصرار سے مجھے افطار کرنا پڑا۔ اور اس طرح بیٹھے بٹھائے آدھا ثواب مل گیا!۔

روزے گذرے مگر چھاؤنی میں رہ کر۔ شہر میں سحر کو کس طرح جگاتے ہیں۔ اس کے مشاہدے کا لطف نہ ملا۔ اس قدر سن لیا کہ اندھا فقیر ٹین کا پیپا بجا کر "روزہ دار جاگو، روزہ دار جاگو" کہتا پھرتا ہے۔ مگر شنیدہ کے بود مانند دیدہ؟

مسجد میں جاکر قرآن شریف بھی تراویح کے ساتھ نہ سن سکا۔ ۲۷ر رمضان کی شب کو جامع مسجد میں قرآن شریف کا اختتام تھا۔ جی چاہا کہ آج ضرور شریک ہوں۔ کم از کم اتنا تو معلوم ہو جائے کہ قرآن شریف کس طرح ختم کرتے ہیں۔ غرض ملازم کو ہمراہ لیا اور جامع مسجد میں ڈیڑھ گھنٹے پہلے جا پہنچا۔ چند ہی آدمی آئے تھے۔ سب سے اندرونی حصے کی پچھلی صف میں بیٹھ گیا۔ جو آتا تھا وہ اپنے ساتھ ایک کمبل بھی لاتا تھا اور اُس کو بچھا کر بیٹھتا تھا۔ میرے ساتھ کوئی کمبل نہ تھا اور اسکا نہ لانا لاعلمی پر مبنی تھا تھوڑی دیر بعد ایک صاحب نے مجھے بے کمبل کا دیکھ کر اپنے پاس بلا لیا۔

جامع مسجد میں قرآن شریف کے اختتام کا اعلان بہ بانگ دہل شہر میں کیا جاتا ہے اور اس دن کی نماز عشاء کے آغاز و اختتام کا وقت بھی ساتھ ہی ساتھ بتا دیا جاتا ہے۔ نو بجے سے نماز شروع ہونے والی تھی۔ ۸ بجے امام صاحب محراب میں جا نماز پر مقتدیوں کی طرف منہ کرکے بیٹھ گئے۔ میں سمجھا اب نماز شروع ہوگی۔ مگر اُن کے بیٹھنے کے پانچ ہی منٹ بعد ایک شخص مجمع سے اُٹھا اور

امام صاحب تک جا کر واپس آ گیا۔ ایک کے بعد دوسرے نے بھی یہی کیا اور تھوڑی دیر میں تانتا بندھ گیا۔ کہیں کہیں سے آوازیں بھی آنے لگیں گر اسلام کے احکام کا علم کوئٹے کا ہندوستان میں اسلامی فضا پھیلانے کا اولین دریچہ ہوتا، اس کی چہار جانب اسلامی آبادی اور اسلامی خودمختار و غیر خودمختار سلطنتوں کا وجود، یہ ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے دماغ نے کان کو ندا سمجھا۔ مگر میرے تعجب کی انتہا نہ رہی جب میں نے صاف صاف دیکھا کہ یہ سب لوگ امام صاحب کی خدمت میں روپے پیش کر رہے ہیں ایک صاحب ادھر سے اٹھے، دوسرے ادھر سے تیسرے اور جانب سے، غرضکہ جیسے برسات کی رات میں جنگل میں جگنو چاروں طرف سے اڑ اڑ کر چمک دکھاتے ہیں پھر بیٹھ جاتے ہیں۔ اسی طرح ان لوگوں نے چاروں طرف سے امام صاحب کو نقرئی سکوں کی دلفریب چمک دکھانا شروع کی۔ امام صاحب نذر ہاتھ میں لیتے اور زور سے روپیوں کے ڈھیر پر مارتے جس سے وہ کھنکھناہٹ پیدا ہو جاتی جس کی چوٹ دور دور بیٹھنے والوں کی باریک پگڑیوں کو چیرتی ہوئی ان کے کانوں کے پردوں پر پڑتی۔ پندرہ بیس منٹ تک امام صاحب کو خوب گرماگرمی کے ساتھ نذریں پیش ہوتی رہیں اس دوران میں میری آنکھیں تو امام صاحب کی جانب لگی ہوئی تھیں مگر میری باطنی و دور اندیشانہ نگاہیں میرے منی بیگ کی جانچ کر رہی تھیں اور دماغ اس بات کا فیصلہ کرنے میں منہمک تھا کہ اگر یہ نذر ہر ایک کو دینا پڑتی ہے تو یہ خرچ کہاں تک قابل برداشت ہوگا۔ تھوڑی دیر بعد جب آنکھوں نے چاروں طرف دیکھ کر اطمینان کر لیا کہ سب لوگ نذر دینے نہیں گئے تو دماغ کو سکون نصیب ہوا۔

ادھر امام صاحب نے جب دیکھا کہ پروانوں نے پرواز بند کر دی تو نہایت حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ "حکیم صاحب نہیں آئے؟" میں سمجھا کہ حکیم صاحب مسجد کے روزانہ آنے والوں میں ہیں۔ اس لیے نماز شروع کرنے کے لیے ان کا انتظار ہو رہا ہے۔ چند ہی منٹ بعد ایک صاحب لنگڑاتے ہوئے صفوں کو چیر کر اگلی صف میں پہنچ گئے۔ لوگ جھٹ سے بول اٹھے۔ "لیجیے حکیم صاحب آ گئے۔" امام صاحب نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا "ادھر جگہ ہے چلے آئیے۔" حکیم صاحب فوراً ان کے پاس گئے اور نذر پیش کر کے بیٹھے۔ پھر ممبر سے لگ کر مجمع کو یوں مخاطب کیا۔ "بھائیو۔ جو کچھ امام صاحب کو دینا ہے دیدو۔

---

(۱) محمد قاسم اسی کوئٹے سے ہو کر سندھ گیا۔ محمود غزنوی نے اسی طرف سے درہ بلان پار کیا۔ کوئٹے کے چاروں طرف پہاڑیاں ہیں۔ باہر جانے کے لیے پہاڑیوں میں کئی درّے ہیں۔ ایک درّے کا نام بولان ہے۔

بہت ثواب کا کام ہے۔ شاباش، شاباش۔ اُٹھو!" یہ کہہ کر وہ مسکراتے ہوئے بیٹھ گئے۔ اُن کا تبسم پُرمعنی تھا مگر اُس کی تشریح نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ بہرحال سفارش کا اثر ضرور ہوا۔ کچھ پروانے شمع کی طرف بڑھے مگر جلدی ہی اُن کا سلسلہ منقطع ہوگیا۔ امام صاحب نے پھر حکیم صاحب کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ انھوں نے شل سابق کے لوگوں کو پھر چمکایا۔ دو ایک مرتبہ کچھ اثر ہوا۔ بیداری کے آثار نمایاں ہوئے لیکن تابکے حکیم صاحب کی جادو بھری تقریر یا بولنے والی بیٹری لوگوں کو مسحور کرنے یا رگوں میں بجلی کی قوت پیدا کرنے سے جب بالکل مجبور و قاصر پائی گئی تو امام صاحب نے نقرئی انبار کو بغور دیکھا۔ نہ معلوم کیا بات تھی کہ اُس پر نظر کرتے ہی امام صاحب کے بجائے خشک گل تر کی طرح شگفتہ ہوگئے۔ امام صاحب کی قلبی مسرت کا اندازہ کر کے میرے پاس والے صاحب نے اپنی زبان میں آہستہ سے کہا "کچھ آٹا وال ہوگیا"۔

اس کے بعد امام صاحب نماز کے لیے کھڑے ہوگئے۔ نماز ختم ہونے کے بعد تھوڑی سی شیرینی تقسیم ہوئی اور کسی صاحب نے اپنی طرف سے چار بسکٹ حاضرین کو پیش کیے۔

روزہ اور نماز دونوں ختم ہوئے۔ اب عید کا حال سنیئے۔ لوگوں نے دو چار روز پہلے ہی مجھے خبردار کر دیا تھا کہ جیسے رمضان بے خبری میں آتا ہے اُسی طرح بے خبری میں چلا بھی جاتا ہے۔ اگر ۲۹ تاریخ کو وہ خود نہیں جاتا تو یہاں کے پٹھان چاروں طرف سے جمع ہو کر رات بھر اُسے کونے کونے سے نکالتے پھرتے ہیں یہاں تک کہ دوسری صبح کے آٹھ نو بجے تک ضرور کوئٹے سے باہر کر دیتے ہیں۔ میں ۲۹ رمضان کو افطار صوم کے بعد شہر میں گیا۔ رات کے دس بجے تک وہاں رہا۔ پھر بازار سے ہوتا ہوا واپس آیا۔ چاند ہونے کی خبر کہیں سُنائی نہ دی۔ بنگلے پر پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ملازم بھی آگیا۔ اُسنے یہ ضرور کہا کہ تھانے میں بڑا مجمع ہے اور چاروں طرف ٹیلیفون دیا جا رہا ہے مگر کہیں سے چاند ہونے کی اطلاع نہیں مل رہی ہے۔ میں اطمینان سے سویا۔ سحری کے وقت سحری کھائی۔ صبح کو نماز فجر ادا کر کے دفتر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ دفعتہً پھر وہی رمضان کی خبر لانے والے دوست وارد ہوئے اور فرمانے لگے "آج عید ہے۔ چمن سے خبر آئی ہے چاند ہوگیا" اور ایم۔ ٹی (ایک فوجی کمپنی) والوں نے بھی کہا ہے"۔ مجھے حیرت ہوئی "نعوذ باللہ" کہہ کے ملازم کو جگایا اور فوراً سائیکل پر بازار سے صحیح خبر لانے کے لیے بھیجا۔ چند ہی منٹ بعد اُس نے بھی آکر عید کی خبر دی۔ اب یقین ہوا۔ کپڑے بدلے اور دوگانہ ادا کرنے عیدگاہ چلا۔

نماز پڑھنے کے بعد سوچ رہا تھا بقیہ وقت کیونکر گذاروں۔ نو وارد ہونے کی وجہ سے چند ملاقاتی ہیں وہ بھی

نہ ملے تو بالکل تنہائی ہو گی۔ دفعتہً ایک پُرانے دوست نظر آئے۔ میرٹھ کے باشندے اور علیگڈھ کے گریجوئیٹ تھے۔ اس لیے ہم صوبہ ہی نہیں بلکہ بھائی بھی تھے۔ ہم دونوں کو بڑی خوشی ہوئی۔ ملٹیری اکاونٹ آفس میں ملازمت کی بدولت وہ عرصے سے کوئٹے میں رہتے ہیں۔ اس لیے کوئٹے والوں کو بخوبی جانتے ہیں۔ انھیں شعر و شاعری سے بھی دلچسپی ہے اور اس طرح بھی ہر دلعزیز ہونے کا موقع حاصل ہے۔ اُنھوں نے میرے خیالات کو جو تنہائی میں آوارہ پھر رہے تھے ایسا بھانپ لیا کہ ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے: "اب تمھیں کہیں نہ جانے دوں گا۔ میرے ساتھ رہو۔" میں نے موقع کو غنیمت سمجھا اور اُن کے ہمراہ ہو گیا۔

وہ مجھے چند نئی جگہوں پر لے گئے۔ ہر جگہ کمرے میں قالینوں پر صاف صاف چادریں بیچ میں بچھی ہوئی تھیں۔ اُن پر تشتریاں رکھی ہوئی تھیں۔ اُن میں قسم قسم کی مٹھائیاں طرح طرح کے پھل تھے۔ ان کے علاوہ عطر، پان اور سگرٹ بھی موجود تھے۔ جو صاحب آتے اُن کی تواضع کی جاتی۔ یہ اہتمام دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ یوں ہی گشت لگا کر سارا دن کاٹا۔ طبیعت بشاش رہی اور تنہائی بالکل محسوس نہ ہوئی۔

انھیں میرٹھی دوست نے یہاں کے پٹھانوں کے عید کا جشن بھی دکھایا۔ بازار کے ایک نالے میں ایک کثیر مجمع ان لوگوں کا کھڑا ہوا تھا۔ ہر شخص کے ہاتھ میں کوئی سفید چیز تھی جسے لیکر وہ دوسروں سے باتوں میں مشغول تھا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ آج کے روز یہ لوگ انڈے لڑاتے ہیں اور اسمیں سَو سَو روپے تک کی بازی لگاتے ہیں۔ جسکا انڈا پھوٹ جاتا ہے وہ بازی ہار جاتا ہے۔

دوسرے دن چھ سات کوس پر شیخ ماندے کا میلہ ہوتا ہے۔ شیخ ماندے صاحب ایک بزرگ تھے جن کی فاتحہ خوانی کے لیے لوگ عید کے دوسرے دن جمع ہوا کرتے تھے مگر اب وہاں وحشیوں کا مجمع ہوتا ہے۔ دو چار رنڈیاں بھی پہنچ جاتی ہیں اور رانڈوں کا جُوا خوب کھیلا جاتا ہے۔ شام کو سب واپس آجاتے ہیں۔ مجمع کو واپس آتے ہوئے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ہولی کا منظر میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ یہ پٹھان جن میں شرفا و معززین نہیں تھے بلکہ صرف غربا تھے۔ بالوں کی لٹیں کھولے ہوئے سر کو کبھی نیچے نچاتے تھے اور کبھی اوپر اور ان میں کچھ ڈھول پیٹ رہے تھے۔ جس طرح کی حرکتیں مجنون یا شرابی کرتے ہیں ویسی ہی حرکتیں پورے مجمع سے سرزد ہو رہی تھیں۔

عید تو اس طرح ختم ہوئی مگر مجھے بار بار تعجب آتا تھا کہ سال گذشتہ "قبلہ قبلی"[1] والے شہر میں عید کرنا نصیب

---

[1] لکھنؤ۔

ہوئی تھی اور اس سال "توسی"[1] "گل سنتو"[2] "اُس[3] کے نال" "سستے[4] دے پکّے بوٹاں دی ہٹی" والے شہر میں عید کرنا پڑی! اپنے دوست سے اس خیال کا اظہار کیا تو انھوں نے میرے اس تلخ احساس کو زندہ دلی سے بدلنے کے لیے مسکرا کر یہ شعر پڑھا ؎

ایک جا رہتے نہیں عاشقِ بد نام کہیں
دن کہیں رات کہیں صبح کہیں شام کہیں

"نوائے سکوت"

(جناب رگھو نندن پرشاد صاحب مخمور۔ جہاں آبادی ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی)

اب نہ وہ چرچ کے نغموں کی پکار — نہ اذانوں کی صدا گوش گزار
اور نہ گھڑیال کی باقی جھنکار — بربطِ دہر کے خاموش ہیں تار

مضطرب شام سے ہے دل میرا
حال ہے رحم کے قابل میرا

آشیانوں میں ہیں طائر خاموش — مچھلیاں قعر میں سوئیں بے ہوش
اب نہ دریا میں رہا جوش و خروش — موج ساحل سے ہوئی ہم آغوش

اک صدا اچھلے پھر آتی ہے
شب کے دریا میں لہر آتی ہے

ہے کہیں دور ندی کے اُس پار — اپنی بنسی کو لیے موسیقار
مجھ سے کہتا ہے کہ ہو جا تیار — آ نئے نغموں سے بھر دوں میں ستار

طرزِ دل لیکے کہاں جاؤں میں
بھیک نغموں کی کہاں پاؤں میں

۱؎ "آپ" کی جگہ "توسی" بولتے ہیں۔ پہلے پہل لاہور اسٹیشن پر قلی نے مجھ سے اس طرح کہا تو مجھے غصہ آگیا۔
۲؎ بات سنو ۳؎ اُس کے قریب ۴؎ سستے اور مضبوط بوٹوں کی دکان۔

ادبی ارتقا

جناب سید تصویر حسین صاحب نقوی بی۔ اے۔ (لکھنؤ)

دنیا کے نامور ادیب اپنی پیدائش کے ساتھ کچھ خصوصیات لیکر باغ عالم میں قدم رکھتے ہیں اور عمر کے ساتھ ساتھ اُن کا طرزِ خاص بھی ترقی کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ آخر میں درجہ کمال حاصل کرکے وہ اپنی مثال اہل دنیا کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔ اُنکے بنائے ہوئے راستہ پر چلنے کی کوششیں ہوتی ہیں۔ جو روشیں گلشن ادب میں یہ باغبان ڈال جاتے ہیں وہ شاہراہیں بنجاتی ہیں اور ایک عرصہ تک ان نامور ادیبوں کی پیروی کا چرچا رہتا ہے۔ لیکن ایک زمانہ وہ آتا ہے کہ قدیم عمارات میں ترمیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جو چیزیں متقدمین کو پسند تھیں متاخرین ان سے خاص دلچسپی نہیں رکھتے مجدد بننے کے ولولے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اور کچھ ہستیاں ایسی رونما ہوتی ہیں جو فنِ سخن میں جدتیں پیدا کرکے اپنے کلام کو زمانہ کی روش کے مطابق بناتی ہیں۔ شہرت عام کے دربار میں انکی صدائیں بزرگوں کی آوازوں سے جاملتی ہیں اور ایسی گونجتی ہیں کہ بقائے دوام کا شرف انکو بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ مگر میدانِ ادب کی ایک خصوصیت یہ ہی کہ اس میں جس نے اول قدم بڑھایا تاج شاہی اُسی کے سر پر رکھا گیا۔ جو بعد میں آیا وہ پچھتایا۔ اگر بعد جد وجہد کی تو ہزار صعوبتوں کے بعد وزارت کا عہدہ پایا۔ چنانچہ ایران کی شعراء میں فردوسی کا پایہ اس قدر بلند ہے کہ دوسرے شاعر کو وہ اوج نصیب نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ سعدی و حافظ کی مثال بھی دنیا پیش نہیں کر سکتی لیکن خدائے سخن کا

لقب فردوسی ہی کو ملا ہے۔ شیراز کے ان بیش بہا جواہر کی پیدائش سے اس نایاب گوہر کی قیمت میں کوئی فرق نہ آیا۔ اسی طرح انگلستان کی سرزمین جو ناز شکسپیر پر کرتی ہے کسی دوسرے شاعر پر نہیں کرتی اور جس طرح فردوسی کے بعد حافظ نے اپنا سکہ ایران پر جمایا اسی طرح شکسپیر کی آب و تاب کے بعد ملٹن کی چمک نے اہل ملک کی آنکھیں انگلستان میں چکا چوند کردیں۔ اردو شعرا میں بھی میر کا رتبہ کسی نے نہ پایا یہانتک کہ غالب کا دور آیا اور انکا رنگ تمام ملک پر چھایا تاہم میر کو فردوسی اور شکسپیر کی طرح میدانِ سخن میں پہلے گامزن ہونے کا شرف حاصل رہا۔

قابل غور امر یہ ہے کہ نظم میں ایک باکمال پیدا ہونے کے بعد عرصہ دراز تک ترقی کا راستہ بند ہونے کی کیا وجہ ہے۔ علوم و فنون کا عام قاعدہ تو یہ ہے کہ جسقدر زمانہ گزرتا ہے فن بھی ترقی کرتا ہے لیکن نظم مین ایک فردوسی کے بعد کئی صدیاں گزرنے پر حافظ اپنا جام شراب لے کر آتے ہیں۔ جس سے دنیا والے متوالے ہوتے ہیں۔ ان سے قبل مدتوں فردوسی ہی کا ڈنکا بجا رہتا ہے۔ میر کی شیریں بیانی کانوں کو اپنی طرف کچھ ایسا کھینچ لیتی ہے کہ مدتوں بعد غالب کی زمزمہ سنجی اُن پر اپنا اثر کرتی ہے۔ اسکی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ متقدمین کے بنا کردہ اُصول آنے والے اساتذہ کے لئے نقش قدم بن جاتے ہیں فکر شعر کے وقت وہ بطور نمونہ سامنے رکھے جاتے ہیں۔ باہم مناظرہ و تنقید کے وقت وہ مسلم الثبوت اُصول کی حیثیت سے پیش کئے جاتے ہیں اور ان سے باہر ایک قدم رکھنا بھی خلاف قاعدہ خیال کیا جاتا ہے۔ اسی بناء پر تمام اساتذہ اپنی کوششیں بزرگوں کے قائم کردہ اصول کے اندر ہی محدود رکھتے ہیں اور اُن کی ترقی کا زینہ ان بزرگوں کی رفعت پر پہونچ کر ختم ہوجاتا ہے ایک عرصہ تک قوت اختراع کو عمل میں لانیکی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ ہر نئی ترکیب یا بندش کا استعمال ناجائز خیال کیا جاتا ہے۔ پرانی عمارت میں ترمیم کی گنجائش نہ ہونے کے باعث اُس میں ترقی مشکل اور نئی عمارت کی بنا نہ پڑنے کے سبب دوسرا طریقہ رائج ہونا محال ہوجاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدتوں قدیم طریقے جاری رہتے ہیں یہانتک کہ زمانہ اُن کی موافقت چھوڑ دیتا ہے اور دوسرا طرز ظہور میں آتا ہے مگر اُصول تازہ بتانے اور قواعد نو ایجاد کرنے

کیلئے ایسی ہستیاں ضروری ہیں جنمیں اختراع کی قوت ضرورت سے زائد اور طبیعت میں موزونی ہمعصروں سے برتر ہو۔ چنانچہ حافظ۔ ملٹن اور غالب تینوں شعرا اپنا نیا انداز لے کر دنیا والوں کے سامنے آئے اور طرح طرح کے راگ انھوں نے لوگوں کو سنائے ان کے نغمے پیشتر شعراء کے سرود سے جدا تھے ان کی آوازیں متقدمین سے علٰحدہ تھیں۔ انھوں نے نئی بنیادیں ڈالیں۔ اور اگلے محلوں کے مقابل نئے قصر تعمیر کئے جن سے پرانی عمارتوں کی رونق بھی دوبالا ہو گئی۔

مگر نثر کی دنیا ایک نرالی دنیا ہے اس میں ہر پھول نیا رنگ اور ہر غنچہ نئی مہک رکھتا ہو۔ نظم کے گلشن میں جو بھینی خوشبو طبیعت کو فرحت دیتی ہے وہ نثر کے باغ میں نہیں ملتی لیکن اُس کے بجائے نسیم کے خوشگوار جھونکے سیاحوں کے دل شاد کر دیتے ہیں اس میدانمیں اول آنیوالے ہی کی بازی نہیں رہتی بلکہ تجربہ کے ساتھ ساتھ ترقی کا قدم بھی بڑہتا جاتا ہو نثر کی نشو ونما اور ترقی اُصول ارتقا کے ماتحت بتدریج ہوتی ہے۔ یہاں جو آتا ہو اگلوں سے آگے بڑھ جاتا ہے اور پیچھے آنیوالوں کے لئے میدان کو وسعت دیجاتا ہو۔ اڈیسن اور اسٹیل ایک عمارت کی بنیاد ڈالتے ہیں جو ہر نو وارد کے ہاتھوں اونچی ہوتی جاتی ہے حتٰے کہ آرنلڈ اور رسکن اسے منزل اختتام کو پہنچاتے ہیں۔ فضل اور عطا حسین کا لگایا ہوا باغ میرامن اور مرزا رجب علی کی کوششوں سے سینچا جاتا ہو۔ جو نیا آتا ہو ایک ڈول پانی دیجاتا ہو یہانتک کہ شبلی اور آزاد کی سعی سے اسمیں پھول کھلتے اور ثمر نکلتے ہیں۔ وجہ اسکی یہ معلوم ہوتی ہے کہ تمدن کی ترقی کیساتھ تکلفات بھی زیادہ ہوتے ہیں اور معاملات میں پیچیدگی بڑھتی جاتی ہے جن کے بیان کرنیکے لئے زبانمیں سلاست روانی اور کمال کی ضرورت پیدا ہوتی جاتی ہو۔ چنانچہ نثر بھی معاشرت کے قدم بقدم درجہ کمال کیطرف بڑہتی ہو۔ تکلفات جو نظم کی سادگی کو تباہ کرکے ترقی میں مانع ہوتے اور اُسکی خوبصورتی کو مٹادیتے ہیں مشکلات بڑہا کر نثر میں پایہ استقلال پیدا کر دیتے ہیں۔ پھر یہ کہ نثر میں طبع آزمائی کرنیوالے گوناگون خیالات اور طرح طرح کے معاملات اپنے طریقہ پر ادا کرتے ہیں انکے کلام پر بہت کم متنقید ہوتی ہو انکا میدان شاعروں کے دائرہ کیطرح تنگ اور محدود نہیں ہے۔ ان پر اُصول کی پیروی اس پابندی کیساتھ لازم نہیں جسطرح نظم کی قواعد و ضوابط کا مدنظر رکھنا ضروری ہے۔

(خالص اُردو) انوکھی باتیں (خالص اُردو)

(حضرت آرزو)

بناوٹ کو چاہت کے سانچے میں ڈھالا — بڑی چوٹ کھائی، ارے مار ڈالا
اُنھیں کیا پڑی ہے جو تلوار دھوئیں — لہو لال تھا اور دھیا ہی کالا
اُسی کے نہ ملنے سے جی پر بنی ہے — یہ کاہے کو سمجھے مرا بھولا بھالا
اب ایسے شے ہم کہ چھیڑو تو رو دیں — بھلا ہوگا کوئی کلیجے کا چھالا
لگاوٹ کی باتیں، بناوٹ کی گھاتیں — اندھیرے نے پھانسا دکھا کر اُجالا
بھری آتے ہی کس نے چپکے سے سسکی — بدلنے لگا کروٹیں مرنے والا
اُلٹنے جو دیتے ہیں پہلے کہاں تھے — کسی نے نہ گرتے ہوئے کو سنبھالا
جو رو دو تو ہنس دے، جو چپ ہو تو چھیڑے — پڑا ہوگا کاہے کو ایسے سے پالا

جسے آرزو کوئی تاکے نہ پوچھے
مجھے راج گدی ہے وہ مرگ چھالا

نہ سوچا نہ سمجھا، نہ دیکھا نہ بھالا — جیو تم کہ چلا لا جسے مار ڈالا
پڑی آنکھ جس پر لہو منہ سے ڈالا — چھری تھی کہ چتون، پلک تھی کہ بھالا
اس اندھیر نگری میں یہی نہ ڈھونڈو — جو کچھ ہے سو اپنی سمجھ کا اُجالا
کیا کیا ہوا کیا، بنی بات بگڑی — جب آنسو کو روکا اُٹھا ایک چھالا
جو کہتا وہ سنتے، جو سنتے وہ کرتے — مرے بانکپن نے مجھے مار ڈالا
یہ آنکھ اپنی ساون کی، وہ آنکھ بھادوں — ٹپا ٹپ ہے آنسو کی، پانی کا جھالا
نہ جھوٹ اسکو جانو کہ مرنا ہے ہم کو — بدل لی جو کروٹ لیا سب سنبھالا
سنیں اور نہ بولیں، دبیں اور نہ ہمیں — ذرا سی جھجک نے بڑا بوجھ ڈالا!

ہر اک بات ہے آرزو کیا انوکھی
کہے جا کہے جا، ترا بول بالا

غیر مطبوعہ　　نظم

دیدہ وری

جناب جوش ملیح آبادی

ہمنشیں! مشکل سے آئیگا تجھے اسکا یقیں　　دیکھتی ہے ہر نفس کیا کیا نگاہِ دوربیں
اک سکوں سا زلزلوں کے قلب میں مانندِ راز　　خامشی میں ایک مبہم سا سرودِ جاں نواز
تلخیوں میں شہد کی بے رنگ سی اک نرم موج　　پستیوں کے سائے میں دھندلی سی اک تخئیلِ اوج
دیدۂ بے نور میں اک بھولی بھٹکی سی نگاہ　　شب کی تاریکی میں اک کھویا ہوا سا عکسِ ماہ
شیب میں اک بے نشاں سی زرد تنویرِ شباب　　بیوگی میں ایک بے جاں سی عروسی آب و تاب
سینۂ آہن میں اک نادیدہ سی دلکش لچک　　خار و خس میں نبضِ گل کی اک ملائم سی دھمک
ظلمتوں کے دائرے میں ایک ہلکی سی کرن　　جھاڑیوں کی شب میں اک موہوم سا خوابِ چمن

"محرم بسترِ نہانِ روزگارم کردہ اند
تا بجرمِ گوش نہد خلق، خوارم کردہ اند"
(غالب)

"شاعر"

(جناب سید احمد اللہ صاحب قادری ایم۔ آر۔ اے۔ ایس)

گوہر کی طرح آب میں پنہاں ہوں میں — تھمتا ہی نہیں کبھی وہ طوفاں ہوں میں
خورشید کے مانند ہویدا ہوں میں — ہر ذرّے ہر جلوے میں پیدا ہوں میں
فطرت کو مری شام و سحر پا نہ سکے — جبریلؑ امیں میری خبر لا نہ سکے
اک چشم زدن میں عرش پر جاتا ہوں — بجلی کی طرح چمک کر آجاتا ہوں
پروانے کی صورت کبھی جل جاتا ہوں — گہہ موم کے مانند پگھل جاتا ہوں
ہر دل میں مری جگہ نکل آتی ہے — شاعر کی ادا ہر ایک کو بھاتی ہے
ہر ایک حسین مدح مری کرتا ہے — ہر اہل شعور شعر پہ مرتا ہے
میں ہی تو ہوں درد دل بڑھانے والا — رنگ رخ عاشقاں اڑانے والا
رفعت پہ سمندر کو بہانے والا — اک بات کو سو رنگ سے لانے والا
میں وہ ہوں کہ قوم کو جگایا میں نے — کشتی کو کنارے سے لگایا میں نے
میرے وہ صفات ہیں کہ اللہ رے میں — کونین کے ہر راز کو پایا میں نے

ہوں سوز ہی سوز نام کو ساز نہیں
یہ راگ عجیب ہے جس میں آواز نہیں

غزل از ممدوح صدر

شیخ جام و سبو کو کیا جانے — مے کے وہ رنگ و بو کو کیا جانے
ہیں عجب نالہائے مست الست — شیخ اس ہائے ہو کو کیا جانے
خود کو اشکوں سے پاک کرتا ہوں — کوئی میرے وضو کو کیا جانے
ترک ہر آرزو ہو جس کی سرشت — وہ کسی آرزو کو کیا جانے

جو سکوں آشنا ہوئے احمد
لذت جستجو کو کیا جانے

چھٹیوں میں اسکول سے واپسی

(اعظم)

ریل سے اُترا میں سٹیشن پہ آدھی رات کو
جی کڑا کر کے اکیلا ہی چلا دیہات کو

چاندنی چھٹکی ہوئی تھی جنگلوں میں ہر طرف
ہو گیا خود، خوف محویت میں دل سے برطرف

دیکھتا تھا ہر قدم ہمراہ ہے ماہِ منیر
یعنی وہ بچپن کا ساتھی ہمدم روشن ضمیر

لیٹتے تھے کھیل سے جب تھک کے انگنائی میں ہم
اُس سے باتیں کرتے تھے راتوں کی تنہائی میں ہم

آج بھی جنگل کے ویرانے میں ہنگام سفر
ساتھ ہے پہلو بہ پہلو میرے ہر ہر گام پر

ملگئی تھی میرے آنے کی خبر شاید اسے
تا بہ اسٹیشن بھی آ پہنچا تھا لینے کے لیے

سو رہے تھے مرد و زن آبادیوں میں دُور دُور
اپنے اپنے آشیانوں میں تھے پوشیدہ طیور

نوم کی حالت درختوں سے بھی ہوتی تھی عیاں
پھول کی خوشبو تھمی تھی، سرنگوں تھیں پتیاں

تھا اثر میں اس سکونِ عام کے خود آسماں
دیکھتا تھا میں کہ تارے لے رہے ہیں جھپکیاں

جبکہ محوِ خواب ہر اک دیدۂ بیدار تھا
اُس گھڑی اے ماہِ کامل تو مرا غمخوار تھا!

راہ طولانی تھی، چلتے چلتے جب تھکنے لگا
بے بسی میں چاند کی صورت کو میں تکنے لگا

مسکرا کر اُس نے چپکے سے یہ مجھ سے کہہ دیا
"اب ہمت ہار نادان! سامنے ہے گھر ترا"

دل میں پھر طاقت ہوئی محسوس گھر کے نام سے
جھک گیا میں پھر مئے حُبِ وطن کے جام سے

جھنڈ سے نکلا درختوں کے تو وہ آیا نظر
یاد میں جس کی کیے تھے رات دن میں نے بسر

وہ مرا دیہات ہاں ہاں وہ مرا پیارا وطن!
وہ مرے دل کا سکوں، وہ آنکھ کا تارا وطن!

خاک پر جس کی تصدق آسمانوں کی بہار
جس کے ویرانوں پہ صدقے گلستانوں کی بہار

مضطرب دل کو نہیں اس خاک کی بیکار چاہ
ہے یہاں اپنے عزیزوں کی عزیز آرام گاہ

سو رہی ہیں ان بیابانوں میں ایسی ہستیاں — جن کے دم سے تھیں کبھی آباد صد ہا بستیاں
سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں
کاش ہم کو بھی انہی میں ایک دن سونا ملے — آج جو بچھڑے ہوئے ہیں ساتھ پھر اُن کا ملے

غم نہ کر اے دل کہ لکھتا ہوں وطن جانے کا حال — بھول جا، ہاں بھول جا، اس وقت رنج و ملال
چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں سے اب گزر ہونے لگا — جیسے جگنو جھونجھڑ میں، یوں اُن میں مٹی کا دیا
سامنے کھپریل کے کچھ چھوٹے چھوٹے ہیں مکاں — جن میں زمینداروں کے آگے بیل کسے ہیں سائباں
کھیت پہ دن بھر جو محنت کر کے پلٹے شام کو — پاؤں پھیلائے کسانوں نے وہیں آرام کو
خاک پر بستر کسی کا ہے کسی کا کھاٹ پر — ہیں نہ کچھ اندیشے تو سوتے ہیں پڑے کیا بے خبر

ایک خاموشی میں سارا گاؤں ہے کھویا ہوا — جس طرح معصوم فطرت طفل ہو سویا ہوا
تانگے والوں کی پکاریں ہیں نہ موٹر کی صدائیں — شور کرتے ہیں نہ بھونپو اور نہ انجن سائیں سائیں
عقل کو طغیانیٔ جذبات سے نسبت نہیں — سچ تو یہ ہے شہر کو دیہات سے نسبت نہیں
شہر کے کوٹھے نمائش گاہ ہیں انسان کی — شہر کی گلیوں بود و باش ہے شیطان کی
یہ کمیں گاہیں شیاطیں کی نہیں دیہات میں — روز روشن کی تجلی ہے وہاں کی رات میں

سو رہے تھے ہر طرف بل چل کے سب پنچھی شجر — بیل کھونٹوں سے بندھے بیٹھے تھے اور کچھ کھڑے
چاند بھی چپ تھے گویا اُس فضا کو تھا قرار — دفعتاً چلنے لگی کم کم ہوائے خوشگوار
بند دڑبے سے اذاں مرغِ سحر دینے لگے — اپنے بستر پر کسان انگڑائیاں لینے لگے
معتدل گرمی کا موسم اور پھر صبح وطن! — خود بخود ہونے لگی زائل مسافت کی تھکن
سامنے سے خانہ باغ اپنا نظر آنے لگا — جھومتے کیلوں کے جو پتے دل بھی لہرانے لگا
ہر شجر جنبش میں تھا جوشِ طرب میں جا بجا — باغ کے پھولوں کی خوشبو بھی بڑھی بے اختیار
خوب تب سمجھا کہ سارے باغ کا کیا حال ہے — دل کی فرحت نے کہا تیرا یہ استقبال ہے

الغرض میں باغ سے ہوتا ہوا گھر میں گیا — صحن میں دیکھا کھڑی ہے ماں لگائے آسرا
خط سے کر دی تھی جو میں نے اپنے آنے کی خبر — انتظارِ صبح میں سوئی نہ تھی وہ رات بھر
سوچتی تھی اس وقت اسٹیشن سے شاید اب چلے — دفعتاً ڈیوڑھی سے یوں آتا ہوا دیکھا مجھے
مامتا کے جوش سے بے چین سی ہونے لگی — دوڑ کر لپٹا لیا سینے سے اور رونے لگی
گرم اشکوں نے غبارِ رنج دل سے دھو دیا — میں بھی فرطِ شادمانی سے لپٹ کر رو دیا

بے نیازِ رنجِ دوش و فکرِ فردا ہو گیا!
ماں کی آغوشِ محبت میں پہنچ کر کھو گیا!

پانچ شعر

چمن کی ہو خیر یا الٰہی کہ آج بجلی کڑک رہی ہے
گلوں کے منہ تمتما رہے ہیں قفس میں بلبل پھڑک رہی ہے

مآلِ پیشِ نظر ہے غافل نہ ہوگی اس سے تسلیِ دل
تو اس پہ سر رکھ کے سو رہا ہے کہ جس کی چھاتی دھڑک رہی ہے

چمن میں جب سے رہے نہیں گُل، کبھی پھٹکتی نہیں وہ بلبل
بنا کے تنکوں کا آشیانہ، جو مدتوں بے دھڑک رہی ہے

ابھی ابھی چھوٹ کر قفس سے، پناہ گلزار میں جو لی ہے
ادھر اُدھر تک رہی ہے بلبل کہ ڈر سے چھاتی دھڑک رہی ہے

ہوئی تھی رو کر بھڑاس کچھ کم اُٹھی ہے پھر دل میں ہوک اعظمؔ
جسے ابھی تم بجھا چکے تھے وہ آگ پھر سے بھڑک رہی ہے

غزلیات

جناب اثر لکھنوی

نہ دماغ سیرِ چمن مجھے، نہ نسیمِ صبح سے کام ہے
جسے ڈھونڈھتی ہے شمیمِ گل اُسی بُو سے تازہ مشام ہے

وہ نمازِ عشق ہے بوالہوس، تہِ تیغ جسکا مقام ہے
نہ رکوع میں، نہ سجود میں، نہ قعود ہے، نہ قیام ہے

ہمہ تن ہوس کوئی زاہدو، کہ خیال توبہ حرام ہے
درِ میکدہ ہے کھلا ہوا، کفِ مے فروش میں جام ہے

ہوس تعین بندگی، نہیں شانِ اہلِ نیاز کی
کبھی سیرِ دیر و حرم کی ہے، کبھی میکدے میں قیام ہے

کوئی آ ہوا، یہ مِرے کہدے، نہ نکلے گی کبھی آرزو
کہ شکار ہوتے ہیں دل جہاں، وہ بلند اس سے مقام ہے

غمِ ہجر جاں لیے جائے گیا، جو قرار آئے تو آئے کیا
دلِ شوق کشتہ ہے وہ بلا، جسے عینِ وصل پیام ہے

کبھی منزل مہ چار وہ تھا جو دل، وہ کاہش ہجر سے
دمِ صبح اب ہے بجھا ہوا، تو رُندھا ہوا سرِ شام ہے

وہ ہے سرگزشتِ بلا کشاں، کہ ہلے اگر لبِ ناتواں
یہ اشارہ ڈوبتے دل کا ہے کہ ہمیں قصہ تمام ہے

کے کون محوِ جمال سے تجھے جلوے دل میں اسیر ہیں
جسے تو سمجھتا ہے آئینہ، اسی صیدگاہ کا دام ہے

تو ہی آبِ رنگِ بقا سہی، تو ہی نقشبندِ قضا سہی
میں خطا سہی، تو عطا سہی، مری وجہ سے ترا نام ہے

وہ فروغِ گل، وہ بہارِ گل، کہ ہلاکِ شوق ہے عندلیب
مگر آہ عہدِ وفائے گل، کہ ثبات ہے نہ قیام ہے

جو شرابِ پختۂ عشق ہے، وہ تمام تر ہے سرورِ اثر
مجھے ہے شکایتِ دردِ سر، ترے جام میں مئے خام ہے

جناب وقار لکھنوی

اُمید پہ دُنیا قائم ہے، اب دل کو یہی سمجھائیں گے
ملنا جو ہے اُنسے قسمت میں، اک دن کہیں مل جائینگے

یہ دردِ نہ جینے دیگا ہمیں، کبتک یونہی سب جھٹلائیں گے
ہنس ہنس کے جو سمجھاتے ہیں ابھی، رو رو کے وہی پچھتائینگے

پھر سینے سے اک شعلہ سا اُٹھا، دل پھکنے لگا، دم گھٹنے لگا
اے ضبط ہمیں دل لینے دے، پانی جو تھا جل جائینگے

ہچکی جو یہ آئی ہے ہیہم، کچھ اور سبب ہے اے ہمدم
کیا جھوٹی تسلی دیتا ہے، ہم اور اُنھیں یاد آئینگے

تصویر خیالی کا کھنچنا، تقدیر کا اک چکر نکلا
ملنے میں گلے معلوم نہ تھا یوں خاک پہ ہم گر جائینگے

ہے رنگِ وقار آسان مگر جب تک نہ محبت ہو تو
دل ہی میں نہ ہوگا درد اگر، جذبات کہاں سے لائینگے

جناب نشتر سندیلوی

جوشِ جلوہ کثرتِ نظارہ ہے پردا مجھے / دیکھتا ہوں اور دکھائی کچھ نہیں دیتا مجھے
جب تمھیں یہ غور کرتے ہو ہوا دھوکا مجھے / تو نہ پہچانے گا کوئی دیکھنے والا مجھے
جیسے اک مایوس کے بجھتے ہوئے چہرے کا رنگ / یوں نظر آتا ہے روئے منظرِ دنیا مجھے
رازِ دل جتنا چھپایا اتنا ہی افشا ہوا / احتیاطوں نے مری خود کر دیا رسوا مجھے
منزلیں طے ہو رہی ہیں اضطرابِ شوق کی / دل کی ہر کروٹ دکھاتی ہے نئی دنیا مجھے
منظرِ یاس آفریں ہے دہر کی ایک ایک چیز / حسرتوں نے کر دیا آزردۂ دنیا مجھے
اب تحمل اس کرم کا دل سے ہو سکتا نہیں / تم نہ یہ پوچھو کہاں کے درد نے مارا مجھے
عشق ہے اور بدگمانی۔ دل ہے اور بے خیال / آج اس نے کچھ عجب انداز سے دیکھا مجھے
سیرِ نہر باغ سے ہم بے دلوں کو واسطہ! / عکسِ گل بنتا دلِ بیتاب کا دھوکا مجھے
غم کا شعلہ تیز تھا دل جل کے رونے لگا / آہ یہ کس نے نگاہِ گرم سے دیکھا مجھے

نشتر اب نوبت یہ پہنچی ہے محبت کے نثار
نقشِ حیرت بن گیا ہر دیکھنے والا مجھے

جناب احسان ازباندہ

صورت دکھا کے کون یہ روپوش ہو گیا / بیخود ہوا کوئی۔ کوئی مدہوش ہو گیا
اظہارِ درد کر نہ سکا تیرا ناتواں / دل کی جگہ بتاتے ہی بیہوش ہو گیا
پھونکی وہ روحِ تازہ تری چھیڑ چھاڑ نے / پیدا ہر ایک دل میں نیا جوش ہو گیا
گل کر کے وہ چراغِ لحد ہنس کے کہہ گئے / تم یہ نہ جانا میں فراموش ہو گیا
مقتولِ تیغِ ناز کا خوں رنگ لائیگا / سمجھے تو تم کہ اب یہ سبکدوش ہو گیا
ایسے کرشمے جذبِ تصور کا کھیل ہیں / جلوہ فگن کوئی کوئی ہمدوش ہو گیا
تیرا ادا تھا آہ کا کیا پُرسکوں جواب / کوئی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا

جب دے سکا نہ شکوے کا احسان کے جواب
اک بار مسکرا کے ہم آغوش ہو گیا

جناب مولانا سید اختر علی صاحب اختر تلہری مولوی فاضل منشی فاضل

نام ظاہر نہ ہوا تھا مرے افسانے سے — راز سربستہ کھلا آپ کے شرمانے سے
کچھ خبر بھی ہے ادھر حال سنانے والے — نیند آئی کہ اُڑی اس ترے افسانے سے
مدعا جبکہ ہے سجدوں کی نمائش خالی — پھر تو مطلب ہے نہ کعبے سے نہ بتخانے سے
بزم ماتم میں نظر آتا ہے رنگ عشرت — کس کی امید بر آئی مرے مرجانے سے
اپنے جذبے میں نہ بول اٹھے تجھے کی کوئی بات — دیکھیے چھیڑ مناسب نہیں دیوانے سے
جان دینے کو سمجھتے ہیں وصال معشوق — سبق عشق پڑھا ہے ہمیں پروانے سے
حق شکایت کا جسے تھا وہی باقی نہ رہا — کیوں خجل بیٹھے ہو بیمار کے مرجانے سے
نقش آخر ہے جنوں عشق کی بیباکی کا — فاش یہ راز ہوا ہے کسی دیوانے سے

خیر ہے حضرت اختر یہ تبسم کیسا ؟
کس کو دیکھا ہے نکلتے ہوئے میخانے سے !

جناب غلام مجتبیٰ خاں صاحب نہر بی۔ اے۔ ال ال بی

گلو سے تیغ کو مصروف ناز رہنے دے — یونہی یہ صحبت راز و نیاز رہنے دے
سمجھ تھی اتنی تو پہلے ہی سوچ لیتے دل — جنون و ہوش کا اب امتیاز رہنے دے
خبر بھی کچھ ہے دل ناتواں پہ کیا گذری — معاف کر مجھے در لطف و ناز رہنے دے
اسی نگاہ سے پھر دیکھ لے ادھر ظالم — مٹا کے دل کو نہ محروم ناز رہنے دے
ادھر ہو شور قیامت ادھر ہو شور طلب — جنون شوق کو ہنگامہ ساز رہنے دے
مزے مزے کی خلش ہو مزے مزے کی تڑپ — نگاہ رہنے دے اور نیم باز رہنے دے
بلا سے دل ہے تصور کسی کی مژگاں کا — رگ خیال کو نشتر نواز رہنے دے
شراب سوز محبت سے بھر دے ساغر دل — غم جہاں سے مجھے بے نیاز رہنے دے

ہنر نہ اٹھے سر اس در سے سنگ در کی طرح
رہین سجدہ جبین نیاز رہنے دے

"نہیں کہ ہے"؟

حضرت آرزو

میں نے "نہیں" بھی کب کہا گر یہ کہا "نہیں" کہ ہے — پوچھ نہ حال درد دل ہوش بجا نہیں کہ ہے
میں تو نہ کچھ سمجھ سکا جبر کہ اختیار تھا — پوچھنے والے خود بتا میری خطا نہیں کہ ہے
بیٹھے تھے وہ تو چین تھا اُٹھتے ہی اُنکے درد اُٹھا — آئی کہاں سے یہ بلا وہم بھی تھا نہیں کہ ہے
پرسش دل کے بعد بھی حالت دل ہے گومگو — پھیر کے منھ وہ ہنس دیے اور کہا نہیں کہ ہے
ہے بس عرض مدعا طرز سکوت کا گلا — عقدہ یہ حل نہ ہو سکا اُس میں وفا نہیں کہ ہے
یاس سے آس کے اُٹھ گیا خود اُسے ڈھونڈھتا ہوا — شوق تھا یا جنون تھا ہوش رہا نہیں کہ ہے
کھا گئی کس کی بد نظر دل کی نہیں کوئی خبر — ڈھونڈھئے کس اُمید پر یہ بھی پتا نہیں کہ ہے
چارہ گر فراق کی اُف رے کرشمہ سازیاں — کم ہوا داغ بن کے درد پھیلا نہیں کہ ہے
رنگ تو کُٹی وہ ہائے ہائے چوٹ جو پھر اُبھر نہ آئے — آگے جو کچھ خدا دکھائے اب تو پتا نہیں کہ ہے
زخم بھی تیر ناز کا راز وفا سے کم نہ تھا — چھیڑ کے دل دکھا دیا منھ سے کہا نہیں کہ ہے
تشنۂ پرسش نہ خوف تھا ظلم پہ ظلم ڈھائے جا — اتنا بتا دے بے وفا تیرے خدا نہیں کہ ہے
مر کے جو کوئی پھر جئے آرزو اُس سے پوچھئے — دردِ فراقِ یار کی کوئی دوا نہیں کہ ہے

حیرت انگیز اعلان

اپریل سنہ ۱۹۳۲ء میں جو اصحاب ادب کی خریداری منظور فرمائیں گے اُنھیں سالانہ چندہ بجائے چار روپیہ کے تین روپئے دینا ہوگا اس اعلان سے پہلے جو حضرات خریداری میں نام دے چکے ہیں یا میعاد رعایت کے بعد جو لوگ خریدار ہوں گے وہ اس وقتی و اتفاقی رعایت کے مستحق نہیں ہیں۔ — "منیجر"

حصہ نسواں

اسلامی خواتین ہند کے گزشتہ اور موجودہ تمدن و معاشرت پر ایک نظر

(گذشتہ سے پیوستہ)

(محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ منشی)

پردہ دوسرا مسئلہ پردے کے متعلق ہے جس قدر پامال شدہ ہے اسی قدر ہندوستان کے لیے اہم ہے پردہ جو اس وقت ہندوستان میں رائج ہے اسکی دو صورتیں ہیں ایک تو اس قسم کا کہ مستورات ایک مکان میں بند رہیں اور ایک ہی محدود قطعۂ ارض و مخصوص فضا میں از مہد تا لحد بسر کردیں اور اپنے اعزا و اقربا جو دوسرے مقامات پر ہوں ان کے پاس ریل کا سفر بھی کر کے نہ جا سکیں - اور اگر کسی طرح اسکی جسارت کی بھی جائے تو اسٹیشنوں پر جہاں گاڑی تبدیل کرنے کی ضرورت ہو ڈولیوں کا انتظام رکھا جائے اور ریل کے درجہ کے ہر روزن کو اس احتیاط سے بند کیا جائے کہ تار نظر کیا ہوا کا گزر بھی ناممکن ہو جائے اس قسم کے پردے کو میں "پردۂ گور" کہتی ہوں اس لیے کہ یہ حالت ساکنانِ گور سے بہت مشابہت رکھتی ہے لیکن ہندوستان کی معاشرت میں بھی مغربی اثر سے انقلاب ہوتا جاتا ہے اور یہ حالت بہت دنوں تک رہنے والی نہیں - اسلامی متمولین نے تو اس قسم کے پردے کو خیرباد کہہ ہی دیا ہے متوسطین بھی آہستہ آہستہ ان کی تقلید کرتے جاتے ہیں - اس تغیر پذیر حالت کا خاکہ نہایت خوبی سے اکبر الہ آبادی مرحوم نے ذیل کے شعر میں کھینچا ہے - ؎

عوام باندھیں دوہر کو تھرڈ و انٹر میں — سکنڈ و فرسٹ کی ہوں بند کھڑکیاں کب تک

دوسرے قسم کا پردہ یہ ہے کہ اسلامی مستورات برقع یا چادر و نقاب سے اپنے جسم کو چھپا کر اور عوام کی نظروں سے محفوظ ہو کر سفر و دیگر کاروبارِ زندگی کرتی ہیں - پردہ اول الذکر کے متعلق جو

اعتراضات کیے جاتے ہیں ان کا لب لباب یہ ہے کہ اس قسم کا پردہ مستورات کی صحت جسمانی، تعلیم و آزادی میں سخت مخل ہوتا ہے۔ مگر یہ اعتراضات آخرالذکر پردے کے متعلق کسی طور سے نہیں کیے جا سکتے۔ یہ پردہ مغربی بے پردگی اور مشرقی گوشہ پسندی کے درمیان کی چیز ہے اور بمصداق "خیر الامور اوسطها" دونوں انتہائی حالتوں سے بہتر اور اختیار کرنے کے قابل ہے۔

اب دو باتیں قابل غور ہیں ایک تو یہ ہے کہ خود اسلام کے احکام پردے کے متعلق ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو کیا ہیں؟ دوسرے یہ کہ مختلف بلاد اسلامی میں قبل شیوع اسلام و بعد شیوع اسلام کسی قسم کا پردہ تھا یا نہیں اور ہندوستان میں اس نوعیت خاص کا پردہ خواتین اسلام میں کیونکر رائج ہوا؟ شیوع اسلام کے قبل بظاہر عرب و دیگر ممالک میں پردے کی رسم کا پتہ نہیں چلتا رومۃ الکبریٰ جیسی متمدن حکومت میں بھی ذکور و اناث بلا کسی حجاب یا رکاوٹ کے آزادانہ خلا ملا رکھتے ہوئے پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ عرب کے چند قطعات میں بھی جو رومۃ الکبریٰ کے زیر اثر تھے۔ اسی قسم کی آزادی معاشرت پائی جاتی ہے شیوع اسلام کے بعد مغربی اخلاق و آزادی کے روکنے کی غرض سے چند اعتدالی اور حکیمانہ احکام نافذ ہوئے اور خواتین اسلام آزادانہ و بے حجابانہ مردوں سے خلط ملط ہونے کے لیے روک گئیں جیسا کہ آیات قرآنی مندرجۂ ذیل سے بیّن طور سے ظاہر ہوگا۔

ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن او آبائھن او آباء بعولتھن او ابنائھن او ابناء بعولتھن او اخوانھن او بنی اخوانھن او بنی اخواتھن او نسائھن .... لم یظھروا علی عورات النساء ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن (پارۂ اٹھارہ سورۂ نور آیت تیس)

یایھا النبی قل لازواجک و بنتک و نساء المومنین یدنین علیھن من جلابیبھن ذالک ادنیٰ ان یعرفن۔ (پارۂ بائیس سورہ الاحزاب آیت ۵۸)

اسلام نے مستورات کو بلا قید پردہ صرف چند مخصوص اعزا کے سامنے آنے کی اجازت دی ہے جنکو اصطلاحاً محارم شرعی کہتے ہیں جنکی تفصیل مندرجۂ بالا سورۂ نور میں گزر چکی۔ ان صاف اور قطعی احکام کے بعد خواتین اسلام نے مقنعہ و چادر اختیار کر لی اور بغیر اس کے عوام میں جانا معیوب

سمجھا جانے لگا۔ اسکا یہاں تک خیال کیا گیا کہ شرفا و اُمرا کی عورتیں بلا محمل اور عماری کے سفر کرنا معیوب خیال کرنے لگیں۔ المختصر اسوقت سے تمام ممالک اسلامی میں بلا حجاب مستورات کا پبلک میں آنا معیوب ہوگیا۔

ترکوں نے جنمیں ابتک اسکی پابندی رہی ہے اب عورتوں کو بے نقاب ہونے پر مجبور کیا ہے۔ اس سیل مغربیت سے قدامت پسند و مجتہد پرست ایران بھی اب غرق آب ہو چلا ہے۔ میرے ایک محترم بزرگ جو حال ہی میں ایران سے واپس تشریف لائے ہیں فرماتے تھے کہ ایرانی عورتوں نے ایک عجیب طرز کا نقاب اختیار کیا ہے جس سے ابرو سے نیچے کا چہرہ کھلا رہتا ہے اور اوپر ایک قسم کا خوشنما و مختصر سا اوٹ جیسا ہیٹ میں ہوتا ہے رہتا ہے۔ اس "دیدار می نمائی و پرہیز میکنی" کے قسم کا پردہ دیکھ کر اُن کو تحیر ہوا اور اُنھوں نے متعجب ہو کر ایک ایرانی سے اسکے متعلق دریافت کیا تو اُسنے اُس طباعی اور ذہانت کے ساتھ جو کہ ایرانیوں کی خصوصیات میں سے ہے یہ جواب دیا کہ "ایں زنہا از ملائک پردہ میکنند"۔ واقعی اس قسم کی ترکیب پردے کا تو کام نہیں دے سکتی۔ البتہ خوشنمائی میں کچھ اضافہ کر سکتی ہے جیسا کہ ایک زمانے میں مصرین بھی ایک قسم کا جالی دار نقاب سلسلہ استعمال کرتی تھیں۔ عراق و حجاز کی مستورات نے ابھی مقنعہ و چادر کو خیرباد نہیں کہا لیکن اس سیل مغربیت سے انکا بھی محفوظ رہنا مشکل معلوم ہوتا ہے چنانچہ مجھکو اپنی جدّہ ماجدہ سے جو کہ ہجرت فرما کر عرصۂ دراز سے وہاں قیام پذیر ہیں معلوم ہوا کہ عربی و عجمی خواتین نے لباس مغربی کی کورانہ تقلید شروع کر دی ہے۔

ہندوستان میں جو اس نوعیتِ خاص کا پردہ ہے اس کی نظیر سلف سے خلف تک کسی زمانے میں کسی ملک میں نہیں ملتی۔ خود اہل ہنود میں گھونگٹ اور چادر سے کام لیا جاتا تھا جو کم و بیش ابھی رائج ہے۔ فاتح مسلمان جب ہندوستان میں آئے تو کچھ اجنبیت کے خیال سے اور کچھ اپنی عظمت و برتری کے لحاظ سے اپنی بیگمات کو پبلک کے نظارے سے علیٰحدہ قلعوں اور عالیشان محلوں میں رکھنے لگے۔ اس طرح ان کے اُمرا و ارکینِ سلطنت بھی اسکے پابند ہو گئے اور اہل حرم و بیگمات کا پبلک میں جانا ممنوع قرار پا گیا۔ امتداد زمانہ سے اصل وجہ تو غائب ہو گئی اور عوام نے اسکو رسماً شرافت کی نشانی سمجھ کر افراط و مبالغے کے ساتھ اختیار کر لیا یہ خیال کہ عظمت کی وجہ سے عوام سے پردہ کیا جائے صرف طبقۂ اناث ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ طبقۂ ذکور میں بھی پایا جاتا ہے۔ ایسے

افراد کے نام گنائے جا سکتے ہیں جو اپنی عظمت اور بلند ہی تربیت کی وجہ سے عوام کے سامنے آنا اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔ مثلاً سنا گیا ہے کہ فرمانروائے نیپال ہمیشہ اپنے قلعہ میں روپوش رہتے ہیں ان کی رعایا کو مجالِ نظّارہ نہیں ہے۔ یہی طرزِ خاص اک زمانے میں شہریارِ چین کا بھی تھا، اس لیے یہ بات بعید از فہم نہیں ہے کہ علاوہ پابندیِ احکامِ اسلام کے مسلم فاتحین نے اپنی بیگمات کو عظمت و جاہ و جلال کے خیال سے قلعوں اور محلّوں میں نظر بند رکھا۔ تاریخی واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیگماتِ شاہی اپنے مخصوص باغات میں بھی بلا برقع جانا پسند نہ کرتی تھیں۔ چنانچہ جہاں آرا بیگم کے متعلق یہ حکایت مشہور ہے کہ ایک مرتبہ وہ برقع پوش ہو کر باغ میں سیر کی غرض سے گئیں۔ باغ میں پردے کا انتظام کرا دیا گیا تھا مگر اتفاق سے سعیدی شاعر کسی گوشۂ باغ میں رہ گیا جس نے شاہزادی کو دیکھ کر فی البدیہہ یہ شعر پڑھا ؎

برقع بر رخ افگندہ برد ناز بہ باغش تا نکہتِ گل بیختہ آید بہ دماغش

گزشتہ اسلامی مستورات کے اس طرزِ عمل کے برعکس اب اُن خاندان کی عورتیں جن میں متوسل تعلیمِ انگریزی کافی ہے یہ رجحان خیال ہوتا جاتا ہے کہ کسی طرح کا بھی پردہ حماقت کی علامت ہے پردہ ان کے محاسنِ صوری و معنوی کو حجاب میں رکھتا ہے اس لیے ہر شخص سے خواہ وہ عزیز ہو یا دوست ہو یا غیر ہاتھ ملانا، مردانے جلسوں کی ممبر ہونا، عام ڈنروں میں شریک ہونا، غیر ساتر لباس پہننا، فرائض خانہ داری سے بے تعلق ہونا، غرضکہ امریکہ و یورپ کی عورتوں کی اندھی تقلید میں اپنے کو مردوں کے ملکیل کے لیے گڑیا بنا دینا اپنی صنف کے لیے معراجِ کمال سمجھتی ہیں۔ غربیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

ہندوستان ہی پر کیا منحصر ہے خود مستوراتِ عرب بھی جو گہوارۂ اسلام ہے اس قسم کے خیالات و معاشرت اختیار کرتی جاتی ہیں۔ جبکہ صحرائے عرب کی سادہ اور بے تصنّع زندگی بسر کرنے والی عرب خواتین کا انتہائی نصب العین عمدہ موٹریں رکھنا ان کے شوہروں عزیزوں کا وزارت کبینہ (کیبنٹ) کا ممبر ہونا، بیش قیمت جواہرات سے مزیّن ہونا ہے[۱] تو ہندوستان کی خواتین میں جن کی ذہنیت پر کافی اثر پڑ چکا ہے ایسے خیالات کی موجودگی تعجب خیز نہیں ہے۔

قدیم و جدید دونوں خیالات کا خاکہ ایک شاعر نے کس خوبی سے مکالمہ کی صورت میں کھینچا ہے

---

[۱] ملاحظہ ہو سفر از ۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء رپورٹ "ایک اقوام ہمرائے متمدن عراق"

ملاحظہ ہو ۔

کہا ایک بیگم سے لیڈی نے اِک دن — کہ موجودہ تہذیب سے تم ہو عاری
نئی روشنی کا اثر کچھ نہیں ہے — بُرائی ہیں یہ جتنی ہیں باتیں تمھاری
سمجھتی ہو زیور کو زینت کا ساماں — خوشی سے اُٹھاتی ہو یہ بوجھ بھاری
بناوٹ سے تم چاہتی ہو چمکنا — لگاتی ہو کپڑوں پہ گوٹہ کناری

. . . .

یہ سب کام باہر ہیں تہذیب سے اب — نشانِ جہالت ہیں باتیں یہ ساری
سلیقہ نہیں بات کرنے کا تم کو — سرِ بزم کیونکر نہ حاصل ہو خواری
رہا کرتی ہو قید گھر میں ہمیشہ — نہ سیر و سیاحت نہ شوقِ سواری
تمھیں اس سے کیا؟ تم اسیرِ قفس ہو — چلے باغ میں لاکھ بادِ بہاری
مصیبت سے دن کاٹتی ہو جہاں میں — یہ جینا ہے یا نزع کی دم شماری

تمھیں جیتے جی مار رکھا ہے اسنے
پڑے بھاڑ چولھے میں یہ وضعداری

کہا سُن کے بیگم نے اے میم صاحب — بس اب چُپ رہو آتی ہے میری باری
نئی روشنی کے نئے گیت گا لے — بہت تم نے بڑھ بڑھ کے شیخی بگھاری
تماشا تو دیکھو کہ پردہ اُٹھا کر — بنی پھرتی ہے میم میری بچاری
نظر پڑتی ہے غیر لوگوں کی ہر دم — تمھارا یہ چہرہ ہے یا چاندماری
کیا کرتی ہو غیر مردوں سے باتیں — پھٹکتی نہیں پاس تک شرمساری
ہوئی ڈولی اور بند گاڑی سے نفرت — پسند آئی بائیسکل کی سواری
نہیں تم کو سیر و سیاحت سے فرصت — بُری طرح برباد ہے خانہ داری
چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھولا — نہ کام آئی کوّے کو کچھ ہوشیاری
ترقی کرو علم و شائستگی میں — نہ چھوڑو مگر اپنی تم وضعداری
ہمیں زیب دیتی نہیں ریس انکی — حکومت سے پھبتی ہیں باتیں یہ ساری

بہرحال حاصل کلام یہ ہے کہ وہ اعتدالی پردہ جس کے متعلق صریح احکام موجود ہیں ترک کردینا نہ صرف اُن نتائج کا خود کو شکار بنانا ہے جو آئے دن امریکہ وہ یورپ میں نظر آتے ہیں بلکہ اسلام سے روگردانی کرنا ہے۔ برعکس اسکے اس اعتدالی پردے کو اختیار کرنے میں صحت، عزت، علم ہر چیز کے حصول میں آسانی ہے۔

لباس | ہندوستان میں لباس کی بہت سی قسمیں رائج ہیں، جس کو جو لباس پسند ہوا اُسنے اُسی کو شرف قبولیت بخشا۔ زمانۂ رواں میں لباس کے متعلق بھی اہل یورپ کی تتبع ہو رہی ہے، حیا فروش لباس اختیار کیے جانے کی کوشش ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ متمدن ممالک کی تقلید کرنی چاہیئے مگر اندھی تقلید نہیں کہ حیا شرم سب اس پر قربان کردی جائے۔ تقلید کیجیئے اور ضرور کیجیئے مگر جو بات قابل قبول ہو جس کو ملک برداشت کرسکے اور جس کے اختیار کرنے میں ملک اور قوم کی بہتری اور خوشحالی مضمر ہو اسکو اختیار کیجیئے اچھی باتوں کو اختیار کیجیئے بُری کو چھوڑ دیجیئے۔ ظاہر ہے کہ جب مغربی لباس اختیار کیا جائیگا تو دیگر متعلقہ لوازمات کی بھی ضرورت ہوگی۔ ہر وقت اعلیٰ قسم کے کپڑے پہننے کی خواہش ہوگی پھر ان کے ساتھ خاص مغربی ممالک کے بنے ہوئے بیش قیمت جوتے بھی درکار ہوں گے اور سپید باریک موزے بھی لازمی قرار دیے جائیں گے۔ ان کے علاوہ عارضی آرائش و زیبائش پر بھی روپیے پانی کی طرح صرف ہوں گے جسکو یہ فلاکت زدہ مفلس ملک کسی طرح برداشت نہیں کرسکتا۔

علاوہ بریں لباس جسمانی صحت اور ملکی آب و ہوا کا خیال کرکے موسم کے موافق استعمال کرنا چاہیئے ٹھنڈے ملک کے کپڑے گرم ملک میں کیونکر پہنے جاسکتے ہیں۔ حکم خداوندی ہے کہ لباس ساتر ہو۔ لباس مغربی بالکل اس کے خلاف ہے۔ آستین اسمیں ہوتی ہی نہیں۔ گلا کافی سے زیادہ کھلا ہوا ہوتا ہے۔ دامن ساق پوشی نہیں کرتا۔ بلکہ بغاوت کرکے گھٹنوں ہی تک رہ جاتا ہے۔ پھر موزے اسقدر باریک ہوتے ہیں کہ جلد دکھائی دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لباس ساتر نہیں ہوسکتا۔ مجھے اکثر ایسی خواتین سے ملاقات کرنے کا شرف حاصل ہوا ہے جو مغربی فیشن کے دیو کو حُسن کی دیوی سمجھکر اسکی پرستاری کرتی ہیں۔ اسمیں سے ایک صاحبہ نے فرمایا کہ اب یہ بڑی مشکل ہوئی کہ سودیشی ہنگامے کی وجہ سے فیشن ایبل کپڑے نہیں ملتے۔ سادہ مزاج انسان ان کے اس تردد کی وجہ بغیر غور کیے نہیں سمجھ سکتا ہے یہ کہ ایسی عورتیں اپنے جہل کو فیشن ایبل لباس سے چھپانا چاہتی ہیں

ممالک خارجہ خاصکر برطانیہ کے بُنے اور سِلے ہوئے کپڑے پہنکر سوسائٹی میں جانے سے وہ روشن خیال و تعلیم یافتہ کہی جاتی ہیں اور اُن کی جہالت کا پردہ فاش نہیں ہوتا جو ایسی نہیں ہیں وہ ان عورتوں میں ہیں جو مغربی فیشن پرستی ہی کو معراج ترقی سمجھتی ہیں لیکن یہ وضعدار فیشن ایبل خواتین اس کو قطعی نظر انداز کردیتی ہیں کہ اس انتہائی مغرب پرستی سے سوا نقصان کے نہ انکا نہ ملک کا کوئی فائدہ ہوگا - - .

ایران میں بھی یہاں کی طرح یہ وبا جاری ہوچلی ہے۔ مگر وہاں کی فہیم اور وطن پرست خواتین نے ذاتی نمائش و زیبائش کو ملکی مفاد پر بخوشی قربان کردیا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں شہزادی ایران نے ایک جلسہ اپنی شاہی والدہ کی صدارت میں منعقد کیا تھا جسمیں منجملہ دیگر قرار دادوں کے ایک قرار داد یہ بھی تھی کہ "ملک کی اقتصادی حالت کو درست کرنے اور خواتین کی اصلاح کے لیے یہ عہد کیا جائے کہ آیندہ فرانسیسی و دیگر ممالک خارجہ کی اشیائے آرائش مثلاً لیس، کپڑے، پاوڈر، کریم، سنٹ وغیرہ وغیرہ نہ خریدی جائیں اور نہ استعمال کی جائیں اور اس اسراف بیجا کے روکنے سے جو بچت ہو وہ مدرسہ نسواں و دیگر مفید اداروں کے قائم کرنے میں صرف کی جائے"۔ چنانچہ ایسی ہی رقوم سے چند ایسے اداروں کا افتتاح کیا گیا ہے جنمیں علوم حفظان صحت اور ابتدائی یا فوری مدد (FIRST AID) کی تعلیم دی جائے۔

مغربی تقلید کا ایک اثر بیشک اچھا نمایاں ہورہا ہے وہ یہ کہ ہندی اسلامی خواتین جنھوں نے نہ صرف اپنے اصلی لباس کی سادگی ترک کردی تھی بلکہ یہاں کے رسم و رواج کے مطابق قیمتی زیورات سے اپنے کو مزین کر رکھا تھا۔ اب یہ رنگینیاں رفتہ رفتہ کم کرتی جاتی ہیں اور اعزا کو گراں قیمت زیورات کی بیجا اور ناقابل برداشت فرمائشوں سے نجات ملتی جاتی ہے۔ خدا کرے کہ شادی بیاہ کے موقعوں پر بھی یہ بیکار رسم اگر بالکل ہی ترک نہ ہوجائے تو اعتدال کی حد میں آجائے۔

رسم و رواج | ہماری اسلامی بہنوں نے ہندوستان میں طول قیام کی وجہ سے تقریبات کے سلسلے میں بہت سے رواج و رسوم ایسے اختیار کرلیے ہیں جو نہ صرف منشائے شریعت اور سادہ طرز زندگی کے خلاف ہیں بلکہ حد درجہ تباہ کن بھی ہیں۔ اکثر رسمیں وہم پرستی پر بھی مبنی ہیں جو اسلام کے صاف اور سیدھے اصول کے قطعی خلاف ہیں۔ بجائے اس کے کہ اس موضوع پر کوئی بسیط

مضمون لکھوں اپنے جد مرحوم (پدر مادر) جناب خان بہادر سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی کی قابل قدر اور غالباً اپنی صنف کی پہلی کتاب صورۃ الخیال کے ملاحظے کی طرف ناظرین کو توجہ دلاتی ہوں امید کی جاتی ہے کہ ان تباہ کن رسوم سے کے ترک کرنے کے متعلق مغربیت کا مفید اثر پڑے گا۔

حقوق نسواں

اسلام نے صنف نسواں کو جس قدر حقوق عطا کیے ہیں کبھی کسی زمانے میں کسی مذہب نے نہ دیے تھے۔ مساوات کے سدا بہار پھول اسلام ہی کے کھلائے ہوئے ہیں اسکی تاریخ شاہد ہے کہ طلوع اسلام سے قبل عورت خلقت خداوندی کا بدترین جزو سمجھی جاتی تھی۔ رومۃ الکبریٰ میں عورتیں قتل کی گئیں۔ روم میں سولی سے عزت افزائی کی گئی۔ یورپ جو کہ زمانۂ موجودہ میں متمدن ترقی یافتہ ملکوں میں سب سے افضل ہے سیکڑوں عورتوں کو سحر کے الزام میں نذر آتش کر چکا ہے۔ عرب میں معصوم بے گناہ لڑکیوں کو عالم وجود میں آنے کے ساتھ ہی زندہ دفن کر دیتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ تمام زنان عالم اس شعر کی مصداق تھیں ؎

ہو رہے تھے ظلم ہفت افلاک کے
امتحاں تھے ایک مشت خاک کے

آخر صنف اناث پر انتہائی ظلم ہوتے دیکھ کر دریائے رحمت جوش زن ہوا اور ارحم الراحمین نے اپنی رحمت کے کامل نمونے کو انسانی پیکر میں جلوہ نما فرمایا جبکہ تمام فضائے عالم پر ظلم و جور کے بادل چھائے ہوئے تھے جہالت کی آندھی چل رہی تھی یہ آفتاب رسالتؐ افق عرب پر جلوہ افروز ہو کر نور پاشی کرنے لگا۔ اس پرجور زمانے میں جس نے صنف نسواں کے ناقابل برداشت مظالم کا سدباب کیا، جس نے مساوات کا خیال فرمایا، جس نے ہماری حالت زار پر اپنے پاک آنسو گرائے جس نے اپنی گوہر افشاں زبان سے ہماری تعریف کر کے ذرّے کو آفتاب پیتل کو سونا کر دیا۔ وہ مبارک اور پاک ہستی ہمارے پیارے رسولؐ کی تھی جس کو دنیا تاجدار مدینہ کے لقب سے موسوم کرتی ہے۔ آپ نے اس وقت جبکہ دنیا صنف نسواں کو خاک کا ایک حقیر ذرہ سمجھ کر نہایت بے رحمی سے پیروں سے کچل رہی تھی یکساں اور مساوی حقوق عنایت فرما کر برابر کی صف میں جگہ دی آپ کا قول ہے کہ "عورتوں کی عزت وہ کرتے ہیں جو شریف اور نیک دل ہیں توہین وہ کرتے ہیں جو ظالم اور کور باطن ہیں" قرآن شریف میں مساوات حقوق کے متعلق متعدد آیات ہیں۔ ایک جگہ فرمایا ہے کہ ولھن مثل الذی علیھن

بالمعروف، وللرجال علیھن درجۃ (پارہ ۲ سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۰)

ازدواج، طلاق وخلع کے معاملات میں جس قدر مساوات کا خیال کیا گیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ جابر اور اسلام کے عطا کردہ حقوق نہایت بیدردی کے ساتھ غصب کیے عورتوں کو اس نعمت سے بالکل محروم کردیا گیا ہے۔ انھیں اب صرف ایک متاع بے بہا سمجھا جاتا ہے۔ خدا مسلمانوں کو چشم حق بین عنایت کرکے انصاف کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

لیکن زمانہ حاضرہ میں جہاں اور خیالات ہیں ایک خیال یہ بھی ہے کہ یورپ اور امریکہ میں جو آزادی وحسب دلخواہ عورتوں کو حاصل ہے اس سے اسلامی خواتین محروم ہیں اس سے بہرہ مند ہونے کے لیے نہ صرف نقاب کو بالائے طاق رکھ دینا چاہیے۔ بلکہ ان تمام حرکات وسکنات و افعال کی تقلید کی جائے جو امریکن یا یورپین مستورات کرتی ہیں۔ ہر ذی ہوش کو اس خیال سے قطعاً اختلاف ہوتا ہے۔ یہ آزادی جادۂ اعتدال سے بڑھ گئی ہے۔ اس کے جو نتائج ہوئے ہیں اس کے اظہار سے میں اپنے قلم کو آلودہ کرنا نہیں چاہتی۔ اسکا ایک نتیجہ یہ ہے کہ وہاں بجائے اس کے کہ عورتیں اپنی خلقت کے لحاظ سے مردوں کی اعانت کی خواہاں ہوں اور مناسب موقعوں پر ان کی تبعیت کریں اُلٹے مردوں ہی کے اوپر حکمرانی کرتی ہیں۔ وہاں قضیہ بالکل برعکس ہے یعنی "النساء قوامون علی الرجال" کے مصداق ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری اسلامی بہنیں اس کے خلاف ہوں گی اور اس کو ہرگز روا نہ رکھینگی۔ والسلام

رفیق تنہائی

انتظار

محترمہ کنیز فاطمہ حیا رحمان (لکھنؤ)

دل کا سکوں بدل گیا حالتِ اضطرار سے — پرسشِ غم کرے تو کون آکے نحیف زار سے
جان تپنگ آگئی اس دلِ بیقرار سے — اٹھنے لگے ہیں شعلے اب دیدۂ اشکبار سے
دل کا سکوں بدل گیا حالتِ اضطرار سے
جانِ حزیں ہے آنکھوں میں اب ترے انتظار سے

اب تو بہار آگئی اور خزاں بھی جا چکی — ہو گیا سال نو شروع تازہ بہار آچکی
میرے نصیب کی بدی خوب مجھے ستا چکی — کیا ترا یہ خیال ہے جان بھی میری جا چکی
پرسشِ غم کرے تو کون آکے نحیف زار سے
جانِ حزیں ہے آنکھوں میں اب ترے انتظار سے

دہر کا ہے وہی شباب اور ہے ویسی ہی بہار — ہے شفق آسمان پر اور زمیں پہ سبزہ زار
دشت کی ہے وہی فضا باغ کا ہے وہی نکھار — مجھ میں ہوا نہ کوئی فرق جان و جگر سبھی ہیں نزار
جان تپنگ آگئی اس دلِ بیقرار سے
جانِ حزیں ہے آنکھوں میں اب ترے انتظار سے

ہیں وہ اگرچہ بے نیاز اور انہیں ہے اسی پہ ناز — نقشِ قدم ہی گر ملیں سجدوں میں ہیں سرِ نیاز
اشکوں سے خونِ دل بہا پھر بھی ہے دل میں آز — اُف ترے انتظار میں آنکھیں ہیں دونوں نیم باز
اٹھنے لگے ہیں شعلے اب دیدۂ اشکبار سے
جانِ حزیں ہے آنکھوں میں اب ترے انتظار سے

حسن و شباب کا طفیل دل کو بنا دے پھر ارم — صدقہ ادا و ناز کا ہو کہیں مائل کرم
پھر وہی چشمِ التفات دور ہوں جس سے سب الم — ہم ہوں خوشی سے ہمکنار پاس نہ آئے کوئی غم
دامنِ صبر چھٹ گیا اُف دلِ بیقرار سے
جانِ حزیں ہے آنکھوں میں اے حیا انتظار سے

[redacted]

کیا ہے؟

محترمہ ملک سلطانہ رعنا جواد (لکھنؤ)

کس کو دیکھا ہے اجڑا کیا ہے — آخر اے دل تجھے ہوا کیا ہے
میرے مالک بجز فریب خیال — تیری دنیا میں اب دھرا کیا ہے
دل میں لیتا ہے چٹکیاں کوئی — ہائے اس درد کی دوا کیا ہے
اس کے عہد شباب میں جینا!! — جینے والو! تمہیں ہوا کیا ہے
گر نہیں یہ جنون عشق کا نام! — پھر جوانی سے مدعا کیا ہے
حوریں نیکوں میں بٹ چکی ہونگی — باغ رضواں میں اب رہا کیا ہے
دل نے پہلے پہل جو کی اک آہ — عشق بولا ابھی ہوا کیا ہے
اب دعا کر دوا کا وقت کہاں — تیرے بیمار میں رہا کیا ہے
یاد آتا ہے بمبئی رعنا — چلو ہو آئیں تو برا کیا ہے

"صبح بہار"

مسز نور جہاں صاحبہ ناز (بمبئی)

نوید بیخودی ہے کہ بہار آئی گلستاں میں — نظر آنے لگے پھر چاک وحشی کے گریباں میں
سکون روح کیونکر ہو میسر عمر انساں میں — مسرت کی کلی کھلتی نہیں صحرائے جہاں میں
نہ پوچھ اے ہمنشیں اس خواب کی دنیا میں رہتی ہوں — زلیخا پھرتی ہے آوارہ میرے یوسفستاں میں
گلستان جہاں روشن ہے یکسر جلوۂ گل سے — سیاہی حسن بنکر جا چھپی گیسوئے جاناں میں
محبت او محبت! آ کہیں پردے میں پنہاں ہے؟ — کہ تیری جستجو لائی ہے ہم کو بزم امکاں میں
نظر آتے ہیں جلوے چرخ پر صبح بہاری کے! — گل خورشید کی ہے روشنی مہر درخشاں میں
جہان عشق میں ممنون سوز و ساز حسرت ہوں — اثر پیدا کیا جس نے نواہائے پریشاں میں
زلیخا کو عبث ہے ناز اپنے خواب رنگیں پر — ہزاروں مصر روشن ہیں مرے خواب پریشاں میں
میں اپنے شعر کے پردے میں ناز اس طرح پنہاں ہوں — نہاں ہو بوئے نکہت جس طرح گلہائے خنداں میں

نقد و تبصرہ

نظام اردو: مصنفہ حضرت آرزو لکھنوی۔ قیمت مع محصول ڈاک عہ، پتہ: منیجر ادب لکھنؤ۔

ایک ایسی کتاب کی سخت ضرورت تھی جس میں اردو زبان کے قواعد و ضوابط اس طرح پر قلمبند ہوں جن کے مطالعے کے بعد اردو کی صحیح حیثیت سمجھ میں آجائے اور وہ طالب علم جو اس زبان کا نبض شناس بننا چاہتا ہے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب یہ ضرورت رفع ہو گئی۔ حضرت آرزو کی یہ تصنیف آپ کو دوسری بہت سی مفید باتوں کے علاوہ

(۱) اردو کے اجزائے حقیقی و غیر حقیقی کا فرق۔

(۲) اردو میں ہندی لفظوں کی سداور فارسی و عربی کی حد۔

(۳) لفظوں کے غلط و صحیح کا فرق اور فصیح و غیر فصیح کا امتیاز۔

(۴) ترکیب ہندی، ترکیب فارسی کے جائز و ناجائز محل۔

(۵) محاورے اور روزمرے کا فرق۔

(۶) مترادفات کا استعمال سمجھائے گی

دیباچوں کے علاوہ جناب سید مسعود حسن صاحب رضوی ایم۔ اے صدر شعبہ فارسی و اردو لکھنؤ یونیورسٹی کے لکھے ہوئے نہایت بصیرت افروز حواشی بھی ہیں۔ غرضکہ یہ کتاب اردو لٹریچر میں نہایت گرانقدر اضافہ ہے۔ ناظرین ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

کتابت و طباعت پاکیزہ ہے متعدد نوٹ بھی شامل ہیں۔

نصاب اردو: مؤلفہ جناب سید علی عباس صاحب حسینی۔ ایم۔ اے۔ ایل۔ ٹی قیمت ۱۴ر

پتہ:۔ جعفری برادرس، الہ آباد۔

ہمارے پاس جعفری برادرس الہ آباد نے یہ کتاب ریویو کے لیے بھیجی ہے۔ یہ مجموعہ نثر و نظم ہائی اسکول کے نویں اور دسویں درجے کے لیے جناب ناصری مرحوم کی تالیف نصاب جدید کی جگہ پر کام آنے کے خیال سے مرتب کیا گیا ہے اس میں حسب ذیل خوبیاں پائی جاتی ہیں:۔

(۱) مضامین کے انتخاب میں یہ خاص طور سے ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اُن کے لکھنے والے دورِ جدید کے معتبر و مستند ادیب ہوں۔ کورس کی دوسری کتاب قدیم انشا پردازی کے نمونے کی حامل ہے۔ اس لیے اس میں یہ اہتمام نہایت مناسب ہے۔

(۲) اس کا کوئی مضمون ان درجوں کے اوسط طالب علموں کی قابلیت سے کم یا زیادہ نہیں ہے۔ ابتدائی سبق آخری سبقوں سے نسبتاً آسان ہیں۔ اسباق کی یہ تدریجی صورت التزاماً رکھی گئی ہے۔ درجے میں آنے کے بعد طالب علم کی دماغی ارتقا بھی تدریجی ہوتی ہے۔ اسکی جو استعداد نویں درجے میں داخل ہوتے وقت ہوگی۔ دسویں میں وہی نہ رہ جائیگی۔ اس لحاظ سے یہ التزام بھی نہایت مناسب ہے۔

(۳) دستورِ قدیم کے خلاف ایک ہی طرح کے ادیبوں کی تحریر کے صرف بہترین نمونے کا انتخاب نہیں کیا گیا ہے بلکہ ادب کے مختلف شعبوں کے متعدد طرز کے نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ اس اصولی فرق کی وجہ سے مضامین کی ترتیب میں ایک جدت ہوگئی ہے جو طلبا کے لیے مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی۔

(۴) مختلف موضوع و مختلف طرز نگارش کے انتخاب سے یہ ادبی نکتہ بھی طلبا کے ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے کہ موضوع کی نوعیت بدلنے سے بیان کا طرز بدل جاتا ہے اور موضوع کے لیے اسلوب کی موزونیت ضروری ہے۔

(۵) معیاری ظرافت نگاری کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں اور اس طرح طلبا کو ایک ایسے اہم و دلچسپ موضوع سے بھی باخبر کیا گیا ہے جو اب تک درسی کتب میں ناپید تھا۔

(۶) ہر ادیب کے طرز تحریر کی خصوصیتیں بھی مختصراً بیان کردی گئی ہیں جس سے طلبا میں ادبیات کا ذوق اور تنقید کی قوت پیدا ہونے کی امید ہے۔

(۷) حصۂ نظم بھی تقریباً انھیں اصولی التزامات کی تحت میں انتخاب کیا گیا ہے۔ حالی، اقبال، نظر، چکبست، صفی، آرزو، جوش، اثر اور بہت سے بلند پایہ شعرا کے مختلف عنوان کے کلام اس میں درج کیے گئے ہیں۔

(۸) غزلیں بالکل نہیں رکھی گئی ہیں۔ سب کی سب نظمیں ہیں۔ اور یہ نہایت ہوشمندی کا کام ہے۔ درس کی دوسری کتاب سے غزلوں کی کمی پوری ہو گی اور اس کوشش سے نظموں کی۔ اب تک حصۂ نظم میں اساتذہ کی غزلیں ہی زیادہ تر پڑھائی جاتی ہیں۔ ان نظموں کا مطالعہ لڑکوں کو اس مغالطے سے

بچائے گا کہ اردو شاعری میں محض غزلیں ہی ہیں۔
(۹) حصّہ نثر و نظم دونوں میں ملہم زبان اردو حضرت آرزو لکھنوی کی "خالص اردو" کے نمونے بھی رکھے گئے ہیں۔ یہ امر مؤلف کی خوش ذوقی کا ثبوت اور ہماری سپاس گزاری کا متقاضی ہے۔ الفاظ عربی و فارسی سے پرہیز اور ٹھیٹھ ہندی سے اجتناب کرنے کی وجہ سے اس طرح کی مقید عبارت لکھنے میں قدم قدم پر دقتوں کا سامنا ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی کامل فن اپنی نباضیٔ زبان کی بدولت اس میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کی باتوں میں پھول کی سی نرمی، شگفتگی اور مٹھاس پیدا ہو جاتی ہے حضرت آرزو کے اس قسم کے مضامین نثر و نظم اُن کے مخصوص کارنامے ہیں جو اپنی ندرت و افادیت کی وجہ سے رہتی دنیا تک رہیں گے۔ انھیں پڑھ کر مصنف کا اعجاز ہی نہیں ظاہر ہوتا بلکہ اردو کی وسعت و ہمہ گیری کا بھی پتہ چلتا ہے۔ انھیں نظر انداز کرنا اور طلبا کو ان سے محروم و بے خبر رکھنا ادبی جرم ہے

اس مجموعے کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ مؤلف نے اس پر کتنی محنت کی ہے۔ ہم جعفری برادرس کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے ایسا مفید و دلچسپ مجموعہ تیار کرانے میں کامیابی حاصل کی۔ اب تک جتنے نصاب نظر سے گزرے ہیں اُن میں "نصاب اردو" یقیناً بہترین ہے ان جماعتوں کے لیے اس سے زیادہ کارآمد کوئی مجموعہ آج تک تیار نہیں ہوا ہے۔ طلبا کی کامیابی اور اردو کی بہبودی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم ذمہ داران بورڈ سے پرزور سفارش کرتے ہیں کہ وہ اسے کورس کے لیے منظور فرمائیں۔

آخر میں ناشرین سے یہ کہنا ہے کہ کتاب میں کتابت و طباعت کی کچھ غلطیاں رہ گئیں ہیں جنکی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ طلبا کے لیے دوسرے اڈیشن کی اشاعت کے موقع پر ان کی تصحیح ضرور کر دی جائے۔

تجلیات فرخ - قیمت عمہ / - پتہ :- علی ہادی پسر مصنف محلہ انصار - اناؤ

شروع میں مولانا رضی احمد صاحب رضی بدایونی کا تبصرہ ہے، پھر ضیا احمد صاحب ایم - اے پروفیسر مسلم یونیورسٹی کا مقدمہ ہے، پھر مصنف کی **عرض حال** اور تصویر ہے۔ اس کے بعد اشعار ہیں کلام کی ترتیب یہ ہے کہ پہلے ایک طویل قصیدہ ہے، اس کے بعد چند نظمیں ہیں۔ ان کے بعد غزلیں اور آخر میں رباعیاں۔

مصنف کتاب جناب فرخ بنارسی موجودہ دور کے نہایت خوشگو شاعر ہیں۔ آپ کے کلام پر

کی جیسی الفاظ کی شوکت نمایاں ہوتی ہے خیالات پاکیزہ ہوتے ہیں، جہاں اثر کا زیادہ خیال رکھا جاتا ہے وہاں اس اعتبار سے بھی کامیابی ہوتی ہے۔ غیر معمولی طباعی کا ثبوت ہر جگہ ملتا ہے۔ تفصیلی تبصرے کی گنجائش نہیں ہے دیوان قابل قدر ہے۔ آپ خود منگا کر ملاحظہ فرمائیں۔ نمونے کے لئے اپنی پسند کے چند شعر نقل کئے دیتا ہوں:۔

بقدر ذوق سجود آستاں نہیں ملتا — زمیں ملے تو بلے آسماں نہیں ملتا
کیا ہے شوق میں طے سر سے جادۂ مقصود — کسی کو سیر سے قدم کا نشاں نہیں ملتا
جرس کی آتی ہے کانوں میں دور سے آواز — تلاش میں ہوں مگر کارواں نہیں ملتا
نہس کہ منزلِ جاناں ہے بے نشاں فرخ — وہاں پہنچ کے خود اپنا نشاں نہیں ملتا

پابندیٔ مشرب سے آزاد ہے دیوانہ — زندان تصور ہے کعبہ ہو کہ بتخانہ
ان آنکھوں کی سرمستی مخمور اگر کر دے — تو سجدوں کا حاصل ہے اک لغزش مستانہ
دے اور تصور کو لے ذوق نظر وسعت — جی بھر کے نہیں دیکھا حسن رخ جانانہ
ساقی کی عنایت تک تھی بادہ کشی فرخ — آنسو نکل آتے ہیں اب دیکھ کے پیمانہ

شہادت عظمیٰ:۔ از شاہ محمد نذیر صاحب ہاشمی۔ قیمت: ۴/

پتہ:۔ شیخ عبدالباقی۔ اینڈ کو عسکر گنج۔ گورکھپور

یہ کتاب شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام سے متعلق ہے۔ جناب شاہ محمد نذیر صاحب ہاشمی مشہور صاحب قلم ہیں آپنے یہ کتاب نہایت محنت و تحقیق سے لکھی ہے۔ اس میں پنجاب کی ایک ہندو قوم کا معرکۂ کربلا میں شریک ہونا ثابت کیا گیا ہے اس کے علاوہ بھی بہت سی عقلی و نقلی باتیں قلمبند کیگئی ہیں ناظرین ضرور ملاحظہ فرمائیں۔

"نیرنگ خیال" سالنامہ ۱۹۳۲ء قیمت عہ پتہ:۔ منیجر "نیرنگ خیال" لاہور۔

دیدہ زیبی وظاہری رنگینیوں میں یہ پرچہ کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہتا۔ بلکہ اکثر سبقت لے جاتا ہے۔ ابکی بھی یہی حال ہے۔ خوشی تو اس بات کی ہے کہ اس کے روشن دماغ اڈیٹر صاحب نے اس کی معنوی حیثیت پر بھی نظر رکھی ہے اور وہ اس معاملے میں ابکی زیادہ کامیاب ہیں۔ ہم موصوف کو مبارکباد دیتے ہیں کہ انھوں نے

ادب"
جناب خواجہ حسن نظامی صاحب، جناب حامد اللہ صاحب افسر میرٹھی، جناب محمد حسین صاحب ادیب، جناب
مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی اور جناب رشید احمد صاحب صدیقی کے بلند پایہ مضامین شائع کیے۔
اس پرچے میں محمد دین صاحب تاثیر ایم۔ اے کا مضمون ناگ رانی بھی نہایت عمدہ ہے جیسا کہ
آپ نے لکھا ہے بنارس کے برہمن سے ایک سنسکرت کتاب کا مسودہ آپ کو ملگیا ہے۔ اس میں بعض ایسے
طرح کی کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ نہایت کامیابی کے ساتھ لکھی گئی ہیں۔
یہ مسودہ نادر اور سنسکرت لٹریچر کی بلندی معیار کا شاہد ہے۔ جناب تاثیر بعد تکمیل ترجمہ اسے شائع فرمانے
والے ہیں اس لیے انھیں یہ مشورہ دینا نہایت ضروری ہے کہ وہ قبل اشاعت اپنے ترجمے پر کسی زباں داں سے
نظر ثانی کرالیں بصورت موجودہ میں زبان کا عجز کتاب کی لطافتوں کو گھٹا رہا ہے۔
عظیم بیگ صاحب چغتائی پنجاب کے مشہور لکھنے والوں میں ہیں۔ آپ کا ایک مزاحیہ مضمون "کیا کبھی آپ
پٹے ہیں" اس پرچے میں موجود ہے۔ مگر ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ زبان کی خرابی اور خیالات کی
عمومیت کی وجہ سے اس فسانے میں خلاف امید دلآویزی بہت کم ہے۔ اس مزاحیہ کی ناکامیابی
اس لیے اور نمایاں ہو جاتی ہے کہ ناظر چند ہی صفحے پہلے رشید احمد صاحب صدیقی کا مزاحیہ مثلث دیکھ
چکنے کے بعد اسے دیکھتا ہے۔ دونوں مزاحیوں میں بڑا فرق ہے۔ جناب صدیقی کی پاکیزہ " زندہ دلی"
اور لطیف "شیریں بیانی" بہت کم لوگوں کو نصیب ہے۔ ہماری موجودہ مزاحیہ نگاری کا معیار
آپ کی بدولت بلند کہا جا سکتا ہے۔

تمام مضامین پر اظہار خیال ممکن نہیں۔ شائقین سالنامہ منگا کر ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

معتقدات المعروف بخزینۂ صنعت حصہ اول ۔ مرتبہ بلقیس جہاں بیگم، بر جیس گلشن بیگم
سید محمد صابر حسین بی۔ اے۔ کلاں باخانہ آگرہ۔ قیمت فی کاپی ۱۲ر

یہ رسالہ صنعت و دستکاری سے متعلق ہے۔ بیل بوٹے اور بہت سی دلچسپ مصوری کے مختلف
و متعدد طریقے لکھے گئے ہیں۔ ہر ایک کا نقشہ بھی موجود ہے۔ عورتوں کے لیے نہایت نادر و کار آمد
رسالہ ہے۔ ہم سفارش کرتے ہیں کہ خواتین اپنے گھر کے لیے اسے ضرور طلب فرمائیں۔ اس رسالے کا
ہر گھر میں ہونا نہایت ضروری ہے۔

٦

فہرست مضامین

جلد ۵ بابت ماہ جنوری سنہ ۱۹۳۲ء نمبر ۱

سید اعظم حسین پبلشر نے باہتمام سید محمد رضی منیجر سرفراز قومی پریس میں چھپوا کر دفتر رسالہ ادب لکھنؤ سے شائع کیا

خالص اُردو

حضرت آرزو

دیکھنے کو جو ان آنکھوں کے ترس جائیگا
دل تو اک پھول ہے کمھلا کے کبس جائیگا

اک سرکتا ہوا پھندا ہے یہ چاہت کا لگاؤ
وہ جو کھنچ بیٹھے کہیں اور بھی کس جائیگا

جل کے میں راکھ بھی ہو جاؤں تو کوئی نہ چھوئے
راکھ بھی آگ ہی ہے ہاتھ جھلس جائیگا

آزمانے سے تو دبنے کی نہیں جی کی اُمنگ
پانی مرتا جو گڑھا ہوگا وہ دھنس جائیگا

سیکڑوں ڈوب گئے بوند چھلک کر نہ گری
باہر آنکھوں کے نہ ان آنکھوں کا رس جائیگا

دیکھ کر مجھ کو بناوٹ سے نہ لو ٹھنڈی سانس
بادل اڑا ہوا آیا ہے برس جائیگا

آرزو آنکھ نہیں اسکے سمانے کی جگہ
دیکھنا دھیان میں آتے ہی وہ بس جائیگا

غیر مقید اُردو

میں ہوں تیرا خلوتیٔ ازل، مجھے کام منظر عام سے؟
وہ بلند حوصلہ ہے نظر، کہ ہے آگے رفعت بام سے

وہ پلٹ کے جلد نہ آئینگے، یہ عیاں ہے طرز خرام سے
کوئی گردش ایسی بھی اے فلک، جو ملا دے صبح کو شام سے

نہ قفس نصیب نہ آشیاں، ہے میان برزخ این و آں
ابھی پر شکستہ ہے مرغ جاں، کہ پھڑک کے نکلا ہے دام سے

مجھے رہنے کو وہ ملا ہے گھر، کہ جو آفتوں کی ہے رہ گزر
تمھیں خاکساروں کی کیا خبر، کبھی نیچے اترے ہو بام سے

جو کوئی کسی کا ہے مبتلا، مجھے اس سے کیا مجھے اس سے کیا
مرے دل کا قصہ نہ مجھے سنا، میں چھلک نہ جاؤں اپنے ہی جام سے

ابھی سوز دل ابھی رنگ رو، ابھی رقص دش ابھی شعلہ خو
وہی آگ پھیلی ہے چار سو، جو لگی تھی ایک مقام سے

مجھے جس حسیں نے لبھا لیا، مرے حسن ظن میں وہ بت نہ تھا
اسے دل نہ دوں تو کروں میں کیا، جو طلب کرے ترے نام سے

وہ حریص بادہ ہوں ساقیا، مرے دل میں جذبۂ میکدا
اگر امتحان ہو ظرف کا، خم اُنڈل پڑے اسی جام سے

جو ترے عمل کا چراغ ہے، وہی بے محل ہو تو داغ ہے
نہ جلا کے بیٹھ اسے صبح سے، نہ بجھا کے سو اسے شام سے

اسے کیا کھلے کہ ہے رشتہ کیا، دم تیغ سے رگ شوق کا
جو لہو نے کی حرکت ذرا، خود اُگل پڑی گی نیام سے

اگر آرزو دل امنڈ پڑے، تو پھر اشک رد کرے کیا رو
کوئی ہے نہیں کہ اُبل چلے، تو پلٹ لو شیشے میں جام سے

بزمِ آدب

'ادب' ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے
حیا ہے اور یہی گو مگو تو کیونکر ہو

'ادب' کی اعانت کے متعلق جب کچھ کہنا چاہتا ہوں تو خودداری عجب کشمکش میں ڈال دیتی ہے۔ نہ یہی ہوتا کہ جو کچھ کہنا ہے کہہ دوں اور نہ یہی کہ کچھ نہ کہوں۔ اُس وقت ہمیشہ مندرجۂ بالا شعر پڑھ کر غالب کی غیب دانی پر وجد کرنے لگتا ہوں اور اس طرح مطلب کی بات رہ جاتی ہے۔ مگر یہ صورت حال کب تک رہ سکتی ہے؟ زمانہ مجبور کرتا ہے کہ بقائے زیست کے لیے جدوجہد ضرور کی جائے۔ مشک اب صرف اپنی خوشبو کی بنا پر نہیں بکتی بلکہ اسکے لیے تعریفی تقریروں اور تحریروں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی بنا پر 'ادب' کے متعلق بھی کچھ لکھنے کی جرأت کی جاتی ہے۔

'ادب' کتنی قابل قدر خدمتیں انجام دیتا ہے اور اُردو لٹریچر کے لیے اُسکے وجود کی کس قدر ضرورت ہے اسکے اظہار کے لیے چند صاحبان علم کے گرامی ناموں کے نہایت مختصر حصے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔ ناظرین 'ادب' کے لیے یہ رائیں کوئی نئی نہیں ہیں بلکہ خود انھیں کی رایوں کی تائید ہیں:-

۱- فاضل اجل جناب سید غلام السیدین صاحب پرنسپل ٹریننگ کالج علیگڈھ تجدید خریداری کے لیے وی-پی طلب کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:- "ادب اُردو کے ان بہت ہی تھوڑے رسالوں میں سے ہے جنکا پڑھنا ذوق سلیم پر اتنا ہی فرض ہے جتنا اکثر رسالوں سے سختی کے ساتھ پرہیز کرنا۔"

۲- دکن کے مشہور رسالہ "تاریخ" کے نامور مدیر جناب سید احمد اللہ صاحب قادری ایک طولانی گرامی نامے میں تحریر فرماتے ہیں:- "ادب حقیقت میں ہندوستان کے اعلیٰ ترین رسائل میں شمار ہونے کے قابل ہے۔"

میں "ادب" کو خاص طور پر پسند کرتا ہوں اور معلومات کے لیے پڑھتا ہوں "

۳۔ ملک کے معزز اہل قلم جناب محمد حسین صاحب ادیب ایم اے۔ بی اے بی ٹی، اپنے ایک نوازشنامے میں لکھتے ہیں:۔ "آج کل بلند پایہ رسالوں کی بڑی کمی ہے "ادب" کے مضامین یقیناً اعلیٰ معیار کے ہوتے ہیں۔ دوسرے بہتیرے جرائد محض اوقات گزاری یا تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتے ہیں لیکن "ادب" اردو زبان اور لٹریچر کی بہترین خدمت انجام دیتا ہے۔ اُسکا مطالعہ نظر میں وسعت اور معلومات میں مفید اضافہ پیدا کرتا ہے۔ علم و ادب کے تشنہ کاموں کی سیرابی کا وافر ذخیرہ اس میں پایا جاتا ہے۔ عروس البلاد کے اس مفید معیاری رسالے کو زندہ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے"

اسی طرح جناب ڈاکٹر وحید مرزا صاحب ایم اے۔ پی ایچ ڈی اور دیگر ممتاز افاضل کے صحیفے ہمارے پاس موجود ہیں جن میں "ادب" کی اہمیت کا اظہار اور اُسکی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے انکی نقل درج نہیں کی جاتی۔ اگر ناظرین والاتمکین توجہ سے کام لیں تو انکی ذاتی رائے کی اتنی ہی تائیدیں عملی ہمدردی کے جذبے کو اتنا قوی بنا دینے کے لیے کافی ہیں کہ وہ "ادب" کے لیے ایک ایک جدید خریدار فراہم کرنا یا بقدر حیثیت عطیے سے اسکی امداد کرنا اپنا فرض سمجھ لیں۔

برکریماں کارہا دشوار نیست

ہمارے یہاں انھیں عام نمبروں میں اشاعت کی غرض سے اس قسم کے مضامین بکثرت آتے رہتے ہیں جن سے اکثر معاصرین کے 'خاص نمبر' تیار ہو جاتے ہیں۔ حتی الامکان اُن کی اشاعت سے انکار کرکے پرچے کا معیار برقرار رکھا جاتا ہے۔ تاہم اگر سال میں کبھی دو ایک بار ایسا مضمون شائع ہو جاتا ہے تو اُسکے لیے ہم مجبور ہوتے ہیں۔ یہ صورت کیونکر پیدا ہو جاتی ہے اسے ہم نہیں بتا سکتے۔ اس لیے نہیں کہ ہم اسکے ناگہانی ایسا ہے ناواقف ہیں بلکہ اس لیے کہ ہمیں سب کچھ معلوم ہے!

ہمیں امید ہے کہ ہمارے احباب خاص اس مخلصانہ اظہار خیال سے متفق ہونگے بلکہ اسے مزید عنایات کا تقاضا تصور فرماکر اپنی قلمی جد و جہد میں پہلے سے زیادہ منہمک ہونگے۔

نالہ جز حُسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں   ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں

اثرات :۔ اس عنوان کے تحت میں مولوی مقبول احمد صاحب صمدنی کا ایک گراں قدر مضمون اس نمبر میں شائع کیا جاتا ہے۔ آج کل مادری زبان سے ناواقفیت اور غیر ملکی زبان کی ترویج کی بدولت اُردو میں عربی و فارسی کی ایسی سینکڑوں غلط لفظیں استعمال کی جا رہی ہیں جو کسی نہ کسی کم سواد موجد کی مسخ کردہ ہیں۔ اثرات بھی انھیں میں سے ہے۔ مولانائے موصوف نے اس مضمون میں اسی لفظ کی صحت و عدم صحت سے نہایت محققانہ طور پر بحث کی ہے۔ جیسا کہ آپ نے لکھا ہے مضمون خشک ضرور ہے مگر فائدے سے خالی نہیں حقیقت میں یہ مضمون ان غیر ذمہ دار اصحاب کے لیے ایک درس ہے جو بے سوچے سمجھے لفظیں گڑھا کرتے ہیں۔

سلطان محمد تغلق :۔ ہمارے کرم فرما شبیر احمد صاحب علوی کے اس مضمون کے اکثر حصے "ادب" میں شائع ہو چکے ہیں اور یہ حصہ اس سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ آئندہ اشاعتوں میں موصوف کے دوسرے دلچسپ مضامین شائع ہونگے۔

حکیم فقیر حسین :۔ جیسا کہ خود اس مضمون کے مصنف مولوی منظر عباس صاحب نے تحریر فرمایا ہے یہ مضمون تشنہ ہے، تاہم شاعر کے کلام کی پاکیزگی نیز دوسرے صاحبان قلم کے لیے مواد کی فراہمی کے خیال سے شائع کیا جاتا ہے۔

ریختی :۔ منور عباس صاحب شہاب بی اے ایک ہونہار گریجویٹ ہیں۔ آپ نے اپنی ادب دوستی کے ثبوت میں یہ طویل مگر دلچسپ مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ ایک قسط نکل چکی ہے۔ دوسری اس نمبر میں شائع ہو رہی ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ دامن "ادب" کی تنگی اس مضمون کو اس نمبر میں ختم کر دینے سے مانع ہوئی۔

پریم رس :۔ اس فسانے کے مصنف وقار عظیم صاحب ادب کا صحیح ذوق رکھتے ہیں۔ اس فسانے سے پتہ چلتا ہے کہ ان میں ترقی کی صلاحیت موجود ہے اور وہ آئندہ کامیاب ہو سکینگے۔

نوشابہ :۔ اس فسانے کے مصنف جناب شمس نونہروی "ادب" کے مخصوص بہی خواہوں میں سے ہیں۔ آپ ہر وقت اسی فکر میں رہتے ہیں کہ "ادب" کی اعانت کس طرح کی جا سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے توسیع اشاعت کے ذریعے سے مالی امداد بہم پہنچانے کے ساتھ ساتھ قلمی اعانت بھی اپنے لئے فرض کر لی ہے۔ ہم آپ کے اس جذبۂ خلوص کے زیر بار احسان ہیں۔ ایسی اظہار رائے کے بعد زیر نظر فسانے پر رائے زنی بیکار ہے۔

"ہر چہ از دوست می رسد نیکوست"

بقیہ نثر و نظم پر اظہار خیال کی گنجائش نہیں ہے۔ البتہ حضرت آرزو مدظلہ کے کلام کی طرف ناظرین کو متوجہ کر دینا ضروری ہے۔ موصوف کی غیر مقید اُردو کی غزل ایکی پہلا جواب ہے۔ "خالص اُردو" میں تو آپکا کوئی مقابل ہی نہیں۔ یہ نہایت مسرت کی بات ہے کہ جن اغراض و مقاصد کو نظر رکھکر "خالص اُردو" کی اشاعت کی جا رہی ہے۔ ان میں بحمدہ اب کامیابی نمایاں ہے۔ وہ تمام اصحاب جو شروع شروع میں اسکے نام سے وحشت کرتے تھے اب افسوس ہوتے ہیں۔ زبان کی بھولی ہوئی لفظیں جو حقیقتاً اسکی روح رواں ہیں پھر سے زندہ کی جانے لگی ہیں۔ نظم و نثر میں للک، ٹھوکا اور بس کے سے لفظ استعمال ہونے لگے ہیں اور اس طرح اردو ہندی کی درمیانی خلیج تنگ ہو رہی ہے۔

پرچے میں کہیں جگہ باقی نہ رہنے کی وجہ سے ابکی "نقد و تبصرہ" کا عنوان قائم نہیں کیا جا سکا۔ چند ضروری تبصرے یہیں درج ہیں:۔

ہندستانی آلہ آباد:۔ ہندستانی اکیڈیمی صوبہ متحدہ کا تماہی رسالہ حجم ۱۶۸ صفحے سالانہ قیمت صہ۔ جنوری سنہ ۱۹۳۲ء کا پرچہ پیش نظر ہے۔ پہلے مضمون میں "شاہ ظہور الدین حاتم" استاد سودا کی شخصیت اور حالات سے محققانہ بحث کی گئی ہے۔ جسکے نتائج معلومات میں خوشگوار اضافہ کرتے ہیں۔ دوسرے مضمون میں "مت رام ایک ہندی رتن" کے حالات کا بیان اور کلام کی تشریح ہے۔ فاضل مضمون نگار نے اس سلسلے میں بہت سے نکات حل کیے ہیں۔ مگر انکی رائے سے کہیں کہیں اختلاف ضروری ہے۔ مثلاً ایک جگہ آپنے لکھ دیا ہے "انیس و فردوسی سے "بزم" تقریباً ناممکن ہی سی ہے"۔ حالانکہ انیس کو "بزم" میں عاجز سمجھنا کسی طرح قابل قبول نہیں۔ تیسرا مضمون "ابراہیم نامہ" پر مشتمل ہے جو سولھویں صدی عیسوی کی دکنی اُردو کی ایک مثنوی ہے اور جسکا "مخطوطہ" اتفاق سے ہاتھ آگیا ہے۔ چوتھے مضمون میں "میر مہدی بیدار" اور انکی شاعری کا بیان ہے۔ بیدار دہلی کے باشندے میر کے ہمعصر اور بہت اچھے شاعر تھے۔ چھٹے مضمون میں "تماہی" کی بحث ہے۔ آخر میں اشک ہندی کی ایک اوریجنل چیز بھی شائع کر دی گئی ہے اور وہ جوش کی مختصر مگر پر کیف نظم ہے۔

تاریخ کوٹلہ اکبر جاہ، حیدرآباد دکن۔ حجم کم از کم سو صفحے، سالانہ قیمت پانچ روپیہ۔ یہ سہ ماہی رسالہ مولوی حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری اور مولوی سید احمد اللہ صاحب قادری کے سے ممتاز صاحبان قلم کی ادارت میں شائع ہوتا ہے۔ "تاریخ" اور "آثار قدیمہ" اسکے موضوع ہیں۔ اپنی نوعیت کا بہترین پرچہ ہے۔

چندر کلا:۔ ناول مصنفہ بشیر احمد صاحب علوی بی اے قیمت ۲ر پتہ نسیم بک ڈپو لکھنؤ۔ سومنات کے مشہور واقعے سے متعلق ہے۔ شائقین ملاحظہ کریں۔

"اعظم"

اثرات

جناب سید مقبول احمد صاحب صمدنی، مصنف حیات جلیل و شاہزادہ خسرو

آج کل یہ لفظ اردو کے رسالوں، خصوصاً پنجاب والوں میں[1] اکثر نظر آتا ہے۔ مجھ کو تعجب آتا ہے کہ ذی علم، نامور اہل قلم بھی اسکے استعمال میں احتیاط نہیں کرتے۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں نے بارہا غور کیا، محققین فن کے روبرو بھی زانوے ادب تہ کیا۔ لغت کی کتابوں پر نگاہ ڈالی۔ متفقاً ایک ہی جواب ملتا ہے کہ یہ لفظ (اَثرات) لغوی طور پر درست نہیں۔ حاشا للہ، میں ان تنگ خیال لوگوں میں نہیں ہوں جو اردو زبان کو محدود رکھنا یا کرنا چاہتے ہیں۔ جو ایک تنگ دائرہ سے اسکا باہر نکلنا گوارا نہیں کرتے۔ مفید اضافوں اور نئی نئی دلکش ترکیبوں سے اردو کے دامن کو مالا مال کرنے سے دور بھاگتے ہیں۔ البتہ یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ محض کم علمی، عدم توجہ یا فقدان التفات سے غلط لفظ، غلط املا، غلط تلفظ، ہماری زبان میں داخل ہو جائے اور اسکا استعمال بڑھتا رہے۔ حتیٰ کہ غلط العوام فصیح و صحیح قرار پا جائے۔ زبان برباد ہو۔

"اثرات" کا لفظ لغات میں کسی نوعیت و اسلوب سے نہیں ملتا۔ مفرد کلمہ کی حیثیت سے بھی ناپید و معدوم ہے۔ اس لیے زیادہ سے زیادہ صحیح الفاظ طور پر آپ "اثرات" کو "اثر" کی جمع تجویز کر سکینگے۔

---

[1] ادبی دنیا۔ ماہ مئی ۱۹۳۱ء۔ صفحہ ۲۶۱۔ کالم اول

حمایت اسلام۔ ۱۷ دسمبر ۱۹۳۱ء صفحہ ۴۔ کالم ۳

صوفی۔ بارہا۔ سالنامہ نیرنگ خیال ۱۹۳۱ء۔ صفحہ ۶۹ کالم ۳

''اَثَر'' عربی زبان کا لفظ ہے اور اردو میں اللہ و رسول پاک کے پاک ناموں کے بعد بہت زیادہ یہی مستعمل ہے۔ اردو کی رائج اور آسان لغتوں میں اسکے معنے[1] ''تاثیر، نشان، کھنڈر اور کھوج'' کے ملتے ہیں۔ وہ[2] اسکی ایک، اور صرف ایک، جمع ''آثار'' بہ معنی نشانیاں، یا بچے ہوئے پیڑوں کے پرانے نشان بتاتے ہیں۔ یعنی ''اَثَر'' بمعنی نشان کی جمع صرف ''آثار'' لکھتے ہیں۔ عربی کی بڑی سے بڑی اور مطول لغت کی کتابیں اس متخیلہ جمع اثرات سے یکسر خالی ہیں۔ نشان تک پایا نہیں جاتا۔

یہ سرسری نظر تو ایک کلمۂ مفرد یعنی اثر کے لگاؤ سے ڈالی گئی تھی لیکن اگر اس سے قطع نظر کی جائے اور ''اثرات'' کو بے سمجھے بوجھے، اسکی کوئی انفرادی یا اصلی حیثیت مان کر دیکھا جائے تو اسکی صحت میں اور بھی تامل ہو جاتا ہے۔

دعوی کیا جا سکتا ہے کہ ''اَثَرات'' جمع مونث سالم ہے۔ مگر نحوی قاعدے اور ایسی جمع بنانے کے اصول اس دعوی کی تائید و تصدیق نہیں کرتے۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ جمع مؤنث سالم وہ جمع ہوتی ہے جس میں کلمہ کے آخر میں الف اور تائے مبسوطہ (دراز) لگا دی جاتی ہے۔ جیسے ثَمَرات، شَجَرات۔ [مگر یہ جمعیں ثمرہ و شجرہ کی ہیں نہ کہ ثمر و شجر کی۔ انکی جمعیں تو آپ کو معلوم ہے کہ اثمار و اشجار آتی ہیں نہ کہ کچھ اور۔ اور عربی لغات میں کوئی لفظ ''اثرہ'' پایا نہیں پایا جاتا] ساتھ ہی یہ پابندی ہے کہ کلمۂ مفرد کے آخر میں اگر تائے لاحقہ ہو تو حذف کر دی جائیگی (زیر بحث کلمہ سے براہ راست اسکا تعلق نہیں۔ مگر اسکی کچھ ایسی صورتیں ضرور ہیں جن پر اسکا اطلاق ہو سکتا ہے اور اور جن کا ذکر عنقریب آئے گا۔)

یہ امر کہ جمع مؤنث سالم کن کلمات کی اور کیسے مبنی یا بن سکتی ہے۔ فقہائے لسان اور ائمہ نحو نے انکی صراحت کردی اور بتادیا ہے کہ چند صفات خاص سے ان کا مُتّصف (موصوف) ہونا لابدی ہے۔

امام النحاۃ ابو عبداللہ محمد جمال الدین بن عبداللہ بن مالک نے اپنے نادر و جامع معلومات ''الفیہ'' میں ان کو نظم فرما دیا ہے اور امام عالم علامہ مختار بن بونہ نے اپنے ''الفیہ'' اضافیہ میں مزید

---

[1] لغات کشوری۔ صفحہ ۲۔ کالم ۲

[2] ؍؍ ؍؍ ؍؍

وضاحت و تشریح کردی ہے جس کو اصل و اضافہ کے امتیاز کے لیے قوسین میں نقل کرتا ہوں[۱] -

وَمَا بِتَاءٍ وَ اَلِفٍ قَدْ جُمِعَا　　يُكْسَرُ فِي الْجَرِّ وَفِي النَّصْبِ مَعَا
(وَقِسْهُ فِي ذِي التَّا وَمَا لَنْ يَعْقِلَا　　مُصَغَّرًا اَوْ صِفَةً وَ مُسْتَجَلَا)
(فِيمَا كَصَنْبٍ وَالَّذِي كَصَحْرَا　　لَا مَا كَحَمْرَاءَ وَلَا كَسَكْرَى)
(اَلَّا اِذَا لَا سُمِّيَتْ قَدْ نُقِلَا　　وَالنَّقْلُ فِي غَيْرِ الَّذِي مَرَّ اقْبَلَا)
كَذَا اُولَاتُ وَالَّذِي اِسْمًا قَدْ جُعِلْ　　كَاَذْرِعَاتٍ فِيهِ ذَا اَيْضًا قُبِلْ .

امام مختار موصوف نے ان اشعار پر کافی و وافی حاشیہ بھی تحریر فرمایا ہے جس میں قرآن مجید اور محاورات و کلام عرب سے ہر ایک کے لیے متعدد مثالیں دی ہیں جن کے اعادہ و نقل کی یہاں نہ ضرورت ہے نہ گنجائش -

اُن دوستوں کی واقفیت و آگاہی کے لیے جو عربی نظم و ادب سے مجھ سے بھی زیادہ بے بہرہ ہیں ان اسما اور قاعدوں کو کم و بیش اپنی فہم و قابلیت کے مطابق ذیل میں درج کرتا ہوں -

(۱) ہر اسم جو تائے تانیث پر ختم ہوتا ہو جیسے شجرات - یا (رسالوں کے) شذرات - بعض مستثنیات بھی ہیں جنکی تفصیل یہاں فضول ہے - .

(۲) عورتوں کے عَلَم (نام) مطلقاً - جیسے مریمات - زینبات طلحات - ہندات -

(۳) غیر ذوی العقول مذکر کی جب تصغیر کردی جائے - مثلاً درہم سے دُرَیہم - تو اسکی جمع دُرَیہمات ہوگی - اسی طرح باب سے بُوَیب جسکی جمع بُوَیبات آتی ہے -

(۴) یا صفت غیر عاقل واقع ہو - باوجودیکہ مذکر ہو - اس قسم کی جمعیں قرآن پاک میں بھی آئی ہیں - جبال راسیات - وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِي اَيَّامٍ مَعْدُودَاتٍ - اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَعْلُومَاتٌ -

(۵) مصادر - بحالیکہ تین حرفوں سے متجاوز ہوں - جیسے تعریفات - امتحانات - الزامات - اشتہارات - مگر بعض فقہا و اطبا و اہل کلام کو اس بارہ میں اختلاف ہے -

(۶) جو الف تانیث پر ختم ہوتے ہوں (عربی کے) خواہ الف ممدودہ ہو خواہ مقصورہ - جیسے صحراوات - حُبلیات -

[۱] مطبوعہ مصر ۱۳۲۷ھ - صفحہ ۱۹

(۷) ان کے سوا چند اور الفاظ بھی ہیں جن کی جمع مؤنث سالم بنانا جائز قرار پا گیا ہے۔ مگر وہ شرِ سماعت (سننے سنانے یا دستور و رواج قدیم) سے تعلق رکھتے ہیں۔ جیسے سُنّادات۔ اربعینات۔ سجلات۔ حمامات۔ سُرادِقات۔ شمالات۔ اُمّہات۔

(۸) ہمارے زمانہ کی ضرورتوں نے بعض خاص وزن و وضع کے عجمی اسماء کو بھی اسی ذیل میں داخل و شامل کر دیا ہے۔ مثلاً تلغراف کی جمع تلغرافات۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ ان کو چھوڑ کر بہت سے الفاظ ایسے بھی ہیں جنکی جمع، جمع مکسر مبنی ہے۔ جیسے اِسکلہ کی اساکل۔ قُنصُل کی (جو کلمۂ دخیل ہے) قناصل۔ بطریرک یا بطرک کی بطارکہ و بطاریک۔ بطریق کی بطارقہ (قیاسی طور پر) کارڈینل کی کرادلہ۔

ایک ہونہار ذہین عزیز کا خیال ہے کہ "اثرات" اَثَر کی جمع نہیں بلکہ "اثْر" (بسکون ثین) کی ہے۔ اس کی نسبت مجھے صرف دو باتیں عرض کرنا ہیں:۔

(۱) ایمۂ فن کا ارشاد ہے کہ جب ثلاثی صحیح العین کی جمع مؤنث سالم بنانا ہو تو خیال رکھیے کہ اگر اسکا مفرد فَعْل یا فَعْلَہ کے وزن پر ہو تو عین پر حرکت فتحہ دینا واجب ہے۔ جیسے حَضْرت کی حَضَرات۔ بَرکت کی بَرَکات۔ رَحْمت کی رَحَمات۔ ثَمْرۃ کی ثَمَرات۔ البتہ بضرورت اسکے خلاف بھی جائز ہے۔

اور بحالیکہ فِعْل یا فُعْل کے وزن پر ہو تو اسکا اتباع یعنی حرکت اصلی کا بحال رکھنا بھی جائز ہے۔ فتح دینا بھی، نیز ساکن کر دینا یعنی تخفیف۔ جیسے کِسْرہ کی کِسِرات۔ کِسَرات، کِسْرات۔ اور حُجْرہ کی حُجُرات۔ حُجَرات، حُجْرات۔

اگر اجوف ہو تو عین کو سکون دینا واجب ہے۔ فا، خواہ کیسی ہی واقع ہوئی ہو۔ جیسے جَوْزَہ سے جَوْزات۔ بِیْعہ سے بِیْعات۔

ناقص ہو تو اس کا حکم صحیح العین والا حکم ہوتا ہے جیسے رَمْیَہ سے رَمَیات۔ رُقْوہ سے رُقُوات۔ رُقَوات۔ رُقْوات۔ خُطوہ سے خُطُوات۔ (کما فی القرآن)

اگر مکسور الفا وادی اللام نہ ہو تو اُسکا اتباع ممنوع ہے۔ البتہ اُسکا ساکن کیا جانا یا فتحہ دیا جانا دونوں یکساں جائز ہیں۔ مجرد رہنا محض شاذ و نادر ہوتا ہے۔ یہی صورت اُس وقت بھی ہوگی۔ جس وقت کہ مضموم الفا یائی اللام ہو۔

لیکن اگر مدغم ہو تو اسکا فک ادغام نہیں ہوتا۔ جیسے ضمّہ سے ضمّات۔ عزّہ سے عزّات۔

یہ تو قواعد کی چھان بین تھی اور اصولی بحث و تمحیص، جو میں نے اپنے سمجھنے اور آپ کے فیصلے کے لیے پوری مگر غیر دلچسپ تفصیل اور بے لطف لیکن ضروری تصریحات کے ساتھ قلمبند کر دی۔

(۲) اب آپ غور فرما سکتے ہیں کہ ان مدات میں سے "اثرات" کو کہاں جگہ ملتی ہے؟۔

مگر نہیں۔ کوئی قطعی یا مختتم رائے قائم کرنے سے پہلے یہ بھی دیکھ لیجیے کہ اسکے اسم مفرد یعنی "اثر" کی نسبت "اہل زبان بزرگوں کا ارشاد کیا ہے۔ دور حاضرہ (موجودہ زمانہ) کے بڑے ماہر و کامل فن لغت نویس پادری لویس معلوف یسوعی نے اپنی نفیس تالیف "المنجد"[1] میں سیر حاصل تحقیقات کی ہے۔ محض قلم کی جولانی دکھانے اور تحقیقات کے نام اور نمائش کی راہ سے نہیں بلکہ غور اور گہری نگاہ کے ماحصل کے طور پر، جو ایک بلند پایہ مصنف کو عالمانہ کد و کاوش کے ساتھ ناچیز چیزوں پر بھی ڈالنا ہوتی ہے۔

انتشار۔ استنشار، ماثر، تاثیر، اثیر، ماثور، اثرہ، اثرہ وغیرہ مختلف مصادر اور صیغوں کو چھوڑ کر جن میں ہیئت ترکیبی کم و بیش بدل گئی ہے یا معانی میں کچھ نہ کچھ فرق آگیا ہے میں صرف اُن کلمات کا ذکر کرونگا جن میں ا ث ر کے اجتماع حرفی یا ترتیبی میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوا ہے۔

اَثَرَ، اَثْراً، اُثْرَۃً، اَثَارَۃً۔ یا اَثِرَ یا اُثِرَ، اِثْراً، اسکی تصریف یعنی گردان ہے۔ انکے کسی خاص معنی یا ادبی پہلو کے بتلانے کی یہاں ضرورت نہیں۔ البتہ یہ واضح رہے کہ یہ کوئی مستقل فعل نہیں، بلکہ اسکے بعد جو فعل آتا ہے اُسکی مدد کرتا ہے جسکو انگریزی اصطلاح میں "ہیلپنگ ورب" کہتے ہیں۔

اُثرہ، اَثْراً۔ معنی ہونگے ایسا ہی کیا جاتا ہے (یُفْعَلُ کذا)، شروع کیا، نیز اَمْر (حکم) کے لیے۔ مستعد یا فارغ ہوگیا۔ علیہ (اُس پر) کے ساتھ ہو تو "عزم (ارادہ) کر لیا"۔ علیہم سے پہلے ہو تو اپنے نفس (ذات) کے لیے اُن کے سوا اچھی اچھی چیزیں پسند کر لیں۔ حدیث نبوی صحیح ہے

انکم ستلقون بعدی اثرۃ فاصبروا حتی تلقونی علی الحوض

ان میں کوئی اسم نہیں اس لیے جمع بھی نہیں لکھی۔

اب اصل چیز زیر بحث خود "اثر" باقی رہ جاتا ہے۔ اسکے کئی معنی ہیں مگر تقریباً سب ملتے جلتے ہیں۔ کسی چیز کے نشان میں جو کچھ باقی رہ گیا ہو۔ نیز حدیث۔ سنت۔ اَجَل (موت کا وقت جسکی جمع

[1] طبع ہجم۔ صفحہ ۳۔

بھی آجال آتی ہے نہ کہ اَجلات) ۔ جامع لغات نے اَثر کی جمع آثار و اُثور لکھی ہے ۔ ساتھ ہی یہ بھی اضافہ فرمایا ہے کہ مسلمانوں کے یہاں علم الآثار ویسا ہی ہے جیسا کہ مسیحیوں کے یہاں علم تنقید ۔ علم الآثار سے مطلقاً مراد یہ بتاتے ہیں کہ کسی قوم کی باقی ماندہ چیزوں کا بنیادوں (عمارتوں) مورتوں، بتوں ۔ روغن و مصالحہ لگائی ہوئی نعشوں، چیزوں، سکوں، وغیرہ سے پہچاننا ۔ اس فن کے عالم کو اَثری کہتے ہیں ۔ عربی زبان میں اَثر کے پس و پیش کچھ لگا دینے سے معنی کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں ۔ مثلاً کہا جائے کہ خرج فی اَثرہ و فی اِثرہ تو معنی ہونگے کہ اُسکے بعد چلا ۔ اور "علی الاثر" کہنے سے مقصود "فی الحال" یا ہماری زبان میں "فی الفور" ہوگا ۔

اب اُن چند اسماء کو نقل کرنا باقی ہے جنکے کچھ معنی بھی ہیں اور جنکی جمع بھی آئی ہے

اُثر ۔ اُثُر ۔ زخم کا نشان ۔ جمع آثار و اُثور

اَثر ۔ تلوار کا جوہر جمع اُثور

اُثرۃ .... جمع اُثر

اَثارۃ ۔ جو علم کرم متوارث اور فعل حمید سے باقی رہ گیا ہو ۔ جمع معمولی اَثارات

اسکے نمونہ ہم شکل عربی میں اور بھی بہت سے کلمے ملتے ہیں جنکی تبدیل حرکات سے جمعیں بھی بدل جاتی ہیں مثلاً

نَفس ۔ جسکے متعدد معنی ہیں ۔ جان، روح، ہستی، حقیقت شے ۔ جمع اَنفُس و نُفوس ۔

نَفَس ۔ دم، سانس جس سے زندہ جاوداں سعدی نے گلستاں کے دیباچہ کا آغاز کیا ہے ۔ اور جسکے معنی بھی کچھ کم نہیں ۔ جمع اَنفاس

یہ ہیچمداں تو عربی لغت کی کتابوں میں "اَثرات" کی تلاش و دستیابی سے قاصر و ناکام رہا ۔ قارئین ادب دوست سے التجا ہے کہ براہ کرم اپنی معلومات و نتیجۂ تحقیق نیز رائے رزیں سے آگاہ فرمائیں ۔

عذر ۔ "ادب" کے شگفتہ و رنگیں اوراق پر ریگزار عرب کے سنگریزوں اور کانٹوں کا پھیلانا میرے نزدیک ناقابل تلافی گناہ تھا ۔ مگر میں نے جو کچھ کیا مجبوری سے کیا ہے کہ اس مینا کے متاع بے خبری و نادانی کی سل کی کائنات اسی قدر ہے ۔ خدا کرے کہ یہی سوکھی پتیاں اور خشک پژمردہ زرد زرد پھول کسی اہل دل کے مشام جان تک نسیم صبا پہونچا دیں ۔ اور کسی شوریدہ سر سودائی کو اس خارستاں میں لیلائے علم و جرأت کی جھلک نظر آجائے ۔ ورنہ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ ۔ آخر یہ سطریں بھی اُسی گل زمیں پر بیٹھ کر لکھی گئی ہیں جہاں سوڈیڑھ سو برس پہلے مرحوم میر آزاد نے "ابر لغات" کا گرجنا دیکھا سنا تھا لیکن نہ وہ بادل برسے نہ موتی پیدا ہوئے ۔ نہ سبزہ اُگا ۔ میں کیا اور بجز اسکے میری توقع ہی کیا کہ

مرا بہ سادہ دلی ہائے من تواں بخشید ۔۔۔ کہ جرم کردہ ام و چشم آفریں دارم

سلطان محمد تغلق

(جناب مشیر احمد صاحب علوی بی اے)

باب ہشتم

اِس سے کسی کو بھی اختلاف نہ ہوگا۔ کہ محمد تغلق کے سر الزامات کا جو طومار ہے وہ صرف چند امور کی وجہ سے اور یہی امور کوتاہ بین مورخین کی نگاہوں میں کھٹک رہے ہیں۔ اگر دورِ حاضرہ سے دورِ پاستان کا مقابلہ کیا جائے تو بہت مماثلت نظر آئیگی۔

"۱۔ محمد تغلق نے صرف دوآب بنارس اور دوآب دریائے سندھ و گنگا ہی میں خراج کا اضافہ کیا تھا، اور کہیں اس تغیر کا اثر نہ ہوا۔ اس موقع پر سوال یہ ہے کہ کیا محمد تغلق کی حکومت ان تمام ضروریات سے بے نیاز تھی جن سے مجبور ہو کر آج کی متمدن سے متمدن حکومت آئے دن رعایا کی جیبیں ٹٹولتی ہے۔ اگر وہ بے نیاز نہ تھا اور یقیناً نہ تھا تو یہ بتاؤ کہ علاقۂ دوآب سے نہیں تو اور کہاں کے لوگوں سے زیادہ خراج لیا جاتا۔ کیا چٹیل میدانوں اور ریگستانی علاقوں سے؟ اگر یہ سچ ہے کہ ٹیکس زیادہ تر زرخیز مقامات ہی کے لوگوں پر بڑھایا جاتا ہے تو اب اس سوال کی گنجائش ہی نہیں کہ دوسری جگہ خراج کیوں نہ بڑھا۔ سب سے اہم بات جو ہمیں یاد رکھنی چاہیے یہ ہے کہ اتنا خراج نہیں بڑھایا گیا تھا کہ رعایا کسی حالت میں ادا نہ کر سکتی لیکن بادشاہ و رعایا دونوں کی بدقسمتی سے اسی سال قحط بھی پڑ گیا، رعایا غریب مجبور

ہوگئی اور خراج کے ادا کرنے میں دشواریاں پیش آئیں، ورنہ بذات خود خراج میں اضافہ کرنا جب کہ حکومت کو اسکی ضرورت ہو نہ تو کوئی عیب ہے اور نہ کوئی ظلم۔ ٹھنڈے دل سے غور کرو اور بتاؤ کہ کیا موجودہ صدی میں ٹیکس نہیں لیا جاتا اور کیا یہ ٹیکس پہلے کی بہ نسبت زیادہ نہیں ہے اور اس پر بھی آئے دن سرکاری مطالبات میں اضافہ نہیں ہوا کرتا جس سے کہ دنیا کی کوئی آبادی محفوظ نہیں۔ یہ تو ایک منحوس موقع تھا جو کہ آخرالذکر جماعت کو خوش قسمتی سے مل گیا جس کی بنا پر انھوں نے ملک میں جابجا بغاوتیں پھیلانے کی کوشش کی اور جب ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو جنگل کو بھاگ کھڑے ہوئے مگر محمد تغلق نے ان مفسدوں کو گھیر لیا اور شاہی تعزیرات کے مطابق سزائیں دیں۔ غالباً یہ بعض مدرسین کی دانستہ غلط فہمی ہے کہ محمد تغلق نے اپنی بھاگی ہوئی معصوم رعایا کو تباہ و برباد کرنے کی غرض سے یہ فوج بھیجی تھی۔ بادشاہ کو اپنی مصیبت زدہ بے گناہ اور امن پسند رعایا کا اتنا خیال تھا کہ اس نے چار ماہ تک خیرات کا سلسلہ جاری رکھا جسکے باعث غربا مفلسوں کا طبقہ زمانہ قحط کو قحط نہ سمجھ سکا۔ رہے کسان جو خیرات نہ لے سکتے تھے اُن کو آیندہ فصل کی ترقی اور عمدہ کاشت کرنے کی غرض سے سلطنت نے تقاوی تقسیم کی"۱؎

اس سال بارش نہ ہوئی۔ چنانچہ دہلی اور حوالی دہلی میں سخت قحط رونما ہو گیا جو عرصہ تک قائم رہا۔ اور ہزارہا مخلوق فاقہ کشی کی بدولت موت کے گھاٹ اتر گئی۔ ایک من اناج چھ دینار کو بکنے لگا۔ صاحب قراں نے حکم دیا کہ اہل شہر کو اس قدر غلہ دیا جائے کہ وہ بخوبی چھ ماہ تک اُس کو کھا سکیں۔ اہلکاروں نے محلوں کی فہرست تیار کی لیکن انھوں نے خوب ہاتھ صاف کیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس بخشش سے بھی کوئی خاص فائدہ نہ ہوا لیکن اقبال خسروی سے کچھ عرصہ کے بعد یہ بلا دور ہوئی۔ باران رحمت برسا اور سوکھے ہوئے کھیت ہرے ہو گئے اور نہ مناسب اضافہ بھی ہنگامی ضروریات کے لیے کیا گیا تھا منسوخ کر دیا گیا۔

۱؎ حارخیین غلطی۔ ہمایوں نومبر ۱۹۲۶ء۔ (کرمی بشیر احمد صاحب بی۔ اے۔ آکسن) اڈیٹر کا رہین منت ہوں۔ آپنے ازراہ کرم رسالہ مفت عنایت کیا۔

سلطان نے سیاحوں سے سُنا کہ ملک چین میں کاغذ کا سکہ چلتا ہے اس لیے اُس نے بھی مُلک کی اقتصادی حالتوں کو دیکھتے ہوئے سنہ ۷۳۱ھ میں تانبے کا سکہ جاری کیا لیکن ہندوؤں نے کمال کیا جعلی سکّے بنانے لگے جس سے ملک میں جعلی سکوں کا رواج ہوگیا۔ تجارت پر اس تلبیس کا بہت خاصا اثر پڑا۔ بلند اختر شہنشاہ نے اس امتحانی سکّے کو منسوخ کیا اور خزانہ عامرہ سے اُس امتحانی سکّے کے بدلے میں طلائی و نقرئی سکّے دے دیے۔ اسی سال سکندر نشان شہنشاہ کو معلوم ہوا کہ خراسان کی حالت اس وقت بہت نازک ہے۔ کیونکہ ابو سعید امیر خراسان نابالغ تھا اور سلطنت کے امور امیر چوپان سرانجام دیتا تھا۔ اس لیے خراسانیوں نے سلطان محمد تغلق نے درخواست کی کہ وہ خراسان پر قبضہ کرے۔ امیر چوپان ایک حد تک "نواب ناظر" (میجر ڈومو) کی حیثیت رکھتا تھا اس کا محل شاہی پر بہت اثر تھا۔ ابو سعید اس بات کو محسوس کر رہا تھا کہ اتفاق سے امیر چوپان کی حسین و جمیل لڑکی "طاہرہ بیگم" سے ابو سعید کو عشق ہوگیا لیکن امیر چوپان نے اس شادی میں مزاحمت کی سلطان ابو سعید نے امیر چوپان کو گرفتار کر کے گلا گھٹوا کر مروا ڈالا۔ اب ایران میں طوائف الملوکی پھیلنے والی تھی، اور چغتائی سردار ترمشیرین خاں کو حملہ کی ترغیب دلائی گئی اور مصر کے سلطان نے فارس کی شرقی و غربی جانب سے حملہ کا ارادہ کیا۔ سلطان محمد تغلق جو سلطان مصر سے دوستانہ تعلقات رکھتا تھا اُس نے بھی ایک بڑی فوج جو تقریباً تین لاکھ ستر ہزار کے تھی جمع کی جسکو ایک سال تک خزانہ عامرہ سے تنخواہ دی گئی لیکن یہ اتحاد کامیاب نہ ہوا۔ سب سے پہلے مصر کے سلطان نے امداد سے دریغ کیا۔ کیونکہ سلطان ابو سعید سے اُسکے دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے تھے دوسرے چغتائی سردار نے اس حملہ سے کوئی فائدہ تصور نہ کیا۔ تیسرے ترمشیرین کی معزولی سے سارا اتحاد ثلاثہ ختم ہوگیا اور اس طرح ایک غیبی امداد نے ابو سعید کی جملہ مشکلات کو ایک بہت بڑی حد تک کم کر دیا۔ سب سے بڑی وجہ اس عساکر سلطانیہ کو منتشر کرنے کی یہ بھی پیش آئی کہ ہندوکش کے دروں سے اس فوج کا لے جانا مشکل تھا کیونکہ اغیار کے ملک میں رسد کا ملنا کوئی آسان نہ تھا۔ اس لحاظ سے اس حملہ کی کامیابی مشتبہ تھی۔ اور ہندوستان میں تو غیر مسلموں پر فتح حاصل کر سکتے تھے لیکن اپنے ہی ہم مذہب افراد پر ہندوستانی افراد کا حملہ آور ہو کر کامیاب ہونا کارے دارد کے مصداق تھا اس لیے سب سے زیادہ عقلمندی کا فعل جو سلطان کر سکتا تھا وہ یہی تھا کہ اس نے اس بڑی فوج کو منتشر کر دیا۔ کیا دور حاضرہ میں زائد فوجیں منتشر نہیں کی جاتیں؟ اس میں کیا حماقت

تھی جو اس قدر چیخ پکار کی جاتی ہے؟ - اسی سلسلہ میں تسخیر چین پر بھی سلطان کو خواہ مخواہ مطعون کیا جاتا ہے - جملہ مورخین نے بھی غلطی کی ہے وہ اسکو حملہ چین کے پرشوکت الفاظ سے یاد کرتے ہیں لیکن برنی کہتا ہے کہ سلطان کا مقصود جبل قراچل یا قراجل کو فتح کرنا تھا جو ہندوستان اور چین کے سرحدی حدود میں تھا - ابن بطوطہ نے بھی اسکی مسافت دہلی سے دس منزل لکھی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ قراچل غالباً ہماچل (ہمالیہ) ہوگا جو ہند اور چین کے سرحدی علاقہ جات کی سد راہ ہے - یہ حملہ ایک پہاڑی سردار کے خلاف کیا گیا تھا - جس نے دہلی کی سلطنت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا - پہلا حملہ کامیاب ہوا تھا لیکن بارش کے موسم کی وجہ سے افواج منتشر اور غیر نظامی ہو گئیں اور رسد کا ملنا بھی مشکل ہو گیا - افواج میں مختلف امراض پھیل گئے اور سردی کی وجہ سے لوگ مرے بھی - پھر پہاڑی قبائل نے ان افواج کو خوب لوٹا - مگر مقصود اصلی کامیاب ہوا یعنی اُس امیر جبل نے صلح کی اور خراج ادا کرنے پر تیار ہو گیا - یہ بھی ایسا کوئی حماقت کا فعل نہ تھا جس پر موجودہ مورخین محمد تغلق کو بدنام کرتے ہیں - اسی زمانہ میں دار الخلافت کی تبدیلی نے بھی ہندوستان کے متعصب مورخین کے دماغوں میں ہیجان پیدا کر دیا - سلطان نے دکن کے گزشتہ تلخ تجربات کی بنا پر یہ طے کیا کہ دار الخلافت کو کسی وسطی مقام پر ہونا چاہیے تاکہ دکن کی حکومت برقرار رہ سکے اور آئے دن کی بغاوتوں سے نجات ملے - چنانچہ بہت غور و خوض کے بعد وہ اس نتیجے پر پہونچا کہ اعیان مملکت کو سنہ ۱۳۲۷ء عیسوی میں دار الخلافت منتقل کرنے کا حکم دیا - اور دیوگیر کا نام بدل کر دولت آباد (اورنگ آباد) رکھا - اور ایک عالی شان قلعہ تعمیر کیا جو آج بھی شہنشاہ عالی ہمم کی اولوالعزمی اور علو ہمتی کی شہادت دیتا ہے - باکمال افراد آباد کئے اور دولت آباد کو مشرق کا غرناطہ و قرطبہ بنا دیا -

ہندوستان کا ملک آرام طلب فرمانرواؤں کے بس کا نہ تھا - یہاں تو علاء الدین خلجی محمد تغلق، اکبر اعظم، شیر شاہ، اورنگ زیب عالمگیر کے سے جفاکش شہنشاہ محض امن قائم رکھ سکتے تھے - ہندو باشندے اپنے فاتحین کے مذہب و حکومت سے خوش نہ تھے - جس وقت مرکزی حکومت میں کمزوری محسوس کرتے آزادی کی جد و جہد شروع کر دیتے - بادشاہ کی میدان کی شکست اسکی تمام اُمیدوں کو منقطع کر دیا کرتی تھی - اُس وقت نہ تو موٹر تھا اور نہ ریل - نہ لاسلکی اور نہ ایروپلین - بعض صوبجات کی سڑکیں بھی صاف نہ تھیں - شمالی دار الخلافت (دہلی) سے دکن و گجرات کی

باقاعدہ نگہداشت نہ ہوسکتی تھی۔ تیرھویں صدی عیسوی میں دورِ حاضرہ کی طرح بغاوتوں کو فرو کرنے کے لیے کوئی باقاعدہ ضابطہ فوجداری اور قانون اسلحہ ملک میں رائج نہ تھا۔ اور اُس پر طرہ مزید یہ کہ صوبجات کے گورنر (صوبہ دار جملہ لوازمات شاہی برتتے تھے ۔ اور فطرتاً خود مختاری کے آرزومند رہتے تھے۔ جب سلطان محمد تغلق بہاءالدین گشتاسپ کی بغاوت فرو کرنے کے لیے دکن گیا تھا۔ اُسی وقت اُس نے یہ خیال کیا تھا کہ دیوگیر بہترین جگہ ہے۔ یہاں سے دکن کے مفتوحہ علاقہ جات پر آسانی سے حکمرانی ہوسکتی ہے اور یہی وجہ تھی کہ اُس نے دارالخلافت منتقل کرنے کا ارادہ کیا۔ دیوگیر

"کہ در زمانہ راجہ بھوج دھارانگری گفتندے دولت آباد نام نہادہ ....

دارالخلافت کرد ـــــــ"

سلطان نے ہندوستان کی سیاسی فضا کو بخوبی سمجھا تھا۔ اِس لیے اس نے مصالح کی بنا پر دیوگیر کو دارالخلافت بنایا۔ کیونکہ اس عہد فیروزی میں اسلامی حکومت کے خطوط ان حدود تک پہونچ گئے تھے کہ اس سے قبل کسی بادشاہ کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ لیکن اُس عالی تبار شہنشاہ کی حیات کے بعد جو مختلف حصص میں جُداگانہ خود مختار سلطنتیں قائم ہونا شروع ہوئیں۔ وہ اکبر اعظم اور اورنگ زیب عالمگیر کے عہد زریں تک سلطنت دہلی کے جزو سلطنت نہ بنائی جا سکیں۔



ہمکو اقرار ہے کہ محمد تغلق نے دار الخلافت دولت آباد مقرر کیا۔ لیکن یہ بات مسلم ہے کہ کسی ملک کا جغرافیہ جانے بغیر اسکا تاریخی انقلاب سمجھنا مشکل ہے جب تک ایک شخص کو یہ معلوم نہ ہو کہ محمد تغلق کی حکومت کن کن صحراؤں اور کن کن بیابانوں میں تھی۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ دار الخلافت کا منتقل کرنا فعل دانشمندی تھا یا حماقت ؟

اسکی سلطنت تین بڑے حصوں میں منقسم تھی۔

(۱) دوآبہ بنارس و دوآبہ دریائے سندھ و گنگا۔ (موجودہ ممالک متحدہ و پنجاب)

(۲) گجرات۔

(۳) مدراس کمشنری کا موجودہ حصے سے کچھ زیادہ جسمیں دکن کا علاقہ بھی شامل تھا۔

یہ خیال رہے کہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ ہندوستان میں سفر کرنے کا کوئی معقول انتظام نہ تھا رسل و رسائل کا کوئی امکان نہ تھا ضرورت یہ تھی کہ دار الخلافت ایسی جگہ پر قائم کیا جائے کہ جہاں سے ہر طرف کا فاصلہ برابر ہو۔ اور ہر طرف جانے میں آسانی ہو۔ شمالی ممالک کی حالت جنوبی ممالک سے ہر لحاظ بہتر تھی۔ کیونکہ وہاں کی حکومت ایک زمانہ سے قائم اور مستحکم تھی اس خیال کو پیش نظر رکھتے ہوے محمد تغلق نے اپنا وائسرائے (نائب السلطنت) کو شمالی ممالک میں چھوڑ دیا تھا اور خود دکن میں جا کر مقیم ہوا۔ چونکہ یہاں بھی حکومت قائم کرنا تھی۔ پہلے اُس نے صرف سرکاری دفاتر کو منتقل کیا پھر تین سال کے بعد اُس نے یقین کر لیا کہ یہ جگہ سیاسی اغراض کے لیے دہلی سے زیادہ مناسب ہے تو اُس نے دہلی کے تاجر اور دیگر پیشہ وروں سے آنے کی خواہش ظاہر کی اور وہ بہت خوشی سے دہلی سے دولت آباد اپنے نفع پیش نظر رکھتے ہوے چلے گئے کیونکہ دُنیا کا اصول بھی یہی ہے جہاں سرکاری دفاتر ہوتے ہیں وہیں بازار با رونق سے لگتے ہیں۔ دار الخلافت کا منتقل ہونا کوئی تعجب نہیں ہے۔ کلکتہ سے دہلی کی منتقلی۔ یا الہ آباد لکھنو کی غیر سرکاری منتقلی ابھی کل کی بات ہے جس زمانہ میں دفاتر لکھنو سے نینی تال چلے جاتے ہیں لکھنؤ کے بازار کی رونق گھٹ جاتی ہے بس اس سے کچھ زیادہ پیمانے پر دہلی میں محمد تغلق کے عہد میں جو مسرسا رونما ہوئی لوگوں نے حاشیہ چڑھا دیا۔

"یاقوت ہمدانی معجم البلدان میں ایک موقع پر آبادی کا ذکر کرتے ہوے لکھتا ہے اور کیا ٹھیک لکھتا ہے کہ شہر وہیں آباد ہوتے ہیں جہاں بادشاہ رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تجار اور دوسرے

بہت خوشی سے دلی کو خیرباد کہنے کو تیار ہو گئے۔

"پرانے زمانے میں سلاطین کا یہ دستور تھا کہ جب کبھی کوئی نیا شہر بساتے لوگوں کو بلانے سے پہلے اُنکے رہنے سہنے، کھانے پینے، اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے غرضکہ تمام ضروریات کے سامان مہیا کر لیتے۔ پھر لوگوں سے شہر بسانے کی خواہش کرتے۔ محمد تغلق نے بھی یہی کیا۔ یہ ہمیشہ کامیاب ثابت ہوا۔ محمد تغلق بھی ناکام نہ رہ سکتا۔ کیونکہ عوام یہاں پر خوشی سے بسنے کے لیے آمادہ اور تیار تھے لیکن اُنکی ہمتیں آب و ہوا کی خرابی نے پست کر دیں اور وہ تجارتی مفاد کو امیدِ صحت پر قربان کر کے بادل ناخواستہ واپس چلے گئے۔ یہ کہنا ظلم نہیں بلکہ جہالت ہے کہ جب بادشاہ نے دہلی کی حالت خراب دیکھی تو اُسکا دل بھر آیا اور اُس کو دوبارہ آباد کرنے کی سوجھی جیسا کہ مؤرخین کا خیال ہے۔

"اس مجنوں کا ایک جرم یہ بھی تھا کہ اُس نے تانبے کے سکے جاری کیے۔ اسکے متعلق ہمکو صرف اس قدر کہنا ہے کہ اُس زمانے میں نہ ہندوستان کی بیشمار کانوں کا پتہ چلا تھا اور نہ غیر ممالک سے سونا چاندی آنا بہت آسان تھا کیونکہ ہر ملک اسکی کمی محسوس کر رہا تھا تو بتائیے یہ مجنوں بادشاہ اتنی مقدار میں سونا چاندی کہاں سے لاتا کہ سارے ہندوستان کے کاروبار میں کوئی رکاوٹ نہ پیدا ہوتی۔ آج بیسویں صدی میں اگر کوئی شخص تانبے، نکل اور کاغذ کے سکوں پر اعتراض کرے تو اُسے احمق کہہ دیا جائیگا لیکن محمد تغلق کے زمانے کے مورخ تانبے کا سکہ چلانے کو جنون کی علامت کہتے ہیں۔ تجارتی کاروبار کو عروج دینے کے لیے ضرورت تھی کہ ایسی چیز کے سکے رائج کیے جائیں جو آسانی سے مہیا ہو سکتی ہو۔ تانبا ہندوستان میں بکثرت پایا جاتا تھا اور گویا اُس نے ایک بیکار چیز سکوں کی صورت میں ڈھال کر ایک باکار چیز بنا دی اور اس طرح ملک کی دولت میں ایک خاص اضافہ کر دیا۔ اکثر مورخین کاغذ کے سکے کو تانبے پر ترجیح دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کاغذ اس سے کہیں اچھا ہوتا۔ مگر یہ بھی جاننا چاہیے کہ اسی زمانے میں ملک فارس میں بہت بڑا نقصان محض کاغذ کے سکوں کی وجہ سے ہو چکا تھا۔ ایک غلطی جسکا اعتراف ہر منصف مزاج کریگا صرف یہ تھی کہ اُس نے سکوں پر کوئی نشان نہیں بنایا تھا جسکی وجہ سے ہر گھر خزانہ ہو گیا لیکن یہ کوئی اہم بات نہیں اس زمانے میں سکوں کی قیمت اُسی قدر ہوتی تھی جتنی کہ مالیت سکے میں ہوتی تھی۔ آج کل نقد نام ہے سکوں کا اُس زمانہ میں نقد سونے چاندی کو کہتے تھے۔"[1]

---

[1] حاتم علی غلطی، ہمایوں نومبر ۲۶ء م۔

حکیم فقیر حسین عظیمؔ

(جناب منظر عباس صاحب ہیڈماسٹر سھولی ایم' ای اسکول)

ہم آج قارئین "ادب" کو ایک ایسی ہستی سے روشناس کراتے ہیں جو صوبہ بہار کے اُردو شعرا کی صف میں ایک خصوصی حیثیت رکھتی ہے اور "اُردو شاعری" کے صنف "مرثیہ گوئی" میں سلاست اور فصاحت سے یکساں طور پر خراج تحسین وصول کر چکی ہے۔ یہ ہستی حکیم فقیر حسین مرحوم عظیمؔ کی ہے جنکو خدائے سخن حضرت دبیرؔ اعلی اللہ مقامہٗ کے ارشد تلامذہ ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔

حکیم صاحب مرحوم کا وطن صوبہ بہار کا وہ مردم خیز قصبہ حسین گنج تھا جو کچھ سال پہلے علوم مشرقی کے مرکز ہونے کا فخر حاصل تھا۔ آپ کا خاندان گنتی کے اُن خاندانوں میں سے ہے جو علم پروری اور ہنر نوازی میں اپنی آپ نظیر تھے اور جنکی ہر فرد بہترین انشا پرداز زبردست ادیب اور اعلیٰ نکتہ سنج تھی۔ ایک اعلیٰ خاندان کے اعلیٰ رکن ہونے کی حیثیت سے مرحوم بھی علوم و فنون میں بدرجہ اتم ممتاز تھے۔ آپ شاعری و طبابت کی جان اور انشاپردازی و خوشنویسی کا معدن کہا جا سکتا ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ آپ اُن چند شعرا میں سے تھے مرثیہ گوئی جنکی شرمندۂ احسان ہے۔

آپ کا کلام حسب ذیل خوبیوں سے مملو نظر آتا ہے۔

(۱) حشو و زوائد سے بری، مغلق تشبیہات و پیچ در پیچ استعارات سے بیگانہ، محاورات کے تصرف بیجا سے غیر مانوس، معنوی محاسن کا حامل اور صوری خوبیوں کا آئنہ دار ہے۔

(۲) الفاظ کی شوکت، بندش کی چستی، خیالات کی روانی اور روزمرہ کی سلاست اسکی خصوصیات

میں سے ہیں۔

(۳) روایات کی پابندی اور صحیح حدیثوں کا التزام اس میں عالمانہ اور محققانہ شان کے ساتھ بدرجۂ اتم موجود ہے۔

(۴) ممدوح کے حفظ مراتب کا خیال اور اسی کے شایاں استعارات کا استعمال اسکے لیے طرۂ امتیاز ہے اور غالباً اس صفت میں آپ اپنے اُستاد سے کسی طرح پیچھے نہیں اور جس طرح ایک فرزند خلف کے لیے کہا جاتا ہے کہ اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ۔ اسی طرح آپ کے لیے بھی غلط نہ ہوگا۔ اگر کہا جائے کہ اَلتِّلْمِیْذُ سِرٌّ لِاُسْتَاذِہٖ۔

اب اس اجمال کی تفصیل کرنے کے لیے میں کچھ نمونے آپکے کلام کے ہدیۂ قارئین کرتا ہوں۔

"گر قبول افتد زہے عز و شرف"

آپ کا ایک مرثیہ جسکا مطلع "اے آفتاب نظم سخن ضوفشاں ہو آج" ہے مندرجہ بالا خوبیوں کا بہ یک وقت حامل ہے جسکے بند مختلف مقامات سے عرض کیے جاتے ہیں۔ ؎

اے آفتاب نظم سخن ضوفشاں ہو آج　　نقطے نجوم ہوں جو خدا مہرباں ہو آج
رفعت میں انجمن کی زمیں آسماں ہو آج　　پیری میں آسماں بھی سرنو جواں ہو آج
فوق السما چڑھا ہوا مصرع نظر پڑے
تحت الثریٰ پہ نظم ثریا اُتر پڑے

ہاں طبع شکر چاہیے منعم کا ہر زماں　　جس نے عطا کی نعمت غطمیٰ پے زباں
میں کیا تھا پر یہ اسکے ہیں الطاف بیکراں　　ذرے کو آفتاب کیا ہو کے مہرباں
رفعت تو ذہن کو دی طاقت زباں کو دی
رونق مرے سخن کو فصاحت بیاں کو دی

ہوتا ہے زندہ دل یہ فصاحت بیاں میں ہے　　اعجاز عیسوی مرے طرز بیاں میں ہے
جوش و خروش بحر کا طبع رواں میں ہے　　نسنہ میں زباں کہ ماہی کو نرد ہاں میں ہے
تقریر میری فیض شہ نامدار سے
بے شک لڑی ہے ساکن شاہوار سے

شروع سے لیکر آخری بند تک دیکھ جائیے کلام کی کل خوبیاں اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں معصوم کی مدح کرنے والی زبان کی کیا سچی تعریف کی ہے۔ ع منہ میں زباں کراہی کوثر دہاں میں ہے

کچھ اس میں گفتگو ہے نہ کچھ قال و قیل ہے | تصنیف میں مری مدد حق کفیل ہے
بے شک ہر کلام سخن بے عدیل ہے | حسن قبول نظم کی یہ اک دلیل ہے
جس نے سنا کلام وہ دل شاد ہوگیا
نکلا ادھر زباں سے اُدھر یاد ہوگیا

ہے برج جسکی نور وہ معراج آج ہے یہ نظم | رحمت خدا کی برسر اوج آج ہے یہ نظم
چوتھے فلک کے واسطے معراج ہے یہ نظم | مدح شبیہ صاحب معراج ہے یہ نظم
شہرہ ہر ایک شعر کا چرخ بریں پہ ہے
مصرع ہے آسماں پہ مہ نو زمیں پہ ہے

ع نکلا ادھر زباں سے اُدھر یاد ہوگیا“ کتنی سچی دلیل حُسن قبول کی ہے جو اتنے صاف روزمرہ میں پیش کی گئی ہے۔ پھر فرماتے ہیں۔ ؎

چوتھے فلک کے واسطے معراج ہے یہ نظم | مدح شبیہ صاحب معراج ہے یہ نظم

چوتھے فلک پر حضرت عیسیٰ ہیں مگر سرور عالمؐ ان سے بلند پایہ ہونے کے سبب معراج پاکر قاب قوسین تک پہونچ چکے ہیں حضرت اکبر جو شبیہ سرور عالمؐ ہیں اگرچہ اس پایہ کے نہیں کہ مثل حضرت کے معراج پاتے مگر شباہت کے لحاظ سے معاً حضرت عیسیٰ پر فوق رکھتے ہیں اس لئے انکی مدح بھی اسی ٹکر کی ہونی چاہیے اسی نقطۂ نظر سے اس شعر کو دیکھیے کیا اُگتا ہوا مضمون ہے۔ پھر مصرع ہے آسماں پہ مہ نو زمیں پہ ہے“۔ کس خوبی کا حامل ہے۔ اسکی سخن فہم حضرات معقول داد دینگے۔

مضمون روایت کس نہج پر آپ نے نظم کیا ہے اسکی مثال کے لیے ملاحظہ ہو۔

راوی بیان کرتا ہے اک عہد کا یہ حال | اکبر کو صغر سن میں ابھی پانچواں تھا سال
مسجد میں ایک روز تھے سلطان خوشخصال | یعنی حسینؑ سبط نبی نور ذوالجلال
اکبر بھی تھے قریب پدر جا کے صدر میں
پرتو فگن ہلال تھا پہلوئے بدر میں

اصحاب خاص وعظ پہ دل تھے دیئے ہوئے — سب ساغر ولائے محبت پیئے ہوئے
انجم تھے گرد بدر کے ہالہ کیے ہوئے — لب پر درود ہاتھوں میں سبحہ لیے ہوئے
دل سب کے تھے بھرے ہوئے عیش و سرور سے
روشن تھی انجمن شہ والا کے نور سے

مو زیارت علی اکبر تھے سب کے سب — گویا کہ دیکھتے تھے جمال رسول رب
بولا وہ روح پرور شاہنشہ عرب — اس وقت ہے کمال ہمیں خواہش عنب
انگور تازہ آپ سے جب تک نہ پائیں گے
بابا نہ گھر کو جائیں گے نہ کھانا کھائیں گے

انگور کی نہ فصل تھی نہ موسم بہار — منگوائیں شہ کہاں سے عنب بہر گلعذار
اصرار غنچہ رو کا تھا حضرت سے بار بار — نزدیک تھا کہ نور نظر ہوئے اشکبار
کیا پیار تھا شبیہ رسالت مآب پر
صدمہ ہوا دل شہ عالی جناب پر

سوئے ستوں جو دست مبارک بڑھا دیا — اک جا پہ ہاتھ تاک کے شہ نے لگا دیا
گویا درخت اسکو عنب کا بنا دیا — معجز نمانے معجزہ تازہ دکھا دیا
مٹھی کو ہاتھ پھیر کے جس وقت وا کیا
انگور تازہ تازہ پسر کو عطا کیا

اس کے بعد شہزادے کا سراپا نظم کیا ہے جسکے چند بند عرض کیے جاتے ہیں۔ ؎

جاں مومنوں کی یوسف شبیر پر نثار — آ جائے جان مُردوں میں تقریر پر نثار
مہر منیر چاند سی تصویر پر نثار — ماہ دو ہفتہ چہرہ کی تنویر پر نثار
قد کو شرف ملا ہے عجب کائنات میں
مثل اذاں بلند ہے قامت صلوات میں

قد قامت الصلوٰۃ کو کیا خوب نباہا ہے۔ اس میں قامت دلجوئے اکبر کی تشبیہ اذان سے دے کر عجیب حسن پیدا کر دیا ہے۔ اکبر صبح عاشور فوج خدا کے مؤذن تھے اسی کی مناسبت سے اذان کا

ملازمہ یہاں بے حد موزوں ہے ۔ ؎

ابرو کا وصف عارفِ حق کرتے ہیں قم　　اللہ رے شوق طاعتِ معبودِ ذوالکرم
پلکیں ہیں یا نمازیوں کی ہیں صفیں بہم　　دنیا میں اس طرح کی جماعت بھی دیکھی کم
ابرو کے نیچے دیکھ لو روشن ہے خال بھی
محراب کعبہ بھی ہے موذن بلال بھی

چشمان نورِ عین شہنشاہ خوش لقب　　بے شبہ ہیں بعینہ چشم رسول رب
چشم امید رکھتے ہیں ان سے جہاں ہیں سب　　ہے چشم میں سفیدۂ صبح و سوادِ شب
دونوں کا ایک مقام میں کیا ربط نیک ہے
ہے صبح عید ایک شب قدر ایک ہے

بینیٔ پاک مخزنِ نور اکہ ہے　　روشن ہے شمع طور تجلی گواہ ہے
ابرو یہ اور آنکھوں یہ سب کی نگاہ ہے　　لو حاجیوں کے واسطے یہ سیدھی راہ ہے
محراب بیت خالق عالم کو دیکھ لیں
کعبہ کو جائیں چشمۂ زمزم کو دیکھ لیں

مندرجۂ بالا بندوں میں از ابتدا تا انتہا یہ بات نمایاں طور پر ظاہر ہوتی ہے کہ کہیں کوئی ایسی تشبیہ نہیں جو مشبہ کی شان سے گرتی ہوئی نظر آئے۔ بندشیں بجائے خود چست ہیں اور کہیں سے ربط کا دامن نہیں چھوٹتا۔ بند چہارم کے مصرعے

ابرو یہ اور آنکھوں یہ سب کی نگاہ ہے　　لو حاجیوں کے واسطے یہ سیدھی راہ ہے

تعریف سے مستغنی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابرو اور آنکھ یہ دو چیزیں ایسی ہیں جو حسن و جمال میں چار چاند لگا دیتی ہیں اور شعرا انھی کی تعریف میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیتے ہیں۔ عام طور پر تمام اعضائے انسانی میں انھی دونوں کے تناسب کا زیادہ لحاظ کیا جاتا ہے اس معنی سے شاعر نے مصرع اولیٰ نظم کیا ہے۔ اب اس کو اصل بند میں رکھ کر پڑھیے کچھ اور حسن دکھائی دیتا ہے۔

بینی پاک مخزن نور اکہ ہے　　روشن ہے شمع طور تجلی گواہ ہے
ابرو یہ اور آنکھوں یہ سب کی نگاہ ہے　　لو حاجیوں کے واسطے یہ سیدھی راہ ہے
محراب بیت خالق عالم کو دیکھ لیں　　کعبہ کو جائیں چشمۂ زمزم کو دیکھ لیں

وب"

قاعدہ ہے کہ مسافر ہمیشہ اپنی نگاہ منزل مقصود پر رکھتا ہے گرد و پیش کا ماحول اُس کو متاثر نہیں کرتا۔ ایک حاجی کو حج کی دُھن میں سوائے کعبہ کے کوئی دوسری چیز سوجھائی نہیں دیتی۔ اس قاعدے کا لحاظ کرتے ہوئے شاعر نے شعر میں مستقل معنویت پیدا کر دی ہے۔

روشن ہی جس سے طور وہ پر نور سینہ ہے — سینہ ہے یا کہ دُرِ نجف کا نگینہ ہے
نام خدا ہے ذکرِ خدا کا خزینہ ہے — اس سینہ سے غضب ہے لعینوں کو کینہ ہے

اہل ستم کا مقصدِ بیجا تو دیکھیے
زخمی کریں گے اس کو کلیجا تو دیکھیے!

"کلیجا تو دیکھیے" کا ٹکڑا غضب کا ہے۔ پھر سینے کی تشبیہ درِ نجف کے نگینے سے اپنے دامن میں کتنی لطافتیں پنہاں کیے ہوئے ہے۔

سراپا کے متعلق بہتیرے بند ایسے ہیں جن کو میں نے بخوف طوالت چھوڑ دیا ہے۔ سب کے سب اپنی جگہ پر بے نظیر ہیں اور لطف یہ ہے کہ ان میں ہر جگہ عبادت خدا کا ملازمہ موجود ہے جو شاعر کی قادر الکلامی کا بین ثبوت ہے۔

اس کے بعد حضرت علی اکبرؑ کی رخصت امامؑ سے ملاحظہ ہو۔ اس میں روایت کی پابندی کا مصنف مرحوم نے جو التزام رکھا ہے وہ خاص طور پر قابل غور ہے۔

تمہید ملاحظہ ہو:—

یہ حسن یہ جمال یہ تصویر بے مثال — یہ آمدِ شباب یہ شیرینیٔ مقال
قابل ترس کے ہو بخداوند ذوالجلال — افسوس تازگی میں کٹے گا یہ نونہال
عرصہ نہیں، اُجڑنے کو ہے گھر بسا ہوا
در پر کھڑا ہے خیمہ کے گھوڑا کسا ہوا

جب سے فلک پہ چاک گریباں سحر کا ہے — در پیش داغ شاہ کو ہر اک قمر کا ہے
صرفِ خزاں یا ض شہ بحر و بر کا ہے — گلگوں لہو سے جسم ہر اک سیمبر کا ہے
دنیا میں تھے جو ناز و نعم کے پلے ہوئے
ہے ہے جُدا ا نھیں کے بدن سے گلے ہوئے

شاہِ امم کی گود کے پالے ہوئے تھے سب — گرمی میں مارے پیاس سے سوکھ گئے تھے لب
پانی نہ وقتِ ذبح ملا ان کو ہے غضب — لاشیں اٹھائیں خود شہِ دیں نے بصد تعب
ہوش و حواس دیکھنے والوں کے کھو گئے
لاشیں اٹھا اٹھا کے ضعیف اور ہو گئے

ان صدموں سے تھا اگرچہ دلِ شاہِ بحر و بر — اب بھائی کا تو داغ ہے سب سے زیادہ تر
اس غم سے جواب دے گئے سب شہ کے بحذر — بازو کا زور۔ نورِ نظر۔ قوتِ جگر
کہتے ہیں دل سے ہم بھی جہاں سے گزر گئے
کیوں اے حسین! کیا ہوا عباس مر گئے!

محشر تھا اس بیان سے خیمے کے درمیاں — تھراتی تھی زمین لرزتے تھے آسماں
ڈیوڑھی سے نکلے حضرتِ اکبر بھی ناگہاں — گردن پہ سر جھکا ہوا اشک آنکھ سے رواں
دنیائے بے ثبات سے منہ اپنا موڑ کے
آئے قریب باپ کے ہاتھوں کو جوڑ کے

دیکھا سوئے امامِ ہدا اور رو دیے — شہ کو دکھایا خشک گلا اور رو دیے
قاسم کا گاہ نام لیا اور رو دیے — چلائے گاہ ہائے چچا اور رو دیے
کی عرض اب تو صدموں کی کچھ انتہا نہیں
گھر صاف ہو گیا کوئی باقی رہا نہیں

غیرت کے ہے خلاف کہ اکبر نہ سر کٹائے — سب کام آئیں آپ کے۔ بیٹا نہ کام آئے
فرزند سے پدر کا نہ حق کچھ ادا ہو ہائے — بابا رضا جو دیجیے تو آبرو نہ جائے
اب تو ہمیں بھوک ہے بابا نہ پیاس ہے
رخصت کے واسطے دلِ اکبرؑ اداس ہے

حضرت علی اکبر کی اس تمہید کے بعد امام نے آپ کو رخصت کر دیا۔ مگر ذرا اس وقت امامؑ کی حالت ملاحظہ کیجیے اور اس کو روایت سے مطابق کیجیے۔

گھر سے چلا مرقعِ عزم یوں خدا گواہ   جو ملنے لگا مزارِ رسولِ فلک پناہ
آگے جوانہ مرگ پسر پیچھے باپ آہ   اور شہ کے پیچھے برہنہ سر اہلبیتِ شاہ
دریائے اشک آنکھوں سے عابد کے بہہ گئے
طاقت نہ تھی جو اُٹھے تو تھرا کے رہ گئے

آئے قریب ڈیوڑھی کے جب شاہِ دیں یار   اہلِ حرم کو ڈیوڑھی میں روکا بحالِ زار
خود نکلے تھامے بازوئے فرزندِ گلعذار   رہوار پر پسر کو کیا آپ نے سوار
پر ہائے جب فرس پہ پسر کو چڑھا دیا
پردہ درِ خیام کا شہ نے گرا دیا

یوں حق سے عرض کرنے لگے شاہِ تشنہ لب   بیکس پہ جو ستم ہیں وہ تجھ پہ عیاں ہیں سب
یارب وہ گھر سے جاتا ہے مرنے کو رن میں اب   جو سر سے تا قدم ہے شبیہِ رسولِ رب
صورت وہی جمال وہی خلق و خو وہی
لہجہ وہی زبان وہی گفتگو وہی

اسکا تو ہی گواہ ہے اے ربِ مشرقین   تیرے نبی کا ہوتا تھا مشتاق جب حسین
آتا تھا دیکھنے سے اسی مہ جبیں کے چین   نانا رسول کا تھا مرقعِ نورِ عین
باقی ہے مصطفےٰ کی نشانی جہان سے
لہجہ سنونگا نانا کا کس کی زبان سے

آخری دو بندوں میں کس سلاست کے ساتھ لفظ بلفظ مضمون روایت کا ترجمہ کر دیا ہے۔
طوالت کے خوف سے بقیہ بندوں کو چھوڑتا ہوں اور اب کچھ بند آمدِ اکبر کے پیش کرتا ہوں۔

آمد ہو رن میں اکبرِ عالی وقار کی   کانپے فلک زمیں ہلی کارزار کی
تھرائی قبر بہمن و اسفندیار کی   رنگت ہوئی سیہ سپہِ نابکار کی
غل تھا ستارے ٹوٹینگے چرخِ بریں سے آج
اُڑ کر فلک پہ جائینگے طبقے زمیں کے آج

شیروں کے ہوش ڈر سے ہرن میں کچھار میں — پانی میں ہیں نہنگ مگر اضطرار میں
آہو خرد رمیدہ ہیں وحشت تتار میں — بھولے ہیں چوکڑی کو فرار و قرار میں
اب آبرو نہیں لبِ دریا کی فوج کی
[illegible] جھلکی ہے لالہ رموتی ہے تیغوں سے موج کی

اب نوبت و دہل نہیں نقار خانوں میں — تکبیر کی صدا ہے فقط اب اذانوں میں
بہرِ رکوع خم ہے نمایاں کمانوں میں — ہے قد کی زور راستی پہ قامت سنانوں میں
آمد ہے رن میں نورِ نگاہِ امام کی
محرابِ تیغیں بن گئی ہیں فوجِ شام کی

بتخانے کافروں کے سراسر شکستہ ہیں — زنار۔ صورت دل کافر شکستہ ہیں
دلِ کفر سے بتوں کے برابر شکستہ ہیں — لات و منات و عزیٰ کے بھی سر شکستہ ہیں
رونق تمام دینِ رسولِ زمن کی ہے
نامِ خدا دہائی شہِ بت شکن کی ہے

لشکر میں چار سمت تلاطم ہے آشکار — ساحل پہ سر پٹکتی ہیں موجیں باضطرار
چکر میں بخت ہیں کہ بھنور میں ہیں نابکار — ہے شور مچھلیوں میں کہ اب زندگی ہے خوار
سوتا تھا گو نہنگ مگر ڈوبا جاگ کے
دریا کنارا رن سے لگا کر کے بھاگ کے

مؤیدِ حق ہے اکبرِ نیکو لقب کے ساتھ — غصے میں آپ آتے ہیں قہر و غضب کے ساتھ
اجلال و احتشام ہیں آگے ادب کے ساتھ — گردوں بھی افتخار سے آتے ہیں۔ دب کے ساتھ
اقبال تھامے آتا ہے حلقے رکاب کے
سرعت قدم کو چوم رہی ہے عقاب کے

تلوار اور گھوڑے کی تعریف میں جو کچھ آپ نے فرمایا ہے اسکے چند بند ذیل میں درج کر کے اس مضمون کو فی الحال ختم کیا جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ آپکی شاعری پر تفصیلی مضمون لکھا جائے۔ بشرط فرصت

انشاءاللہ حاضر کرونگا۔ صورت موجودہ میں جو کچھ عرض کیا گیا کچھ نہ ہونے سے اسکا ہونا بہتر ہے۔
اشعار ملاحظہ ہوں :۔

حیرت میں اسکی کاٹ سے اہل ہنر رہے ثابت نہ تن رہے نہ کسی تن پہ سر رہے
سینے رہے نہ سینوں کے اندر جگر رہے جوہر نہ خنجروں کے نہ تیروں کے پر رہے
آتش سے آب تیغ دودم کو جولاگ تھی
بادل میں برق اور نہ پتھر میں آگ تھی

بادل پہ تیغ چمکی تو بجلی میں دم نہ تھا سیدھا فلک پہ کاہکشاں کا علم نہ تھا
گردوں کو بھی سکون کہیں ایک دم نہ تھا تیغوں میں راستی نہ تھی تیروں میں خم نہ تھا
ہیبت سے اسکی آگئے سب انقلاب میں
صحرا چھپا تھا ذرے میں دریا حباب میں

تلوار بےمثال تھی رہوار لاجواب بادل ہوا پہ، دھوپ میں سیماب تھا عقاب
موج رواں تھا نہر میں موج میں پیچ و تاب پانی میں شعلہ آگ کا آتش میں سیل آب
سورج تھا دن کا چلنے میں اور چاند رات کا
کاوے کا آسمان زمیں تھا ثبات کا

دریا کا تھا نہنگ تو ضیغم کچھار کا طاؤس تھا چمن کا تو آہو تتار کا
گلشن کا تھا نسیم چمن تھا بہار کا آندھی چڑھاؤ کا تھا تو پانی اُتار کا
چلنا غضب تھا توسن گیتی نورد کا
سرعت سے تھا آنکھوں میں سرمہ نہ گرد کا

آہو کی جست شیر کی چتون پری کی چال طاؤس کا خرام تو کبک دری کی چال
معشوق کی تھیں شوخیاں عشوہ گری کی چال بشدیز چرخ چل نہ سکا ہمسری کی چال
ناکند نوجواں ہے یہ پوچھو سواروں سے
اور سبزہ فلک کسی ہے ستاروں سے

... ...

چھوٹی سی تنگ تو تھی محکم کلائیاں — باریک جلد شانوں کی اور چوڑی ہڈیاں
سینہ کشادہ غنچوں کی صورت کنوتیاں — دشمن جو دیکھے سینے پہ چل جائیں برچھیاں
گنڈہ گلے میں کلغیٔ زیبا ہے فرق پر
صدقہ ہلال و سنبلہ ہے زرق برق پر

سرپٹ چلا ... تو گرد ... سرک گئے — ... جو ٹاپ طبقے زمیں کے تھلک گئے
ذرّے زمیں کے جو اُڑے تا فلک گئے — ہیکل ہلی تو دن کو تارے چمک گئے
رن کی زمیں پہ چار سموں کے کمال تھے
تھے بدر سیکڑوں تو ہزاروں ہلال تھے

غزل جناب سید لیاقت علی صاحب تاباںؔ بدایونی

چھیڑ اے سازِ جنوں نغمۂ حرماں کوئی — کچ ثابت نہ رہے تارِ گریباں کوئی
کیف خود رفتگی ذوقِ تماشا مت پوچھ — بن گیا ہے ہمہ تن دیدۂ حیراں کوئی
ذرے ذرے سے عیاں ہوتا ہی حُسن خود بیں — نہیں چھپتا نہیں چھپتا کسی عنواں کوئی
حیرت جلوہ گہِ ناز کا عالم مت پوچھ — دم بخود ہے کوئی۔ انگشت بدنداں کوئی
جلوۂ ہستی موہوم ہے تصویر فریب — ہے یہ وہ نقش کہ جسکا نہیں عنواں کوئی
حرم و دیر میں پھرتے رہے اک عمر عبث — جلوہ افروز تھا نزدیک رگِ جاں کوئی
عشق احساس کم و کیف سے بیگانا ہے — عاشقی یہ ہے کہ حرماں نہ ہو ارماں کوئی
کر دیا قید تعین سے جنوں نے آزاد — نہ بیاباں نظر آتا ہے نہ زنداں کوئی
دل ہے اور کیف فراوانیِ سامانِ جنوں — اب نہ حسرت کوئی باقی ہے نہ ارماں کوئی
سخت جانی کا بُرا ہو کہ نکلتا ہی نہیں — دم بھی لے موت ہی منجملہ ارماں کوئی
چشمِ خونبار کو صرفِ چمن آرائی کر — شاید آ جائے پئے سیرِ گلستاں کوئی
طے ہوئی منزلِ عرفانِ جنوں اے تاباںؔ — اب کوئی دشت ہی باقی نہ بیاباں کوئی

حصۂ نسواں

اسلامی خواتین ہند کے گزشتہ و موجودہ تمدن و معاشرت پر ایک نظر

(محترمہ فاطمہ بیگم صاحبہ منشی)

انتزاع سلطنت اودھ کے قریب مغربی خواتین کو محلسراؤں میں کسی قدر تقرب حاصل ہونے لگا تھا اس وقت کی بیگمات ان فرنگیوں کے تقرب پر برافروختہ ہوکر ان کو طنزاً "لال منھی" اور دیگر نسوانی وصف اضافی سے یاد کیا کرتی تھیں لیکن ان غریبوں کو یہ خبر نہ تھی کہ عنقریب ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جب کہ ہندوستان بالخصوص مسلم قوم کے افراد پر مغرب کا ایسا اثر پڑیگا اور وہ مغربی تمدن کے ایسے دلدادہ ہو نگے کہ وہ اپنے نیم تعلیم یافتہ اخلاف کو کندۂ ناتراشیدہ یا تودۂ خاک سے بہتر نہ سمجھینگے۔ یہ ضرور ہوا کہ جس طرح مسلمانوں کے تمدن سیاسیات معاشرت اور تمام دیگر امور میں انحطاط و زوال آتا گیا۔ اسی طرح ان کی مستورات میں تعلیم بھی مفقود ہوتی گئی۔ لیکن یہ کسی طرح قابل قبول نہیں کہ مسلم خواتین میں کبھی تعلیم تھی ہی نہیں اور اب اُسکی ترویج ہوئی ہے۔ مسلمانوں میں تعلیم نسواں ہمیشہ سے تھی۔ ہاں موجودہ تعلیم مغربی نہ تھی۔

شیوع اسلام اور زمانہ جاہلیت میں عورتیں اپنی مادری زبان عربی میں بے حد قابل اور نہایت عمدہ شاعرہ ہوتی تھیں جیسے اشعار وہ برجستہ موزوں کرتی تھیں اب غور و خوض کے بعد بھی مشکل ہوتا ہے۔ وہ برابر اپنے مقتول اعزا کے مرثیے کہتیں اور جوش انتقام کو مشتعل کرنے کے لیے ایسے اشعار نظم کرتیں جو سمند غیرت و حمیت کے لیے تازیانہ ہوتے تھے۔ وہ میدان جنگ میں اپنے پرجوش اشعار سے ہمت افزائی کرتی تھیں۔ یہ فن چند ہی عورتوں تک محدود نہ تھا بلکہ تمام ملک ایسی مایۂ ناز مستورات سے بھرا ہوا تھا۔ ان میں

ذلفا حضرت زینب خواہر سیّد الشہدا دربآب زوجہ امام حسین علیہ السلام سلمہ بہت مشہور ہیں - اس وقت کی فصاحت وبلاغت کا سچا نمونہ بہترین زنان عالم البضعۃ الرسول جناب فاطمۃ الزہرا کا وہ مشہور ومعروف خطبۂ " طہ " ہے جو آپنے مسجد خیر الانام میں تمام اہل اسلام کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا تھا - خلفائے بنی اُمیہ وبنو عباسیہ کے زمانے میں بھی ایسی ہی زیور علم وادب سے مزین مستورات موجود تھیں - جن کی بیعدیل قابلیت قابل تقلید تھی - چنانچہ عبدالرحمن سویم کے زمانے میں عائشہ وصفیہ اور ایک کنیز مزنہ بے حد شیریں کلام اور پرگو شاعرہ تھیں - جب کہ شروع شروع اسپین میں اسلامی سلطنت قائم ہوئی ہے اس زمانہ میں شاہ اندلس کے محل میں ایک حسین وجمیل لڑکی فاطمہ نامی تھی جو 'صرف'، 'نحو'، حساب اور دیگر علوم میں طاق تھی اسکا خط بے حد نظر فریب تھا - یہ لڑکی شاعرہ بھی تھی اور اپنے اعلیٰ کلام سے بڑے بڑے چیز فہموں سے خراج تحسین وصول کرتی تھی - دوسری لڑکی خدیجہ موسیقی میں اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی -

اسی بدنصیب ہندوستان میں شاہان مغلیہ کے وقت میں تعلیم نسواں کو جس قدر فروغ تھا وہ محتاج بیان نہیں - بیگمات مغلیہ کے کارنامے آسمان علم وادب پر ماہ وانجم بن کر چمکے - آج بھی تاریخ کے صفحات پر ان کے لازوال نام سنہری حرفوں میں نمایاں ہیں - چونکہ وہ خود انتہائی علم دوست ہوتی تھیں اس لیے سارا ملک تعلیم کی روح افزا صداؤں سے گونج رہا تھا - بادشاہوں کو تعلیم کا اس قدر خیال رہتا کہ جہاں شہزادیاں سات آٹھ سال کی ہوتیں وہ پہلے ایک بوڑھی لائق معلمہ کے سپرد کردی جاتیں جو انھیں مذہبی تعلیم کے زیورات سے مرصع کرتی - اُس سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ ایسے بلند پایہ وبیعدیل اُستاد سے دیگر علوم حاصل کرتیں جو اپنے فرائض نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے -

جہاں آرا بیگم کے کارناموں پر تاریخ ناز کرتی ہے - ان مخدرہ کی عربی وفارسی انشا پردازی بڑے بڑے حضرات کو حیرت زدہ کردیتی تھی - وہ نثر کی زبان کی بھی ماہر تھیں - فن شاعری جو علوم ادبی کے خزانے کا جوہر بے بہا ہے انھیں قدرت کی طرف سے عطا ہوا تھا وہ فارسی اور عربی میں طبع آزمائی کرتی تھیں - اُنکا کلام درس اخلاق اور حمد ونعت سے مملو ہوتا تھا - انتہائی دانشمندی وعلم دوستی اور سادگی مزاج کی وجہ سے شاہجہاں کی بے حد عزیز اور پیاری لڑکی تھیں - دنیا اور اُسکے جاہ وحشم کو ہیچ سمجھنے کا پتہ اُنکے اس شعر سے چلتا ہے جو کہ خود اُنکی خواہش کے مطابق اُنکی قبر پر کندہ ہے ؎

بغیر سبزہ نپوشد کسے مزار مرا
کہ قبر پوش غریباں ہمیں گیاہ بس است

قدسیہ بیگم زوجہ محمد شاہ اُردو کی اچھی شاعرہ تھیں۔ آسمان علم و ادب کی مہر منور زیب النسا بیگم کے نام سے تو ہر شخص کم و بیش واقفیت رکھتا ہے۔ مُلّا سعید مُلّا اشرف جیسے فاضل جیّد ان کے اُستاد تھے وہ فارسی اور عربی میں یدطولیٰ رکھتی تھیں، وہ زبردست شاعرہ تھیں۔ اُنکا تخلص مخفی تھا، اگرچہ کلام زمانہ کی دستبرد کی وجہ سے برباد ہوگیا۔ پھر بھی انکے مختلف اشعار و قطعات زبان زد خاص و عام ہیں۔ دربار میں بڑے بڑے علما و فضلا موجود ہوتے اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ مشہور ہے کہ اس شہزادی نے ایک عظیم الشان کتب خانہ بھی قائم کیا تھا جس میں ہزاروں کی تعداد میں بے نظیر کتابیں تھیں۔ گلبدن بیگم نے جو ہمایوں نامہ لکھا ہے وہ ادبی و تاریخی لحاظ سے اپنا آپ نظیر ہے۔

بیگمات شاہی کی علم دوستی اور قدر دانی کا یہ حال تھا کہ شعرا قصیدے کہکر لیجاتے اور گرانقدر انعامات سے مالامال ہوکر واپس آتے تھے۔ یہاں تک کہ بات چیت عرض و معروض کو بھی شاعری کا جامہ پہنایا جاتا۔ معمولی معمولی خواصیں بھی فی البدیہہ ایسے اشعار موزوں کرتیں کہ اساتذہ متعجب ہوجاتے۔ بات بات پر لطیفہ سنجی و شاعری ہوتی تھی۔ ع "از قضا آئینہ چینی شکست" کے سے کیسے لطیفے روز پیدا ہوتے ہونگے! ۔ ان مخدرات اسلامی کے کمالات صرف تحصیل علوم ہی تک محدود نہ تھے بلکہ وہ تدبر ملکی و جہانداری میں بھی عدیم المثال تھیں۔ جیسا کہ رضیہ بیگم اور نورجہاں بیگم کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے۔

اس علم دوست و ادب نواز سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی تعلیم نسواں کی قدر بھی کم ہوگئی اور جیسا کہ اوپر کہا گیا مسلمانوں کے عام انحطاط کے ساتھ ساتھ اس میں بھی روز افزوں انحطاط ہونے لگا۔ تا اینکہ قریب بہ فنا ہوگئی۔ اسی وجہ سے دور متوسط فقدان تعلیم نسواں کے لیے مشہور ہے لیکن یہ کہنا کہ مسلم خواتین میں کبھی تعلیم تھی ہی نہیں بالکل خلاف واقعہ ہے۔ ہاں اس نکتہ خیال سے کہ تعلیم مغربی نہ تھی ٹھیک ہے۔ اس کا سبب یہ ہوسکتا ہے کہ ملک کا طرز تعلیم و معاشرت اور وضع قطع وغیرہ کا انحصار زیادہ تر موجودہ بادشاہ یا برسر اقتدار حکومت کے مذاق پر ہوتا ہے۔ جسکو بارگاہ خسروی میں قبولیت حاصل ہوتی ہے۔ اُسی کو سارا ملک پسند کرتا ہے اور اسی کو ہر شخص اختیار کرنا چاہتا ہے۔ بمصداق "اَلنَّاس عَلیٰ دِینِ مُلُوکِہِم" اُس وقت کی حکومت عربی و فارسی کی مربی تھی اس لیے اسی کا چرچا تھا۔

دورجہالت کی عارضی تاریکی اب پھر زائل ہو رہی ہے اور تعلیم نسواں کا آفتاب افق ہند پر جلوہ نما ہونا شروع ہوگیا ہے۔ اس ضروری تحریک کو بفضلہ روز افزوں ترقی حاصل ہو رہی ہے لیکن یہ آفتاب وہ نہیں جو علم پرور تعلیم یافتہ بیگمات تیموریہ کے وقت میں ضیا پاشی کرتا تھا جسکی نور پاش کرنیں ملک کو جگمگاتی رہتی تھیں بلکہ اس میں صرف مغرب کی برقی روشنی ہے۔ علوم فارسی و عربی کے ستارے آسمان ادب پر ماند پڑ گئے ہیں اور بیچاری اردو بھی اپنے زوال پر خون کے آنسو رو رہی ہے اس لیے کہ اب طالبان علم کا رجحان صرف تعلیم مغربی کی جانب ہے۔

فی زمانہ جو تعلیم نسواں کا طریقہ ہے وہ بیحد قابل اعتراض ہے اسلامی لڑکیوں کو بچپن ہی سے مغربی تعلیم دی جاتی ہے اس لیے وہ مذہب سے قطعی ناواقف رہتی ہیں۔ ان کے خیالات منتشر رہتے ہیں۔ اسلامی حرمت اُن کے دلوں سے اُٹھ جاتی ہے اور وہ نماز روزے سے آزاد اور ارکان دینی سے بے بہرہ ہو جاتی ہیں۔ اس میں لڑکیوں کا قصور نہیں بلکہ والدین کا ہے۔ بچپن میں جو تعلیم دی جائیگی وہ لوح دماغ پر نقش کالحجر ہو جائیگی۔ چونکہ انھیں مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی اس لیے وہ نام نہاد مسلمان رہ جاتی ہیں۔ اسکا اثر ان کے اخلاف پر پڑنا ضروری ہے کیونکہ ماں کی گود بچہ کی سب سے پہلی درسگاہ ہے۔ اسکے علاوہ علوم مغربی کی تحصیل کی وجہ سے انھیں اپنی مادری اور موروثی زبان سے کما حقہ واقفیت نہیں ہوتی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان اپنے علوم کو ذلیل سمجھتی ہیں۔ اس لئے اس کی تحصیل کا خیال نہیں کرتیں۔ ممالک غیر میں تو اسے سب سے پہلے اپنے علوم اپنا تمدن کافی حد تک حاصل کرتی ہیں یا کم از کم غیر علوم کے ساتھ ہی اپنے علوم کی تحصیل کو فرض سمجھتی ہیں۔ اسلامی خواتین اپنے تمدن معاشرت علوم کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ میں ادب انگریزی اور اسکی تحصیل کو ہرگز کسی طرح بُرا نہیں سمجھتی بلکہ خود اسکی تحصیل میں کافی انہماک رکھتی ہوں۔

مجھے جو کچھ اختلاف ہے وہ موجودہ نصاب تعلیم اور طرز تعلیم سے ہے۔ موجودہ نصاب تعلیم نہ تو جامع ہمہ گیر ہے اور نہ اس پر عمل کرنے سے اسلامی خواتین علوم و فنون و اخلاق سے پوری طرح آراستہ ہو کر اپنے فرائض کے ادا کرنے کے لیے مساوات حقوق کی طلبگار ہونے کی مستحق ہو سکتی ہیں۔ ان کے لیے ایسا طریقہ تعلیم ہونا چاہیے جس میں وہ تمام باتیں آجائیں جو فرائض و خصوصیات نسواں میں داخل ہیں۔ میرے خیال میں عورتوں کو :-

(۱) مذہبی تعلیم دی جائے تاکہ اسکول میں پڑھنے سے جو اکثر لامذہبیت آجاتی ہے اس سے وہ محفوظ رہیں۔ وہ اس طرح راہ راست پر آجائیں اور آیندہ نسلیں لامذہب نہ ہوں۔ لیکن تعلیم زیور بہشتی، راہ نجات، بنیاد اعتقاد، جامع عباسی، وغیرہ ہی کے مطالعہ تک محدود نہ ہونی چاہیے بلکہ اسے ایسی تعلیم ہونا چاہیے جس سے بجائے تنگ خیالی کے وسعت نظر پیدا ہو اور بجائے آئینۂ دل کو زنگ عصبیت سے آلودہ کرنے کے، یا لکیر کے فقیر ہونے کے بے تعصبی، رواداری، حلم، انکسار، دیانت داری، راست بازی اور دیگر اخلاق حمیدہ سے مزین ہوسکیں۔ ممکن ہے کہ اس قسم کی تعلیم قشری و سطحی مولویوں کو ناپسند ہو کیونکہ ع

"ہر کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد"

(۲) فارسی تعلیم معقول حد تک ہونا چاہیے۔

(۳) اُردو سے کما حقہ واقفیت حاصل کرنا چاہیے۔

(۴) انگریزی کم از کم انٹرنس تک پڑھنا چاہیے۔

(۵) فنون لطیفہ اور خاص طور سے ان میں سے ڈرائنگ پینٹنگ، فوٹو گرافی، ٹائپ رائٹنگ، موسیقی سیکھنا چاہیے۔

(۶) سوزن کاری مع جملہ شعبہ جات متعلقہ سے واقف ہونا چاہیے۔

(۷) طباخی و خانہ داری کا ماہر ہونا چاہیے۔

(۸) ابتدائی علاج (First Aid) اور اُسی طرح کی دوسری چیزوں کا جاننا اور عملی طور سے سیکھنا بے حد ضروری ہے تاکہ ضروری مواقع پر ابتدائی و فوری علاج خود کر سکیں اور ڈاکٹر کی امداد ملنے سے پہلے امراض یا ضربات کے نقصان کو کسی قدر روکا جا سکے۔ ایسی حالت میں جب کہ کوئی اس سے واقف نہیں ہوتا۔ ڈاکٹری امداد تک مزید مضرت و تکلیف کا خدشہ رہتا ہے تیمارداری کے لیے تو نسوانی فطرت خاص طور سے موزوں ہے۔ اس ابتدائی علاج یا فوری مدد کی وجہ سے سیکڑوں جانیں تلف ہونے سے بچائی جا سکتی ہیں۔ فلورنس نائٹ انگیل، سسٹر ڈورا وغیرہ نے جو کارہائے نمایاں کئے اور خلق خدا کی جانیں بچائی ہیں، کیا اسکو دنیا بھول سکتی ہے؟ ان خدا ترس خواتین نے اپنی عزیز جانیں، دولت، عیش و آرام، سب مجروحین و مرضا کے علاج و خبرگیری اور

تیمارداری پر قربان کردیں اور ہر امکانی کوشش سے بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کی کوشاں ہیں۔ اسلام نے ہم کو اسکی بھی تعلیم دی اور عملی طور سے سکھا یا ہے چنانچہ تمام غزوات میں مستورات فوج کو پانی پلانے، تیمارداری اور مرہم پٹی کرنے کے لیے میدان جنگ میں موجود رہتی تھیں۔ جنگ احد میں نسیبہ بنت کعب اس خدمت پر مامور تھی۔ وہ اپنے لڑکے عبداللہ و عمان کو شمع رسالت پر نثار ہونے کے لیے بھیجتی تھی۔ یہاں تک کہ جناب سید کذاب میں اُسکا بایاں ہاتھ کٹ گیا۔ خود خاتون جنت نے جنگ خندق میں جب کہ مسلمان شدت سرما و گرسنگی سے پریشان تھے باوجود خطرات کے اپنے پدر بزرگوار کے لیے روٹی پہنچائی۔

(۹) قواعد حفظان صحت کی کتابوں کا مطالعہ اور اُس پر عمل کرنا بھی بے حد ضروری ہے۔ تندرستی ہزار نعمت ہے۔ حفظان صحت کے اصولوں سے واقف ہو کر بیماری کے سیکڑوں حربوں کو شکست دی جاسکتی ہے اور اسکے جراثیم کو فنا کرکے اس نعمت کی حفاظت کی جاسکتی ہے۔ اچھی صحت صرف قواعد حفظان صحت کے معلوم ہونے سے برقرار رکھی جاسکتی ہے۔ اور اس طرح اموات میں بھی کمی ممکن ہے۔ (بقیہ مضمون آیندہ اشاعت میں شائع ہوگا۔)

محترمہ کنیز فاطمہ حیا رحمان اور محترمہ ملک سلطانہ رعنا جواد کی دلچسپ نظمیں آیندہ پرچے میں شائع کی جائینگی۔ اس ناگزیر تاخیر کے لیے ہم ان معزز بہنوں سے معافی کے طالب ہیں۔ ہم ان خواتین کے شکر گزار ہیں جو "ادب" کو اپنی نوازشوں سے گرانبار کررہی ہیں۔

(مدیر)

تصحیح

۱۰- دسمبر ۱۹۳۱ء کے "ادب" صفحہ ۳۰ پر حضرت آثر لکھنوی کے شعر کا ایک مصرع غلط شائع ہوگیا ہے:-

تری ادا کا مقابل ترا شباب ہوا   اک آفتاب تھا جو محو آفتاب ہوا

ناظرین "ادب" سے درخواست ہے کہ اس طرح اسکی تصحیح فرمالیں۔

ترا شباب ترے حسن کا جواب ہوا   اک آفتاب تھا جو محو آفتاب ہوا۔

"کم سخن"

ریختی

(جناب منور عباس صاحب شہاب بی اے میرٹھی)

سلسلے کے لیے "ادب" ماہ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء ملاحظہ ہو

ریختی کا درجہ اُردو شاعری میں

اب ہم تھوڑا سا اقتباس مسٹر رام بابو سکسینہ کی مشہور و معروف کتاب ہسٹری آف اُردو لٹریچر سے ہدیۂ ناظرین کرنا چاہتے ہیں۔

"ریختی کے طرز میں ایک قسم کی دلچسپی ضرور ہے مگر خرابی یہ ہے کہ اس میں اکثر غیر مہذب اور فحش آمیز اشارے ہوتے ہیں۔ نساخ کی رائے ہے کہ اس طرز خاص کے موجد میاں رنگین تھے اور رنگین نے خود بھی یہ دعویٰ اپنے دیوان کے دیباچہ میں کیا ہے۔ مگر غور سے دیکھا جائے تو یہ طرز قدیم شعرا علی الخصوص شعرائے دکن میں بھی موجود تھا۔ مثلاً مولانا ہاشمی جو دکن کے ایک مشہور شاعر تھے، و نیز مولانا قادری جو ولی کے ہمعصر تھے اور جن کا تخلص خاکی تھا اور جن کا دیوان سنہ ۱۱۸۲ھ میں مرتب ہوا ہے۔ ان لوگوں کے یہاں بھی ریختی کا پتہ چلتا ہے مگر اتنا فرق ضرور ہے کہ ان قدیم شاعروں کی ریختی ایک خاص قسم کی تھی جسکی وجہ یہ ہے کہ چونکہ انکے کلام میں بھاشا کا زیادہ اثر ہے لہذا اسی کے تتبع میں اظہار عشق عورت کی جانب سے اور اُسی کے الفاظ میں کرتے ہیں بخلاف معمولی اردو کے جس میں اظہار عشق عموماً مرد کی جانب سے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے اس قسم کی ریختی میں فحش اور ابتذال مطلق نہیں ہوتا برخلاف انشا و رنگین کے طرز کے جن کا دارومدار عیاشی اور شہوت پرستی پر ہے۔ ان کی غرض عموماً یہ ہوتی ہے کہ ایسا کلام پڑھ کر لوگوں کو ہنسی آئے یا اُن کے نفسانی جذبات میں ہیجان پیدا ہو

اسی وجہ سے اس قسم کی نظموں میں خلوص اور بلند خیالی یہاں تک کہ بے ضرر سادہ مذاق بھی نہیں ہوتا۔"

یہاں ہم کو فاضل مصنف سے صرف دو باتوں میں اختلاف ہے۔ اوّل تو یہ کہ قدیم دکنی شعرا کی ریختی اصل میں ریختی نہ تھی بلکہ وہی ہندی شاعری کا تتبع تھا۔ اگرچہ وہ ریختی سے ملتی جلتی ضرور ہے دوسرے یہ کہ انشا و رنگین کی ریختی کا دار و مدار عیاشی اور شہوت پرستی پر ہے۔ یہ بات حقیقت سے بعید ہے۔ یہ ضرور سچ ہے کہ بہت سی ریختیاں فحش اور مبتذل ہیں مگر ریختی کی بنیاد شہوت پرستی پر ہرگز قائم نہیں تھی۔ ریختی کا منشا صرف عورتوں کی زبان اور اُنکی مصطلحات کا نظم کرنا تھا اگر شعرا اس میں جادۂ اعتدال سے باہر نکل گئے تو یہ اُنکی بے اعتدالی ہے جو اکثر شعرا کے یہاں پائی جاتی ہے میر سے شاعر کا کلام بھی فحشیات سے پاک نہیں ہے۔ سودا اور ضاحک کے یہاں کیسا کیسا ابتذال ملتا ہے۔ انشا اور مصحفی نے شاعری کی رنگینیوں کو چھوڑ کر بھی ایک دوسرے کی چوٹوں میں کیا اُٹھا رکھا ہے۔ ظریف شاعر کے لیے خصوصاً اُس زمانے میں جادۂ اعتدال سے ہٹ جانا کوئی تعجب خیز امر نہ تھا۔ کیا حضرت اکبر الہ آبادی کا یہ شعر فحش نہیں ہے ؎

ٹرخا دیا ہر اک کو مغرب نے پاس کرکے
بتدبھی کورے کھسکے خالی سماس کرکے

اسی قسم کے بیسیوں شعر اور بہت سے شعرا کے یہاں مل سکتے ہیں۔

ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اب ہمارا مذاق بدل گیا ہے اب ہماری محفلوں میں بوس و کنار کے اشعار بھی غیر مہذب خیال کیے جاتے ہیں۔ لیکن کیا آپ پرانے شعرا کے کلام کو بھی اسی نظر سے دیکھ سکتے ہیں !!!

حیرت کا مقام ہے کہ اکثر شعرا کے یہاں فحش اور شہوت انگیز خیالات نظم ہوے تو بھی ہم انھیں آنکھوں سے لگاتے ہیں اور ریختی کو مخرب اخلاق سمجھ کر ہاتھ نہیں لگاتے۔ اور پھر اُردو ہی پر منحصر نہیں۔ عرب کی شاعری میں کیا کیا خرافات نہیں ہے۔ محبوبہ کی تعریف کی جاتی ہے کہ "جب اُسکا اونٹ میرے اونٹ کے برابر پہونچتا ہے تو وہ اوپر کے دھڑ سے تو بچے کو دودھ پلاتی رہتی ہے اور نیچے کا دھڑ میرے اونٹ پر رکھ دیتی ہے۔" یہ فحش نہیں ہے مگر ریختی فحش ہے۔ سنسکرت شاعری میں کیا کچھ عریانی نہیں ہے۔ یونان کی شاعرہ سیفو نے کون سی کسر اُٹھا رکھی ہے۔ انگریزی ادب کو ہم لوگوں نے نہ معلوم کیا سمجھ رکھا ہے مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ ایسے ویسے جذبات

انگریزی شاعری میں موجود ہیں کہ جان صاحب بیچارے شرما کر رہ جائیں۔

ریختی میں ایک غیر فطری حرکت کا اکثر ذکر آتا ہے جس پر چنیں پناں ... بی سے گرکیا اسکی واقعیت سے کوئی انکار کر سکتا ہے۔ دنیا کی کئی مشہور عورتیں اس بلا میں مبتلا تھیں۔ اس علت کا وجود قدیم زمانے سے ہے اور آج تک ہے۔ سائنس کی ترقی کے ساتھ اس میں بھی نئی نئی جدتیں کی گئی ہیں۔ بازار میں آلات فروخت ہوتے ہیں اور کوئی کونسل میں سوال نہیں کرتا۔ ریختی میں جہاں کوئی ایسا شعر آجاتا ہے بس سب چیخ اٹھتے ہیں۔

یہی ایک بات ریختی میں فحش کہی جا سکتی ہے ورنہ باقی باتیں وہی ہیں جنکا تذکرہ اردو کے اکثر شعراء مردانہ طریقے پر کر چکے ہیں۔ ریختی والوں نے انھیں باتوں کو عورتوں کے منہ سے کہلوا دیا ہے۔

ریختی گو شعرا

قدیم ریختی کہنے والوں میں رنگین، انشا، جان صاحب، نازنین، پری، زیادہ مشہور ہیں۔ پھر خانم اور رنجور کا نمبر ہے۔ موجودہ زمانہ میں ریختی قریب قریب متروک ہوگئی ہے۔ دو چار بڈھے بطور آثار قدیمہ کے رہ گئے ہیں جن کو چراغ سحری سمجھنا چاہیے ان کے بعد ریختی کا چراغ بھی گل ہو جائیگا موجودہ ریختی گویوں میں ہم صرف بیگم، عنقا، شیدا اور رونق سے واقف ہیں۔

اب ہم ان میں سے ہر ایک کا مختصر نمونہ کلام پیش کرتے ہیں تاکہ ناظرین ان کے کھرے کھوٹے کو خود پرکھیں۔

رنگین

سعادت یار خاں نام رنگین تخلص تھا۔ طہماسپ بیگ خاں کے منجھلے بیٹے تھے بچپن ہی سے کسرت اور سپاہ گری کا شوق تھا۔ گلشن بے خار کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاحت کے بھی دلدادہ تھے۔ شاہ حاتم کے شاگرد تھے۔ آب حیات میں انکی شاگردی کے متعلق ایک قصہ لکھا ہے کہ "میر صاحب کے پاس گئے اور غزل اصلاح کے لیے پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ صاحبزادے آپ خود امیر ہیں اور امیرزادے ہیں۔ نیزہ بازی تیر اندازی کی کسرت کیجیے۔ شہسواری کی مشق فرمائیے۔ شاعری دلخراشی و جگر سوزی کا کام ہے۔ آپ اسکے درپے نہ ہوں۔ جب انھوں نے بہت اصرار کیا تو فرمایا کہ آپ کی طبیعت اس فن کے مناسب نہیں۔ یہ آپ کو نہیں آنے کا۔ خواہ مخواہ میری اور اپنی اوقات ضائع کرنی کیا ضرور ہے"۔

میر صاحب کی پیشینگوئی اور قیافہ شناسی خواہ صحیح ہو یا غلط۔ مگر رنگین کی طبیعت ابتدا ہی سے شوخ تھی جسکا اقرار اُنھوں نے خود "مجالس رنگین" میں کیا ہے۔ ان کی نومشقی کے دن تھے۔ ایک دن انکے اُستاد شاہ حاتم نے فرمایا کہ آج رات ایک مطلع کہا ہے۔ ؎

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھو کوٹا ہے
رات ہم ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

میاں رنگین کہتے ہیں۔ ابتدا سے میرے مزاج میں چالاکی تھی اور شعور کم تھا۔ اپنی نادانی سے گستاخانہ بول اُٹھا کہ اگر یوں ہوتا تو اچھا ہوتا۔

سر کو پٹکا ہے کبھو سینہ کبھی کوٹا ہے
ہم نے شب ہجر کی دولت سے مزا لوٹا ہے

شاہ صاحب بہت خوش ہوئے اور فرمایا آفریں آفریں ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ انشاءاللہ تمہاری طبیعت بہت ترقی کریگی۔ مشق نہ چھوڑنا۔"

نہ معلوم میر صاحب کی رائے صحیح تھی یا شاہ صاحب کی۔ ہم تو اسے بھی معراج ترقی سمجھتے ہیں کہ اُنھوں نے اُردو شاعری میں ایک بیش بہا صنف کا ایجاد کر دیا۔

۱۲۵۱ھ میں انتقال کیا۔ اسّی برس کی عمر پائی۔ جس سال مرے ہیں بھلے چنگے تھے۔ مگر کہا کرتے تھے کہ اس سال مرجاؤں گا۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو کہا مدت ہوئی اپنے لیے ایک تاریخ کہہ چکا ہوں جس سے یہی سنہ نکلتا ہے اور پھر اپنے استاد شاہ حاتم کا واقعہ سنایا۔ شیفتہ لکھتے ہیں کہ رنگین کی پیشینگوئی صحیح نکلی۔ نمونہ کلام ملاحظہ ہو۔ ؎

کس سے گرمی کا رکھا جائے یہ بھاری روزہ — سردی ہوئے تو رکھے مجھ سی بچاری روزہ
دیکھ پنسورے[۱] میں تاریخ بتائے مجھ کو — اب کے آتوں جی رکھونگی میں ہزاری روزہ
میرا منہ اُترا ہوا دیکھ کے کہتی ہے حیا — آج تو کر کے نہ رکھ منت و زاری روزہ
اُٹھتی ہے پچھلے پہر رات کو کھا کر سحری — شوق سے رکھیو تو کل ہی تر واری روزہ
آج روزہ ترا تڑوا کے رہیگا دوا — یا سر رنگیں کے تو آ رکھ کے بچاری روزہ

میں تو اوڑھنے کی نہیں ململ کی اوڑھنی — باجی مجھے منگا دو جھلا جھل کی اوڑھنی
بھیجا ہے گوٹ کا یہ ڈوپٹہ مجھے چہ خوش — اور آپ اوڑھ بیٹھیں مسلسل کی اوڑھنی

---

[۱] پنسورہ، عورتیں پنج سورہ کو پنسورہ کہتی ہیں۔

گرمی کے مارے ناک میں آئی ہے میری جان   اتنا اُڑھا دے لاکے مجھے ہلکی اوڑھنی
.... ہاں جائیگی دوا   تہ کرکے رکھ پٹاری میں آنچل کی اوڑھنی

ذرا یہ شعر ملاحظہ ہو :-

برسات اسکو کہتے ہیں جی جس بہار میں   سر پر ہوا کے ہوتی ہے بادل کی اوڑھنی
بھاری بنت منگا دے کہ رنگیں لگاؤں میں   سر پر سے ٹھہرتی نہیں ہلکی اوڑھنی

اور سنیے :-

دل کو بیٹھا جو وہ بے پروا سے   پڑ گئے جان کے مجھ کو لا لے
آہ اس عشق کا گھر کھوج مٹے   اس نے گھر دیکھو کیا کیا گھالے
نہیں آتے وہ سفر سے ہے ہے   پڑ گئے پاسے طلب میں چھالے
جان و مال و دل و دیں تم نے لیا   پھیر اب تم سے کوئی کیا کیا لے
سخت بے درد ہو بے رحم ہو تم   بچ پڑے کوئی تمہارے پالے
روز رنگیں سے بھڑاتے ہیں مجھے   یارب اُڑ جائیں لگانے والے

کچھ مختلف اشعار سن لیجیے - یاد رہ جائیں گے -

یاد دکھانے میں جو رنگیں مجھے کل تو آیا   تو بھی مرہی کے ایسا نہ مجھے اچھو آیا
چاک دل رشتۂ الفت سے سدا سیتی ہوں   ہجر میں وصل کی امید پہ میں جیتی ہوں
میں رو برو بیٹھی ہوں مری جان ادھر دیکھ   صدقے تری ہر آن کے ہر آن ادھر دیکھ

رباعی

شب تجھ سے جدا ہوئی تو معلوم ہوا   جب تجھ سے جدا ہوئی تو معلوم ہوا
دل تجھ کو بہت چاہتا ہے اے رنگیں   اب تجھ سے جدا ہوئی تو معلوم ہوا

قطعات

میں نے چاہا جو تجھ کو اے رنگیں   مجھ سے ہر ایک بد گمان ہوا
تہمتیں جوڑتی ہے کیا کیا خلق   جی لگانا بلا سے جان ہوا
کیا تجھ سے کہوں کہ میں نے ناحق   کھینچی تجھے چاہ کر ندامت

رنگیں تجھ سے جو دل لگایا تھی اپنے دشمنوں کی چاہت،

وہ بھی سن لیجیے جہاں ریختی کے ایجاد کا راز کھلتا ہے۔

زمیں ہے ریختہ ایجاد رنگیں اسی خاطر کہا کرتا تھا اکثر
موا انشا بھی اب کہنے لگا ہے چہ خوش اس چیونٹی کے بھی پر ہوے پر

انشا یہ اتنے مشہور ہیں کہ یہاں انکا حال لکھنا ہی بیکار ہے۔ اور اگر لکھا جائے تو ایک علیحدہ مضمون کا محتاج ہے۔ لہذا صرف نمونہ کلام سن لیجیے شاید لطف آجائے۔

ہوا اتنی نوں میں انکی جو آواز ڈوک میں تو گھڑ دراہٹ اور ہی ہے نوک جھوک میں
باجی نکالے ہاتھ دوشالے سے کون اب پانی پلائے تو ہی مجھے اپنی اوک میں
دربان ہو وہ ایک نگوڑا سو عمر بھر میری اصیل ہی کی رہا روک ٹوک میں

پھولوں سے ان نوں میں لچھن سے جھڑ رہے ہیں شاید کہ اس پری کے دہن سے جھڑ رہے ہیں
کل ایک گھر میں خوب سے چھوٹے بڑے لڑے ہاتھوں سے ہاتھ اور گھڑوں کرٹے لڑے
انشا رہ دیئے اپنے ہی اس دھوم دھام میں دیدہ دن ایک شخص کے ہو کر کرٹے لڑے
میں ترے صدقے نہ رکھ لے مری پیاری روزہ بندی رکھ لیگی ترے بدلے ہزاری روزہ
جو ہم کو چاہے اسکا خدا نت بھلا کرے دودھوں نہائے اور وہ پوتوں پھلا کرے
روٹھے ہوے کو کس لیے جا کر منائیے منت کسی نگوڑے کی اپنی بلا کرے
جھلسا ہی اسکے منہ کو جو چاہت کا نام لے اس دل کی آنچ میں کوئی کب تک جلا کرے
کس سے اقرار ہوا جو ہم سے کرتے ہر بات پہ انکار ہو تم
یہ اتفاق ہو نہ بنے یا بنی رہے پر آدمی کو چاہیے دل تو غنی رہے
مانگونگی آدھی رات کو سر کھول کر دعا آمین کہنے کے لیے ادرک چھنی رہے
نواب وہ لکھا شیر بہادر وزیر کی جم جم سے ملکوں ملکوں میں نت روشنی رہے
دولت بنی ہے اور سعادت علی بنا یا رب بنی نبے میں ہمیشہ بنی رہے
قائم رہے وہ چاند سا مکھڑا جہان میں اس کا برا جو چیتے اسے جانکنی رہے۔

جم جم وہ آنکھ اسکی جو برچھی سے تیز ہے — دشمن کے دل میں چبھتی اُسی کی انی رہے
ہمت کبھی نہ ہارئے انشا یہ چاہیے — جو بات دل میں ٹھن گئی بس ٹھنی رہے

جان صاحب فرخ آباد میں کوئی ۱۲۳۲ھ میں پیدا ہوے۔ ان کے والد کا نام میر امن تھا۔ جان صاحب بچپنے ہی میں لکھنؤ چلے آئے اور یہاں نواب عاشور علی کی شاگردی کی حیرت یہ ہے کہ نواب صاحب کے دونوں شاگرد جرأت اور جان صاحب تو اتنے مشہور ہوں کہ قابل لوگوں کو کلام حفظ ہوا اور خود نواب صاحب کا ایک مصرعہ بھی کسی سے سننے میں نہ آئے۔ پہلا دیوان جان صاحب کا لکھنؤ ہی میں مرتب ہوا اور مطبع مرتضوی میں ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں چھپا جان صاحب نے اسکی تاریخ خود کہی۔ ؎

اجی اس کی تاریخ بیت الشفا ہے — یہ دیوان چاہت کا نسخہ ہے باجی

اگرچہ لکھنؤ میں واجد علی شاہ کا زمانہ تھا مگر قسمت ہر جگہ ساتھ جاتی ہے جان صاحب کی قدر لکھنؤ میں نہ ہوئی۔ تنگدستی و ناقدری کے باعث برداشتہ خاطر رہتے تھے چنانچہ کہتے ہیں۔ ؎

اے جان لکھنؤ سے نکل جاؤنگی میں اب — اوقات مجھ نخی کی ہوتی بسر نہیں

جب یہاں رہتے رہتے بیزار ہو گئے تو دلی چلے آئے۔ یہاں دال نہ گلی، تو بھوپال گئے۔ وہاں بھی گزر نہ ہوئی تو اورنگ آباد کی طرف رُخ کیا۔ مگر جہاں گئے قسمت ساتھ گئی۔ پھر پھرا کے لکھنؤ چلے آئے۔ گارڈن دی تاسی، اور لالہ سری رام نے اپنے اپنے تذکروں میں اسکا ذکر کیا ہے۔ مرزا قادر بخش نے اپنے تذکرہ گلشن سخن میں جس کو بعض کہتے ہیں کہ صاحب عالم نے ستر روپیہ دے کر صہبائی سے لکھوایا تھا۔ جان صاحب کے دلی آنے کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ ہاں جان صاحب کی تعریف بہت کی ہے۔ شاید جان صاحب سے ملاقات بھی ہوئی ہو کیونکہ مرزا بنارس میں آتے تھے اور لکھنؤ میں آنا جانا رہتا تھا۔ جان صاحب لکھنؤ میں جم کے بیٹھے اور غدر کے کوئی پانچ چھ برس بعد ان کا دوسرا دیوان چھپا اس میں پہلے کی نسبت پختہ کلامی زیادہ ہے۔ پہلا دیوان دل سے اُتر گیا ہے۔ خود کہتے ہیں۔ ؎

پہلا دیوان سب غلط میرا — اس میں ظاہر یہ تین چار ہیں عیب

دوسرے دیوان پر بہت چونچلا ہے۔ ؎

لیتے آنا چوک سے مرزا کرونگی سیر میں — جان صاحب کا چھپا ہے دوسرا دیوان اب

اس کی پہلی تاریخ خود کہی ہے۔ ؎

اک ہفتہ میں بک جائینگے ہیں درشنی ہنڈی — مطبع سے تو نکلیں ابھی یہ صاحبو دونوں
منشی جی ہیں مطبع کے بجا مہتمم اچھے — تجویز یہ نسخے وہ کیے صاحبو دونوں
بی جان کہی جان نے تاریخ بھی اچھی — دیوان بہت خوب چھپے صاحبو دونوں

یہ دیوان مطبع علمی صاحب میں حافظ محمد باقر کے اہتمام سے سنہ ۱۲۷۹ھ میں چھپا۔ اس میں ۱۱۶ صفحے مع حاشیہ کے ہیں۔ اس میں پختہ کلامی زیادہ آگئی ہے۔ غلطیٔ اضافت سے بھی پاک نہیں ہے۔ غزلوں میں لکھنؤ کا رنگ زیادہ نمایاں ہے۔ اس دوران میں حکومت پلٹا کھا چکی تھی۔ جان صاحب کے کلام میں جا بجا اسکے حالات ملتے ہیں۔ اسکے بعد غدر کا ہلڑ مچا مگر جان صاحب کے قدم جمے رہے۔ کہتے ہیں۔ ؎

وہ سور مارتی ہیں فرنگی گوروں سے ڈری ہیں — بھگدڑ میں قدم شہر سے باہر نہ نکالا

لکھنؤ کی اداسی پر آنسو بہاتے ہیں۔ ؎

اے جان لکھنؤ میں تو ریختی ہے پڑھتا — بلبل چہک رہا ہو اجڑے ہوئے چمن میں

اخیر میں دل اچاٹ ہو گیا اور پھر لکھنؤ چھوڑا۔ مگر اب دلی بھی باقی نہ رہی تھی۔ دو ٹھکانے مسلمانوں کے رہ گئے تھے۔ ایک حیدرآباد دوسرا رامپور۔ حیدرآباد کالے کوسوں کون جاتا۔ رامپور ہو رہے، نواب تک رسائی ہوگئی گزارہ مقرر ہو گیا۔ دربار میں آنے جانے لگے۔ جان صاحب جب رامپور میں آئے ہیں تو ساٹھ سے کچھ اوپر ہونگے۔ امیر مینائی کے انتخاب یادگار کی تالیف کے وقت تہتر برس کی عمر ہوگی۔ میانہ قد گندمی رنگ۔ دبلے پتلے، اچھی خاصی صورت، داڑھی منڈی، لکھنؤ کی وضع کی مونچھیں۔ بڑکا پاجامہ گھیتلی جوتی پاؤں میں۔ پنج گوشیہ ٹوپی سر پر، انگرکھا جسم پر۔ پڑھتے وقت دوستوں کے اصرار سے دوپٹہ بھی اوڑھ لیتے تھے۔ اور اس طرح بھاؤ بتا بتا کے پڑھتے تھے کہ مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ کہتے ہیں۔ ؎

ریختی پڑھ کے بڑھاپے میں مٹکتا ہے موا — جان صاحب کی ابھی دیکھو حماقت نہ گئی

اولاد کوئی نہ چھوڑی۔ شاید بھانجوں کو متبنیٰ کر لیا تھا۔

جان صاحب سے نہیں جلتے ہیں میرے دلسوز — بھانجے مجھ کو یہ بیٹوں سے سوا پیارے ہیں

رامپور میں ملا ظریف کی برزیا میں رہتے تھے اور لکھنؤ میں شاید رستم نگر میں مکان تھا۔

جان صاحب بڑے متقی پرہیزگار آدمی تھے جو کچھ خرافات بکی ہے زمانہ کا پھکڑپن ہے۔ زہد ارندی دیکھیے:۔

اُٹھا ہے ابر باغ میں کعبہ کی سمت سے　　لازم ہے ساقیا بطِ مے کا شکار آج

۱۳۰۳ھ یا ۱۳۰۲ھ میں انتقال ہوا۔ رام پور میں دفن ہوئے۔

اکثر تذکروں میں ان کا ذکر ملتا ہے۔ مولوی سید احمد صاحب مولف فرہنگ آصفیہ نے تو ایک فقرہ لکھکر بیچارے کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا ہے۔ لکھتے ہیں: "جان صاحب نے ریختی گوئی میں اپنی اوقات عزیز کو رائیگاں کھویا"۔ لیکن مولوی صاحب کی یہ رائے صحیح نہیں ہے۔ جان صاحب کی بدولت سیکڑوں الفاظ زمانہ کی دستبرد سے بچ گئے۔ ان کے کلام میں ان کے زمانہ کی معاشرت کا صحیح صحیح فوٹو مل سکتا ہے۔ کس طرح انگریزی معاشرت لکھنؤ میں دخل کر رہی تھی ان شعروں سے واضح ہو جائیگی۔

کلو نظر آنے لگے اب لاکھوں ہی گورے　　درگور ہوا لکھنؤ کمپو سے زیادہ

مجھ کو تو ڈالا گھر میں فرنگن کے ہو مرید　　مسجد بنائی آپ نے گرجا کے سامنے

پہن کے کپڑے انگریزی میاں خوش نکلتے ہیں　　نئے موتی محل سے بن کے اب لو نکلتے ہیں

کپڑا انگریزی نہ میں پہنونگی موتی خانم　　ماں جو لولو ہو تو کیا بیٹی بھی لولو ہو جائے

ہندو مسلم اتحاد پر کہتے ہیں:۔

گو ابروئے مرزا کی ہے گنگا سے زیادہ　　اسلام ہے رغبت مجھے ہندو سے زیادہ

عدم تعاون کے سیاسی لیڈروں اور والنٹیروں کو نصیحت ہے۔

کیوں پاؤں پہ سر رکھتے ہو تم ہاتھ نہ جوڑو　　کو کھا اجی کیا کاٹے گی سرکار تمہارا

انگریزی الفاظ کس طرح اردو پر سکہ جما رہے تھے۔

منگوائی گوگی سبز تھی وہ لائے بہن سرخ　　قطامہ موئی پہنوں محرم میں بہن سرخ

سو رہو کمرے میں اب منہ پر دوپٹہ تان کر　　اس میں بہتر ہے کہا میرا کریں منظور آپ

سوت جھپا مری انگاروں پہ یہ لوٹ رہی　　کیا مرے ہاتھ سوا لاکھ کا ہے بل آیا

ذرا انگریزی حکومت پر چوٹیں دیکھیے۔

انگریزی رہے قیامت تک　　دے نہ اک دن کہیں خسارہ لاٹ

کاغذ کے سکہ پر اس سے بہتر چوٹ کیا ہو سکتی ہے انداز بیان کے قربان جایئے۔

پہلے ہی چاہئیں اسٹام کے کاغذ کو روپے	ہو کے نادار چلے کرتے ہیں فریاد عبث
اپنے گھر بھرنے کا اس وقت کے حاکم کو ہے دھیان	تنک چھن جاتی ہو اب ملتی ہے جاگیر کسے

ذرا گاندھی مہاتما کی تحریک کی پیشینگوئی ملاحظہ ہو۔ ؎

اسکو قربان کروں اپنے گزی گاڑھے پر	میری جوتی سے ملیں ہے اگر آیش ہتیں

اب دو ایک شعر سن لیجیے دوسرے شعراء سے مقابلہ تو مقصود نہیں ہے مگر ہاں اشارہ کیے بغیر دل نہیں مانتا

جان صاحب رہی جب کہ کسی بات کی ضد	جو ہنر یاد مجھے تھے وہ ہنر بھول گئے

ذرا غالب کا شعر یاد دلا دوں :۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں	ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

ایک شعر اور سنیئے :۔

میں کیا جان صاحب کے گھر سونے جاؤں	سوا خاک کے چارپائی نہ ہو گی

اور یہ بھی یاد رہے۔

ہے خبر گرم ان کے آنے کی	آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا

اس زمانہ میں اور آزادی بیان ملاحظہ ہو :۔

یہ قول ہو مردوں کا خدا پر ہے لے جان	تعویذ کا قائل ہو نہ بوٹی نہ جڑی کا
سنو باجی پری خانم خدا پر اپنے شاکر ہوں	نہ ٹونوں کو سمجھتی ہوں کسی کے میں جادو کو
جو کہ تقدیر کا لکھا تھا ہوا وہ باجی	کام آیا کوئی گنڈا نہ کسی کا تعویذ

اُستاد امانت نے جان صاحب کے توڑ پر عصمت اور ہدایت دو پہلوان پیدا کیے تھے۔ جان صاحب چوٹ کرتے ہیں۔

؎ تمام عمر نہ آئیگی ریختی اس سے	کہے وہ ریختی لے جان اسکا منہ کیا ہے

نواب مصطفٰے خاں شیفتہ اپنے "گلشن سخن" میں جان صاحب کی بابت لکھتے ہیں کہ "ان کا کلام نوجوانوں میں مقبول ہوا"

وہ خود کہتے ہیں۔ ؎

قدر کیا نامرد جانیں مردوے جو مرد ہیں	جان صاحب شاد ہوتے ہیں وہی سنکر مجھے

نان پارہ سے کچھ سہارا ہو گیا تھا کہتے ہیں۔ ؎

خدا دیتا ہے تم کو نان نفقے کا سہارا ہے ۔ وہ راجہ مجھ پہ مرتا ہے کہ جسکا نان پارا ہے

نواب کلب علی خاں کی مدح میں جان صاحب نے ایک قصیدی لکھی تھی۔

عجب ہے نور کی صورت خدا کی قدرت ہے ۔ کلیم کلب علی خاں ہیں طور ہے ہاتھی

اسی میں ایک شعر تھا۔

تصدق انکے سے سر سبز ہوں پھلوں پھولوں ۔ قصیدہ مرد ہیں کہتے قصیدی میں نے کہی

اس شعر نے یہ قیامت جوتی کہ جان صاحب بیچارے کو پورب والوں نے مرد سے عورت بنا کر چھوڑا۔ گارساں دتاسی صاحب نے جان صاحب کے متعلق جو اپنے تذکرے میں لکھا ہے وہ لطف سے خالی نہیں۔ فرماتے ہیں۔

"جان صاحب میر یار علی جان صاحب یا صاحب جان جسے محسن ریختی کی بیان کہتا ہے ۔ (کوئی جی صاحب اور جان صاحب کو ایک نہ سمجھ لے) ریختی لکھنے والی عورت ہے جو میر امن کی بیٹی ہے ۔ وہ فرخ آباد میں پیدا ہوئی لیکن لکھنؤ میں جا رہی جہاں اس نے اپنی ادبی شہرت حاصل کی۔ اورنگ آباد بھوپال میں رہنے کے بعد بچپن ہی سے اس نے آپکو موسیقی اور ادب کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس نے فارسی سیکھی گلستان بوستاں اور بہار دانش پڑھی مختصر یہ کہ نواب علی شیر علی خاں بہادر کے مشورے سے ہندوستانی شاعری کا شعار ٹھہرایا۔ کریم الدین اسکو اپنا استاد بتاتا ہے اور اپنے کلام میں اس سے اصلاح لی ہے اسکے کلام کا مجموعہ دیوان میر یار علی کے نام سے پچاسی صفحہ کے متن اور حاشیہ پر لکھنؤ میں ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۵ء میں چھپا تھا اُس وقت اسکی عمر چھبیس یا ستائیس سال کی ہو گی۔ یہ مجموعہ بڑی سرعت کے ساتھ ہندوستان کے خوش مذاق معاصرین میں پھیل گیا جس سے مصنفہ کی بڑی نام آوری ہوئی۔ یہ عورتوں کی اس شاعرانہ زبان میں لکھا گیا ہے جسکو ریختی کہتے ہیں اور جو زبان خاتونوں میں بولی جاتی ہے اسکی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ شاعرہ نے شاعری کے تمام عنوانوں کے تذکیر کی تانیث کر دی ہے۔ مثلاً غزل کے بجائے غزلی اور ریختے کی بجائے ریختی وغیرہ اس دیوان میں سعادت یار خاں رنگین کے مذاق کی تمام خوبیاں اور رنگینیاں بھری پڑی ہیں لیکن ان میں نفاست اور نزاکت زیادہ ہے اس شاعرہ کا تذکرہ صرف کریم الدین ہی نے نہیں کیا بلکہ محسن نے بھی لکھا ہے اور اسکی بہت سی غزلیں نقل کی ہیں"۔

دیوان آج تک اس قدر مقبول ہے کہ ہر جگہ ملتا ہے بیسیوں جگہ چھپا ہے نظامی پریس کا ایڈیشن سب سے اچھا ہے۔ دستیابی کی آسانی کی وجہ سے انکے اشعار یہاں نہیں لکھے جاتے۔

"پریم رس"

(جناب سید وقار عظیم صاحب لکھنؤ یونیورسٹی)

"بیٹا کیشو۔ دیکھو تو آج صبح سے تمہاری بہن کا پتہ نہیں۔ مجھ ماما کی ماری نے کل سے اُسے کپڑے اور ہنسلی سب پہنا رکھی ہے۔ ایشور نہ کرے کہیں کوئی گنڈا بدمعاش اُسے نوچ کھسوٹ کر مار ڈالے۔ نہیں تو دُکھیاری تو پھر کہیں کی نہ رہونگی۔ ابھی کوئی ایک مہینے کی بات ہے کہ ہمارے پچھواڑے جو پیشکار صاحب رہتے ہیں اُنکی بچی کانوں میں بالیاں پہنے ہوئے باہر گئی۔ کوئی گھنٹہ بھر میں ہمارے محلہ کا دودھ والا اُسے گود میں لیے ہوئے آیا اور یہ کہا کہ اجی پیشکار صاحب دیکھو تو تمہاری بچی کو کیا ہوا۔ یہ سنتے ہی سارا گھر دوڑ گیا۔ بچی جو گھر میں آئی تو اُسکے دونوں کان لہولُہان۔ ایسی بلک بلک کر رو رہی تھی کہ دل ٹکڑے ہوا جاتا تھا۔ ایشور جانے کس پاپی نے اُس کے کانوں کی بالیاں اس بیدردی سے گھسیٹیں کہ تمام کان کٹ گئے۔ بھلا اتنی ذرا سی جان کا دل کیا کہتا ہوگا۔ دیکھ میرے لال۔ ذرا باہر جاکر میری شانتی کو دیکھ، کہاں گئی۔ میرا دل کچھ اندر ہی اندر بیٹھا جاتا ہے۔"

کیشو اپنی ماں کا بے حد فرمانبردار تھا۔ جب سے اُسکے باپ مرے، وہ اپنی ماں کا کوئی حکم نہیں ٹالتا تھا۔ ماں کی یہ باتیں سنتے ہی بولا "اچھا ماتا جی میں ابھی جاتا ہوں۔ شانتی کہیں کہیں باہر ہوگی میں اُسے مارتا ہوا یہاں لاؤنگا کہ ماتا جی تیرے لیے بیاکل ہیں اور تو یہاں گھوم رہی ہے۔"

ماں نے جلدی سے کہا۔ "نا بیٹا۔ شانتی کو مارنا مت۔ بس تم اُسے سمجھا بجھا کر یہاں لے آنا۔"

لڑکے نے جواب دیا۔ "اچھا ماتا جی"

کیشو گھر کے باہر نکلا اور اُسکی ماں دروازے پر کھڑی ہوکر اُسکا انتظار کرنے لگی۔ کیشو نے شانتی کو محلے کے ہر گھر میں ڈھونڈا مگر وہ کہیں نہ ملی۔ ہار کر واپس آگیا۔ ماں کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ شانتی کی بھولی بھالی صورت اُسکی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔

کیشو کو گھر میں آئے ابھی مشکل سے دس منٹ ہوئے تھے کہ شانتی اچھلتی کودتی گھر میں داخل ہوئی۔ اُسکے ہاتھ میں ایک نوجوان جوگن کا گیروا دامن تھا۔ آتے ہی وہ ماں کی گود میں لیٹ گئی اور کہنے لگی۔

"ماتا جی - دیکھو تو یہ سنیاسی جی کیسی اچھی ہیں - ان کے اوپر یہ کپڑے کیسے اچھے لگتے ہیں ماں ہمیں بھی ایسے ہی کپڑے بنوا دو - ہم بھی انھیں سنیاسی جی کے ساتھ رہینگے۔"

ماں نے بچی کو کلیجے سے لگا لیا - اس کے دل میں ٹھیس سی لگی اور آنسوؤں کے دو قطرے اُسکی آنکھوں سے گر کر شانتی کے خوبصورت اور ملائم گالوں پر ڈھلکنے لگے - شانتی نے ماں سے یہ باتیں کر کے سنیاسی سے کہنا شروع کیا "سنیاسی جی ہمیں وہی گانا پھر سنا دو جو تم ابھی اسی ستار پر بجا کے گا رہی تھیں - ہمیں وہ بڑا پیارا لگتا ہے - ہماری ماتا جی کو ضرور اچھا لگیگا - بھیا کیشو آؤ تم بھی یہاں بیٹھ جاؤ - تم سی جی تم بھی ذرا یہاں آؤ - دیکھو ایسا گانا تم نے کبھی نہ سنا ہوگا - غرضکہ شانتی نے سب کو اُس حسین جوگن کے گرد جمع کیا - اُس گیروے لباس میں وہ ایک دیوی معلوم ہوتی تھی - سب کی ضد سے اُس نے نہایت درد بھری آواز میں گانا شروع کیا۔

"میں جو ایسا جانتی کہ پریت کیے دُکھ ہوئے"
"جگت ڈھنڈھورا پیٹتی کہ پریت نہ کیجو کوئے"

جوگن کی آواز میں اتنا درد تھا کہ معصوم شانتی کے سوا سب کی آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔ خود جوگن کی آواز بھی بھرانے لگی - شانتی محوِ حیرت تھی کہ یہ سب کیوں رو رہے ہیں - اس گانے کے بعد کچھ دیر تک ایک خاص قسم کی خاموشی قائم رہی - اُسکے بعد شانتی کی ماں نے جوگن سے پوچھا:-

"سنیاسی جی اس جوانی میں کیا دُکھ پڑا کہ سنیاس لے لیا - تمہاری سندر صورت دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ سدا تمہارے ساتھ رہوں - بھلا بتاؤ کہ تمہارے ہردے پر ایسی کیا چوٹ لگی کہ یہ بال دھرا؟"

نوجوان جوگن کا دل ان محبت بھری باتوں سے بھر آیا - آنکھوں میں آنسو امڈ آئے - وہ بولی:-

"ماتا جی ہم پریم پجاری ہیں - یہ سنسار کا ہردے پریم رس سے خالی ہے - دُنیا کو تیاگ کر اب من چاہتا ہے کہ ایسی بستی بسائیں جہاں پریم ہی پریم ہو - اور ایسا پریم ہو کہ دُکھ اُسکے آس پاس بھی نہ پھٹکے - اس سنسار کے پریم میں تو دُکھ ہی دُکھ ہے۔"

"سنیاسی جی کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ ہم سب کے ساتھ رہتیں۔"

"ماتا - تمہارا ہردے پریم رس میں چور ہے - مگر اب تو میں نے اس بستی کو تیاگ دینے کی دل میں ٹھان لی ہے - پریم نگری سے پریم رس کی مدھر تانیں اٹھ اٹھ میرے ہردے کو اپنی اور کھینچ رہی ہیں اب میں یہاں نہیں ٹھہر سکتی"۔

یہ کہہ کر جوگن چلنے کے لیے تیار ہوگئی۔ شانتی نے اُسکا دامن پکڑ لیا اور کہا " سنیاسی جی میری گڑیوں کے بکس میں دو موتی چور کے لڈو رکھے ہیں وہ بلا کھلائے میں آپکو کہیں جانے نہ دونگی۔ یہ کہہ کر وہ دوڑی ہوئی گئی اور ایک پھول کی تھالی میں دو لڈو رکھ کر لے آئی - ایک گنگا جمنی لوٹا دھویا اور ٹھنڈا پانی لا کر رکھ دیا۔ سنیاسی کے دل پر اس محبت کا بے حد اثر پڑا - اُس نے ایک لڈو خود کھایا اور اپنے ہاتھ سے شانتی کو کھلایا - باوجود انتہائی کوشش کے بھی وہ شانتی کے یہاں نہ ٹھہری اور گاتی ہوئی چلدی :-

میں جو ایسا جانتی کہ پریت کیے دکھ ہوئے　　نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پریت نہ کیجو کوئے

۲

بھولی بھالی شانتی بلا کی ذہین تھی - اُسے سنیاسی کا گانا اس قدر بھایا کہ اُسے زبانی یاد کر لیا - وہ جس وقت اُسے اپنی نازک اور رس بھری آواز میں ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں گاتی تو ہر ایک کو بے حد بھلا معلوم ہوتا - شانتی اُسے گا کر بہت خوش ہوتی - وہ اگر کسی کو رنجیدہ دیکھتی تو اپنے سُریلے گانے سے اُسے مسرور کرنے کی کوشش کرتی - محلہ میں کوئی ایسا نہ تھا جو اُس سے محبت نہ کرتا ہو - کسی کا دل ایسا نہ تھا جو اُسکے بھولے بھالے گانے کے سُننے کا مشتاق نہ ہو۔

شانتی کے پڑوس میں ایک بہت غریب عورت رہتی تھی - اُسکی آنکھوں کا تارا اور زندگی کا سہارا صرف ایک اولاد تھی وہ اُس سے بے حد محبت کرتی تھی - طاعون پھیلا اور اُس غریب دکھیاری عورت کے جگر کا ٹکڑا اُس سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گیا - اُسکا سکھ چین اُس سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگیا - دن رات اُسے رونے کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا - شانتی محلہ بھر کی عورتوں کو موسی کہتی تھی - ایک دن شام کو وہ اُس غریب عورت کے یہاں گئی - اُسے روتا ہوا دیکھ کر اُسے بیحد رنج ہوا اُسکے پاس گئی اور اپنی گلابی ساری کے پلے سے اُسکے آنسو پونچھ کر بولی " موسی - تم ہمیں نہ کہانی

سنایا کرتی تھیں۔ اچھا آج ہم تمھیں گانا سنائینگے"۔ اُسے گھسیٹ کر اُسکی کھٹری پر لے گئی جو انگنائی میں بچھی ہوئی تھی۔ اور بولی "موسی تم اسی پر لیٹ جاؤ، اور پھر میں تمہیں گانا سناؤں"۔ غریب عورت کا دل اس چھوٹی سی بچی کی محبت دیکھکر بھر آیا۔ اُس کا بچھڑا ہوا لال اُسے یاد آگیا۔ آنسو اور تیزی سے بہنے لگے۔ شانتی نے آنسوؤں کو نہیں دیکھا۔ اور دردبھری آواز میں پھر وہی جوگن والا گانا شروع کیا :-

"میں جو ایسا جانتی کہ پریت کیے دُکھ ہوے نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پریت نہ کیجو کوے"

غریب عورت کے آنسوؤں کی روانی اور بڑھ گئی۔ مگر معصوم شانتی اپنے گانے میں مست تھی۔ اُسے یہ خیال نہ تھا کہ اُسکا گانا محبت سے بھرے ہوے دل کے لیے ایک قیامت تھا۔!

۳

شانتی کی عمر اب چودہ برس کی تھی۔ شباب نے اُسکی سیرت اور صورت کے حُسن میں ایک نمایاں اضافہ کیا۔ اُسکا حُسن لوگوں کے لیے قابل پرستش بن گیا۔ وہ ایک حسن کی دیوی تھی۔ مگر بھولی بھالی شانتی کو ان باتوں کا بالکل احساس نہ تھا۔ وہ خود کو کسی بات میں کسی سے بہتر نہ سمجھتی۔ اور یہی اُسکے حُسن کا سب سے بہتر گہنا تھا۔ شانتی کی ماں کئی سال سے یہ سوچ رہی تھی کہ وہ کاشی، تربینی، اجودھیا اور ہردوار کی تیرتھ یاترا کرے۔ اُسکی پہلی تمنا یہ تھی کہ وہ شانتی کا شباب دیکھے وہ پوری ہوئی اور اچھی طرح پوری ہوئی۔ اُسکی دوسری تمنا تیرتھ یاترا تھی۔ وہ بھی خیال تھا کہ کبھی نہ کبھی پوری ہوجائیگی۔ ساون کی پہلی پھوار کے ساتھ شانتی اور اُسکی بوڑھی ماں کا سفر شروع ہوا۔ ہردوار کا جی کے درشن ہوے گنگا جی کی روانی میں شانتی کو جوگن والا گانا سنائی دیا۔ اُسکا دل خوشی سے بھر گیا۔ ہردوار کی دل خوش کن فضا کو خیرباد کہا گیا۔ اجودھیا جی میں عقیدت کے کم مایہ لیکن قابل قدر پھول چڑھائے گئے۔ شانتی نے اپنے ہاتھ سے تازے تازے پھول اور کنویں کا ٹھنڈا پانی چڑھایا۔ اجودھیا جی کے مندر کے پروہت کے گیروے کپڑوں نے جوگن کی یاد دلادی۔ اُسکا گانا کانوں میں گونجنے لگا۔ شانتی کے دل میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ دوسرے دن اجودھیا کی مقدس زمین کو خیرباد کہا گیا۔ شانتی کو وہاں کی زمین دامنگیر معلوم ہوئی۔ اُسے رام کا بن باس یاد آگیا۔ دل میں غم کی تاریکی دوڑی۔ مگر جوگن کے پُر ترنم گانے کی یاد اُسے اُڑا لیگئی۔ شانتی پھر خوش تھی ——— اجودھیا سے رخصت ہونے کے بعد معتقد پجاری کاشی پہونچے۔ رات ایک دھرم شالہ میں بسر کی۔ نور کا تڑکا ہوا۔ شانتی اور اُسکی

ماں گھر سے روانہ ہوئی۔ شانتی نے سپید رنگ کی ساری باندھی۔ داہنے ہاتھ میں پھولوں کی ٹوکری لی، بائیں ہاتھ میں ایک گنگا جمنی چمکدار لوٹا اور دل میں اعتقاد کی نازک کلیاں جو ہر قدم پر چٹک چٹک کر پھول بنتی جا رہی تھیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سورج نکلنے سے قبل ماں و بیٹی گنگا کی سیڑھیوں پر پہونچیں گنگا کے پوتر پانی نے ان کا خیر مقدم کیا۔ پانی کی پہلی لہر شانتی کے کنول جیسے پاؤں پر لوٹی۔ اور دوسری اسکی ماں کے قدم پر۔ شانتی نہائی۔ گنگا مائی خوش تھیں کہ ان کے پجاریوں میں سب شانتی بھی تھی! شانتی نے ماتھے پر سیندور لگایا۔ سورج کی پہلی کرن تڑپ کر اس پر پڑی۔ شانتی کے چاند سے مکھڑے کی چھوٹ نے گنگا کے پانی میں ایک قسم کی چمک پیدا کر دی۔ شانتی ان سب باتوں سے بے خبر تھی۔ اُس نے پانی کا لوٹا بھرا اور مندر کی طرف چل دی!

شانتی نے مندر میں اپنا پاؤں رکھا۔ اُسکے دل میں ایک دھڑکن سی پیدا ہوئی۔ جوگن کی موہنی صورت اسکی نظروں کے سامنے آگئی۔ دل خوش ہو گیا اور مندر کے اندر داخل ہوئی۔ وشنوجی کا پوجا کیا اور پھول اور پانی چڑھا کر رسیلی آنکھیں اوپر کو اٹھائیں اور دعا کی:- "جگت داتا مجھے پریم ساگر میں ڈبو دے۔ میرے ہردے کو پریم رس سے بھر، تاکہ میرے کانوں کو بس پریم کی مدھر بانی ہی بھلی لگے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ابھی شاید شانتی کی دعا پوری نہیں ہوئی تھی کہ اسکی ماں گرمی کی وجہ سے وہاں بیہوش ہو کر گر پڑی۔ شانتی کے اوسان جانے رہے۔ عین اسی وقت ایک حسین جوان نے اسکی ماں کے چہرے پر گلاب چھڑکا۔ شانتی نے اپنی سفید ساری کے دامن سے اپنی ماں کے چہرے کو ہوا دی۔ شانتی کی ماں کو ہوش آگیا۔ شانتی کی رسیلی آنکھوں نے اٹھ کر نوجوان کی مہربانی کا شکریہ ادا کیا۔ نوجوان پر جادو سا ہو گیا۔ شانتی کو بھی منہ مانگی مراد ملی۔ پریم کا دیوتا اسکی آنکھوں کے سامنے تھا! دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ تڑپ کر دیکھا۔ اور دیر تک دیکھا۔ پھر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شانتی اپنی ماں کے ساتھ گھر چلی آئی۔ گھر میں داخل ہوتے وقت اُس جوگن کا جادو بھرا گانا اُسے یاد آیا۔ گیارہ برس میں یہ پہلا اتفاق تھا کہ گانے کے ساتھ اسکی آنکھوں سے آنسو ٹپکے۔ آج تک اُس نے اس گانے کا صحیح مطلب نہیں سمجھا تھا۔ لیکن آج اُس کا دل، زبان اور آنکھوں کے آنسو ہم نوا ہو کر کہہ رہے تھے۔

"میں جو ایسا جانتی کہ پریت کیے دکھ ہوئے　　نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پریت نہ کیجو کوئے"

۴

شانتی ایک رات گھر سے غائب ہوگئی۔ اُس کی ماں اور بھائی دونوں غمگین تھے۔ بچپن میں شانتی کے کھو جانے کے بعد صرف کیشو اُسے ڈھونڈھنے گیا تھا۔ آج اسکی دکھیاری ماں بھی اُسکے ساتھ تھی۔ دونوں نے ہندوستان کا کونہ کونہ چھان مارا مگر شانتی لاپتہ تھی۔ ماں اور بھائی پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ دونوں نے سوچا کہ ہردوار جائیں۔ ماں بیٹے روانہ ہوئے۔ میلہ کا مہینہ تھا۔ دونوں محبت کے دیوانے پہاڑی راستہ طے کر رہے تھے۔ تھکان محسوس ہوا اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے شام ہوگئی۔ دونوں نے پھر سفر کا ارادہ کیا۔ پہلا قدم اُٹھایا تھا کہ دفعتاً ایک نوجوان لڑکی کی نہایت دردناک مگر مانوس آواز سُنائی دی "میں جو ایسا جانتی کہ پریت کیے دُکھ ہوئے"

تھوڑی دیر خاموشی رہی اور پھر پہاڑیوں کے دوسرے کونے سے ایک ادھیڑ عورت کی تھراتی ہوئی آواز سُنائی دی۔ آواز جسے کانوں نے پہلے بھی سُنا تھا کہہ رہی تھی:-

"نگر ڈھنڈورا پیٹتی کہ پریت نہ کیجو کوئے"

آوازیں رفتہ رفتہ آگے کو بڑھیں اور تھوڑی دیر میں "چار" پریمی ایک جگہ جمع ہوگئے۔ ہر ایک کے دل میں وہی سوز تھا اور ہر ایک کی زبان پر وہی نغمہ!!!

کالی پرشاد صاحب صبا استھانہ سندیلوی

خالص اُردو باتباع اُستاد معظم حضرت آرزو لکھنوی

رہے سہے تھے جو کچھ وہ تو شکھ سے کٹ جاتے
جو آپ آتے برے دن مرے پلٹ جاتے

کبھی دکھاتے ہمیں بھی جو چاند سا مکھڑا
کوئی کلنک لگا تا نہ آپ گھٹ جاتے

کسی کے ملنے کی جی سے جو لو لگی ہوتی
تو سچ سمجھیے کہ گنتی کے دن بھی گھٹ جاتے

کبھی تو پوچھتے کیا چاہتا ہے کون ہے تو
لگا کے آس جو چپ چوکھٹ پہ اُنکی ڈٹ جاتے

تڑپ کے رہ گئی کاٹھی میں آپکی تلوار
جو ایک ہاتھ بھی پڑتا تو لاکھ کٹ جاتے

جھلک دکھاتے تو پھر دیکھتے لگی جی کی
کہ اُنکے پاؤں سے ہم دوڑ کر لپٹ جاتے

جو اُنکی دُھن میں پہنتے نہ ہتکڑی بیڑی
بھلا تھا شاد کہ وہ ہاتھ پاؤں کٹ جاتے

"نوشابہ"

(جناب سید محمد صالح صاحب شمس - نونہروی)

نوشابہ کی شادی کو پانچ برس ہو چکے ہیں۔ میاں کی بیرسٹری زوروں پر ہے۔ روپیہ پیسہ بہت افراط کے ساتھ موجود ہے۔ نوکر چاکر ماما دائیوں سے گھر بھرا ہوا ہے۔ میاں کی صورت بھی کچھ ایسی بری نہیں۔ اُن کے شوق بھی کچھ زیادہ قابل اعتراض نہیں۔ بس یہی کہ ذرا منچلے ہیں۔ انکے لیے ہر عورت میں ایک خاص حُسن ہے اور ایک علیحدہ ذائقہ۔ ماما دائیوں پر بھی ڈورے ڈال لیتے ہیں۔ مگر اسکے معنی یہ نہیں کہ بیوی کا خیال نہ رکھتے ہوں۔ نوشابہ انکی عزت کی امین تھی۔ وہ آیندہ نسلوں کی ماں تھی۔ وہ شرعی حیثیت سے حاصل کی گئی تھی۔ اس لیے وہ قابل احترام تھی۔ اس کا دل کُڑھانا مناسب نہیں تھا مگر اسکا کیا علاج کہ نوشابہ آئے دن بیمار رہتی تھی۔ آج نزلہ ہے، کل سر میں درد ہے، پرسوں بخار ہے اس پر طرہ یہ کہ اختلاج بھی ساتھ ہی ساتھ۔ چہرے کی زردی اور آنکھوں کے گرد حلقہ بڑھتا ہی جاتا تھا حکیم، ڈاکٹر، وید سب کا علاج کیا۔ اول تو دوا نہ پیتی تھی۔ دوسرے اگر بہت اصرار سے پی بھی تو دوا پانی ہو جاتی تھی۔ کبھی کوئی اثر ہی نہ ہوا۔ مزاج میں خاموشی بھی حد سے زیادہ۔ لاکھ پوچھو کہ کیسی طبیعت ہے، کیسا مزاج ہے۔ نہ منہ سے بولتی تھی نہ سر سے کھیلتی تھی۔

ڈاکٹروں نے بالآخر یہ رائے دی کہ ایسی صورتیں کی جائیں جن سے اُس کا دل بہل سکے۔ بیرسٹر صاحب نے غور و فکر کی۔ ایک دن کچھ گانے والیوں کو بلایا۔ بڑے ہال میں فرش لگایا گیا۔ احباب و موکلین آ کے بیٹھے۔ بغل والے کمرے میں نوشابہ چلمن چھوڑ کے بٹھائی گئی اور ناچ گانا شروع ہوا۔ اس شب میں اور اسکے بعد دن میں بھی نوشابہ کے چہرے پر ہلکی سی مسرت دکھائی دی۔ بیرسٹر صاحب نے

سوچا اچھا نسخہ ہاتھ آیا۔ دوسرے دن پھر محفل رہی۔ نوشابہ پھر خوش رہی۔ اب برابر یہی معمول ساہو گیا کہ آئے دن نوشابہ کے بہلانے کے لیے کبھی گانا ہورہا ہے۔ کبھی ناچ، کبھی ڈومنیاں بلائی جارہی ہیں کبھی بھانڈ، کبھی بائسکوپ کی سیر ہے تو کبھی تھیٹر کی۔ نوشابہ کی حالت بھی سدھر چلی۔ چہرے پر رنگ دکھائی دینے لگا۔ آنکھوں میں شرارت کی چاپ عود کرنے لگی۔ پتھر کے بت کی جگہ جوان عورت معلوم ہونے لگی۔ اسی خوشی میں بیرسٹر صاحب نے اپنے شاعر دوستوں کی تحریک سے مشاعرے کی ٹھان دی۔ مصرع طرح چنا گیا، کارڈ چھپوائے گئے۔ بڑے بڑے شعرا کے گھروں پر جا جاکے وعدے لیے گئے۔ اور جو مشاہیر دوسرے شہروں میں مقیم تھے انکے پاس خطوط لکھے گئے۔

ہال میں دودھ کی دھلی چاندنی بچھی۔ اسکے حاشیوں پر بیضاوی قطع سے متعدد قالین اس طرح بچھائے گئے کہ ایک حلقہ سا بیچ میں خالی اور چاروں طرف نشست کے لیے ایرانی قالین۔ ہر قالین پر دو دو تین تین گاؤ رکھے گئے تاکہ لوگ ٹیک لگا سکیں اور مشاعرے میں تاخیر ہونے سے کیل کی طرح بیٹھے بیٹھے گھبرا نہ اٹھیں۔ پچاسوں سگریٹ کے ٹین اور سگار کے بکس منگوائے گئے۔ جھوا بھر پان بنواکے رکھ دیے گئے۔ کئی دیگ کشمیری چا تیار کرائی گئی اور بیرسٹر صاحب میزبان کی طرح لوگوں کے استقبال کے لیے دروازے پر کھڑے ہو جو آتا اُس سے صاحب سلامت کرتے۔ ایک دوست آگے بڑھ کے عطر لگاتے۔ دوسرے شناسائی آنے والے کو ہار پہناتے تیسرے صاحب پان کی گلوریاں اور تمباکو پیش کرتے۔ چوتھے سگریٹ اور سگار بڑھاتے۔ غرض یوں ہاتھوں ہاتھ انھیں بزم مشاعرے تک لاتے اور انکی حیثیت اور علمی قابلیت کے لحاظ سے ایک مقام پر بٹھا دیتے۔

کوئی نو بجے تک سب لوگ آگئے اور مشاعرہ شروع ہوا۔ عین اُس وقت جب کہ مشاعرہ ذرا گرمایا ایک صاحب آشفتہ مو، گیروا بستر پہنے السلام علیکم کہتے ہوئے بزم میں داخل ہوئے۔ لوگ انکی وضع قطع اور انکی اس بدتہذیبی سے کہ بیچ مشاعرے میں یوں ٹوک کے السلام علیکم کا نعرہ لگایا۔ ذرا بھنّا کے ہوئے۔ کچھ لوگ کسمسائے بھی مگر پڑھنے والے صاحب کی چونچلہ بندیوں اور گلے بازیوں نے اس جوش کو انکی تعریف میں بدل دیا اور واہ واہ سے چھتیں اڑ گئیں۔ لوگوں کی یہ حالت کہ چیختے چیختے گلے پڑ گئے۔ غرضکہ جب یہ ہنگامہ موقوف ہوا اور اُن صاحب کی غزل ختم ہوئی تو سودائی اُٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ جوڑ کے صدر سے عرض کیا "میں بھی غزل کہہ کے لایا ہوں، پردیسی ہوں، اجازت دیجیے کہ پڑھ کر چلا جاؤں"۔

صدر نے بیرسٹر صاحب کی طرف دیکھا۔ انھوں نے چپکے سے کہا "یہی مناسب ہے۔ کچھ خبطی سا معلوم ہوتا ہے پڑھ لینے دیجیے۔ ورنہ نہ معلوم بعد میں کیا فساد برپا کرے"۔ انھوں نے کہا "بسم اللہ"۔ آپ نے تسلیم کی اور وہیں سے کھڑے کھڑے غزل پڑھنا شروع کر دی۔ مطلع تھا۔ ؎

ہوتا دلِ حزیں جو مرے اختیار میں
پھر دیکھتا نہ کوئی مجھے کوے یار میں

پڑھتے وقت حالت یہ تھی کہ دونوں آنکھوں سے آنسو جاری، سینہ پر ہاتھ، آواز میں اس قدر درد کہ شعر نوحہ بن گیا۔ محفل پر پہلے تو سناٹا سا چھایا۔ پھر شاعر نے جھوم جھوم کے مطلع کو دہرایا، ساری محفل نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ تیسری بار شاعر نے پھر مطلع پڑھا۔ اب کے لوگوں نے سر دھننا شروع کیا۔ اب تو یہ حالت تھی کہ اچھی خاصی محفل مشاعرہ، مجلس ماتم بن گئی۔ کلام میں کوئی خاص خوبی نہ تھی۔ یہی روزمرہ کی پیش پا افتادہ باتیں تھیں۔ یہی معشوق سے گلے شکوے، ہجر کا رونا، اپنی ناکامی کا غم، مگر شاعر پڑھتا اس طرح تھا اور اسکے حرکات و سکنات اس طرح کے فطری تھے کہ ہر شعر تیر و نشتر کا کام دے رہا تھا۔ ساری محفل معمول ہو رہی تھی۔ آثار غم ہوں یا آثار خوشی دونوں ساری ہوتے ہیں۔ ایک کو دیکھ کے دوسرا۔ دوسرے کو دیکھ کے تیسرا رونے لگا۔ بیرسٹر صاحب گھبرا کے اپنی جگہ سے اٹھے لیکن قبل اسکے کہ وہ اس اجنبی شاعر کے قریب آ سکیں اس نے اپنی بے مقطع کی غزل ختم کی اور ایک آہ کھینچی۔ پھر سر دھنتا اپنا یہی مطلع ؎

ہوتا دلِ حزیں جو مرے اختیار میں — پھر دیکھتا نہ کوئی مجھے کوے یار میں

پڑھتا ہوا مشاعرے سے باہر نکل گیا!

جیسے ہی یہ مجذوب مشاعرے سے نکلا اس کمرے سے جدھر نوشابہ کے لیے چلمن ڈال دی گئی تھی ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ نوشابہ روتے روتے بیہوش ہو گئی تھی!۔

ڈاکٹروں کی رائے ہوئی کہ نوشابہ کے لیے تبدیل آب و ہوا کی سخت ضرورت ہے۔ شروع میں ایک جگہ جم کے نہ رہے۔ مختلف مقامات کی سیر کر لیجیے۔ پھر چاہیے پہاڑ پر چلے جائیے گرمیوں بھر قیام کیجیے۔ بڑے دن کی تعطیل تھی بیرسٹر صاحب کو بھی چھٹی تھی۔ بیوی کو ساتھ لے کے آگرے پہنچے۔ نوشابہ کو ریل سے قلعہ اور تاج کا منظر بے حد پسند آیا تھا۔ پھر شہر کی چار سو برس پرانی وضع کی عمارتوں اور پتھر کی

سڑکوں پر بڑی ہنسی آئی تھی۔ ہوٹل میں منہ ہاتھ دھو کے ناشتہ کر کے تاج دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئی۔

وہ آہستہ آہستہ میاں سے ہر چیز کی تعریف کرتی ہوئی اس زینے پر چڑھی جہاں سے تاج کی اصل عمارت شروع ہوتی ہے بڑے حوض میں سرخ سبز مچھلیوں کا تماشہ دیکھا۔ پھر مقبرے میں داخل ہوئی۔ وہاں کی محنت کاری، پچی کاری دیکھی۔ تہہ خانے میں جا کے چھیتے میاں بیوی کی قبروں پر فاتحہ پڑھا پھر اس طرف متوجہ ہوئی جدھر دریا کے کنارے عمارت کے کونوں پر مینار بنے ہیں۔

راستے میں بیرسٹر صاحب کے ایک پرانے دوست مل گئے۔ نوشابہ برقعہ پوش تو تھی ہی جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ بیرسٹر صاحب رک کے اپنے دوست سے باتیں کرنے لگے۔ ماما دائیاں جلدی جلدی مینار پر چڑھنے لگیں مگر نوشابہ کنارے پر آ کے دریا کا سماں اور قلعے کے اس مقام کو حسرت سے دیکھنے لگی جہاں سے شاہجہاں بیوی کا مقبرہ بیٹھا دیکھا کرتا تھا۔ دفعتاً اسے ایسا محسوس ہوا کہ اسے کوئی قوت اس طرف کھینچ رہی ہے جدھر دریا کے کنارے والا دوسرا مینارہ تھا۔ اس نے پلٹ کے ادھر دیکھا۔ ایک شخص گرد آلود پھٹے فرش پر بیٹھا ہوا تھا۔ نوشابہ کا دل دھڑکنے لگا۔ ہونٹوں پر خشکی سی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنی زبان ہونٹوں پر پھرائی اور آہستہ آہستہ شاہ جی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ شاہ جی نے نظر اٹھا کے دیکھا۔ ایک برقعہ پوش عورت آتی دکھائی دی مگر چال کچھ پہچانی ہوئی تھی۔ قد اور انداز بھی کسی تصویر سے ملتا جلتا تھا۔ گھبرا کے کھڑے ہو گئے۔ ہاتھوں میں اس قدر رعشہ ہوا کہ تسبیح ہاتھ سے گر گئی۔ نوشابہ اب بالکل ہی قریب پہنچ گئی تھی۔ اس نے گھبرا کے چہرے سے نقاب اٹھا دی۔ شاہ جی نے کانپتے ہوئے ہونٹوں سے کہا "نوشابہ!"

نوشابہ نے ہونٹ چاٹ کے کہا "سعید!"

پھر دونوں ساکت کھڑے ہو گئے۔ ایک دوسرے کو بغور دیکھنے لگے۔ مگر وہ جو کچھ دیکھ رہے تھے وہ بادی النظر میں نہیں دکھائی دیتا تھا!۔

سعید نے اس وقت نوشابہ کو پہلے تین برس کا دیکھا جب کہ وہ تتلی زبان سے اسے "تیند بھیا" کہنے لگی تھی، پھر اسکو پانچ برس کا دیکھا جب وہ ایک دن اس سے خوب لڑی تھی اور اسے محض اس جرم پر خوب کوسا کاٹا تھا کہ اس نے نوشابہ کی گڑیا لے کے اپنی خالہ کی لڑکی رابعہ کو صرف چپ کرانے کے لیے دے دی تھی۔ اس دن نوشابہ نے اس جرم پر سعید کے بال خوب نوچے تھے اور شکایت ماموں جانی تک

پہونچی تھی۔ ماں نے بھی بیٹی کا ساتھ دیا تھا اور سعید کو جو ماں باپ کے مرجانے سے ایکے ٹکڑا دل کا محتاج تھا خوب ڈانٹا تھا۔ پھر اسکو وہ نو برس کی لڑکی دکھائی دی جس نے سعید کو اپنے ہاتھ سے پہلے پہل پکا کے میٹھے پراٹھے کھلائے تھے۔ پھر اسے دہ بارہ برس کی نوشابہ کھائی دی جس نے اس سے شرمانا اور چھپنا شروع کر دیا تھا۔ پھر وہ پندرہ برس کی نوشابہ دکھائی دی جس نے اس کے سینے پر سر رکھ کے قسم کھائی تھی کہ "میں دنیا میں تمہارے سوا کسی اور مرد سے محبت نہ کرونگی"۔ اور جس نے اس حالت میں سب کی آنکھ بچا کر ایک معمولی چاندی کا چھلّا اپنے ہاتھ سے اتار کر اسکے ہاتھ میں اپنی یادگار کے طور پر پہنایا تھا، اور آخری بار اس نے اس نوشابہ کو دیکھا جو عروسی کے کپڑے پہنے، عطر عروسی سے بسی، بیرسٹر نعیم سے بیاہی جا رہی تھی...... اور اس نے کانپتے جلدی سے اپنے ہاتھوں سے ایک چاندی کا چھلّا اتارا اور نوشابہ کی طرف پھینک دیا اور دیوانہ وار یہ شعر پڑھا۔ ؎

"تو آں قاتل کہ از بہر تماشہ خون می ریزی
من آں بسمل کہ زیر خنجر خونخوار می رقصم!"

اور قبل اسکے کہ نوشابہ کوئی جواب دے وہ دریا میں پھاند پڑا! نوشابہ نے ایک چیخ ماری اور وہیں بیہوش ہو کے گر پڑی!!۔

نوشابہ نے اس واقعہ کے چھ مہینے بعد شوہر کو بلا بھیجا۔ بیرسٹر صاحب آئے تو اس نے ماما سے اشارا کیا کہ انکے لیے ایک کرسی اسکے بستر علالت کے متصل رکھ دی جائے۔ جب ماما کرسی رکھ کے چلی گئی اور بیرسٹر صاحب نے پوچھا "کیوں کیسا مزاج ہے؟" تو وہ ذرا مسکرائی۔ مگر یہ مسکراہٹ اس طرح کی تھی کہ بیرسٹر صاحب کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ اس نے کہا "میں نے آپ کو...... اس لیے بلا بھیجا ہے کہ...... میں آپ سے اپنے قصور معاف کرالوں"۔ بیرسٹر صاحب نے نوشابہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کے کہا "تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ تم نے میرا کون سا قصور کیا ہے، خواہ مخواہ کی باتیں!"

اس نے کہا "نہیں۔ میں نے سب سے بڑا قصور کیا۔ میں آپ کی بیوی تھی۔ مجھ پر فرض تھا کہ میں آپ سے دل سے محبت کرتی.... مگر میں نے آپ سے کبھی محبت نہ کی!"

بیرسٹر صاحب نے نوشابہ کو تعجب سے دیکھا۔ اس نے سر ہلا کے کہا "یہ میرا قصور ہے۔ اور چونکہ میں بری

تھی لہٰذا یہ گناہ بھی ہے - مگر میں یہ چاہتی ہوں کہ آخری وقت ..... آپ مجھے للّٰہ کہنے دیجیے .... یہ میرا آخری ہی وقت ہے ..... میں جانتی ہوں ..... میں نے آپ کو بڑی تکلیف دی ..... آپ کا بڑا روپیہ خرچ کرایا ...... اچھا یہ آپ کا فرض عین سہی ..... مگر میں نام ہی کی بیوی تھی ..... میرا دل تو دوسرے کے پاس تھا ...... غصہ نہ کیجیے میں صرف خیال کی مجرم ہوں فعل کی نہیں ...... واقعہ یہ ہے کہ میں اور سعید ایک ساتھ پالے گئے - ایک ہی ساتھ کھیلے اور پڑھے ..... وہ میری پھوپھی کے لڑکے تھے مجھ سے پانچ چھ برس سن میں بڑے تھے .... مجھے ان سے محبت ہو گئی .... میں نے ان سے شادی کا وعدہ کر لیا .. مگر وہ انٹرنس پاس کرنے کے بعد پچاس سے زیادہ کی ملازمت نہ حاصل کر سکے ..... میں اپنے ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی ..... پھر میں نے پڑھا لکھا بھی تھا ..... انھوں نے سعید کی جگہ آپ سے شادی کر دی .... میں اسی وجہ سے بیمار رہی ..... سعید میری شادی کے بعد سے لاپتہ تھا .... اس دن مشاعرے میں وہی گیروا بستر پہنے آیا تھا ..... شادی کے بعد پہلی دفعہ میں نے اس دن اسے چلمن سے دیکھا .... جب اس نے یہ مطلع پڑھا:

> اتنا دلِ حزیں جو مرے اختیار میں
> پھر دیکھتا نہ کوئی مجھے کوئے یار میں

اور میں نے اسکی آواز پہچان کے اسکی دیوانی صورت دیکھی تو میں بیہوش ہو گئی ..... ذرا سا مجھے پانی پلا دیجیے ..... الحمدللّٰہ - خدا آپ کی ساری زندگی خوشی سے بھر دے ! .... دوسری بار مجھ سے سعید سے تاج محل میں ملاقات ہوئی - وہی جب آپکے دوست مل گئے تھے وہ اس دن بھی وہی گیروا لباس پہنے تھا - اس نے مجھے پہچان لیا - اور مجھے یہ چھلہ .... دیکھیے اسے میری قبر میں رکھوا دیجیے گا ..... یہ یادگار چھلہ واپس دے کر اپنی جان تاج محل سے دریا میں پھاند کے دے دی - میں اس وجہ سے بیہوش ہو گئی تھی ...... اب میں زندہ کیسے رہ سکتی ہوں - وہ میری وجہ سے پاگل ہوا ...... اس نے میری وجہ سے جان دی ..... میں اسکے بعد زندہ رہ کر خدا کو کیا منہ دکھاؤنگی؟

میں ہاتھ جوڑتی ہوں ..... میرا قصور معاف کر دیجیے گا - میں مجبور .... بالکل مجبور تھی !"

بیرسٹر صاحب نے بیوی کا ہاتھ تھپک کر کہا "میں نے معاف کیا - میرے خدا نے معاف کیا - اس میں تمہارا قصور نہیں - ہماری رسموں کا قصور ہے، جو یوں لڑکیوں کا گلا گھونٹ کے زبردستی شادی کی جاتی ہے!"

نوشابہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی - اسکی آنکھیں دفعتہً بند ہو گئیں ! اور وہ آن واحد میں اس ظلمت کدہ کو چھوڑ کر جاودانی مسرت کی دنیا میں سعید سے جا ملی !!-

---

قاضی جی

مزاحیہ — مزاحیہ

(جناب حکیم سید محمد کاظم صاحب موہانی)

(سلسلے کے لئے "ادب" ماہ دسمبر ۱۹۳۱ء ملاحظہ ہو)

قاضی صاحب شادی کرنے جاتے ہیں

اس مشکل سے نجات پاکر اب اسٹیشن جانے کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ ہمراہان باوفا گھڑی گھڑی سے آوازوں پر آوازیں لگا رہے ہیں۔ صبح کا بلغم آلود حنجرہ پھاڑے رکھے دیتے ہیں۔ ہوشیار باش کی پکار طباخہ ہی کہ باوصف پیرانہ سالی، جوانی کی نیندیں لے رہی ہیں طباخ در بغل نہ غم عشق نہ غم کالا۔ مگر قاضی صاحب ہیں کہ پکارے جاتے ہیں۔ ہائے یہ چیخ پکار قاضی صاحب کی بیکار نہ گئی۔ طباخہ کیا بلکہ محلہ کا محلہ سمجھ گیا۔ کہ حضرت کی سواری باد بہاری بی شادی کے لیے کولہ پانی دے چکی اور اب سیٹی پر سیٹی دے رہی ہے۔ قاضی جی طباخہ کو پکارتے جاتے ہیں اور رخت سفر کی بندش و درستی میں مصروف۔ آخر میں دست بقچہ لباس سنی مون مکمل کرکے گھر سے برآمد ہوئے۔ یہاں طباخہ بھی اتنے عرصہ میں مع طفلی و طفل خرد سال لیس ہوکر اسٹارٹ کی منتظر۔ قاضی صاحب نے دست بقچہ سنبھالا، نہتے ہمراہیوں نے چھوٹی چیزیں ہتھیائیں۔ بی طباخہ بنڈل کلاں برسر بہ معیت قاضی صاحب سب جانب اسٹیشن ہوا خوری کرتے رواں ہیں۔ وقت کافی ہے مگر قاضی صاحب قبل از وقت

پہونچ جانا بہ لحاظ موقع مناسب سمجھتے ہیں۔ بقچہ در بغل، پولی عشق پر سوار ہوائے شوق کے پر لگائے سریع السیر ہیں۔ تا بہ اسٹیشن سب رفیقان راہ فرلانگ بہ فرلانگ چھوٹ گئے۔ اور ایک ساعت قبل قاضی صاحب اسٹیشن پر موجود۔ رفتہ رفتہ ہمراہی بھی ایک ایک کرکے پہونچے۔ مگر پہونی راہ کے شاکی۔ قاضی صاحب بیخودی شوق سے معذوبیت کا اعتراف کرتے ہوئے خواستگار معافی ہوئے دی گئی۔ شکر رنجیاں دور ہوئیں۔ اب پان خوری ہو رہی ہے۔ اور قاضی صاحب یہ ساعت انتظار نہیں کاٹ رہے ہیں بلکہ جوئے شیر لا رہے ہیں۔ خدا خدا کرکے یہ مصیبت کی گھڑی کٹی۔ گاڑی اسٹیشن پر پہونچی۔ آپ سمجھیے، وحشی ہندوستانیوں کا ریل پر چڑھنا اترنا، اور پھر تھرڈ کلاس مسافر، بھیڑ یا دھسان تھی۔ قاضی صاحب کچھ تو فطرت ہندی سے مجبور، کچھ نشۂ بیخودی سے مخمور۔ قبل اسکے کہ گاڑی رکے، اور مسافر اتر جائیں۔ چلتی ہی گاڑی میں دو چار گاڑیاں جھانکیں، ایک گاڑی کا دروازہ کھلا پاکر آؤ دیکھا نہ تاؤ گھس ہی تو گئے۔ مگر اتری گنواروں کی بھیڑ اترنے والی تھی اسکے سیلاب سے تاب و کشش نہ لاکر آناً فاناً پھر پلیٹ فارم پر موجود ہو گئے ہیں۔ آدھے گنواروں نے ابھی گاڑی خالی نہ کی تھی کہ اس مرتبہ پھر قاضی صاحب نے مع دستہ ہمراہیاں شاندار پسپائی کے بعد جھپٹ کر چڑھنے کے لیے جارحانہ کارروائی شروع کردی۔ بعد ہشت مشت بسیار و کشاکش بے شمار ایک سیٹ پر قبضہ جما کر ہمراہیوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دی۔ اب پان پہ پان گلوری پر گلوری خود بھی نوش فرماتے جاتے ہیں اور اگر طبا خہ کا رخ بدلا دیکھتے ہیں تو اسکی صلاح بھی کر لیتے ہیں۔ گاڑی چلی۔ گو قاضی صاحب کی دلخواہ رفتار سے کم تاہم چل رہی ہے یہاں تک کہ مطلوبہ اسٹیشن آیا۔ حضرت مع رفقا اترے۔ سواری میں بیل گاڑی آنے والی تھی۔ اسٹیشن پر موجود نہ تھی۔ پہونچنے میں کچھ ہی دیر تھی۔ قاضی صاحب کو کیا پروا۔ بی شادی کی پہلی منزل۔ اس پر جوانی کا ٹرہ، ٹرہ میں زور، زور میں فراٹے۔ اونچ دیکھتے ہیں نہ نیچ۔ سمجھتے ہیں کہ اگر ابھی سے کمزوری دکھائی تو آیندہ کا خدا ہی حافظ ہے۔ ہوائے شوق کے پر تو لگے ہی ہوئے تھے۔ اڑے چلے جاتے ہیں۔ بخرام خہلاک ستھیاں جو بھریں، تو ہمراہیوں کو تلاش گاڑی میں اپنی اپنی چال پر چلتا چھوڑ داخل منزل مقصود ہے۔ اگرچہ قاضی صاحب لباس ہنی مون کی خرید انصرام اور اسباب آرائش بی شادی کے چکروں پھیروں میں اتنے منجھ گئے تھے کہ تگ و دو سی چوکسی ریاضت کی کچھ حقیقت نہ سمجھتے تھے مگر پھر بھی تعب و تکان سفر نے خستہ و بکھرا بنا ہی دیا۔ اگر قاضی صاحب بی شادی کو نوازنے والے نہ ہوتے، یا ان کی جگہ کوئی اور ہوتا، تو

تلاشِ آرام میں مردوں سے بازی لگا لینا کچھ مشکل نہ تھا۔ مگر قاضی صاحب جیسی ہی اصل خیر سے کچی سڑک پر قدم با دہاں کرتے گرد و غبار میں آ۔ کے خاکی پتلے بنے۔ غباری نقاب ڈالے گھر پہنچے پالکی دو ڈکر تھلے سے گھونگھٹ کی بلائیں لیں۔ منہ بھر بھر دعائیں دیں۔ گرد راہ سے چہرے کو نقاب پوش دیکھ آیاں کے دل کو تاب کہاں، فوراً دہنی آفتابہ (بدھنی) آیا۔ قاضی صاحب کے ترنت تاؤ روشنائی ترمائی۔ اس سے فارغ ہوئے تھے کہ بہ تخیل قدیم غسل یاد آیا۔ اب نہا رہے ہیں اتنے ہی سکون، روشوئی د غسل سے سب کھلن کافور۔ اب وہی کس بل، وہی دم خم، وہی حلیت پھرت ہے جو قطرت کی غلط بخششوں سے قاضی صاحب کی طبیعت ثانوی بن گئی ہے۔

حضرت نا کے گھر پہنچتے پہنچتے شام ہو چکی تھی۔ شادی کی شروعات ہونے لگی۔ اُبٹنا قاضی جی کے جسم میں ملا جانے لگا۔ مہندی مُٹھی مُٹھی ہاتھوں میں رچنے لگی۔ اور دور قریب کی بہنوں نے اپنا اپنا نیگ مانگنا شروع کر دیا۔

شادی کا گھر

بیاہ کا گھر رونق سے جگمگ جگمگ ہو رہا ہے۔ پنڈول کی قلعی کا بھورا لباس قاضی جی نے اُسے بھی جوڑے میں پہنایا ہے۔ دروازوں پر آم کے پتوں کا بندھن وار ہریالی چھا رہا ہے غرضکہ اندر باہر شادی پھیلی ہوئی ہیں۔ مکان کے اندر صدر دالان میں آٹھ چوکیوں کا فرش، صدر میں مسند تکیہ جس پر مہمان بیبیوں کی نشست ہے۔ پائین فرش سال خوردہ کہنہ مشق قصباتی ڈومنیاں میراثنیں ایک چھوٹے سے حصے پر مع ساز و سامان نیا عماد خانہ کیے ہوئے ہیں۔ صد سالہ نہیں بلکہ ہزار سالہ مجرب، سہرے، بنڈرے ٹپے جو بالکل نچے تلے ہیں اپنے خیال میں منجھی ہوئی ضعیف آوازوں سے تکی سروں میں الاپ رہی ہیں بلکہ سر جوئی کا پر جوش دھارا بہہ رہا ہے قاضی جی بھی جا کے کن رسیا ٹھہرے۔ سامعہ شریف لذت گیر لطف نشاط ہے۔ اُسی دالان کے ایک گوشہ میں نیچر کے بچھائے ہوئے فرش پر حشرات مقامی کا فیمیل ڈیرن (جھینگیں) تنہا اپنی ڈھولک کے بل پر موسلا دھار مینہ، غزل، ٹھمری، دادرا، ٹونا ترانہ، معرفتوں کا شعرا کے کلام میں اپنی اپنی اصلاحیں دے کر برسا رہا ہے۔ قاضی صاحب کے لیے یہ بھی اس ہنگامہ شادی میں "عالمے دارد" کا مصداق ہے۔ بیبیاں کچھ تو گانا سننے میں مصروف۔ کچھ

ایک دوسرے کو دیکھکر اور یہاں آنے کی یہی ایک غرض سمجھ کر اپنی اپنی جان پہچان والیوں سے کن پھوسیوں میں مبتلا۔ کچھ شادی کے گھر کے مہمانوں کے زیور پوشاک کو پہلے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی ہیں۔ پھر نکتہ چینیوں سے انبار گوشہ ہائے دماغ میں لگاتی جاتی ہیں کہ شادی کے گھر سے واپسی پر گھر پہنچتے ہی سب کو نئے کترے دماغ کے جھاڑینگی۔ ہر ایک ایک ملنے والی ہر ایک جان پہچان سے شاعری کی چپٹ دے کر، روک ٹوک کر، خواہ کوئی پوچھے یا نہ پوچھے، سنے یا نہ سنے، سنائینگی اور ایک ایک کی دس دس لگا دینگی۔ دو ایک بیبیاں بڑی بوڑھی جو اگرا کا منتظم بنائی گئی تھیں بوکھلائی ہوئی۔ قابلیت انتظام سے عاری، بات بات پر گلا پھاڑے رکھے دیتی ہیں۔ اتنا گلا پھاڑ کہ اپنی بات آپ ہی نہیں سن سکتیں۔ پانچ اٹھائے انتظام پر مٹی ہوئی بضرورت و بلا ضرورت بیٹھنگی پال سے سارے گھر کا الٹ پلٹ کیے دیتی ہیں۔ خادمائیں، لونڈیاں، باندیاں۔ انمل بے جوڑ کپڑے، گہرے رنگوں کے موٹے ڈوپٹے، موٹی سوسی کے گھٹنے، بھدے یوں بھیجنے اپنے اپنے مالکوں کی قدر کے اندازہ اپنی اپنی پوشاکوں، نقرئی زیوروں سے دکھاتی ہوئی شتر بے مہار کی طرح کسی مقام کی تخصیص کیے بغیر جدھر منہ اٹھایا پہونچ گئیں۔ گھر بھر میں بیر بہوٹیوں کی طرح پھیلی ہوئی ہیں۔ زیادہ حصہ دروازے پر مجتمع باہر مردانے میں آنے والے مہمانوں کا نظارہ کر رہی ہیں۔ خالی دیکھ لینا انکے لیے کافی نہ تھا۔ اگر نظروں کے ذریعے کھا جانا ممکن ہوتا۔ تو بلا شبہ قاضی صاحب کے کل مہمانوں کو ہڑپ کر جاتیں۔ کہیں کسی بی بی کا شیر خوار بچہ کسی خادمہ کی عدم توجہی کا شکار ہونے سے گرا۔ شور و فریاد اور نالہ درد رسیدہ سے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ اس غل میں ماں بچہ کی آواز پہچان کر بے تکان چیختی چلاتی، پائنچے سمیٹتی، دائی کو وہیں سے دھتکار پھٹکار بتاتی چلی اور جھپٹ بچے کو اٹھا کر معمولی منہ بند لقمہ دے کر اس کی نالہ و فریاد کی بندش فوری میں مصروف ہو جاتی۔ اناؤں و دائیوں، ماماؤں، اصیلوں، لونڈیوں باندیوں کے ہجوم غضب، از غیبی ڈھیلے، سارے گھر میں نئی برسات کے مینڈکوں کی طرح تنہا اکیلے ہی اکیلے نہیں پھرتے بلکہ اپنی چلی ہوئی، جیحم ڈھار سے ایک ہنگامہ شادی علیحدہ برپا کر رہے ہیں۔

شادی کا انتظام

ظاہر ہے بی شادی معمولی چیز نہیں ہے۔ کہیں ملتی ہے؟ اگر کسی کو سہرے مل گئی ہو، ل گئی ہو

ہم کو کیا مطلب ۔ ہمارے قاضی صاحب کو تو چہل سالہ تگ و دو کے بعد یکڑ ملیں ۔ پھر اُس کے انتظام و اہتمام کا کیا پوچھنا ۔ خیر سے قاضی صاحب کے بھائی نہایت با سلیقہ ۔ مسلم منتظم نکلے (افسوس ہے کہ زنانخانہ میں اُن کا دسترس نہ تھا ۔ ورنہ مذکورہ بالا بدامنیاں نہ ہونے پاتیں) اُنھوں نے پہلے ہی سے عساکر منتظمان انتخاب کر کے ۔ حسب لیاقت عہدے تقسیم کر دیے تھے ۔ جن میں سے سب اپنی اپنی ڈیوٹی پر متعد ۔ چند برادری کے بھائیوں کو باہر والوں کی مہمان نوازی سپرد ہوئی کچھ اہل دل اہل نظر بھائیوں کے سپرد محفل کا انتظام رہا ۔ باورچی خانہ میں، خورش میں با سلیقہ خوش غذا حضرات کو نخچت طعام کی خدمت ملی ۔ خانہ ساز خواجہ سرا چہار دہ سالہ لونڈا، مردانہ زنانہ دونوں جگہ صرف تگاپو کا مختار کل کیا گیا ۔ ٹکٹک دیکھتا رہ کی نسل کی یادگار ہر فن مولا پرانا تشتیں خاص تراش، گاندھی جی کے محبوب ٹیوں کے ٹیکے سے کمربستہ در دولت پر حاضر ۔ گر قطرہ ہم ہے ۔ یہ پیروی رسم قدیم لب معشوق کی غور و پرداخت سپرد ہوئی تھی ۔ گر بحث و اتفاق کا بقیہ آگ کی سہولت کی وجہ سے باورچی خانہ میں ترتیب پا گیا ۔ قریب ہی اغذیہ لطیف و نفیس کی خوشبو ا کی لپیٹیں ۔ اُسکے مشام کو قاضی صاحب کے دل کی طرح بیخود کیے دے رہی ہیں ۔ اب ڈیوٹی فراموش جناب غائب اعجاز نمائیوں میں مصروف ہے ۔ کیوں نہ ہو کس کا نائی ہے ۔ ہر مقام پر موجود ۔ ہر حاضر ۔ ابھی حقہ پر حقہ ڈھو رہا تھا ۔ اور ابھی دیکھیے تو کھانے کی دیگوں کے پاس ڈٹے ہوئے غذا کی خوشبو کے لخلخے دماغ پر چڑھا رہے ہیں ۔ اور پھر دیکھیے تو بس خوردہ اُلش سمیٹنے میں مصروف ۔ سب سے بڑھی ہوئی کرامات یہ ہے کہ اتنے عرصے میں کوئی بھائی برادری والا ایسا نہ بچا ہو گا کہ جس یہاں کھانے کے بلاوے کے لیے آپکی حاضری چند بار نہ درج ہوئی ہو ۔

قاضی صاحب کی حجامت بنتی ہے

خاص تراش نفع بخش، مہمات میں منہمک ۔ قاضی صاحب کو آخری حجامت نوشاہ بننے کے بنوانا ضروری ۔ اگرچہ مفید تاک دو تک کرکے بیکار خاص تراشی سے طبع خاص تراش نفور تھی ۔ گر یہ خدمت بھی ضروری اور اشد ضروری ۔ بہ جبر و اکراہ خاص تراشی کو جملہ امور مفیدہ پر ترجیح اور قاضی صاحب کی داڑھی جسکو عمر بھر کی کمائی کہیں تو بجا ہے گر چہ ہمیشہ ان کے تناسب اعضا کے خو

رخنہ انداز رہی اور جس کے متعلق لوگوں کا خیال ہے۔ اگر یہ داڑھی پاک دل والے چہروں پر ہوتی۔ تو بیشک خدائی نور کہلاتی۔ مگر قاضی صاحب کے رخساروں پر اُسکا ہونا ضرورت سے زیادہ مخدوش ہونے کے ساتھ ہی بادہ عصیاں سے تشبیہ دیے جانے کا بھی مستحق ہے۔ اس حجاب کو فوراً ہٹا دینے کا خیال قاضی صاحب کو اُس وقت میں اس لیے اور بھی پیدا ہو۔ کہ دُلھن بی کو اس لمبی داڑھی مع مونچھوں ہلاتے ہوئے کیا مُنہ دکھائیں۔ بس پھر کیا تھا۔ داڑھی چند ہی منٹ میں کلا سوت کی تلاوت کرتی ہوئی اور یہ بتلاتی ہوئی کہ میں کیا تھی اور کتنی تھی۔ خاص تراش کے استرے کے جھمان بی کے آگے دھری تھی۔ اب قاضی صاحب کے رخسار لکھنؤ کی تازہ شیرمال سے نرم نظر آنے لگے۔ بعد صفائی ویسلین کی پالش نے تابانی پیدا کی۔

قاضی صاحب محفل کا لباس زیب جسم کرتے ہیں

بعد فراغ لباس نو دست بقچہ سے برآمد ہوکر زیب بر۔ کلاہ کج برسر۔ عینک کی الحمدللہ ضرورت نہ تھی۔ مگر کچھ تو ترقی حسن رخ کے خیال اور کچھ بہ مدد عینک نظارہ مارنے کے پردے ڈال۔ اور زیادہ تر چیاں نیز آنکھوں کا پردہ رکھنا تھا۔ اس لیے زیب چشم کرلی ہی رہی۔

قاضی صاحب کی محفل میں آمد اور وہاں پہنچکر نشست

غرض قاضی صاحب سب حربہ ہائے حُسن آفریں سے مسلح ہوکر اپنے مخصوص انداز سے پوقدمے کھٹ کھٹاتے، ہاتھوں کو اوپر اُٹھاتے۔ جھٹکارتے اور پھر گراتے ہوئے محفل میں آتے ہیں حضرت پہنچے۔ اہل محفل کی نگاہیں منتظر جلوہ ریزی تھیں۔ سب شاد کام ہوئے۔ آئیے آئیے سے خیر مقدم ہوا قاضی زبان سے نہیں، اپنی اداؤں کی زبان حال اور عینک کی نقاب پوش نگاہوں سے جواب ممنونیت دیتے ہوئے مسند تک پہنچکر قرین مسند پر جاکر ایک ہاتھ کی کہنی تکیہ پر ٹیک کر نوشاہیت کے غرور میں پُر ہیبت۔ باچشم عینک ادھر ادھر نگراں ہوئے۔

(باقی آیندہ)

ہمارے معاصرین

"عالمگیر" خاص نمبر ۱۹۳۲ء: طول عرض اور حجم کے اعتبار سے پرچہ حیرت انگیز ہے اتنا ضخیم پرچہ اس سلیقے سے شائع کرنا آسان کام نہیں ہے ادارہ عالمگیر مبارکباد کا مستحق ہے۔

اگر کوئی شوقین پورا رسالہ پڑھنا چاہے تو دیگر مشاغل کے ساتھ ایک ماہ سے کم میں ختم نہیں کر سکتا۔ مگر ذوق سلیم کے لیے یہ امر موجب تسکین ہے کہ اسکے لائق مدیر نے اس میں ایسی بہت سی چیزیں چھاپ دی ہیں جنھیں پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ مثلاً ملا رموزی صاحب کا مضمون "نکاح ہو گیا ہے" کہ جس میں صرف کشمیریوں کے سے فقرے اور جملے استعمال کر کے ہنسانے کی کوشش کی گئی ہے۔ شروع مضمون میں حسب دستور بیوی کا تذکرہ ہے اور پھر "گدھے کہیں کے" "سفر تو کرتے ہیں بیٹیا تھرڈ کلاس میں۔۔" "کمینہ کہیں کا" اور اسی طرح کے ناشائستہ فقروں سے مزاح کو بازاری مذاق میں تبدیل کیا گیا ہے۔

اس طب و یابس کے مجموعے میں چار پانچ مضمون ضرور پڑھنے کے قابل ہیں۔ مثلاً جناب محمد حسین صاحب ادیب کا مضمون "اردو شاعری میں درس پیغام کی تلاش" اس بات کا مستحق ہے کہ اسکے مطالعے کیلئے وقت نکالا جائے۔ حصہ نظم کا بھی یہی حال ہے۔ اس میں ایک شعر یاد رکھنے کے قابل ہے ؎

چھیڑ کی بات کہتے ہوئے ڈرتے ہیں یاس
آن حسیں ہر وقت ہو انکے منانے کے لئے

اردو شاعری کے اخلاقی پہلو پر اعتراض کرنے والے دیکھیں کہ ہمارے شعرا کی زبانی عیش پرستیاں اُن کی عملی پاکبازیوں سے کتنی دُور ہوتی ہیں۔ اس شعر کے کہنے والے ایک سن رسیدہ بزرگ ہیں جنکی لمبی داڑھی کے سفید بال اور نورانی چہرے کی جھریاں اُنکی پاکیزگی نفس کی شاہد ہیں!!

"نیرنگ خیال" جنوری ۱۹۳۲ء:۔ اسکا خاص نمبر نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ جنوری کا معمولی پرچہ آیا ہے۔ شذرات میں سائز کی تبدیلی کا اعلان ہے یعنی رسالہ پھر چھوٹے سائز پر شائع ہو گا۔ ہم اپنے معاصر کے اس فیصلے سے عملاً متفق ہیں۔ رسائل کے لیے کتابی سائز یقیناً موزوں ہے۔ مگر ملک میں کچھ رسالے بڑے سائز پر بھی شائع ہونا چاہیے ضرورت ہے کہ جس وقت سنجیدہ رسائل علم و ادب کی خدمتیں انجام دے رہے ہوں کچھ تجارتی پرچے صحافتی نمائش میں اس طرح لگے ہوئے ہوں کہ اُنکا پھیلاؤ سطح زمین گھیرے ہوئے ہو اور اُنکی چیخ پکار آسمان کو پار کرتی ہو!!

شذرات کے آخر میں "نیرنگ خیال" کی چھ ہزار اشاعت ہونے کا دعوی کیا گیا ہے اور اسکے جھٹلانے والوں کو چیلنج دیا گیا ہے۔ یہ جھگڑا عرصے سے چلا آرہا ہے۔ "عالمگیر" کا دعوی ہے کہ ہماری اشاعت زیادہ ہے، آپ کہتے ہیں نہیں، ہماری اشاعت زیادہ ہے۔ یہ تو خدا ہی جانے کہ ان میں سچا کون ہے۔ مگر اتنا معلوم ہے کہ بے فکر ٹٹو ؤں کی طرح آئے دن کی لڑائی نہ تو ادبی خدمت ہے اور نہ زیادہ مفید پروپیگنڈا۔ رسائل کے پڑھنے والوں کو سمجھدار مانتے ہوئے یہ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ پرچے اس لیے نہیں خریدے جاتے کہ انکی اشاعت زیادہ ہے بلکہ اس لیے خریدے جاتے ہیں کہ ان میں دلچسپ مضامین ہوتے ہیں۔ البتہ ان شاعتی اعلانات کا نتیجہ بظاہر یہ ہے کہ اشتہارات زیادہ حاصل ہونگے۔ مگر حصول اشتہارات کی کاوش تمام "ایڈورٹیزمنٹ منیجر" کے سپرد ہونا چاہیے جو اپنی طور پر تحریری و تقریری ذرائع سے توسیع اشاعت کرتا ہے۔ اس تجارتی رقابت کی خانہ جنگی کو منظر عام پر لانے کی ضرورت نہیں ہے۔

10 اس نمبر میں "اسٹوسن" کے ایک مضمون "مارخیم" کا ترجمہ علیگڑھ میگزین سے ماخوذ ہے اسکے مترجم سید احمد شاہ صاحب بخاری ایم اے ہیں۔

ایک سال پہلے دسمبر ۱۹۳۰ء کے "ادب" میں اس مضمون کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔ "ادب" کے مترجم محمد مقبول حسین صاحب نیر فتحپوری ہیں۔ ہم نے دونوں ترجموں کو ملایا۔ کہیں کہیں ایک ترجمہ دوسرے سے مختلف ہے۔ اور اسکا ایک ٹکڑا دوسرے سے بہتر۔ بحیثیت مجموعی دونوں ترجمے اچھے ہیں۔ مضمون بذات خود بہت عمدہ ہے۔ فلسفہ ضمیر کا تجزیہ نہایت کامیابی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

نیرنگ جنوری ۱۹۳۲ء :۔ سالگرہ نمبر ہے۔ نسبتاً چھوٹی تقطیع پر شائع ہوا ہے مگر تصویریں اور رنگینیاں کسی سے کم نہیں ہیں معنوی حیثیت بھی اچھی ہے۔ جناب محمد حسین صاحب ادیب کا مقالہ علمیہ اور جناب محترم علی عباس صاحب حسینی ایم اے کا گرانقدر فسانہ "پنچھو چیا" پڑھنے کے قابل ہیں۔ علی الخصوص جناب حسینی مدظلہ کا فسانہ ذوق سلیم کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ سرورش لاہور کی طرح اڈیٹر صاحب نیرنگ بھی مستحق مبارکباد ہیں کہ انھیں ایسا بلند پایہ فسانہ حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی۔ ان مضمونوں کے علاوہ جناب سلطان حیدر صاحب جوش اور جناب خواجہ اطہر حسین صاحب نیر کے مزاحیہ مضامین بھی قابل قدر ہیں۔

"ساقی" جنوری ۱۹۳۲ء یہ بھی خاص نمبر ہے۔ ظاہری خوبیاں تمام موجود ہیں۔ البتہ اسکے مضامین ہمیشہ "ادب لطیف" ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ نمبر بھی فسانوں سے بھرا پڑا ہے۔

عظمت اللہ خاں صاحب مرحوم کا فسانہ بہت عمدہ ہے - اور بھی چند فسانے اچھے ہیں -

"چمن" جنوری ۱۹۳۲ء :- سالانہ نمبر ہے - ظاہری رنگینیوں میں سب نمبروں سے گیا ہے۔ سب بڑا سائز ہے، سب سے زیادہ تصویریں ہیں اور سب سے بہتر کتابت و طباعت ہے۔ مدیر چمن اس صوری حیثیت کی تکمیل کے لیے مستحق مبارکباد ہیں - البتہ انھوں نے مضامین نظم و نثر میں زیادہ احتیاط و انتخاب سے کام نہیں لیا - اس اعتبار سے پرچے کا معیار بہت پست ہے - رسالہ زیادہ تر اشعار سے پُر ہے - حضرت صفی مدظلہ اور جناب یاس خیرآبادی کے تبرکات کے علاوہ جناب عزیز لکھنوی - جناب آثر لکھنوی - جناب آشفتہ اور جناب سراج کی نظمیں بہت خوب ہیں

مضامین نثر میں محترمی علی عباس صاحب حسینی کا افسانہ "انتقام" بہترین ہے۔ اس فسانے میں موصوف نے دیہاتی معاشرت اور اعتقادات کا خاکہ بے نظیر پیرایہ میں کھینچا ہے - سچ تو یہ ہے کہ یہ فسانہ سنگریزوں میں لعل کی طرح نمایاں ہے - افسوس ہے کہ جن اوراق پر طبع ہوا ہے وہ سب ریلا دبے ترتیب ہو گئے ہیں - جسکی وجہ سے ناظرین کو سلسلۂ مضمون کی تلاش میں دقت اور فسانے کے لطف میں کمی محسوس ہوتی ہے -

اس فسانے کے علاوہ حکیم آشفتہ صاحب کا مضمون "شالیمانی - پروفیسر عابد علی صاحب کا ڈراما "صحرا" پڑھنے کے قابل ہے - خواجہ عشرت صاحب لکھنوی نے ایک مضمون رانی درگاوتی پر لکھا ہے - مگر "ادب" کے گزشتہ پرچے میں سید ناظم حسین صاحب وکیل فیض آباد کا ایک گرانقدر مضمون اسی رانی سے تعلق اسی عنوان کی تحت میں شائع ہو چکا ہے -

مزاحیہ مضامین میں جناب خواجہ اطہر حسین صاحب ندا ایم اے کا مضمون سب سے بہتر ہے - آپ کی عالمانہ متانت اور شگفتگی اور جبلی ذہانت و شوخی ملک کے تمام مزاحیہ نگاروں میں آپ کو ہمیشہ ممتاز رکھتی ہے -

"اعظم"

صوبہ بہار و اوڑیسہ کا عظیم الشان سالانہ مشاعرہ

۲۶ دسمبر ۱۹۳۱ء کو شیخپورہ میں نہایت کامیاب مشاعرہ ہوا۔ لکھنؤ، گیا، عظیم آباد، بارہ، جمولی، مونگیر، بھاگلپور اور دوسرے مقامات کے کاملین فن تشریف لائے نیز شیخپورہ و حسین آباد کے حضرات بھی شریک جلسہ ہوئے۔ مشاعرہ ۹ بجے شب کو شروع ہوا اور صبح ہوتے ختم ہوا۔ مشاعرہ اتنا جلد ختم نہ ہوتا اگر دوسری غیر طرح کی غزلیں بھی پڑھی جاتیں۔ مگر جناب وقار کی غزل صبح ہوتے پڑھی گئی جسکے بعد دوسری طرح کے دور کے لیے نہ شعرا پڑھنے پر راضی ہوئے نہ سامعین سننے پر اور نہ جناب سید علیخاں صاحب ایڈوکیٹ پٹنہ ہائیکورٹ صدر جلسہ نے اسے مناسب سمجھا۔ انجمن جناب جمیل عظیم آبادی ارشد تلامذہ جناب شاد مرحوم، و جناب مظاہر جناب بحر عظیم آبادی۔ جناب ہادی، جناب قیس، جناب مظاہر شیخپوری، جناب رضا، جناب محسن حسین آبادی، جناب ہاتف جمولی اور دیگر حضرات کی بے حد شکرگزار ہے۔ جناب سید علی افضل صاحب صدر جلسہ نے جناب وقار کی اس آمد پر بھی تشریف آوری پر انجمن ہذا کو مبلغ صہ روپئے کا وعدہ فرمایا اور جناب وقار سے ایک طلائی تمغہ قبول کرنے کی درخواست کی جسکو موصوف نے قبول و منظور کیا۔ مصرع طرح یہ تھا

"ابھی تو میں تھکا ماندہ چلا آتا ہوں منزل کا"

بعض غزلوں کا انتخاب درج ذیل ہے۔ (سید امداد حسین سکریٹری انجمن معین الادب شیخپورہ ضلع مونگیر)

جناب نواب کاظم علیخاں صاحب وقار لکھنوی

وہ گھبرا کر اُٹھے بالیں سے وقت آتا ہے مشکل کا
الٰہی امتحان جان ہے یہ۔ یا امتحاں دل کا

سنبھل اے ناخدا کشتی میں یہ ٹھہراؤ سا کیوں ہے
یہ ڈوبا چاہتی ہے یا پتہ دیتی ہے ساحل کا!

ہمارا ہنستے ہنستے رونا، روتے روتے ہنس پڑنا
خوشی و غم نہ سمجھو اب یہ عالم اور ہے دل کا

ارے دو اک رگیں باقی ہیں مشکل سہل ہونے دے
کہاں او بیکنا ہی روکتی ہے ہاتھ قاتل کا

خیال الفت، محبت، عشق، جذب عشق، مرجانا
پتا ملتا چلا آتا ہے ہر منزل سے منزل کا

شاہ محمد ہادی صاحب مختار۔ ہادی شیخپورہ

قیامت سے نہیں کم اک اشارہ چشم قاتل کا
کہ جب چاہے بدل دے رنگ وہ محفل کی محفل کا

کوئی جب پوچھتا ہے کون ہے بے صبر عالم میں
بنا کر پیش کر دیتے ہیں وہ نقشہ مرے دل کا

تھی قہر آلود چتون میں بھی آمیزش محبت کی
رہا میٹھی چھری بن کر اشارہ چشم قاتل کا

نظر آئیگی اک تصویر اس میں بھی شکایت کی
مرا چہرہ نہ دیکھو ہے یہ آئینہ مرے دل کا

ہیں جتنی بستیاں اُجڑی، پھر بسینگی سب کے دن ہادی
نہیں آباد اگر ہوگا تو ویرانہ مرے دل کا

شاہ محمد نقی صاحب مختار قیس شیخپورہ

لبوں تک آتے آتے کیوں رکا نالہ مرے دل کا
مسافر ہے نیا رستہ بھٹک جائے نہ منزل کا

مجھی سے ہائے کر کے دل مرا ٹکڑے ٹکڑے کر دیا
مرے ہی سامنے افسوس کچھ بربادی دل کا

وہ اسکو چھین کر دیتے ہیں کہ سینے سے لگاتے ہیں
ابھی تو دیکھنا ہے فیصلہ ہوتا ہے کیا دل کا

کہو ہاں یا نہیں کچھ لب ہلاؤ عرضِ مطلب پہ
ہوا جاتا ہے دو باتوں میں قصہ مختصر دل کا

گلا کٹنے پہ سمجھے تھے سبکدوشی ہوئی حاصل
مگر احسان پھر بھی رہ گیا گردن پہ قاتل کا

سیّد ظفر حسین خاں صاحب شیخپورہ شاگرد جناب وقار لکھنوی

کہیں کڑیاں ہیں بیڑی کی کہیں حلقہ سلاسل کا
الٰہی کیا یونہی ہوتا ہے درماں وحشتِ دل کا

قدم رکھا تو ہے راہِ محبت میں ظفر تو نے
بڑا کاوا اک رستہ ہے خدا حافظ ترے دل کا

سیّد مظاہر الحق صاحب یاس شیخپورہ

اُٹھا میری طرح مجنوں حجابِ آئینۂ دل کا
اُلٹنے کو چلا ہے پردہ کیوں لیلیٰ کی محمل کا

خدا کا خوف بھی دل میں بتوں کی بھی محبت ہے
یہ نازک مسئلہ ہے اجتماعِ حق و باطل کا

ڈاکٹر سیّد مظفر صاحب بنارسی

بوقتِ ذبح دیکھا مسکرانا جب کہ بسمل کا
گلے پر چلتے چلتے رک گیا خود ہاتھ قاتل کا

چڑھی ہے آستیں تیور ہیں بدلے تیغ نکلی ہے
نظر آتا ہے کچھ انداز بیڈھب آج قاتل کا

شاہ محمد ناصر صاحب ناصر شیخپورہ

یہ جذبِ حسن بھی کیا شے کہ عالم محوِ حیرت ہے
ترے چہرے سے وابستہ رہا رنگ اہلِ محفل کا

ادھر بھی اک نظر کر لے ذرا او محوِ آرائش
میں آیا ہوں تری محفل میں لے کر آئینہ دل کا

سیّد علی اوسط صاحب ہلوری شاگرد جنابِ وقار لکھنوی

یہ وقتِ دید ہے تھم تھم کے چل اے خنجرِ قاتل
دمِ آخر نکل جانے دے ظالم حوصلہ دل کا

مرا مدہوش جو سرکا دے نقاب روئے روشن کو
تو ہو جائے ابھی پھیکا یہ جلوہ ماہِ کامل کا

سید ناظم حسین صاحب شیخپورہ

یہ پیہم اشک کیوں نکلے چلے آتے ہیں آنکھوں سے
الٰہی خیر ٹوٹا کیا کوئی پھر آبلہ دل کا

پہونچ کر کوئے جاناں میں یہ بیخود ہو گئے ناظم
پتہ منزل پہ آکر پوچھتے پھرتے ہو منزل کا

شاہد حسین خاں صاحب حسین آبادی شاگرد جناب وقار

قیامت ہو گیا قاتل سے نظریں چار ہو جانا
لگی یوں چپ کہ آخر رہ گیا دل میں گلہ دل کا

خدا جانے ہوا گم یا کسی پہلو میں جا ٹھہرا
کہاں جاؤں کدھر ڈھونڈھوں پتہ ملتا نہیں دل کا

سید سراج الحق صاحب شیخپورہ

یہ پہونچی جس کے سر پہ پھر عدم اسکا ٹھکانا ہے
اڑا لائی قضا انداز سارا تیغ قاتل کا

بھروسہ کر خدا پر بحر الفت میں اتر بھی تو
خدا خود ناخدا بن کر بتا دیگا ساحل کا

سید ذاکر حسین صاحب ذاکر شیخپورہ شاگرد جناب وقار لکھنوی

معاف اے شوق اجازت ضعف بڑھنے کی نہیں دیتا
اٹھانا دو قدم گویا کہ طے کرنا ہے منزل کا

مجلّہ مکتبہ

دار الاشاعت مکتبۂ ابراہیمیۂ امداد باہمی (محدود) حیدرآباد دکن کا علمی و ادبی مصوّر ماہوار رسالہ ہے جس کا شمار دنیائے اردو کے چیدہ علمی رسالوں میں ہوتا ہے۔ کئی سال سے مولوی محمد عبدالقادر سروری ایم اے، ایل ایل بی مولوی سید محمد ایم اے اور مولوی عمر یافعی کی ادارت میں حسب ذیل خصوصیات کے ساتھ نہایت آب و تاب سے شایع ہو رہا ہے:۔

(۱) اس میں دو عمدہ طبعزاد افسانے یا ہندی، عربی، انگریزی فرانسیسی اور روسی افسانوں کے تراجم ہوتے ہیں۔

(۲) اس میں تاریخ، سائنس، فلسفہ اور معاشیات پر بھی مفید علمی مقالے شایع ہوتے ہیں۔

(۳) اس میں عام ادبی و تحقیقی مضامین کے علاوہ دکن کے قدیم شعرا اور اردوئے قدیم کی نسبت محققانہ مضامین ہوتے ہیں

(۴) مشاہیر اُدبا و شعرا اور اہل علم و فضل کی تصویریں ہر نمبر میں شایع ہوتی ہیں۔

(۵) اسمیں اردو کی نئی کتابوں پر تبصرے اور جدید مطبوعات کی اطلاعیں بالالتزام شایع ہوتی ہیں قیمت سالانہ للعہ ششماہی ؏ نمونہ ۶

منتظم مجلّہ مکتبہ مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

